

نہی کیا

نہی

گंगा سے गोमती تک

.....' 'موجی' کی کہانیوں کی विशेषیت انکی سہل اور آسان ہے۔ عامیانی اور سادگی انکی ہی ہے۔ ان کی کہانیوں میں ان کی زندگی کے سچے سچے حالات ہیں۔ ان کی زندگی کے سچے سچے حالات ہیں۔ ان کی زندگی کے سچے سچے حالات ہیں۔

ان کہانیوں میں ہنس بھی ہے، رونا بھی ہے۔ ان کی کہانیوں میں ہنس بھی ہے، رونا بھی ہے۔ ان کی کہانیوں میں ہنس بھی ہے، رونا بھی ہے۔

—ڈاکٹر رام دھیر سنگھ

.....' 'موجی' کی کہانیوں کی خصوصیت انکی سہل اور آسان ہے۔ ان کی کہانیوں میں ان کی زندگی کے سچے سچے حالات ہیں۔ ان کی زندگی کے سچے سچے حالات ہیں۔ ان کی زندگی کے سچے سچے حالات ہیں۔

—جنرل کمار

.....' 'موجی' کی کہانیوں کی خصوصیت انکی سہل اور آسان ہے۔ ان کی کہانیوں میں ان کی زندگی کے سچے سچے حالات ہیں۔ ان کی زندگی کے سچے سچے حالات ہیں۔ ان کی زندگی کے سچے سچے حالات ہیں۔

.....' 'موجی' کی کہانیوں کی خصوصیت انکی سہل اور آسان ہے۔ ان کی کہانیوں میں ان کی زندگی کے سچے سچے حالات ہیں۔ ان کی زندگی کے سچے سچے حالات ہیں۔ ان کی زندگی کے سچے سچے حالات ہیں۔

—مینیجر نیا ہند

مینیجر کا پتہ—

مینیجر 'نیا ہند' 145، سٹی گنج، دہلی۔

گنگا سے گوتمی تک

.....' 'موجی' کی کہانیوں کی خصوصیت انکی سہل اور آسان ہے۔ ان کی کہانیوں میں ان کی زندگی کے سچے سچے حالات ہیں۔ ان کی زندگی کے سچے سچے حالات ہیں۔ ان کی زندگی کے سچے سچے حالات ہیں۔

ان کہانیوں میں ہنس بھی ہے، رونا بھی ہے۔ ان کی کہانیوں میں ہنس بھی ہے، رونا بھی ہے۔ ان کی کہانیوں میں ہنس بھی ہے، رونا بھی ہے۔

—ڈاکٹر رام دھیر سنگھ

.....' 'موجی' کی کہانیوں کی خصوصیت انکی سہل اور آسان ہے۔ ان کی کہانیوں میں ان کی زندگی کے سچے سچے حالات ہیں۔ ان کی زندگی کے سچے سچے حالات ہیں۔ ان کی زندگی کے سچے سچے حالات ہیں۔

—جنرل کمار

.....' 'موجی' کی کہانیوں کی خصوصیت انکی سہل اور آسان ہے۔ ان کی کہانیوں میں ان کی زندگی کے سچے سچے حالات ہیں۔ ان کی زندگی کے سچے سچے حالات ہیں۔ ان کی زندگی کے سچے سچے حالات ہیں۔

.....' 'موجی' کی کہانیوں کی خصوصیت انکی سہل اور آسان ہے۔ ان کی کہانیوں میں ان کی زندگی کے سچے سچے حالات ہیں۔ ان کی زندگی کے سچے سچے حالات ہیں۔ ان کی زندگی کے سچے سچے حالات ہیں۔

—مینیجر نیا ہند

مینیجر کا پتہ—

مینیجر 'نیا ہند' 145، سٹی گنج، دہلی۔

ہندوستانی کلچر سوسائٹی

ہندوستانی کلچر سوسائٹی

مقصد

مقصد

(1) ایک ایسی ہندوستانی کلچر کا بڑھانا، फैلانا اور پرچار کرنا جس میں سب ہندوستانی شامل ہوں۔

(1) ایک ایسی ہندوستانی کلچر کا بڑھانا، फैلانا اور پرچار کرنا جس میں سب ہندوستانی شامل ہوں۔

(2) ایکٹا پھیلانے کے لئے کتابیں، اخباروں، رسالوں وغیرہ کا چھاپنا۔

(2) ایکٹا پھیلانے کے لئے کتابیں، اخباروں، رسالوں وغیرہ کا چھاپنا۔

(3) پڑائی، دھرم، کتاب، دھرم، سماجی، کانفرنسیوں، لکچروں سے سب دھرم، جانوں، بیگاریوں اور فیکٹوں میں آپس کا میل بڑھانا۔

(3) پڑائی، دھرم، کتاب، دھرم، سماجی، کانفرنسیوں، لکچروں سے سب دھرم، جانوں، بیگاریوں اور فیکٹوں میں آپس کا میل بڑھانا۔

سوسائٹی کے پریسیڈنٹ می:۔ عبداللہ مہدی راجا؛
وائس پریسیڈنٹ—ڈاکٹر بھگوان داس اور ڈاکٹر عبدالحق۔
گورننگ باڈی کے پریسیڈنٹ ڈاکٹر بھگوان داس؛
سکرٹری—یوسف سلوڈی۔

سوسائٹی کے پریسیڈنٹ—مسٹر عبداللہ مہدی راجا؛
وائس پریسیڈنٹ—ڈاکٹر بھگوان داس اور ڈاکٹر عبدالحق۔
گورننگ باڈی کے پریسیڈنٹ ڈاکٹر بھگوان داس؛
سکرٹری—یوسف سلوڈی۔

گورننگ باڈی کے آفیسر ممبر—

گورننگ باڈی کے آفیسر ممبر—

ڈاکٹر سید منعمون، ڈاکٹر نازا چلدا، مولوی سید
سلمان ندوی، مسٹر مظفر علی سوڈی، شی:۔ ی:۔ جی
کوہر، یوسف سلوڈی، مہتما بھگوان داس، سید یونس
چلدا، قاضی محمد عبدالغفار اور شی:۔ اوم پرکاش
پالہوال۔

ڈاکٹر سید منعمون، ڈاکٹر نازا چلدا، مولوی سید
سلمان ندوی، مسٹر مظفر علی سوڈی، شی:۔ ی:۔ جی
کوہر، یوسف سلوڈی، مہتما بھگوان داس، سید یونس
چلدا، قاضی محمد عبدالغفار اور شی:۔ اوم پرکاش
پالہوال۔

ممبروں کے قاعدوں کے لئے لکھئے۔

ممبروں کے قاعدوں کے لئے لکھئے۔

سکرٹری

سکرٹری

سکرٹری، ہندوستانی کلچر سوسائٹی

سکرٹری، ہندوستانی کلچر سوسائٹی

145، سڈی گنج، دہلی

145، سڈی گنج، دہلی

نوٹ—سوسائٹی کے نئے قاعدے کے انوسار ممبروں کی
فیس صرف ایک روپیہ کر دی گئی ہے۔ "نیا ہند" کے
جو گاہک ممبر بننا چاہیں ان کو صرف چھ روپیہ جلد
دینے پر ہی ممبر بنا لیا جائیگا۔ الگ سے ممبروں کی
فیس دینے والے سوسائٹی کی نکلی ہوئی کوئی کتاب جو
ایک روپیہ دام کی ہوگی مفت لے سکیں گے یا زیادہ دام
کی کتابیں لے کر ایک بار ایک روپیہ کم کر سکیں گے۔

نوٹ—سوسائٹی کے نئے قاعدے کے انوسار ممبروں کی
فیس صرف ایک روپیہ کر دی گئی ہے۔ "نیا ہند" کے
جو گاہک ممبر بننا چاہیں ان کو صرف چھ روپیہ جلد
دینے پر ہی ممبر بنا لیا جائیگا۔ الگ سے ممبروں کی
فیس دینے والے سوسائٹی کی نکلی ہوئی کوئی کتاب جو
ایک روپیہ دام کی ہوگی مفت لے سکیں گے یا زیادہ دام
کی کتابیں لے کر ایک بار ایک روپیہ کم کر سکیں گے۔

हमारे यहाँ मिलने वाली कुछ और किताबें

नोट:—यह किताबें सिर्फ हिन्दी में हैं			कुछ और किताबें सिर्फ हिन्दी में हैं		
नाम किताब	लेखक	राम	लेखक	नाम किताब	राम
1. शेर और शायरी	श्री अयोध्या प्रसाद गोयली	8 0 0	श्री अयोध्या प्रसाद गोयली	1. शेर और शायरी	8 0 0
2. शेर और सुजन	"	8 0 0	"	2. शेर और सुजन	8 0 0
3. गहरे पानी पैठ	"	2 8 0	"	3. गहरे पानी पैठ	2 8 0
4. हमारे आराध्य	श्री बनारसीदास चतुर्वेदी	3 0 0	श्री बनारसीदास चतुर्वेदी	4. हमारे आराध्य	3 0 0
5. संस्मरण	"	3 0 0	"	5. संस्मरण	3 0 0
6. दो हजार वर्ष पुरानी कहानियाँ	श्री जगदीशचन्द्र जैन	3 0 0	श्री जगदीशचन्द्र जैन	6. दो हजार वर्ष पुरानी कहानियाँ	3 0 0
7. ज्ञान गंगा	श्री नारायण साव जैन	6 0 0	श्री नारायण साव जैन	7. ज्ञान गंगा	6 0 0
8. पंच बिन्दु	श्री शान्ति प्रिय द्विवेदी	2 0 0	श्री शान्ति प्रिय द्विवेदी	8. पंच बिन्दु	2 0 0
9. पंच प्रदीप	शान्ति एम. ए.	2 0 0	शान्ति एम. ए.	9. पंच प्रदीप	2 0 0
10. आकाश के तारे धरती के फूल	श्री कन्हैयालाल मिश्र प्रभाकर	2 0 0	श्री कन्हैयालाल मिश्र प्रभाकर	10. आकाश के तारे धरती के फूल	2 0 0
11. मुक्ति दूत	श्री बीरेन्द्र कुमार जैन एम. ए.	5 0 0	श्री बीरेन्द्र कुमार जैन एम. ए.	11. मुक्ति दूत	5 0 0
12. मिलन यामिनी	श्री बच्चन	4 0 0	श्री बच्चन	12. मिलन यामिनी	4 0 0
13. रजत रश्मि	डाक्टर रामकुमार वर्मा	2 8 0	डाक्टर रामकुमार वर्मा	13. रजत रश्मि	2 8 0
14. मेरे बापू	श्री तन्मय ब्रुखारिया	2 8 0	श्री तन्मय ब्रुखारिया	14. मेरे बापू	2 8 0
15. विश्व संघ की ओर	पंडित सुन्दरलाल भगवानदास केला	3 0 0	पंडित सुन्दरलाल भगवानदास केला	15. विश्व संघ की ओर	3 0 0
16. भारतीय अर्थशास्त्र	श्री भगवानदास केला	5 0 0	श्री भगवानदास केला	16. भारतीय अर्थशास्त्र	5 0 0
17. भारतीय शासन	"	3 0 0	"	17. भारतीय शासन	3 0 0
18. नागरिक शास्त्र	"	2 4 0	"	18. नागरिक शास्त्र	2 4 0
19. साम्राज्य और उनका पतन	"	2 8 0	"	19. साम्राज्य और उनका पतन	2 8 0
20. भारतीय स्वाधीनता आन्दोलन	"	1 4 0	"	20. भारतीय स्वाधीनता आन्दोलन	1 4 0
21. सर्वोच्च अर्थ व्यवस्था	"	1 8 0	"	21. सर्वोच्च अर्थ व्यवस्था	1 8 0
22. हमारी आदिम जातियाँ	श्री भगवानदास केला और श्री अखिल विनय	3 8 0	श्री भगवानदास केला और श्री अखिल विनय	22. हमारी आदिम जातियाँ	3 8 0
23. अर्थशास्त्र शब्दावली	श्री दया शंकर दुबे, एम. ए. एल. बी. गजाधर प्रसाद, अम्बिष्ट, भगवानदास केला	2 0 0	श्री दया शंकर दुबे, एम. ए. एल. बी. गजाधर प्रसाद, अम्बिष्ट, भगवानदास केला	23. अर्थशास्त्र शब्दावली	2 0 0
24. नागरिक शिक्षा	भगवानदास केला श्री दयाशंकर दुबे	1 8 0	भगवानदास केला श्री दयाशंकर दुबे	24. नागरिक शिक्षा	1 8 0
25. राष्ट्र मंडल शासन	श्री दयाशंकर दुबे	1 8 0	श्री दयाशंकर दुबे	25. राष्ट्र मंडल शासन	1 8 0
26. जवानो	महात्मा भगवानदीन	3 0 0	महात्मा भगवानदीन	26. जवानो	3 0 0
27. मारने की हिम्मत !	"	1 0 0	"	27. मारने की हिम्मत !	1 0 0
28. सखीना सच	"	0 8 0	"	28. सखीना सच	0 8 0
29. मेरे साथी	"	1 0 0	"	29. मेरे साथी	1 0 0

मिलने का पता—

मैनेजर 'बचा हिन्द'
145, इन्दौर, इन्दौर-3.

मैनेजर 'बचा हिन्द'
145, इन्दौर, इन्दौर-3.

گیاتا اور کوران

لےکچر-پंडित सुन्दरलाल

اس کتاب میں ہندو دھرم اور اسلام دونوں کے مہل کی باتوں میں۔ گہتا کا بڑھن، گہتا کے ایک ایک ادعا کے کا نچھوڑ، قرآن کا بڑھن، لگ بھگ 15 خاص خاص مضمونوں پر قرآن کی قریب 500 آیتوں کا لفظی ترجمہ وغیرہ دیا گیا ہے۔

جو لوگ سب دھرموں کی بلحاظی لیکھا کو جاننا اور سمجھنا چاہیں ان کے لئے یہ کتاب اصول ہے۔

پولہ تین سو صفحے کی سندر جلد بلدی کتاب کی قیمت صرف ڈھائی روپہ، ڈاک خرچ الگ۔

ہندو مسلم عکاتا

اس کتاب میں وہ چار لیکچر جمع کئے گئے ہیں جو پبلشنگ جی نے نلسنہتری بورڈ کوالیار کی دھوت پر کوالیار میں دئے تھے۔

سو صفحے کی کتاب، قیمت صرف بارہ آلے۔

مہاتما گاندھی کے بلیدان سے سبک

اس کتاب میں ہندو دھرم اور اسلام دونوں کے مہل کی باتوں میں۔ گہتا کا بڑھن، گہتا کے ایک ایک ادعا کے کا نچھوڑ، قرآن کا بڑھن، لگ بھگ 15 خاص خاص مضمونوں پر قرآن کی قریب 500 آیتوں کا لفظی ترجمہ وغیرہ دیا گیا ہے۔

سو صفحے کی کتاب، قیمت صرف بارہ آلے۔

پنجاہ ہمیں کیا سکھاتا ہے

اکتوبر سن 1947 میں پچھمی اور پوربی پنجاہ کے ہٹکارے کے بعد وہاں کی بھنگر برہانی اور اہسی مار کٹ کے کارن لوگوں پر جو جو مصیبتیں آئیں ان کا ہرناک آنکھوں دیکھا ورنہ۔ اس چھوٹی سی کتاب میں آجکل کی مصیبتوں کو حل کرنے کے لئے کچھ سچھاوی ہو بھی کئے گئے ہیں۔ قیمت صرف چار آلے۔

بنگال اور اس سے سبق

اس چھوٹی سی کتاب میں 1949-50 میں پوربی اور پچھمی بنگال کے فرقہ وارانہ جھگڑوں پر روشنی ڈالی گئی ہے اور ایسے جھگڑوں کو ہوشہ کے لئے ختم کرنے کی ترکیب بھی سکھائی گئی ہے۔ قیمت صرف دو آلے۔

میلے کا پتہ۔۔۔

میلنگر 'نیا ہلد' 145، سٹی ٹیچ، الہ آباد۔

گیاتا اور قرآن

لیکچر-پندت سندر لال

اس کتاب میں ہندو دھرم اور اسلام دونوں کے مہل کی باتوں میں۔ گہتا کا بڑھن، گہتا کے ایک ایک ادعا کے کا نچھوڑ، قرآن کا بڑھن، لگ بھگ 15 خاص خاص مضمونوں پر قرآن کی قریب 500 آیتوں کا لفظی ترجمہ وغیرہ دیا گیا ہے۔

جو لوگ سب دھرموں کی بلحاظی لیکھا کو جاننا اور سمجھنا چاہیں ان کے لئے یہ کتاب اصول ہے۔

پولہ تین سو صفحے کی سندر جلد بلدی کتاب کی قیمت صرف ڈھائی روپہ، ڈاک خرچ الگ۔

ہندو مسلم ایکتا

اس کتاب میں وہ چار لیکچر جمع کئے گئے ہیں جو پبلشنگ جی نے نلسنہتری بورڈ کوالیار کی دھوت پر کوالیار میں دئے تھے۔

سو صفحے کی کتاب، قیمت صرف بارہ آلے۔

مہاتما گاندھی کے بلیدان سے سبق

اس کتاب میں ہندو دھرم اور اسلام دونوں کے مہل کی باتوں میں۔ گہتا کا بڑھن، گہتا کے ایک ایک ادعا کے کا نچھوڑ، قرآن کا بڑھن، لگ بھگ 15 خاص خاص مضمونوں پر قرآن کی قریب 500 آیتوں کا لفظی ترجمہ وغیرہ دیا گیا ہے۔

سو صفحے کی کتاب، قیمت صرف بارہ آلے۔

پنجاہ ہمیں کیا سکھاتا ہے

اکتوبر سن 1947 میں پچھمی اور پوربی پنجاہ کے ہٹکارے کے بعد وہاں کی بھنگر برہانی اور اہسی مار کٹ کے کارن لوگوں پر جو جو مصیبتیں آئیں ان کا ہرناک آنکھوں دیکھا ورنہ۔ اس چھوٹی سی کتاب میں آجکل کی مصیبتوں کو حل کرنے کے لئے کچھ سچھاوی ہو بھی کئے گئے ہیں۔ قیمت صرف چار آلے۔

بنگال اور اس سے سبق

اس چھوٹی سی کتاب میں 1949-50 میں پوربی اور پچھمی بنگال کے فرقہ وارانہ جھگڑوں پر روشنی ڈالی گئی ہے اور ایسے جھگڑوں کو ہوشہ کے لئے ختم کرنے کی ترکیب بھی سکھائی گئی ہے۔ قیمت صرف دو آلے۔

میلے کا پتہ۔۔۔

میلنگر 'نیا ہلد' 145، سٹی ٹیچ، الہ آباد۔

ہندوستانی کلچر سوسائٹی کی کتابیں

پچاس روپے سے زیادہ دام کی کتابیں خریدنے والوں کو اور بکسٹروں کو خاص رعایت دی جائے گی۔ پوری جانکاری کے لیے لکھیے۔

ڈاک یا ریل کے ذریعے ہر حالت میں گاہک کے ہمسے ہوگا۔

ہندوستانی کلچر سوسائٹی کی کتابیں

پچاس روپے سے زیادہ دام کی کتابیں خریدنے والوں کو اور بکسٹروں کو خاص رعایت دی جائے گی۔ پوری جانکاری کے لیے لکھیے۔

ڈاک یا ریل کے ذریعے ہر حالت میں گاہک کے ہمسے ہوگا۔

بھارت کا ویधान

پورا ہندی انوواد

جو 26 جنوری سن 1950 سے سارے بھارت میں لاگو ہوا۔
'بھارت میں انگریزی راج' کے لکھک پندت سندرلال
دوارا مूल انگریزی سے انووادیت۔

ہر بھارتی کا فرض ہے کہ جس ویधान کے अधीन
स्वाधीन भारत का शासन इस समय चल रहा है उसे
अच्छी तरह समझे. भारत के हर घर में इस पुस्तक का
रहना जरूरी है.

आसान बामहावरा भाषा. रायल अठपेजी बड़ा साइज.
लगभग चार सौ पन्ने. कपड़े की सुन्दर जिल्द. क्रीमत केवल
साठे सात रुपय.

بھارت کا ویधान

پورا ہندی انوواد

جو 26 جنوری سن 1950 سے سارے بھارت میں لاگو ہوا۔
'بھارت میں انگریزی راج' کے لکھک پندت سندرلال
دوارا مूल انگریزی سے انووادیت۔

ہر بھارتی کا فرض ہے کہ جس ویधान کے अधीन
स्वाधीन भारत का शासन इस समय चल रहा है उसे
अच्छी तरह समझे. भारत के हर घर में इस पुस्तक का
रहना जरूरी है.

आसान बामहावरा भाषा. रायल अठपेजी बड़ा साइज.
लगभग चार सौ पन्ने. कपड़े की सुन्दर जिल्द. क्रीमत केवल
साठे सात रुपय.

فیرکا بندی پر باپو

सम्पादक—श्री श्रीकरन दास

इस पुस्तक में 1921 से सन 1948 तक गांधी जी ने
साम्प्रदायिकता के सवाल पर जो कुछ कहा या लिखा वह सब
आपको एक जगह मिलेगा.

भारत के आजाद होने पर यह और भी जरूरी हो गया
है कि हर भारतवासी साम्प्रदायिकता के मुकसानों को समझे
और इस अंधेर को अपने अन्दर से साफ करे.

सुन्दर जिल्द. अच्छा काराप. दो सौ सफे. क्रीमत
बोरुपया.

विनोबा का सन्देश

लेखक—सुरेश रामभाई

एक शब्द—महात्मा भगवानदीन

विनोबाजी के भू-दान-यज्ञ से आज सारा देश वाकिक
है. इस छोटी सी किताब में आपको मिलेगा कि यह भू-दान-
यज्ञ कब और कैसे शुरू हुआ और इसका मकसद क्या है.

पहला एडीशन हाथों हाथ निकल गया. यह दूसरा
एडीशन है. सफे 25, बाम केवल दो आने.

मिचने का पता—

मैनेजर, 'नया हिन्द' 145, मुट्टीगंज, इलाहाबाद.

فرقہ بندی پر باپو

سمپادک—شری شریکرشن داس

اس پستک میں سن 1921 سے سن 1948 تک
گاندھی جی نے سامپردائیکتا کے سوال پر جو کچھ کہا یا
لکھا وہ سب آپکو ایک جگہ ملےگا.

بھارت کے آزاد ہونے پر یہ اور بھی ضروری ہو گیا ہے کہ
ہر بھارتی کسی سامپردائیکتا کے نقصان کو سمجھے اور
اس زہر کو اپنے اندر سے صاف کرے.

سندر جلد. اچھا کارپ. دو سو صفحے. قیمت
دو روپے.

ونوبا کا سندیش

لکھک—سوریش رامभाई

ایک شبد—مہاتما بگواندین

ونوبا جی کے بھودان یجن سے آج سارا دیس واقف ہے.
اس چھوٹی سی کتاب میں آپکو ملےگا کہ یہ بھودان یجن
کب اور کسے شروع ہوا اور اس کا مقصد کیا ہے.

پہلا ایڈیشن ہاتھوں ہاتھ نکل گیا. یہ دوسرا ایڈیشن
ہے. صفحے 25، دام بکول دو آنے.

میلنگ کا پتہ—

مینیجر، 'نیا ہند'، 145، مٹھی گنج، ایلہ آباد.

ہیں جسکی ایک راہبانی ناگپور ہو اور دوسری بمبئی۔ ہمارا تو خیال تھا کہ سرورہے سماج جب ہندوستان میں کرایم ہوگا تو نہ بمبئی رہے گا نہ ناگپور، نہ نہ دیکھی، نہ کھنکھ، نہ کھنکھتا، نہ مہاراشٹر، بڑے بڑے اور گاہے بڑے شہر ختم ہو جائیں گے۔ ہمارا یہ خیال اب بھی ہے۔ لیکن اسی شکر راہ جی کو اپنی راہ دینے کا پورا ہر ہے اور اس راہ میں دوسروں کو بھی شریک کرنے کا پورا ہر ہے۔ اس طرح ہر کا الگ صوبہ بنے اور بمبئی کا الگ، ان کے لئے شری برج لال جی بھائی اور شری ایس۔ کے۔ پاتل صاحب کو بھی فہم کرنے کا پورا ہر ہے۔ ہماری گذارش ہے کہ اس بھائی کے سوال پر تھلکے دل سے جواب دے کر دیا جاتا چاہئے اور جتنے چاہے یا خیال اس مسئلے پر انہیں ان کا ملحق ہونا چاہئے۔ دیکھیں وہ کہ ہم ملحق چاہتے ہیں، دیکھیں نہیں۔ ملحق سے مکھن پیدا ہوتا ہے اور دیکھیں آگ۔ لیکن ہم یہ بھی چاہتے ہیں کہ ہندوستان کے نئے نقشہ کے بارے میں جو بھی فیصلے ہوں وہ کسرت رائے یا مہاراشٹری ونگ سے نہ ہو کر سب کی مشترکہ یعنی ایک رائے سے ہوں۔

ایک مرضی اور ہے۔ آخر یہ صوبوں کے بلنے بدلنے کا تماشہ کیا ہے، اس کے لئے انہی بدگمانیاں پھیلنا یا واپس مچنا ہماری سمجھ میں نہیں آتا۔ کیا ہم ایک ہی ہندوستان کی میٹھی کی پھاوار نہیں ہیں؟ اگر ہمارا ہندوستان جیتا ہے تو ہم سے کون مر رہا ہے اور اگر ہندوستان ختم ہوتا ہے تو ہم سے کون جیتا ہے؟ اسلیئے یونیورسٹی مسالہ یہ ہے کہ ہندوستان کرایم رہے اور یہاں پر کوئی بھی ننگا بھکا نہ رہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ہمارے غریب بھائی اپنی غریبی چھوڑیں، غریب بھائی اپنی غریبی چھوڑیں، باہر لوگ اپنی باہر گوری چھوڑیں، ہم اپنی اپنی ہستی میٹا دیں اور سب ملکر ایسا سموس یا ایک دس سماج بنائیں جس کا ذرہ ذرہ ہمارا آکھلے ہو۔

23. 5. '54

سورہرام بائی

—سورہرام بھائی

23. 5. '54

کی یہ بھی یو. پی. کے کچھ مینسٹروں اور خاص کر
 ایک مینسٹر صاحب اور ان کے ہم خیالوں کو پسند نہیں آئی اور انکی ناراضگی کے قہر
 سے کچھ لوگوں نے اوپر والے ممبرانہم سے اپنی دستخط
 واپس بھی لے لیئے۔ ہم پھر عرض کر دیں کہ ہمارے ہمارے
 معلوم کہ اس کے پیچھے سچائی کو یا کہا راز ہے ؟
 لیکن جب ہم نے پختہ کووند بلوہ پختہ کی ایک اسٹیج
 کی رپورٹ سنی تو حیرت ہوئی کہ ان کے جیسا اونچا
 تجربہ کار اور دانشمند سیاست دان کس طرح ایسی باتوں
 کو کہتا ہے۔ یہ کہا جاتا ہے کہ پختہ جی نے فرمایا کہ
 اگر پر دیکھیں رام اور کرشن کا، لکھا و جیسا کا پر دیکھیں ہے اور
 کسی صورت سے بھی اسے تقسیم نہیں کیا جا سکتا۔
 پختہ پختہ کو بھی اور حکامی طور پر اپنی رائے دینے کا
 پورا حق ہے۔ لیکن ان کے ان لفظوں میں ایک کرسی ایک
 ہونگہمت اور ایک قانت ایسی نظر آتی ہے جو ان
 کے جیسے مری اور اصلی ہستی کو شوبھا نہیں دیتی۔
 ہم اس وقت ہندوستان کے نئے نقشہ کے بلوہ پر اپنی
 کوئی رائے نہیں دے رہے ہیں اور نہ اسے بزرگ چیف
 مینسٹر کی بات کا ہی جواب دینا چاہتے ہیں۔ لیکن
 کہا پچھلے سو برس کا اتھاس یہ نہیں بتانا کہ یوپی کا
 ہوئی پتا—رام اور کرشن، لکھا اور جیسا، ہندی اور اردو
 ہندو اور مسلمان، علیحدہ اور ہمارے، ہندی اور تہلخ
 لہگ اور مہامہا، الہ آباد اور لکھنؤ، وغیرہ وغیرہ زندگی
 کے مانو ہر ممکنہ میں دو بھائی رہا ہے۔ ہندوستان
 کی سیاست کو بگاڑنے کا اور اس ملک کے دل کے دو ٹکڑے
 کر دینے کا—پھر یہ ہی کوئی قدرتی اکائی بھی نہیں ہے
 بلکہ ایک بدلتی گول گھا سا ہے جسے انگریزوں نے اپنی مرضی
 اور قابلیت کے مطابق یہ آج کے جیسے بدنام اور فہل پاؤں
 کی سی شکل دے ڈالی۔ اس صوبہ کے جغرافیہ کو دیکھ
 کر کوئی بھی اس کے ہلانے والوں کو داہ نہیں دے سکتا۔
 لیکن اگر پختہ پختہ کو یہ چھو پسند آتی ہے تو وہ
 انہیں مہارکا، ہزار ہا، ہارک۔ مگر اس کے یہ معنی تو
 نہیں ہوتے کہ ان کے آگے کسی کی نہ چلے اور ان کی بات
 پتھر کی لکھ مانی جائے۔ ہمیں یقین ہے کہ پختہ جی
 جیسے قماربازی یا لوگ شاعی کے پجاری کو خود یہ
 بات مصلحت نہیں محسوس ہوئی اور وہ ہر خیال کی
 قدر کرے اور اس خیال کے باہر نکلنے کا ہر ممکن
 موقع ہر کسی کو اپنی ذاتی اور حکمی، دونوں طرفوں
 سے دیں گے۔

ایک طرف جہاں پختہ پختہ ہو ہی کو بھی ہی رہا
 دیکھ پر اصرار کرتے ہیں، دوسری طرف کانگریس اور
 ممبرانہم کے سابق ممبرانہم، ہندی ہندی، ہندی ہندی، ہندی ہندی،
 مولائی بھائی بھائی، لیکن کا ایک ہوا اور ہاندرا صوبہ چاہتے

ایک طرف جہاں پختہ پختہ ہو ہی کو بھی ہی رہا
 دیکھ پر اصرار کرتے ہیں، دوسری طرف کانگریس اور
 ممبرانہم کے سابق ممبرانہم، ہندی ہندی، ہندی ہندی، ہندی ہندی،
 مولائی بھائی بھائی، لیکن کا ایک ہوا اور ہاندرا صوبہ چاہتے

سنتوہ ہو، اُپمہ کی ہندوستان کے ناکرو کا موٹاپن کامپس نے شکر سے ہی مہسوس کر لیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ 1920 کے قریب جب کامپس کا سنگٹن ملک کے کوئے کوئے میں پہلا تو کانگریسی صوبوں اور سرکاری صوبوں میں کافی فرق ہو گیا۔ کانگریس کا اصرار تھا کہ صوبہ بھاشا یا بولی کی بنا پر قائم کیا جائے اور ملک کی بھائی و خدانت کے ساتھ ساتھ اس صوبہ کے رہنے والوں کی خواہشوں کا پورا خیال رکھا جائے۔

اُپمہ کی راہ کی ویدائی کے باء باشاوار سوبوں کی مانگ قدرتی طور پر زور پکڑنے لگی۔ لیکن بھارت کا جو تھا وہاں ہذا اس میں قریب قریب وہی صوبہ (خاص کر Part A والے) رکھے گئے جو اُپمہ کی خواہش تھی۔ لہذا چلتا میں اسلئے وہاں اور بھاشا کے سوال کو لیکر جبکہ جبکہ شور فل مچایا جائے گا۔ زیادہ بلند آواز دہن سے اور خاص طور پر آندہ سے اتنی۔ آندہ کے لوگ جان تک قربان کرنے کو تیار ہو گئے اور ایک پاک ہستی کی شہادت کے بعد آخر آندہ کا تھا صوبہ مدراس نے پرانے صوبہ میں سے کانگریس دیا تھا۔ آندہ کا ہلکا تھا کہ دوسرے بھاشا والے بھی آئے سے باہر ہوئے تھے۔ نئی دلی کی حکومت پریشان ہو گئی کہونکہ خود اس حکومت کی پارٹی والے یعنی کانگریس کے لوگ بھی اس کھلم میں پورے جوش کے ساتھ حصہ لیتے تھے۔ معاملہ کو زیادہ بگڑنا نہ ہو کر حکومت نے بھاشائی کمیشن نام سے تین آدمیوں کا ایک بورڈ قائم کر دیا اور اس کے سرور یہ نام کیا کہ ملک بھر کا دورہ کرے، مختلف جماعتوں اور لوگوں سے ملکر انکی رائے اس سوال پر لے اور پھر ہر پہلو سے اس پر غور کرنے کے بعد ہندوستان کے نئے نقشہ کے متعلق اپنی سفارشی سرکار کو پیش کرے۔

اس کمیشن کو پہلے قریب تین ماہ ہو چکے تھے اور آجکل یہ ملک کا دورہ کر رہا ہے۔ جبکہ جبکہ یہ لوگوں سے ملتا ہے اور لوگ بھی اپنے سچے سچے مہمورندم کی شکل میں اس آگے دے رہے ہیں۔ خاموشی اور احتیاط کے ساتھ یہ کمیشن کام کر رہا ہے۔ حال ہی میں اُپمہ کی خواہش کے کچھ اثر دار لوگوں نے بھی اپنا ایک مہمورندم اس نے آگے پیش کیا جس میں شاید یہ خواہش ظاہر کی گئی کہ پچھلی اُپمہ کی خواہش کو روہلکھلڈ یا مہرٹھ اور اکثر کمیشنوں کو دہلی و پنجاب کے کچھ مشرقی ضلعوں کو ملا کر ایک تھا صوبہ کھوا گیا جائے۔ اس میں یہ بھی اصرار ہے کہ یہی بہت سے مہمورن کے دستخط تھے۔ ہمیں نہیں معلوم کہ آندہ ہی آندہ تھا والے ہوئے مگر اخباروں سے پتہ چلتا ہے کہ یہ چھ

اُپمہ کی راہ کی ویدائی کے باء باشاوار سوبوں کی مانگ قدرتی طور پر زور پکڑنے لگی۔ لیکن بھارت کا جو تھا وہاں ہذا اس میں قریب قریب وہی صوبہ (خاص کر Part A والے) رکھے گئے جو اُپمہ کی خواہش تھی۔ لہذا چلتا میں اسلئے وہاں اور بھاشا کے سوال کو لیکر جبکہ جبکہ شور فل مچایا جائے گا۔ زیادہ بلند آواز دہن سے اور خاص طور پر آندہ سے اتنی۔ آندہ کے لوگ جان تک قربان کرنے کو تیار ہو گئے اور ایک پاک ہستی کی شہادت کے بعد آخر آندہ کا تھا صوبہ مدراس نے پرانے صوبہ میں سے کانگریس دیا تھا۔ آندہ کا ہلکا تھا کہ دوسرے بھاشا والے بھی آئے سے باہر ہوئے تھے۔ نئی دلی کی حکومت پریشان ہو گئی کہونکہ خود اس حکومت کی پارٹی والے یعنی کانگریس کے لوگ بھی اس کھلم میں پورے جوش کے ساتھ حصہ لیتے تھے۔ معاملہ کو زیادہ بگڑنا نہ ہو کر حکومت نے بھاشائی کمیشن نام سے تین آدمیوں کا ایک بورڈ قائم کر دیا اور اس کے سرور یہ نام کیا کہ ملک بھر کا دورہ کرے، مختلف جماعتوں اور لوگوں سے ملکر انکی رائے اس سوال پر لے اور پھر ہر پہلو سے اس پر غور کرنے کے بعد ہندوستان کے نئے نقشہ کے متعلق اپنی سفارشی سرکار کو پیش کرے۔

اس کمیشن کو پہلے قریب تین ماہ ہو چکے تھے اور آجکل یہ ملک کا دورہ کر رہا ہے۔ جبکہ جبکہ یہ لوگوں سے ملتا ہے اور لوگ بھی اپنے سچے سچے مہمورندم کی شکل میں اس آگے دے رہے ہیں۔ خاموشی اور احتیاط کے ساتھ یہ کمیشن کام کر رہا ہے۔ حال ہی میں اُپمہ کی خواہش کے کچھ اثر دار لوگوں نے بھی اپنا ایک مہمورندم اس نے آگے پیش کیا جس میں شاید یہ خواہش ظاہر کی گئی کہ پچھلی اُپمہ کی خواہش کو روہلکھلڈ یا مہرٹھ اور اکثر کمیشنوں کو دہلی و پنجاب کے کچھ مشرقی ضلعوں کو ملا کر ایک تھا صوبہ کھوا گیا جائے۔ اس میں یہ بھی اصرار ہے کہ یہی بہت سے مہمورن کے دستخط تھے۔ ہمیں نہیں معلوم کہ آندہ ہی آندہ تھا والے ہوئے مگر اخباروں سے پتہ چلتا ہے کہ یہ چھ

اُپمہ کی راہ کی ویدائی کے باء باشاوار سوبوں کی مانگ قدرتی طور پر زور پکڑنے لگی۔ لیکن بھارت کا جو تھا وہاں ہذا اس میں قریب قریب وہی صوبہ (خاص کر Part A والے) رکھے گئے جو اُپمہ کی خواہش تھی۔ لہذا چلتا میں اسلئے وہاں اور بھاشا کے سوال کو لیکر جبکہ جبکہ شور فل مچایا جائے گا۔ زیادہ بلند آواز دہن سے اور خاص طور پر آندہ سے اتنی۔ آندہ کے لوگ جان تک قربان کرنے کو تیار ہو گئے اور ایک پاک ہستی کی شہادت کے بعد آخر آندہ کا تھا صوبہ مدراس نے پرانے صوبہ میں سے کانگریس دیا تھا۔ آندہ کا ہلکا تھا کہ دوسرے بھاشا والے بھی آئے سے باہر ہوئے تھے۔ نئی دلی کی حکومت پریشان ہو گئی کہونکہ خود اس حکومت کی پارٹی والے یعنی کانگریس کے لوگ بھی اس کھلم میں پورے جوش کے ساتھ حصہ لیتے تھے۔ معاملہ کو زیادہ بگڑنا نہ ہو کر حکومت نے بھاشائی کمیشن نام سے تین آدمیوں کا ایک بورڈ قائم کر دیا اور اس کے سرور یہ نام کیا کہ ملک بھر کا دورہ کرے، مختلف جماعتوں اور لوگوں سے ملکر انکی رائے اس سوال پر لے اور پھر ہر پہلو سے اس پر غور کرنے کے بعد ہندوستان کے نئے نقشہ کے متعلق اپنی سفارشی سرکار کو پیش کرے۔

ملازمین میں ہونے لگی ایک بڑی وجہ V. I. P. کمپنی کا قیام کرنا تھا اور اگر یہ کمپنی نہ ہوتا تو شاید وہ حادثہ نہ رونق پڑتا۔ گھانا سمیتلین سے پہلے کبھی کسی سمیتلین میں یہ چیز نہیں ہوئی۔ یہ ضروری ہے کہ آگے سمیتلین میں سرکار سے کم سے کم مدد لی جائے اور سارا ہوجہ اس صورت پر ضائع کی بیہودان کمیٹی (جہاں سمیتلین ہو) ہر دانشمندی کرے اور اس علاقہ کی جنگ کا زیادہ سے زیادہ سہولت حاصل کیا جائے۔

ہمارے پریمی ہاتھک شاید یہ جانتے ہوں کہ ونوہاچی نے بھودان یکمہ اندولن کو گوتم بدھ کا نام بتایا ہے اور اسے دھرم چکر پر بیروٹی کہا ہے۔ یہ لفظ انہوں نے پہلی بار 9 مئی 1952 کو ہمدہ جھلتی کے دن لکھنؤ میں کہہ کر سنایا تھا۔ اس نے یہ ثابت کر دیا کہ ونوہاچی کا یہ کہنا مانو زمانے کی ہی آواز ہے۔ اس سہولتی نے یہ دہا دیا کہ ہندوستان کی نوبت کا اخلاقی مطالعہ کے سوتے ابھی جاتدار ہیں اور سہج زور پکڑ سکتے ہیں۔ اس سے یہ بھی پتہ چل گیا کہ ایک نوبت اور پاک نام کے لئے ملک کے نوجوان قربانی کے لئے آج بھی تیار ہیں۔ اس سے یہ بھی ظاہر ہو گیا کہ ہندوستان کو آئندہ ہل میں گھرا رہے ہیں اور اس ہل کے ذریعہ دنیا کے دوسرے سہمی 'خوفناک سے خوفناک' ہلوں کا مقابلہ کیا جاسکتا ہے۔ اور سب سے خاص بات یہ نکلی کہ بھگوان بدھ کی روشو آتما نراکار روپ میں اشارہ کر رہی ہے کہ بھر کی جگہ مصہبت، قصہ کی جگہ شانتی اور جھوٹ کی جگہ سچ پر چلے بنا انسان اس دھرتی پر اب سہمی سلامت زندہ نہیں رہ سکتا۔

22.5.'54

ہندستان کے نئے نقشہ کی تیاری

پلاسی کی لوائی کے بعد سے انگریز لوگ ہندستان کے تھوڑے تھوڑے حصہ کو فتح کرتے گئے اور اپنا راج کھڑا کرتے گئے۔ اپنی سہولیت اور پلاسی کے مطابق انہوں نے سوچے قابض کر دیئے۔ اسی بات کا کوئی لٹھلا نہیں رکھا کہ اس سوچے میں کوئی لوگ دھتے ہیں، انکی آپس کی بولی کہا ہے، 'انکا دھن سہن'، کہاں پان کس قہنگ کا ہے' ان کے خیال کہا ہیں، 'دھیرہ دھیرہ'۔ نتیجہ یہ ہوا کہ انہوں نے ایسے ایسے بے لگے سوچے پلا قائم جن پر خود انگریز کو بھی فہم آتی تھی اور دھیرے دھیرے انہوں نے ضوہوں کو توڑ کر نئے نئے سوچے بنائے شروع کر دیئے۔ لیکن اب آخری ہم تک ہندستان کے نقشہ کو وہ ایسی کوئی صفحہ شکل نہ دے سکے جس پر انہوں نے ناز ہو یا چلتا ہو

54

کہا کہ اس میں کئی نوجوان آئیں گے۔ اسی وقت 500
 سے لہجہ خط آئے جن میں صدر کے اسماء پر چھ پرکاش بابو
 نے پڑھ کر سنا لیا۔ اسی طرح دوسرے دن کا آدھا وقت
 اسی نام میں لگا۔

سمٹلی کی آخری ہولٹک تیسرے پھر کو ہوئی ۔
اس میں پہلے تو پچھلے دن کی وہاٹوار ہولٹکوں کی
کارروائی کا نچھڑو سنا یا گیا ۔ پھر سمٹلی کا خاص تھراؤ—
اور ایک ہی تھراؤ—دوسوا ملنگ کے ملٹری سٹیٹسٹک
ڈاؤ جی دیو نے دکھا ۔ اس تھراؤ میں کہا گیا کہ کسی نہ
کسی طرح زمین کا اٹکوا پورا کرنا ہمارا مقصد نہیں ہے۔ آج
چاندان اور مالکی کے بارے میں جو خیال سماج پر حاوی
ہے اسے ہم جو مول سے بدلنا چاہتے ہیں ۔ اس معنی
میں بھوجی دان ہمارے آرتھک انقلاب کا پہلا قدم ہے ۔
ہمیں اُسود ہے اور یقین ہے کہ سماج میں نئے پیمانے قائم
کرنے کی تمنا رکھنے والے سبھی بھائی بہن اس انقلابی اور
چاندروشی کے تجربہ کے لئے اپنا جھون دان دیملنگ اور
اسے جلدی ہی کامیاب بنانے میں اپنے آپ کو کھپا دیملنگ۔

تھوڑا دیر ہی کرتے کے بعد سری شنگر راؤ کی تقریر ہوئی جس میں انہوں نے کہا کہ ہونہ کیا سہیلان کا سندیہ ہی ہے کہ جہوں ہی ایک پگھ ہے ۔ اس پہچ قانتہ راجندر پرشاد ہی آ گئے تھے ۔ شنگر راؤ جی کے بعد ان کا بھائی ہوا جس میں انہوں نے پچھلے تین سال میں ہونہ پگھ کے کارن میں جو جاگرتی ہوا ہوئی ہے اس پر سندھو شاعر کہا ۔ انہوں نے پگھ دنکایا کے اہم طرح کی مضبوط ہندوؤں پر چر ہوا دتہ ہلے کا رتا خود کمال اور ہائے دار ہوا ۔

اب سہلی کا آخری پروگرام۔ سلامت ونوبا کا پروچہ۔
 انہوں نے آچاریہ کرپانی کی سی ہوئی چھٹاوتی پر سب کا
 دھیان کھینچا اور کہا کہ جہوں دان کرنے ے سہلی میں
 جہوں سہلی کا فیصلہ۔ پھر انہوں نے کہا کہ میں 'دھرم'
 اور 'پرہم دھرم' میں تھوڑی چاہئے۔ دھرم اچھا ہوتا
 ہوئے بھی پرہم دھرم میں لگتا چاہئے۔ انہوں نے آچاریہ
 کرپانی کی اس بات پر بھی وضاحتی طائر کی کہ
 راجسہلی اپنے قابو میں ہوئی چاہئے اور موجودہ سہلی
 نظام کو بدلنا چاہئے۔ مگر 'ونوبا جی بولے' میں کہتا
 ہوں کہ طائفہ مہرے ہاتھ میں لہئے کی کوئی ضرورت
 نہیں ہے، طائفہ مہرے کہتے میں رہے تو کافی ہے۔ پھر
 ہاتھ میں طائفہ لہئے کی تکلیف اٹھانے کی ضرورت
 نہیں ہے۔ اس طرح طائفہ کے باور رہ کر ہی لکر طائفہ
 پر اندھکار کر سکتے ہیں تو طائفہ ہاتھ میں
 لہئے کا سلکت کوں اٹھائے گا۔ اس لئے جو انقلاب
 یا راج کرانتی ہم چاہتے ہیں وہ بنا تکلیف کے
 لیسے ہی ہوگی۔ ہم چاہتے ہیں کہ کرپانی

دھڑے کا جیون سندر و پاک بنے گا اور نئے نئے کارکن بھی اُنہیں ملینگے۔ بالآخر میں دینوبہا جی نے دھڑا کی کہ ہم سب جیہکاش باپ کی طرح ہمارے کے ساتھ ہوں۔

ان دنوں تقریبوں سے سمیلن میں نئی جان آگئی۔ وہاں کی ہوا میں ہی مانو فرق آگیا۔ اس دن پر اوتھلا کے بعد آجاریہ کرپانی کی اسوجھ ہوئی۔ انہوں نے کہا کہ صرف پانچ کروڑ ایکو زمین جمع کرنے اور ہانت دینے سے کام نہیں چلے والا ہے، راجستھ کو بھی ایلانا ہوا یا اچے قابو میں کرنا ہوا، ایسی جدتوں انہوں نے دی۔ ہری جہ پرکاش کے فیصلہ کی تعریف کرتے ہوئے وہ بولے کہ مجھے یہی لالچ ہوا مگر میں نے کہا کہ ہرولہسر ہرے اندر قصہ ہے، سول ہے، انکو ختم کرنا چاہیے کہونکہ دان اچھی چوڑا کا ہی ہو سکتا ہے۔ ایسا قدم اٹھانے کے پہلے ہم کو ایسی من مقام، اسلکھن دھڑا متا دینا چاہیے۔

دوسرے دن 20 اپریل کو وہ ہو گیا جسکا کہی لسان بھی نہیں ہو سکتا تھا۔ مجمع کے وقت دینوبہا جی نے ہری جہ پرکاش کو ایک خط بھیجا۔ وہ یہ تھا :—

”ہری جہ پرکاش“

کل آپ نے جو آواہن کیا تھا اس کے جواب میں ہرودان پگھہ مولک، ادھوک پردھان اہلساتھک کرانتی کے لئے مہرا جھون سمریت ہے۔

—دینوبہا—

اس خط کو پانچ کون دنگ نہیں رہ جائیگا اور کون صحت کرے گا کہ اسے آپ پاس رکھے؟ جہ پرکاش باپ نے سمیلن کی صدر آٹھا ہیں کو ایک چٹھی لکھی—

”بابا کا ایک پتر آیا ہے جو ساتھ بھیج دیا میں۔ چلوں نے ہم سب کو ہریرت کہا ہے وہی مجھے جیسے ناچھوڑ کر جھون دان کریں، اس پر کچھ کہا نہیں جاتا۔ اتنا ہی کہونگا کہ اس اصول دان کو جو پیکر کر سکوں اس کے ایک دم ناقابل ہوں۔ ہمیں تو جھون دان ہوکوان کے نام پر بابا کو ہی کرنا ہے۔“

آٹھا ہیں نے یہ دنوں خط سمیلن میں پوہکر سنا۔ پھر کہا تھا۔ مانو جھون دان کی لکھا یہ نکلی۔ ہرے کلمے سے آٹھا ہیں نے کہا کہ مہرا پورا جھون اس نام کے لوگ سمریت ہے۔ پھر ڈوڈ اسوہکر پر ہری دھوریلندر بھائی آئے۔ انہوں نے کہا کہ کچھ گہراہمت کے ساتھ میں بھی اپنا جھون دان کرتا ہوں۔ گہراہمت اس لئے کہ جھون دان کا مطلب یہ نہیں ہے کہ زمین مانگنے کا کام کڑی سے چلوکا بلکہ یہ کہ ہم سماج میں نئے تصانی پھیلانے قائم کریں گے۔ انہوں نے یہی ہمار

”ہری جہ پرکاش۔“

کلیت آپنے جو آواہن کیا تھا اس کے جواب میں ہرودان پگھہ مولک و دھون پر دھان اہلساتھک کرانتی کے لئے مہرا جھون سمریت ہے۔

—دینوبہا—

اس خط کو پا کر کون دنگ نہیں رہ جائیگا اور کون دھمت کرے گا کہ اسے اپنے پاس رکھے؟ جیہکاش باپ نے سمیلن کی صدر آٹھا بھن کو ایک چٹھی لکھی—

”بابا کا ایک پتر آیا ہے جو ساتھ بھیج دیا ہے۔ جیہکاش نے ہم سب کو پریرت کیا ہے وہی سیکر جیسے نپیش کو جیون دان کرے، اس پر کچھ کہا نہیں جاتا۔ اتنا ہی کہونگا کہ اس اصول دان کو جو پیکر کر سکوں اس کے ایک دم ناقابل ہوں۔ ہمیں تو جھون دان ہوکوان کے نام پر بابا کو ہی کرنا ہے۔“

آٹھا ہیں نے یہ دنوں خط سمیلن میں پوہکر سنا۔ پھر کہا تھا۔ مانو جیون دان کی گنگا بھ نیکلی۔ سرے گلے سے آٹھا بھن نے کہا کہ مہرا پورا جھون اس نام کے لوگ سمریت ہے۔ پھر ڈوڈ اسوہکر پر ہری دھوریلندر بھائی آئے۔ انہوں نے کہا کہ کچھ گہراہمت کے ساتھ میں بھی اپنا جھون دان کرتا ہوں۔ گہراہمت اس لئے کہ جھون دان کا مطلب یہ نہیں ہے کہ زمین مانگنے کا کام کڑی سے چلوکا بلکہ یہ کہ ہم سماج میں نئے تصانی پھیلانے قائم کریں گے۔ انہوں نے یہی ہمار

کھانا ہے کہ کچھ کمونسٹس بھائی بھی موجود تھے مگر انہوں نے کوئی نمایاں حصہ نہ لیا۔ سہیلی کی صدارت سرکاری آفا دیوی آرہے نایم کے کی۔

اپنی پہلی تقریر میں جو تاریخ 18 کو سپر کے وقت ہوئی ونوبا جی نے پلڈت نہرو کے آگے مانو یہ چند سوال بھی کرے :

1—کچھ ملکر کام کرنے کے لیے آفیس چاہئے ہی، کچھ مایوسا ہینڈستان میں جو بےشمار بےد ہزار ہیں وہ کافی آت نہیں ہیں؟ چلاؤ کے کارن جانی بھد مضبوط ہو رہے ہیں۔ سمجھدار لوگوں کو سوچنا چاہئے کہ اس میں کیا کرم کی جائے۔

2—پچھلے تین برس میں ملک کے اندر ایک نئی ہوا تھار ہوئی ہے جس کے اندر زمین کی مالکی کسی ایک شخص کی نہیں ہو سکتی۔ اس لئے ضروری ہے کہ جو ہوں طاقت ہو، چاہے دولت کی شکل میں، چاہے کسی شکل میں، اسکا اپہوک سب کے لئے ہونا چاہئے۔ جو بھی زمین پر مکتبت کرنے کی تھاری رکھتا ہے اسے زمین ملی ہی چاہئے جیسے کہ پورے کو ہائی۔

3—جس طرح انگلینڈ میں ہر کسی کو ٹھہرا و ہولنگ آتا ہے اسی طرح ہندستان میں ہر کسی کو سوت کاتا آنا چاہئے۔ یہ سوال بعض آرٹک و ساجک ہی نہیں بلکہ دیس کی رکشا کا سوال ہے۔

پلڈت جواہر لال نے اپنے طریقہ سے جواب دیتے ہوئے کہا کہ ہمارے سامنے دراصل 36 کروڑ سوال ہیں۔ انہوں نے اقرار کیا کہ جات پات بڑ رہی ہے مگر چلاؤ کا ایک پچھلے سوال ہے جس کا واسطہ دیمان ہے۔ زمین کے مسئلہ پر انہوں نے کہا کہ بھودان یگہ کا طریقہ گندھی جی کے جیسا ایک عجیب و غریب طریقہ ہے۔ لیکن اگر سرکار اس میں پڑتی ہے تو اس کا رتب بدل جانے کا قہر ہے کیونکہ سرکار کا ہاتھ ڈرا بھاری پڑتا ہے اور کٹائی کے بارے میں وہ بڑے کہ ضرور اس سے عریضوں کو مدد پہونچتی ہے۔ لیکن آج کے زمانہ میں سائلس کی کھوجوں کو بھی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔

پلڈت جواہر لال کے بعد ڈانٹر راندھا کرشنن نے کہا کہ بھودان سے اس ملک کے دیہاتوں میں انقلاب آئے گا اور ساتھ ہی ساتھ اس کی چھوڑھوت و بھوت بھوا دور ہونگے۔ انہوں نے بتایا کہ آسج نہج یا چھوڑھوت کے فرق رکھنے کے معنی ہیں انسان کی شان ومان مرہادا پر چوک کرنا جو ایک پاپ ہے اور کسی دھرم میں جائز نہیں کیا گیا ہے۔ دھرم وہی ہے جو سماج کو جوڑتا ہے اور ادھرم وہ جو اس کے ٹکڑے کرے۔

پلڈت جواہر لال نے اپنے طریقہ سے جواب دیتے ہوئے کہا کہ ہمارے سامنے دراصل 36 کروڑ سوال ہیں۔ انہوں نے اقرار کیا کہ جات پات بڑ رہی ہے مگر چلاؤ کا ایک پچھلے سوال ہے جس کا واسطہ دیمان ہے۔ زمین کے مسئلہ پر انہوں نے کہا کہ بھودان یگہ کا طریقہ گندھی جی کے جیسا ایک عجیب و غریب طریقہ ہے۔ لیکن اگر سرکار اس میں پڑتی ہے تو اس کا رتب بدل جانے کا قہر ہے کیونکہ سرکار کا ہاتھ ڈرا بھاری پڑتا ہے اور کٹائی کے بارے میں وہ بڑے کہ ضرور اس سے عریضوں کو مدد پہونچتی ہے۔ لیکن آج کے زمانہ میں سائلس کی کھوجوں کو بھی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔

پلڈت جواہر لال نے اپنے طریقہ سے جواب دیتے ہوئے کہا کہ ہمارے سامنے دراصل 36 کروڑ سوال ہیں۔ انہوں نے اقرار کیا کہ جات پات بڑ رہی ہے مگر چلاؤ کا ایک پچھلے سوال ہے جس کا واسطہ دیمان ہے۔ زمین کے مسئلہ پر انہوں نے کہا کہ بھودان یگہ کا طریقہ گندھی جی کے جیسا ایک عجیب و غریب طریقہ ہے۔ لیکن اگر سرکار اس میں پڑتی ہے تو اس کا رتب بدل جانے کا قہر ہے کیونکہ سرکار کا ہاتھ ڈرا بھاری پڑتا ہے اور کٹائی کے بارے میں وہ بڑے کہ ضرور اس سے عریضوں کو مدد پہونچتی ہے۔ لیکن آج کے زمانہ میں سائلس کی کھوجوں کو بھی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔

پلڈت جواہر لال نے اپنے طریقہ سے جواب دیتے ہوئے کہا کہ ہمارے سامنے دراصل 36 کروڑ سوال ہیں۔ انہوں نے اقرار کیا کہ جات پات بڑ رہی ہے مگر چلاؤ کا ایک پچھلے سوال ہے جس کا واسطہ دیمان ہے۔ زمین کے مسئلہ پر انہوں نے کہا کہ بھودان یگہ کا طریقہ گندھی جی کے جیسا ایک عجیب و غریب طریقہ ہے۔ لیکن اگر سرکار اس میں پڑتی ہے تو اس کا رتب بدل جانے کا قہر ہے کیونکہ سرکار کا ہاتھ ڈرا بھاری پڑتا ہے اور کٹائی کے بارے میں وہ بڑے کہ ضرور اس سے عریضوں کو مدد پہونچتی ہے۔ لیکن آج کے زمانہ میں سائلس کی کھوجوں کو بھی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔

پلڈت جواہر لال نے اپنے طریقہ سے جواب دیتے ہوئے کہا کہ ہمارے سامنے دراصل 36 کروڑ سوال ہیں۔ انہوں نے اقرار کیا کہ جات پات بڑ رہی ہے مگر چلاؤ کا ایک پچھلے سوال ہے جس کا واسطہ دیمان ہے۔ زمین کے مسئلہ پر انہوں نے کہا کہ بھودان یگہ کا طریقہ گندھی جی کے جیسا ایک عجیب و غریب طریقہ ہے۔ لیکن اگر سرکار اس میں پڑتی ہے تو اس کا رتب بدل جانے کا قہر ہے کیونکہ سرکار کا ہاتھ ڈرا بھاری پڑتا ہے اور کٹائی کے بارے میں وہ بڑے کہ ضرور اس سے عریضوں کو مدد پہونچتی ہے۔ لیکن آج کے زمانہ میں سائلس کی کھوجوں کو بھی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔

پلڈت جواہر لال نے اپنے طریقہ سے جواب دیتے ہوئے کہا کہ ہمارے سامنے دراصل 36 کروڑ سوال ہیں۔ انہوں نے اقرار کیا کہ جات پات بڑ رہی ہے مگر چلاؤ کا ایک پچھلے سوال ہے جس کا واسطہ دیمان ہے۔ زمین کے مسئلہ پر انہوں نے کہا کہ بھودان یگہ کا طریقہ گندھی جی کے جیسا ایک عجیب و غریب طریقہ ہے۔ لیکن اگر سرکار اس میں پڑتی ہے تو اس کا رتب بدل جانے کا قہر ہے کیونکہ سرکار کا ہاتھ ڈرا بھاری پڑتا ہے اور کٹائی کے بارے میں وہ بڑے کہ ضرور اس سے عریضوں کو مدد پہونچتی ہے۔ لیکن آج کے زمانہ میں سائلس کی کھوجوں کو بھی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔

پلڈت جواہر لال نے اپنے طریقہ سے جواب دیتے ہوئے کہا کہ ہمارے سامنے دراصل 36 کروڑ سوال ہیں۔ انہوں نے اقرار کیا کہ جات پات بڑ رہی ہے مگر چلاؤ کا ایک پچھلے سوال ہے جس کا واسطہ دیمان ہے۔ زمین کے مسئلہ پر انہوں نے کہا کہ بھودان یگہ کا طریقہ گندھی جی کے جیسا ایک عجیب و غریب طریقہ ہے۔ لیکن اگر سرکار اس میں پڑتی ہے تو اس کا رتب بدل جانے کا قہر ہے کیونکہ سرکار کا ہاتھ ڈرا بھاری پڑتا ہے اور کٹائی کے بارے میں وہ بڑے کہ ضرور اس سے عریضوں کو مدد پہونچتی ہے۔ لیکن آج کے زمانہ میں سائلس کی کھوجوں کو بھی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔

پلڈت جواہر لال نے اپنے طریقہ سے جواب دیتے ہوئے کہا کہ ہمارے سامنے دراصل 36 کروڑ سوال ہیں۔ انہوں نے اقرار کیا کہ جات پات بڑ رہی ہے مگر چلاؤ کا ایک پچھلے سوال ہے جس کا واسطہ دیمان ہے۔ زمین کے مسئلہ پر انہوں نے کہا کہ بھودان یگہ کا طریقہ گندھی جی کے جیسا ایک عجیب و غریب طریقہ ہے۔ لیکن اگر سرکار اس میں پڑتی ہے تو اس کا رتب بدل جانے کا قہر ہے کیونکہ سرکار کا ہاتھ ڈرا بھاری پڑتا ہے اور کٹائی کے بارے میں وہ بڑے کہ ضرور اس سے عریضوں کو مدد پہونچتی ہے۔ لیکن آج کے زمانہ میں سائلس کی کھوجوں کو بھی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔

اس سیمٹی پر نظر قائم ہے پہلے پچھلے دو سیمٹوں پر کچھ تہوری سی روشنی ڈالنا ضروری ہے۔ بہودان تحریک کی ضرورت 18 اپریل سن 1951 کو ہوئی جب حیدرآباد ریاست کے تھلکانہ نام کے علاقے کے کوچہیلی گاؤں میں ونوبا جی کی 80 ایکڑ کی مانگ پر 100 ایکڑ زمین ملی۔ گریب ایک سال تک ونوبا جی اکیلم ہی اس تحریک کو چلاتے رہے اور جب لگ بھگ ایک لاکھ ایکڑ زمین انہیں مل گئی تو اپریل سن 1952 میں مہوا پوری (پٹنار) میں ہونے والے چوتھے سرورڈے سیمٹی میں سرورڈے سنگھ نے اس کام کو باضابطہ اپنایا اور سرورڈے سنگھوں نے یہ دن کہا کہ دو سال کے اندر کم سے کم 25 لاکھ ایکڑ زمین جمع کریں گے۔ اس کے بعد مارچ سن 1953 میں چاندل (بہار) میں ہونے والے پانچویں سیمٹی میں یہ چوتھا طائر کی لگی کہ بہودان یکم کا مقصد دیہات دیہات گرام راج قائم کرنا ہے جس کے لئے موجودہ حالت میں پھر بدل ضروری ہوگا، یعنی آج جو سیاسی و مالی طاقت و دولت ایک ایک جگہ جمع ہے اسکو بائٹ بائٹ کر گاؤں گاؤں پہنچانا ہوگا۔ ونوبا جی نے صاف صاف اعلان کیا کہ ہمیں آزاد چن سکتی (عوام کی طاقت)۔ چھپا کرلی ہوئی جو فوجی یا مذہبی شکتی کے خلاف ہوئی اور قانونی یا سرکاری شکتی سے علیحدہ ہوئی۔ اس دو سال کے اندر بہودان آندولن ملک کے اندر تیزی کے ساتھ پھیلا اور 2,37,022 داتاؤں سے 28,15,101 ایکڑ زمین حاصل ہوئی۔ اسکا مطلب ہے کہ سرجنپار کی پرنسپل سے سرورڈے سنگھ پرورا ہوا اور گریب دن کروڑوں لوگوں تک بہودان یکم کا سندھیں پہنچ گیا۔

ظاہر ہے کہ ہودہ کیا سیمٹی پر سرورڈے سراج کو اب آگے قدم رکھنا تھا اور ملک کے سامنے نئی تعمیر کا نقشہ کھینچ کرنا تھا۔ خوبی کی بات ہے کہ اس سیمٹی میں یہی کام ہوا اور فالتو تقریریں یا غیر ضروری ٹھہراؤ وغیرہ طبعی نہ ہوئے۔ اس سیمٹی میں پہلے دن تاریخ 18 کو پخت جواہر لال نہرو اور قائد راجندر سنگھ لہر شریعت کی۔ ان دونوں مہمانوں نے سیمٹی میں تقریر کی اور پھر شام کو پرلوتھما کے بعد ایک بڑے مجموعے کے سامنے بھی ونوبا جی کے پروجیکٹ کے بعد پخت جی کی اسٹیج ہوئی۔ تاریخ 19 کو آجادیہ کرپانی شریک ہوئے اور 20 تاریخ کو راجندر پتی، قائد راجندر، پرہاد۔ ان کے علاوہ کانگریس پارٹی کے بہت سے کارکن و منسٹر (مرکزی و صوبائی) ہادی شریف لاکھ چلوں نے مختلف چرچوں میں حصہ لیا اور اس طرح پرجا سوشلسٹ پارٹی کے نمائندوں نے بھی۔ ہمارا

ظاہر ہے کہ ہودہ کیا سیمٹی پر سرورڈے سراج کو اب آگے قدم رکھنا تھا اور ملک کے سامنے نئی تعمیر کا نقشہ کھینچ کرنا تھا۔ خوبی کی بات ہے کہ اس سیمٹی میں یہی کام ہوا اور فالتو تقریریں یا غیر ضروری ٹھہراؤ وغیرہ طبعی نہ ہوئے۔ اس سیمٹی میں پہلے دن تاریخ 18 کو پخت جواہر لال نہرو اور قائد راجندر سنگھ لہر شریعت کی۔ ان دونوں مہمانوں نے سیمٹی میں تقریر کی اور پھر شام کو پرلوتھما کے بعد ایک بڑے مجموعے کے سامنے بھی ونوبا جی کے پروجیکٹ کے بعد پخت جی کی اسٹیج ہوئی۔ تاریخ 19 کو آجادیہ کرپانی شریک ہوئے اور 20 تاریخ کو راجندر پتی، قائد راجندر، پرہاد۔ ان کے علاوہ کانگریس پارٹی کے بہت سے کارکن و منسٹر (مرکزی و صوبائی) ہادی شریف لاکھ چلوں نے مختلف چرچوں میں حصہ لیا اور اس طرح پرجا سوشلسٹ پارٹی کے نمائندوں نے بھی۔ ہمارا

ظاہر ہے کہ ہودہ کیا سیمٹی پر سرورڈے سراج کو اب آگے قدم رکھنا تھا اور ملک کے سامنے نئی تعمیر کا نقشہ کھینچ کرنا تھا۔ خوبی کی بات ہے کہ اس سیمٹی میں یہی کام ہوا اور فالتو تقریریں یا غیر ضروری ٹھہراؤ وغیرہ طبعی نہ ہوئے۔ اس سیمٹی میں پہلے دن تاریخ 18 کو پخت جواہر لال نہرو اور قائد راجندر سنگھ لہر شریعت کی۔ ان دونوں مہمانوں نے سیمٹی میں تقریر کی اور پھر شام کو پرلوتھما کے بعد ایک بڑے مجموعے کے سامنے بھی ونوبا جی کے پروجیکٹ کے بعد پخت جی کی اسٹیج ہوئی۔ تاریخ 19 کو آجادیہ کرپانی شریک ہوئے اور 20 تاریخ کو راجندر پتی، قائد راجندر، پرہاد۔ ان کے علاوہ کانگریس پارٹی کے بہت سے کارکن و منسٹر (مرکزی و صوبائی) ہادی شریف لاکھ چلوں نے مختلف چرچوں میں حصہ لیا اور اس طرح پرجا سوشلسٹ پارٹی کے نمائندوں نے بھی۔ ہمارا

کبھی بھی، کبھی کبھی پر بھی، ہندوستان کو نہ لگے دھما
چاہئے اور نہ اسکی لڑت میں ہریک ہونگے۔

نئی دہلی کے ناکارخانے میں ہماری جوسی طوطی
کی آواز ہوگئی سدا کی نہیں ہو سکتی۔ مگر ہم یہ کہنا
اپنا فرض سمجھتے ہیں کہ اگر "انڈیا لیگ" کا خیال
ہمارے فائینلس منسٹر کے دل میں گہر کر گیا ہے تو یہ
بڑے افسوس اور دکھ اور فکر کی بات ہے۔ پارلیمنٹ کے
کسی بھی ممبر کو اس خیال پر کوئی تکیہ نہ
پہنچنا اور سب کا اسے چپ کرنا اور کرنا اور بھی
زیادہ دردناک بات ہے۔ کیا نئی دہلی کی ہوا ہمیں سن
بلاتی چلی جارہی ہے؟ کدھر لے جائے ہمارے ملک
کو یہ پارلیمنٹری نظام؟ یہ سیاست اور یہ پارٹی بازی
یہ واقعہ کی نقل؟ بلشک، جیسا مہاتما گاندھی نے
"ہندو سراج" میں کہا ہے، خاتمہ و موت کی طرف۔

ہم نمونا کے ساتھ چھتارنی دینا چاہتے ہیں کہ
"انڈیا لیگ" کا دوبار زور سے جاری ہے اور بہار
ماتا کی مٹی پلہد کی جا رہی ہے۔ ہمارے اعلیٰ سے اعلیٰ
حکام جوسی فائینلس منسٹر اس میں کدھا لگا رہے
ہیں۔ یہ غداری کب تک چلتی؟ ہندوستان کی
چلتا کو یہ کبھی برداشت نہ ہوگا۔

23. 5. '54

—سوریش رامभाई

—سوریش رامभाई

23. 5. '54

بوند گیا سیمین پر ایک نظر

اپریل مہینے کی تاریخ 18، 19 اور 20 کو گیا
شر نام مقام بوند گیا میں سرورڈے سماج کا چھٹا حالانہ
جلسہ یا مہمان ہوا۔ یہ سیمین پچھلے پانچوں سیمینوں
کے مقابلے زیادہ زندہ زوردار اور جاتدار تھا۔ ایسا ہونا
قدرتی ہے اور ہمیں افسوس ہے کہ آگے کے سیمین اس سے
بہتر ہو چڑھ کر ہونگے کیونکہ سلامت ونوبا کا بھودان
پگھلے آندولن ایک زندہ آندولن ہے جو ملک کی سوائی
ہوئی طاقتوں کو جگا رہا ہے، سماج کے دیے ہوئے حصوں
کو ابھار رہا ہے اور ہر کسی کو سوچنے سمجھنے اور پرانی
جگہ سے حرکت کرنے کے لئے مہم چھڑ کر رہا ہے۔ اس لئے
اسمیں دن دن نئے کارکن آ رہے ہیں اور جب تک یہ
بھودان تحریک زندہ تھریک رہتی ہے تب تک ہر
سرورڈے سیمین ملک کی چلتا کا اچھے مقصد کی طرف ہر
کی منزل میں مہل کے ایک ایک پتھر کی طرح ثابت
ہوگا۔

جس سے یہاں کی شہریوں کو یہ محسوس کر سکتی ہے کہ وہ بھی اس ملک کے کاروبار یعنی "انڈیا لمیٹڈ" میں شریک ہے!

ہمیں دیکھنا چاہیے کہ کونسا منسٹر کے اس خیال پر پارلیمینٹ کے کسی بھی ممبر نے اس سوال پر جواب دیا ہے۔ کون نہیں جانتا کہ "انڈیا لمیٹڈ" کے خیال کے پیچھے ہندوستان کی لوٹ اور تباہی کی کہانی بھری پڑی ہے۔ آج بھی "انڈیا لمیٹڈ" کے نام سے ہندوستان میں انگریزوں اور دوسری ولایت والوں کے انہوں کارخانے اور دکانیں ہیں جن کی بدولت ہندوستان کے وہ سب اہم اشیاء دہلے سے رہے ہیں اور یہاں کی بھی کچھ دولت باہر چلی جا رہی ہے۔ اور جب تک "انڈیا لمیٹڈ" نام کا کاروبار اس ملک میں چلتا ہے یہاں کے آدمی کو سب اشیاء کے لئے موقع نہیں ہے۔ ہم سمجھتے تھے کہ آزاد ملک کی یہ کوشش ہوگی کہ یہ "انڈیا لمیٹڈ" کا دھندا اس ملک سے اٹھ جائے۔ مگر فائنلس منسٹر کی بات سے ایسا لگتا ہے کہ یہ دھندا اور بھی گہری جڑیں پکڑ رہا ہے اور فائنلس منسٹر اس میں پورا زور لگا رہے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہندوستان دن دن زیادہ ویران ہوتا جا رہا ہے اور ہمارے یہاں کے غریب لوگوں کے ساتھ زیادہ غریب اور امیر زیادہ امیر ہوتے جا رہے ہیں۔

ہمارے فائنلس منسٹر بھی چلتا من نہیں مگر پرانے آئی۔ سی۔ ایس۔ ہیں اور انگریزوں کے آج سے پہلے جگہوں پر رونق پاتے تھے۔ قدرتی طور پر ان کی نس نس میں انگریز حکومت یعنی انڈیا لمیٹڈ کی گندہ سمانی ہوئی ہے اور وہ انگریز آرٹیکل ۱۱۱ کی ایک زبردست ضرورت ہے بلکہ اس کی پختہ ہواوار میں۔ لہذا وہ ہر چہ انگریزوں کے لئے دیکھتے ہیں اور یہ اس لحاظ سے کہ ہندوستان کی سرزمین کیا چاہتی ہے انگریزوں کے لئے کو وہ اس دھن میں برقرار رکھنا چاہتے ہیں۔ تصویر انکا نہیں ہے اس لئے کہ انہوں نے پائی ہے اس ملازمت کا جس میں وہ برسوں رہے اور اس چمک کا جس نے انکی آنکھوں کو چوندھیا دیا ہے۔ خوش قسمتی کہیں یا بدقسمتی! آرٹیکل معاملوں میں ہمارے پرہیزگاروں کی ہی ان کے کئی ہم خیال ہیں۔

لیکن ہم یہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ جو جواہر لال نہرو سبھا میں "جے ہند" کی آواز بلند کرتے ہیں یا آزادی کے پہلے "بھارت مانا کی جے" سے آسمان کو گونجتے تھے انہیں "انڈیا لمیٹڈ" کا خیال ذرا بھی برداشت نہیں ہو سکتا تھا اور وہ

جس سے یہاں کی غریب چلتا یہ محسوس کر سکتی ہے کہ وہ بھی اس ملک کے کاروبار یعنی "انڈیا لمیٹڈ" میں شریک ہے!

ہمیں دیکھنا چاہیے کہ کونسا منسٹر کے اس خیال پر پارلیمینٹ کے کسی بھی ممبر نے اس سوال پر جواب دیا ہے۔ کون نہیں جانتا کہ "انڈیا لمیٹڈ" کے خیال کے پیچھے ہندوستان کی لوٹ اور تباہی کی کہانی بھری پڑی ہے۔ آج بھی "انڈیا لمیٹڈ" کے نام سے ہندوستان میں انگریزوں اور دوسری ولایت والوں کے انہوں کارخانے اور دکانیں ہیں جن کی بدولت ہندوستان کے وہ سب اہم اشیاء دہلے سے رہے ہیں اور یہاں کی بھی کچھ دولت باہر چلی جا رہی ہے۔ اور جب تک "انڈیا لمیٹڈ" نام کا کاروبار اس ملک میں چلتا ہے یہاں کے آدمی کو سب اشیاء کے لئے موقع نہیں ہے۔ ہم سمجھتے تھے کہ آزاد ملک کی یہ کوشش ہوگی کہ یہ "انڈیا لمیٹڈ" کا دھندا اس ملک سے اٹھ جائے۔ مگر فائنلس منسٹر کی بات سے ایسا لگتا ہے کہ یہ دھندا اور بھی گہری جڑیں پکڑ رہا ہے اور فائنلس منسٹر اس میں پورا زور لگا رہے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہندوستان دن دن زیادہ ویران ہوتا جا رہا ہے اور ہمارے یہاں کے غریب لوگوں کے ساتھ زیادہ غریب اور امیر زیادہ امیر ہوتے جا رہے ہیں۔

ہمارے فائنلس منسٹر بھی چلتا من نہیں مگر پرانے آئی۔ سی۔ ایس۔ ہیں اور انگریزوں کے آج سے پہلے جگہوں پر رونق پاتے تھے۔ قدرتی طور پر ان کی نس نس میں انگریز حکومت یعنی انڈیا لمیٹڈ کی گندہ سمانی ہوئی ہے اور وہ انگریز آرٹیکل ۱۱۱ کی ایک زبردست ضرورت ہے بلکہ اس کی پختہ ہواوار میں۔ لہذا وہ ہر چہ انگریزوں کے لئے دیکھتے ہیں اور یہ اس لحاظ سے کہ ہندوستان کی سرزمین کیا چاہتی ہے انگریزوں کے لئے کو وہ اس دھن میں برقرار رکھنا چاہتے ہیں۔ تصویر انکا نہیں ہے اس لئے کہ انہوں نے پائی ہے اس ملازمت کا جس میں وہ برسوں رہے اور اس چمک کا جس نے انکی آنکھوں کو چوندھیا دیا ہے۔ خوش قسمتی کہیں یا بدقسمتی! آرٹیکل معاملوں میں ہمارے پرہیزگاروں کی ہی ان کے کئی ہم خیال ہیں۔

لیکن ہم یہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ جو جواہر لال نہرو سبھا میں "جے ہند" کی آواز بلند کرتے ہیں یا آزادی کے پہلے "بھارت مانا کی جے" سے آسمان کو گونجتے تھے انہیں "انڈیا لمیٹڈ" کا خیال ذرا بھی برداشت نہیں ہو سکتا تھا اور وہ

نہی چاہتے—ہمارے ساتھ یا ہندوستانی کلچر سوسائٹی کے ساتھ کون کی لگی ؟

اس وقت سے ہمیں ایک اور کچھ پرانی کہتا یاہ آگئی۔ ”بہکم سہتا“ نام کا جو بھی ایک بار ہندوستانی کے حمایتیوں کے سر ملتا جا چکا ہے اور بھارت بھر میں گونج چکا ہے۔ ہم نے خوب پتہ لگائے کی کون کون سی بہمت سے لوگوں سے پوچھا۔ اچے سب سالہوں سے بھی پوچھا۔ جس ہندوستانی کہتی کے سر ”بہکم سہتا“ ملتا جا رہا تھا اس کے ایک ایک ممبر—بابو واجہندرو پرشاد، ڈاکٹر تارا چند، ڈاکٹر کالہنکر، ڈاکٹر مسعود اور سوچ پورا کے راجا راجندر پرشاد سنگھ—سب سے پوچھا۔ ہمیں کہیں بھی دیکھی ہوئی ہوں کوئی ایسی کتاب نہ ملی جو کسی بھی ہندوستانی سدھا یا ہندوستانی کہتی کی نکالی یا مظلوم کی ہوئی ہو اور جس میں ”بہکم سہتا“ آتا ہو۔ اور اس کے بعد تو کہول ”بہکم سہتا“ پر ہی گہاے واپس لے سلکھیں نہیں کیا۔ ہم نے اچے کانوں سے ڈیڑھ گھنٹہ پریموں کے منہ سے ”بادشاہ دھرتی“ ”شہزادہ لو“ اور ”مولوی وشیشہ“ بھی سنا ہے۔ دوسرے کو چوہانے کے لئے اہلی ناک کاٹنے والے ابھی دنیا سے ملے نہیں اور ان میں سے کئی وہ لوگ ہیں جو کہلی سہتاؤں کے اندر نہ کہول ”لڑ کر شہا“ ہی کہتے ہیں بلکہ اہلی دھرم پتھوں کو ”لہدی آمک“ اور ”مسز آمک“ کہ کر پڑھتے کرتے ہیں !

ہم سوچنا کرتے ہیں کہ ہمارے شہدوں میں اب کلمہ اور گورا ہیں آئے لگا۔ اس لئے ہم اس نوٹ کو یہیں بلند کرتے ہیں۔ بہکوں ہم سب کو سوچتی ہیں کہ ہم سچائی، ایمانداری اور انصاف کو نگاہ میں رکھتے ہوئے شاعری اور پریم کے ساتھ چلتا کے ہمت میں بھاشا کے سوال اور دیہی کے اور۔ سب سوالوں پر وجہ کر سکیں اور ملکر چل سکیں۔

14. 5. '54

—سندھراج

—سندھ لال

14. 5. '54

جے ہند یا ”انڈیا لیمیٹڈ“ ؟

ہماری پارلیامینٹ کے ہاؤس آف ایسٹس میں جب سرکار کی طرف سے لگنے والے نئے نئے ٹیکسوں پر چرچا چلی تو کچھ ممبران نے یہ کہا کہ انہوں نے بھی جو ٹیکس لگتے ہیں ان کا بہار دراصل فریبوں پر ہی ہوتا ہے اور پان ’سہاری‘ تمناؤں جیسی ضرورت کی چیزوں پر ٹیکس تو سودہ ہی فریبوں کے ساتھ ہوتا ہے۔ یہاں جاتا ہے کہ اس پر ہمارے لائسنس منسٹر صاحب نے یہاں فریبوں پر ٹیکس لگنا ہی چاہئے اور انہوں نے جو مظلومی مظلور کرنی چاہئے کیونکہ یہی ایک طریقہ ہے

سے پراہنا کرتے ہیں کہ وہ ہمیں ان شہدوں کی جگہ
 अधिक खपते हुए शब्द बतावें. अगर उन शब्दों के
 पीछे भी वही भाव होंगे और उनके बनाने में उन्हीं
 वस्त्रों से काम लिया गया होगा जिन से इस शब्दावली में
 लिखा गया है तो हम नये शब्दों को अपना लेंगे. यह भी
 ध्यान रखना होगा कि केवल हिन्दुस्तानी बोलने वाली
 जनता के सुभीते को ही नहीं देखना है, बल्कि हिन्दुस्तान
 भर में उस जनता के सुभीते को भी देखना है जो उसी
 परम्परा से निकले और बने दूसरे शब्दों को काम में
 लाती रही हैं."

हमें याद रखना चाहिये कि यह "शब्दावली" पांच
 बरस पहले की निकली हुई है. अगर हमारे हिन्दी प्रेमो
 आई ऊपर के पैर में हिन्दुस्तानी की जगह हिन्दा कर लें
 और सारी शब्दावली को ध्यान से पढ़ जावें तो हमें
 विश्वास है कि अब भी उसके तीत-चौथाई शब्द उन्हें काफी
 पसन्द आयेंगे. यह "शब्दावली" इस नोट को लिखते समय
 हमारे सामने रखी हुई है. इसमें प्राइम मिनिस्टर
 (Prime Minister) के लिये केवल एक शब्द दिया
 गया है और वह शब्द है 'परम वजीर' यानी इस शब्दावली
 के अनुसार भी जवाहरलाल जी को 'पहलुभा' नहीं कहा जा
 सकता. प्रीमियर (Premier) के लिये कई शब्द हैं जिनमें
 एक शब्द 'पहलुभा' भी है. अंग्रेजी शब्द 'प्रीमियर' के कई
 अर्थ भी होते हैं. 'प्रीमियर' के लिये उसमें दूसरे शब्द
 हैं—'पहला वजीर' और 'बड़ा वजीर.' अंग्रेजी शब्द
 कैबिनेट के भी कई मानी होते हैं. इस "शब्दावली" में
 (Cabinet) का अर्थ कुटी और खानी भी दिया है और
 'काबिना' और 'वजीरायत' भी. 'काबिना' शब्द कैबिनेट
 के लिये दुनिया की बहुत सी भाषाओं में काम आता है और
 'वजीरायत' शब्द पंजाब के बजान पर बनाया गया है.
 इस "शब्दावली" के तैयार करने वालों ने मिनिस्टर की
 जगह वजीर शब्द सुझाया है, इसलिये क्योंकि 'मंत्री'
 शब्द वह 'सेक्रेट्री' के लिये काम में लाये हैं और वजीर
 शब्द का जो सारे भारत में समझा जाता है उन्होंने बाईकाट
 करना ठीक नहीं समझा. सेन्टर के लिये उन्होंने अवश्य
 'विष विन्दी' शब्द सुझाया है.

पांच बरस पहले की छपी हुई हिन्दुस्तानी प्रचार सम
 वर्षा की निकाली हुई उस "शब्दावली" के कोई शब्द
 किसी को अच्छे लगें या न लगें—हमें भी उसके कई शब्द
 अच्छे नहीं लगते—पर हिन्दुस्तानी कलचर सोसाइटी का
 निष्ठा हुआ भारत के विधान का पूरा पूरा हिन्दी
 अनुवाद बाजार में बिक रहा है. उस सारे अनुवाद में न
 कहीं 'विषविन्दी' शब्द है न 'खोखी' और न 'पहलुभा'.
 फिर यह ज़बर्दस्ती—हम अधिक कहा शब्द काम में लाना

पर लक्ष्य कئے हैं. हमें तो वा हमें उन शहदों کی
 جگہ انھیں کہتے ہوئے شہد بتاویں. اگر ان شہدوں کے
 پیچھے بھی وہی ہوا ہوگا اور ان کے بنانے میں انہیں
 اُصولوں سے کام لیا گیا ہوگا جن سے اس شہداولی میں لیا
 گیا ہے تو ہم نئے شہدوں کو اپنا لیں گے. یہ بھی دھیان
 رکھنا ہوا کہ کچھ ہندوستانی بولنے والی جگہ کے سہمے
 کو ہی نہیں دیکھنا ہے، بلکہ ہندوستان بھر میں اُس
 جگہ کے سہمے کو بھی دیکھنا ہے جو اُسی پر مبنی ہے نکلے
 اور بلکہ دوسرے شہدوں کو کام میں لائی وہی ہے."

ہمیں یاد رکھنا چاہیے کہ یہ "شہداولی" پانچ
 برس پہلے کی نکلی ہوئی ہے. اگر ہمارے ہندی پر
 بھائی اور کے پھرے میں ہندوستانی کی جگہ ہندی کو
 لیں اور ساری شہداولی کو دھیان سے پڑھاویں تو ہمیں
 دھراس ہے کہ اب بھی اُس کے توں چوتھائی شہد انہیں
 کافی پسند آئیں گے. یہ "شہداولی" اس نکت کو لکھتے
 سہ ہمارے سامنے رکھی ہوئی ہے. اس میں پرائم منسٹر
 (Prime Minister) کے لئے کچھ ایک شہد دیا گیا
 ہے اور وہ شہد ہے 'پریم وزیر' یعنی اس "شہداولی"
 کے انوشاہ بھی جواہر لال جی کو 'پہلوا' نہیں کہا جا
 سکتا. پریمیر (Premier) کے لئے کچھ نئی شہد ہیں
 جن میں ایک شہد 'پہلوا' بھی ہے. انگریزی شہد 'پریمیر'
 کے نئی اواز بھی ہوتے ہیں. 'پریمیر' کے لئے کچھ اس
 دو-دے شہد ہیں—'پہلے وزیر' اور 'بڑا وزیر' انگریزی
 شہد کابینہ کے بھی نئی معنی ہوتے ہیں. اس
 "شہداولی" میں کابینہ (Cabinet) کا ارنہ نئی
 اور کچھ بھی دیا ہے اور 'کابینا' اور 'وزیرایہ'
 بھی. 'کابینا' شہد کابینہ کے لئے دنیا کی بہت سی
 بھاشاؤں میں کام آتا ہے اور 'وزیرایہ' شہد پنجاب
 کے وزیر پر بنایا گیا ہے. اس "شہداولی" کے تیار کرنے
 والوں نے منسٹر کی جگہ وزیر شہد سوچا ہے. اس لئے
 کونیکہ 'منسٹر' شہد وہ 'سکریتری' کے لئے کام میں لائے
 ہیں اور وزیر شہد کا جو سارے بھارت میں سمجھا جاتا
 ہے انہوں نے بالکل کرنا ٹھیک نہیں سمجھا. منسٹر کے
 لئے انہوں نے آؤشہم 'بیج ہندی' شہد سوچا ہے..

پانچ برس پہلے کی چھپی ہوئی ہندوستانی پرچار
 سمیا دھما کی نکلی ہوئی اس "شہداولی" کے فولی
 شہد کسی کو اچھے لگیں یا نہ لگیں—ہمیں بھی اُس
 کے نئی شہد اچھے نہیں لگتے—پر ہندوستانی کچھ
 سوشلٹی کا نکل ہوا بھارت کے دھماں کا پورا پورا ہندی
 انوار بازار میں بک رہا ہے. اُس سارے انوار میں نہ
 نہیں "بیج ہندی" شہد ہے نہ 'کچھلی' اور نہ 'پہلوا'.
 پھر یہ زبردستی—ہم انھیں کچھ لڑا شہد کام میں لانا

से खींच कर अपनी राय ज्ञापन करें, इसी सिद्धे "नया हिन्दू" के कायम इस सभास की बहस के सिद्धे सुते हैं, इस धर्त पर कि बहस शान्ति ढंग से और उचित सीमाओं के अन्दर हो.

कुछ और भाइयों ने एक और “अमेज़ी हिन्दुस्तानी शब्दावली” में से कुछ शब्द चुन कर हिन्दुस्तानी कलचर खोसाइटी को दिक्कतमरी बनाने के अयोग्य साबित करने की कोशिश की है. इनमें से तीन शब्द बानी ग्राहम मिनिस्टर (Prime Minister) के लिये ‘पहलुभा’, कैबिनेट (Cabinet) के लिये ‘खोली’ और सैन्टर (Centre) के लिये ‘बिच बिन्दी’ लगभग सारे हिन्दी जगत में गूँज गये. पार्जिमेन्ट में भी कई मेम्बरों ने इन्हें खूब हँसाया और इनके आधार पर दुनिया की यह साबित करने की कोशिश की कि हिन्दुस्तानी कलचर खोसाइटी को दिक्कतमरी बनाने का काम नहीं मिलना चाहिये था.

पहली बात तो यह कि हिन्दुस्तानी कलचर सोसाइटी ने आज तक कभी इस तरह की कोई 'शब्दावली' नहीं निकाली, जिस शब्दावली में से यह शब्द लिये गये हैं उस पर कहीं हिन्दुस्तानी कलचर सोसाइटी का नाम नहीं। यह शब्दावली निकाली हुई है हिन्दुस्तानी प्रचार समाज की ओर पाँच बरस पहले की निकली हुई है, 'शब्दावली' की भूमिका लेखकों में चार नाम हैं, उनमें एक हमारा नाम भी है, चार नाम यह हैं :—काका कालेलकर, रामेश्वरी नेहरू, सत्य नारायण और सुन्दरलाल। भूमिका लेखकों ने उस "शब्दावली" को केवल एक सुझाव के तौर पर हिन्दी जगत के सामने रक्खा है, उसके अधिकतर शब्द बालू और रोजमर्रा की बाजबाल के शब्द हैं जैसे—सेक्रेट्री के लिये 'मन्त्री,' सिडिशन (Sedition) के लिये 'राजद्रोह', लिबर्टी (Liberty) के लिये 'स्वतंत्रता,' डिमान्ड (Demand) के लिये 'मांग', हाउस (House) के लिये 'सदन' वगैरा। जो बांके से शब्द भये गढ़े गये हैं उनके बारे में भूमिका लेखकों ने अपनी भूमिका में लिखा है कि :—

“हम वह शब्दावली जनता के सामने यह दिखाने के लिये रख रहे हैं कि ऐसे आसान शब्द बनाये जा सकते हैं जिन्हें आम जनता समझ सके और जिन से बोली को आसान भी किया जा सके और साथ ही साथ माझामाझ में। हम वह दावा नहीं करते कि इन अंग्रेजी शब्दों के जोड़ के और हिन्दुस्तानी शब्द नहीं बन सकते, और न वह दावा करते हैं कि इसमें कोई कमी नहीं रही। कई जगह अधिक जगते हुए शब्द मिल सकते हैं या बदले भी जा सकते हैं। हम सब मित्रों

یہ سوچو ابھی رائے قائم نہیں۔ اسی لئے ”انہا ہند“ کے
کالم اس سوال کی بحث کے لئے کہلے ہوں، اس شرط پر
کہ بحث شانہ و شامہ کے ملک سے اور اچھت سماجوں کے اندر
ہو۔

کچھ اور یہاںوں نے ایک اور "انگریزی هندستانی شہزادوں" میں سے کچھ شہد چونکہ ہندستانی کلچر سوسائٹی کو قاضی بنانے کے لیے ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ ان میں دوں شہد یعنی پرائم منسٹر (Prime Minister) کے لئے 'پہلو' کوہنٹ (Cabinet) کے لئے 'کونہ' اور سنٹر (Centre) کے لئے 'بچہ ہندی' ایک ہنگامہ ہندی جسکے میں گونچ لئے۔ پارلیمنٹ میں بھی کئی ممبروں نے انہیں خوب اچھا اور ان کے آدھار پر دنیا کو یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ ہندستانی کلچر سوسائٹی کو قاضی بنانے کا کام نہیں ملتا چاہئے تھا۔

اپنی بات تو یہ کہ هندوستانی کلچر سوسائٹی نے آج تک کبھی اس طرح کی کوئی "شہدائی" نہیں نکالی، جس "شہدائی" میں سے یہ شہد لہکے گئے ہوں اس پر کہیں ہندوستانی کلچر سوسائٹی کا نام نہیں۔ وہ "شہدائی" نکالی ہوئی ہے ہندوستانی پرچار سبھا وردھا کی اور پانچ برس پہلے کی نکلی ہوئی ہے۔ "شہدائی" کی بھوک لہکے ہوں میں چار نام ہوں، ان میں ایک ہمارا نام ہی ہے۔ چار نام یہ ہوں:—کا کالمیکر، رامشوری نہرو، ستھ نارائن اور سندو لال۔ بھوک لہکے ہوں نے اس "شہدائی" کو گہول ایک سوچاؤ کے طور پر ہندی حکمت کے سامنے رکھا ہے۔ اس کے آدھک تو شہد چالو اور روزمرہ کی بول چال کے شہد ہیں جیسے —سکریتری کے لئے 'سکرتری'، سڈھن (Sedition) کے لئے 'راچ سدھن'، لبرٹی (Liberty) کے لئے 'سولنڈرنا'، ڈمانڈ (Demand) کے لئے 'سادک'، ہاؤس (House) کے لئے 'سڈن' وغیرہ۔ جو تھوڑے سے شہد نہ تو گئے ہوں ان کے بارے میں بھوک لہکے ہوں نے اپنی بھوک میں لکھا ہے کہ:—

”عم یہ شہد اولیٰ چلتا کے سامنے یہ دکھانے کے لئے رکھ
 رہے ہوں کہ ایسے اُحسان شہد پلانے جا سکتے ہیں چلتے ہیں عام
 چلتا سمجھ سکتے اور جن سے پولی کو اُحسان بھی کیا جا
 سکتے اور ساتھ ہی ساتھ مالا مال بھی۔ ہم یہ دعویٰ نہیں
 کرتے کہ ان انگریزی شہدوں کے جوڑ کے اور ملحدستانی شہد
 نہیں ہی سکتے“ اور نہ یہ دعویٰ کرتے ہوں کہ اس میں
 کوئی کمی نہیں رہی۔ لگی جگہ آدھک کھاتے ہوئے شہد
 مل سکتے ہوں یا پلانے بھی جاسکتے ہیں۔ ہم سب مکتوں



ہمارے ہندی پریمی ہائی

ہمارے ہندی پریمی ہائی

جب سے پارلیمنٹ میں ہندوستانی کلتور سوسائٹی کو انگریزی ہندی ڈکشنری بنانے کے لیے گرانٹ کی ضرورت ہوئی ہے تب سے کئی ہندی پریمیوں میں اس وجہ سے ہلچل مچ چکی ہے۔ ہم نے ان سب کو نہیں پڑھا۔ ان لوگوں کی جن خاص خاص باتوں کی طرف ہمارا دھیان دینا چاہیے وہ یہ ہیں۔

ایک بھائی، جو ان آباد ہندوستانی کلتور سوسائٹی میں اپنے بھائیوں کے ساتھ ساتھ "نیا ہند" کے کچھ لوگوں سے بڑے بڑے واقعہ دے کر یہ دکھانے کی کوشش کی ہے کہ بھاشا کے بارے میں ہندوستانی کلتور سوسائٹی کی نوعیت کیا ہے اور اس نوعیت کو برا بھلا کہا ہے۔ ان لوگوں میں سے ایک ہوں واقعہ سہادک کے کسی لوگو یا نوک سے نہیں ہے۔ ہمارے ویدوان بھائی کو یہ تو ضرور معلوم ہوگا کہ کسی پتر یا پتریکا میں جتنے لوگ لکھتے ہیں یہ اوشوک نہیں ہوتا کہ ان لوگوں میں ہرگز کئے ہوئے وچار سہادک کے یا پتر یا پتریکا کے مالک کے وچار بھی ہیں۔ انہوں نے جب "نیا ہند" کی فائل کو الٹ دیکھا ہے پوچھا ہے تو یہ بھی ناممکن ہے کہ بھاشا کے پشور پر "نیا ہند" سہادک کے لوگ نہ دیکھیں ہوں۔ بھارت کا وہاں پاس ہوتا ہے "نیا ہند" میں ہمارا ایک لکھا لوگو وہاں کی بھاشا سہادک کی نوعیت پر نکل چکا ہے۔ ہمارے بھائی نے اسی کو پوچھا ہوتا تو ان کے سب سہادک دور ہو گئے ہوتے۔ ہندوستانی کلتور سوسائٹی کی درجن سے آدھار کتابیں ہندی میں لکلی چکی ہیں۔ ان کتابوں میں نہیں ہیں وہی "وہ شہد نام میں نہیں آئے گئے جملہ ہمارے بھائی نے دوسرے لوگوں کے لوگو کے اعداد پر شکایت کی ہے۔ پھر انہوں نے ہندوستانی کلتور سوسائٹی یا "نیا ہند" کے ساتھ یہ صاف زبردستی کیوں کی یہ ہم نہیں کہہ سکتے۔

جب سے پارلیمنٹ میں ہندوستانی کلتور سوسائٹی کو انگریزی ہندی ڈکشنری بنانے کے لیے گرانٹ کی ضرورت ہوئی ہے تب سے کئی ہندی پریمیوں میں اس وجہ سے ہلچل مچ چکی ہے۔ ہم نے ان سب کو نہیں پڑھا۔ ان لوگوں کی جن خاص خاص باتوں کی طرف ہمارا دھیان دینا چاہیے وہ یہ ہیں۔ ایک بھائی نے جو ان آباد ہندوستانی کلتور سوسائٹی میں اپنے بھائیوں کے ساتھ ساتھ "نیا ہند" کے کچھ لوگوں سے بڑے بڑے واقعہ دے کر یہ دکھانے کی کوشش کی ہے کہ بھاشا کے بارے میں ہندوستانی کلتور سوسائٹی کی نوعیت کیا ہے اور اس نوعیت کو برا بھلا کہا ہے۔ ان لوگوں میں سے ایک ہوں واقعہ سہادک کے کسی لوگو یا نوک سے نہیں ہے۔ ہمارے ویدوان بھائی کو یہ تو ضرور معلوم ہوگا کہ کسی پتر یا پتریکا میں جتنے لوگ لکھتے ہیں یہ اوشوک نہیں ہوتا کہ ان لوگوں میں ہرگز کئے ہوئے وچار سہادک کے یا پتر یا پتریکا کے مالک کے وچار بھی ہیں۔ انہوں نے جب "نیا ہند" کی فائل کو الٹ دیکھا ہے پوچھا ہے تو یہ بھی ناممکن ہے کہ بھاشا کے پشور پر "نیا ہند" سہادک کے لوگ نہ دیکھیں ہوں۔ بھارت کا وہاں پاس ہوتا ہے "نیا ہند" میں ہمارا ایک لکھا لوگو وہاں کی بھاشا سہادک کی نوعیت پر نکل چکا ہے۔ ہمارے بھائی نے اسی کو پوچھا ہوتا تو ان کے سب سہادک دور ہو گئے ہوتے۔ ہندوستانی کلتور سوسائٹی کی درجن سے آدھار کتابیں ہندی میں لکلی چکی ہیں۔ ان کتابوں میں نہیں ہیں وہی "وہ شہد نام میں نہیں آئے گئے جملہ ہمارے بھائی نے دوسرے لوگوں کے لوگو کے اعداد پر شکایت کی ہے۔ پھر انہوں نے ہندوستانی کلتور سوسائٹی یا "نیا ہند" کے ساتھ یہ صاف زبردستی کیوں کی یہ ہم نہیں کہہ سکتے۔

ہم یہ ضرور چاہتے ہیں کہ اس سمجھوتہ پر ہندی پریمی سب طرح کے وچاروں کو سلیں اور ان پر شانتی

साहायता प्रदान करेगा लेकिन शर्त यह है कि हमारे बड़े लेकक अपने छोटे छोटे कर्कों को मिटा कर साहित्य सेवा के माध्य से अपना सहयोग प्रदान करें.

व्यापार लोभ पाठकों को गाली देते हैं कि वह पठित्वा नहीं पड़ता है और अच्छे साहित्य को नहीं बुझा, लेकिन असल कारन माली है, पाठकों का आनन्द अच्छे साहित्य में ही आता है, बहुत दिनों से इस बात की जरूरत महसूस की जा रही थी कि कोई ऐसी पत्रिका निकाला जाये जो सचमुच कहानी साहित्य की प्रतिनिधि हो और उसका नाम भी कम हो, “कहानी” ने यह काम पूरा कर दी है, अच्छी कहानियों के लिये सम्पादकों को बधाई मिलनी चाहिये लेकिन चार आना दाम रख कर “कहानी” के प्रकाशक कम बधाई के पात्र नहीं हैं.

—मुजीब रिषावी

खेल-खिलौने

कोलक-राजेन्द्र बाबू, निकालने वाले-भारतीय
नवीठ, काशी, भाषा-हिन्दी, खंडे-152, क्रिम-
वां कप्या.

श्री राजेन्द्र यादव नवजवान कहानीकार हैं, उनके विचारों में एक नई शक्ति है, नया जोश है और सामाजिक कुरीतियों को दूर करने की सच्ची लगन है. 'खेल खिलौने' ऐसी ही कहानियों का एक संग्रह है. इस संग्रह में बारह कहानियाँ हैं. लेखक ने हमारे आज के समाज की समस्याओं पर जिनका हमें रात दिन क्रदम क्रदम पर सामना करना पड़ता है, एक अच्छी तस्वीर खींची है. 'खेल खिलौने' की सभी कहानियाँ पाठक का दिल छूती हुई चलती हैं और अपना एक अस्तर उसके दिल पर छाड़ देती हैं लेखक ने 'आजकल के लड़के' नाम की कहानी में भाभी-देवर, माई माई की समस्यायों पर बहुत अच्छी तस्वीर खींची है. लेखक कहता है—

“नहीं” मैंने जैसे जैसे मुख का कौर निगला, खाना का कर जैसे ही उठा, भाभी ने कहा—“नवल, राशन समाप्त हो गया है स्कूल से आके ले आना.” इतना ही नहीं आगे फिर कहता है—

“आके फिर गेहूँ पनचककी पर से जाना.” इसी तरह लेखक ‘यथार्थवादी कहानी लेखक’ नाम की कहानी में आज के समाज की कुदृष्टियों की ओर जाता हुआ कहता है—

“यहां हमारी सहायता करना सांपों की दूध पिलाना है, हमने बर्ष के प्रति बिद्रोह किया है, समान की व्यवस्था के प्रति अविरवास किया है न ! इसलिये अकृत हैं !”

सभी कहानियों की भाषा सरल और मुहावरेदार है।
हिन्दी जगत को भारतीय ज्ञानपीठ की यह एक अनौत्पी
वेग है। — बेतम कुमार शर्मा

سہارا پر دانی کرے گا لیکن شرط یہ ہے کہ ہمارے لیے ایک ایسے چھوٹے مڑے فرقوں کو متنازعہ سمجھا کر ہمارے لیے سہارا پر دانی کریں ۔

زیادہ تر لوگ پائیک کو گلی دیتے ہیں کہ وہ
لٹکيا چوڑیں پڑھتا ہے اور اچھے ساھتہ کو نہیں
چھوٹا۔ لیکن اصل کارن مالی ہے، پائیکوں کو آنڈ
اچھے ساھتہ میں ہی آتا ہے۔ بہت دنوں سے اس
بانت کی ضرورت محسوس کی جا رہی تھی۔ کہ کوئی
ایسی پکڑ کا نکالی جائے جو سچے سچ کہانی ساھتہ
کی پڑتھدھی ہو اور اس کا نام بھی تم ہو۔ ”کہانی“
لم بہ کسی پڑوی کر دی ہے۔ اچھو۔ کہانوں نے لٹکے
سمادانوں کو بدھائی ملتی چاھتے لیکن چار آنہ نام
دیکھ ”کہانی“ کے پڑکھک تم بدھائی کے پانز نہیں ہوں۔

—مستطاب

کھیل-کھلونے

محمود - راجه پندو ياد، نكاحه والى بهار اتمه گوان
پوتله، قاضي، بهار - همدى؛ صفحه 152؛ قسمت نو و پيمه.

شہری واجہندہ یادو نوجوان کہتی گاؤں میں۔ اُن کے چاروں
 میں ایک نئی شکتی ہے، بھا جوش ہے، اور ساسا ایک
 فوریکہ جس کو دور کرنے کی سچی لگن ہے۔ 'بھول نہ دے'
 ایسے ہی کہانئیں کا ایک سنگرہ ہے۔ اِس سنگرہ میں
 بارہ کہانئیں ہیں۔ لکھک نے ہمارے آج کے سماج کی
 سمسیاؤں پر جن کا ہمیں دت دن قدم قدم پر سامنا کرنا
 پڑتا ہے، ایک اچھی تصویر بھیلچئی ہے۔ 'بھول نہ دے'
 کی سبھی کہانئیں پائتھ کا دل چھوئی ہوئی چلتی
 ہیں اور ایسا ایک اثر اُس نے دل پر چھوڑ دیتی ہیں۔
 لکھک نے 'اُجکل کے ٹوٹے' نام کی کہانی میں بھابی
 جیور، بھائی بھائی کی سمسیاؤں پر بہت اچھی تصویر
 بھیلچئی ہے۔ لکھک کہتا ہے—

”نہیں“ میں نے جیسے جیسے مکہ کا کور نکلا، کہتا تھا، ”جیسے ہی اُنہاں پہاڑی نے کہا۔ ”نول“ (اٹھ سو ساٹھ سو) تھا۔
 وہ اسکرول سے اُٹے اُٹے آئے۔ ”اِندا ہی نہیں اُنکے پھر کہتا ہے۔“

”اے یہ دو لڑکےوں پہنچکی ہو لے جانا۔“ اسی طرح ادھک
 ”ہمارا نوادی کہانی لکھک“ نام کی کہانی میں آج کے
 سماج کی گریختوں کی آواز جانا ہوا کہتا ہے۔

”یہاں ہماری سہانگیا کرنا سناہوں کو دودھ پلانا ہے“
 ہم نے دھرم کے پرتی وودھ لکھا ہے“ سماج کی دوستی
 کے پرتی اودھواس لکھا ہے نہ! اس لئے اچھوت ہوں!“

— چوتھن شمارہ —

कहानी

माहवारी पत्रिका, लिखावट—हिन्दी, सम्पादक—भीपत राय श्यामू संयासी, मैरौ प्रसाद गुप्त; एक कापी का दाम—चार आना; साजाना चंदा—तीन रुपया; मिलने का पता—सरस्वती प्रेस, 5 सवोर पटेल मार्ग, इलाहाबाद.

“कहानी” का पुनर्जन्म हुआ है. पहले यह पत्रिका बनारस से निकलती थी. फिर किन्हीं कारणों से बन्द हो गई. बन्द होने पर अच्छी कहानियों के पाठकों का दुख हुआ था. और अब जब कहानी फिर निकल रही है पाठकों को विली खुशी हुई है इस खुशी का प्रमाण यह है कि हर रोज पचास पचास की तादाद में इसके ग्राहक बन रहे हैं.

“कहानी” में कहानियां ही छपती हैं. इन कहानियों का स्तर बाफारू नहीं होता और न आबारागर्ही बढ़ाने वाले जिम्सी चटखारे इसमें मिलते हैं. “कहानी” के सरीदार को कबर वलट कर देखने की जरूरत नहीं है कि इस अंक में कोई अच्छी कहानी है या नहीं. “कहानी” में कोई घटिया कहानी छपती ही नहीं.

“कहानी” में शुद्ध साहित्य सेवा का भाव मिलता है. संगदिखी का नाम इस पत्रिका के पत्रों से ग्रायब है. भारती और विदेशी सभी भाषाओं की अच्छी कहानियां “कहानी” में पढ़ने को मिलती हैं. इसमें मरहटो की कहानियां छपती हैं, उर्दू की कहानियां छपती हैं, रूनी, चीनी, अंग्रेजी सभी भाषाओं की कहानियां जगह पाता हैं.

“कहानी” की एक और विशेषता भी है. दूसरे पत्रिकाएं नाम पर दौड़ती हैं और बन उनका लक्ष होता है. “कहानी” नये लेखकों को प्रोत्साहित करना अपना कर्ज समझती है. इसीलिये कुरनचन्द्र, कवाजा अहमद अन्शास, गुरबक्ष सिंह और दूसरे बड़े लेखकों के साथ साथ नये लेखकों की कहानियां पढ़ने को मिलती हैं और इस बात का अन्शास लगाने में आसानी होती है कि कहानी साहित्य में कैसे-कैसे रहान पैदा हो रहे हैं और नये लेखक आगे बढ़ रहे हैं या नहीं?

“कहानी” सम्पादकों ने “कहानी क्लब” नाम से एक स्तम्भ खोला है. इस स्तम्भ से साहित्यकारों को बहुत सहायता मिलेगी, पाठकों को इस से विलासनी तो होगी ही. आज बहुत सी समस्याएं हैं. लेखक व्यक्तिगत रूप से इन समस्याओं की चर्चा करते हैं लेकिन कोई ऐसा जरिया नहीं है जिसमें सामुहिक चर्चा हो सके और रचनात्मक साहित्य को आगे बढ़ाने वाले नतीजे निकाले जा सकें. दूसरी कुछ पत्रिकाएं कभी कभी ऐसी चर्चा करती हैं लेकिन उनका स्तर तानाबाजी से ऊपर नहीं उठ पाता. “कहानी क्लब” शुद्ध साहित्य को पैदा करने में जरूरत

कहानी

माहवारी पत्रिका; लिखावट—हिन्दी; सम्पादक—भीपत राय श्यामू संयासी, मैरौ प्रसाद गुप्त; एक कापी का दाम—चार आना; साजाना चंदा—तीन रुपया; मिलने का पता—सरस्वती प्रेस, 5 सवोर पटेल मार्ग, इलाहाबाद.

“कहानी” का पुनर्जन्म हुआ है. पहले यह पत्रिका बनारस से निकलती थी. फिर किन्हीं कारणों से बन्द हो गई. बन्द होने पर अच्छी कहानियों के पाठकों का दुख हुआ था. और अब जब कहानी फिर निकल रही है पाठकों को विली खुशी हुई है इस खुशी का प्रमाण यह है कि हर रोज पचास पचास की तादाद में इसके ग्राहक बन रहे हैं.

“कहानी” में कहानियां ही छपती हैं. इन कहानियों का स्तर बाफारू नहीं होता और न आबारागर्ही बढ़ाने वाले जिम्सी चटखारे इसमें मिलते हैं. “कहानी” के सरीदार को कबर वलट कर देखने की जरूरत नहीं है कि इस अंक में कोई अच्छी कहानी है या नहीं. “कहानी” में कोई घटिया कहानी छपती ही नहीं.

“कहानी” में शुद्ध साहित्य सेवा का भाव मिलता है. संगदिखी का नाम इस पत्रिका के पत्रों से ग्रायब है. भारती और विदेशी सभी भाषाओं की अच्छी कहानियां “कहानी” में पढ़ने को मिलती हैं. इसमें मरहटो की कहानियां छपती हैं, उर्दू की कहानियां छपती हैं, रूनी, चीनी, अंग्रेजी सभी भाषाओं की कहानियां जगह पाता हैं.

“कहानी” की एक और विशेषता भी है. दूसरे पत्रिकाएं नाम पर दौड़ती हैं और बन उनका लक्ष होता है. “कहानी” नये लेखकों को प्रोत्साहित करना अपना कर्ज समझती है. इसीलिये कुरनचन्द्र, कवाजा अहमद अन्शास, गुरबक्ष सिंह और दूसरे बड़े लेखकों के साथ साथ नये लेखकों की कहानियां पढ़ने को मिलती हैं और इस बात का अन्शास लगाने में आसानी होती है कि कहानी साहित्य में कैसे-कैसे रहान पैदा हो रहे हैं और नये लेखक आगे बढ़ रहे हैं या नहीं?

“कहानी” सम्पादकों ने “कहानी क्लब” नाम से एक स्तम्भ खोला है. इस स्तम्भ से साहित्यकारों को बहुत सहायता मिलेगी, पाठकों को इस से विलासनी तो होगी ही. आज बहुत सी समस्याएं हैं. लेखक व्यक्तिगत रूप से इन समस्याओं की चर्चा करते हैं लेकिन कोई ऐसा जरिया नहीं है जिसमें सामुहिक चर्चा हो सके और रचनात्मक साहित्य को आगे बढ़ाने वाले नतीजे निकाले जा सकें. दूसरी कुछ पत्रिकाएं कभी कभी ऐसी चर्चा करती हैं लेकिन उनका स्तर तानाबाजी से ऊपर नहीं उठ पाता. “कहानी क्लब” शुद्ध साहित्य को पैदा करने में जरूरत

والی ریاست تھے بقول غالب انہوں نے کچھ دن بعد دس ہزار کے پانچ ہزار سالانہ نکرا دیے اور خواجہ صاحب کو بھی اس میں دو ہزار کا شریک کر دیا جو بین غالب اور ان کے بھائی کو صرف پندرہ سو روپے ماہوار ملنے لگے۔ نواب احمد بخش خاں خانہ نشین ہوئے۔ ریاست دو حصوں میں تقسیم کر دی گئی۔ فیروز پور جہر کہ شمس الدین کو ملا اور لودھیا میں الدین خاں کو۔ شمس الدین خاں کی خاندان کے دیگر افراد سے بنی نہ تھی۔ شمس الدین نے غالب کی پیش اور بیگم غالب کا وظیفہ بھی بند کر دیا۔ آمدنی کے وسائل مسدود، احترامات کی تنگی نے پریشانی کر دیا۔ غالب پہلے تو نواب احمد بخش خاں کے پاس گئے کہ ان سے مل کر معاملہ کو سلجھائیں، لیکن نواب صاحب نے ہاتھوں سے ہیرا دیا۔ غالب نے مجبور ہو کر قانونی چارہ جوئی کا ارادہ کیا۔

اس زمانہ تک غالب کی زندگی بہ طور فراغت میں بسر ہوئی۔ انہیں اس سے والدہ کی معرفت کچھ نہ کچھ مل جاتا تھا۔ نواب احمد بخش خاں بھی کچھ نہ کچھ پنشن کے علاوہ دیتے رہتے تھے۔ سسرال سے بھی مدد ملتی رہتی تھی۔ بے فکری سے اس لئے بسر ہوتی تھی کہ خرچ برداشت کرنے والے تھے۔ نواب کہلاتے تھے۔ انہی امام کے متعلق ایک خط میں اشارہ کیلئے ہے: "بھائی صاحب کو سلام کہنا اور کہنا کہ صاحب وہ زمانہ نہیں، اور مقررہ اس سے قرض لیا، اور درباری مل کو ہمارا، اور خوب چند، چہین مسک کی کوٹھی جالوئی ہر ایک کے پاس تمسک جہی موجود، شہر لگاؤ، چائو، نمول، نہ سود۔ اس سے بڑھ کر بات کہ دوئی کا خرچ پچھو بھی کے سرو، ہینہ بھی خاں نے کچھ دے دیا، کبھی الور سے کچھ دلوادیا، کبھی ماں نے آگرہ سے کچھ بھیج دیا۔"

۱۸۶۵ء کے بعد ان امور میں تغیر واقع ہوا۔ قرضہ خاں نے تنگ کیا ہوا دیکھا جو مگر خان (نواب احمد بخش خاں) کے رویت میں تبدیلی ظاہر ہے۔ خاص کر ان کے بیٹے شمس الدین خاں نے غالب کو تنگ کرنا شروع کر دیا تھا۔

جس جہد کی ہم بات کر رہے ہیں وہ بڑی اتاری کا دھنکا، مگر جے آگرہ نے حالات کو کچھ نہ کچھ بہتر بنادیا تھا مگر اہل ہند، معاشی و اقتصادی حیثیت سے بہت پریشان حال تھے۔ غالب نواب تھے، مگر جاگیر نہ تھی، جہاں نہ تھی انتہایہ کچھ مکان تک نہ تھا۔ اٹھنا بیٹھا، امیروں، جاگیرداروں

پر دوش پانی بہہ وہ اس کو بندہ سطح سے نیچے آکر دیوڑھ گری، تعلق اور کچھ سرحدیں داخل نہیں ہونے دیتی مگر حسب اس کے ہی خواہ، اس کی زندگی کی قربانی سے متاثر ہوتے ہوئے اس کو مشورہ دیتے ہیں کہ ابنا کی موجودہ روش کو دیکھو، جو تم سے کم مرتبہ ہیں مگر داویدیش دے رہے ہیں کہ انہوں نے زمانہ سے سمجھنا نہ کر لیا ہے۔ تم بھی "گر زمانہ باقوسانہ و لا یزنا" نہ پھل کر دو۔ پس بروقت کے اس مشورہ سے اس کے احساس ہوتی ہو کہ کتری کی کھا کش زیادہ دتیر ہوتی ہے، اور وہ کبھی کبھی چند لچات کے رک کر زمانہ سے عارضی صلح کر لیتا ہے، اور ملٹی مشوروں پر عمل پیرا اٹھتا ہے جو اپنی سطح سے نیچے اترتا ہے۔ عرش سے فرش کی راہ لیتا ہے۔ وں کا بھیس بنا کر وہ "تا شلئے اہل کرم" دیکھنے لگتا ہے۔ مگر اس نہ گری میں اس کا احساس اور زیادہ مجروح ہوتا ہے۔ وہ "انا" جس نے تو مٹی دیر کے لئے انگ کر دیا تھا اس کے اندر پھر ابھرتی ہے اور پھر آئے در کعبہ گروانہ ہوا کی منزل پر لاکھڑا کرتی ہے۔ وہ دوسروں کا میں پاتا، بلکہ خود اپنا بن جاتا ہے اور اپنے کرم فراؤں سے کہہ دیتا ہے کہ میں نے جہاں سے مرئی تہمت عالی نے مجھ پر۔

احساس و شعور کی آواز میں اور قوت اہل کے تاریخی بہاؤ سے تصادم نتائج کا عکس ہیں غالب کی زندگی میں بہ تمام و کمال نظر آتا ہے اور ہم آدیش کشکش اور تصادم کے چند ہیرو دیکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ س کے انگریزوں سے روابط کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں ہے۔ مگر ان روایات تک جن زاویہ ہائے نگاہ سے دیکھا جاتا رہا ہے، اس میں ان روابط عوامی، اس زمانہ کی سیاست اور اقدار و جیات، کو پیش نظر نہ رکھنے کی کمی نا جاتی ہے۔ غالب کے ذہنی رجحانات، خاندانی مراتب عظمت کو بھی انفرادی حیثیت سے سامنے رکھنا ضروری ہے۔

غالب نے جب ہوش سنبھالا، باپ کا سایہ سر سے اٹھ چکا تھا۔ اپنے سر پرستی فرمائی، غالب کے چچا نصر اللہ بیگ خاں مرہٹوں کی طرف سے آگرہ کے صوبیدار تھے، آگرہ کو انہوں نے انگریزوں کے حوالہ کر دیا اور ب احمد بخش خاں کی سفارش پر انگریزی فوج میں رسالہ دار ہو گئے۔ ہزاروں ہندو اہل و عیال بعض ڈیڑھ ہزار روپے ماہانہ تنخواہ اور ایک جاگیر صالحہ کے صلح کے لئے مقرب ہو گئی، مگر غالب فوریس ہی کے تھے کہ چچا ابھی سے مگر کرالہا کو سدھارے۔ انگریزوں نے صلح و خدات و جاگیر کے عوض ۱۰ ہزار روپے سالانہ غالب کے چچا نصر اللہ بیگ خاں کے متوسلین، پنشن دیاست فیروز پور جہر کے سے وابستہ کر دی۔ نواب احمد بخش خاں

ماحول اور معاملات کا مطالعہ وقت و نظر سے نہیں کیا ورنہ وہ مولک کے متعلق اس قسم کے خیالات کا اظہار نہ کرتے۔ غالب معاشی بحران میں مبتلا تھے جس کے متعلق بیان گزرجکا۔ نیز قدر شناسی کے امیر بھی تھے جس کی شکایت انہیں ہمیشہ رہی، غالب ہمیشہ شاعر، عرقی، نظیری، ظہوری وغیرہ سے کم مرتبہ نہ تھے بلکہ ان کا مرتبہ کچھ بلند ہی ہے۔ ان شعرا کی قدر و منزلت کی داستانیں معلوم تھیں۔ غالب بھی ایسی ہی قدر و منزلت کے خواہاں تھے اس میدان میں بھی ان کو اپنی برتری کا احساس بہر حال رہا۔ لیکن زمانے نے ان کے ساتھ جو سلوک روا رکھا اس سے شعور کی تری کا پیدا ہونا ایک لاپرواہی امر تھا۔ غالب نے اپنی برتری کے لئے کوشش کی اور انہیں انگریزوں کے علاوہ اور کوئی نظر نہ آیا جو انہیں بلند مرتبہ دے سکتا۔ چنانچہ خود کو ملکہ کا شاعر بنائے جلنے کی منت کا انہاں اسی بنا پر کیا ہے۔ ورنہ کلکتہ کے دور کا قیام سے لے کر آخر تک انگریزوں کے متعلق جتنے قطعات اور قصائد لکھے۔ ان میں سے زیادہ تر منظوم عرضیاں ہیں ان کا منشا یہی تھا کہ حکام وقت، پیش، خلعت، دربار اور خطاب کے بارے میں میری مدد کریں۔ غالب ۱۸۳۲ء میں سپریم کونسل کے ممبر سر جارجس شکاف کی مدد میں قصیدہ لکھا تھا۔ اس کے چند شعر دیکھتے بالکل مرضی ہیں۔ قصیدہ سے مستحضر ہوتا ہے کہ سر جارجس شکاف دہلی آئے ہیں غالب کلکتہ میں ان سے مل چکے تھے۔ تشبیب کے بعد مدد میں وہی مبالغہ آمیز باتیں دہرائی گئی ہیں جو ہر ایک کے لئے بالنی اختیار بیان ہوتی رہی ہیں پھر اپنی حالت زار بیان کر کے مطلب کا انہاں اس طرح کرتے ہیں۔

پنج مطلب: تو ام بہت بے سود گونہ امید
خواہم آن پنج علی الزعم خسود و غنا
اول ایست کہ در باب معاشے کہ راست
کنی اندیشہ مکمل بہ طریق ایجاب
ہر چہ در زفر سر کار بود نقش پذیر
ہم باندازہ آن نقش شوی ماند و ساز
دوم آن کز اثر عدل تو اسے سحر عہد
غیر باندہ دریں و ہر نہا شد انبار
سوم آنست کہ دیگر کلمہ دست طلب

پیش فرماندہ میوات، بدریوزہ دماز
ہم بگنجیدہ سرکار پر استے خواہم
دادہ انصاف بدیں یافتگی اذین جلا
چارم آنست کہ باقی لید چندی سالہ
بے نزاع و جدل و جہد بین گرد باز
پنجم آن کہ پس ایں فتح کہ بناید وئے
وہم مژدہ اگر ام و نوید اعزاز
بخشند نامازہ خطابی دہراں افزا ہے
خلعتی در خرمایں دولت جادید طراز

غالب کی قادر الکلامی قابل داد ہے کہ اپنے مطالب کو کیسے عموماً پیرائے میں بیان کیا ہے اس مدحت طرازی کی علت غائی معاشی تنگی سے نجات تھی ورنہ ۱۸۲۷ء سے قبل انہوں نے کسی انگریز کی مدد میں ایک شعر بھی نہیں لکھا۔ پس اس کو مطلب برآری کا وسیلہ ہی کہا جائیگا۔ غالب شاعر تھے، انہوں نے صحیح راستہ اختیار کیا کہ شعر کو ذریعہ اظہار و دعا قرار دیا، شر کے مقابلہ میں شعر کی تاثیر مسلم، اگرچہ غالب کے حق میں شعر کی تاثیر بھی محدود ہی رہی۔

جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ غالب نے ہندوستانی امور و سلاطین کی شان میں بھی قصیدے لکھے ہیں لیکن انہوں نے غالب سے کیا سلوک کیا؟ یہ بات سب پر روشن ہے کہ بہادر شاہ ظفر نے بھی حکیم آصف علی خان اور حضرت کائے صاحب کی سفارشات پر غالب کو ملازم رکھا اور تنخواہ صرف پچاس روپے ماہانہ تا تاریخ فوری خدمت، بعد میں اصلاح شعر کا حکم بھی سپرد ہوا۔ انگریزوں کے خزانہ سے سارے باسٹھ روپے ماہانہ ملتے تھے جس کے عوض کوئی خدمت نہیں لی جاتی تھی۔ خدر کے بعد انہیں رامپور نے صندوق (جولائی ۱۸۵۹ء سے) سو روپے ماہانہ سے مدد کی۔ پس یہ اس زمانہ کا حوالہ تھا کہ شاعر کا جس سے توسل ہوتا اسی کی مدد سرائی کرتا۔ اگر غالب کا تعلق پیش کی وجہ سے انگریزوں کے ساتھ نہ ہوتا تو غالب بھی اوروں کی طرح انگریزوں کی مدد کرتے۔ غالب کی اس مدحت طرازی کی حقیقت اس وقت واضح ہو جاتی ہے جبکہ ہاکنس سنگال غالب کے خلاف رپورٹ کرتا ہے تو غالب اس کی تدریج پر اتر آتے ہیں اس کا ایک ہی مطلب ہوا کہ جس سے

قدیم صاحب سیکرٹری استقبال کو تشریف لائیں گے۔ جبکہ وہ انھیں سے آگے نہ بڑھے اور دیر ہوئی تو صاحب سیکرٹری نے جھڑکے پوچھا۔ وہ پھر باہر آیا کہ آپ کیوں نہیں چلتے۔ انہوں نے کہا کہ صاحب استقبال کو تشریف نہیں لائے، میں کیونکہ جانا۔ بعد ازاں جاکر کچھ عرض کی۔ صاحب باہر آئے اور کہا، جب آپ دوبارہ گورنری میں جغیت ریاست تشریف لائیں گے تو آپ کی وہ تعظیم ہوگی، لیکن اس وقت آپ نوکری کے لئے آئے ہیں اس تعظیم کے مستحق نہیں۔ مرزا صاحب نے فرمایا کہ گورنمنٹ کی ملازمت، باعث زیادتی اعزاز سمجھتا ہوں نہ کہ بزرگوں کے لوازم کو بھی گنا بدیہوں! صاحب نے فرمایا کہ ہم آئین سے مجبور ہیں مرزا صاحب! رخصت ہو کر چلے آئے یہ

جیسے نامسن جو کے ساتھ یہ معاملہ گزارا غالب کے پرانے جانے والوں میں سے تھے۔ ان کی مدت میں قطعہ ملا، قعیہ ملا اور دلفش کی آخری غزل کلیات میں موجود ہے۔ پنج آہنگ میں ان کے نام تین خط ہیں جن میں غزل اور قطعہ بھی شامل ہے۔ یہ پہلے گورنمنٹ کے سیکرٹری پھر فارن سیکرٹری اور بعد کو بی بی کے لفٹ گورنر ہوئے۔ دہلی اس زمانہ میں یوپی میں شامل تھی۔ ایسے شخص کے بعد مرزا غالب کی یہ جہالت غیر معمولی بات نہیں، اور بغیر ملاقات لوٹ آنا بھی ایک غیر متداولہ فعل ہی کہا جاسکتا ہے۔ یا عظمت و برتری کے شدید احساس کا نتیجہ ان کے بعد مومن خاں مومن کو بلایا جاتا ہے وہ بھی ملازمت کرنے سے منع کر دیتے ہیں صرف اس لئے کہ ان کو سو کی جگہ انہی روپے ماہانہ دینا چاہتے تھے۔ ظاہر ہے کہ غالب نے ملازمت عورت کی خاطر قبول نہ کی اور مومن خاں مومن نے صرف بیس روپے کی کمی کی وجہ سے۔ دونوں کا فرق واضح ہے۔

غالب ۱۸۴۲ء میں پنشن کے معاملہ میں بالکل مایوس ہو چکے تھے لیکن ان کو نئے خطاب و احوال کی فکر و کنویر سے امید تھی۔ یہ امید آخری دم تک رہی جو پوری نہ ہوئی تھی نہ ہوئی۔ ۱۸۵۰ء سے ۱۸۵۴ء تک غالب شاہ دہلی سے وابستہ رہے۔ اس زمانہ میں بھی انگریزوں سے رسمی تعلقات تھے۔ وہ شدید باقی نہ رہی جس کا ظہور ۱۸۵۲ء سے ۱۸۴۲ء تک ہوا۔ یہ بھی اس کا ثبوت ہے کہ غالب کی محنت طرازی

مطلب برکسی میں امداد ملنے کی فدا سی ترقی ہوئی اس کو خوش کر کے اپنا کام نکالنا چاہا اور تعریف و توصیف سے اپنی طرف مائل کیا۔ جس نے مخالفت کی اس کی پرائی کوئی۔

غالب کی سلامتی طبع کے ثبوت ان کی تحریروں میں جا بجا ملتے ہیں جو اس بات کی بین دلیل ہیں کہ غالب انگریزوں کے متعلق ابھی رائے رکھنے کے باوجود ان کے افعال پر کڑی نگاہ دینی کرتے تھے۔ مولوی سراج الدین احمد کو انگریزوں کے عدل و انصاف کے متعلق لکھتے ہیں:-

"ہیبت! اگر معاش میں ہمیں پنج ہزار روپیہ سالانہ ہم میں تھوڑی از روئے دفتر سرکار کہ سادہ لوحان آئنا معدلت آثار گویند ثابت شدہ بود با پیٹے کہ صاحبان صدر دراز پیش راندہ سے۔"

"سادہ لوحان آئنا معدلت آثار گویند" میں کتنا گہرا طنز ہے۔ اسی طرح جب مولوی فضل حق نے سرٹنہ داری عدالت سے استعفا دیا ہے تو اہل شہر کو سخت صدمہ ہوا۔ بہادر شاہ ظفر ولی عہد سلطنت تھے انہوں نے بھی بہزار شیون و بجا مولوی صاحب کو رخصت کیا۔ غالب نے یہ تمام حالات مولوی سراج الدین احمد کو ۳۱ جنوری ۱۸۴۳ء کے خط میں لکھے ہیں۔ انگریزوں کے متعلق لکھتے ہیں "بے تیزی و قدر ناشامی حکام رنگ آن ریخت" یہ وہ زمانہ ہے کہ غالب کا مقدمہ حکومت کے سامنے ہے۔ ان تمام امور سے قطع نظر اگر صرف معاملہ ملازمت مدد دہلی کلک کو سامنے رکھا جائے تو واضح ہو جائے کہ غالب کی خود داری کس منزل تک پہنچی ہوئی تھی یہ واقعہ مولانا محمد حسین آزاد نے آب حیات میں، بعنوان "کیا آن تان ہے لکھا ہے۔"

۱۸۴۲ء میں گورنمنٹ انگلشیہ کو دہلی کالج کا انتظام از سر نو منظور ہوا۔ نامسن صاحب جو کئی سال تک اضلاع شمال و مغرب کے لفٹنٹ گورنر بھی رہے اس وقت سیکرٹری تھے۔ وہ مدرسین کے امتحان کے لئے دلی آئے اور چاہا کہ جس طرح سو روپیہ پیسے کا ایک مدرس عربی کے ایسا ہی ایک فارسی کا بھی ہو۔ لوگوں نے چند کاموں کے نام بتائے۔ ان میں مرزا کا نام بھی آیا۔ مرزا صاحب حسب الطلب تشریف لائے۔ صاحب کو اطلاع ہوئی، مگر یہ پانسی سے انکر اس انتظار میں ٹھہرے کہ حسب دستور

مطلب براری کے لئے سنی البتہ ہمدرد کی رستہ پر جا سکتی وجہ سے انہیں پھر انگریزوں کی طرف متوجہ ہونا پڑا کیونکہ اس زمانہ میں، پنشن کی بندش، خلعت و درباری اور ازسے عروسی، ان کے لئے، معاشی بوجھ بن گئی۔ اعزاز کی پانچویں کا سبب تھی۔ اس لئے سب سے پہلے پنشن کے حصول کی کوشش کرنی پڑی اور اس کے بعد خلعت و دربار کی بحالی کے لئے لگے دو ہوئی اور ان دونوں امور کے سلسلہ میں ان کا انگریزوں سے رابطہ رہا۔ اس سلسلہ میں سب سے مقدم دستاویز ہے جس میں غالب نے عدالت کے واقعات لکھے ہیں۔ یہ کتاب غالب نے چھپو اگر انگریزوں کی نند کی تھی۔ اسی کتاب کے ذریعہ وہ اپنے آپ کو ہنگامہ پرورد گروہ سے الگ ثابت کرتا چاہتے تھے تاکہ پنشن و خلعت وغیرہ بحال ہو جائے۔ ایام غدر میں تنہائی سے اکتار، وقت گزارنے کے لئے حالات غم و دیدہ و شنیدہ قلم بند کرنے شروع کر دیئے۔ مگر کتاب خود شاہد ہے کہ اس میں واقعات و حالات جو کچھ لکھے گئے تھے، بعد کے برائے مصلحت کتاب سے بعض کو نکال دیا ہے۔ بالخصوص حالات دربار شاہ ظفر وغیرہ، مگر جو کچھ لکھا ہے اس کی راستی میں بھی شک و شبہ کی گنجائش نہیں ہے۔ غالب کی اصلیت پسندی حقیقت نگاری آشکارا ہے۔ انگریزوں کے بے جرم خطا قتل عام اگر اہل افسوس کیسے تو ہندوستان کی تباہی پر بھی غولی کے آنسو بہائے ہیں۔

”دل است، سنگ دامن نیست، چرا نسوزد چشم است،
رخت و ریزن نیست، چون نگرید آسہ ہم بدلت فرزند ان بایرخت
و ہم بر بد بانی ہندوستان بایر گریست۔“
دل ہی قہر نہ سنگ و خشت دروے بہر نہ آئے کیوں
لوئیں گے ہم ہزار بار کوئی ہمیں تلے کیوں
اگر یزید، عہد توں اور بچوں کے قتل کے متعلق لکھا ہے:-

”ہامی آل جہانداران داد آموز و دانش اندوز نکو خوی کو نام
و آہ ازاں خاقان برسی پیر و نازک اندام بار خوی چوں ملہ و تنی چوں

لے اگرچہ آں قدر کہادوست نہیں ہے ہمارے نزدیک یہ جنگ آزادی تھی
مگر جس عہد کے متعلق ہم گفتگو کر رہے ہیں اس کے لئے ہمیں اس کے استعمال
پر مجبور ہیں۔ جنگ آزادی کہہ کر بعض جگہ بات نہیں بنتی۔

۱۰ کلیات نشر ۲۵

سیم خلم و دروغ آل کو در کان جہاں نادیدہ کہ در محفلہ معنی بہ لالہ و گل ہی
خدیوہ ہندوستان خوشنوی بر کبک و تندر آہوئی گرفتند کہ ہمدیکہ ہمدیکہ
خون فرورفتند۔

مرید احمد خاں نے اسباب بغاوت ہند میں ہندوستانیوں
کی ناکامی کا سبب، غیر تربیت یافتگی، جہالت، فقدان عظیم و عدم اتحاد
قرار دیا ہے۔ سر سید احمد حکومت کے ملازم تھے انہیں حالات کا زیادہ
علم تھا۔ لیکن غالب نے ہندوستانیوں کے لشکر اور ان کے نظام حکومت
کے متعلق جو کچھ لکھا ہے وہ سر سید احمد خاں سے کہیں زیادہ دقیق ہے۔
”اس لشکر کے لئے عجم و جنگ جویان بے شمار جا رہا رو بہ کار
مگر بیاد بکیت۔ آسے رفت و رو بہ ہند بوم، بد انسان کہ آرائش و
آسا کش، اگر جویند، باندازہ پتہ کا ہی کا ہی نیابند، ہم چند لوہے
گیتی کا شوب، ہمیں خواست۔ ایک ہزار لشکر نگری، ہم بے لشکر آرائی
آرائے، بسا سپاہ بیتی، بے سپہدار جنگ برخاستہ۔“

اور ہندوستان کے شہروں کی حالت ملاحظہ فرمائیے:-
”شہر کے بے شہریاں، پرازدہ ہند ہائے خدا وند۔ چنانچہ
با خباہت بے باخباں، پراندہ خباں نامبر و مند۔ رہن از گرو دار
آزاد، بازگاہ از خفا، ویرانہ و کلہ با خوان لیغا، گلستان
نہاں خاندن، تاغوش را آریند و شورخ چشمی غمیش بوم
غامند۔ ریمہ، چون خرہ با خنجر با آختہ۔ ویک مرداں ہمدوگی
گزین، ویکہ بر خوار آیتہ از خانہ باز لہ آیتہ، ہزار جا سپہ انداختہ۔
دندال بسکہ در روز، سیم و زر، دلیرانہ رہانید، شہا از بہ نیل و سیاہ
غولب آریند۔ دشمن گہراں راز و دن نما نہ کربانہ بکا شانہ جملہ افورتنہ
اس سے زیادہ اور کیا بدلتی ہوگی۔ یہ کتاب انگریزوں کو نذر
دی گئی تھی جو بہادر شاہ ظفر کے سخت ترس دشمن تھے۔ لیکن اس میں
بادشاہ کے متعلق کتنا درد انگیز بیان ہے اور اس کی بے چارگی کی کتنی
بے مثال تشبیہ ہے۔

شاہ سادرمیاں گرفت سپاہ
دیں گرفت سن لہو گرفت سن ماہ

۱۱ کلیات نشر ۲۵

۱۲ کلیات نشر ۲۵

ماہ نو گراچی، فروری ۱۹۳۳ء

خدا یہ بتایا ہے۔ اردو خطوط میں بھی دہلی اور اہل دہلی کی بربادی پر
خدا بگ بگائے موجود ہیں سب سے پہلے قطعہ غدر یہ ملاحظہ فرمائیے۔

وہ علاؤ الدین خاں خلایق کو اسی زمانہ میں تحریر کیا تھا۔

بسکہ فعال مایہ پر ہے آج

ہر سلسلہ انکسار کا

گھر سے بازار میں نکلتے ہوئے

زہر ہوتا ہے آبِ انسان کا

چوک جس کو کہیں، وہ مقتل ہے

گھر بنا ہے نمودِ زنداں کا

شہر دہلی کا ذرہ ذرہ خاک

قشہٴ خوں ہے ہر مسلمان کا

کوئی داں سے نہ آئے یاں تک

آدمی داں نہ جاسکے یاں کا

میں نے مانا کر مل گئے، پھر کیا؟

وہی رونا تن و دل و جاں کا

گاہ جل کر کیا کئے مشکوہ

سوزش داغ بنائے پنہاں کا

گاہ رو کر کہا کئے باہم

ماجرہ دیدہ ہائے گریاں کا

اس طرح کے وصال سے یارِ

کیا ملے دل سے داغِ بھراں کا

انگریز سپاہیوں کی مطلق العنانی، مسلمانوں کا قتل عام

ان کی تباہی حالات، جمہوری بے بسی اس سے زیادہ کیا بیان

ہو سکتی تھی اب دیکھئے انگریزوں کے ترحم کی مثال بے مثال

غلبہ ہی کا قلم لکھ سکتا ہے۔

"ہر شخص کی سرفروخت کے موافق حکم ہو رہے ہیں۔ نہ کوئی

قانون ہے، نہ قاعدہ ہے، نہ نظیر کام آئے، نہ تقریر پیش جائے

ارتضیٰ خاں ابن مرتضیٰ خاں کی پوری دوسو روپے کی پنشن کی

منظوری کی رپورٹ گئی اور ان کی دو بہنیں، سو سو روپے مہینہ

۱۰ خطوط غلبہ ۱۰

ماہ فروری ۱۹۳۳ء

جنم چاروہ نئی گیسرد

شاہ، ماہ گرفتہ را ماند

نہ کہ ماہ دو ہفتہ را ماند

بادشاہ گہن لگا چاند تخیل کی بلندی کا کمال ہے اور اس کی بے بسی

اور جمہوری کی کتنی عجیب و لطیف مثال ہے۔ بادشاہ اور شہزادگان

کے حالات، فتح و ہلاکت کے بعد لکھتے ہوئے کلیو مذکور آتا ہو گا۔ اس لئے

بات کو اس طرح مثال جاتے ہیں۔

"ایں کہ فرجام کار بادشاہ و بادشاہزادگان کی بے بسی

کشائش شہر بایتے، نخست نہ گشتہ ام۔ لایق اینست کہ مرادندیں نام

شنیدن سرمایہ گفتار و ہنوز سخنہائے ناشنیدہ بسیار است۔"

لیکن ایک موقع پر بادشاہ و شاہزادگان کے متعلق افوس

کہتے ہوئے لکھا ہے۔

"از شاہزادگان بیرون ازیں نتوان سرود کہ اندر را اندوخت

مرگ بدہانی زخم گلوک تغنگ فرد برد۔ و چندے رادر ہم بند چاہے

بکشاکش رس رواں در تن افرد۔ و افردہ چند ازاں میان زندان

نشین اند۔ و شمرہ چند ازاں دودماں آوارہ روئے زمین۔ بر باد شاہ

ایک آرام گاہ کہ ماتم زوہ کتاب و قوائ است، فرمان گیر و دار

باندازہ باز پرس رواں ہست۔"

آخر کار دستبندی تحریر یکم اگست ۱۹۳۳ء کو ختم کر دی

خاتمہ پر لکھتے ہیں۔

"کہن پس اگر بدست آید نیز رنگ از آئینہ نمی زواید۔۔۔۔۔"

کاش در بارہ آن خواہش ہائے سرگنا، ہمانا جس خواہش و سرانجام

پائے، چنانکہ ہم دیں نگارش ازاں گزارش آہی و لوہ ام و اینک

چشم نگراں بدل دختہ دل بر امید بیاں نہادہ ام۔"

گویا دستبندی کو بھی خطاب، خلعت اور پنشن کی بھائی کا

۱۰ کلیات نشر ۱۰

۱۰ کلیات نشر ۱۰

۱۰ کلیات نشر ۱۰

۱۰ کلیات نشر ۱۰

پانے والیوں کو حکم ہوا کہ چہ بچہ تمہارے بھائی مجرم تھے۔ تمہاری پنشن ضبط، بطریق ترمیم من و س روپے جہینا تم کو ملے گا۔ ترمیم ہے تو تغافل کیا قہر ہوگا! میں خود موجود ہوں، حکام صدر کا روشناس، سکتا ہے۔

یہ داستان دراز سے دراز تر ہوتی جا رہی ہے غالب نے غدر کے حالات بہت زیادہ لکھے ہیں صرف دو واقعے اور ملاحظہ فرمائیے، غدر کے بعد دہلی کی عمارات بھی انگریزوں کی تباہی و بربادی کا نشانہ بنیں۔ بہت سی عالی شان عمارتیں برباد ہوئیں۔ مسجدیں مسمار کی گئیں، امام باڑے ڈھائے گئے۔ مولوی محمد باقر کا امام باڑہ ڈھایا گیا تو غالب کو بڑا دکھ ہوا۔ شہر کی بربادی، مسجدوں کی مسماری میں انگریزوں کی حرکتیں ملاحظہ فرمائیے۔

”بڑے دربار کا دروازہ ڈھا یا گیا، قابل عطار کے کوچے کا بقیہ مٹا یا گیا کشمیری کٹرے کی مسجد زمین کا پوند ہو گئی، مرکز کی وسعت دوچند ہو گئی۔ اللہ اللہ! گنبد مسجدوں کے ڈھائے جاتے ہیں اور ہنود کی ڈیلر صیوں کی جھنڈیوں کے پرچم لہراتے ہیں ایک شیر نورا اور پیل تن بندر پیدا ہوئے مہمے مکانات جا بجا ڈھا تا پھرتا ہے۔ فیض اللہ علی بخش کی حویلی پر جو گھڑتے ہیں جن کو عوام گری کہتے ہیں، انہیں ہلا کر ایک ایک بنیاد ڈھا دی، اینٹ سے اینٹ بجا دی، وہ رے بندر یہ زیادتی اور پھر شہر کے اندر۔“

انگریز کو بندر کہنا کتنی بے مثال تشبیہ ہے۔ میرے لاپس تک انگریزوں کے لئے یہ لفظ بچوں اور لڑکوں کی زبان پر تھا۔ مگر غالب نے اس سے جو فائدہ اٹھایا ہے۔ اور جس موقع پر استعمال کیا ہے وہ بلاغت کی انتہا ہے۔ بندر کی فطرت کو سامنے رکھتے اور اس انگریز کی حرکت کو دیکھتے اور تشبیہ کا لطف اٹھائیے۔ اسی طرح انگریز حکام کی جہالت کا خاکہ کتنے پر لطف اندازیں اڑا رہے ہندوستان میں عرف کی دبا عام ہے۔ نام اور عرف کو انگریز نے ایک جانتے ہیں اور نہ مانتے ہیں۔

۱۰ خطوط غالب ۳۹۵

۱۱ خطوط غالب ۳۹۵

۱۲ خطوط غالب ۳۹۵

”ایک لطیفہ پرسوں کا سنا! حافظ متو بے گناہ ثابت ہو چکے ہیں، رانی پانچکے، حاکم کے سامنے حاضر ہوا کرتے ہیں۔ اٹلاکاپنی مانگتے ہیں۔ قبضہ و تصرف ان کا ثابت ہو چکا۔ صرف حکم کی در، پرسوں وہ حاضر ہوئے، مثل پیش ہوئی۔ حاکم نے پوچھا۔ حافظ محمد بخش کوئی؟ عرض کیا کہ میں! پھر پوچھا، حافظ متوکون؟ عرض کیا کہ میں! اہل نام میرا محمد بخش ہے متو متو مشہور ہوں۔ فرمایا یہ کچھ بات نہیں۔ حافظ محمد بخش بھی تم، حافظا متو بھی تم، جو دنیا میں ہے وہ بھی تم۔ ہم مکان کس کو دیں؟ مثل داخل دفتر ہوئی۔ میاں متو اپنے گھر چلے گئے۔“

ان واقعات میں انگریزوں کے خلاف جو کچھ کہا ہے وہ کم نہیں ہے اب انگریزی فوج کے متعلق بھی سن ہی لیجئے۔ غالب باغیوں کی طرح، انگریزی فوج کو بھی اپنا خیال نہ کرتے تھے۔

”ایک خدر کالوں کا، ایک ہنگامہ گوروں کا، ایک فتنہ ہندام مکانات کا، ایک آفت و بانی، ایک مصیبت کال کی۔ اب یہ برسات جمیع حالات کی جامع ہے۔“

کتنے لشکروں کا دہلی پر حملہ ہوا، اور انگریزی فوج نے کیا کیا لوٹا اس کی تفصیل غالب ہی سے سنئے۔

”پانچ لشکر کا حملہ ہے درپے اس شہر ہوا۔ پہلا باغیوں کا لشکر، اس میں اہل شہر کا اعتبار تھا۔ دوسرا لشکر خاکبوسوں کا، اس میں جان و مال و ناموس و مکان و سکین و آسمان و زمین و آثار مہتی ہل کر لٹ گئے۔ تیسرا لشکر کال کا، اس میں ہزار ہا آدمی بھوکے مرے پھٹا لشکر بیٹھے کا۔ اس میں بہت سے پیٹ بھرے مرے۔ پانچواں لشکر تپ کا، اس میں تاب و طاقت عموماً لٹ گئی۔“

انگریزوں نے دہلی میں جو تباہی مچائی تھی اس کو کتنے مختصر اور جامع لفظوں میں بیان کر دیا ہے۔ تفسیر کی جائے تو ایک کتاب تیار ہو جائے۔ غالب کا مسلمانوں کی زبوں حالی پر افسوس ایک فطری

۱۰ خطوط غالب ۳۹۵

۱۱ خطوط غالب ۳۹۵

۱۲ انگریزی پنج، خاک دردی کی وجہ سے یہ نام دہلیہ دیو خط میں بھی خلی

یعنی انگریزی سپاہی بکھا ہے۔

۱۳ خطوط غالب ۳۹۵

آعطیہ ید الہی ہے۔

اولیوسف مرزا سے جب خواجہ جان نے کہا کہ فیشن کی بجالی میں
والٹی رامپور نواب یوسف علی خاں باقم کا ہاتھ ہے تو انہیں جواب دیا۔
خواجہ جان جھوٹ بول رہے۔ والٹی رامپور کو اس فیشن کے بھرا
میں کچھ دخل نہیں۔ یہ کام خدا سنا ہے، بہ علی ابن ابی طالب علیہ السلام
بھی محل خلعت دربار کا بھگے۔ مرزا صاحب کو دربار میں داہنی طرف
دوسوں نمبر پر کرسی ملتی تھی۔ ہفت پارچہ دوسرے قوم چارہر خلعت میں
معلق تھے۔ قدر کے زمانہ میں اس کی بھی توقع نہ رہی ۱۸۶۳ء میں سربراہ برٹ
منگمری نے دربار کیا مرزا صاحب کو بلا یاد گیا تھا۔ لیکن ۱۳ مارچ کو کوئٹہ
نے یاد کیا اور خلعت عطا کیا اور بار کا شہرہ سنایا کہ ابتداء جاؤ وہاں دربار
ہو گا اور خلعت پاؤ۔ غالب نے اس کی اطلاع قریب قریب سب سنے
والوں کو دی ہے مگر بعض حضرات اس کو درست نہیں مانتے اور کہتے ہیں
کہ ہو سکتا ہے کہ غالب نے خلعت ملنے کی خبر اپنی کسی مصلحت سے اڑا دی ہو۔
ان حضرات کی یہ بات اس نے تسلیم کرنے میں تامل ہے کہ غالب نے جو حضرت
کو اطلاع دی ہے سب کو کھلے کہ لغٹ گورنر خجابت نے اپنی طرف سے
خلعت دیا۔ اس خبر کو بہنوں نے اخیالات میں بھی شائع کرنے کی کوشش کی
ہے خط بنام منشی نوکسور میں بھی خط نے خلعت کا ذکر موجود ہے۔ یہ خط
اور اخبار میں شائع ہوا تھا۔ شیونرائٹ کو بھی خط لکھا ہے ان کا بھی اخبار
نکلا کرتا تھا قیاس ہے کہ اس میں بھی یہ خبر شائع ہوئی ہوگی۔ نواب یوسف علی
خاں والٹی رامپور منشی غلام غوث خاں نے خبر منشی لغٹ گورنری میں
کو بھی لکھا ہے۔ یہ حضرات کو غلط خبر دینی کسی طرح مناسب نہیں معلوم
ہوتی۔ اخبار میں اشاعت مفید ہی نہیں بلکہ مضرت ثابت ہو سکتی تھی غالب
ایسی غلطی کسی حالت میں بھی نہیں کر سکتے تھے۔ ۱۸۶۶ء میں نواب
کلب علی خاں کو جو خط دربار اور خلعت کے سلسلہ میں لکھا ہے اس سے
یہ غلط فہمی پیدا ہوئی ہے جس کا پس منظر یہ ہے کہ لغٹ گورنر نے دہلی
میں ایک دوبار تالیف قلوب کی خاطر کیا تھا جس میں صاحبان فن و کلام
کو شرکت کا اعزاز بخشا گیا تھا یہ عام درباروں سے جداگانہ نوعیت کا
دربار تھا۔ لغٹ گورنر نے اردو میں تقریر کی تھی۔ اس میں خلعت من

امرتھا خطوط میں جا بجا اس کا اظہار پایا جاتا ہے۔ مسجدوں کے
انہدام اور ہندوؤں کے مکانات کی شان و شوکت کا مقابلہ جس
درناک انداز میں کیا ہے وہ پہلے گزر چکا۔ مولانا سائی نے یا نگار
غالب میں لکھا ہے کہ مرزا کہتے تھے کہ مجھ میں کوئی بات مسلمانی کی نہیں
ہے۔ پھر میں نہیں جانتا کہ مسلمانوں کی ذلت پر مزہ کون کون اس قدر
درج و تاسف ہوتا ہے؟ ان کے کلام میں اس موضوع پر ہم بھی بہت
کچھ پایا جاتا ہے۔ جب پنجاب میں سکھوں کا زور تھا تو مسلمانوں پر
سورہ حیات تنگ تھا، شمالی ہند میں سکھوں کے خلاف کافی فحش و غصہ
کی لہر دوڑ گئی تھی۔ مولانا سید احمد شہید اور مولانا اسماعیل شہید نے
اپنی کے خلاف جہاد کیا تھا، مومن نے شرکت جہاد کی تمنا کی تھی۔
غالب نے بھی اپنی حسرت کا اظہار بارڈنگ کے قصیدہ میں جو
فتح پنجاب کی خوشی میں لکھا ہے، اس طرح کیا ہے۔

گزارش شیعہ من نیست است بگویم دریں زمانہ مرا بچے از زمان شباب
پے شکستن کفار پیستے بہ نبرد کمر بہ سر خوشی نیت حصول ثواب
اسی طرح ایک غزل میں درگاہ ربانہ عزت میں کہنے اچھے
انما میں شکوہ پیش کیا ہے۔

نہ کنی چارہ لب خشک مسلمانے را لے بسرا بچھاں کردہ نے لب سبیل
غرض غالب نے خدا محركات خدا نتائج خدا کے بیان میں
مسلمان طبع کا شیعہ دیا ہے۔ انگریزوں کے موافق و مخالف تا خدات کا لہجہ
گزر چکا ہے۔ اب پیش اور دہا کے متعلق مختصر بیان کیا جا رہا ہے۔ انگریز
پیش ہی ۱۸۵۷ء سے بند ہوئی تھی اور ۱۸۶۰ء میں بحال ہوئی۔ اس
سلسلہ میں انہوں نے متعدد طریقہ سے کوشش کی۔ ان کے احباب
اور قدر دانوں نے بھی حتی الامکان اسی وسطارش کی، دوسروں کی سعی و
سفا رش منظر عام پر نہیں آسکی، لیکن بمقتضائے ہمدردی اس سے انکار
کی بھی گنجائش نہیں کہ دوسروں نے درپردہ اس بارے میں ضرور مدد
دی ہوگی۔ مگر غالب اس کو عطیہ ید الہی قرار دیتے ہیں۔

”میرا دماغ میرے بچا کر امت اسد الہی ہے۔ ان پیسوں فیشن کا ہاتھ

۱۔ یادگار غالب ۹۵

۲۔ کلیات نظم ۱۴۵

۳۔ کلیات نظم ۱۴۵

۱۔ خطوط غالب ۳۸۹

۲۔ خطوط غالب ۳۸۹

غالب کا کوہ گیا تھا اور کسی کو نہیں جس کا اظہار رونہ اور دہان میں بھی
ہو اور غصہ نہ گونے بھی اپنی تقریر میں اردو کی تحریف کرتے ہوئے
اس طرح کہتے "اس کی شہادت آپ کے مشہور شاعر مرزا نوشہ کے کلام
سے جن کو ابھی خلعت دی گئی ہے ظاہر ہے۔ کیونکہ معمول کے مطابق دیا
نہ تھا اس لئے اس میں خلعت ملنے کی توقع بے محل تھی اس لئے غالب نے
یہ صحیح لکھا ہے "نہ مجھے احتمال، نہ صاحب کشنر بہادر شہر کو علم" اور
غالب کے اس لکھنے کو "بعد غد اگرچہ نہیں اور دربار بھل رہا۔
لیکن خلعت موقوف ہو گیا۔" سہو پر معمول کرنا چاہیے۔

غالب کے انگریز حکام کے علاوہ دوسروں سے بھی مرام
تھے۔ جن میں منتر جان جاکوب اور انگلزنڈر ہیدرے کا نام مرفوض
ہے انگریزوں کے متعلق ایک خط میں لکھتے ہیں:-

"انگریز قوم میں سے جو ان روسیہ والوں کے ہاتھوں

قتل ہوئے۔ ان میں سے کوئی میرا میکر کا تھا اور

کوئی میرا شفیق، اور کوئی میرا دوست، اور کوئی میرا باز اور
کوئی میرا شاگرد۔"

شہر جان جاکوب سے بہت دیرینہ مراسم تھے۔ یہ فارسی کا بڑا اچھا
ذائقہ رکھتا تھا۔ دیوان حافظ کو مرتب کر کے چھپوایا تھا غالب سے دیر
لکھنا چاہا مگر غالب نے تقریظ لکھ دی جو کلیات نشر میں موجود ہے۔
خط و کتابت بھی تھی۔ مکان اور کنوئیں کی تاویخیں بھی لکھی تھیں جو کلیات
نظم میں شامل ہیں قطعہ ۳۳ میں اس کا زائچہ بھی نظم کیا ہے۔ یہ غلام
مار گیا تھا۔ حاتم علی تہر کو لکھتے ہیں:-

"ہائے میجر جان جاکوب کیا جوان مار گیا تھے اس کا

شیوہ یہ تھا کہ اردو کے فکر کو مالچ آتا اور فارسی

زبان میں شعر کہنے کی رغبت دلواتا۔ یہ بھی نہیں

ہے جن کا میں حاجی ہوں۔"

اور منشی نفثہ کو تقریظ دیوان حافظ کے متعلق لکھتے ہیں:-

"جو تقریظ دیوان حافظ کی بموجب فرمائش میجر
جان جاکوب بہادر کے لکھی ہے۔ اس کو دیکھو کہ
فقط ایک بیت میں ان کا نام اور ان کی مدح آئی
ہے اور باقی ساری نشر میں کچھ اور ہی مطالبہ ہیں۔"

انگریز ہیدرے ایک فرانسیسی خاندان کا فرد تھا۔ اس کے باپ
کسی ہندوستانی عورت سے شادی کر لی تھی۔ اور وہ بڑا اچھا شاعر تھا۔
ابتداء میں زمین العابدین خاں عارف سے شرف تلمذ تھا۔ ۱۸۶۱ء جولائی
۱۸۶۱ء کو انتقال ہوا۔ اس کے بھائی تاسس ہیدرے نے اس کا دیوان
شائع کیا تھا جس میں غالب سے بھی تلمذ مذکور ہے مگر غالب کے
کسی خط سے اس کی تصدیق نہیں ہوتی۔ اپریل ۱۸۶۰ء میں یوسف خوا
کو لکھا ہے:-

"انگریز ہیدرے صاحب میرے دوست کے

فرزند ہیں اور نیک نعت و سخاوت مند ہیں۔۔۔

... دو مقدموں میں میں نے انہیں خط لکھے مگر

انہوں نے ایک کا بھی جواب نہیں دیا اور ان مقدموں

میں سفارش بھی نہیں کی۔"

پھر ۱۸۶۰ء کو انہی کو لکھا ہے:-

"تاسس ہیدرے صاحب سے میری ملاقات نہیں

ہے۔ ہاں الگ صاحب سے ہے، سوان کے ہاں کا

خط لکھا مگر مجھے جواب نہیں ملا۔"

میر جہدی بخروا لکھا ایک خط میں لکھتے ہیں:-

"انگریز ہیدرے کا کوئی خط نہیں آیا۔ ظاہر ان کی

معاذت نہیں دونوں مجھ کو ضرور خط لکھتا رہتا ہے۔"

پھر انہی کو اس کی موت کی خبر دیتے ہوئے لکھتے ہیں:-

"انگریز ہیدرے شہر بہر الگ صاحب مر گیا۔ واقعی

بے تکلف و دیر حزن اور ترقی خواہ اور راج میں

۱۰ خطوط غالب ص ۱۱

۱۱ مقالات ماجد ص ۱۱

۱۲ خطوط غالب ص ۱۲

۱۳ خطوط غالب ص ۱۳

۱۴ خطوط غالب ص ۱۴

۱۵ غالب از ہر ص ۱۵

۱۶ کلیات نشر ص ۱۶

۱۷ ۔ ۔ ۔ ص ۱۷

۱۸ ۔ ۔ ۔ از ملک ص ۱۸

۱۹ خطوط غالب ص ۱۹

حکومت دارالحکومت تھا پٹن کے مقدمہ میں جہاں ان کو ٹھہرا پڑا۔ اس قیام کا اثر ان پر بہت اچھا ثابت ہوا۔ انگریزی ایجا سے وہ شعوری اور لاشعوری طور پر متاثر ہوئے اور انہیں ایک نئے والے دور کا شدید احساس ہوا۔ ان کے طبی میلانات اس دور آئندہ سے مناسبت رکھتے تھے چنانچہ وہ سب سے پہلے اس آثار و کچھ کر اس کی طرف متوجہ ہوئے۔ اور ایسے آثار قائم کئے اور ایسے نقوش چھوڑے کہ ان کے بعد والوں نے انہی کو نشان راہ بنایا اور ایک منزل ارتقاء کی طرف قافلہ لڑھکایا۔ اس دور آئندہ کے نشانات ان کے کلام میں بکثرت ملتے ہیں مثلاً:

مژدہ صبح دریں تیرہ خیانت نام دادند شمع کشتہ فذخو ریشہ نیل نام دادند
مژدہ صبح سے مراد دور آئندہ اند تیرہ شبان سے مراد دولہا پتی و بہلا
ہو تو کیا تعجب ہے اور مصرع ثانی ترقی کی نشان دہی کے لئے اشارہ ہو تو کیا
مید ہے مگر یہاں تاریخی شعور سے کام لیا جائے تو بات بنتی ہے کہ انگریزوں نے ہندوستان کی دولت خرد و لونی، مگر ایک نیا ذہن اور جدید شعور
انہی کی بدولت حاصل ہوا۔ غالب کے معاصرین کا کلام دیکھئے وہ اپنے مفروضہ، تنگ اور محدود دائرے سے باہر نکلنا گوارا نہیں کرتے مگر غالب طرح طرح سے دور جدید کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ ایک غزل ہے جس کی روایت "مخسب ہے پوری غزل ایک پیام بیداری ہے تشبیہ و امتداد کے پیرائے میں بہت کچھ کہہ دیا ہے پوری غزل پڑھئے اور سمجھو کہ غالب نے کیسے عالم میں بیدار کر کے نئے گوشش کی ہے ہاں خصوصاً یہ شعر:

سحر و میدہ و محل درو میدنت، مخسب!
جہاں جہاں محل نظارہ چیدنت مخسب!
تو محو خواب و سحر در تاسف اندانم
بہشت دست برداں گزیدنت مخسب!
نشان زندگی دل درویدنت ماینت
ملائے آئینہ چشم دیدنت، مخسب!

اور بہت سی غزلوں میں بھی احساس کارفرما ہے چند شعرا اور ملاحظہ فرمائیے!

دھم کہ بگلی ز تبا شاہر انگسٹم
درہم دنگ و بونٹے دھگیا انگسٹم

اور مجھ میں متوسط تھا۔

ان بیانات میں شاگردی کا ذکر کہیں نہیں لیکن قیاس یہ ہے کہ عارف کے انتقال کے بعد اس نے غالب سے غرور و اصلاح لی ہوگی تا مگر نے نے بھی اپنے ویباچہ میں اس کا اعتراف نہیں کیا، البتہ منشی شوکت علی صاحب کے ویباچہ میں غالب کی شاگردی کا ذکر ہے۔

اب تک غالب کے انگریزوں سے روابط بیان کئے گئے۔ مجید جان جاکوب اور آگنڈ ہڈ ہڈ کے علاوہ اور وہ سے تعلق تمام تہذیب، فطرت اور دربار کے سلسلہ میں رہا۔ حصول عظمت و برتری کی خاطر غالب ان روابط کے لئے مجبور تھے۔ اگر غالب نے انگریزوں کی مدد مافی کہ ہے تو ان کی برائی کرنے سے بھی گریز نہیں کیا ہے۔ لیکن ان روابط نے غالب کو فائدہ بھی پہنچایا ہے۔ غالب طبعاً جدت پسند تھے، شاہراہ غا سے الگ چلنا بھی ان کی فطرت میں تھا۔ طبع معنی باب و فکر دور رس پائی تھی۔ پیشین کے تفسیر میں انہیں مالی فائدہ تو نہیں پہنچا، مگر فکر و نظر کے لئے اسباب انادیت فراہم ہوتے رہے۔ دہلی سے کلکتہ کو چلے راستہ میں تجربات حاصل ہوتے۔ یہ احساس برتری ہی تھا کہ لکھنؤ میں محمد اندولہ آغا میر سے صرف اس لئے نہ ملے کہ اس نے غالب کی یہ دو شرطیں منظور نہ کیں اول یہ کہ نائب السلطنت غالب کی تعلیم دیں، دوسرے نہ شہیا کرنے سے معاف رکھا جائے۔ باندہ، بنارس، مرشد آباد لکھنؤ میں بہت سے حضرات سے ملاقات ہوئی۔ بنارس بہت پسند آیا اس سے تعلق مشنوی چراغ دیر ایک عمدہ شنوی ہے۔ کلکتہ پہنچے۔ وہاں کی ادبی کا نامہ آرائی نے غالب کو غفلت مضمر نہ چنے میں بڑی تقویت پہنچائی۔ اس بحث میں بھی احساس برتری اور شعور کتری کی آویزش کو بڑا دخل ہے۔ ایرانیوں کی تعریف نے دل کے حوصلے بڑھائے۔ مرزا کوچک ایک ایرانی فاضل نے بھی محفل میں غالب کے متعلق کہہ دیا کہ آج اس درجہ کا شاعر سرزمین ایران میں بھی کوئی نہیں ہے۔ غالب کی صلح ہوئی بھی ہاں مخالف کے روپ میں ڈھلی۔

۱۔ خطوط غالب ص ۲۹

۲۔ مقالات ماجد ص ۱۱

۳۔ یادگار غالب ص ۳۳

۴۔ غالب از ہر حاشیہ ص ۱۲

۳۱ مادہ پنج ترشہ دوسرے دیش تر
بگدا زما بگینہ وور ساغرا مگنم
بخت دوزخا بست / بختا م کہ بیلار ش کم
یارہ غوغاے عشر کو در کاوش کنم
بیا کہ تادمہ آسمان بگر و نیم
قضا بگر دوش و دل گراں بگر و نیم

اور اردو میں مشہور قطعہ۔

اے تازہ دار فان بساط چولہے دل
ز نہار گر تہیں ہوس ناؤ نوش ہے

میں جو کیفیت ہے اس کو دیکھتے ہی کہ وہ گوش حقیقت نبیوش ہی کی
ضرورت ہے کہ نہ نکلا اس کا سرچشمہ نہ اسے سروش ہے گویا دم کوڑتی ہوئی
مغلیہ تہذیب کی تصویریں ان کے علاوہ غالب کی پیش بینی اور نئے دور کی طرف
کھلے اشارے، آئین اکبری کی تقریظ میں ملے ہیں جو سرسید احمد خاں کی
فرمائش پر لکھی گئی تھی اس مثنوی میں انہوں نے سرسید احمد خاں کو مشورہ
دیا تھا کہ وہ پہلے آئین وروش کو چھوڑ کر نئے آئین وایجادات کی طرف
متوجہ ہوں۔ دیکھیں کہ انگریزوں نے دغائی شتی، ریل، موٹو، ٹیلی گرام
ٹیلی فون، گرام فون، گیس کی روشنی، دیاسلائی وغیرہ ایجاد کی ہیں اگرچہ
سرسید احمد خاں نے اس وقت اس مثنوی کو قبول نہ کیا اور اس کی وجہ
یہ تھی کہ غالب نے یہ بات اپنی روشن طبع اور باطن نظری کی وجہ سے بہت
پہلے محسوس کر کے لکھ دی تھی۔ غالب کی نگاہ دور میں، اس قدیم
دور در تہذیب کو ختم ہونے دیکھ رہی تھی۔ اے ایک نئے دور کی آمد کا
شعور احساس تھا۔ اس سے دور جدید کی طرف رخ بدلنے کا عمل بین
طور پر دکھائی دیتا ہے جس کی روح، عقل، عمل اور تجسس ہے۔ تاہم
۱۸۵۷ء کے بعد سرسید احمد خاں کو غالب کے بتائے ہوئے راستہ کو اختیار
کرنا پڑا۔

غالب نے صرف انگریزوں کی ایجادات اور آئین ہی کی طرف توجہ

لے خدر کے بعد جدیدی ظاہر ہے غالب کی پیش بینی قابلِ داد ہے۔

۳۱ مثنوی کلیات نظم ص ۱۰۱ اس سلسلہ میں میرا مضمون غالب اور سرسید
مطبوعہ ماہ لوشمارہ بابت فروری ۱۹۶۱ء کی ملاحظہ کیا جائے۔

نہیں کی بلکہ انگریزی زبان کے الفاظ کو بھی بکثرت استعمال کیلئے۔ ان کے
معاصرین کے ہاں اس کثرت سے نہیں پائے جاتے اس کی وجہ یہ ہے کہ
جن حالات سے انہیں دوچار ہونا پڑا ان کے ہم عصر، ان حالات سے
بہت دور تھے۔ فٹن کے تفسیر اور مقدمہ، بندش اور سجائی خنعت
و دربار کے معاملہ میں انہیں بعض انگریزی لفظوں سے واسطہ پڑا اور
انہیں بے تحلف اپنی اردو اور فارسی تحریروں میں استعمال کیلئے۔ ایک
خط میں لکھتے ہیں:

”چالی، کہ بانی فارسی اور پائے حلی ہے کالی اور پانی اور
پالی یہ قافیہ ہمہ گیر ہو سکتے ہیں۔ چالی، لغت انگریزی
ہے۔ اس نزلے میں اس اسم کا شعر میں لانا جائز ہے۔
بلکہ مزاد تیلے۔ تا نکلی اور دغائی جہاز کے مضامین
میں نے اپنے یاروں کو دئے ہیں۔ اور وں نے بھی
باندھے ہیں اور بکاری اور طلبی اور موجود اور ای اور
مشرشتہ دار، خود یہ الفاظ میں نے پائے ہیں۔
چالی بہ معنی کلید شوق سے لکھو نہ چاہی۔“

الفاظ کا اصطلاحات کے علاوہ بہت سے لفظوں کا ترجمہ بھی کیلئے
مثلاً، چس کو انگریزی دیا سلائی۔ نو کو آئین کی تصویر، عکس کی تصویر
مارشل لا کو جنرلی بندوبست۔ گورنر جنرل کو حاکم اکبر لکھا ہے۔ دیکھئے!
صاحب، امیم اور بابا کو کیسے عمدہ طور سے اپنے بیوی اور بچوں کے لئے
استعمال کرتے ہیں۔ پھر صاحب اولیم اور بابا لوگ اپنے قدیم مسکن میں
آ رہے ہیں۔ یہی نہیں بلکہ چک، نوٹ، پورٹ کو نظم بھی کیا ہے:

آدے نہ چک بود نہ تمسک نہ ہر کہ ہست
لے دستخط نہ ہرن نام و نشان دوست
مضمون شعر نوٹ بودنی زمانہ
یعنی بدست ہر کہ بیفتا دان دوست

غالب کے نزدیک ولایتی یعنی انگریز اور دو کو کا حقہ نہیں سمجھ
سکتے تھے یہ حبیب اللہ خاں ڈاکو لکھتے ہیں:-

”آپ ولایتی ہی نہیں جو میں یہ تصور کر رہا ہوں کہ اردو

۱۔ خطوط غالب ص ۵۲

۲۔ خطوط غالب ص ۵۲
۳۔ کلیات نظم ص ۱۰۱

مولانا ابوالکلام آزاد کے بیان میں ہمیں اس لئے قائل ہے کہ غالب نے پنج آہنگ کا دیباچہ اور آہنگ اول ۱۸۲۵ء میں اور آہنگ دوم ۱۸۲۷ء میں مرتب کر دیا تھا۔ اس میں لکھتے ہیں:

”اداش اس جانتے ہے کہ نگارش میں میری روش

یہ ہے کہ جب کاغذ و قلم ہاتھ میں لیتا ہوں تو کتب و خطبات کو اس کے مرتبہ کے لائق لفظ سے خطاب کرتا ہوں

اور مدعا بیان کرنے لگتا ہوں۔ القاب، آداب

خیریت گوئی اور عاقبت جوئی حشو و زاید نہیں

دیباچہ ہی میں کتب و نگار کو ہدایات فرمائی ہیں بیشیز امور کو ترک کرنے اور اختیار کرنے کے متعلق لکھا ہے ابتدا میں لکھتے ہیں:-

”نامہ نگار کو چاہئے کہ نگارش کو گزارش سے الگ

ذکرے تحریر کو تقریر کا رنگ دے۔ مطلب کو اس طرح

ادا کرے کہ اس کا سمجھنا دشوار نہ ہو۔“

غرض غالب کے دیباچہ کو سامنے رکھتے ہوئے یہ فیصلہ کرنا چاہیے

نہیں کہ یہ اسلوب ان کا اپنا ایجاد کردہ تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ

انگریزوں سے ان کے مراسم نہ تھے۔ کلکتہ کی سیر تو درکنار، سفر

کلکتہ کا خیال بھی نہ تھا۔ مولانا آزاد نے قیاس سے کام لیا ہے تحقیقی

بات نہیں ہے۔ مگر پلٹ و ناتر تہ کی قیاس سے آجکل دہلی بابت ستمبر ۱۹۵۲ء

میں ایک مضمون شائع کرایا جس میں غالب کی طرز خطوط نویسی کو غالب کی

ایجاد تسلیم نہیں کیا۔ بلا منشی راجندر کے ایک مضمون مطبوعہ رسالہ

محبت ہند جلد ۲۹ بابت دسمبر ۱۹۴۶ء و جنوری ۱۹۵۰ء سے اثر

پذیرا کا نتیجہ اور کامیاب تقلید کا نمونہ قرار دیا ہے۔ اس کے متعلق

پھر کبھی سیر حاصل بحث کی جائے گی سر دست یہی کافی ہے کہ ۱۸۲۵ء

کی تحریر کی موجودگی میں یہ ثابت کیا جاسکتا ہے کہ منشی راجندر کا مضمون

غالب سے استفادہ کا نتیجہ ہے۔

اختصار یہ امور بند کردہ ہمارے نزدیک رابطہ فرما میں چاہا

جوابت سے استنباط مطلب اچھی طرح ذکر کر سکے۔

انگریز اردو سے نا بلند ہونے کی وجہ سے غلط اردو بولتے تھے اس کے

متعلق بھی اشارہ کئے ہیں مثلاً ”اب ہم سے ملنا کیوں مانگتے ہو؟“ یا ایک

اور جگہ لکھتے ہیں ”فریاد مؤنث، فریاد کر لینی چاہیے۔ فریاد کر لینا، انگریز

بولد ہے۔“ غالب اس فرق کو اچھی طرح سمجھتے تھے۔ آج ہم بھی یہی کہتے ہیں

کہ اردو کو انگریزی محاورہ سے بچایا جائے۔ انگریزی کے رواج کے متعلق

لکھتے ہیں:- ”محل، جنو، پھانسی انگریزی لغت ہے۔ انگریزی زبان نے

ہنگامے میں سو برس اور دہائی، اکبر آباد میں ساٹھ برس سے رواج پایا“

غالب کی تحریروں میں بعض انگریزی لفظوں کا تلفظ بدلا ہوا ہے

مثلاً لاؤ کو لاؤ اور لاٹ لکھتے ہیں بیشیز کو بیش، بریکٹیر کو برکٹیر،

سائیکلیٹ کو سارنی فلٹ، اسٹیشن کو اسٹین، کیمپ کو کپ اور

کنپ، نمبر کو لمبر لکھا ہے مرزا جواں نخت کے سہرے میں نمبر ہی نظم کیا ہے:-

سہرے چڑھنا مجھے چہ نسبت ہے پہلے طرف کلاہ

مجھ کو دوسرے کہ نہ چھینے ترالمبر سہرا

اسی طرح محک کو کسی معنی میں استعمال کیا ہے بلکہ اسٹارپ،

محک، اجارت نامہ، دہریٹ، محک، ملاقاتی کا رڈ۔ انگریزی الفاظ کی

ایک فہرست آخر میں شامل کی جا رہی ہے۔

غالب کی اردو و نثر میں، خطوط قابل ذکر ہیں۔ ان کی طرز

تحریر کے متعلق اکثر حضرات کا یہ کہنا ہے کہ یہ انگریزی طرز سے تاثر کا

نتیجہ ہے مولانا ابوالکلام آزاد لکھتے ہیں:

”خط و کتابت میں قدیم اسلوب القاب و مخاطب سے کلی

احترام اور محض کسی ایک نام و لقب سے یاد کر کے براہ راست حرف

مطلب پر آ جانا، جو اس عہد میں ایک غیر معمولی بات تھی۔ یقیناً انگریزی

اسلوب کے تاثر سے سامنے آئی۔“

۱۔ خطوط غالب ۱۸۵۵ء

۲۔ خطوط غالب ۱۸۵۶ء

۳۔ خطوط غالب ۱۸۵۷ء

۴۔ خطوط غالب ۱۸۵۸ء

۵۔ غالب از مبر ۱۸۵۹ء

۱۔ کلیات نثر مرث

۲۔ کلیات نثر مرث (نوم)

۳۔ کلیات نثر مرث (ترجمہ)

اب میں غالب کے بہتے ہوئے انگریزی الفاظ کی فہرست پیش کرتا ہوں:

1. TICKET. ٹکٹ
2. GOVERNMENT. گورنمنٹ - گورنمنٹ
3. PENSION. پنشن
4. DIVISION. کمشنری
5. DOCTOR. ڈاکٹر
6. CAMP. کیمپ - کیمپ
7. AGREEMENT. اگریمینٹ
8. COLLECTORATE. کلکٹریٹ
9. INCOME TAX. انکم ٹیکس
10. PARCEL. پارسل
11. TIFFIN. ٹیفن
12. DEPUTY. ڈیپٹی
13. COMMITTEE. کمیٹی
14. RAIL. ریل
15. REPORT. رپورٹ
16. AGENT. ایجنٹ - ایجنٹ
17. POST PAID. پوسٹ پیڈ
18. DEPUTY COMMISSIONER. ڈیپٹی کمشنر
19. REPLY POST CARD. ڈبل خطا پوسٹ پیڈ
20. MARTIAL LAW. جرنیلی بندوبست
21. BANK. بینک
22. REGISTERED. رجسٹرڈ
23. GOVERNOR GENERAL. حکم اکبر گورنر جنرل
24. POCKET. پاکٹ
25. LIEUTENANT GOVERNOR. لفٹننٹ گورنر
26. PAMPHLET POCKET. پمفلٹ پاکٹ
27. BABU. بابو
28. COPY. کاپی
29. FRENCH. فرنچ (کاغذ کا نام)
30. NUMBER. نمبر، طبرو

تعلق تمام تر خاندانی اعزازات کی برقراری جس سے ہمیں بیکہ غالب کی معیشت سے بھی گہرا رابطہ ہے۔ اور ان دونوں نے نفسیاتی طور پر ان کو متاثر کیا تھا۔ البتہ جدید آئین و مجادلات سے دلچسپی ان کی ترقی پذیر طبیعت اور جدت پسند فطرت سے مناسب تھے باوث ہے۔ وہ خود ماحفہ دینا کھڑے کے اصول پر عمل پیرا تھے۔ انہوں نے "مے فرنگ" میں نفاست، لذت، بول رنگ بہہ لایا۔ اس کے ذریعہ ہونگے۔ اولڈ نام، فرنگ، شام چین، کاس ٹین، وغیرہ سے رغبت ہو گئی۔ اور شراب تندی ہند سے ہمیشہ نفرت رہی بلکہ اس کے مقابل میں شراب کشمیری کو بہتر خیال کرتے تھے:

غالب شراب تندی ہند میں کباب کرد

نرس بعد بادہ بائے گوا لاکشید کرد

شراب تندی ہند وستان دامن سحر

ز شہرہ خانہ کشمیر، درندہ شراب

ان رد و بط کے سلسلہ میں باب چھرا سحر کر پڑا جاتی ہے کہ غالب کی زندگی کے حالات زمانہ کی تاریخی رو سے متصادم ہوئے اور غالب کو کبھی کسی اپنے بلند مقام سے نیچے اتار کر باتیں کرتی تھیں۔ نہ صرف انگریزوں کی مدح سرائی بلکہ مسلمان اور ہندو زعماء اور حکمرانوں کی شان میں قصیدہ خوانی بھی ان کے منزل سے تعلق رکھتی ہے۔ کیونکہ وہ خود کہتے ہیں:

لیک نا بد زمیں کہ درخشاں

مدحت لارہ سو رواں گنم

عاجان دولہ و حکومت کی مدح سرائی اور قصیدہ خوانی میں جو وقت برباد ہوا اور جو قوت بیان ضائع ہوئی ان کا احساس بہتر ہے اس پر آخر عمر میں یہ افسوس کرتا رہا۔ سمجھتا تھا کہ اپنی زندگی کا محاسبہ کرنے پر اسے لکھتے ہیں:

"دہوئے کہ بال بالا غنی زدہ ام و دلا وائیکہ

خود را بشکر نی ستودہ ام، نیمہ ازاں شاہد زبانت

یعنی ہوا پرستی و نیمہ دیگر تو آئینہ نیست یعنی ہوا غنی

... شادم اندازہ کی کہ بد سخن بھی عشق بازان

گزارہستم، و دامن آزار ہندی کہ درونی چند بگردار

دنیا طلبان، و مدح اہل جاہ سیر کہ ہستم۔"

طہ کلیات نثر ص ۱۵ و کلیات نظم ص ۱۵

31. COUNCIL.	کونسل	63. PRESIDENT.	پریسیڈنٹ (پریسیڈنٹ)
32. FRAME. (PLATE)	فریم	64. LONDON.	لندن
33. SECRETARY.	سکرٹری	65. ENGLAND	انگلینڈ
34. FRENCH.	فرنگ (شراب کا نام)	66. COMMANDER-IN-CHIEF.	کمانڈر چیف
35. CAMPAIGN	شام بین	67. POST MASTER.	پوسٹ ماسٹر
36. POLICE.	پولیس	68. STAMP.	اسٹامپ
37. STAMP PAID.	اسٹامپ پیڈ	69. PERMIT.	پریمٹ
38. DOUBLE TICKET.	ڈبل ٹکٹ	70. COMMISSIONER.	کمنشنر
39. GAZETTE.	گزنٹ	71. COURT.	کورت
40. LORDS.	لارڈ۔ لارڈ۔ لائٹ	72. TELEGRAM.	تار برقی (ٹیلیگرام)
41. SECRETARY.	سکرٹری۔ سکرٹری	73. FINANCIAL COMMISSIONER.	فینانشل کمنشنر
42. SICK NUMBER.	سکھ لبر (بزدل بیمار)	74. NOTE.	نوٹ
43. CERTIFICATE.	سرٹیفیکٹ۔ سارقی ٹکٹ	75. CHEQUE.	چک
44. LIQUOR.	لیکور	76. SESSIONS JUDGE.	سشن جج
45. TICKET.	ٹکٹ (ملاقاتی کارڈ)	77. EXTRA ASSISTANT.	اکسٹرا اسسٹنٹ
46. DEPUTY COLLECTOR.	ڈپٹی کالکٹر	78. BOX.	بکس
47. COMPANY.	کمپنی	79. HOSPITAL.	اسپتال
48. APPEAL.	اپیل	80. GALLIOWS.	گل (پھانسی)
49. ENGLISH.	انگلس	81. COSTUME (?)	کاسٹم (شراب)
50. POST.	پوسٹ (ٹکٹ چسپاں)	82. OLD TOM.	اولڈ ٹام (شراب)
51. PAID.	پیڈ (ٹکٹ چسپاں)	83. QUEEN'S POET.	کونٹس پوسٹ
52. STATION.	اسٹیشن	84. BRIGADIER.	برگنڈیر، برگنڈیر
53. COURT OF DIRECTORS.	کورت آف ڈرکٹر	85. GENERAL.	جنرل
54. REVENUE BOARD.	ریونیو بورڈ	86. INDIAN GOVERNMENT.	انڈیا گورنمنٹ
55. RESIDENT.	ریسڈنٹ۔ ریزیڈنٹ	87. BARRACK.	بارک
56. RESIDENCY.	ریسڈنسی۔ ریزیڈنسی	88. MISS.	مس
57. AGENCY.	ایجنسی۔ اجنسی	89. MISTER. (MR)	مستر
58. AGENT.	ایجنٹ۔ اجنٹ	90. TICKET. (PERMIT)	ٹکٹ (اجازت نامہ)
59. DECREE.	ڈگری	91. STEAMER.	دھانی جہاز
60. MAGISTRATE.	مجسٹریٹ	92. MATCH.	انگرمزنی دیاسلائی
61. ASSISTANT SECRETARY.	اسسٹنٹ سکرٹری	93. COUNCIL.	کونسل (باہمی مشورہ)
62. CHIEF SECRETARY.	چیف سکرٹری		

”گنجفہ بازِ خیال“

(ایک تصور یہ)

رفیق خاور

وہی ہے۔ وہی خنرہ معصومیت جس میں کثافت کا کوئی شائبہ نہیں۔ وہ پست دیوار جس کے عقب میں وہ اس قدر متانت سے جلوہ افروز ہے، اس کے پر تو جمال سے کیسی سنور گئی ہے! دیوار پر ہمارے نام کندہ! ان کی بجائے گی میں کس قدر کیف ہے! ایک مقدس حجاب پر ابھی اترام! یہ دیوار پر لکیریں جیسے مرمریں کف دست پر ہمدرد پیوستہ خطوط! یہ سبز زنگری۔ کچھ بھی نہ ہوں پھر بھی سب کچھ ہیں۔ یہ کیا طلسم تھا جس نے مجھے اس قدر محو کر دیا! میرے دست حویلی کی چھت پر کنکڑے اڑا رہے تھے۔ کیسے عجیب و غریب کنکڑے تھے اور ہم کس ذوق و شوق سے حلقہ یا ندھ کر لایا نہ رقص کرتے، گاتے اور تالیاں بجاتے تھے۔ ایک ایک کر کے ڈور اپنے ہاتھ میں لیتے۔ اڑتی ہوئی پر بیزاد جیسی کنکیا کو طرح طرح کے پھیر دیتے اور بھاؤ تانے کی ان گنت صورتیں پیدا کرتے۔ اس سے بے خبر کر چھت کے نیچے مگر دالوں پر کیا گزرتی ہوگی۔ اور جو یہی اس حلقہ میں کھڑے کھڑے مجھے دور سے لقمہ کی جھلک دکھائی دی! جیسے یکلخت قدیم ایرانی کاریگر کا ایک جھلکی برنجی طبقہ نظر کے سامنے جھگکا اٹھے، میں سب کو چھوڑ چھاڑ کر اس کی طرف ایک بے پناہ داپہیت کے ساتھ دوڑ پڑا۔ جیسے ایک نہایت قوی مقناطیس نے مجھے اپنی طرف کھینچ لیا ہو۔ وہ خاموشی کم سی ممکنیت کی تصویر تھی۔ اسے دیکھتے ہی اُس نو مشقی کے عالم میں بھی بے اختیار کیا جست شعر منہ سے نکل گیا جیسے عین وقت پر روح القدس کی طرف سے فیضان ہوا ہو۔

خوشیوں سے تماشہ ادا نکلتی ہے

نگاہ دل سے تری مرمر سا نکلتی ہے

باتی غزل تو برسوں بعد جیسے بنی سو بنی مگر خلوص اور واقعیت نے مطلع میں جو رنگ پیدا کر دیا ہے، اسی کا حصہ ہے لقمہ سر پہ پلکا

یہ روشنیاں بعض دھیمی دھیمی دھندلی دھندلی بعض نکستی بجھتی اور کچھ ایسی جیسے وہ کچھ چکی ہوں یا کھر کے بوجھل پر دے میں روپوش ہو چکی ہوں۔ یہ سلسلہ دور تک پھیلا ہوا۔ بہت دور! اس قدر کہ وہاں تک پہنچتے پہنچتے نگاہ آبلہ پا ہو جائے۔ کتنا دلچسپ اور عجیب ہے! وہ آخری قندیل۔ دیکھتے ہی دیکھتے اس کی لو کستی تیز ہو گئی! اس کی حرارت سے شیشے پرچی ہوئی نہی کستی سرعت سے نیچے اترتی جا رہی ہے۔ ہر وہ وہی سماں جو میں نے کلکتہ کی ایک فرنگی تماشہ گاہ میں دیکھا تھا، اُن گاہاں صاف کے مانند کھلتے رنگ کا اجلا اجلا پردہ سرکنے کا عمل ہو رہی ہے۔ صغودی نہیں۔ جیسے اک ہنگام آتشیں رخ کے تابناک چہرے سے ملاحت آمیز انگوری، سیمائی آنجل، خزیلہ، مغزید، مائل، بنشید ہو۔ تمازت آفتاب کی بدولت آج سے تمام دن کے ابھرتے ہوئے بخارات بھی تو کچھ کم طلسم آفریں نہیں جو پہنائے نظر میں کسی ہروش کے صندلی شانوں پر شبرنگ زلفائے پریشاں کا سماں پیدا کر رہے ہیں۔

چاندنی چوک کی یہ دلاؤ نریاں کیونکر خاموش کی جاسکتی ہیں۔ میزب نماہر جیسے کسی نے دور تک سیال چاندنی بچھا دی ہو۔ شام کو انسان یہاں نہ آئے تو کہاں جلے۔ لو، قندیل ہلک جھپکنے میں اور تیز! اس قدر خیر و کن! کیونکہ بخارات کا طبل کی طرح باریک غلاف اب بالکل اتر چکا ہے اور روشنی اپنی پوری برائی کے ساتھ کھڑکے کے شفاف سینے سے چھین چھین کر آنے لگی ہے۔ بار ابلنا! یہ کون سے کی لپک! جیسے جبریل امیں دفعتاً اپنی پوری الہامی وجاہت اور کور فرمے آشکار ہوں۔ نغمہ! ہو ہو وہی! وہی ملکو تو جیوں! وہی ملا ہوئی چہرہ ایک پر تمکین شعلہ جوار، مہار اور حقیقت کے جمیل ترین امتزاج کی کی فروزاں تمثیل ملکہ بوس ہونے کو آئے لیکن اس کا نروانی شکوہ

نظر آتی تھی۔ اللہ اللہ! میرے لئے — جذباتی اور وجدانی نشے —
اس کے مافوق البشر رنگ سے کیسے شاداب و سرشار ہوئے۔ اور
ان کی مستیوں میں رگ رگ اور ریشہ ریشہ میں دوڑ دوڑ کر میرے
اشعار۔ ان کے بحور۔ ان کے ترنم۔ ان کے لفظ لفظ میں کسی التہابی
شعریت کے ساتھ سرایت کر گئیں۔ اس اولین احساس غیرے
دل و دماغ کے نہاں خانوں میں کیا کیا پُرکار یادیں چھوڑ دی ہیں۔

وہ فراق اور وہ وصال کہاں
وہ شب و روز و ماہ و سال کہاں
فرصت کا دوبار شوق کسے
ذوق نظارۂ جمال کہاں
دل تو دل وہ دماغ بھی نہ رہا
شور سودائے خط و خال کہاں

تھی وہ اک شخص کے تصور سے
اب وہ رعنائی خیال کہاں
بس بس یہیں تک۔ اس غزل کا برا ہو۔ آدمی چلتا کس طرف ہے
اور یہ اسے کھینچ کھینچ کر کہاں لے جاتی ہے۔ معاذ اللہ! میں یہ غزل
نکتے نکتے بہک کر کہاں کا کہاں چلا گیا۔ یہ بھی میں نے کہنے ہی کو
کہہ دیا تھا کہ ”اب وہ رعنائی خیال کہاں“۔ ورنہ خوب جانتا ہوں
میری شخصیت، میرے کلام کا کوئی ذرہ بے پر تو بخیر شہید نہیں۔
اس میں نغمہ ہی کی بھرپور رعنائی کا تامل ہے۔

طبع انسانی ہی کی طرح فرما شہ ہے۔ یہ احساس تھا کہ کلاور
ادا کب ہوا۔ گویا میں اسے اتنے برس اپنے ساتھ لئے پھرا۔ اب کسی
کو یہ بتاؤں تو وہ مجھ پر بے اختیار ہنس دے گا۔ کہے گا ”بچ بچ
سٹھیا گئے ہو۔ لیکن یہ راز تو میں ہی جانتا ہوں کہ جب قویٰ مضمحل
ہو گئے اور عناصر میں کوئی اعتدال نہ رہا۔ تو کوئی کرشمہ غیبی رسولؐ
دل کی تہوں میں خریدہ احساس کو بروئے کار لے آیا۔ اب اگر
اس میں بچنے کے چہل پن اور شباب کے شور و مستی کی بجائے بڑھاپے
کی نڈھال انصافیت نہ ہو تو اچھا کیا ہو؟

ایک محبت ثبات پیدا کرتی ہے، دوسری بیزاری۔ نغمہ
نے — میں اسے محبت کہوں یا وفاق روحانی مجھے اس محبت
کا کیف سردی عطا کیا جو ثبات پیدا کرتی ہے۔ یہ بھی اس کے ”ماونہ کراچی“

تک جلال تھی۔ اس کی نموشی میرے لائیا لیا نہ بن پر ایک تین مرتبہ
تھی۔ وہ میرے دل و دماغ پر یہ گہرا نقش ثبت کر کے نہ جانے
کہاں چلی گئی، مگر خلاؤں میں روپوش ہو گئی۔ لیکن کوئی خلا سے جذب
نہیں کر سکتا۔ وہ اب بھی جب چاہے سراپا وہ اسرار سے نکل کر اسی
سطوت و جلال کے ساتھ جلوہ گر ہو سکتی ہے۔ نغمہ مجھ سے دور نہیں
ہوئی۔ وہ میری تھی، وہ ہمیشہ میرے ساتھ رہی اور زندگی کی حبیب
پستیوں۔ فاختانہ سر بلند یوں۔ شدید سے شدید بجائوں عظیم عظیم
طوفانوں اور زبوں سے زبوں فاختا دوں میں میرے ساتھ رہی جیسے
خود حسین مثالی کی شان کبریائی کا ثبات سفلی پر دائماً پر توڑ الٹی ہے۔
اسی طرح اس کلبیکو جمیل بھی میری ہستی پر پرتو فگن ہے۔ میری زندگی
کے ہمیشہ دودھارے رہے۔ نغمہ نے دفعۂ نمودار ہو کر ان میں ایک اور
زبردست دھارا ملا دیا۔ اس نے زیریں دھارے میں — میں اسے زیریں
ہی کہوں گا کیونکہ گویہ بظاہر تانائیاں نہ تھا لیکن تھا زیادہ گہرا اور پڑھ
— ایک طوفانی کیفیت پیدا کر دی جیسے قدرت نے اس کو دفعۂ
ایک اور ہی قوت اور گیرائی عطا کر دی ہو۔

مجھے خوب یاد ہے۔ اس دن اور اس کے بعد جب بھی میں
تاج محل گیا مجھے اس میں ایک اور ہی شان، اور ہی معنی دکھائی دیے۔
مجھے اس میں نغمہ ہی نغمہ تحلیل نظر آتی تھی۔ اور اس کی نمکنت نے اسے
ثبات سے ماورا متانت، جمال سے ماورا جمال عطا کر دیا تھا۔ اور
تاج محل پر ہی کیا منحصر ہے، مجھے اپنے ہر فعل، ہر خیال، ہر لفظ اور قدرت
کی ہر چیز میں ہی شان اور جمندی دکھائی دینے لگی۔ اب اس قدر دل نے
دفعۂ روشن ہو کر جو یہ کہربانی صورت اختیار کر لی ہے۔ تو اس سے
بصر میں پھر کس قدر تجلیاں بھوٹ رہی ہیں اور کتنے ہی تار تپ تپ
کر دینے لگے ہیں۔ سرخ رنگ بھی کیا قیامت ہے۔ مجھے پھر یاد آیا۔
اس شعر پر نغمہ کی کیسی چھوٹ پڑ رہی ہے۔ ہاں ہاں نغمہ ہی کے
شفق گول چہرے کی چھوٹ،

نشہ ہا شاداب رنگ دسا زہامت طرب
شیشے سے سرو سبز جو تبار نغمہ ہے

اب کسی کو کیا معلوم کہ یہ سچ کے نشے یا کتنا رجو مضمحل تاؤ نوش کا
ذکر نہیں بلکہ شیشے سے کسی کے جمیل پیکی کی مبدل صورت ہے۔
جو نو برس کی عمر میں بھی سرو کی سی بلندی اور تحمل پیدا کرتی ہوئی

ہونے کا عجیب کرشمہ تھا۔ یہ حسرت آمیز منزل اس ہی کی قدین ہے۔
یار دروہد جوانی بہ کنار آمد و رفت
ہنچو عیدے کہ بہ ایام بہار آمد و رفت
یہ کیا لطیف درد تھا جو نغمہ نے مجھے عطا کیا اور روپوش ہو گئی۔
کیا خبر ظہری کو بھی ایسا ہی تجربہ ہوا ہو اور اس نے میرے ہی دل
کی کیفیت شعر کے پردے میں یوں کھول کر رکھ دی ہو۔
شد طیب ما حبت۔ منتشیر جان ما
محنت ما، راحت ما، دردا، آزار ما
اور رومی کی روح ابدالاً باتک خوش رہے جس نے یہ ترانہ الہامی
انشا کیا:

شاد باش اے عشق خوش سودائے ما

اے طیب جسد علتہائے ما

کچھ ان اشعار کا والہانہ کیف۔ کچھ احساس جبلی اور کچھ طبع زود رس
اور تخیل شگوفہ کار کی کار فرمائی۔ یہ قصہ ہے تب کا کہ آتش جواں
تھا۔ مجھے بھی ان کی گہرائیوں میں ڈوب کر اس احساس کی ترجمانی
کرتے ہی ہن پڑی۔ کیا اچھا ہو اگر اس احساس میں ان دونوں اہل دل
اور میرے شعور کی رو میں بچا ہو گئیں۔ یہ احساس میرے دل پر بچا گیا،
میرا بن گیا، میں اسے اپناتے بغیر نہ رہ سکا۔ کیا مجال کوئی خیال ایک
اپنی ندرت، مسائل حیات پر غور و فکر یا دوسروں سے اثر پذیری
کے سبب ایک بار ذہن میں جاگزین ہو جائے اور نطق کے سانچے
میں نہ ڈھلے۔ چنانچہ یہ گراں مایہ احساس بھی لباس نغمی سے آراستہ
ہو کر رہا اور کس شان سے:

عشق سے طبیعت نے زلیست کا مزا پایا

درد کی دوا پائی، دردِ لا دوا پایا

اس میں "درد لا دوا" کی رمز خفی اور کسک کو میرے سوا
اور کون جانے؟ ہائے یہ شور یدگی! یہ مستی! اس نے مجھے
کہیں کا نہیں رکھا۔ خوب یاد آیا۔ جب میں اور تو آئے سننے
کھڑے تھے۔ ایک تمام حسن، ایک تمام شوق۔ ایک سراپا تجلی،
ایک سراپا نظارہ۔ اور ہم ایک خاموش سکھ سے اپنے واردات
کو تشکیل کر رہے تھے تو میں ایسا محسوس کرتا تھا گویا قدرت نے
مجھے ایک لباس فاخر پہنا دیا ہے۔ میں اتنا سر بلند ہو گیا ہوں

کہ میرا سر آسمان بوس ہے اور جسم کی گیرائی کو تمام آفاق پر مستولی
خدا جانے یہ کیسا احساس تھا۔ ایک عجیب احساس۔ اور پھر
عجیب تر پیکر میرے شعور میں کچھ ایسی دکاوت۔ حواس میں ایسی
تیزی اور تخیل میں ایسی برا نیگیٹنگلی پیدا ہوئی گویا دفعہ مجھ پر
سینکڑوں درد ازلے کھل گئے۔ دل کی عمیق ترین تہوں سے خیال
پر خیال شلالہ وار بلند ہوئے یہ کیوں ہوا۔ کیسے ہوا؟ آج بھی میری
عقل اس سلسلہ میں میری بہانی نہیں رکھتی کتنی عجیب بات ہے میں
نے کاوش فکر سے تو کبھی ان خیالات کا ادراک کیا ہی نہیں تھا۔
نہ مجھ پر کچھ کوئی کیفیت طاری ہوئی اور نہ کوئی ایسے ارباب
ہی تھے جو میں نے کبھی قبول کئے اور دل کے گوشے میں محفوظ کر لئے
تاکہ انہیں دریا برد ہونے کے بعد پھر برآمد کروں مگر کوئی یہ
کہے بھی تو میں نہیں مانوں گا نظر ہری قوی نے اس حشر خیالات میں
حقہ لیا۔ پھر یہ یک بیک نمودار کیسے ہو گئے؟ میں تو یہ سوچتے سوچتے
حاجز آ گیا ہوں۔ شاید ہم ان اجرام سماوی کی طرح ہیں جو روشنی کے
ایک سیمائی غبار میں گردش کرتے ہیں۔ اس لئے جوں جوں ہم اس
کے مختلف طبقات میں داخل ہوتے ہیں۔ کوئی طلسماتی پردہ دھچکا
ہوتا ہے۔ یا پھر یہ ستارہ ستارہ غبارِ شاہِ انسانانی فطرت کے
عالمِ صغیر میں پہنچا ہے جو اتر آ عالمِ اکبر ہو رہا ہے۔ اگر اسے عجیب
ذہنوں تو اور کیا کہوں!

آتے ہیں غیب سے یہ مضامین خیال میں

غالب صریر خامہ نوائے سروش ہے

آج یہ پرانی یادیں پھر میرے دل میں رہ رہ کر گہراں بھری
ہیں؟۔ یاد آنے دو۔ یہ یادیں بہت لطیف ہیں۔ یہ میری تمام
زندگی کا حاصل ہیں۔ محبت کیا ہے؟ نغمہ کی ملاقات نے مجھے پہچنے
پر مجھ کو دیا۔ کئی دن تک نہ کھیلنے کو چاہا اور نہ کہیں آنے جانے کو۔
میں اپنے آپ میں کھو گیا تھا۔ چاندنی رات کو برجِ مٹھن کے پاس
جہاں سے تلخ محل کا گنبد نورِ اعلیٰ نور دکھائی دیتا تھا اور کائنات
کے بقعہ نور میں ایک اور جگہ نورانی معلوم ہوتا تھا۔ ایک گھاس
کے تختے پر بیٹھ جاتا۔ اور سوچنے لگتا۔ چاندنی کی طرح صاف و صلی
ہوئی محبت میں بھی کیا جامہ ہے! دور جہاں کی ہر ہلکی، ہلکی، دھیمی دھیمی،
مگن گاتی، مرقی ہرول کی طمسی آواز مجھے نغمہ کا خاموش محکم معلوم ہوتی۔

جس میں وہ دوبارہ ملاقات کا وعدہ کر کے رخصت ہو جاتا ہے۔ ہر چند نغمہ سے دید و وادید غبات آشنا نہ ہوئی پھر بھی قدرت اس کا بدلہ ہی گئی۔ اس کے رنگارنگ جلوے اس کا عکس پیش کرنے لگے اور ان میں باوجود مغایرت ایک شادی وحدت منعکس ہوئی۔ کائنات کے ذرہ اقصیٰ پر ایک انتہائی مجسمہ نصب ہو گیا جس کے پاؤں دنیائے آب و گل کی قدم گاہ پر ممکن تھے۔ یہ مجسمہ نغمہ ہی کا برادر تھا۔ آخر یہ کائنات ایک "ایزدی آتش" کا فروغ نہیں تو اور کیا ہے؟

اب پھر وہی طلسم ایک وجد۔ ایک استغراق کی لہر پھر مجھے اپنے جسمانی حدود سے پرے لے گئی۔ وہی عشق کی والہانہ شورش جو عاشق کو مونیہ کی مستی و حال سے روشناس کرتی ہے۔ ہاں ہاں یہ صوفی بھی تو دیوانگان عشق ہی کے ہم طبع ہیں۔ انہیں سملے اور حالی کی طلب کیوں ہے؟ اس لئے کہ وہ ایک محیط اعظم میں پہنچ جائیں۔ کائنات اول کس کا محیط؟ شاید دونوں کا۔ اس کا سبب؟ دنیائے مجاز سے گریز؟ نہیں۔ بلکہ ایک وسیع تر عالم کا ادراک۔

ہاں تخیل کی لہر مجھے دور لے جاتی ہے۔ وہ دیکھو ایک طلسمی منع نور سے تجلی کی ایک سیل جاری ہوئی۔ جو لگا تار بچہ جاتی ہے۔ یہ جو ہر یہ عرض۔ یہ سبز۔ یہ گل۔ یہ ابر۔ یہ "ہری چہرہ لوگ" تمام اسی کے مظاہر ہیں اور اس سیل تجلی کے اجزاء ہوتے کیا ہے؟ ایک بہاؤ۔ اس بہاؤ کی روح وحدت ہے، کثرت نہیں۔ میں تو یہ کہتے کہتے تنہک گیا اور شاید آخری دم تک کہتا رہوں گا کہ

نہ ہو بہر زہ بیاباں نور و ہم وجود

ہمنوز تیرے تصور میں ہیں نشیب و فراز

میں نے اسی بہاؤ میں بہنا شروع کیا۔ یہ مجھے نغمہ ہی کے وجدانی اثر کی ودیعت تھی۔ میں نے دیکھا ہی نہیں۔ یہ خیر کن قبول مدح ہوتے ہوئے بھگ گئی۔ اس کی روشنی نے گرد و پیش کے بخارات سے کتنے ہیولے پیدا کئے۔ اور اب وہ کہاں ہوا ہو گئی؟ یہ ادھر پاس ہی ایک اور چراغ تہ دامان سے بخارات کا پردہ ہٹ گیا لیکن "موج ہائے دود" اسے بدستور لپیٹی ہیں۔ اس سے نظروں ہٹا رہی لی جائیں تو بہتر ہے۔ میں بھی کیا "خفقانی" ہوں بلکہ تابناک قنادیل سے، مویوم باقوں کے تابو پود سے "افسانہ" کا خیر مکرر

ہے نے محسوس کیا کہ محبت انسان کو کچھ اور ہی بنا دیتی ہے۔ وہ دنیا سے آب و گل میں پابجولاں نہیں رہتا۔ اس کی روح اس دنیا سے رُم نہیں کرتی۔ بلکہ وہ اس کی صبح کو اپنے اندر جذب رکے اس سے بلند تر ہو جاتی ہے۔ اس میں ایک زبردست ارتعاش پیدا ہوتا ہے۔ جیسے اس کے جان و دل میں کسی نے برقی جھر ہر دیئے ہوں۔ اس کی روح میں ایک بالیدگی پیدا ہوتی ہے۔ وہ اپنے پہلو میں زندگی کی ایک نئی دھڑکن محسوس کرتا ہے۔ اور اپنے آپ کو یزدانی قوتوں کا مظہر اتم تصور کرنے لگتا ہے۔ یہ پھر یہ ذوق و شوق کتنا جانگسل، کتنا جانگداز ہے! میں نے نغمہ سے جدا ہو کر ایسا محسوس کیا گو یا میں اپنے آپ سے بیگانہ ہو گیا تھا۔ اور میرے دل میں ایک خلش پیدا ہوئی۔ یہ خلش رفتہ رفتہ جاوداں ہو گئی۔ نہیں یہ شروع ہی سے جاوداں تھی۔ یہ تو ایک ایسی رودبار ہے جو اپنے اطراف و جوانب سے مختلف النوع ذریعہ و فزنی پارے اور لعل و جواہر جمع کرتی اور پاکیزہ چکنی مٹی سے آئینہ ہو کر خبر نہیں کیسے ویکش اور حسین قالب اختیار کرتی ہے۔ اس نے میرے تخیل کی دنیا میں کیا کیا رنگ و رنگی پیدا نہیں کی۔

روشنی ہستی ہے عشق خانہ ویراں ساز سے

انجن بے شمع ہے گر ہر قہر خمن میں نہیں

کب سے ہوں کیا بتاؤں جہاں خراب ہیں

شہائے ہجر کو بھی رکھوں گز حساب میں

دل ہی تو ہے نہ سنگ و خشت درد سے بھر نہ آئے کیوں

روئیں گے ہم ہزار بار کوئی ہمیں ستائے کیوں

تہا تیری ملاقات میرا سب سے بڑا المیہ تھی اور سب سے بڑا گریہ بھی۔ تو میرے ذہن پر حسن مثالی بن کر کچھ اس طرح نقش ہو گئی کہ میں اور کسی پیکر جمال سے مطمئن نہ ہو سکا۔ تیرے مثیل کی تلاش ایک مستقل عروجی اور لب کشائی کا باعث ہوئی۔ میری اپنی فیض حیاتی اور لوہیگم ہزاروں میں لیک ہو، پھر بھی کیا۔ وہ نغمہ کی مثیل نہیں ہو سکتی۔

سوچتا ہوں یہ خواب اور شہائے ہجر کا ذکر محض تقاضائے

بیاں سے ہوا۔ ورنہ حقیقتاً ہجر کی ایک مستقل رات ہے اور وہ

میدار کا جس میں مجھرب سے ملاقات ہو ایک جاودانی خواب

لئے کس قدر رنگین تھے۔ جب حسن و رحنائی کے یاسمن زار
پوری آب و تاب سے جلوہ فروش تھے۔ نشہ فکر کے عالم میں اس
لطافت نے شوخی تحریک کی بدولت صفحہ قرطاس پر شعر کا کیسا انداز
اختیار کیا۔

بخشے ہے جلوہ گل ذوق تماشا غالب
چشم کو چاہئے ہر رنگ میں وا ہو جانا
میں اس سرچشمہ فیض، نغمہ کا احسان کیسے فراموش کروں
کہ جب گلنار کی بالائیں رحنائی مجھے نہ جانے کن گہرائیوں میں
لے گئی تو۔ اب ان بے پایاں نوازشوں کا تذکرہ ہی کیا جن سے
میری حیات ابد تک زیر بار رہے گی۔

لو، وہ اس سرے کی قندیل پھر بیکار کیسے چمک اٹھی۔
اس کی وہ سرخ لوفانوس بلوریں اور بخارات سے چھن چھن کر آتی
ہوئی کتنی بلیدہ معلوم ہوتی ہے۔ ساری قندیل ایک دکھنا دکھاو
ہے انگارہ۔ ایک دکھنا چہرہ! اتنا کشادہ، اتنا باوقار، لکھتی اور
جلیل۔ جیسے گلاب کا تمنا تا ہوا پھول! میری ہی طرف غماں گسختہ
رواں ہے۔ یہ کہیں قریب ہی ہے۔ بہت ہی قریب! دیوار کے
اس طرف بہنیں ادھر۔ یہ بھوکا، جو کسی دھند میں گھرے ہوئے
گوشے سے نکلتا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ ایک شعلہ جوالہ! یہ لو، یہ
زبان آتشیں، اس قدر قریب۔ جیسے یہ میری نظر، میرے دل سے
خروج کر رہی ہو! کوئی سمجھے، انفس و آفاق دھم دھم گئے ہیں اہ
ان کے مطلع پر ایک برقی تجلی ضو فلک ہے۔ قندیل!؟ غنیمت
کون؟ کون؟

طرح دیتا ہوں۔ یہ تیغ ہے۔ یہ قلعہ اکبر آباد ہے، یہ جامع مسجد، یہ
چاندنی چوک، یہ قلعہ شاہجہاں۔ اور یہ میرا اپنا کلبہ احاطہ دنیا اور
اس کے قماشہ ہائے روز و شب سے دل بستگی۔ فانوس خیال میں
رکشی اسی کی شرمندہ احساں ہے۔ کبھی انسانی تمناؤں کے چراغ
بھی بجھ ہیں۔ یہ تو آخری دم تک اس کے نہاں خاندہ دل میں روشن
رہیں گے۔ آج جب "گنجد باز خیال" نے نئے نئے ورق الٹ الٹ کر
"نیرنگ یک بت خاد" کا منظر دکھا رہا ہے، مجھے سالہا سال کے
فراموش شدہ افسانے یاد آتے ہیں۔ کتنی ہی آرزوؤں اور صرتوں کے
تصور میرے ذہن میں رقص کرتے ہیں۔ ہائے! اس "کافرا"۔
اد "رہزن نمکین دہوش" گلنار سے "رسم ورہ شوق" جس کی
وجہ سے امر او بیگم کے ساتھ اس قدر خلفشار پیدا ہوا۔ بیچا ہوں
بھی تو ان جنت نگاہ اور فردوس گوش عشرتوں کو صفحہ خاطر سے محو
نہیں کر سکتا۔ میں نے اس وقت بے محابا کہہ دیا تھا اور بعد میں بھی
بار بار زبان پر لاتا رہا۔

ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے
بہت نکلے مرے ارمان یکنی پھر بھی کم نکلے
وہ زبان پھر کہاں سے لالوں جس نے کبھی اس بارہ سحر کو پردہ جنب
سے منقہ شہود پر جلوہ گر کیا تھا!

کس کو سناؤں حسرت اظہار کا محلہ
دل فرد جمع و خیر زباں ہائے لال ہے
مگر میں پوچھتا ہوں۔ عشرت شباب سے گریز کیوں؟ یہ تو عین متغافلے
حیات ہے اور گرمی طبیعت جو بایں نشاط۔ یہ چند در چند خوشگوار
لئے! وہ حریفان خود آرا سے نفق کا جونی۔ عشرت کے یہ بحرانی

غالب کا رابطہ فرنگ۔۔۔ بیتہ صفر ۳۵

94. MAJOR. میجر
95. PIECES OF STAMP. اسٹامپ کے ٹکڑے
(STICKET) ٹیل
96. DOUBLE. چابی (دھوا، شکاف دار)
97. CHAPPY. میچہ بن (باندھنا)
98. MAGAZINE.

99. PHOTOGRAPH. (PHOTO) عکس کی تصویر۔ آئینہ کی تصویر
100. (P.M.G) POST MASTER GENERAL. پوسٹ ماسٹر جنرل
101. GOVERNOR GENERAL. گورنر جنرل
102. GOVERNOR. گورنر
103. COLONEL. کرنل

Date: 13-11-73

”اک بزرگ ہمیں ہم سفر ملے“
(عقاب احمد میاں)

قربان حسین

[illegible]

نہ کوئی چہار آتا جا سکتا ہے۔ امریکی، انگریز، فرانسیسی، جرمن، اطالوی
ہولینڈ، غرض قدرت کے کارخانے کے ہر نمونے کو یہاں دیکھ سکتے
ہیں۔ ہو سکتا ہے کوئی اپنے پیارے وطن سے بھی آیا ہو۔ اس سے مل کر
پوچھیں: تمس حال میں ہیں یا ران وطن؟ انہی کہیں گے، ان کی سنیں گے
اور کچھ نہیں تو گھر کے واقعات سے ہی آگاہی ہوگی۔ سو ہم جیسے دُور
افراد ملنے کے لئے یہ بھی کیا کام ہے۔

چلتے چلائے جاپان ایئر لائن کی طرف جانے۔ ہر طرف زمین،
گلابی، زناٹا اور خوش وقتی نظری۔ یہ مشرقی تو تھا۔ دیکھ کر خاک
وطن یاد آگئی۔ ابھی دوڑ نہیں گیا تھا کہ دو ایک سیاہ ٹوپی نظر پڑی۔
دل خوشی سے دھڑکنے لگا۔ سو چار سو کوئی پیرا اہل وطن ہے۔ مگر نہ دیکھا
جا کر دیکھا۔ یہ آجکل کی سیاہ قراقل تو نہ تھی۔ مگر اس کی ہر رنگ
کلاہ پابان ضرور تھی۔ یہ ایک نوا در ہرنگ تھے۔ بڑھ کر اسلام علیکم
قبلا اور عرض کرتا ہوں آؤ داغ دیا۔ بڑے میاں نے میرے سر پر ہاتھ
دیکھا اور جواب میں کہنے لگے میاں لڑکے، حم بڑے بڑے خوش ہوئے تھے۔

دل قدم سے اداس تھا سو چنے لگا کیا کروں کئی خیال آئے۔
کبھی سو جا کافی شاپ میں چل کر ٹیٹیوں۔ کبھی یہ کہ کوئی فلم دیکھ لیا جائے
مگر کوئی تجویز بھی نہ تھی پھر سو جا کسی دوست سے ملنے جاؤں، مگر
دوسو سوہ چو کہ اس سے ملنے گئے اور وہ نہ ملا یا اس کا کوئی اور
پر وگرام ہوا تو سخت کوفت ہو گئی۔ اس جیسے بحث کے بعد فیصلہ کیا
کہ چلو انٹر نیشنل پورٹ میں چلا جائے جہاں تازہ دار مان بھلا ہوا
کو دیکھنے اور نئے نئے چہرے دیکھا رنگ لباس۔ دس دس دس کے لوگوں کو
دیکھ کر وقت گزرنے کا محسوس نہ ہوا۔ یوں ہر سو ہر طرف تازہ سو دیکھ کر
اپنے پاس میں تیرہ مین کی دہی ہوائی "فورڈ" تھی۔ اس میں ہم
دیرینہ کا ساتھ چھوٹا نادل کو کھانا نہ ہوا، اس لئے اسی پر سو اور ہر
چل نکلے۔ سڑک کی ادھانچہ اور گڑھوں سے بچے چلتے،
بچکولے کھاتے کسی نہ کسی طرح انٹر پورٹ تک پہنچ ہی گئے اور گلی کی
"پارکنگ سٹاٹ" میں کھڑ کر دیا۔

سوچا گیلری سے نظارہ اچھا رہتا۔ ہر دو منٹ بعد کوئی

باس کا بھی خیال نہیں رکھتے۔ نہ سر پر ٹوپی، نہ چھوٹوں کا پاس نہ بڑوں کا ادب۔ میں کچھ محبوب ہو گیا اور شمس صولت بنا کر کہا محدثیت کا خواستگار ہوں۔ بولنے، خیر، جانے دو اس بات مگر یہ تو بتاؤ تم کوں ہوا کیا شغل ہے؟ عرض کیا: خففت، مجھے قرآن کہتے ہیں۔ طلب علم کے لیے یہاں آیا ہوں۔

”خوب، خوب، نام بھی خوب ہے، قرآن جلیے۔ مگر کہاں سے آنا ہوا؟“

”پاکستان سے۔“

”خوب۔ بلکہ خوب تر شد۔“

”حضور نے اصرار کیسے تکلیف فرمائی؟“

”بھئی بہت زمانہ سے جنت کی فضاؤں میں رہا ہوا تھا، دل اچاٹ ہو گیا۔ وہی حمد وہی تصور، میں سیلابی جیوٹا ٹھہرا، سوچا پھر سیر دنیا کے لئے نکل چلوں۔ رضوان سے بہت ہی لڑائی ہوئی مگر آخر کار اس نے دودن کی زحمت دے ہی دی۔ میاں، یہ تو جانتے ہی ہو کہ آسان کا دسکھ تو یہاں کی ہر چیز نظر آتی ہے۔ میں بھی دیکھنے میں سے جھانکنا کرتا تھا۔ ایک مقام پر بہت بڑے مینار اور بڑی چہل پہل نظر آئی۔ مینار اور ساتی بھی ساتھ ساتھ دکھائی دئے۔ مسجد کے زیر سایہ خرابیات چاہتے، میں پہلے ہی کہہ چکا تھا۔ غور کیا تو ایک جال سا بچھا ہوا نظر آیا۔ ریل کو تو پہچان لیا مگر اور نئی سوا سوا یاں۔ کیا برق رفتار نظرائیں اور کیا کیا کلیں کہ دیکھ کر

اچھٹا ہو۔ مگر دانا یاں فرنگ سے کچھ بعید نہیں۔ میدان بھی خوب دکھائی دیتے تھیل تھیلے بھی کیا کیا عجوبے نکلتے ہیں۔ ایک جگہ تو کیونظر آیا۔ حد نظر بنیلا، وہ گنتر والی لمبی چوڑی سڑک، دلت کی روشنیاں۔ گویا ایک نادر چراغ تھا سرسبز کبھی قاہرہ کا جمال دکھائی دیا۔ ہائے دھماکہ! مجھے اب یہ جاننے کی ضرورت نہ تھی کہ یہ خضر کی صورت۔

”لے بڑگ کون تھے۔ حضرت غالب کی معیت میں میں آگے ہی ہٹتا آکھنگے، ہم نے قس دنیا کا بس دور ہی سے نظارہ کیا ہے۔ جی چاہے نہ نزدیک سے بھی دیکھوں۔ تم یہاں کافی عرصہ سے رہتے ہو، ضرور بد بتاؤ گے کہ کون کون سے مقامات دیکھنے چاہئیں۔“

عرض کیا قبلہ بجا ارشاد ہے۔ مگر یہ تو فرمائیے کس کس جگہ کی سیر کا شوق زیادہ ہے۔ یہاں تفریح کا کیا ٹھکانہ۔ سیر کی جگہوں کی

کسی نہیں۔ ادبی شوق ہو تو دارالطالعہ جگہ جگہ موجود ہیں۔ عجائب خانہ بھی ہے، مگر پہلے میرے غریب خانہ پر تشریف لے چلیں تو عین کرم ہوتے معاملے ہو گیا اور میں حضرت کو لے کر اس پرانی قوریں آن بیٹھا۔ چند ریل کی مسافت کے بعد گھر آگیا۔ دروازہ کھولا اور خضر تک اندر لے گیا۔ فرمائے گئے ہاں میاں تم نے کہا تھا کسی نے میری غزلیں گائی ہیں۔ ہاں وہ کیا چیز ہوتی ہے ریکارڈ؟ تو انہیں سنواؤ نا جو فردوس گوش بھی میسر ہو۔ کیا یہ ریکارڈ سنائے گی؟

میں مسکرایا۔ نہیں حضور، سہو ہو یا یہ تو ٹاپ لاٹری ہے۔ اس اجمال کی تفصیل پھر عرض کروں گا۔ سر دست یہ ارشاد ہو کہ آپ پتہ لگے کیا چائے یا کافی؟

”بھئی پیئے کی جو بھی چیز ہو پی لیتا ہوں۔ تم جب ساتی گری کی شرم کرو گے تو مجھے بھلا کیا عذر ہو گا۔“

میں سمجھ گیا کہ میاں کچھ نہیں سمجھے اور اپنے ذہنی مشروب کا خود ہی سرور لیتے رہے اور جب میرے جگ بھر کر کافی ساغنے دکھلا اور حضرت نے چکی لینی شروع کی تو گویا ہونے، بھئی شے عجیب معلوم ہوتی ہے۔ مگر کیا خاک مزا ہے۔ تم ہی اس کا کچھ لطف اٹھاتے ہو گے کوئی ایسا شغل نہیں کرتے کہ یک گونہ بخود کا موجب بنے؟ دست بستہ عرض کیا حضور میں تو نر ازادہ نہ جک ہوں۔

”تو یہاں پھولنے کو کیوں زندوں میں شمار کرتے ہو؟“

”بس بچے جارہے ہیں۔ ویسے پاس خاطر والا نزدیک کے ہوٹل میں ملتا ہوں۔ تشریف لے لیتے اور چند نمکے خانہ سرد رکھ کر دیکھتے۔ گمراہ عرض ہے۔ یہ مقام ایسا ہے کہ جب تک یہاں کی وضو قماش اختیار نہ کی جائے محفل کا لطف زیادہ نہ اٹھایا جائے گا۔ لوگ اجنبی سمجھیں گے، دور دور ہیں گے، تماشہ بن جائیں گے۔“

”ہاں بھئی یہ تو ٹھیک ہے، جیسا دیں دیا بھیں۔ تو پھر کیا تجویز ہے؟“

”تجویر یہ کہ آپ میرا ایک سوٹ پہن لیں اسے پہن کر ادھر چلے۔ چنانچہ انہیں مغربی لباس پہنا دیا گیا۔ گھر سے نکل کر سڑکی اور اوشیمن کے سنگم پر حیات باؤس کو انتخاب کیا۔ اس کا مالک کوئی ایرانی معلوم ہوتا تھا۔ یہ جگہ تھی بھی خوب۔ خواتین کا رنگین ہجوم، لباس میں ہر درجہ اختصار۔ نیم تاریک ایوان رقص۔ ہر کوئی ایک دوسرے

بابت آپ ہی کی بات دہراؤں۔ کچھ طبیعت اور ہنسی آتی۔ خوف یہ کہ چھوٹے ٹیری ان حرکتوں سے کیا سبق لیں گے اور بڑے سب سے کیا کہیں گے۔ غرض ان اندیشہ ہائے دور دراز میں غمگین تھی۔

”میاں ابھی تمہاری عمر کا کیا ہے کہ مولوی صدق اللہ صدور نے جا رہے ہو۔ کچھ تو فریب آرزو دکھاؤ کہ زیست کا مزہ پاؤ۔“

”خوب ارشاد ہوا۔ میں نے مسکرا کر فراموش کر دیا۔“

ابھی یہ باتیں ہو ہی رہی تھیں کہ ایک اور قہقہہ خالی آدھر آنکلی۔ اس نے سائی گری کی شرم رکھ لی اور حضرت کو جام بھر کر پیش کر دیا۔ مسکرائی اولاد نے خاص سے لچکتی چلتی جس تیزی کے ساتھ اُدھر آئی تھی اسی تیزی سے نکل کر ایک دوریز کی طرف بڑھ گئی۔ حضرت کا سرور اوج پر تھا اور مسکرا رہے تھے۔ کہنے لگے:

”بھئی بڑا لطف رہا۔ مگر اب کہیں اور چلنا چاہیے۔ آڈی کو شہد کی مکھی بننا چاہیے۔ کہیں اور چل کر کسی اور جگہ گاہ کی سیر کریں۔ کسی اور کے ہاتھ سے جام پیں، سرور سے سرور پیدا ہو، قند مکترا خزانے۔“ مگر میں نے بات کاٹ کر کہا حضور آپ ہی تو فرماتے ہیں۔

”سائی گری کی مشرم کرو آج ورنہ ہم ہر شب پیہا ہی کرتے ہیں۔ جتنا روئے“

اس پر حضرت پھر کچھ مسکرائے اور کہنے لگے: ”ہاں یہ بھی ٹھیک ہے مگر ساتھ ہی یہ بھی یاد رکھئے کہ“

”بلے کے ہے طاقت آشوب آگہی“

”کھینچا ہے غجز حوصلہ نے خط ایام کا“

میں نے عرض کیا جہاں تک پینے پلانے کے مسئلہ کا تعلق ہے

کوئی کافر سے جواب کی بات رو کرے۔ چلے کہیں اور چلتے ہیں۔“

یہ کہہ کر ہم باہر گئے اور دائرہ لوٹ کی دوسری جانب ٹینڈر

نالی منغلے میں پہنچے۔ یہاں بھی وہی عالم نیم تاریک الوان رقص و سرور

مگر بدلا ہوا انداز، تیز تر موسیقی اور مغربی رقص کی ساری کافر ماجرا

جلی دشمنی تحقیقتیں سلنے تھیں۔

اگلے وقت کی وضع پر ہی ہوئی برقی شمعیں روشن تھیں۔

مگر افسوس! پروانہ تھانہ پتہ نکلا، بس ایک شمع ہی رہ گئی تھی سو وہ بھی

نیم سوختہ۔ اور جام بھی وہی مانوس مانوس ناموں کے تھے۔ برتن،

اولاد کرو، سکاچ، ماٹینی، کلی لاریج، شلر، اولیگ غرض ہر قسم کی

سب سے پرانا ہی دامن میں مست کبھی اپنے سے بھی بے خبر۔ اور

اُدھر سائی جگہ دشمن ایمان و آگہی موجود تھا دیر مطرب بہ نغمہ رن

تمکینیں دھوش بھی۔ ڈھلتی دو پہر سے جو بزم نشاط میں ہوتی ہے تو

تاروں کے آخری جھلنے تک ہر ماہر تھی ہے۔ جو آواز ہے ایک خاص انداز

دلہرائی سے اور دیکھنے والوں کے دامن ہوش تارتا۔!

ہر کیف ہم بلا کشانی محبت اس مقام تک پہنچ ہی گئے۔ بیٹھتے ہی

حضرت نے ”میاں زبان فرنگ میں اس کی انواع و اقسام کو کیا کیا

کہتے ہیں، یہ تو تم جانو۔ مگر کہو: گنگ کے برف میں سائی صراحی سے لا

اور جھلا۔ اب یہاں پہنچ کر تاب و توان رخصت ہوا چاہتے ہیں۔“

”ابھی لیجئے، حضرت“

ہمارے بیٹھے ہی ایک حوالہ دینی کھٹ کھٹ کرتی، ہاتھ میں کاغذ

تھلے آن پہنچی۔ اس نے بھی لباس کا زیادہ مختلف مناسب نہیں سمجھا۔

کہنے لگی ”کیا خدمت کی جائے؟“

میں نے عرض کیا ”کوئی بھی سرور اور شے لے آؤ۔“

”مگر کیا ہو کہ برائڈی، ماٹینی۔ دم۔ جن؟“

حضرت نے اس کے سراپا کا ہاتھ لیٹنے کے بعد فرمایا ”بھئی

خوب خوب نام ہیں۔ میں تو دم کو دم آہو سے پہچانا اور یہ جن بھوت

بھلا کیا شراب ہوگی، ہم تو اولاد نام پسند کرتے تھے۔ خالص ہنگوئی

شے تھی، مگر اب نیا نیا نہ ہے، جو بھی آجائے۔“

”حضرت نام میں کیا رکھا ہے۔ میں تو اتنی ہی معلومات

رکھتا ہوں کہ ان کے چند نام آتے ہیں۔ یوں اس سائی کو بھلنے

کے لئے اتنا کہہ دیتا ہوں کہ جو بھی لاؤ تیز عمل شے ہو، چنانچہ اسی طرح

کہہ دیا۔“

کچھ دیر غل رہا۔ سرور گھٹنے لگا تو حضرت بولے ”میاں اس جگہ

کو تو بلاؤ۔ کیا ہمارے بلا سکتے ہیں؟“

”کیوں؟ کیا کوئی خاص بات کہنی ہے؟“

”میاں تم بھی عجیب تباہ ہو۔ اپنے آپ کو زندگیوں میں شمار

کرتے ہو۔ نہ پتہ ہو نہ کافر دادوں کی داد دیتے ہو۔“

عرض کیا ”حضرت آپ کا پیشہ تو سولہیت سے سپہ گری

رہا ہے۔ میں نے بھی اس شعار کو اختیار کیا اور بڑی پابندی سے کیا۔

بلکہ اب تو زندگی کا جزو ہو گیا ہے۔ مگر یہ حیات آپ نے بھی اس کی

جوئے نمی نظر کرتے، دنیا و مافیہا سے بے خبر، ہاتھ میں ہاتھ دے چلے جا رہے تھے، کوئی دیکھتا تو وہ مسکلا دیتے۔ حضرت بھی ہر کباب تھے۔ یہ سب کچھ دیکھتے چلے جا رہے تھے کہ ان سے رونا گیا اور فریاد لگے "عجب زندہ دل لوگ ہیں۔ دل پیٹیک۔ مگر تم نے اس میدان کی کتنی سیر کی؟"

عرض کیا "مجھے اس دنیا سے علاقت نہ رہا۔ وہی آپ کی بات: مجھے اس سے کیا توقع بہ زمانہ جوانی کبھی کو دکی میں جس نے مٹی مٹی کبابی اصل میں میں اس ماہ پر آیا ہی نہیں۔"

"تو میاں پھر دعا کرو کہ یونہی دکھ کسی کو دینا نہیں خوب ورنہ کہتا مریے عدو کو ماسب لے میری زندگی؟" اس پر میں اور تو کچھ نہیں مگر ہاں آنا ضرور کہہ سکا "خدا اس دعا کو قبول کرے! یہ بات ابھی ختم ہی ہوئی تھی کہ پھر ایک میسر خوبی سامنے نظر آئی۔ لباس کے اختصار کا وہی عالم۔ حضرت بول پڑے "مے نے کیا ہے حق خدا لا کو بے نقاب" "لیکن حضرت! شوق کو یاں اجازت تسلیم و ہوش تو ممکن نہیں؟"

اس پر خوب ہنسے اور یونہی راستہ کھٹا چلا گیا۔ تھوڑی دیر میں بارش ہونے لگی۔ ایک دم تیز چلنے لگی اور ایسا لگا جیسے کسی جھکڑ مجھے اٹھا کر دیوار سے ٹکرا دیا ہے!

مگر یکدم چوکا۔ غور کیا تو معلوم ہوا یہ سب عالم رویا تھا، ایک خواب تھا حقیقت نہا۔ ٹیبل پر رکھا ہوا پانی کا گلاس گر کر ٹوٹ چکا تھا۔ پانی نے کتابوں، کاغذوں کو مثل لور کر دیا تھا اور یہ سیل بے محابا اب میرے ہاتھوں تک پہنچا تھا! :

یہ بھی موجود۔ وہ پھٹکے جام اور آنکھوں کے تن کے مگر خوب سجے ہانسنے والے بیٹامات ہر قدم پر ہر طرف تہمت، ہر جانب سرگوشیاں کن آنکھیوں کے اشارے، مسکلا نہیں۔ اسے جنت ارضی کہنے میں کسے پاک ہوگا! جو خود سرور کے چنگل میں تھے وہ تو خیر تھے ہی، جو صفا انہیں دیکھ رہے تھے وہی کم کم نہ تھے۔ جولانی، امگ، قوس لوک جھونک، تراوت، سادگی، ہر کاری۔ کیا کیا نہ تھا۔ "چا چا" اور ٹوسٹ کی موسیقی کے درمیان زلفوں کا گھنیرا اندھیلو۔ نیم سوختہ شمعیں۔

سوچتا تھا "نزل منزل دل بھٹکے گا، مگر خیر دامن کشا ایک طرف گوشہ عافیت میسر آ ہی گیا اور ہم بیٹھے ہی تھے کہ آواز کرتی اور کالائفہ دریافت کرتی ہوئی ایک جلوہ فرشتہ ہمارے قوس کرتی ایک لڑکی کے ساتھ تیرتی ہوئی ہمارے قریب آ پہنچی بڑھتا ہوا اندھیرا، بڑھتی ہوئی ہمارے ہی، تیز رفتاری میں، ہلکے سرور پر قوس کرنے والوں کا بھی قریب آنا، کبھی دور چلے جانا۔ عجب ساں تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ یہ محفل ہا و ہو، شب کو ایک بجے سے پہلے ختم ہونے والی نہیں۔ اور اب وہ لمحہ بھی آپہنچا تھا یعنی دوایہ جلوہ کی ساعت قریب تھی اور خواب تھا جو کچھ دیکھا، جو سنا افسانہ تھا "بتا دینے والا اعلان بھی ہونے لگا۔ بساط ہوا دل اٹھنے لگی اور ہم اہل محزون باہر آئے۔"

دوسرے روز صبح تقریباً نو بجے بیدار ہوا۔ ناشتہ سے فارغ ہو کر شہر کا رخ کیا۔ وہی "ڈاؤن ٹاؤن" گویا اپنے علاقے صدی کی طرف نکل گئے۔ ہر شخص رواں دواں، زندگی کے دھارے پر سچے چلا جا رہا تھا۔ تیز رفتاری، بڑے بڑے اسٹور، مالیشان عمارتیں۔ ہر قوم، نسل، رنگ، عمر اور وضع واداک غزنین کا ہجوم۔ رومانی

* ستارہ سحری

(اسلام آباد)

سلیم خان گنتی

اقبالؔ نے کہا تھا: ہر گھر اہل نظر تازہ بستیاں آباد

مگر آج پاکستان میں ایک نہیں، کئی تازہ بستیاں زیر تعمیر ہیں اور یہ آباد و شاد کے عمل کا تسلسل و جہ طمانیت ہی نہیں حیرانی کا سبب بھی ہے۔ قلب و نظر ان معنوں میں حیران ہیں کہ ایک قوم اتنے مختصر عرصہ میں تعمیر و آبادی کے اتنے کٹھن مرحلے کیسے طے کر گئی اور کر رہی ہے۔ حقیقت ہے کہ اب پاکستان میں تازہ بستیاں آباد کرنے والے اہل نظر کی کوئی کمی نہیں ہے۔ وہ پریشانیوں جو دیدہ و دل کو پابند بنا رکھے ہوئے تھیں ۱۹۵۸ء کے انقلابِ ندریں میں ختم ہو گئیں۔ وقت نئی اور جملہ افزا بشارتیں لے کر آیا۔ انقلاب کے چار سال بعد آج بشارتیں بچائی کے نور سے فروزاں ہیں اور انہیں ایک دنیا اپنی آنکھوں سے دیکھ کر دنگ ہے۔ آفتاب آمد و دلیل آفتاب۔

انقلاب کی مسرت افزا بشارتوں میں سے ایک بشارت قومی دارالحکومت کے قیام و تعمیر کی بھی تھی۔ آج یہ بشارت اسلام آباد کے روپ میں ہمارے سامنے موجود ہے۔ اگر بستی آباد کرنے والے اہل نظر کہلا سکتے ہیں تو تازہ شہر آباد کرنے والوں کو قوم کس طرح یاد کرے گی؟ قوم انہیں اہل نظر، اہل اچان اور اہل ہمت کہہ سکتی ہے۔ حد پاکستان محمد ایوب خان اور ان کے رفقاء یقیناً ان تینوں خوبیوں بلکہ تصوف کی زبان میں، ان تینوں کیفیتوں کے مالک ہیں۔ یقیناً ان خوبیوں کو کیفیتوں کے بغیر اسلام آباد کی تعمیر و تکمیل ممکن نہیں ہو سکتی تھی۔

اصل میں اسلام آباد ہماری نئی ثقافت کا منظر ہے۔ ایک نیا جہل۔ یہ نئی ثقافت تو ابھی ہے اور اسلامی بھی، بالکل اسی طرح جس طرح اسلام آباد کے معمار قلبِ مومن بھی دیکھتے ہیں اور عہدِ جدید کے تقاضوں کے روبرو شناس بھی ہیں۔ اس دعویٰ کی تصدیق ہر وہ شخص کرے گا جو اسلام آباد کی تعمیر و تکمیل کے مرحلے اپنی آنکھوں سے دیکھ لے اور ان دیکھنے والوں میں اعلیٰ حضرت شہنشاہ ایران اور فرزانہ لائے اعلیٰ ملایا جیسی بستیاں بھی ہیں اور شرقی و مغربی

* ستارہ سحری خزانہ بچہ دیکھتے ست، (غالب)

پاکستان کے کسان اور طالب علم بھی۔

اسلام آباد خطرہ پوچھو! کے عین قلب میں واقع ہے۔ پوچھو! پاکستان کا وہ خطہ ہے جو صدیوں تک نئی اور پرانی تہذیبوں کا دارالث، امین اور جلالی گاہ رہا ہے۔ اس خطے میں برف کے عہد کی ثقافت، پتھلاور وحات کے زمانے کے آثار، گچھاہستانی ثقافت اور گول، دراوڑ، آریائی، ایرانی، یونانی، باختری، منگول، ستھین غرض کوئی بیس ثقافتیں اپنے اپنے عہد میں پروان چڑھیں۔ آج یہی خطہ پاکستان کی اسلامی ثقافت کا مرکز ہے اور اسلام آباد اس خطہ کا بیٹا سو اور آج شام و سحر تعمیر و تکمیل کے مرحلوں سے گزر رہا ہے۔

پاکستان کے لئے نئے قومی دارالحکومت کی ضرورت آنادی کے حصول کے ساتھ ہی محسوس ہو چکی تھی مگر پرامن انقلاب سے پہلے اس احساس عملی جامہ نہ پہنایا جاسکا۔ نیم دلی کے ساتھ کوششیں ہوئیں مگر نیم دلی سے کبھی کوئی کام سر انجام نہیں پاسکتا۔ ماری پور، گڈپ اور مضرے کے مقامات کو قومی دارالحکومت کے لئے چننا گیا مگر تعمیر کا مرحلہ کبھی نہ آیا۔ کراچی کے ساحلی شہر میں بکھری ہوئی عمارتوں میں مرکزی حکومت کے دفاتر قائم ہوئے، اور کام کرتے رہے مگر ان دفاتر کی ماضی عمارتوں سے جو جھکا را حاصل نہ ہو سکا۔ آخر اکتوبر ۱۹۵۸ء میں انقلاب آیا تو نئے عزم اور نئی ہمت کے چلنے لگی روشن ہوئے۔ مردہ دلی اور پرانگندہ خیالی کے اندھیرے دور ہوئے اور اس طرح وطن تعمیر و ترقی کے ایک فیصلہ کن دور میں داخل ہوا۔

حقیقت یہ ہے کہ صدر ایوب نے ہی قومی دارالحکومت کے اس منصوبہ کی طرف پوری طرح توجہ دی جو دس سال سے گولگلی حالت میں چلا آ رہا تھا۔ اس مسئلہ کا جائزہ لینے کے لئے فروری ۱۹۵۹ء میں آٹھ افراد پر مشتمل ایک کمیشن قائم ہوا جس کے چیرمین سچو جنرل اے۔ ایم۔ یحییٰ خان تھے۔ کمیشن کے ذمہ یہ کام تھا کہ وہ قومی دارالحکومت کی حیثیت سے کراچی کی موجودہ پرچند کرے اور اگر کراچی قومی دارالحکومت کے لئے موزوں نہ ہو تو کسی دوسری

اور اپنی رپورٹیں پیش کر کے کام کو آگے بڑھایا۔

فروری ۱۹۶۰ء میں وفاقی دارالحکومت کے رقبہ کو اسلام آباد کا مبارک نام عطا کیا گیا۔ اور اسی سال ہی میں کمیشن نے ابتدائی عظیم منصوبہ تیار کیا جس پر صدارتی کابینہ کے اجلاس میں مروجہ پکار کیا گیا اس اجلاس کو اس اعتبار سے تاریخی اہمیت حاصل ہے کہ یہ اسلام آباد کی پہاڑی، شکر ٹریاں پر منعقد ہوا تھا، یعنی تعمیر نو کی شروعات ہوئی۔ یوں اسلام آباد کی تعمیر دس سال میں مکمل ہو گئی مگر تعمیری مرحلوں کو دو حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے پہلے پنج سالہ منصوبہ (۱۹۶۰ء سے ۱۹۶۵ء تک) کے مقاصد طلب ذیل رکھے گئے ہیں۔

(۱) پچیس ہزار ایکڑ اراضی کا حصول (۲) چھ ہزار سرکاری ملازموں کے لئے مکانات (۳) چھ ہزار سرکاری ملازموں کے لئے دفاتر (۴) دوسو بیس کمروں پر مشتمل پاکستان ہاؤس کی تعمیر (۵) اٹھاونے سہ لکھ مربع فٹ اور ماستوں کی تعمیر و پختگی (۶) پچاس ہزار نفوس کی آبادی کے لئے آب رسانی (۷) پچاس ہزار کی آبادی کے مکانات اور دوکانوں اور دفاتروں کی آب نکاسی (۸) اٹھارہ ہزار ایک سو پچاس ایکڑ اراضی کی تزیین اور شہرکاری (۹) ایوان صدر، سپریم کورٹ اور پارلیمنٹ کی تعمیر (۱۰) سفارتی بستی کے دوسوا ایکڑوں کی ترقی (۱۱) ساٹھ ایکڑ کے رقبہ میں چھوٹی صنعتوں کی تنصیب (۱۲) تعلیمی اور دفائی اداروں (مدرسے۔ ڈاک خانے وغیرہ) کی تعمیر (۱۳) بجلی کی فراہمی (۱۴) اسلام آباد کے رقبہ کے کاشتکاروں اور زمینداروں کی متبادل آباد کاری۔

۱۹۶۰ء سے ۱۹۶۵ء تک کے پنج سالہ منصوبہ پرانی دوسالوں

۱۹۶۰ء سے ۱۹۶۲ء تک میں جو کام ہوئے ہیں ان کا اجمالی ذکر بھی کچھ کم اہم نہیں ہے۔

اسلام آباد کے لئے اراضی حاصل کی جا چکی ہے۔ سرکاری ملازموں کی ملازمت کے لئے چھ سو مکانات بن کر تیار ہو چکے ہیں۔ چھ سو مکاناتوں کی اس بستی کو "آب پارا" کا نام دیا گیا ہے۔ آب پارا میں بجلی اور پانی کا نظام مکمل ہے۔ یہاں تاجر اور ڈاک خانہ کام کر رہے ہیں۔ اس بستی کی آٹھ دوکانیں بھی تعمیر ہو چکی ہیں۔ محکمہ ادا ہوئی نے اپنا سٹور یہاں قائم کیا ہے اور محکمہ صحت کی طرف سے شفا خانہ بھی موجود ہے۔ بچوں کے لئے سکول اور پارکوں کا انتظام ہو چکا ہے۔ غرض آب پارا میں زندگی کی ہر سائنش فراہم ہو چکی ہے۔ ایک ہزار چار سو پندرہ مکانات کی تعمیر عنقریب مکمل ہو جائیگی۔

جنگ کی ہمت غور کرے۔ کمیشن نے چار ادا کے کافی غور و فکر کے بعد اپنی رپورٹ پیش کی کہ کراچی صنعتی و تجارتی اعتبار سے قوموں شہر ہے مگر قومی دارالحکومت کے تقاضے پورا کرنے سے قاصر ہے۔ کمیشن نے یہ بھی کہا کہ پاکستان کا کوئی بھی شہر قومی دارالحکومت بننے کے لئے موزوں نہیں ہے۔ چنانچہ کمیشن نے فیصلہ کیا کہ نیا وفاقی دارالحکومت الگ ہی تعمیر کیا جائے۔ اس غرض کے لئے لاہور، لہندہ کی شمال اور شمال مشرق میں اسلام آباد کے رقبہ کو منتخب کیا گیا کیونکہ یہ رقبہ آب و ہوا، پیداوار، قدرتی وسائل، دفاع اور مواصلات کے اعتبار سے بھی پاکستان کا موزوں ترین علاقہ تھا جو اس مقصد کے لئے موزوں ہو سکتا تھا۔

لیجئے اب کچھ حال اس مقام کا بھی سن لیجئے۔ اسلام آباد کا رقبہ ڈھائی سو مربع میل کو محیط ہے۔ اس رقبہ کی سطح سمندر سے ڈیڑھ ہزار فٹ سے دو ہزار فٹ تک بلند ہے۔ اس کے شمال میں مرگھ کی پہاڑیاں، شمال مشرق میں سری کی پہاڑیاں، جنوب مغرب میں شاہراہ اعظم اور جنوب میں لہور ٹرورڈ واقع ہیں۔ آب و ہوا بڑی خوشگوار ہے۔ زیادہ سے زیادہ اوسط درجہ حرارت ایک سو تین اور کم سے کم اوسط درجہ حرارت اڑتیس درجے رہتا ہے۔ اسلام آباد کے رقبہ میں چار دریا۔ سواں، کورنگ، یلنگ اور کس۔ بہتے ہیں۔ مرگھ اور سری کی پہاڑیوں میں چشموں، آبشاروں اور جھروں کی کوئی کمی نہیں۔ یہاں تعمیراتی سلا بھی بخوبی مل جاتا ہے۔ بہتر کم کی سبزیاں، ترکاریاں، باغات ہیں۔ اشیائے خورد و نوش باافراط دستیاب ہوتی ہیں۔ غرضیکہ اسلام آباد کے علاقہ میں وہ تمام اوصاف موجود ہیں جو کسی قومی دارالحکومت کے لئے ضروری سمجھے جاسکتے ہیں۔

جن ۱۹۵۹ء میں صدارتی حکومت نے اسلام آباد کے رقبہ کو وفاقی دارالحکومت کے لئے موزوں قرار دئے جانے کی رپورٹ منظور کی اور اس کے بعد ستمبر ۱۹۵۹ء میں فیڈرل کپٹل کمیشن کے نام سے ایک ادارہ قائم کر دیا گیا۔ اس کمیشن نے اسلام آباد کے لئے عظیم منصوبہ اور عظیم لائوٹیشن تیار کیا۔ اس غرض کے لئے مرکزی اور صوبائی حکومتوں کے ایک سو ماہرین نے اہم مل کر کام کیا۔ یہ ماہرین مرکزی اور صوبائی حکومتوں کے ہمیا بیس محکموں سے لئے گئے تھے اور چودہ کمیٹیوں میں تقسیم ہو کر الگ الگ اپنے کاموں کو مکمل کر رہے تھے۔ ان کمیٹیوں نے اسلام آباد کی تعمیر و تکمیل کے ہر پہلو پر باہر انداز میں اور بڑی تفصیل کے ساتھ غور کیا

ماہنامہ کراچی، دسمبر ۱۹۶۳ء

پھیلا ہوا ہے اور اس میں ایک لاکھ اور پودے شہر کاری کے لئے تیار ہو چکے ہیں۔ راول جھیل، پہاڑی قری روتھ اور ملحقہ راستوں پر بھی پانچ لاکھ جائیں گے، چنانچہ اس غرض کے لئے زمین ہوا اور یہی ہے اور یہ جگہ غریب لالہ زار بن جائے گی۔

ایوان صدر سپریم کورٹ اور پارلیمنٹ کی عمارتیں استقامی حلقہ (سیکٹر) میں ہوں گی۔ ان عمارتوں کے علاوہ اسی حلقہ میں ثقافتی اہمیت کی عمارات جیسے قومی کتب خانہ، قومی عجائب گھر اور سیکرٹریٹ کی عمارتیں بھی ہوں گی۔ ان عمارتوں کی منصوبہ بندی پر بیرونی مالک کے کئی اہروں سے بھی مشورہ کیا گیا ہے۔ ان میں سے بعض عمارتوں کی منصوبہ بندی کا کام مکمل ہو گیا ہے اور تعمیر کا سلسلہ غریب شروع ہونے والا ہے۔

یہاں ایک سفارتی علاقہ بھی ہوگا۔ اس علاقہ میں سے دو لاکھ اڑسٹھ ہزار نو سو پندرہ اسی مربع گز رقبہ چنے پر دیا بھی جا چکا ہے۔ اب تک آسٹریلیا، سوئیڈن، برطانیہ، ہندوستان، اٹلی، برازیل، فرانس، آسٹریا اور نیدرلینڈ کے سفارت خانے یا قونصل خانے اپنے اپنے لئے زمینیں لے چکے ہیں۔ معلوم ہوا ہے کہ اس زمین سے کیپٹل ڈیولپمنٹ اتھارٹی کو تین لاکھ اسی ہزار چار سو چھپن روپے کی رقم وصول ہوگی۔ فلاح عامہ کے کاموں کو بھی نظر انداز نہیں کیا گیا ہے، اور چھوٹی صنعتوں کی تنصیب کے لئے اب تک انیس پلاٹ الاٹ کئے گئے ہیں۔ صنعت کاروں نے اپنے کارخانوں کے لئے تعمیر کا کام شروع کر دیا ہے سینٹ تیار کرنے اور پتھر کوٹنے کے کارخانے قائم بھی ہو چکے ہیں۔

تعلیمی اور رہائشی اداروں کی تعمیر کا منصوبہ منظور ہو چکا ہے۔ جس کے تحت اس وقت چار پرائمری سکولوں کی عمارتیں بن رہی ہیں۔ حکومت مغربی پاکستان راولپنڈی اور اسلام آباد کے درمیان ایک ڈگری کالج بھی قائم کرے گی جس کی تعمیر جاری ہے۔ اسی طرح پارکوں، ڈاک خانوں، تانگھروں، کھیلوں کے میدانوں، تھانوں اور کھیتوں کی تعمیر بھی مختلف مراحل سے گزر رہی ہے۔

برقی قوت کی فراہمی کے سلسلے میں حکام ہر لمحہ وہ بھی بڑا اہمیت افزا ہے۔ چنانچہ اس وقت اسلام آباد میں ایک سو تیس کلو واٹ کا بجلی گھر قائم کیا جا رہا ہے جس پر تاسی فی صد کام مکمل ہو چکا ہے۔ یہ بجلی گھر وادی لکھ

شہر کاری ملازموں کے لئے دفاتر کی منصوبہ بندی چلی ہے، پاکستان پاور کمپنی کے علاوہ ایک دوسرے کمپنی کی تعمیریں جلد مکمل ہونے لگیں۔ اس کمپنی کا مقصد مغربی ساحل ہزار مربع گز ہوگا۔ اس کی پانچ منزلیں رکھی گئی ہیں جن میں سے تین منزلیں تعمیر بھی ہو چکی ہیں اور چوتھی منزل کا کام جاری ہے۔ معلوم ہوا ہے کہ اگر ضرورت پڑی تو اس عمارت کی چوتھی منزل بھی تعمیر کی جائیگی۔

سڑکوں کی تعمیر کے لئے زمین ہوا اور یہی ہے۔ نیشنل پارک روڈ پر کام مکمل ہو چکا ہے۔ دریائے گورنگ پور کی تعمیر ۱۹۶۳ء میں مکمل ہو جائے گی۔ اسلام آباد میں چار بڑے پل بھی ہوں گے جن میں سے ایک دریائے گورنگ کا پل ہوگا۔ مرکز جیب روڈ پر بھی کام ہو رہا ہے اور اب تک اس سڑک کے بیس میل مکمل ہو چکے ہیں۔ آپ بکھلے گلی کوچوں، راستوں اور ملحقہ سڑکوں پر جو کام ہو رہا ہے اس کے جلد مکمل ہونے کی توقع ہے۔

سید پور اور نور پور شاہان کے آبائی ذخیرے یہاں کا خاص مرکز ہیں جن سے کام لیا جائے گا۔ شکر پڑیاں کی پہاڑی پر جو آبائی ذخیرہ زیر تعمیر ہے وہ مکمل کو پہنچنے والا ہے۔ چنانچہ اس آبائی ذخیرہ میں ساڑھے چار لاکھ ٹین پانی جمع رہے گا اور اسلام آباد کے بعض ذیلی حلقوں میں پائپ لائنیں بچھائی جا رہی ہیں، اس طرح ہر جگہ صحت بخش پانی پہنچ سکے گا۔

اسلام آباد کی زمین اور شہر کاری پر بھی توجہ دی گئی ہے۔ جاپان کے ایک ماہر کیمونو کنڈو نے نیشنل سپورٹس سینٹر کی تعمیر، زمین اور منظر سازی کے لئے ایک منصوبہ تیار کیا ہے۔ اس سلسلہ میں کھیل کے میدان، بچوں اور عورتوں کے لئے پارک، گولف کے میدان ہوں گے۔ ایک مصنوعی جھیل، چین زار اور کشتی رانی کے کلبوں کے لئے بھی خاکے تیار کئے گئے ہیں۔ شکر پڑیاں کی پہاڑی پر جو زہ باغوں کے لئے زمین ہوا کر لی گئی ہے جس جگہ پھر ڈیڑھ اور ان کی کابینہ نے اسلام آباد کے ابتدائی تنظیمی منصوبہ پر پھر دغوض کیا تھا وہ جگہ اب ایک تاریخی اہمیت اختیار کر گئی ہے اور اب وہاں پھول کھلتے نظر آتے ہیں۔ اس پہاڑی کے ایک سو ایکڑ رقبہ پر شہر کاری کا کام ختم ہو چکا ہے۔ اب تک پانچ ہزار اٹھ سو ستر ایکڑ رقبہ میں پودے لگائے جا چکے ہیں۔ اسلام آباد میں اس وقت دو لاکھ پودے بالکل تیار ہیں۔ اسلام آباد کے میں پودوں سے پودے لئے جاتے ہیں وہ خود کافی بڑا ہے یعنی تیس ایکڑ رقبہ میں

بنگالہ شگرف آب و ہوائے دارۃ

(مشرق پاکستان — مانجھیوں کا دیس)

یونس (جس)

تلاطم خیز موجوں کا مقابلہ کچھ اپنی بلاکش مانجھیوں کا کام ہے۔
وقت اور موسم کی طرح ماہی گیری کو سال دس سے بھی کوئی
نسبت نہیں خواہ بادل ٹوٹ ٹوٹ کر برس رہے ہوں یا کڑا کے کی سردی
پڑ رہی ہو۔ مشرقی پاکستان کے دیہات میں سردی اس ہلاکی پڑتی ہے
کہ اکثر دانت سے دانت بجنے لگتے ہیں، بالکل ایسی سردی جیسے مغربی
پاکستان کے میدانی علاقوں میں پڑتی ہے اور پانی جھنکے لگتا ہے۔
بڑے بڑے دریا ابل رہے ہوں یا ٹھنڈوں ٹھنڈوں پانی کھڑا ہو، گھر سے
دور نہریں بہہ رہی ہوں یا پاس ہی چھوٹی سی پرسکون ندی بہنے لگے ہیں
جاری ہو، ماہی گیری کے کام میں لگے ہوئے نظر آئیں گے۔ اور صبح کھانا
نمودار تہہ اور ادھر یہ لوگ کام کے لئے نکل کھڑے ہونے اور پھر غریب کی
بات یہ ہے کہ شخص دنیا دیا فیہا سے بے خبر اپنی دھن میں لگا ہوا نظر
آئے گا، خواہ وہ بچہ ہو یا پولا پولا بڑھا، ناخبر بہ کار لڑکا ہو یا سرد و گرم
چشیدہ مانجھی۔ اپنے ساتھیوں سمیت جنگھاڑتے دریاؤں میں
جال پھینکنے سے اسے کوئی چیز نہیں رکت سکتی۔ اگر وہ اکیلا بھی ہے
تو کنارے پر کھڑا ہوا یا بیٹھا ہوا پھلی کا شکار غرور و تکبر رکھتا ہوگا۔ اگر
موسم خشک ہے تب بھی وہ پورا آل جال ضرور پھینک دے گا یا
”بیل“ نلے کے ٹخنوں ٹخنوں پانی میں گھس کر پھلیاں پکڑے گا کہ سن
بچوں کی کھپ کی کھپ ہاتھوں سے ہی پھلیاں پکڑتی الگ نظر آئے گی۔
جب ان کی قسمت یاوری کرتی ہے تو پھلیاں اٹھا اٹھا کر ایک دوسرے
کو دکھاتے اور خوش ہوتے ہیں۔

مشرق پاکستان میں عوام کے لئے ماہی گیری تفریح بھی ہے
اور پیشہ بھی شہری لوگ بھی پھلی کا شکار کرتے ہیں مگر صرف تفریح کے لئے
ناکارانہ کی پھلیاں یا فالتو وقت ہنسی خوشی گزر جائے۔ یہ لوگ شہر سے
باہر نکل جاتے ہیں اور پھلی کے شکار کا لطف اٹھاتے ہیں۔ لیکن دیہات

اندھیرے ابلے صبح شام، ہر آن، ہر وقت، یہاں تک
کہ سوتے جاگتے بھی ایک ہی شکل — ماہی گیری جیسے یہ لوگ دھرتی
نہیں پانی کے باسی ہوں۔ ندیاں نلے دریا پھیلیں تالاب، ان سب کا
ہبتا، ٹھہرا پانی، ان کا اور بھنا بھونسا ہے۔ آپ کہیں گے ماہی گیری
جاگتے میں تو خیر ٹھیک ہے۔ مگر سوتے میں؛ بیشک، یہ لوگ بہتے
ہیں بھانت بھانت کی کشتیوں، ڈونگوں اور ناؤں میں ہی۔ ان کے
گھر بھی لکڑی کے چلتے پھرتے گھر ہیں۔ وہ سوتے ہیں تو اگلے دن ماہی گیری
کے لئے کیل کانٹے سے لیس ہو کر اور نیند میں بھی اس ہی کے خواب دیکھتے ہوئے۔
اس لئے جاگتے کے ساتھ سوتے نہ ہوتا اور کیا ہو؟ ماہی گیری ان لوگوں
کی گھٹی میں پڑی ہے اور اس کا کوئی وقت، کوئی موسم نہیں۔

یہ کون نہیں جانتا کہ مشرقی پاکستان پھلی، تال، ندی نالوں اور
دریاؤں کی سرزمین ہے اور یہاں کی بود و باش پرستیاں چاندی کی روٹیاں
دواں چادروں کا بڑا گہرا اثر ڈالتا ہے۔ یہی بات ہے جس نے ہمارے
مشرق بازو کے پرشور ندی نالوں کی تند و تیز موجوں کا منہ پھیر دینے والے
جہازے مانجھیوں کو دنیا کے بہترین تاج بنا دیا ہے۔ جگہ جگہ ندیاں، قدم قدم
پر پھیلیں، مگر گھر تالاب۔ آب رواں کے کنارے کنارے بستیاں، بازار
اٹ، منڈی بلکہ ایک گھر سے دوسرے گھر تک جانے کے لئے بھی بھٹی دھاتا
ڈونچے کشتیاں ہی کام میں لائی جاتی ہیں۔ ہر وقت طوفانوں اور سیلابوں
کا سامنا۔ تیز و تند موجوں سے زور آزمائی۔ اس لئے یہاں کے جاکش اور
پھلے لوگ کو خطرے کے چھ پادوں پر کھیلنے کا ڈھنگ سکھا دیا ہے۔ خبر نہیں کب سے
یہ سلسلہ نسل بعد نسل چلا آتا ہے جس طرح پانی کے ساتھ ان کی پہلی داس کا
ساتھ ہے، اسی طرح ماہی گیری سے بھی ہے۔ یہ ان کا پیشہ بن چکا ہے۔

ان کی شکل و شہادت جسمانی ساخت اس کٹھن زندگی کے سانچے میں
پوری طرح ڈھل چکی ہے۔ پڑا شوب دریاؤں کے سینے پر چڑھ کر ان کی تند و

والے، کھیتی باڑی کرنے والے، حیر، گانا شروع کر دیتے ہیں، یا کوئی سہانا ٹپتہ یا مایہ الاپنا شروع کر دیتے ہیں۔ اسی طرح شوقیوں کے ہاتھ چمچ چلاتے، ڈانڈنا پتوار تھامے اور پھیرے جال پھیلانے اور پھیلیاں بھرتے، زور زور سے کشتیاں کھینچتے ہیں تو کام کے دوران کیا مکان دور کرنے کے لئے طرح طرح کے گیت بھی ادا کرتے رہتے ہیں۔ یہ گیت ان لوگوں کی جان ہیں اور ان سے سارے مشرقی پاکستان کی فضا سی بسی ہوئی ہے۔ پیرے سارے مانجھی پھیرے کھن زندگی کے تار چڑھاؤ، خوشی، غمی، ہمت و جدات کے یہ میٹھے سریلے گیت گانے والے کچھ ایسا سماں باندھ دیتے ہیں کہ ساری فضا پر ایک کیف چھایا رہتا ہے۔ یہ گیت ان لوگوں کے فیاضانہ کی ترجمانی کر کے زندگی کو گوارا ہی نہیں خوش گوارا ہی بنا دیتے ہیں۔ عام گیتوں کے علاوہ جو لوگ خود ہی گھر لیتے ہیں، یا وہ خود بخود ان میں پیدا ہو جاتے ہیں، بعض بڑے لکھے لوگ بھی ہیں جن کو خدا نے ایسے گیت مرتب کرنے کی صلاحیت عطا کی ہے۔ کوئی جیم الدین کو کون نہیں جانتا وہ لپچے لپچے کے کسانوں، پھیریوں، مانجھیوں کے دل کی دھڑکنیں خوب جانتے ہیں اور بڑی ہی سادگی سے ان کو گیتوں میں سمو دینے کا ڈمٹنگ خوب جانتے ہیں۔ ان کا ایک گیت ہے ”ندیہ کے پار“۔ اس کو بڑھ کر وہاں کے لوگ تو دہرائے ہم یہاں کے لوگ بھی خود بخود گنگانے لگتے ہیں اور ایک عجیب حظ محسوس کرتے ہیں گویا یہ ہمارے اپنے ہی گیت ہوں اور ہم مشرقی پاکستان میں نہ ہوتے ہوئے بھی اس سے پورا پورا قرب محسوس کرتے ہیں۔

ندیہ کے پار :-

مانجھی رے —

کروں کیسے میں ندیا کو پار !

مجھے لے چلے جو اس پار رے

اسے دوں گی میں پھولوں کا ہارے

مانجھی رے —

اس پار میں بھیانک ندی کے

چلی جاؤں گی ساجن کے دوارے

مجھے لے چل تو ندیا کے پار رے !

یہ ہے ایک بھٹیائی گیت اور اس دوسرے میں بھی ایسا ہی رس گھلا

کی عام آبادی کی بات اور ہے۔ بلاشبہ دیہات میں رہنے والے سارے عوام ماہی گیری سے سال کے بارہ مہینے خوب خوب لطف اٹھاتے ہیں مگر ساتھ ہی پھیلیاں پکڑ کر اپنی معاشی حالت بھی بہتر بناتے رہتے ہیں ان میں جو ذرا چاق و چوبند تندرست اور کس بل والے ہیں، وہ اتنی پھلی پھونڈ پکڑ لیتے ہیں کہ ان کا کنبہ بھی خوب میر ہو کر کھائے اور باقی ”ماچھ“ بیچ کر کچھ پیسے بھی کمالیں۔ یہ ادھر ادھر چل پھر کر اپنی ”ماچھ“ ضرور کسی کے گھر فروخت کر ڈالتے ہیں۔ خاص کر کھانے پیتے گھرانوں میں تازہ پکڑی ہوئی پھلی کی بڑی مانگ ہوتی ہے۔ جب گھر بیٹھے سستے دامن تازہ عمدہ ”ماچھ“ آجائے تو بازار باٹ کون جانتا ہے۔ اگر پھلی کافی مقدار میں پکڑی گئی تو قریب کے بازاروں میں بھی کثرت سے نظر آتی ہے۔ ویسے عام طور پر دیکھا گیا ہے کہ بڑے بڑے ادھر پتے صرف اتنی ہی پھلی پکڑتے ہیں جتنی انہیں ضرورت ہو۔

گھاؤں کے وہ بڑے بڑے یا جوان جو صرف ذوق و شوق کی خاطر ضرورت سے زیادہ پھلی پکڑ لیتے ہیں وہ نہ صرف اپنے علاقوں بلکہ چھوٹے چھوٹے شہروں، حتیٰ کہ دور دست ڈھاکہ تک اپنی پھلی بچکے کو بیچ دیتے ہیں۔ ادھر بیبیاں بھی خوش ہوتی ہیں کہ چلو گھر بیٹھے اچھی ”ماچھ“ ہاتھ آگئی، لاکر تو بازار جا کر بھی خالی ہاتھ لوٹ آئے گا کہ جی آج تو ماچھ بہت ہی ہنسی گئی !

پھلی پکڑنے والے یہ شوقین یا تولیسی ہی کے شوقین اور جیلے ہوتے ہیں یا پھر بچا رس کم تنخواہ دار ملازم جو اپنا فرسٹ کلاس کام میں لگا کر کچھ نہ کچھ کمائی لیتے ہیں۔ اور اس طرح اپنا اور اپنے کنبے کا پیٹ پالتے ہیں۔ یہ لوگ ان نشیبی علاقوں میں پھلیاں پکڑتے ہیں جہاں سیلاب کے دنوں میں قریب کے دریاؤں، ندیوں، نالوں کا پانی چڑھ آیا تھا اور اب اتر گیا ہے۔ یہاں پھلی عمدہ اور بکثرت ملتی ہے۔ خود ڈھاکہ میں ایسے بے شمار تالاب ہیں جو کسی کی ملکیت نہیں اور لوگ یہاں کثرت سے آتے اور پھلی پکڑ کر لے جاتے ہیں۔ مگر ایسی کڑی زندگی جس میں کشمکش ہی کشمکش ہو اور

انسان دن رات موجوں کے خلاف سینہ سپر اور ان کے ساتھ بہروں نبرد آزما رہے، کسی دلخوش کن تفریح کے بغیر کیسے بسر ہو سکتی ہے۔ جیسے مغربی پاکستان میں چچی پیسے والیاں دل بہلانے یا شفت کا احساس دور کرنے کے لئے گیت بھی گاتی جاتی ہیں یا رہٹ چلاتے

ہوا ہے :-

رنگ برنگی ناؤ کے ناہی

آؤ باندھو ناؤ یہاں

چھڑوں دل کی داستاں

سُن بھٹیالی گیت کو تیرے

نیر بھائے ساگر

اس کی لہر بہا لے جائے

میری کمر سے گاگر

لنگر اس فوکا سا ناہی

مست ہوا ہے اڑتا جائے

ساری کا آنچل میرا

رہ رہ کر بل کھائے

ناہی تیری پیت میں شاید

دل نہ کسی کا ٹوٹا ہوگا

نہ کسی دل نے لہر گئی ہیں

نہ کوئی گاگر چھوٹا ہوگا

اور حق یہ ہے کہ نہ تو مشرقی پاکستان نہ بنگلہ شاہی کا دامن تاقی

نہ لاسلام کے اس بھرے گیتوں سے خالی رہ سکتا ہے۔ اس کی

ایک مدھرتان کی صدائے بازگشت، نظم نہ ہسی، نشر ہی میں ہسی:

اے گہری ندی کی موجو!

جنم جنم سے تم مجھ کو خس و خاشاک کی مانند

بہاتی رہی ہوا

میں نے اپنے لئے جو گھر تعمیر کیا تھا

اے ندی! اسے بھی تمہاری موجیں بہا گئیں!

پھر میں نے چہرے میں پناہ لیتی چاہی مگر وہ

بھی نذر آب ہو گیا!

اب میں سب کچھ لٹا کر سب کچھ کھو کر موجوں کے ساتھ

بہتا جا رہا ہوں!

میں گھر دو بارہ تعمیر کر سکتا ہوں

لیکن دل کا گھر نایاب گم ہو جانے کے بعد کہاں لے گا؟

بھٹا میں ایک بار دل کھو جائے تو وہ بھی

جوار کی طرف نہیں جانا پتا!

اے ندی!

تمہاری موجیں ساحل کا ایک ہی حصہ کاٹتی ہیں

لیکن جن کی ندی کا وہ ایک کنارہ بھی نہیں چھوڑتی!

اور اس ٹیپ کے سر کے بعد ظاہر ہے، اور کوئی سر کیا ہوگا اور کیسے

کیف پیدا کر سکے گا۔ بے شک "بھٹا" میں ایک بار دل کھو جائے

تو وہ جوار کی طرف نہیں جانا چاہتا!

مسلم بنگالی ادب

بنگلہ سے ترجمہ

ڈاکٹر انعام الحق۔ ایم اے۔ پی ایچ ڈی

اس کتاب میں بنگالی زبان و ادب کی مکمل تاریخ اور اس کے ثقافتی، ملی و تہذیبی پس منظر کا جائزہ لینے کے بعد بتایا گیا ہے

کہ اس زبان کی نشو و نما و ترقی و تہذیب میں مسلمان حکمرانوں، صوفیاء، اہل علم، شعرا اور دانشمندان کس قدر حصہ لیا ہے۔ یہ جائزہ

بہت مکمل اور تحقیقی و تفصیلی کا شاہکار ہے۔

پورے کتاب نویس اور ڈاکٹر میں چھاپی گئی ہے اور مجلد ہے۔ سرورق دیدہ زیب اور رنگین۔ ضخامت ۲۰۰ صفحات۔ قیمت چار روپے

ادارہ مطبوعات پاکستان۔ پوسٹ بکس ۸۳۲ کراچی

”چشم بکشا اندریں دیر کین“

محمد اعلیٰ عثمان

بہنیدہ حکیم فتح کے اطفال، بھول اکھ، نریں دیکھ، فلک دیکھ، فضا دیکھ مگر یہ آگ سے کوئی سوہن
پہلے تقریباً تین اکڑی مسعود سرسید میں غائبہ غالبہ سے بڑے کارکن تھے۔ میر نے نئی روشنی دین
مغربی علم و حکمت کی نئی نرا خدائی سے تحسین کی تھی۔ اسی مناسب باہمی کی نام پر ہم عنوان باہک کے تحت
سائنٹفک سوسائٹی آف پاکستان کے چوتھے سالانہ اجلاس کی کارروائی اور اس کا خطبہ صدارت
یہاں پیش کر رہے ہیں۔ (ادامہ)

خود بھی اہم تر ہو جاتی ہے۔ اسی طرح کی ایک سنجیدہ، ذہین اور علمی مجلس
وہ اجتماع تھا جو کچھ دنوں پہلے منعقد ہوا۔
میں سائنٹفک سوسائٹی پاکستان کی اس سہ روزہ کانفرنس
کے بارے میں ذکر کر رہا ہوں جس کا ہمارے شہر میں کافی دنوں سے
چرچا تھا۔ اگر یہ کہا جائے کہ بیشتر دوسری شہری سرگرمیوں پر اسے
توقیت حاصل ہو گئی تھی تو شاید یہ بات بے محل نہ ہوگی۔ اس لئے
کہ مذکورہ جماعت کے پیش نظر جو مقصد ہے وہ نہایت اہم ہے اور
موجودہ وقت کا تقاضا بھی۔

آئیے ایک نظر اس مقصد کی طرف بھی ڈالتے چلیں جیسے میں نے
”نہایت اہم“ کہلے۔ ان مخصوص نشستوں کو جانے دیجئے جو اردو کے
شاعر اور ادیب بھی کجا منعقد کر لیتے ہیں بلکہ ذرا ان کانفرنسوں یا
جلسے جلسوں کا تصور کیجئے جو ملک گیر میانہ منعقد ہوتے رہتے ہیں۔
کیسا ان سب کی کارروائی اردو میں ہوتی ہے؟ اکثر کی نہیں۔
ایسے ماحول میں جہاں معیشت کے ادنیٰ سے شعبوں میں بھی توقیت کسی غیر کی
زبان کو دی جانے کسی ملک گیر کانفرنس کی تائید کا اردو کی آگاہی میں
ہو تو کیا یہ چوکنے کی بات نہیں؟ یہ کانفرنس ”نہایت اہم“ اس لئے تھی
کہ اس میں ہر یہ لفظ جو بولا گیا وہ اس زبان میں تھا جسے یہاں کے لوگوں
کی ایک کثیر تعداد بولتی اور سمجھتی ہے اور ہمارے قومی زبانوں میں سے ایک
ہے کانفرنس کی مجلس استقبالیہ کے صدر کے الفاظ میں یہ نہایت اہم

”کراچی جیسے شہر میں جو علمی اور ثقافتی سرگرمیوں کا مرکز ہے
سوسائٹی کی طرف سے کانفرنس کا اعلان کوئی ایسی بات نہیں
تھی جس پر غیر معمولی حیرت یا مسرت کا اظہار کیا جائے۔ یہ تھے
لفاظ جو جن علی عبدالرحمن صاحب نے ”سندھ مدلتہ الاسلام“
ایم تارکی عمارت میں سائنٹفک سوسائٹی، پاکستان کی چوتھی سالانہ
کنس کے موقع پر اپنے خطبہ استقبالیہ میں کہے۔

اس میں شک نہیں کہ کراچی کی پہلو دانہ ندگی میں ہر روز
ایکسی ثقافتی یا علمی محفل کا انعقاد کوئی ایسی غیر معمولی بات بھی نہیں۔
اسرا کے رو پہلے سورج میں کبھی خام کے ٹکے دھند کے میں کبھی
مکمل جب لوہا شہر نیوں لائٹس کے شش رنگی خیابان میں آہستہ آہستہ
آئی لے کر یوں بیدار ہوتا ہے جیسے سمندر کے جھاگ اٹلتے پانیوں
وہیں بیدار ہو رہی ہو یہاں اس بام سے اس بام تک، چنگ و
ما، شعر و سخن و غم و غصہ اور علم و ادب کی محفلیں سمجھتی ہی رہتی ہیں
باجل کر اس شہر کی ایک شخصیت ترقیب پاتی رہتی ہے، اس کا
دارا اسی طرح تراشا گیا ہے۔ اس شہر کی شخصیت ”اور کردار“
محفل میں ان سب عناصر کو یکساں اہمیت حاصل رہی ہے لیکن
ناپوری بھی ہوتا ہے کہ کوئی محفل بذات خود اس درجہ اہم ہوتی ہے کہ
نڈا گے ٹھوکر شخصیت سازی کے اس محل میں سب سے نازک
سنگ تعمیر پڑنے ہاتھوں میں لے لیتی ہے اور پوری شخصیت کے ساتھ

اس لئے بھی تھی کہ اس کانفرنس کے دو طرز آپ دیکھیں گے کہ طبیعیات
کیما، ریاضی، حیاتیات اور دوسرے علوم کے مشکل سے مشکل مضمون
کس سادگی اور صفائی کے ساتھ اردو کے سانچے میں لکھتے اور سننے
والے کے ذہن میں اترتے چلے جاتے ہیں۔ اس لئے اردو کی گراں
مانیگی اور اظہار مطالب پر اس کی قدیمت کا ایک اور ثبوت پیش کیا۔
یادش بخیر! یہ وہی سو سائیس ہے جس کی داغ بیل اب سے
سوسلی پہلے سرسید نے ڈالی تھی اور جس کا وقع اگر تہذیب الاعمال
کا علمی و ادبی کام ہم سب کے سامنے ہے اور اسی جماعت کے اندر
سرسید نے پسماندہ مسلمانوں کو باسیت کے غول سے نکل کر نئی دنیا
اور اس کی ترقیوں کے ساتھ قدم سے قدم ملا کر چلنے کی ترغیب
دی تھی، سرسید کے جذبہ عمل، ان کی بے لوثی اور صداقت سے
کسے انکار ہو سکتا ہے۔ یہ سو سائیس جدید سائنسی علوم کی تحصیل کا
ذوق عوام میں پھیلانے کے سلسلے میں اردو کے سرسید سے کام
لے رہی ہے اور اسی طرح جو شمع سرسید نے روشن کی تھی اسے روشن
رکھنے کی سعی کر رہی ہے۔

دوسری سروری تھی جمعہ کا دن تھا سہ پہر کے وقت یہ کانفرنس
منعقد ہوئی۔ پروگرام کے مطابق اس نیک کام کی ابتدا تلاوت قرآن
پاک سے ہوئی۔ جناب ماہر القادری نے تلاوت فرمائی اور اس کے
خلعتے پر جناب حسن علی عبدالرحمن (صدر مجلس استقبالیہ) نے اپنا
خطبہ استقبالیہ پڑھا جس کا اوپر ذکر آیا ہے۔ خطبہ کیا تھا، بجاؤ
اختصار سے چند جملوں میں سو سائیس کے مقاصد پر نظر ڈالی گئی تھی
اور ان خدمات کو بھی ذکر کیا جو اس سو سائیس نے اپنے قیام سے
آج تک ملک کی ذہنی نشو و نما اور اردو میں سائنسی علوم کی ترویج
کے سلسلے میں کیا ہے۔

ڈاکٹر نہایت سادگی سے سما ہوا تھا۔ حاضرین محفل کے
عینی سامنے جو ڈاکٹر کا عقبی حصہ تھا، نہایت جلی حروف میں یہ
قرآنی آیت ہمیں دعوت عمل دے رہی تھی۔ سَتَجِدُنَا فِي
السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ذٰمِرًا يَّسْتَفِیْ
اَسْمٰوٰنِ مِیْلَہ ہے اور جو کچھ زمینوں میں ہے ہمارے منہ کے اعتبار
سے یہ آیت کس قدر باموقع ہے اس کی فادہ شخص دے رہا تھا۔
اصل میں شمع علم کے نقش کے ساتھ یہ آیت خود اس سو سائیس کا

مولو اور مولو گرام بھی ہے اور کس قدر موزوں۔
ہم میں سے اکثر و بیشتر نے حالی کو نہیں دیکھا لیکن حالی
کی زندگی، افکار کے جذبات کے بارے میں سنا یا پڑھا ضرور ہے
بلکہ ہمارے بزرگوں سے کراہ تک ہم برابر حالی کے خلوص
فیضان حاصل کر رہے ہیں۔ آج اسی جذبہ کی بازگشت بنا
دے رہی تھی۔ استقبالیہ خطبہ کے بعد جو خطبہ افتتاحیہ پڑھا کر
اس کالب والیہ یعنیہ دیا ہی تھا جیسا حالی کے مضامین ان کے
مدرس اور قومی نظموں کی دلسوزی کا ہے۔ مدہم مدہم
درہمند کہیں موثر الفاظ والیہ۔ یہ خطبہ جو کراچی یونیورسٹی کے
ڈاکٹر چانسلر، جناب اشتیاق حسین قریشی نے پڑھا تھا بلاشبہ دلور
گہرا نقش چھوڑنے میں کامیاب ہوا۔ شاید اس کی وجہ پڑھنے والے کا
اپنا درد تھا اور اس کے لیے کی بے لوثی تھی! یوں محسوس ہوتا تھا جو کچھ
پڑھا جا رہا ہے وہ پڑھنے والے کے اپنے محسوسات میں انصاف سے
کاری!۔ صرف خلوص اور آئندہ نسلوں کے لئے ایک پیغام عمل۔
انہوں نے اپنے خطبہ کا آغاز اس شکریہ سے کیا جو بقول
ان کے اس عزت افزائی پر ان کے ذمہ واجب الادا تھا۔ پورا
خطبہ ٹبری سلیس، شستہ، سادہ لیکن اثر انگیز اور دین تھا۔
ان کا مؤرخ ذہن براہران اسباب و علل پر مرکوز تھا جو کسی قوم کو
ٹھیک اس وقت جبکہ وہ اپنے عروج کی بلند ترین سنگھاس پر
فروکش ہوتی ہے، دھکیل کر قحط زلزلت کی طرف لے جاتے ہیں۔
ان تمام اسباب و علل کو نہایت وضاحت سے کھول کھول کر
سامعین کے سامنے پیش کیا محسوس ہوتا تھا حاضرین وہ سب کچھ
سمجھ رہے ہیں جو ایک دل کی گہرائیوں سے نکلا ہے۔

ان کے خطبہ کا ایک اہم پہلو یہ تھا کہ اس میں انہوں نے ہمیں اپنی
انفرادی ثقافت کی تعمیر پر نودیا تھا۔ فرمایا "اگر ہمارے دلوں میں
اپنی ثقافت کی محبت کا جذبہ نہ ہوتا تو ہم ہندوستان کی تہذیب میں
جذبہ ہونے پر تیار ہو جاتے اور اپنی انفرادیت کو قائم کرنے کے لئے ان
سب مصائب کا مقابلہ نہ کرتے جو ہمیں پاکستان کے حصول کی راہ
میں پیش آئے۔ ظاہر ہے ہند کیا برا تھا اگر اس کی ثقافت ہمارے
لئے قابل قبول تھی لیکن ہمیں اپنی شخصیت، الگ بنانی تھی۔ انفرادی
شخصیت محض ایک قوی تر کاتی میں خم ہو کر اپنے تھوڑے بہت

بھی آگاہ کیا گیا تھا۔ اس بصیرت افروز خطبہ کو سننے کے بعد یہ احسا بالکل بجا تھا کہ ہماری زبان ہرگز کم مایہ نہیں بلکہ اس میں تمام جدید اصطلاحات کو کچن دھوئی اپنے میں سمو لینے کی مکمل صلاحیت موجود ہے۔ ضرورت صرف اس محنت کی ہے جو اسے رائج کر سکے اور فروغ دے میں خود اہل علم آگے بڑھیں۔

اس خطبہ کے بعد خورشید حسن صاحب (شریک متمد) نے ملک کے مختلف گوشوں سے موصول ہونے والے خیر مقدمی پیغام پڑھ کر سنائے۔ گزردہ مخرجی پاکستان اور وائس چانسلر سندھ یونیورسٹی کے پیغامات خاصہ کی چیز تھے۔ رضی الدین صدیقی صاحب کا پیغام اہمیت کا بھجپ تھا۔ دراصل یہ ایک "چیلنج" پر مشتمل تھا۔ یہی کہ بندہ یلہ اللہ جدید سائنسی علوم کا فروغ ان کی ترویج و اشاعت ممکن نہیں! مگر حقیقت یہ ہے کہ اس پیغام کے پیچھے ایک مخلصانہ جذبہ ہی کا اثر تھا۔ ورنہ اگر مقصد مخالفانہ ہوتا تو جناب رضی الدین صاحب اپنی یونیورسٹی کے مختلف شعبہ جاتی افتادہ حیوں میں اس جوش و جذبہ کے ساتھ اردو میں تمام جدید علوم کے تراجم اور فروغ کے لئے اٹھ کر کام نہ کرتے۔

جلسہ کا اگلا پروگرام "دوا دوا سالانہ" تھا۔ اسے شریک متمد پڑھ کر سنایا اور پھر عصرانہ کے بعد ایم سینا پر ایک نہایت پر مغز لکچر کے ساتھ مع کا پروگرام بطریق احسن ختم ہوا یہ لکچر جناب سلیم الزماں صاحب نے دیا تھا اور جلسہ کی صدارت ڈاکٹر نذیر احمد نے کی۔

آٹے روز کوئی ڈھائی بجے، سہ پہر کے وقت مختلف شعبہ جاتی اجلاس منعقد ہوئے مثلاً شعبہ علوم طبیعی، علوم حیاتیاتی، علوم ارضیات اور شعبہ تعلیم وغیرہ۔ ان تمام مجالس میں نہایت پر مغز تحقیقی مقالات اور دوسری میں پڑھے گئے جسے صاحب ذوق حضرات نے پسند کیا۔ ان علوم کو اردو میں منتقل کرنے کی مساعی کو سراہا۔

بچے شام بدیہ کراچی کی جانب سے ایک عصرانہ کا اہتمام بھی ہوا اور پھر ایک عام فہم لکچر "بازاری غذاؤں میں بیماری کے جراثیم" پڑھا گیا جسے ڈاکٹر محمد علی احمد صدر شعبہ خودک و حیاتیات کراچی یونیورسٹی نے پڑھا تھا اسے بھی بہت پسند کیا گیا کیونکہ عوام کی ضرورت کے عین مطابق تھا۔

یہ سہ روزہ کانفرنس کا آخری دن تھا۔ جلسہ ۹ بجے صبح شروع ہوا مختلف شعبوں میں تحقیقی مقالات پڑھے گئے، ہمارے بچے دھک کو (۱۵۹ پر)

میزان سے دستبردار نہ ہونا تھا۔

اخلاق کی بلندی، علم و عمل کے میدان میں ترقی یہ تمام باتیں ان کے خیال میں دیگر اقوام کی اندھی پیروی میں انہی زبان سے دستبردار نہ کر حاصل نہیں کی جاسکتیں۔ اس طرح ترقی تو کیا اس کی پہچان بھی ہاتھ نہ آسکے گی۔ اگر اسی خوشحالی و تنگ تمیصوں، چست پتلونوں و جیم کی ساخت کی نمائش سے ہاتھ آسکتی تو پھر کیا تھا۔ نہ کتب خانہ کی ضرورت تھی نہ محل کی، نہ کسی جامعہ کی نہ کسی دانشگاہ کی بچہ تو اب افسوس تھا جو ہاتھ آجانا کہ جو کچھ اردو نے خون پسینہ ایک کر کے حاصل کیا وہ ہمیں درزیوں کی سحر سے مل جاتا۔

"جس قوم کو اپنی کوئی چیز بھی نہ لگے اور دوسروں کی ہر ادھر فریفتہ ہو وہ کیا زندہ رہ سکتی ہے؟ کوئی قوم اس وقت تک جی نہیں کر سکتی جب تک وہ خود آگاہ نہ ہو۔ جب تک اسے خود اپنے لافنی ورٹے سے دلچسپی نہ ہو تاہم اس کا کونسا طالب علم ہے جو یہ نہ جانتا ہو کہ ہم تک یورپ میں علوم لاطینی و یونانی زبانوں کی جاکڑ بند ہیں اسے وہاں اور تار کی ختم نہ ہوا؟

اپنے خطبے کے آخری حصہ میں انہوں نے قوم کے باشعور و ذہین افراد سے بطور خاص دو باتوں کے لئے درخواست کی: (الف) اگر طبی علوم کے ماہر اس قوم میں ان علوم کا ذوق صحیح پیدا کرنا چاہتے ہوں ان کو اپنا زمانہ میں منتقل کریں۔ انہی زبان میں سوچیں، لکھیں، سمجھیں اور سمجھائیں تاکہ یہ علوم پھیلیں اور عوام تک رسائی حاصل ہو سکیں۔ (ب) کہ اگر قوم کو تباہی سے بچانا مقصود ہے تو اس فاصلہ کو اس سے کم کر کے جانے جو اس کے اور دیگر ترقی یافتہ ممالک کے مابین ہے۔ اور یہ فاصلہ نصاب تعلیم اور مدت تعلیم میں کمی سے نہیں بندھا گیا ہے کم ہو گا۔

صدارتی خطبہ ڈاکٹر افضل حسین قادری (دکراچی یونیورسٹی) پڑھا جس کا عنوان "پاکستان کی حیاتی جغرافیائی ماحولیات" تھا۔ یہ اہمیت و دقیق سائنسی موضوع پر محیط ہونے کے باوجود بڑا عام فہم تھا۔ بڑی روانی اور دہلیز پڑھا گیا کہ حاضرین کو اس کی شمولیت ذہن میں لے کر کسی وقت کا سامنا نہ کرنا پڑا۔ اس امر کی حقیقت اس وقت تک ہی تھی کہ انگریزی مصطلحات سے گریز کیا جائے اور جہاں جہاں مصطلحات لگائے گئے ہوں ان کے ساتھ ساتھ ان کی ہم معنی اردو مصطلحات

”اترائے کیوں نہ خاک...“

مرفت جاوید

وہ چھڑا سا قلم جو پہلے بھی اپنے ہر دکھا چکا ہے۔ اب پھر میدان میں آتا ہے۔ اور بتاتا ہے کہ خاتمہ غالب کی آتش افشانی — ہر کو یہ شمارہ اسی بزرگ سے منسوب ہے، اس لئے ہر بات میں اس کا حال مناسب ہے۔ کے برعکس اس کے خاتمہ خوردیں اب بھی وہی دم ہے۔ (ادارہ)

قوم اور ملک کا دست و بازو۔ ان کا سہارا۔ ان کے محافظ سلطان کو پشت و پناہ۔ وہ لوگ جو ہمارے بڑے بڑے نازک وقتوں پر کا۔ آئے۔ یہاں تک کہ ہمارا آخری سب سے بڑا انقلاب بھی ان ہی کے دم قدم سے ہوا۔

اور یہ تو آپ جانتے ہی ہیں کہ شکر خورے کو کسی نہ کسی طرح شکر مل ہی جاتی ہے۔ اب یہ سچ کی شکر ہو یا شکر کی بنی ہوئی چیز یعنی مٹھائی جس کے لڑکے بالے دیوانے ہوتے ہیں۔ یا ویسے ہی کوئی نہ سلی چیز۔ چنانچہ ہمیں بھی جو پرچم کے فرزند ہر لڑنے اور چم چم کرتی فوجوں کا دھوم دھام سے مظاہرے کرنے کے رسیا ہیں۔ اس سال بھی ایک موقع مل ہی گیا کہ ہم ان کے قریب آئیں۔ اور اپنی آنکھوں سے ان کے کارنامے دیکھیں۔

ہو ایوں کہ کھاری لیڈی پنسل نے ہم لوگوں کو یاد فرمایا۔ ان کے ہاتھ میں دو بڑے ہی خوبصورت چھپے ہوئے رسالے سے تھے اور کچھ کاغذات۔ ایک رسالے پر تین بیضوی قسم کے رنگین پکڑتے۔ اور دو تلواروں میں چاند تارا۔ ایسا عمدہ چمکتا دبیز کاغذ کہ خود بخود چھوٹے کوچی چاہا۔ اس لئے اور بھی کس قسم کا بہترین کاغذ بھی ہمارے وطن عزیز کے دوسرے حصے مشرقی پاکستان میں تیار ہوتا ہے اور اس سے ہمیں باہر سے کتنا ہی روپیہ ہاتھ آتا ہے۔ بعد میں اس سے معلوم ہوا کہ یہ سلع افواج کے چوتھے دم کے لئے جو اگلے دن ہرجوڑی کو منایا جائے گا۔ سو مزید چھپا ہے۔ میں نے جوں توں کر کے یہ تحفے

اور یہ خاک پاکستان کی خاک پاک کے سوا اور کون ہو سکتی ہے؟ جس ہر سال کے سال ہمارے فوجی بھائی یوم مسلح افواج کے سلسلے میں پرہیز کرتے ہوئے پاکستانی جھنڈے کو سلامی دیتے ہیں اور اپنے شہری بھائیوں سے گھل مل کر ہنسی خوشی وقت گزارتے ہیں۔ اس دن اپنے قومی جھنڈے کو لہراتے ہوئے دیکھ کر جی کتنا خوش ہوتا ہے اور منہ سے بے اختیار یہ بول نکلتے ہیں: جھنڈا اڑتا ہے ہمارا۔ اور اڑتا ہی نہیں بلکہ جھنڈا اونچا ہے ہمارا۔ یقین جانیے جب بھی مجھے پاکستان کا چاند تارے سے آراستہ پرچم لہراتا نظر آتا ہے تو اس کے ساتھ میرا دل بھی آپ ہی آپ اونچا ہی اونچا اڑنے لگتا ہے اور جب کوئی ایسا موقع آتا ہے کہ یہ پرچم لہرایا جائے۔ تو میرا دل پھر کھڑانے لگتا ہے کہ میں اس کے آن بان سے لہرنے کا منتظر دیکھوں۔ اور جہاں اس پرچم سے پیارے پرچم کے ساتھ ہماری مایہ ناز فوج۔ اس کے جیالے جوانوں، اس کے ہر دلعزیز پاسبانوں کی پرہیز اور بینڈ باجے کے ساتھ یا اس کے بغیر کچھ اور اس کے شاہینوں کی پرواز بھی شامل ہو۔ تو کچھ کرنا کہنے۔ سچ جانیے اس کے تصور ہی سے دل ملیں اچھلنے لگتا ہے۔ جی چاہتا ہے۔ اے کاش! ایسے مظاہرے روز روز ہوں۔ خاکی، سفید، نیلی و بدی میرے لئے خوشی کی انتہا ہے۔ اپنے وطن کے ان مایہ ناز سپاہیوں کو دیکھ کر انسان پھولا نہیں جاتا۔ اور سینہ خود بخود غر سے تن جاتا ہے۔ اس لئے کہ ہم چھوٹے چھوٹے پاکستانی ہی تو ہیں جو آگے چل کر اپنے وطن کا مان سپاہی نہیں گے۔

انتہائی لئے۔ اور لان میں اپنی بڑی، بھری اور بولتی فوجوں کی تقریریں دیکھ دیکھ کر اچھل اچھل پڑا۔ فوج ہو تو ایسی اور اس کا ساز و سامان اس کے کارنامے۔

خیر تو پرنسپل صاحب نے کہا: ”لوگو! کل خوب چاق و چوبند ہو کر آؤ۔ کل اتوار کو بڑا ہی شاعر ارمیل ہوگا۔ فوجیوں کا میلہ جس میں تمہارے فوجی بھائی تمہارے پاس آئیں گے۔ بات چیت کریں گے طبع کے کمالات دکھائیں گے۔ جن کو دیکھ کر تمہاری طبیعت میں ولولہ بھی پیدا ہوگا اور تم بہت خوش بھی ہو گے۔ اور سنو، تمہیں کرایہ دے دے کر نہیں جانا پڑے گا۔ بلکہ فوجی میں خود آئیں گی اور تمہیں پلوگر اور زمین یا دوسری جگہوں میں جہاں ایسا ہی فوجی ملن ہوگا تم جہاں جانا چاہو جہاں چاہو اور سنو میلہ تو ہو گا ہی اور بڑا شاندار لیکن ساتھ ہی اس خوشی اور میلے سے فوجی بھائیوں سے ملاپ کے موقع پر مٹھائی بھی تقسیم ہوگی“

یہ سن کر تو یاروں کوئی کی باجھیں کھل گئیں۔ اور بعض کے دل میں اسی وقت لڑ پھوٹنے لگے۔ اس لئے نہیں کہ مٹھائی ملے گی بلکہ یہ مٹھائی ہمارے فوجی بھائی دیں گے جس کی مناس دوہری ہوگی۔ کیونکہ ہمارے دست کی مناس سے زیادہ مناس اور کیا ہو سکتی ہے۔ اور پھر یہ بھی خوشی کم نہ تھی کہ گھر کے قید خانے سے نجات ہوئی اور ہم تھوڑی دیر کھلی ہوا میں دم میں گئے۔ پڑھائی و ڈھائی یا ہوم نامک کا سمجھٹ بھی نہ ہوگا۔ بعض اس خوشی سے اچھل رہے تھے کہ طرح طرح کے بینڈ بجے سنیں گے، رنگ بنگا فوجیں دیکھیں گے اور خوب موج میلہ ہوگا۔ چینی کی تو بات ہی کیا ہے۔ کیونکہ اس دن اتوار پڑھا تھا۔ اور چینی ہوتی ہے تو اس کی خوشی کی باجھیں ملتا۔ ہم پاکستان کے نونہال پڑھائی سے کیوں بھاگیں۔ پڑھائی پڑھائی ہے وہ کھیل کھیل۔ اور حق پر چھ تو کھیل تماشے بھی کھیل کے کھیل اور پڑھائی کی پڑھائی یعنی سکھائی ہیں۔

تو صاحب وہ دن آیا۔ کتنا سہانا دن! ہم سب لڑکے لڑکیاں۔ انجے تک کیا ۹ بجے ہی دھڑا دھڑا سکول کے کچھ نڈیں جمع ہو گئے۔ بس آئی۔ ہم سب لپک لپک کر اس پر سوار ہو گئے۔ واٹس کس شاخہ کی بس تھی کہ گندوں پر بیٹھتے ہی حرا آگیا۔ وہ دھڑل چل رہی تھی جیسے نیچے سرک بنی ہو۔ اس وقت ہمیں وہ رسالے کام آئے۔ اور ہم ان کے ورق الٹ الٹ کر دیکھنے لگے۔ وہ پہلی اوراق پر سارا پھر دیکھنا شروع تھا۔ پتے کی بات تو ایک ہی تھی۔ یہ کہ اس یوم کا مقصد ہے۔ یہ تیرا کہ ہماری افواج نے

کس طرح اپنے معیار اور استعداد کو برقرار رکھا ہے۔ اس دن ہر قسم کے لوگ، ہماری طرح چھوٹے بھی اور بڑے بھی، اگر اپنے فوجی بھائیوں سے مل سکتے ہیں جس سے خود بخود ان کے متعلق بھرپور پیدا ہوتا ہے۔ اور ہم جہاں جلتے ہیں کہ ہمارا ملک مضبوط اور توانا ہاتھوں میں ہے۔ اور ہمیں اس کے بارے میں ذرا بھی اندیشہ نہیں ہونا چاہئے۔ ان خوبصورت رسالوں سے یہ بھی پتہ چلا کہ ہمارے بعض فوجی بھائیوں خصوصاً افسروں اور دوسرے کارکنوں نے بڑی بڑی عالمی مشقوں میں خوب کام کیا ہے۔ یوم سلخ افواج سے صرف ہمیں کہ ان کا حال معلوم نہیں ہوتا بلکہ باہر کے لوگ بھی ان کا کس بل خوب جان جاتے ہیں۔

میں تو وہ پہلی صفوں پر چھپے ہوئے پھر دیکھ رہی تھی کہ وہاں وہ ادا کیا کیا باتیں ہوں گی۔ صدر پاکستان کا حفاظتی دستہ شہر کا گھونٹا کھانے۔ میوزیکل سواری اور سنٹ پانک کے کیا کیا کمالات دکھائے گا۔ چوگان بازی تو ہم پاکستانیوں کا خاص مواد کھیل ہے۔ اس کا شاندار منظر بھی ہوگا۔ دن بھر بینڈ باجے کی سنگت کتنا مزہ دے گی۔ ان کے ساتھ ہی ساتھ ورزش کے مظاہرے، لوگ ناچ خاص کر ہمارے پٹھان بھائیوں کا مشہور جیالا ڈنک ناچ۔ یہ تو خیر تو فوجی باتیں ہوں گی۔ بڑی بات تو خالص فوجی قسم کے مظاہرے ہوں گے۔ یہ کہ حملہ کیسے ہوتا ہے۔ بچاؤ کیسے کیا جاتا ہے۔ دشمن کے ٹھکانوں پر بے پناہ گولہ باری۔ ساتھ ہی توپیں، سنگل کرنے کا سامان۔ فوجی فارمن اور فیکٹریوں کی پیداوار میں۔ چھوٹی چھوٹی بینڈ فوجوں سے نشاد باری اور بیار یا زخمی فوجیوں کا علاج معاملہ کیسے ہوتا ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔ مزے کی بات یہ کہ لوگوں میں ہم جیسے شوقین لڑکوں کو بھی نشاد بازی کا موقع دیا جائے گا۔

اُدھر پاکستانی کے ماینا زبوری جہاز بھی ڈاک یا رڈ میں کھڑے ہوں گے۔ تاکہ ان کو دیکھنے کے دلدادہ شہری جوق جوق آئیں۔ اور وہ ساحلی فرودگاہیں جو بحر کی مدد اور ضرورتوں کے لئے بنائی گئی ہیں یعنی ”کار سائز اور بہادر“ لوگوں کے لئے کھلے ہوں گی کہ وہ ان میں اور ان کو دیکھیں۔ رات کو ان مقامات پر گودی اور جہازوں پر ایسا شاندار چراغاں ہوگا کہ وہ جنگل جنگل کر اٹھیں گے۔ بھری حلقہ کے بینڈ بلجے پلوگر اور نڈی میں نہیں فرود ہال میں بھی بچے رہیں گے۔

اور سارا دن خوب رونق رہے گی۔

ایک بات بہت اچھی لگی۔ یہ کہ اس دن ہمارے فوجی بھائی قوم کے لئے "ایٹ ہوم" ہوں گے۔ اور یہ اب کچھ زیادہ دور نہ تھا۔ کیونکہ ہم لوگ جلد ہی فنرل مقصود پر جا پہنچے۔ اور اچھل اچھل کر جلدی جلدی بس سے نیچے اتر گئے۔ دیکھا تو دوسرے اسکولوں سے بھی لڑکیاں دھڑا دھڑا کر آ رہی تھیں اور سب کے سب خوشی سے چہچہا رہے تھے۔ دوسرے لوگوں کے بھی ٹھٹ ٹھٹ لگے تھے اور سچے اتنی بڑی گراؤنڈ پر بہت بڑا میلہ لگا ہوا تھا۔ ہر طرف رونق ہی رونق اور گہما گہمی بڑک کر کی ایک طرف جو چوڑا بنا ہے، اس پر کراچی کی فر فر چلنے والی ہوا میں ہمارا قومی جھنڈا کس شان سے لہرا رہا تھا۔ اور اس کے سامنے سے پلٹنیں سلائی دیتی ہوئی گزر رہی تھیں ہماری بڑی افواج کا دم خم دیکھنے کے لائق تھا۔ تربیت یافتہ فوجی کیس آن بان سے ایک ساتھ قدم اٹھا اٹھا کر چل رہے تھے۔ اور ان کے پورے ہم آہنگی کے ساتھ اٹھتے ہوئے قدموں کی جھلک پاکستان کے ہر شہر لاہور، کوئٹہ، پشاور، ملتان، ڈسکہ میں ہر کہیں نظر آ رہی تھی جہاں ہماری مسلح افواج کا دن اس ہی وقت بالکل اسی اہتمام سے منایا جا رہا تھا۔ ہمارے یہ کھیل جولا کیلئے صحت، قوت، بہادری، تربیت اور نظم و ضبط کی چلتی پھرتی تصویریں۔ اوی کو دیکھ کر ہمارے چھوٹے چھوٹے سینے میں خود کو دو توجہ جیسے نہ نہیں ہم مارچ کر رہے ہوں۔ اور اس میں تعجب بھی کیا ہے۔ آخر ہم جیسے قوم کے نو نہل ہی تو اپنی تعلیم، اچھی تربیت پاکر فوج میں شامل ہوں گے۔ کوئی فوجی جوان نہیں گے، کوئی بحریہ کے سپوت اور کوئی شاہین۔ میرے خدا بیٹنگوں کی وہ شاندار قطار اور بڑی بڑی لہریں جن کی سلائی کی پہلی پہلی گھن گرج اب بھی کانوں میں گونج رہی تھی۔ بیگ پائپوں کی سرسبلی مست کن آواز اور ڈھول کی دھڑلہ انگیز ضرب۔ آگے آگے رنگ برنگی ددی پہنے روپیل عصا ہلاتا اور کبھی کبھی ہوا میں اچھلتا قوی ہیکل جوان، کتنا عزا آتا تھا اس کو دیکھ کر۔ وہ سر ہاں سفید براق بھر پورا قطار اندر قطار ڈھول لٹھ لٹھ دھپی لٹھ بان۔ اور شاہین۔ زمین پر یوں چلتے ہوئے جیسے دھما دھمی فضاؤں میں شاہانہ پرواز کر رہے ہوں۔ دیکھنے میں فوج کے بازو تین مگر درحقیقت مکمل طور پر ایک۔ وہ اودان کا ساز و سامان بھی ملک کی زیادہ سے زیادہ طاقت اور حفاظت کے مٹامن بھی تو اڑتے کھٹے

وقت میں بھی یہ قوم کے کام آسکے۔ اور ملک کے اندر ہی کیا باہر بھی انہوں نے پاکستان کی ایسی دھاک قائم کی کہ دیکھنے والے حیران رہ گئے۔ کون نہیں جانتا کہ مغربی ایران اور کانگو میں ہماری فوج کچھ چلائے جوانوں نے کیا کیا کاروائے نمایاں انجام دیئے۔ ہمارے سپاہی اور ملحق اقوام متحدہ کے زیر سرکردگی اُن دونوں ملکوں میں گئے۔ لطف یہ کہ انڈونیشیا اور ہالینڈ دونوں حریفوں نے بڑی خوشی سے ان کا اپنے یہاں آکر خدمات انجام دینا قبول کیا۔ ہمارے فوجی بھائیوں نے دو گنا جگہ بڑی ہی تن دہی مستعدی اور خلوص سے کام کیا۔ اور اپنے حسن سلوک اور حسن عمل سے کانگو اور مغربی ایران دونوں کے باشندوں کو اپنا دوست اور گرویدہ بنا لیا۔ یہ دیکھ کر تو اقوام متحدہ نے طے کر لیا کہ آئندہ جب بھی اس کی خاطر فوجی امداد کی ضرورت پیش آئے گی، تو پاکستان کا نام سر فہرست ہو گا۔

اور یہ کوئی اچھے کی بات نہیں۔ وہ علاقہ جو آج پاکستان کہلاتا ہے، صدیوں سے ایسے لوگوں کا گہوارہ رہا ہے۔ جو سپاہی بننے پر ناز کرتے ہیں۔ شجاعت اور بہادری ان کی روایات ہی میں نہیں ان کے خون میں داخل ہے۔ ان کے نزدیک فوجی ہندوستان سے زیادہ فخر کی بات ہے۔ بھڑکھڑاتے وقت آئے پر سپاہی بننے کا اہل ہے۔ فراموشی تربیت دی اور وہ سونے پر سہاگہ ثابت ہوئی۔ جیسی تو ہمارے فوجی ہمارا مان ہیں۔ اور دنیا بھر میں بہتوں مانے جاتے ہیں۔ آج ہماری فوج مشرق میں سب سے زیادہ چاق و چوبند فوج ہے جو ہر جہم میں پوری اتر سکتی ہے۔ کئی رجمنٹیں تو ایسی ہیں جن کا سنہ دو سو سال سے قائم ہے۔ اور انہوں نے فوٹوں ملی جگہوں میں میں بڑا نام پیدا کیا ہے۔ یہی نہیں بلکہ ہماری فوج میں اچھے اچھے نامور کھلاڑی بھی پیدا کئے ہیں۔ مثلاً میجر حمیدی اور میجر عارف جو باکی کے مشہور کھلاڑی ہیں۔

خوب یاد آیا۔ یہ ہماری فضائیہ ہی کا ایک نوجوان تھا جس نے ہلاک مستعدی سے ایک در آنے والے لڑاکا جہاز کو ہانک سمیت اڑا کر اپنا جہاز ہمارے فوجی ٹھکانوں کے نوٹ لینے آیا تھا۔ ہماری پیدل فوج کو بجا طور پر میدان جنگ کی ملک کہہ سکتا۔ پنجاب رجمنٹ، بلوچ رجمنٹ اور فرنٹیر فورس رجمنٹ سب کی سب اپنی بہادری اور جوان مردی کے لئے شہرہ آفاق ہیں۔ فوجی افراد

گورسار اولیٰ اور دوسرے چلتے پھرتے — کبھی سرکاری فوجی بسوں۔ اور کبھی ٹینکوں میں — گزرا جس سے نکان تو ضرور ہوئی لیکن جو تفریح ہوئی اس سے ایسا لگا جیسے ہم اسی طرح بٹاش بٹاش گھر والیں آ رہے ہیں۔ جیسے صبح روانہ ہوئے تھے۔

بہت اچھا ہے کہ یہ دن ہر سال اسی طرح منایا جائے۔ یہاں تک کہ ہم نئی پود کے لوگ بٹھے ہو کر خود کیڈٹ بنیں اور اپنے بعد کی نانی کو پاکستانی فوج کا ایسا ہی خاندان نظر دکھا سکیں +

”چشم بکشا اندیں دیر کہیں“ — بقیہ صفحہ ۵۵

اجلاس ختم ہوا۔

سہ پہر ۳ سے ۵ بجے تک ایک مذاکرہ بعنوان ”ملک کی معاشی ترقی کے لئے وسائل کا استعمال“ منعقد ہوا جس کا افتتاح جناب غلام فاروق صاحب سالانہ گورنر مشرقی پاکستان نے کیا اور سادات جناب رضی الدین صدیقی نے فرمائی، اس میں ملک کے مشہور دانشوروں نے شرکت کی اور اسے ان اجتماعات کا اگر عمل سرسید کہا جائے تو بیجا نہ ہوگا۔

شام ۵ بجے سندھ مدرسہ بلورڈ کی جانب سے جس نے اس سال کا نفرس کے انعقاد کے سلسلہ میں جمالی نوازی کے فرائض قبول کئے، ایک عصرانہ کا اہتمام بھی ہوا اور اس طوع یہ سہ روزہ کانفرنس ٹہری کا بیانیہ کے ساتھ ختم ہوئی۔ یہ امر باعث مسرت ہے کہ ملک کے میڈیکل سائنسدان اور دانشور ملک کی ضرورتوں کو محسوس کر رہے ہیں اور طبیلا بدیر نہیں یہ احساس ہو گیا ہے کہ انہی زبان ہی انہی ترقی میں مدد معاون ثابت ہو سکتی ہے اور ملک میں سائنس و ٹکنالوجی کے فروغ میں ہماری زبان بڑا اہم کردار ادا کر سکتی ہے اور اسی تیزی کے ساتھ بدلتے ہوئے خلائی و فضائی دور میں ہم دوسروں کے ساتھ اگر ہمدرد رہنا چاہتے ہیں تو اپنے آپ کو ان علوم کی تحصیل کی طرف متوجہ کرنا پڑے گا اور جیسا کہ خود صدر پاکستان بار بار ہمارے نوجوانوں کو تلقین کر رہے ہیں ملک کو سائنس کے فیضان سے بہرہ ور ہونا چاہیے مگر ساتھ ہی اپنی روحانی و ثقافتی اقدار کے سرچشموں سے بھی ہمیں دور نہیں جانا چاہیے کیونکہ علم اور عمل کی راہیں ہمیں اپنی منزل کی طرف تباہی لے جاسکتی ہیں جب ہم اپنے ماضی کے درخشاں پہلوؤں سے بھی آگاہ ہوں اور نئے تقاضوں کو بھی اپنی زندگی کا آدرش بنائیں +

اور حملہ کے لئے اسٹاف کلج کو مشہور دنیا کے اہم ترین کالجوں میں شمار ہوتا ہے۔ اس سونہیر میں دنیا کا نقشہ کیسا عمدہ بنایا گیا ہے۔ اور اس میں مشرقی و مغربی پاکستان اور اہم فوجی مقامات کس خوش اسلوبی سے دکھائے گئے ہیں۔ گھر آ کر میں بھی برش اور کلر بکس لے کر بیٹھ گیا کہ ایسا ہی خوب ڈرائنگ بناؤں اور اس کو دیوار پر لٹکا دوں۔ ہاں، اور وہ جو فوجی جوانوں کو درساں پکڑ پکڑ کر اوپر چڑھتے دکھایا گیا ہے، اسی طرح ریسوں کو پکڑ کر میں بھی اوپر چڑھنے کی مشق کرتا رہا۔

جہاز سازی کی گودی ہمارا ایک اور بڑا کارنامہ ہے۔ اس کی واقعی بڑی ضرورت تھی۔ اب ہمارا بحریہ، خدائے فضل سے ہر طرح اتنی ترقی کر چکا ہے کہ یہ دونوں بازوؤں کی پوری پوری مہدی حفاظت کیلئے۔ اس میں سکھائی، ساز و سامان اور درستی و مرمت سب کا پورا پورا اہتمام ہے۔ ساحل ساحل بحری فرو دگا ہیں بھی ہیں۔ بہادر، ہمالیہ، دلاور۔ اس طرح ۱۵ ایک سال میں بحریہ کچھ ہو گئی ہے۔ جہاز خریدے گئے، تربیتی ادارے قائم ہوئے، مرمت و درستی کا انتظام ہوا۔ اور دوسرے ملکوں کے ساتھ مل کر کتنی ہی مشقیں بھی ہوئی ہیں۔ پی۔ این۔ این۔ این۔ ہلالہ۔ نگار ساز۔ ہمالیہ۔ لڑکوں میں بڑے ادارے ہیں۔ طوفانوں اور سیلابوں کی روک تھام، ان کے سلسلے میں مدد سمندر کی تہ کی پیمائش اور جانرہ۔ اور ساحلی پیمائش کے سلسلے میں بڑا کام ہوا ہے۔ مشرقی پاکستان میں چائنا کی نئی بندرگاہ اس ہی مطالعہ کا نتیجہ ہے۔ چائنا کام میں جو سمندری اکیڈمی قائم ہوئی ہے، وہ اچھے اچھے افسر اور جہاز راں پیدا کرے گی۔ زمین، پانی اپنی جگہ ہیں، ہوا اپنی جگہ۔ اور اس کی بات ہی کیا ہے۔ آگے سے آگے بڑھ جاتے کے لئے فضا ہی کام آتی ہے اور ہم ایسا کر رہے ہیں۔ تربیتی ادارے قائم ہوئے۔ نئی وضع کے جہاز بنا کر تیار، ہارڈ ویئر وغیرہ خریدے گئے۔ اور اب توجہ طیاروں کا دور ہے۔ سب سے بڑی بات رائل پاکستان ایئر فورس کب کا صرف پاکستان ایئر فورس بن چکا ہے۔ اور یوں کتنے ہی خواب ہیں جو پورے ہو چکے ہیں۔ ہمارے شاہین اور شاہیناز برابر عالمی مشقوں میں حصہ لیتے رہے ہیں۔ اور ملک میں جو ٹیڈی دل آتے رہتے ہیں، ان کو طیارہ میٹ کرنے میں فضائی بیڑے نے بڑا کام کیا ہے۔ سیلابی علاقوں کی امداد کے سلسلے میں جو کام کیا گیا ہے، اس کو کبھی نہیں بھلا یا جاسکتا۔ یہ سب کچھ میں نے اور میرے ساتھ ہزار پاکستانیوں، چھوٹوں اور بڑوں نے بڑھا ہی نہیں، اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ اور

آزاد بنام غالب — بقیہ صفحہ ۱۱

عجب احوال ہے میرا کہ جب خط اس کو لکھتا ہوں۔
تو دل کچھ ادکھتا ہے، قلم کچھ اور کہتی ہے
بلکہ اگر خود مولانا آزاد کا اقتدار کیا جائے تو یہ شعر ظفر کا نہیں بلکہ
ان کے اپنے استاد ذوق کا ہے کیونکہ یہ ظفر کے دیوان سوم میں ہے۔
(ص ۱۵۴)

۱۰۔ التماس دلی میں مذکور — اور لکھنؤ میں مونٹ ہے۔
اگر یہی لفظوں کی تذکیر و تانیث کا اس زمانے تک تعین
ہی کہاں ہوا تھا کہ اس پر اعتراض ہو، بلکہ سچ تو یہ ہے کہ ابھی تک اس
بائے میں کوئی ایک تادمہ نہیں ہوا۔ ایک ہی لفظ کوئی ذکر کلمہ
کوئی مونٹ۔

یہ ہے مولانا آزاد مرحوم کی فرد جرم غالب کے خلاف۔ اس سے
آپ اس نتیجے پر پہنچیں گے کہ۔

(۱) غالب دراصل اردو کے نہیں فارسی کے شاعر تھے۔
اس ان کی تعلیم و تربیت ناقص رہ جانے سے وہ اس میں بھی
صحیح اور خاطر خواہ کامیابی حاصل نہ کر سکے،
(۲) اردو میں ان کا اکثر کلام ناقابلِ فہم یا دوسرے لفظوں میں
بے معنی ہے،

(۳) اردو میں وہ غلط محاورہ اور زمرہ لکھتے ہیں،
(۴) وہ اردو شعر میں لاری ترکیبیں اور محاوروں کا ترجمہ لکھتے ہیں
جو اردو کے اہل زبان کے روزمرہ کے خلاف ہوتا ہے،
(۵) ان کی اردو سولے غیر سنجیدہ تحریک کے اور کسی سحر فکری نہیں
(۶) ان کے اردو خطوط عام قاری کے لئے بے مزہ ہیں؛

خیال یا علمی مطالب یا دنیا کے معاملات خاص میں
ملائے رکھے، تو اس انداز میں ممکن نہیں (ص ۶۴۹)
اس پر مزید حاشیہ رائی کی ضرورت نہیں مان کا مدعا یہ ہے کہ
اردو کی معنی کی زبان صرف اس چیت اور خط و کتابت (اور وہ بھی
غیر سنجیدہ موضوعات پر) تک کا ترجمہ ہو سکتی ہے۔ اگر کوئی شخص اس زبان میں
کسی اہم موضوع تاریخی یا اخلاقی یا کسی خاص علم کا بیان کرنا چاہے، تو
یہ زبان اس طرح کے مفہوم کے ادا کرنے میں قاصر رہے گی۔

۸۔ پھر اس پر بس نہیں کرتے۔ عام خیال ہے اور یہ سچ بھی
درست کہ اردو کی معنی کی زبان، ان کا فکا ہی انداز اور بے معنی
ایسا ہے کہ ان کو اگر انہیں پڑھنا شروع کرے، تو بے مکان ٹہرتا ہی
چلا جائے اور اس کی سی سی نہ ہو۔ مولانا آزاد لکھتے ہیں۔

”لو! لطف ان تحریروں کا اس شخص کو آئے کہ جو خود
ان کے حال سے اور مکتوب ایسوں کی حال و حال
سے اور طریقہ کے ذاتی معاملات سے بخوبی واقف ہو
غیر آدمی کی سمجھ میں نہیں آتیں۔ اس لئے اگر ناواقف
اردو پڑھ کر لوگوں کو اس میں مزہ نہ آئے، تو کچھ تعجب
نہیں“ (ایضاً)

۹۔ اس کتاب میں قلم، التماس کو مونٹ، پنشن، بیلہ
نابالک کو مذکور فرمایا ہے۔ ایک جگہ فرماتے ہیں: میرا
اردو بے نسبت اردو دنیا کے فصیح ہو گا“ (ایضاً)
یوں معلوم ہوتا ہے کہ قلم، غالب کے زمانے تک مونٹ بھی لکھا
جاتا تھا۔ ظفر کا شعر ہے۔

غالب بنو شہرہ من قافیہ بندی
علیٰ بہت کہ ہلکے ذوقی تم شب

نقش فریدی ہے کسی کی شوقی تحریر کا
کاغذی ہے پیرانہ سوچے تصور کا

نقد و نظر:-

”راہ سخن واکرے کوئی“

عبداللہ خاور

کچھ عرصہ گزرا ہم نے نقد و نظر کے لئے یہ تازہ عنوان ملے کیا تھا لیکن فردا نہیں فردا ملتی ہوتے ہوتے نوبت اس شمارہ تک پہنچی جو غالب سے منسوب ہے اور اس طرح حق اور حقدار تک پہنچی گیا۔ مگر خود راہ سخن واکرے کی بجائے ہم یہ ہمیشہ رویہ رواں کے پروکر رہے ہیں جو شاعر اور شاعر دونوں کے لئے ”دل گواختہ“ رکھتا ہے۔ کا وہم از راہ ہم از ساز آگہست۔ اور یہ راز و سنا تھا ہر ہے غالب کا فارسی کلام اور اس کے نکات و معانی ہی ہیں۔ رنج نہ ہی رنج یعنی عبداللہ خاور ہی ہیں! — (اوارہ)

بحث کے ساتھ کلام کا انتخاب بھی کیا۔ چند اور اہل ذوق، مثلاً نیاز فتحپوری، عروسی، غلام رسول جہر، مالک رام اور ڈاکٹر یوسف حسین وغیرہ نے اپنی تحریروں میں غالب کی فارسی شاعری کا ذکر کیا، مگر اس پر زیادہ گہری نظر نہیں ڈالی۔ خلیفہ عبدالحمید مرحوم نے بھی اس کو بہ انداز محرمانہ دیکھا۔ بہر حال اس کا اعتراف تقریباً سب ہی کو ہے کہ غالب کا فارسی کلام اساتذہ ایران کے کلام سے کسی طرح کم رتبہ نہیں۔ یہ اور بات ہے کہ ان کے ”نقش ہائے رنگ رنگ“ کسی نے نہ دیکھے اور ان پر تاریکی کے دبیز پردے ہی پڑے رہے۔ ڈاکٹر حارف شاد گیلانی نے، خون گرم کوہکن دار درگ قیصال ما، کے مصداق اور توجہ دی اور اپنا تحقیقی کا نامہ ”غالب، اس کی زندگی اور فارسی شاعری“ (بزبان انگریزی) پیش کیا جس میں شاعر کی زندگی اور اس کے فن کے کئی گوشے اجاگر کئے گئے ہیں۔ اس کتاب کی ترتیب میں غالب کے متعلق پورا سرمایہ پیش نظر رکھا گیا ہے اور اردو فارسی نظم و نثر کی تمام اصناف سخن پر تحقیقی نظر ڈالی گئی ہے۔ مآخذ کا وسیع و عریض میدان بھلے خود ناقد کی ہمت عالی کا آئینہ دار ہے۔

کتاب دو حصوں میں منقسم ہے۔ پہلے میں غالب کے حالات ہیں اور دوسرے میں ان کی شاعری اور فن پر گفتگو ہے۔ آخری حصہ کی ترتیب میں مصنف نے فارسی شاعری کی اصناف پر بھی گہری نظر ڈالی ہے تاکہ فارسی شاعر کی حیثیت سے غالب کے صحیح مقام کا تعین کیا جاسکے۔

غالب نے کہا اور بہت زور دیا کہ برصغیر میں فارسی سخن آرائی کا سلسلہ نہ صرفی و غالب بہ غالب رسید۔ اور یہ کہ از باز پسینہ گزراں پیشم یہاں تک کہ اردو کو بے رنگ من است“ قرار دے کر فارسی نثر تاثرینی نقش ہائے رنگ رنگ“ کا آواز بلند کیا۔ لیکن منکراد شاعر من“ نے اس کی طرف کوئی توجہ نہ کی جس کا نتیجہ یہ ہے کہ بعض فارسی دوستوں نے بادل فارسی سے سرمست سخن ہونے کی کوشش کی ہے۔ پھر بھی جو میخانے، بقول شاعر ”در بن ہر لفظ چیدہ ہیں وہ بری حد تک ناشاید“ نادیدہ اور ناحیف دیدہ ہی رہے۔

ہماری یہاں فنکار تخلیقی کرتا ہے اور نقد فیصلے صادر کرتے ہیں۔ غالب نے کہا ”فارسی ہیں....“ نقاد نے کہا یہ تو ذوق سے کہا ہے، ہم سے نہیں۔ اور ہم سے بھی کہا ہے تو اس پر عمل کرنے کی ضرورت نہیں۔ غالب کا اردو کلام ان کی بقائے دوام کا ضامن ہے جس کی عظمت کا خود انہیں اندازہ نہ تھا۔ چنانچہ غالب کی زندگی طعنا غالب اور ان کی اردو شاعری کے علاوہ ان کے خطوط — غرض سب ہی کچھ زیر بحث آئے۔ نہ آئی تو ان کی فارسی شاعری۔

مرستید نے تذکرہ اہل ہنری میں سب سے پہلے غالب کا ذکر فارسی شعر کے زمرہ میں کیا۔ حالی نے یادگار غالب میں ان کے فارسی کلام کے تجزیہ اور افہام و تفہیم کی طرف توجہ کی۔ پھر ایک جگہ بیت گیا اور شیخ محمد اکرام غالب کے فارسی کلام کی طرف توجہ ہوئے۔ انہوں نے تفصیلی

نے تقریباً بیس برس اس پر صرف کئے ہیں۔ اس لئے غالب کے فارسی کلام میں اسے جو کچھ نظر آئے وہاں تک شاید بعض معروف مبصرین غالب کی نگاہیں بھی کم پہنچی ہوگی۔ غالب کے نظریہ شعر و فن کا خود غالب ہی کے اشعار اور تحریروں سے جس طرح استنباط کیا گیا ہے وہ بھی مصنف کی نکتہ رسی و وقت نظر کی ایک روشن مثال ہے۔ غالب میں ابہام کی دریافت تو کوئی نئی بات نہیں البتہ اس کے متعلق مصنف کا یہ جواز ضرور قابل غور ہے کہ فکر غالب میں ہمیشہ گہرائی اور ندرت کا جوہر ملتا ہے اور ان کے کلام تک پہنچنے کے لئے قاری کو اپنے اندر فکر و خیال کی وسعت بھی پیدا کرنی پڑتی ہے اور زحمت بھی۔ غالب خود باریک بین ہیں اور اپنے قاری سے بھی باریک بینی کی توقع رکھتے ہیں مصنف نے یہ کہنے کی خاطر ہی نہیں کہا ہے بلکہ اپنی اس تصنیف میں غالب کے ساتھ اپنی باریک بینی کا ثبوت دیا ہے۔

غالب کے مقام کا تعین کرنے میں جس وقت نظر سے کام لیا گیا اس کا اندازہ ان عنوانات سے بھی لگایا جاسکتا ہے :
 ۱۔ کیا غالب تقلیدی شاعر تھا؟ اس فارسی شاعری میں غالب کا مرتبہ (۳) ہماری شاعری میں غالب کا مقام (۴) معاصر شعراء میں غالب کا درجہ (۵) غالب کا اندازہ اپنے بارے میں۔ (۶) معاصرین کی رائے۔ (۷) پیغام۔ ان توضیحات سے ظاہر ہوتا ہے کہ غالب کے فارسی کلام کا مطالعہ اس سے زیادہ شرح و بسط کیساتھ اب تک پیش نہیں کیا گیا تھا۔

یوں تصنیف کے بعض مباحث سے جزوی اختلاف ہو سکتا ہے اور ان امکانات کے پیش نظر ہی مصنف نے لکھا :
 ”میں تکمیل کا دعویٰ نہیں کرتا۔ اگر تکمیل کے حصول میں صاحب نظر حضرات تعمیری مشورے دیں تو ذاتی طور پر ہمنون ہوں گا۔“
 کہہ کئی کا سلسلہ یہیں نہیں ختم ہو جانا بلکہ ایک اور جوئے شیر بھی نکالی گئی ہے یعنی غالب کا تمام فارسی کلام پیش نظر رکھ کر کتاب کے آخر میں ایک ہزار اشعار کا برجستہ انتخاب بھی دیا گیا ہے جس نے تصنیف زیر نظر کو ہر اعتبار سے مکمل اور قابل قدر بنا دیا ہے۔

تہذیب میں سب سے پہلے عصر غالب کا سیاسی، سماجی، مذہبی اور ادبی جائزہ اس طرح لیا گیا ہے کہ پورے دور کی تصویر نظر وں کے سامنے آجاتی ہے اور غالب کی شخصیت اور شاعری دونوں کو سمجھنے میں مدد دیتی ہے۔ یہ دور انقلابوں اور آشوبوں کا دور تھا جس میں غالب کو اپنی پوری زندگی گزارنی پڑی۔ پہلے حصہ میں غالب کی تاریخ ولادت، ان کی تعلیم و تربیت، خاندانی حالات، اساتذہ کا ذکر، دلی منتقل ہونے کی تاریخ، دہلی میں قیام، کردار، قید و بند، علیہ، مذہبی عقائد، حالات اور وفات تک کوئی ایسا اہم پہلو نہیں جس پر مصنف نے تحقیقی نظر ڈال کر کوئی فیصلہ نہ دیا ہو۔ ان معاملات میں جو دلائل اور شواہد پیش کئے گئے ہیں ان میں غالب کے متعلق بعض نئی معلومات اور تحقیقات بھی سامنے آئی ہیں اور غالب کے قول کے سامنے نئی راہیں کشاہ ہوئی نظر آتی ہیں۔

کتاب کے دوسرے حصہ میں غالب کی فارسی شاعری کا بڑی تفصیل کے ساتھ جائزہ لیا گیا ہے۔ اس میں غالب کی فارسی استعداد و ان پر اساتذہ ایران کے اثر، نظیری اور تبیل کے تنقید، اور پھر مصنف دار غالب کی شاعری کا ایک بسبب جائزہ ملتا ہے۔ غرض کوئی بات ایسی نہیں چھوڑی گئی جو فارسی شاعر کی حیثیت سے غالب کا صحیح مقام متعین کرنے میں ہماری رہ نمائی نہ کرے۔

مصنف خود فارسی کا شاعر ہے اور فارسی زبان و ادب کا عبور رکھتا ہے اس کا انداز فکر و سائنسی ہے جس کا ثبوت کلام غالب کی تنقید و تبصروں میں ملاحظہ ہے۔ ہر صنف میں غالب کے فن اور اندازہ کلام کی خصوصیات، اساتذہ سے موازنہ اور ان کی تاریخی اہمیت واضح کرتے ہوئے غالب کا مقام متعین کرنے کی جس طرح کوشش کی گئی ہے وہ نقد کے اعتبار سے بھی اہم ہے اور حقائق کی تفصیل و تجزیہ کے اعتبار سے بھی۔ خصوصاً تصانیف کا جامع تحریر اپنی ہر جگہ منفرد حیثیت رکھتا ہے۔ غالب کا کلام اعتباراً زبان و فن کی ایک ہاسیک میں شاعر کا کلام ہے اور اسے پرکھنے کے لئے پہلے اس کی وسیع کائنات پر حاوی ہونے کی ضرورت ہے۔ مصنف

رنج گراں نشیں

آج ہمیں رنج گراں نشیں کی شکایت کئے بغیر چارہ نہیں۔ جس سے ہمارے قلب و جگر ٹکڑا اور آنکھوں سے جوتے خون رواں ہے۔ بیدار و اجل نے ہمیں پھر ناگہاں ایک ایسے ستارہ روشن سے محروم کر دیا ہے جو ہمارے افقِ ملت کے لئے دجہ فردخ تھلا اور مشرقی پاکستان ہو یا مغربی، اس کے ماتم میں سید پوش ہے۔ ہمارے وزیر خارجہ جناب محمد علی — جو پہلے بحیثیت سفیر پاکستان اور پھر وزیر اعظم کی حیثیت سے ملت کے افق پر بڑی آب و تاب سے فروزاں ہوئے تھے اور اب پھر جب دور انقلاب کے بعد نئے آئین نے جمہوریت کی شعاعوں سے معمور، روشن تر فضا پیدا کر دی تھی وہ اور بھی آب و تاب سے ایک نیاحیات افروز کردار ادا کرنے کے لئے منظر عام پر آئے تھے۔ اور انہوں نے اپنے نئے عہدے کی مختصر مدت پر — خوش و خشنید و لے دولت مستعجل بودا — میں اس کا نمایاں ثبوت بھی دیا تھا۔ اس لئے تمام افرادِ ملت کی نگاہیں اُن پر مرکوز تھیں اور اُن کی ذاتِ گرامی سے اُن کی بہترین امیدیں وابستہ تھیں۔ لیکن افسوس! وہ جانکا ہوا مرض جس کا شکوہ انسان کو ازل ہی سے رہا ہے، اس نے بہت ہی بے وقت ہمیں اس ستارہ روشن کی تابانیوں سے محروم کر دیا۔ عین اس وقت جب وہ ہمارے ملی اور بین الاقوامی لائحہ عمل میں ایک نئی جوت جگا رہا تھا، اس کی شعاعوں میں ایک نئی تابانی پیدا ہو رہی تھی اور اہل ملک کو اس کی بصیرت افروز رہ نمائی کی اشد ضرورت تھی، اس ستارے کا روپوش ہو جانا جو ہماری ملت کے مفکر کی تشکیل کا ضامن تھا، یقیناً ایک عظیم سانحہ ملی اور ناقابلِ تلافی نقصان ہے، جس پر قوم کا ہر فرد اشکِ خوں بہا لے بغیر نہیں رہ سکتا۔

وہ ہے کہ خداوندِ کریم مرحوم کو اپنے جوار رحمت میں جگہ دے اور پاکستان کی جس ترقی و خوشحالی کا خواب وہ عمر بھر دیکھتے رہے اور جس کو پورا کرنے کے لئے وہ اپنی زندگی کو خطرے میں ڈال کر آخری دم تک کوشاں رہے، وہ حقیقی معنوں میں روشناسِ تعبیر ہو۔ پاکستان کی اس مایہ ناز ہستی کے پسماندہ گنا اور سو گوارانِ ملت کو گہم کوئی بات وجہ تسلی ہو سکتی ہے تو یہ کہ:

مرنے والے کی جبین روشن ہے اس ظلمات میں
جس طرح تارے چمکتے ہیں اندھیری رات میں

”ماکافو“ اشاعت خاص

مارچ ۱۹۶۳ء

سابقہ روایات کے مطابق اس سال ہی ”ماکافو“ یوم پاکستان کی تقریب پر اپنا خاص نمبر شائع کر رہا ہے جس کی ترتیب کا کام شروع ہو چکا ہے۔
بوصغیر کے ممتاز اہل قلم اس میں حصہ لے رہے ہیں

چار صفحے کی آرٹ پیپر پر چھپی ہوئی رنگین و دیدہ زیب تصاویر
۱۲ صفحے کی سادہ تصاویر

— فن — تاریخ — معاشرہ — ثقافت — ادب —
— علاقائی شہ پارے — کہانیاں —

— نامور شعرا کا تازہ کلام —
سرورق، نفیس نقاشی کا نادر نمونہ
ضخامت و گنی

★

فی کاپی ایک روپیہ ۲۵ پیسہ
سالانہ خریداروں کو یہ اشاعت خاص
اور اکتوبر میں شائع ہونے والی ایک اور
خاص اشاعت سالانہ چندہ ہی میں
پیش کی جاتی ہے۔

مشہرین اور ایجنٹ حضرات فی الفور توجہ فرمائیں

(تفصیل)

اکثر مطبوعات پاکستان پوسٹ بکس ۱۸۳، کراچی

صحت اور دانت



صحت کا دار و مدار دانتوں پر ہے۔ دانتوں کو مضبوط اور مسوڑھوں کو صحت مند رکھنے کے لئے ضروری ہے کہ انھیں کپڑا لگنے سے محفوظ رکھا جائے کیونکہ اس سے بڑی بڑی بیماریاں پیدا ہو سکتی ہیں۔ ہمدرد منجن جیسے بے شمار تجربوں اور تحقیقات کے بعد مکمل کیا گیا ہے دانتوں کے لئے بے حد فائدہ مند ہے۔ مندرجہ ذیل اسباب کی بنا پر آپ کو اسی کا انتخاب کرنا چاہئے۔

صفائی اور مالش :- ہمدرد منجن اندر تک پہنچ کر دانتوں کو اچھی طرح صاف کرتا ہے۔ انگلی کی مدد سے مسوڑھوں کی بھی مالش اور ورزش ہو جاتی ہے جو دانتوں کے لئے بے حد ضروری ہے۔

خوش ذائقہ :- ہمدرد منجن خوش ذائقہ ہے اور اس کے ٹھنڈے اثرات بچے اور بڑے سب پسند کرتے ہیں۔

خوش گوار :- ہمدرد منجن کی دیر پا خوشبو منہ کی بدبو کو دور کر دیتی ہے۔



ہمدرد منجن

مسکراہٹ پیش کش اور دانتوں میں بچے موتیوں کی چمک پیدا کرتا ہے

ہمدرد دواخانہ (وقف) پاکستان
کراچی دھاکہ لاہور



مسلم بنگالی ادب کے بامیں

(بنگلہ سے ترجمہ)

ڈاکٹر انعام الحق ایم۔ اے۔ پی۔ ایچ۔ ڈی

اس کتاب میں بنگالی زبان و ادب کی مکمل تاریخ اور اس کے ثقافتی، ملی و تہذیبی پس منظر کا جائزہ لینے کے بعد بتایا گیا ہے کہ اس زبان کی نشو و نما اور ترقی و تہذیب میں مسلمان حکمرانوں، صوفیاء، اہل قلم، شعرا اور ادباء نے کس قدر حصہ لیا ہے۔ یہ جائزہ بہت مکمل اور تحقیق و تفصیل کا شاہکار ہے۔

پوری کتابت نفیس اردو ٹائپ میں چھاپی گئی ہے اور مجلد ہے۔

سرورق دیدہ زیب اور رنگین - ضخامت . . . صفحات

قیمت چار روپے (علاوہ محصول ڈاک)

نوائے پاک

ملک میں ایسے مجموعہ منظومات کی بڑی ضرورت محسوس کی جا رہی تھی جو ہمارے وطنی احساسات کو بیدار کر سکے اور ہمیں اپنے وطن کی ناک سر زمین کی عظمت اور عظمت سے روشناس کر سکے۔

”نوائے پاک“ میں ملک کے نامور شعرا کی لکھی ہوئی وطنی جذبات سے لبریز نظمیں، گیت اور ترانے درج ہیں

کتاب مجلد ہے اور خوبصورت گردوپیش سے آراستہ

گٹ اپ بہت نفیس اور دیدہ زیب -

قیمت صرف ایک روپیہ

ادارۂ مطبوعات پاکستان - پوسٹ بکس نمبر ۱۸۳ - کراچی

نئی کتابیں

پیر حکومت، ————— مصری مصنف علامہ عبدالرزاق کی عربی تصنیف کا ترجمہ
 مناسب ہیں اس نظریہ کو پیش کیا گیا ہے کہ خلافت ایک اسلامی ادارے کی حیثیت سے ختم کر دینی چاہیے۔ خلیفہ کو قرآن اور سنت کے
 کوئی سند حاصل نہیں چونکہ دو قلوب میں محض اصول احکام ہیں۔ خلافت کے دینی و دنیاوی ہونے کا نظریہ رسول اکرم کے منصب رسالت کی
 غلط تاویلات پر مبنی ہے۔ آنحضرت کی بعثت کا مقصد یہ نہ تھا کہ دنیا میں ایک نئی ریاست یا ایک نئی حکومت وجود میں آئے۔ رسول کریم کی حاکمیت
 دینی تھی نہ کہ دنیاوی ————— قیمت چاندو ہے

موسیقی : ————— موسیقی محض نثر اور روح کا سامان ہی نہیں ہمارا ثقافتی اور تہذیبی سرمایہ بھی ہے۔

تالیف: کنور خالد محمود ————— عنایت الہی ملک ————— کلاسیک موسیقی سے متعلق لکچر کی کمی ایک عرصے سے محسوس ہو رہی تھی
 اس کتاب میں جہاں موسیقی کی تکنیک اور ولایت پر سیر حاصل بحث کی گئی ہے۔ وہیں یہ کتاب موسیقی کا فن جاننے اور سیکھنے والوں کی بجا طور پر
 رہنمائی بھی کرتی ہے۔ (دکھن آرابیگم) قیمت: ۱۰ روپے

چتر لیکھا، ————— ہندی کاشتکار ناول

چتر لیکھا اس نام کی ایک بانٹاری عورت کی داستان ہے جو گناہ کا مجسمہ بن کر ناول میں داخل ہوتی ہے لیکن ناول کے ارتقاء کے ساتھ ساتھ
 اس کا کردار بدل جاتا ہے۔ وہ ایک سنیاسی لکھاری لکھنوی کے عقیدے سے متاثر ہو کر سنیاس لے لیتی ہے اور اس کے آخروں میں پناہ لے لیتی ہے لیکن کمار گری کی دلی کھلی
 ہوئی منہ خواہشات بیدار ہو جاتی ہیں اور وہ اس پر عاشق ہو جاتا ہے۔ یہی ناول کا نقطہ عروج ہے۔ عمدہ کہانیت و طبعیت۔ جالب نظر کردار، قیمت ۴ روپے

نظم	پنجابی ادب	تاریخ و سوانح
۱۔ دوم منزلیا: عبدالحمید ساک ۲۵-۳۰	۱۔ دو گلیاں فاناں { ۲-۵۰	۱۔ اسلام اور اصول حکومت، علی عبدالغفار ۳۰-۳۵
۲۔ موی خوں، احمد راضی ۵	۲۔ دکانیاں: (فوز)	۲۔ حکیم فلسفی، عبدالغفار ملک (ذریعہ)
۳۔ ناول و ڈرامہ	۳۔ جہانیاں (مضمون): شرفیہ کجھیا ۲۰-۲۵	۳۔ انسان کا عروج و رضیہ سجاد ظہیر ۲۰-۵۰
۴۔ سحر سے پہلے، رابعہ سید ۳۰-۵۰	۴۔ سادے پتر (نظم): موہن سنگھ ۲۰-۵۰	۴۔ ہمارے کھیل (مقبول کام کھیلوں کے قواعد پر اردو میں پہلی کتاب) ۳۰-۵۰
۵۔ لغزش، عبدالحمید بھٹی ۲۰-۵۰	۵۔ پنجابی ادب تے ساک { ۱-۵۰	۵۔ بیڈن پول (دسکاؤٹ تحریک کے لاپٹا) ۲۰-۵۰
۶۔ پتیاں کی بیٹی: خدیجہ خٹیم ۲۰-۵۰	۶۔ ساک مرحوم دیاں پنجابی تحریروں {	۶۔ حالات زندگی {
۷۔ چتر لیکھا، جگدیش چرن دما ۴۰-۵۰	۷۔ لوبیا آنت (چھ دیواناں، انوار فتحیم ۳۰-۵۰	۷۔ صبا اور سائنس ڈانی سی کارٹر ۲۰-۵۰
۸۔ شیشے کی دیوار: (محمد زولایہ) ۲۰-۲۵	۸۔ ترنگن (نظم): احمد راضی ۲۰-۵۰	۸۔ شخصیتیں، عبدالغفار ملک (ذریعہ)

پیپلز پبلشنگ ہاؤس

الٹار مارکیٹ ————— چوک انارکلی ————— لاہور

شماره ۳

ماہِ نو

جلد ۱۶

شمارہ خصوصی — مارچ ۱۹۶۲ء
مدیر۔ ظفر قریشی

نجوم پرین

۳۸	صدر پاکستان، فیلڈ مارشل محمد ایوب خان	بدست صبا (اپنی قوم کے نام پر)	تلاشِ بہادری
۴۹	(اہلاس انجمن مصنفین پاکستان لاہور)	بہارِ تازہ	
		★	
۸	سید رضی ترمذی	"مرے شہر کو آج دیکھو" (نظم)	آہنگِ زبود
۱۰	عبداللہ خٹاور	سازِ شرفو (نظم)	
۱۱	رشید آفرین	"خوش روزگارے؟" (نظم)	
۱۷	اختر انصاری اکبر آبادی	تعمیرِ اشیاں (نظم)	
		★	
۱۲	شہابِ رفعت	"زخ ہوا کا" (عمومی جائزہ)	گرد و پیش
۱۸	کنیز اختر	فردوس جو فردوس نہیں (خصوصی جائزہ)	
		★	
۲۱	ڈاکٹر سید عبداللہ	غالب کی تصویر آفرینی	خیابانِ ادب
۲۲	ڈاکٹر ابوالکلیث صدیقی	سخنِ فہمی و سخنِ شتاسی	
۲۷	ڈاکٹر گیان چند	تمیر کی عشقیہ مثنویاں	
۴۴	ڈاکٹر شوکت سبزواری	علمی اصطلاحات کے اردو ترجمے	
۳۱	سید قدرت نقوی	"میں نے لاہور جانا ہے؟" (ایک سانی تحقیق)	
		★	
۵۳	ڈاکٹر محمد عبداللہ چغتائی	مسیح نبوی (تعمیرِ مساجد کی مقدس ابتدا)	دیرینہ و نو
۶۲	جناب اے کے ایم فضل انقادر چودھری	"... ہازرہ تعمیرِ جہان خیز ہے"	
۶۰	ڈاکٹر مولوی عبدالحق (مرحوم)	نواب محسن الملک مرحوم	
۶۴	مشہزادہ نعیم آرزو	داستانِ قفس (بہادر شاہ ظفر)	

۷۱	انور	لیج و قلم، (مضامین شاعری، یہ دن، یہ راتیں) (دہلی دکان)	
۷۵	ابوسعید قریشی	پزل (افسانہ)	
۸۵	یونس احسر	دکھی شاہ زادی (ہنگلا نوک کہانی)	
۸۸	اصغر پٹ	نا آسنا ٹولہ	
۷۸	حمید کاظمی سری	خون کے پیاسے! (افسانہ)	
۱۰۱	الشہنشاہ راجپوت	"جہاں رنگینیاں آگتی ہیں" (دہلی دکان)	
۱۱۳	شفیع عقیل	"سنہری بالوں والی شہزادی" (بجانبی نوک کہانی)	
		★	
۱۲۴	وقار اشدری	جسیم الدین: (شخصیت اور شاعری)	دکھارستان مشرق،
		★	
۱۲۸	محمد عدیل	ایوان زریں (آسیہ آرٹ سوسائٹی، نائنٹھ نقاشی)	پہاڑی رنگ (دفن):
		★	
۵۰	رفیق خاں اور	"... کہ نہ دیکھا کرے کوئی؟" (طویل نظم)	اعتبار نغمہ:
۴۷	جمیل نقوی	"نوائے دوش" (نظم)	
۶۸	عارف حجازی	شعلہ ہوا (نظم)	
۱۲۳	خواجہ غلام فرید ہالپوٹکا	"رم جم یہ پھرا" (کافی)	
	ترجمہ، محنت افضل	★	
۶۹	مشرید ایوبی	شیر افضل جعفری	نغمہ زار (غزلیں)،
۷۰	مشتاق مبارک	شاہد عشقی	
		★	
۱۱۹	سلیم خان گتی	ایک تصویر، دو رخ (تبصرہ)	سخن ہائے گفتنی،
۱۳۵	ر۔ رخ	"راہ سخن واکرے کوئی؟" (تبصرہ)	
		★	
۱۳۰	امیر حسن سیال	"کون ہے جو نہیں ہے حاجتمند؟" (سرمایہ کاری)	
		★	
۱۴۱	صہب اختر	اپنی ذیلیں میں (مصوٰفحہ، حادثات)۔ ذرا بیک کے چل؟	
		★	
	رنگین نقش: مریم خان	طاووس	سورق:

سلاخ چندہ
پانچ روپے ۵۰ پیسہ

شائع کردہ
ادارہ مطبوعات پاکستان پبلسٹ بکس ۱۸۳ لاہور

قیمت فی کاپی
ایک روپیہ ۲۵ پیسہ

”مرے شہر کو آج دیکھو“

سید رفیع ترمذی

مراتھ شہر میرا یہی شہر، جس میں
نہی سے تھکتے، و خشاں شگوفوں سے حد نظر تک چراغاں ہے
اس شہر میں ایک دن روشنی کا نشان تک نہیں تھا
یہ ایوانی — یہ جگہ گاتے ہوئے سب دروہام
سنسان تارکیوں کا کفن اور کھریوں کھڑے تھے
کہ جیسے زمانوں کے اُجڑے ہوئے جنگلوں کا ساں
جہاں بے رنگ ابے برگ، ننگے درختوں کے سانسوں کی پُھول آواز ہوتی ہے
ساری فضا جیسے روتی ہے!
تو میں چیخا کلاہ گیا — اے درندہ آسنو، یہ بہاریں نہیں
میرے پہلو میں نغمہ سی اک آبجو دیکھتے دیکھتے جوئے خوں بھاگی
اور میں کہتا رہا،
”چھوڑ دو جشیو، شہر ویران ہو جائیں گے، کھیتیں بائیں گے
اس بھوے ہونٹ گیتوں سے محروم ہونے ہوئے دیکھ کر
میں نے ہر اک کو آواز دی،
یہ سلنے — جو آجائوں میں پہلے ہوئے راستے ہیں، یہاں
جیسے جھوں کے کتنے مسکتے ہوئے خواب
شاموں کے مسئلے ہوئے گیت
کھسکے پڑے تھے پونہی راتیں گھل
اور مرے دوست سب نغمہ خواں

”ہم گمراہی سے لہو مت پھوٹو، پشیم نہیں ہے۔“

یہاں شیطن کے گھساٹوپ اندھیروں میں

جب ایک اک مورقی رات بھر معدوں میں کراہی

تو میں خوف سے کانپ اٹھا۔

میں نے سب کو جھنجھوڑا کہ یہ کیل چھانیں،

یہ مقدس اُجالے نہ غارت کرو، باز آؤ

— مگر یہ مرا شہر

میرا چمن اس طرح ٹٹ گیا

جیسے صدیوں کا کوئی پراانا خرابہ ہو جس میں

ہر اک صحت عفریت پرچم اُٹاتے، لہو پاشتے، ناچتے پھر رہے تھے،

اسی شہر کو آج دیکھو!

مرے شہر کو آج دیکھو

جہاں زندگی کی نمی سے درخشاں، ہلکتے شکوفوں سے

حز نظر تک

ہر اک راستے، ہر روش میں چراغاں ہے

دیکھو، اٹھو دوستو

یاس کی سرو، تاریک عبرت سراؤں سے نکلو

جہاں زندگی اپنے اک آخری سانس کے کرب میں مبتلا ہے،

ادیت میں جکڑی ہوئی ہے،

اٹھو، اپنی بیچاگی کے سید، اڑگئے مقبروں سے نکل کر

اُبھرتے ہوئے آج کے آفتاب درخشاں کو دیکھو،

یہ پُرشور، بیباک، آزاد دریا،

ہواؤں کے سرسبز، شاداب جھونکے

ہلکتے درختوں کے گاتے ہوئے سانس

— ان سے محبت کرو!

چاندنی میں نہاتی ہوئی کونٹلیں

باغ کی داہنیں،

یہ ستاروں کی شبنم میں ٹھنڈے گلابوں کے پیالے

ہلکتی، چمکتی ہوئی، نرم، دوشیزہ شاہیں

— یہ سب محترم ہیں،

یہ پھیلے ہوئے کھیت، مٹی کی خوشبو بھلی دھوپ، سورج کا آئینہ اُجالا

پھلوں سے لدے، جھومتے، جھلگاتے جوان پیر

— سب زندگی ہیں!

اٹھو، دوستو،

ان کی عظمت سے

امید کا حسن لے کر،

گھروں کو سجالو —

صدر جمہور کے ساتھ

سیل جمہور ہے، ہنگامہ جمہور ہے آج

حفظ ناموس وطن، جذبہ بے تاب عروج

روز و شب اپنا یہ دستور ہے آج

سازنیہ نو

عبداللہ خاؤر

وادئی دل میں چراغاں کر دو

شیعہ جمہور سر و زان کر دو

ذرتہ خاک میں کرنوں کے چلن جاگ اٹھے

صبح آئی تو سبھی کوہ و دمن جاگ اٹھے

نکبتِ گل ہے پرستارِ صبا

اور صبا دید کا پیغام لئے۔

گنگنائی ہے درِ دل کے قریں۔

زندگی ہے کہ ابنتی ہی چلی آتی ہے

کوہساروں پہ چلا پرتو بہتاب کی ہے

از افق تا بہ افق

وادیاں۔ بنتو بہار۔

قریب و شہر و خرابات کہن جاگ اٹھے۔

صدر جمہور کے لب ہائے تبسم کا فسون

فاصلے رشتہ وحدت میں پروئے جس نے

خاک کے دل میں نئے عزم سموئے جس نے

ساحلِ سندھ سے تا ارضِ جبال

ہے بپا جتنِ طرب شب ہمہ شب، روز بروز

شرق کے زہرہ جیسے رقص کناں

غرب کے ہاتھ میں ہے سازنیہ نو۔

نغمہ گر، نغمہ سرا باد و طنبورہ و چنگ

نغمہ نو کی گمک وادیوں، کہساروں میں؛

کلی کلی میں آج تری رشتائی ہے

ساتی بن کر روج بہاراں آئی ہے

پھوٹی ہے چہروں پہ شفق کی رنگینی

تو سبز تریج ہے قوس میں یا انگڑائی ہے

امیدوں کے پھول کھلے دامنِ دہی

پھولوں کی ریت گیتوں میں اُڑائی ہے

ساحلِ دوشست میں، صحرائیں، ستاروں کا ہجوم

مہ دا بنجم سرِ سیمائے وطن جاگ اٹھے۔

پاسِ بابائین وطن باہمہ سطوت، جبروت

خیلِ درخیل چلے آتے ہیں۔

ان کے تیمور سے پہاڑوں کی صلابت لرزاں

ان کی نظروں میں پھرتے ہوئے طوفانِ پہاں

خوشاروزگارے!

رشید آفریں

بجھ رہا تھا عزت و ناموسِ ملت کا چسراغ
جس طرح سب پھول ہوں فصل خزاں میں زندہ زرد
ہر طرف تھی تیرگی اور راہ ناہموار تھی
اس طرف نشوونما کے بند تھے سب راستے
مائل پرواز تھے سب نت نئے انداز سے
قوم تھی دنیا میں جس کا پاسباں کوئی نہ تھا
آسمان پر خون تھا یا ایک رنگ بے کسی
حالِ ملت دیکھ کر دل اہلِ دل کے ہل گئے
بر محبتِ قوم کا دل رو رہا تھا دہریں
آخر اٹھا اک مجاہد باندھ کر سر پر کفن
کاٹ ڈالا اس نے جسمِ قوم کے ناشور کو
دن کو دن سمجھانہ اس نے شب کو شب جانا کبھی
ناہم نیت کر دیا دنیا کی نظروں میں بلند
اس پہ احساسات کے ہر سو دیئے جلنے لگے

نوعِ و سِ ملک کی تاباں جبیں تھی دلخ دلاخ
یوں ہوا سال تھا ہماری انجمن کا فرد فرد
کیا کہیں یہ قوم کن آفات سے دوچار تھی
اور دنیا کے بدلتے جا رہے تھے زاویئے
تھے ہمیں محسوس لیکن قوتِ پرواز سے
راہبر کوئی نہ تھا اور کارواں کوئی نہ تھا
مرغِ بیل کی طرح دم توڑتی تھی زندگی
آرزوؤں کے شگوفے خاک میں یوں مل گئے
سب ہی پتے جا رہے تھے بے بسی کی لہریں
جس کے دل میں عظمتِ ملت کی تھی روشن کرن
زندگی بخشی نئی پھر ملت مجبور کو
اس سے جو بھی ہو سکا اس کام کی تکمیل کی
پھر نہ ملت کو ملے گا کوئی ایسا دم مند
راہرو اس روشنی میں شادماں چلنے لگے

کھل اٹھے جوشِ عمل سے ہر طرف گویا چمن

کر لیا زیب بدنِ ملت نے اُجلا پیرہن

استقلال سے قائم ہے۔ اسے حق اور صرف حق سے سروکار ہے۔ اس کا دوسروں کے ساتھ تعاون شرط ہے۔ اگر سٹیٹ اسٹیٹو فی الحقیقت اس کے قومی احساسات کے حامی و مددگار ہوں تو وہ ان کا حلیف رہے گا۔ ایسے ہی اس کے بدلے دوست و اقارب دوست ہیں تو وہ ان کی دوستی پر قائم ہے۔ لیکن اگر وہ کسی اور کی اس طرح اطلاع و پشت پناہی کریں کہ وہ پکٹا کے مناد کے خلاف ہو تو ضروری نہیں کہ وہ اپنے عہد و فائز کا پاس کئے جائے۔

بلا سے گر مڑا یا رشتہ خوئے
رکھوں کچھ اپنی بھی مڑگان خوئے نڈاں کے لئے

پاکستان کی پالیسی لاتمدیل نہیں۔ اگر حالات اسے مجبور کریں تو وہ اپنا رویہ بدل بھی سکتا ہے۔ جنابریں اگر اس کے موجودہ لائحہ عمل میں اس تبدیلی تصور کا عکس نظر آئے تو کچھ عجب نہیں۔

اس تمام سلسلے سے ایک بات بخوبی نمایاں ہے۔ ہمارے نصابی پانچیاں کا خلوص، بیداری اور چوکتا پن۔ وہ نہ کسی کے ہاتھ بکے ہوئے ہیں اور نہ حالات کے تقاضوں سے بے خبر۔ اس لئے وہ ہر قدم انتہائی احتیاط سے، پورے غور و غوض کے بعد، اٹھا رہے ہیں۔ اور اس ہم ذمہ داری اور ذوق و شوق ہی پر حقیقی ترقی کا دار و مدار ہوا کرتا ہے۔ ادب اور فن کبھی اپنے گرد و پیش کے حالات کا ساتھ دیتے ہیں اور کبھی نہیں دیتے۔ اور اس میں کوئی حرج نہیں بشرط یہ کہ ان میں زندگی اور توانائی کی روح موجزن ہو۔ وہ حقیقی معنوں میں جاندار معلوم ہوں۔ یہ بھی ضروری نہیں کہ ان میں یکدم قدامت اور شخصیتیں پیدا ہوں اور کثیر تعداد میں بیکایک بڑے شاہکار پیدا ہوں۔ اتنا ہی کافی ہے کہ دنیا فوٹا اچھے خاصے فن کار اور اچھی اچھی پیشکش پیدا ہوتی رہیں۔ مصوری، رنگ تراشی، موسیقی وغیرہ میں ایسی عام و سبھی موجود ہے اور ان میں نئی نئی کوششیں بروئے کار آتی رہتی ہیں۔ زیادہ بنیاداً بات اس دلچسپی کا موجود ہونا ہے۔ اور ان میں لگاتار تخلیق۔ تاکہ سلسلہ کہیں ختم نہ جائے۔ اس وقت ہمارے یہاں مشرق و مغرب کے اختلاف کا دور ہے۔ اس لئے ہر میدان میں نئے نئے طریقے، پیرائے اور فن رواج پار رہی ہیں۔ اور دعائے بہت ہی بے جا ہیں۔ بعض اوقات نکل بھڑک کر کہیں کوئی سلسلہ بہت ہی پیچھے رہ گیا ہے۔ پھر بھی وہ بدستور موجود ہے۔ کوئی سلسلہ درمیان کبھی پہنچا ہے۔ اور کوئی بہت ہی دور، بہت آگے، نکل گیا ہے۔ جیسے زندگی میں ہے۔

نہیں۔ چنانچہ قومی نظم و ضبط کی جگہ شہری نظم و ضبط کا دور دورہ ہونا چاہیے۔ وہ مقامات جن کی سماعت پہلے فوجی عدالتیں کرتی تھیں۔ اب سول عدالتوں کے سامنے پیش ہوتے ہیں۔ پولیس کی آزادی اس کے دہان بڑھتے ہوئے نکتہ چینی کے رجحان سے ظاہر ہے، چنانچہ حکومت کی کارروائیوں پر جو سخت مندانہ جرح ہوتی ہے اس پر خود بھی کیا جاتا ہے۔ تاکہ عوامی میلان سے ہم آہنگی برقرار رکھی جاسکے جو اس دور کا خصوصی طبع نظر ہے۔ انتہا یہ کہ ایٹم و زود سیاست دانوں کے معاملہ پر بھی نظریاتی کی جاسکتی ہے۔ ان تمام امور سے حالات بڑی حد تک معمول پر آچکے ہیں اور وزیر و زوار زیادہ معتدل ہوتی جا رہے ہیں۔

تاحال اپنے مختصر دوران میں حکومت نے رفاد عامہ اور رد براہی حالات کے لئے سرتوڑ کوشش کی ہے۔ اور بعض اہم اقدامات بھی کیے ہیں۔ ایک اہم اقدام مشرقی پاکستان میں ترقیات عامہ کے لئے مشرقی پی۔ آئی۔ ڈی سی کا قیام ہے جس سے جلد ہی اہم تنہائی کی توقع کی جاسکتی ہے۔ مشرقی پاکستان کے بارے میں جو کچھ کیا جا رہا ہے اس کے متعلق ایک برطانوی ادیب مسٹر جینز محل نے اپنے مضمون مطبوعہ "دی سٹیشن میں" بڑا اہم انکشاف کیلئے۔ اس نے لکھا ہے کہ صدر ایب نے مشرقی پاکستان کے طویل المیاد سرمایہ کاری کے میزانہ کہ دو گنا کر دیا ہے اور ایسی آکسیں جاری کی ہیں جو اس کے مواصلاتی نظام کو بہت بہتر بنا دیں گی۔ اور صرف مشرقی پاکستان ہی نہیں۔ مغربی پاکستان کے تمام حصوں میں بھی رفتار ترقی کا یہی عالم ہے۔ قومی نو، وقار و دروغ و حق کی واضح علامت کے طور پر اسلام آباد میں نئے دارالحکومت اور ڈھاکہ میں ایک نئے ذیلی دارالحکومت کی تعمیر تیزی سے جاری ہے اور وہ دن دور نہیں جب یہ دونوں پلیدی آب و تاب سے منظر عام پر آجائیں گے۔

ایک اہم اقدام نفاذ کیشن کی سفارشات پر عملدرآمد ہے۔ چنانچہ ادنیٰ اور تان گزیشٹ محمد کے لئے نفاذ ہوں اور اسکیلوں کا احاطہ ہو چکا ہے۔ اور گزیشٹ اسٹاف کے بارے میں احلان ہونے ہی والا ہے۔ چین کے ساتھ سرحدی معاہدہ جس سے امن و دوستی کی خواہش نمایاں ہے اور دیگر تازہ ترین اقدامات ان کے علاوہ ہیں۔ قوم اور حکومت دونوں کی حریت، بیداری اور عمل کی کوئی کشمیر ہے جس کے حق خود اختیار کئے گئے ہیں پاکستان نے معیم عہد بھی کر رکھا ہے۔ اور وعدہ بھی۔ یہ بھی امن عالم کے قیام ہی کی ایک صورت ہے اور پاکستان اس پر پورے

ویسے ہی فن، ادب اور صحافت میں بھی ہے۔ کہیں تمام تر وضع پابند کہیں تمام تر آزاد۔ فکر میں بھی اور طرز روش میں بھی۔

اس موضوع کی بساط بہت وسیع ہے۔ اس لئے ہم فی الحال صرف فکر کی بعض بالخصوص پُر معنی تازہ کاریوں پر نظر ڈالتے ہیں۔ اول تنقید و ادبی خیالات کے دھڑے سے پرے ہٹنے میں کوشاں ہے۔ جہاں اکثر آوازیں اب بھی روایت، روایت، پکارتی ہیں وہاں بعض اس سے روگرداں ہو کر دوسری انتہا — انج — کو اپناتی ہیں۔ کہیں ادبی، کہیں نجی۔ کہیں غیب، کہیں برعلٰی سنجیدہ تنقید اب شعرو ادب کے بعض جدید مظاہر کو جدید تسلیم کرنے کو تیار نہیں۔ چنانچہ ”ادبی دنیا“ کے ایک مضمون نگار نے سیدہ تجزیہ کے بعد فیض کو رجعت پسند قرار دینے کی ہمت کی ہے۔ اور اس کی رائے میں بہت وزن ہے۔ ایسے ہی جاتی، راشد میراجی وغیرہ کے بارے میں بھی بعض چر بکا دینے والی باتیں کہی گئی ہیں۔ ایسی آزاد اور نظر نے ایک راجعہ کی علامت ہیں۔ اب فن برائے جہات، فن برائے افادیت و مقصدیت جیسے نظریات کو بلا حیل و حجت تسلیم نہیں کر لیا جاتا۔ بلکہ اس سے مدلل وجوہ کی بنا پر شدید اختلاف ظاہر کیا گیا ہے۔ اس کے معنی میں ادب و فن کا نئی نگاہوں سے جائزہ اور ان میں پیغامِ حقیقی اور شد و ہدایت کی بجائے دوسری اہم قدروں کی تلاش جنہیں معنوی قدروں کی بجائے فنی قدروں کا کہنا بجا ہو گا۔ اس لئے ادب و فن کا ایک نیا تصور بنایا جاتا ہے جس کے باعث سابقہ آزاد اور فیصلوں پر نظر ثانی لازم آتی ہے۔ اور کئی صورتوں میں ان کا استرداد و تجدید بھی لازم قرار پاتی ہے۔

شاعری میں بھی ایک نیا انداز مشاہدہ و پیشکش کافی حد تک نمایاں ہو چکا ہے۔ یہاں تک کہ اس کا غزل پر بھی شدید غلبہ نظر آتا ہے۔ اس قدر کہ اس کی روایتی وضع، لب و لہجہ، مضامین بڑی حد تک دب چکے ہیں۔ مثلاً یہ اشعار لیجئے جنہیں کسی طرح بھی غزل کے ذیل میں لانا ممکن نہیں۔ ان میں صرف نظم ہی کے تیور چمکتے ہیں۔ اور غزلوں پر غزلیں ایسی ہیں جو نظم سے قریب تر ہیں:

ہو میں نرگس پھولوں کی داسِ دہ آئی
مرے خیال میں یہ کس کی آنکھ بھر آئی
وہ دیکھو باغ میں کپنار کے درختوں پر

لگا کے کیسری ہندی شفقِ اتر آئی
وہ کون آیا ہے؟ اس چھت پہ دیکھنا کچر
کنا پر بام سے قوس قزح ابھرا آئی
نظم میں الفاظ، آہنگ، تمثیلات، تکنیک سے لے کر تصور تک ایک نئی جست نظر آتی ہے۔

سر دہلی اور اس میں عسریاں بدن
شپرک سالیوں کی بے انقاس رو
زنگ خوردہ نیم خوابیدہ بسیں
شہر کے گوشے میں روشن تار دیک
ایک شیدی ڈھول کی آواز ہے

موتی جو رملیگر ہا سی
اپسرا میں شب تار دیک میں چھاپا پھر ہے

ہر بارہ اسی طرح سے ... شافیں
کھلتی ہوئی گونہیں اٹھائے

دستوں کے سلاخوں سے لگ کر

ہر صبح ہی ہلکتی دوری
ہر صبح ہی کشور آندو

ایسی ہی بے شمار مثالیں اور بھی ہیں جنہیں کسی طرح تسلیم نہیں قرار دیا جاسکتا۔ اور یہ سب کچھ باطل حالی کی بات ہے۔ اقبال، میراجی، فیض سے بہت بعد کی۔ اس سے بھی زیادہ شاعری میں نئی وضع کی ایمائیت و علامتیت ہے۔ اس سے مراد محض کوئی منفوی نکتہ نہیں بلکہ قسم قسم کی تاریکیاں ہیں۔ جن پر ہر اہم اور دوسرے مضمون گزارا ہوا ہے۔ بعض کچھ شماروں میں روشنی ڈال چکے ہیں۔ علامتیت کو ہمارے یہاں بالکل بدیہی معنوں میں سمجھا گیا ہے۔ یعنی لا۔ قسم کی مسافات۔ چنانچہ سققل مضامین — ”اقبال اور اس کے رموز و علامت — اور دشا عری کے علامت میں ساقی۔ مینا وے۔ شامین۔ کیم وغیرہ معین دلائل کی معین اصطلاحات

ہے۔ کیونکہ اظہار سیدھی گیر کی طرح آگے نہیں بڑھتا۔ اور بہت سے علاقاری کو خود اپنے تخیل سے پر کرنے پڑتے ہیں۔ واقعات سارے کے سارے آپ ہی آپ بیان نہیں کر دئے گئے۔ اور سلسلہ بدیہی نہیں ہے اور نہ ایک بات سے دوسری بات مکمل ہوتی ہے بلکہ بات تلامذات سے آگے بڑھتی ہے۔ شدید دھچکے کے ساتھ جس کا باری النظر میں جواز نظر نہیں آتا۔ لیکن ہوتے ہوئے سب کچھ بلکہ جانتا، احساس کے بہاؤ میں ایک چیز دوسری کے ساتھ گھسی جلی جاتی ہے۔ سب سے پہلے۔ ”لو پھر ہم تم دونوں آئیں چلیں“ میں تم عام مخاطب نہیں بلکہ اس سے کچھ زیادہ ہے۔ وہ شخص جسے راوی اپنے دل کی بات بنانا چاہتا ہے۔ یہ جھپٹے کا وقت ہے۔ نہ دن نہ رات۔ اور یہ سماں ساری نظم پر چھایا ہوا، اس کی روح رمل ہے۔ اور اس سے کتنی ہی گہرائیوں کے سونے پھوٹے آتے ہیں۔ لاشعور کا دھندلکا۔ دھما دھما دبا دبا لہجہ جھجکتا۔ جھجکتا انکشاف خارج باطن، ظاہر پنہاں کا ملاپ۔ LIKE A PATIENT ETHERIZED ON A TABLE کے ساتھ یہ دونوں وقت طے کی دنیا۔ زندگی اور موت کے درمیان کی سرحد ایک سنگم بن جاتی ہے۔ ساتھ ہی ایک بیمار دنیا اور آپریشن کے کمرے کی فضا بھی پیدا ہوتی ہے اور کہا جاسکتا ہے کہ راوی کو اپنا آپریشن کرنے کو ہے۔ یا کم از کم اپنا طبی امتحان کر رہا ہے۔ بیمار وہ خود بھی ہے اور اس کی دنیا بھی۔ وغیرہ وغیرہ۔ بیمار کی علامت بعینہ وہ ذاتی قسم کی علامت ہے جس کے علامت جگہ حامل ہیں۔ اد یہ کوئی شعر نہیں۔ بلکہ تخیل میں وہ پھیلاؤ، وہ گھبراہٹ پیدا کرتا ہے جو عام ذرائع سے ممکن نہیں۔

یہی خصوصیات ہیں جو ایسی شاعری کو مرکب بناتی ہیں اس شاعر نے بعض نظموں کی راہ سے اردو میں صرف راہ ہی نہیں پائی بلکہ کچھ نئے طرائق بھی رسائی پیدا کی ہے۔ چونکہ نظمیں مرکب ہیں اس لئے ان میں سے ہر ایک میں ہندی بند ہیں جنہیں وکرنے پر داستان خاصی دما ز ہو جاتی ہے۔ اس لئے صرف ایک نظم... کہ نہ دیکھا کرے کوئی؟ پر جو حال ہی میں حلقہ ارباب ذوق، لکڑی میں پڑھی گئی تھی، سرسری نظر ڈالی جاتی ہے عنوان ہی میں مرکب وضع، نظم کے فانیہ کا اچھوتے پرائے میں انکشاف۔ نظم دراصل ایک افسانہ ہے۔ ایک فن کار کی نگاہ کوئی جلوہ مشاہدہ کرتی ہے۔ اور وہ اسے اپنے فن کی گرفت میں لانا چاہتا

ہیں حقیقی علامت جگہاری اس سے بہت مختلف ہے۔ اس کی علامات نہ اتنی کھلی ہوتی ہیں نہ عام۔ اسی لئے وہ زیادہ اچھوتی، تخیلی، طبع اور نادر ہوتی ہیں۔ فرانسیسی علامت جگہاری کا ذکر کرتے ہوئے ڈاکٹر سید عبدالرشید نے اس کو ایک طرح کی ٹھکی قرار دیا ہے۔ اس لئے کہ وہ معنی کو قاری سے چھپا دیتی ہے۔ اعلیٰ درجے کی علامت جگہاری بھی حجاب نہیں ہوتی۔ وہ ایک لطیف حجاب ہوتی ہے جیسے لطیف ابہام۔ حجاب ہوتے ہوئے بدیع قسم کا انکشاف۔ الفاظ کی طرح ان علامات کا انتخاب بھی ذاتی ہوتا ہے لیکن ایسا ذاتی نہیں کہ معنی فی البطن شاعر کو رہ جائے اگر کوئی شاعر اظہار کی مناسبت اس قسم کی علامات میں پالے کہ

سایہ زریں گئی ہے بے پری
کھینچتی ہے ایک تازہ زاویہ
اک خط سا کفن سے روح بہری
یا

وقت کے ذرے ہموں میں گڑ گئے
عقرب ساعت کی نوک تیز سے
نیل سے دیوارِ دل میں پڑ گئے

تو اس کے ذاتی انتخاب الفاظ و علامات میں کیا برائی ہے؟ یہ تو اس کے مافی الضمیر کو زیادہ موثر و برجستہ طور سے ادا کرنے کی تدبیر ہے۔ ایسی علامتیں زیادہ گہرائیوں اور زیادہ رسائیوں کی خبر دیتی ہے۔ اسی لئے اس کا درجہ علامتیت سے کہیں ارفع و اعلیٰ ہے۔ جو جوں شاعر زیادہ گہری اور مرکب ہوتی جاتی ہے۔ اتنا ہی زیادہ اسے اس قسم کی علامتیت پر انحصار کرنا پڑتا ہے جو ساتھ ہی ساتھ بلین اشارہ و کنایہ کی حامل بھی ہوتی ہے۔ ٹی۔ ایس ایلیٹ کی علامتی منظومات ہمارے ذہین طبقہ میں جس طرح کثرت

زیر مطالعہ رہی ہیں۔ اس سے یہ توقع تھی کہ علامت جگہاری کا یہ اعلیٰ تصور بہت جلد متعارف ہو جائے گا لیکن اتفاق سے ایسا نہیں ہوا۔ جن لوگوں نے ایلیٹ کی THE LOVE SONG OF J. ALFRED PRUFROCK پڑھا ہے وہ جانتے ہیں کہ اس میں بات نہ سیدھے سمجھاؤ گی گئی؟ اور نہ اٹے سمجھاؤ گی اسے ٹھکی یا عمر بنادے۔ ٹھکی بہر حال کلمہ کھلا چین بھٹ ادا رہا ہے بہتر ہے کیونکہ اس میں حکمت تو ہے۔ ایلیٹ کی یہ نظم نور داغ نور دی نہیں جست برجست بھی

ہے۔ وہ اس کو ہوبہو پیش کرنے کے لئے بہترین ساز و سامان تلاش کرتا ہے۔ گونا گوں رنگ، روغن، کفراس، موقلم، اودھ، بیڑوں ریاض کرتا ہے۔ یہاں تک کہ ۸۰ سال کی عمر کو پہنچ جاتا ہے۔ آخر وہ تمثال تیار ہو جاتا ہے۔ عین اس لمحہ کھراتی میں وہ انہی لمحوں سے جنہوں نے شاہکار بنایا تھا، اپنی بصارت چھین لیتا ہے۔ تاکہ وہ حقیقت منتظر لباس مجاز میں آنے کے باوجود حقیقت منتظر ہی رہے۔ اودھ ذہن میں اس کے تمثال کا منت نیا تصور کر لیا اور اسے نت نئے پیراؤں میں جلوہ گر کرنے کی حکمتیں سوچتا ہی رہے۔ اس طرح عنوان کی بات بڑی خوش اسلوبی سے پوری ہو جاتی ہے۔ اس فن کار کے لئے حقیقتی معنوں میں دیکھنا یہی ہے کہ وہ نہ دیکھے اور اس کا فن برابر نونہل رہے۔ کیا آپ اسے فنی رشک کہیں گے جو فن کی حدیں ختم ہونا بند نہیں کرتا یا مسلسل نشو و نما کے فن کی تمتا یا عیبت عشق جو محبوب کو شرمندہ عکاسی یا مطلق کو شرمندہ تعین دیکھنا گوارا نہیں کرتا۔

شاعر نے قصداً اس کو آگ سے تمثیل دی ہے جو روانی و مجاز دونوں اعتبار سے بجا ہے۔ پہلے بند میں اسی آتشیں ہیولی یا پیکر کو نمایا کیا گیا ہے۔ لیکن اس کی وضاحت نہیں کی گئی۔ یہ بات قاری کے شعور پر چھوڑ دی گئی ہے کہ اس آتشیں تمثیل کا ریکارڈ کیا ہے۔ اس مظہر کا کتنا بڑا انکشاف جو فن کار کے ذوق و سوق کا محرک ہوا ہے برق شعلہ آتش کے استعاروں کا ہجوم اشارت اس محرک کا تصور پیدا کرتا ہے۔ شدت جلال، شدت احساس، شدت اظہار اور شدت ارتقاء کے لئے آگ ہی کا عنصر بہہ دجہ مناسب ہے۔ بہہ نور، بہہ نار، گداز، مرئی، رفعت کوش۔ تمثیلات مجازی حقیقی دونوں کے حسب حال ہیں۔ یہ اردو میں اپنی قسم کی پہلی بیسٹ تمثیل ہے۔ نظم کا آفانہ ہی بلیغ علامت نگاری سے ہوتا ہے، اشیری، گیرا۔ لوبانی۔

پہلا لفظ فلک اشیر کی رعایت سے ہے۔ یعنی آگ اپنے لطیف ترین، ارفع و اعلیٰ آسانی روپ میں۔ گیرا و پھر ایک معروف حانہ رنگ ہے، آگ سے مشابہ۔ مزید یہ کہ آگ کے جل کر لوگ فلسفہ کے اس تصور کی صداقت ہے کہ جوں جوں ریاضت بڑھتی جاتی ہے۔ ریڑھ کی ہڈی کے مہرے سیدھے ہو کر کنول کا روپ دھارتے جاتے ہیں۔ یہاں تک کہ وہ سب کے سب ایک کنول ہا بہن جاتے ہیں۔ یعنی انسان و حیوانی طور پر اشراق ہی اشراق بن جاتا ہے۔ یہی کیفیت ریاض فن کی بھی ہے۔ اس لحاظ سے شاعر کی نادر حسن ہے۔ تیسری تمثیل لوبانی۔ ہنود کے جوں یا پھر ہنود

مخلوں میں۔ مسلمانوں کے یہاں بھی حود و لوبان جلانے کا کسے علم نہیں اور لوبان نہ صرف خود مرئی مائل اور اس لئے آگ کے مشابہ ہے بلکہ اسے جلایا بھی جاتا ہے۔ جس سے شعلہ ہی نہیں، پیچ و بیک جزوے بھی اٹھتے ہیں اور وہ شعلہ کے بھیکے کبھی چاروں طرف پھیل جاتے ہیں۔ شاعر نے انہی شعلوں اور رخنوں سے اپنے شاہدہ کردہ جلوہ کے عکس کھینچا ہے۔ اور اس کی پاکیزگی و جل پن کا احساس پیدا کیا۔ بلکہ اس کا جاودہ گھایا یہ تینوں تمثیلیں مل کر آنے والے نقشے کے لئے تیار کر دیتی ہیں۔ جیسے کسی مقدس ایوانِ جمال و جلال کی لوح پر کندہ طلسمی نقوش ہیں۔ اور اندازاً تجلیات کے مبشر گھونگر گھونگر کلیاں، اک نکلا آتشیں رخ سر کھلا کی بڑی ہی کائیاں عکاسی ہے۔ گویا اس میں بھی یہ صفائی برقی تھی کہ اس کے خدقات جلوہ کی عکاسی بھی کہا جاسکتا ہے۔

ساری نظم میں مسئلہ تمثیل کی کڑیاں اس ہی طرح مضمر ہیں۔ اور یہی ان کی خوبی ہے۔ اگر ان سب باتوں کو کھول کر بیان کیا جائے تو نظم سے سوا گنا جگہ درکار ہوگی۔ اس ہی سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ مرکب شاعری کھیرا بہ عام بانیہ پیرایہ سے، جو ہمارے یہاں اب تک رائج ہے، کس قدر بھرپور، جامع اور وسیع حاصل ہے۔ اس مختصر جائزہ میں صرف دو ہی اور نکات کا ذکر کیا جاسکتا ہے۔ پیکر جلوہ ہی کا شخص شاعر نے سلفالات جوا سے کیا ہے۔ یہ مرکب ملاقاتی شاعری کا مخصوص بلیغ پیرایہ ہے۔ سلفا کا اشارہ مشہور پنجابی لوک گیت کی طرف ہے جس میں کہا گیا ہے کہ،

ان نہا کے چھڑو چوں نکلی
سلنے دی لاٹ ودگی

احمد ذہیم قاسمی نے اس کی یوں تشریح کی ہے: "اگر آپ سلنے کی لاٹ کو غور سے دیکھیں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ اس کا سرا چوٹا اور سیاہی ہوا ہوتا ہے۔ درمیانہ حصہ قدرے چوڑا اور بے حد روشن اور زریں ہوتے تک اگر یہ پھر چھوٹا ہو جاتا ہے۔ لیکن زیادہ اہم بات شعلے کا لال سمیٹا ہوا ہے جو سرخ تمکاتے ہوئے جسم کے ساتھ شدید مٹا بہت رکھتا ہے۔ اور پھر وہ تمکاتا ہوا جسم جو پھر میں نہلنے دھونے سے دو آتش بن چکا ہو پنجابی گیت کی تمثیل کا جواب نہیں۔ مگر اردو شاعر کی استاد کی بھی قابل داد ہے کہ وہ اسے صاف اچک کر لے گیا ہے اور اس نے طبعاً بلکہ انداز سے کلام میں سمودیا ہے۔ اور وہ اس سے بھی لوک قدم ہنگے بڑھتا ہے: "اطلس لاخ الحرا" الحرا تمام درنگ سرخ کی لالہ صاب تعمیر ہے۔ گونا گوں رنگینوں کا مجموعہ مرقع بلکہ مجرور۔ شاعر نے اپنے جلوہ مقصود کو "اطلس لاخ الحرا" کہہ کر ایک دم

تعمیرِ آشیان

اختر انصاری اکبر آبادی

دہلیکستانی اہل قلم کو صوبہ پاکستان کے
حالیہ ارشادات کی روشنی میں

روشن کرو اس عالمِ امکان کو کھل کے
دنیا پہ ہیں چھائے ہوئے پُر ہول دھندلے
انسان کی خرابی پہ یہ حالِ دل صد چاک
رہ جاتا ہے آنکھوں میں لہو دل کا ابل کے
پھر امن کے جذلوں کو حیاتِ ابدی دو
جلتی ہوئی دنیا کہیں رہ جائے رُحل کے
ہاں راہ میں ہے سنگِ گراں وحشتِ تخریب
اس دور کو پیغامِ محبت دو سنبھل کے
مشرق کے افق پر جو ابھرائیں گی کرنیں
رہ جائیں گے مغرب کے اندھیرے بھی کچل کے

سرمایہٴ اخلاص تقاضا ہے وطن کا
روشن کرو ہر راہ کو جوں شمعِ مچھل کے
لے ہم سخاوت اب ہے نئے دور کا آغاز
آزادیٴ افکار خیالات سے چھلکے

ہو شعر اگر حاملِ احساسِ غم و درد
رکھ دو گے نئی زلیست کی اقتدارِ بدل کے
اب ضبطیں تبدیل ہوتی جنسِ ہوس کی
ہیں آج کے ایوب سکندر تھے جو کل کے

کتنی ہی باتیں اکٹھی کر دی ہیں۔ انسانی جن، آسانی جن، مشرق، مغرب،
زندگی، فن۔ اطلس سے سرخ دہری لودا اطلس کی بڑائی کی طرف بھی اشارہ ہے۔
وہ مقام جہاں یہ بتایا گیا ہے کہ فن کا راجہ ہاتھوں سے اپنی انگلیوں
کو بے نو کر دیتا ہے جن سے اس نے اس نوڑ ملی نور شمال کو جلوہ گر کیا تھا۔
بالخصوص ہتم باطن ہے۔ اوساپنے اپنا کب انکشاف میں بے حد درمائی۔
ہاتھوں کے برابر — فور ہی فور! اب آنکھوں میں

اور دور ہی دور — اب دور ہی دور۔ اب آنکھوں سے!
ساری نظم میں قریب قریب ہر مصرعے میں ایسی ہی نو ایجاد مناعیا
نہایاں ہیں۔ ان سے یہی نتیجہ اخذ ہوتا ہے کہ اگر ہماری شاعری اس دور پر فٹ گئی ہو
قوی امکان ہے کہ وہ پڑ جائے، تو اس کا دھارا یکسر بدل جائے گا۔ اور جدید تر
و جدید ترین کا فرق نمایاں طور پر دکھائی دے گا۔ اردو شاعری سے قطع نظر
اس نظم کی تکنیک ایسی ہے کہ اس سے عالمی شاعری میں بھی ایک نیا قدم اٹھتا
ہے۔ اجرام میں ایلٹ کا حالہ آپ کو یاد ہو گا۔ دی بوسانگ آف جے الفریڈ
پروفرک اور ویٹ لینڈ دونوں میں راوی کا سلسلہ بیان اور لہجہ بالکل
 واضح ہے۔ اس کی آواز زندگی ہوئی ہے اور وہ صاف اپنے من کی بات بتاتا
ہوا معلوم ہوتا ہے۔ اس نظم میں یہ دونوں باتیں نہیں۔ اگر شاعری عجیب
کہ ایلٹ نے کہا ہے سبذبات کا بے تحاشا انڈیل دینا نہیں بلکہ ان سے
دارستگی ہے۔ تو یہ نظم اس کی پوری طرح مصداق ہے۔ اس میں معروفی ترانہ
فی الحقیقت معروفی ہے۔ راوی کی رقت یا جذباتیت کہیں بھی چھلک چھلک
نہیں پڑتی۔ بلکہ فن کی پوری قدرت کے ساتھ بروئے کار آتی ہے۔ دوسرے
حکایت یا روایت کہیں بھی فاش نہیں ہوتی۔ راوی کا احساس اور نظم کا

مضمون دونوں پردہ پنہاں رہتا ہے مگر ایسے کہ

پہننے وھوپ بہین لباس

جبنا دور آتا ہی پاس

راوی کا مدعا قاری خود اشارات و کنایات سے اخذ کر لے۔ راوی
خود اپنے بیانی سے اس کی غمازی نہیں کرتا۔

چونکہ یہ تجربہ اردو شاعری میں ایک خاص اہمیت رکھتا ہے
اس لئے اس کا کسی قدر تفصیل سے ذکر کیا ہے۔ ظاہر ہے کہ ہمارے
شاعروں کا شعور اور اس کے ساتھ خود زندگی بھی ایک نئے موڑ پر ہے۔
اگر ہم یہ موڑ مٹ گئے تو ہماری جوانی کا جس بہت مختلف ہونے کی بات
لئے کئے میدان انہی نئے افق ابھر رہے تھے چلے جائیں گے؟

”فردوس جو فردوس نہیں!“

گنہگار

اور خود کو آزادی و حریت کے جلا نثار سپوت اور محافظ ثابت کیے ہیں۔ کیا ہم اس داستان کو قلیل کہیں؟ بلاشبہ یہ ایک تمثیل ہے۔ بے حد زندہ، جاندار اور معنی، بلطف۔ عجب نہیں کہ ان کی کیا دینے والے حادثے نے جو اس قوم نجیب پر بعد نازل ہونے والے تھے، پہلے ہی اپنا سایہ ڈال دیا ہو۔ اودان کے دل و دماغ میں اس تمثیلی داستان کی صورت میں جلوہ گر ہوئے ہوں۔ یہ افسانہ نہیں حقیقت ہے۔ ایک تلخ و جاگمگلا حقیقت۔

اہل کشمیر کے لئے یہ کوئی طلسمی داستان نہیں اور نہ محض نقطہ۔ یہ تولدِ خونیں کفن کی وادی جو کبھی سودجہ راہ اور گل و یاسمن کی پھیلائی وادی تھی، کی خوشچال آپ جی ہے۔ تاثر میں جگرخوں کن حوادث کی اشک آفریں سرگزشت۔ ایسے حوادث جو حریت کش اور آزادی دشمن قوتوں کے ہاتھوں سالہا سال وقوع پذیر ہوتے رہے ہیں۔ اور آج بھی اجنبی ہاتھوں کا بے نام گراں باز تم اس وادی بہاریں کے لئے جلاں لیوا ثابت ہو رہا ہے۔ فوش لب، مست ناز، نازست، اونچی اونچی فصیلوں والے دیو زاد حصاروں اور طلسم اندر طلسم دلوں میں اسیز کیا یہ سب جیتی جاگتی ہستیاں نہیں؟ کیا ان کا اسیر دام ہونا ایک پاد ہو اخیالی قطعہ ہے؟ جب دنیا کے کسی بھی خطے میں آزادی روشن خمیری اور رواداری کے حسین تخیلات محکومی جہالت اور بربریت کے آہنی پہلوں میں گرفتار ہو کر دم توڑ رہے ہوں تو کیا ہم اس کو قصص و حکایات کے نام سے یاد کریں گے؟ اگر ہم ایسا کریں گے تو یہ ہماری ذہنی نارسائی اور فقدانِ بصیرت کی دلیل ہوگا۔ یہ تو ایک انلی وادی داستان ہے۔ اور اس کے مظاہر جس قدر قدیم ہیں اتنے ہی جدید بھی ہیں۔ دُنویں بہت قریب۔ ایسے کہ اگر ہم اپنے ہاتھ آگے بڑھائیں تو وہ ابنِ شعلہ کے تند و تیز سے جل کر خاک ہو جائیں۔ جبر و حریت کی کشمکش ہر جگہ ہو

ہر افسانہ کی تہ میں کوئی ذکوئی حقیقت ضرور پنہاں ہوتی ہے۔ اگر کوئی داستان صحتِ معنوں میں اس کی مصداق ہے تو وہ کشمیر کی عوامی داستانِ ظلمت ہے۔ اس کا ہیرو تمام طلسمی داستانوں کے ہیروؤں کی طرح جن بھوتوں کے رولر تیجوتی سے تود چار ہوتا ہی ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی ان کی صفت نازک یعنی پریوں کے مکر و فریب سے بھی دوچار ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ اس بلاکشی میں اُس کا دوست وزیر زادہ بھی حسبِ معمول شریک ہوتا ہے۔ خبیث تم شعار — قدرتی جفا کار — ”دریائے اتم“ اور ”کوہِ اتم“ بھی ہیں — اور ان دونوں کو ایسی ایسی مصیبتوں اور دشواریوں میں مبتلا کرتے ہیں کہ ان کی جگہ کوئی اور ہوتا تو اپنا ارادہ ترک کر کے اپنی دنیا کو بے نیل مرام واپس آجاتا۔ مگر ان دونوں کی ہمت و استقلال قابلِ داد ہے کہ وہ طوفانِ حوادث سے منہ نہیں موڑتے اور آخر کار گو ہر مقصود حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔

یہ عوامی داستان کشمیر کی وادیِ دلائم میں بے حد مقبول ہے۔ بہار و خزاں ہو یا گرا و سرما، کشمیر کے لوگ — مزدور، تاجرو، مزد عورتیں بچے — بھی اس مظلوم داستان کو بڑے شوق سے سنتے ہیں۔ غالباً اس لئے کہ ان میں ہمت بلند اور اعلیٰ کردار کا بھرپور عکس نظر آتا ہے۔ اہ اس کے افراد انسانیت کی گراں بہا قدروں کے امین اور پاسباں ہیں۔ وہ آسمانوں کی طاغوتی آمریت اور پریوں کی شیطانی خدشہ و ترغیب کی ہمدانہ نہیں کرتے۔ دریائے اتم کی بے خروش، تلاطم آفریں موجیں ان کو اپنے عزم و ارادہ سے باز نہیں رکھ سکتیں اور کوہِ اتم کی کزحمت، خوشحال چٹانیں ان کے پائے شوق کو متحرک ہونے سے نہیں روک سکتیں۔ وہ انتہائی دالہا نہ ہن سے ”جلاجل جانبِ نعل چلاجل“ کا دلدارا انگیز حرکت کاتے ہوئے برابر آگے ہی بڑھتے چلے جاتے ہیں

- ۳: فصل پک کر تیار ہو گئی۔ ہمارا جہ کے کارنر سے ڈوگرہ سپاہی آئے اور سفینوں کے زور پر سارا اناج اٹھا کر لے گئے۔
- ۴: ہمارا اور پانی کے سوا ہر چیز پڑ ٹیکس، یہاں تک کہ قبر کی کھدائی پر بھی ٹیکس، گورکنوں پر!
- ۵: رشیم، زعفران، تمباکو، کاغذ، نمک اور اناج کی خرید و فروخت۔ ریاستی حکومت کا اجارہ۔
- ۶: دکاندار، نانپانی، کنبڑے، قصاب، طابع اور مزدور سب کی آدمی پورمید کمانی سرکاری خزانہ میں جمع!
- ۷: عیدین پر بکرے، دنبے، حلال کرنے پر فی بجک یا فی دنبہ ٹیکس۔
- ۸: بھیڑیں بکریاں پالنے پر ٹیکس۔
- ۹: اگر کوئی ہندو مسلمان ہو جائے تو اپنی جائیداد منقولہ وغیرہ منقولہ سے محروم۔
- ۱۰: گلے حلال کرنے پر سزائے موت۔
- ۱۱: ہمارا جہ یا اس کے کارندے مسلمانوں سے بیگار لیتے رہتے تھے۔
- ۱۲: مسلمان سارے علاقے میں،، فی ہند مگر ملازمتوں میں ان کا تناسب اس کے برعکس شیخ محمد عبداللہ اس قدامتعلیٰ تعلیم یافتہ ہونے کے باوجود ایک معمولی اسٹنٹ کی اسامی پر بھی متعین نہ کئے جاسکے، بعض اس وجہ سے کہ وہ مسلمان ہیں، ہر چند کہ یہ اسامی خالی پڑی رہی!
- ۱۳: ڈوگرہ فوج میں مسلمان سپاہیوں کی تعداد ۱۵ فیصد اور باقی سب غیر مسلم۔ اس تناسب کو برقرار رکھنے کے لئے غیر ریاستی ڈوگروں، گورکھوں اور سکھوں کو بھرتی کیا جاتا تھا اور ریاست کے مسلمان پنجاب میں آکر انگریزی فوج میں بھرتی ہوتے۔
- ۱۴: ڈوگرہ عہد میں ۲۸ وزیر اعظم ہوئے ان میں سے ایک بھی مسلمان نہ تھا۔
- ۱۵: جب ۱۸۷۷ء میں مجدد ہمارا جہ رتیر سنگھ قحط پڑا تو قحط زدہ آبادی کو غلہ پہنچانے کے بجائے ریاست کے مسلمانوں کو کشتیوں میں لاد کر جمیل و کر میں خرق کر دیا گیا! اس ظلم کی شکایت اُس وقت کے برطانوی وائسرائے سے دہلی میں بھی کی گئی تھی۔

کی کشمکش، براہِ جاری ہے کسی محرائیں کسی دادی میں، کسی کو ہستان میں اور کسی شاعر کے الفاظ میں بہارِ سدا آزادی کے نشیمن سے ہوں، لیکن قدرت کی ستم نظریں سے شاید کسی کو ہستان میں یہ کیفیت نہ رہے اور وہ جلاوخریت میں آزادی پسندوں کا قافلہ سالارین جلے۔ بیرون صدی کا دیواستبدادِ جہوری قبا میں پائے کو ب۔ مگر تاجکے؟

دادی سرور چار جب تقدیر کے، ایک انوکھے کھیل، ایک عہدِ ہند سے ان لوگوں کے ہاتھ آئی، جنہیں باذوق اہل ایران، سچ ہانکے نام سے یاد کرتے ہیں، تو وہ تاریخی طرفہ تماشا بروئے کار آیا جسے دیکھنا شہائی کہتے ہیں۔ جب سکھوں نے انگریزوں کے ہاتھ شکستِ فاش کھائی تو یہ افسوسناک حادثہ رونما ہوا کہ انہوں نے ریاست جوں و کشمیر کو انگریزوں کے ہاتھ فروخت کر دیا۔ اور کس قدر اڑاں! برصغیر پاک و ہند میں انگریز تاجروں نے کتنے تھے اوروہ جب تک یہاں رہے ان کی تاجرانہ ذہنیت سیاست میں بھی برقرار رہی جب شکست خوردہ سکھوں نے ولوی کشمیر اور ملحقہ علاقہ جات انگریزوں کے حوالے کر دیئے تو انگریزوں نے اپنے خالی خزانے بھرنے اور اپنے ایک فادار ساتھی، راجہ گلاب سنگھ عرف گلابو کو خوش کرنے کے لئے ذکرہ علاقہ جات اس کے ہاتھ فروخت کر دیئے۔ انگریز تاجروں نے قومِ نجیب و چرب بست و تردیع کو ڈوگرہ گلابو کے حوالے کرتے وقت اس امر کی طرف زہ بھر توجہ نہ دی کہ وہ اپنی اس حرکت سے انسانیت اور جہوریت دونوں پر ظلم کر رہے ہیں۔

ڈوگرہ جانشینانِ گلابو نے کشمیر اور کشمیر سے ملحقہ علاقہ جات برسوں حکومت کی۔ اور اس دوران میں جو جرم لکھائے چرب و بست و تر ان قومِ نجیب پر جو جو نوازش ہائے بے پایاں ہوئیں ان کے کیا کھنڈاے کاش! اب یاتب ان میں کوئی بارتن پیدا ہوتا جس نے پوناں سلسلے میں آتشِ نوازی کا ثبوت دیا تھا۔ ”دیائے الم“ کے چند شوبہ ”کہ کوہ الم“ کی چند احضائیں سنگینیاں ملاحظہ ہوں۔

ریاست کی تمام مزدور و صغیر زہد کا مالک ہمارا جہ کیساں بکا شنگا عدل کے حقوق ملکیت کا عدم۔ مسلمانوں کی حالت کھیت مزدوروں سے بھی بدتر!

سیاسی اطاعت اور انتظامی حمایت کے لئے ہندو باگیروں، مسلمان مزارعوں سے فرائض کا سلوک۔

۱۶ ریاست کے بہت سے محکوموں — پولیس، مال، وغیرہ کے کارندوں کو ریاستی خزانہ سے تنخواہ نہیں دی جاتی تھی۔ انہیں اجازت تھی کہ وہ ریاست کے مسلمانوں سے جس قدر چاہیں رشوت لے لیں، وہی ان کی ”تنخواہ“ تھی۔ رشوت کے کئی طریقے رائج تھے جن کو ”رسوم“ کہا جاتا تھا۔ کیا یہ ایسی حکومت ہے جس کے ہتھکڑی کے لئے ہنگامہ آرائی کی جائے یا اسے کسی بھی قول و قرار کے لائق سمجھا جائے؟ جب معمار خشت اقل ہی کچ رکے تو دیوار تریا تک پہنچنا تو کجا، چند ہاتھ بھی بلند نہیں ہو سکتی۔ یہ ایک ایسی بنیادی حقیقت ہے جسے ہر حال پیش نظر رکھنا لازم ہے۔ اس کے بعد جو ہنگامے ہوں ان کی نوعیت اظہار میں شمس ہے۔

یہاں ان تلخ و افسوس ناک حالات و واقعات کا اعادہ ناممکن ہے جو اس افتاد کے بعد رونما ہوئے۔ محلی کا تعلق ہم کسی قدم کے جائز حقوق اس کی آزا دی، اس کے حق خود اختیاری انسانوں کے ساتھ پنج شیلہ کے اصولوں سے مطابق سلوک، بین الاقوامی پرواہ، بانصوب پاک و ہند کے خوش گوار تعلقات اور امن عالم سے ہے۔ کشمیر کے بارے میں کہا گیا ہے اور بجا طور پر کہا گیا ہے کہ وہ ایشیا کا فلیٹ بارڈ ہے۔ خداسی جنگجاری سے دنیا بھر کا امن بھک سے اڑ جائے گا۔ ۱۹۴۷ء میں جو کچھ ہوا وہ ہمارے سامنے ہے۔ اور یہ بہت چھوٹے پیالے پر ہوا تھا۔ اگر خدا نخواستہ یہ لوگ پھر بھڑک اٹھے، اور قوی اندیشہ ہے کہ یہ بڑے ہی زور شور سے بھڑک اٹھیں تو اس کا کیا نتیجہ ہوگا؟ دوسروں کو بھڑکانے اور ڈرا بھڑا کر اپنا مقصد پورا کرنے والی فتنہ کش طاقتیں پہلے بھی موجود تھیں اور اب بھی موجود ہیں۔ تباہی و بربادی کا اولین تختہ مشق یہ دور افتادہ طاقتیں نہیں بلکہ ہم ہوں گے۔

جہاں تک اس دیرینہ قضیہ پر بحث و مباحثہ اور ان کی چھان بین کا تعلق ہے یہ سب کارروائیاں ہو چکی ہیں اور یہ وقت نہیں کہ ان کے موافق و مخالف پہلوؤں پر بحث کی جائے اور کیا جائے کہ کوئی سچا ہے اور کون جھوٹا۔ یہ کھیل صد ہا برس تک کھیلا جاسکتا ہے اور اس کا نتیجہ ناخوش گوار روابط اور مسلسل ہتھیار بندی کے سوا اور کچھ نہیں جس سے برصغیر کا کوئی حصہ بھی خاطر خواہ ترقی نہیں کر سکتا۔

حالات تھوڑی سی دیر میں کیا صورت اختیار کر سکتے ہیں اس کی ایک تھوڑی سی جھلک اسی حال میں دکھائی دے بھی چکی ہے۔ اور اس سے وہ احساس پیدا ہونا چاہئے جو نازک حالات سے پیدا ہونا لازم ہے۔ چین اور ہندوستان کے مابین شمالی سرحدات کے بارے میں مدت سے اختلاف ہے جو وہ کہہ کر خاش کی صورت میں رونما ہوتا ہے۔ ابھی چند ہی دن کی بات ہے کہ اس نے یکایک ہمارے ہمسایہ ہندوستان کے لئے جس کی دوستی کے ہم ہمیشہ تہہ دل سے خواہاں رہے ہیں، بلکہ نازک صورت حال اختیار کر لی۔

اس نے پہلی بار یہ محسوس کیا سارے حریف چیدرا آباد (دکن) جو ناکرہ یا گوا نہیں ہیں کہ ان کے لئے ”پولیس ایکشن“ کافی ہو۔ ظاہر ہے کہ چھوٹی چھوٹی اندرونی جہات کی وہ کیفیت نہیں جو بیرونی جہات کی ہے۔ اس لئے اب ہندوستان کو مجبوراً اپنی غیر جانبداری کا لبادہ دور کر کے بیرونی امداد کے لئے دست سوال دراز کرنا ہی پڑا ہے اور اپنی عسکری کمزوری کا احساس کرتے ہوئے ساری قوت دفاع پر صرف کرنا لازمی ہو گیا ہے۔ جو کل ہوا ہے وہ آج بھی پھٹتا ہے۔ چین کے ساتھ سرحد کا تنازعہ بدستور موجود ہے اور کسی وقت بھی پُر آشوب شکل اختیار کر سکتا ہے۔ آخر یہ ایک مسئلہ نہیں تو اور کیا ہے کہ پاکستان نے ہمیشہ حالات کی نزاکت کو محسوس کرتے ہوئے مصالحانہ فیصلہ پر زور دیا ہے۔ اس کے لئے سرور کو کشش کی ہے۔ اس نے ہمیشہ مصالحت کا ہاتھ آگے بڑھایا ہے اور اب بھی اس کے لئے تیار ہے۔ شک ہے کہ ہماری نیکدل اور ذی فہم حکومت نے بھی موجودہ تجربہ کے باعث مصالحانہ فیصلہ کی اہمیت کو محسوس کیا ہے اور باہمی صلاح و مشورہ کی دعوت کو رد نہیں کیا۔ چنانچہ اس سلسلہ میں چند کانفرنسیں منعقد بھی ہو چکی ہیں۔ ان کے نتیجے میں فی الحال کوئی اہم صورت تو رونما نہیں ہوئی ہے۔ لیکن کم از کم ہندوستان کا رویہ دنیا کے سامنے ضرور آچکا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ باہمی مفاہمت و گفت و شنید کی فضا خیر رنگائی کی بنیاد ثابت ہو۔ امید کرنی چاہئے کہ شعوس اور دو قلعہ تنازع جلد رونما ہوں گے۔ اہل چیز دل کا بدلنا ہے۔ بہتر پالیسی یہی ہے کہ اس باب میں بالکل ناامید نہ ہوں۔ اور دل کی بے تبدیلی کے لئے کوشش کریں۔

جہاں تک مائندے نے آخری اجتماع میں کچھ چھینٹے پھینکے ہیں۔

غالب کی تصویر آفرینی

ڈاکٹر مستند جہاں اللہ

ہے۔ اور اس سے شاعر کے ذہن و نفس کا مطالعہ ممکن ہو جاتا ہے۔ اس کے آئینے میں شاعر کا اصلی چہرہ نظر آ جاتا ہے۔ شاعر، اپنی شاعری کے پرہے میں اپنی ذات کو چھپا نا بھی چاہتا ہو تب بھی انھوں نے ذات کی کوئی کوشش کا مکیاب نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ اس کی تصویریں ہر بے نقاب کرنے کے لئے کافی ہیں۔ اسی لئے کہا گیا ہے کہ شاعر کو اس کی لفظی تصویروں میں تلاش کرو کیونکہ اس کی دریافت کا بڑا ذریعہ اس کی تصویریں ہیں۔ آئیے۔ اس آئینے میں غالب کی مثال پر نظر ڈالیں۔

غالب ایک کامیاب مصوّر جذبات ہیں، اور انہوں نے معاملہ کا بھی ایک مخصوص انداز پیدا کیا ہے۔ معاملہ بندی سے مراد معاملاتِ محبت کی گفتگو ہے، معاملات میں محبوب سے میل جول، اس کے بات چیت، گلہ شکوہ، اس کے حسن اور اس کے اندازِ آواز کا براہِ راست بیان ہی نہیں خود محبوب سے، اس کی آوازوں کا ذکر اور تذکرہ۔ یہ سب چیزیں شامل ہیں۔ معاملہ میں محض داخلی تاثر نہیں خارجی وصف الحال اہمیت رکھتا ہے۔ غالب کے یہاں معاملہ بندی کی ایک خاص صورت موجود ہے جس کی گفتگو کا یہ موقع نہیں۔ مجھے یہاں صرف یہ عرض کرنا ہے کہ غالب کے ذہن کا رخ محسوس سے تجرّد کی طرف ہے۔ اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ غالب کے ذہن کا فکری رجحان اس کے باقی اوصاف پر غالب ہے۔ غالب ماویٰ زندگی کے ذوق سے بے ہوش نہیں رہتا۔ کیونکہ وہ نہیں، اپنے فن اور فکر میں وہ ماحول سے تجربہ کی کیفیتوں کی طرف بڑھتے نظر آتے ہیں۔ ان کی دیدہ وری اور ہنردہی ان کو مادیات سے حقائق اور تصوراتِ حقیقت کی طرف لے جاتی ہے۔ وہ مفکر شاعر نہیں اور مفکر اس معنی میں کہ خالص فکر ان کی منزل مقصود ہے۔ وہ اپنے شاعرانہ عمل میں جب بھی رفعت طلب ہوتے ہیں، زمینی ماحول سے اگر کفرضا بے علوی یا فضائے تجرّد کی طرف بڑھنا چاہتے ہیں۔

تصویر آفرینی۔ یہ میں نے "ایمگری" (IMAGERY) کا ترجمہ کیا ہے۔ ایمگری سے مراد وہ تصویر آفرینی ہے جو محسوس اشیاء کو لفظوں کی مدد سے چشم خیال کے سامنے یوں لے آتی ہے گویا بڑی ہمیں مشاہدہ کیا جا رہا ہے۔ مگر یہ تصویر آفرینی کسی خارجی تحریک سے یا بلا لفظ نہیں ہوتی بلکہ اظہار کے دوران، مزید توضیح یا ترجمین کی خاطر تخیل کے اندر کسی تصور بے یا ارادے کے بغیر ابھرتی ہے۔ (اسی کو انگریزی میں "WITHOUT EXTERNAL STIMULUS" کہتے ہیں) اور یہی چیز اس کو ڈسکرپشن (DESCRIPTION) یا وصف الحال سے جدا کرتی ہے۔

کہا گیا ہے کہ شاعری کے قماش میں مصوری اور موسیقی کو تانے بانے کی حیثیت حاصل ہے۔ شاعری میں اگر تصویریت یعنی زائدِ توضیحی تصویریں نہ ہوں تو شاعری بے رنگ ہو جائے۔ شاعر دراصل تصویر سازی ہو رہا ہے۔ موسیقی کا نمبر مصوری کے بعد آتا ہے۔ کیونکہ موسیقی یا غنائی و بیانی الفاظ بھی ممکن ہے اور ادھر محض آواز ہی کسی کو شاعر نہیں بنا سکتی۔

شاعرانہ تصویریں اپنے ظہور کے لئے کسی تشبیہ یا استعارے یا صفت کی محتاج ہوتی ہیں۔ اور انہی کے پیچ در پیچ عمل سے شاعری کی سطح کو اس طرح رنگین کرتی رہتی ہیں کہ یہ تصاویر بذاتِ خود ایک وسیع رقع بن جاتی ہیں، یعنی شاعر کے افکار اور مضامین کی پہلی صف کے عتبہ میں، احساسات و جذبات کی شخص النوع اور مستقل قطاریں، استوار ہوتی رہتی ہیں، اور شاعری کا یہ وہ مواد ہوتا ہے جو شاعر کے افکار کے پس و پیش و ازاں اپنا کام دیتا ہے، یہ شاعر کے (شعوری طور پر) ظاہر کئے ہوئے اوصافات سے زیادہ یقینی اور قطعی ہوتا ہے، اس کی امداد سے شاعر کے ذوق اور میلان کے نزعات کا صحیح سمجھنا ہو سکتا

میں نے غالب کی اس ذہنی سمت کا پتہ چلانے کے لئے ان کی لفظی تصویروں پر سرسری ہی نظر ڈالی ہے۔ یوں تو غالب کی تصویریں ہیں وصفیہ مواد (DESCRIPTIVE) بھی مل جاتا ہے اور اس کے ثبوت میں بہت سے اشعار بھی پیش کئے جاسکتے ہیں، مگر میں نے اس غرض کے لئے جو رات تیار کئے ہیں۔ ان میں مجھے غالب، ذہنی کیفیت، تصویری اور تجربی آدمی معلوم ہوئے ہیں۔

اس کے ثبوت میں بغرض اختصار میں غالب کی ایک غزل پیش کرتا ہوں۔

مکن نہیں کہ بھول کے بھی آرمیدہ ہوں
میں دشتِ غم میں آہوئے تینا ویدہ ہوں

اس شعر کے دوسرے مصرعے میں جو تصویر ہے بظاہر VISUAL ابھر معلوم ہوتی ہے مگر یہ ظاہر ہے کہ دشت اور آہوا اور تینا ویدہ کے باوجود اصل تصویر اس کیفیت کی مقصود ہے جو تینا ویدہ آہو کی ہونی چاہئے۔ یہ کیفیت مرنی نہیں، اس کا صرف تصور کیا جاسکتا ہے۔

دوسرا شعر ہے۔

ہوں دردمند جبر ہو یا اختیار ہو
گہ نالہ کشیدہ گہ اشکب چشیدہ ہوں
ہرگز کسی کے دل میں نہیں ہے مری جگہ
یعنی کلامِ غمزوئے ناشنیدہ ہوں

لئے ناشنیدہ میں مہجوم اور معدوم کے درمیانی فاصلے تقریباً مٹ گئے ہیں۔

ہوں گرمی نشاطِ تصور سے نغمہ سنج

میں عندلیبِ گلشنِ ناآفریدہ ہوں

اس شعر میں مجسم اور محسوس کی مدد سے مہجوم اور معدوم کا تصور دلایا ہے۔

میں چشمِ داکشادہ و گلشنِ نظر فریب

لیکن عبت کہ شبنمِ خورشید دیدہ ہوں

اس شعر میں بھی ذہن کا رخ محسوس سے مہجوم و معدوم کی جانب ہے۔

ان مثالوں سے یہ سمجھ لیا جائے کہ غالب کی مصوری میں VISUAL

اور محسوس اشیا موجود ہی نہیں۔ کہنا صرف یہ ہے کہ غالب کا ذہن، ان محسوسات کی تصویر کو مقصود نہیں سمجھتا۔ وہ ان کے اشارے سے

ایک ایسی فضا پیدا کرتا ہے یا ایسے معانی کی رہنمائی کرتا ہے جو فکری ہیں اور

تصور یا اور اک سے سمجھا جاسکتا ہے، جو اس سے محسوس نہیں کیا جاسکتا۔

میں اس نکتے کی مزید تشریح کے لئے میر تقی میر کے کلام سے چند مثالیں پیش کرنے کے یہ واضح کر سکوں گا کہ میر کا ذہنی رخ محسوسات (محاسن) میں آنے والی چیزوں کی طرف ہے۔ وہ معاملات اور کیفیات دونوں کی توضیح کے لئے جب امجری لاتے ہیں تو ان کی IMAGES بالکل

محسوس اور قطعی جسم و جان رکھنے والی ہوتی ہیں۔

خوبی رُو چشم سے آنکھیں اٹک گئیں

پلکوں کی صف کو دیکھ کے بھڑکیں مر گئیں

اس شعر کے دوسرے مصرعے میں عجیب قسم کی مرکب تصویر ہے جو سراپا محسوس ہے۔ عام مشاہدہ ہے کہ بھڑکیں خوف کے موقع پر گھبرا کر سب کی سب کسی ایک سمت مرکب خوف کو ٹانے کی کوشش کیا کرتی ہیں، تصویر میں کیفیت بھی ہے اور مشاہدہ بھی واضح ہے۔

ترجی نگاہیں پلکیں پھریں اس کی پھر پھریں

سرفرویں جو دودستہ کھڑی تھیں ٹھٹک گئیں

چلتے سمند ناز کی شوخی کو اس کی دیکھ

گھوڑوں کی ہانگیں دستِ سپ سے اچک گئیں

محبت نے شاید کہ دی دل کو آگ

دھواں سا ہے کچھ اس گھر کی طرف

اب فائدہ سراغ سے بلسل کے باخباں

اطرافِ باغ ہوں گے پڑے مشتِ پرکھیں

سُدا لے گھر کی بھی شعلہ آواز

دود کچھ آشیاں سے اٹھتا ہے

اس کے کوہے سے جڑاٹھ ابل و فاجاتے ہیں

تا نظر کام کرے رو بقفا جاتے ہیں

اس شعر میں طوفان ایک مرئی (VISUAL) چیز ہے جس سے تصور کو مدد ملی ہے مگر مبالغہ سے کام لے کر تصویر کو مجسم کرنے کی بجائے خیالی کر دیا گیا ہے۔

بعض اوقات تصویر کے دونوں رخ محسوس ہیں لیکن تصویر پھر بھی تصویر ہی ہے، حقیقی نہیں ہے۔

تمثال میں تیری ہے وہ شوخی کہ بصد شوق

آئینہ باندا ز گل آغوشش کشا ہے

ظاہر ہے کہ آئینہ لاکھا آغوش کشائی کرے پھر بھی وہ آغوش سے محروم ہے۔

قری کف خاکستر و بیل قفس رنگ

اے نالہ نشان جگر سوختہ کیا ہے؟

قری کف کو کف خاکستر کہنا ٹھیک مگر بیل کو قفس رنگ کہہ کر تصویریت کو مبہم اور محسوس حقیقتوں سے دور لے جایا گیا ہے۔

غالب کی انجیری کی بحث بے حد محسوس ہے۔ مگر اس مختصر مضمون میں اس کے تفصیلی مطالعہ کی گنجائش نہیں۔

غالب کی چند ذہنی کیفیتیں بہر طور واضح ہیں،

اول: تغلیب الفاظ کی سعی یعنی تصویروں کو کمیٹ کر پیش کرنا۔

ان کا ذہن تیرے مختلف ہے جو جزئیات کے پھیلا دینے میں لطف خاص

حاصل کرتا ہے۔ غالب وصف الحال میں بھی پھیلاؤ سے بچتے ہیں مثلاً

بجلی اک کو زند گئی آنکھوں کے آگے تو کیا

بات کرتے کہ میں لب تشنہ تقریر بھی تھا۔

بجلی اک کو زند گئی — بجلی کے مانند آنکھوں کے آگے آگے وہ جوت

سے غائب ہو گئے! یہاں غالب نے ساری بات کو زند گئی کہہ کر داکر

ہے — اور ”سمیٹنے“ کی یہ خواہش غالب کے ذہن کی ایک

عام حالت ہے۔

غالب کی دوسری ذہنی کیفیت ”غیر معمولی“ کی جستجو اور مار زو ہے

اسی لئے وہ معمولی تشبیہات سے دامن بچا کر چلتے ہیں۔ اس کو شش میں

وہ عام فہم حقیقتوں سے دُور چلے جاتے ہیں۔ اور MYTH کی تخلیق

میں گرفتار ہو جاتے ہیں۔

غالب کے ذہن کی تیسری کیفیت، ان کا یہ احساس ہے کہ

ان سب اشعار میں حالات یا کیفیات کو روشن کرنے کے لئے جو تصویریاں وارد ہوئی ہیں، وہ قطعی، ٹھوس اور ہماری مشاہداتی جس یا تصور کے لئے حد درجہ تسلی بخش ہیں۔ تیر کا ذہن عموماً تجزوات اور مہومات سے ٹھوس محسوسات کی طرف سفر کرتا دکھائی دیتا ہے۔ تیر کا ذہنی مشاہدہ اور زمینی شوق ان کو زمین سے متعلق رکھتا ہے۔ ان کے برعکس غالب اپنے زمینی شوق کے باوجود سرحد دراک کے پرے کی دنیا کی طرف پڑھتے ہیں۔ ان کی زمینی رخ والی تصویریں بھی ذہن کو تجرید کی رفعت اور مہمیت کی طرف لے جاتی ہیں۔

غالب عہد مغلیہ کی فارسی شاعری سے (جیسا کہ معلوم ہے)

بے حد اثر پذیر تھے۔ اکبری، جہانگیری دور کے شعرا (ماسوا فیضی کے)

واضح تصویر آفرینی سے کم دلچسپی رکھتے تھے۔ وہ تصویر سے زیادہ

تأثر کی شدت میں اعتقاد رکھتے تھے۔ اسی لئے محسوس تصویریں

ان کو بے مزہ معلوم ہوتی تھیں۔ عربی کی خوشی اور مشتعل طبیعت حقیقت

سے مطمئن نہ تھی، اسی لئے وہ اپنی دنیا سے بیزار ہو کر بے جا چیزوں کے

پٹلے بنا بنا کر (PERSONIFY کر کر کے) لایم سے بھونکتے رہتے

تھے۔، فیضی اپنے رنگ خاص میں محسوسات سے گریزاں تھے

مگر ان سب تفصیلات کا یہ موقع نہیں۔ غالب بھی اس دور کی پوجانی

شاعری سے متاثر ہوئے جو دور مغلیہ کے آخر تک عزت کی نظر سے

دیکھی جاتی رہی، ایک آدھ مثال دیکھئے۔ اس دور میں واضح تصویر سازی

کے بجائے مبہم ذرائع سے فائدہ اٹھایا جاتا تھا۔ غالب کے یہاں بھی یہی

ہے۔ مثلاً قہر اک کے ذریعے مبالغہ کرنا شاعروں کی عام عادت تھی مثلاً

دورے ہے پھر ہر ایک گل ولالہ پر خیال

صد گشتان بچا و کاساں کئے ہوئے

پھر تیریش حرمت دل کو چلا ہے عشق

سامان صد ہزار نمک داں کئے ہوئے

تصویریت کا یہ انداز مبالغہ بعض ایسی اشیاء کی مدد سے

نورز نایا گیا ہے جو شدت، افراط اور وسعت کی نمائندگی کرتی ہیں۔ مثلاً

لفظ طوفان ہے

اے عندلیب یک کف جس پہر اشیاء

طوفانی آمد آمو فصل بہار ہے

طہ وصف اعمال (بالاعاء ذکرین)۔

سخن فہمی اور سخن شناسی

ڈاکٹر ابواللیث صدیقی

تنقید کلام کی بنیاد تفہیم کلام پر ہے چاہے یہ تفہیم سرسری اور سطحی ہو یا گہرے مطالعہ اور غور و خوض کا نتیجہ ہو دونوں صورتوں میں اسے تنقید کا پہلا قدم سمجھنا چاہیے۔ ایک حد تک بلکہ بعض کے نزدیک بڑی حد تک تنقید کا سطحی ہونا یا اس کا وقوع و باوقار ہونا اس پر منحصر ہے کہ لغت کلام کے معنی بھی پوری طرح سمجھ گیا یا نہیں۔ شاعر یا شاعر نگار، ناول نویس یا داستان گو یا خود لغت جو کچھ کہنا چاہتا ہے، جن خیالات کا اظہار اسے مقصود ہوتا ہے، جن جذبات، احساسات اور کیفیات کو وہ ظاہر کرنا یا دوسروں تک پہنچانا چاہتا ہے یا جس مقصد یا نصب العین یا مشق کی وہ تبلیغ کرنا چاہتا ہے جو پیغام وہ دینا چاہتا ہے اسے بصورت میں اپنی ترجمانی کے لئے ایک ذریعہ یا وسیلہ اختیار کرنا پڑتا ہے۔ اور یہ ذریعہ الفاظ ہیں۔ فنون لطیفہ کی تفریق اور تقسیم ایک حد تک اسی ذریعے کے اختلاف کا نتیجہ ہے۔ مصوّر رنگ اور خطوط کا سہارا لیتا ہے، زخا صحریات و سکناات کا محتاج ہوتا ہے، بیت تراش پتھر اور چھپائی کی مدد سے صنم تراشتا ہے لیکن مقصد سب کا ایک ہوتا ہے انہی ذات کا اظہار، انہی کیفیات اور اپنے احساسات کا انعکاس، اپنے جذبات کی ترجمانی، اپنے پیغام کا ابلاغ، موضوع، خیال، مضامین، جذبہ، کیفیت، احساس یا حالت اگر روح ہے تو اس روح کو جسم الفاظ سے ملتا ہے۔ الفاظ محض خیال کا لباس یا پرہیز نہیں ہر ایک پیکر میں اور جس طرح رون اور پیکر کے تعلق کا نام زندگی ہے اسی طرح خیال اور لفظ کا رشتہ کلام کی اصل بنیاد ہے۔

الفاظ ہم روزمرہ ہر وقت اپنی گفتگو میں استعمال کرتے ہیں۔ ہم بھی سمجھتے ہیں کہ ہم الفاظ کے معنی جانتے ہیں لیکن کتنے الفاظ کے معنی کیا ہم میں سے ہر شخص کا ذخیرہ الفاظ برابر ہے؟ کیا ایک ان پڑھ انسان کا ذخیرہ الفاظ ایک عالم دراصل، ایک شاعر اور ادیب کے ذخیرہ کے برابر ہوتا ہے؟ کیا سائنسدانوں کا ذخیرہ الفاظ عام لوگوں بلکہ ادیبوں

اور شاعروں سے بھی کچھ الگ نہیں ہوتا؟ اگر یہ فرق موجود ہے تو ہمیں ہمیں الفاظ اور الفاظ میں تفریق کرنا پڑے گی۔ کچھ الفاظ ایسے ہیں جنہیں زبان کے بنیادی الفاظ کہنا چاہیے۔ ان کے بغیر معمولی بات کرنا، سادہ اور آسان خیالات کو بیان کرنا ناممکن ہے۔ یہ حلقہ بھی بولنے والے کی ضرورت اور ماحول کے مطابق ہوتا ہے۔ دیہات کے رہنے والوں کی نسبتاً سادہ اور آسان زندگی میں نسبتاً کم الفاظ سے کام چل جاتا ہے شہروں کی مہذب، تمدن اور نسبتاً وسیع تر زندگی میں اس دائرہ کو بہت کچھ پھیلا نا پڑتا ہے۔ پھر شہروں میں بھی شخص کے لئے یہ حلقہ کیسا وسعت کا محتاج نہیں ہوتا۔ طبقاتی تفریق، تعلیم، پیشہ اور کاروبار کی نسبت سے یہ وسیع تر اور محدود تر ہو سکتا ہے۔ زبان میں یہ وسعت اکتساب اور کوشش سے حاصل ہوتی ہے، پھر اس میں اجتماعی اور انفرادی حلقے الگ الگ ہوتے ہیں۔ فرد جماعت سے سیکھتا ہے لیکن وہ جماعت کو سکھاتا بھی ہے۔ وہ صرف زبان کا ورثہ ہی نہیں پاتا، اس ورثہ میں اپنا حصہ شامل کر کے آئندہ دلوں کے لئے ایک نیا ورثہ ترقی یافتہ ایک وسیع تر اور مکمل تر زبان چھوڑ جاتا ہے۔ الفاظ کی پیدائش کی حقیقت، ان کی اصل و نسل کا سروغ لگانا، ان کے تلفظ اور معنی کی تبدیلیوں کا مطالعہ کرنا ماہرین لسانیات کا کام ہے لیکن ادب کا طالب علم اور نقاد بھی اس سے بیگانہ نہیں رہ سکتے۔ ادب کی تاریخ و لوہو الفاظ سے بنتی ہے اور الفاظ کے معنی یا ان کی معنویت کی تفہیم جو تنقید سے پہلے ضروری اور لازمی ہے اتنی آسان بات نہیں جتنی بظاہر نظر آتی ہے۔ الفاظ پیدا ہوتے ہیں۔ جاندار اجسام کی طرح ان کی نشو و نما ہوتی ہے۔ وہ بڑھتے ہیں، پھلتے پھوٹتے ہیں ان میں معنی کے رنگ رنگ پھول کھلتے ہیں اور پھر ان میں سے بعض مرجح ہیں بعض مرکز زندہ ہوتے ہیں بعض کمزور ہوتے ہیں بعض جاننا

وہ اس کے لغوی معنی ہیں۔ عام طور پر ایک لفظ کے ایک ہی معنی ہوتے ہیں اور اسی طرح ایک معنی یا تصور کے اظہار کے لئے ایک ہی لفظ موزوں، مناسب اور صحیح ہو سکتا ہے لیکن اکثر الفاظ میں ایک سے زیادہ معنی بھی ہوتے ہیں اور ایک ہی معنی کے لئے کئی لفظ بھی ہوتے ہیں۔ اگر ایک لفظ کے کئی معنی ہوں تو دراصل معنی خاص کا تعین محل وقوع اور سیاق و سباق سے ہی ہو سکتا ہے، مثلاً کوئی شخص سونا، کہے تو معلوم نہیں سونا، سے مراد نیند آنا، یا سونا سے مراد وہ قیمتی اور چمکدار دھات ہے جو خراج نہیں لیکن خدا نہ ہوتے ہوئے بھی ستارے عیوب اور قاضی الحاجات ہے۔ اٹھائے، منے تو سیاق و سباق کے بغیر نہیں کہہ سکتے کہ یہ وہی گائے ہے جس کا ذکر مولوی اسماعیل مرٹھی نے کیا ہے:

رب کا شکر عطا کر بھائی

جس نے ہمارا گائے بنائی

یابہ کسی معنی کو حکم یا اجازت ہے کہ وہ گائے شروع کرے۔

بہر حال لفظ مفرد معنی رکھتا ہو یا متعدد پہلی صورت لغوی معنی کی ہے۔ یہ عام فہم، مراد، فہم، کثیر الفہم، متفق، البس، واضح، غیر مشکوک اور متعلق معنی ہوتے ہیں۔ ان کو سن کر سوائے خافہ صورتوں میں مطلب واضح ہو جاتا ہے اور شک و شبہ یا اشتباہ باقی نہیں رہتا۔ عام گفتگو میں روزمرہ بولے جانے والے الفاظ اکثر و بیشتر یہی صورت رکھتے ہیں یعنی اپنے عام لغوی معنوں میں استعمال ہوتے ہیں۔ یہی الفاظ زبان کا سرمایہ ہیں اور ان پر عبور حاصل ہوئے بغیر کلام کی تفہیم ممکن نہیں۔ اہل زبان یہ سوائے ورثہ میں ہاتے ہیں۔ آنکھ کھولتے ہیں تو ماں باپ بہن بھائی، عزیز رشتہ داران کا تحفہ اسے پیش کرتے ہیں۔ بچہ ان کو نہیں سمجھتا، آہستہ آہستہ وہ ان الفاظ (آوازوں) اور ان کے معانی میں رشتہ قائم کر لیتا ہے اگرچہ خود ایک عرصہ تک وہ ان کو ادھنی کر سکتا۔ وہ ادا کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ نقل کرتا ہے اپنی تلی زبان سے ان کی نامکمل اور ناقص نقل سے وہی مطالب ادا کرتا ہے۔ زبان صاف ہوتی ہے تو نقل آہستہ آہستہ اصل کے مطابق ہوتی جاتی ہے۔ جیسے سنتا ہے ویسے ہی بولتا ہے۔ یہی اس کے لئے تلفظ کی سند ہے۔ جیسے زندگی میں آگے بڑھتا ہے گھر کی چار دیواری آغوشِ مادہ بہن بھائیوں کے حلقے سے نکل کر بھولیوں، سہیلیوں اور دوستوں

اور توانا۔ قدیم اور جدید ادب کا مطالعہ اس وقت تک مکمل نہیں ہو سکتا جب تک الفاظ اور ان کے معنی کی ان تبدیلیوں سے واقفیت نہ ہو۔ اس ناواقفیت کی بنا پر کبھی کبھی مسانی معنی بھی پیدا ہو جاتی ہے جو ادب کے مطالعہ اس کی تفہیم اور تفسیر کے راستے میں شگ پران بن کر حائل ہو جاتی ہے۔ یہی وجہ تھی کہ اردو کے قدیم نفاذ یعنی تذکرہ گو ذہنی اردو کے محاورے سے واقف نہ ہونے کے باعث ذہنی ادب کو "ایک پورا" کہہ کر گزر جائے۔ کی کوشش کرتے ہیں۔ میر تقی میر اپنے تذکرہ میں یہ تو تسلیم کرتے ہیں کہ رنجیت گوئی کا آغاز دکن سے ہوا لیکن وہاں کا کوئی شاعر انہیں مربوط نظر نہیں آتا۔ معلوم نہیں مربوط سے میر کی مراد کیا تھی۔ اگر قلی قطب شاہ کا کلام مربوط نہیں، وجہ کی مشغول نہر کی کوشش عشق، و اس کے قصائد، بن نشاط کی پھول بن، خوب محمد قی کی خوب ترنگ، رنجی کا خاور نامہ، خانہ کا قصہ رضوان شاہ و روضہ افزاء یہ اوریشا اردو ذہنی منظومات مربوط نہیں تو پھر شمالی ہند کے شعرا کا کلام کیوں کر مربوط کہلا سکتا ہے۔

بہر حال اس باب میں زیادہ بحث کی ضرورت نہیں کہ تنقید کلام میں پہلا مرحلہ تفہیم کلام ہے جسے معنی یا بی بھی کہہ سکتے ہیں۔ اس تفہیم یا معنی یا بی کا دار و مدار سب سے پہلے الفاظ کی معنی شناسی اور معنی فہمی پر ہے۔ الفاظ صرف اصوات یا حروف کا مجموعہ نہیں۔ یہ علام اور اشارات ہیں، مرتب اور مکمل، یا معنی اور متعلق۔ ہر لفظ کسی شے، فعل، تصور یا حالت کی علامت ہے۔ گفتگو میں یہ علامت صوتی اور تحریر میں لفظی ہے لیکن صوتی ہو یا لفظی مقصد دونوں کا ایک ہے۔ مخصوص علامت کو خاص معنی دینا اسے ہم اصطلاحاً لفظ یا لفظ کہتے ہیں جو ایک مکمل تصور کی خواہ وہ کوئی شے ہو یا فعل یا حالت یا کیفیت الجھوٹی سے چھوٹی مکمل اکائی ہوتی ہے۔ ہم یہاں اس بحث میں نہیں پڑنا چاہتے کہ آخر مخصوص آوازوں اور ان کے مجموعوں میں معنویت کس طرح پیدا ہوتی ہے یا سادہ زبان میں یوں کہتے کہ الفاظ کی کیفیت ہیں اور ان کے معنی کا تعین کس طرح ہوتا ہے۔ یہ اہم اور عجیب بحث لسانیات کا موضوع ہے۔ نفاذ کا لسانی مسائل سے واسن بچ کر نکل جانا مشکل ہے لیکن اس مسئلہ میں ہم آگے بڑھ جائیں تو کوئی حرج نہیں۔ الفاظ کے سب سے سادہ اداسان معنی جن سے ہم سبہ شاہ

ہیں وہ ان کے بغیر چٹا کام چلا سکتا ہے لیکن نقاد کو اس سے منفی نہیں
وہ قدما کا کلام پڑھتا ہے جس سے اسے ادبی روایت کا سلسلہ ملتا ہے،
وہ ادب کا تاریخی مطالعہ کرتا ہے، اس کی تدریجی ترقی اور عہد بہ عہد
ارتقا کا مطالعہ کرتا ہے، وہ اس مطالعے میں اسے قدم قدم پر ان متروکات کا سامنا
کرن پڑتا ہے۔ وہ ان کو نہیں جانتا پہچانتا تو یہ سارا ذخیرہ اس کے لئے
کالعدم ہے۔ اردو کا جو نقاد کھنی زبان سے واقف نہیں، ولی کی زبان
سے آشنا نہیں، میر و سودا پر انشا اور مصحفی کے عہد کی زبان
کے ان عناصر سے واقف نہیں وہ اردو کے ادبی سرمائے کے ایک
بڑے اور اہم حصے کی تنہیم سے محروم ہے، ہماری زبان کی موجودہ
اور جدید صورت ایک بڑی حد تک تاریخ کے عہد میں آکر متعین ہوئی
لیکن ناسخ سے پہلے اردو شاعری اور نثر دونوں کے بہت سے
اعلیٰ درجے کے نمونے تخلیق ہو چکے تھے۔

قدیم زبان کا یہ مطالعہ نہایت دلچسپ بھی ہے۔ میر تقی
کی "باغ و بہار" میں "رندی" عورت کے معنوں میں استعمال ہوا ہے۔
اس وقت دونوں لفظ استعمال ہوتے تھے پھر رندی کا لفظ ان معنوں
میں ترک ہو گیا، طوائف کے معنوں میں استعمال ہونے لگا اور آج کل
بلوچستان میں ایک اور سی دلچسپ معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ وہاں
"لانڈ" یا بیوہ کو "رندی" کہتے ہیں، یہ بلوچی نہیں، بلوچستان میں
اردو بولنے والے استعمال کرتے ہیں اردو والے بیوہ کہتے ہیں یا لانڈ
کہتے ہیں۔ مرد کو جس کی بیوی مر جائے "رندی" کہتے ہیں۔ ہندی والے
"دوہوا" کہتے ہیں جو بیوہ کی ہی قدیم ہندی شکل ہے۔ اسی خاندان
ڈھیا، اردو دیہا، اور اس کے مشتقات، بیابھی، بیوی وغیرہ ملتے ہیں
متروکات کی مثالیں تلاش کرنے کے لئے بہت قدیم زمانے کی
طرف رجوع کرنے کی ضرورت نہیں۔ میر حسن کی مثنوی اور نظیر
اکبر آبادی کا کلام ایسا پرانا نہیں کہ ہم انہیں قدما میں شمار کریں۔
آج کا عام اردو بولنے اور پڑھنے والا ان کے کلام کو سمجھتا اور
پڑھتا ہے لیکن دونوں میں بکثرت ایسے الفاظ ہیں جو اب استعمال نہیں
ہوتے۔ ان کے معنی لغات میں تلاش کرنا پڑتے ہیں اور اکثر وہاں
بھی نہیں ملتے۔

کے دائرے وسیع ہوتے ہیں۔ کتب اور مدد دہنے میں جاتا ہے، پڑھتا
لکھتا ہے اس ذخیرہ میں اضافہ ہوتا چلا جاتا ہے۔

الفاظ کا یہ ذخیرہ اور سرمایہ شخص کا برابر ادب کا نہیں ہوتا۔
کسی کا کم کسی کا زیادہ، اس کا انحصار ذاتی اور انفرادی ماحول، تعلیم اور
اکتساب پر ہے۔ انفرادی خصوصیات کے علاوہ اس میں علاقائی اور
جماعتی اثرات بھی اپنا رنگ دکھاتے ہیں۔ یہ اثرات صرف لب و لہجہ میں ہی
نہیں الفاظ کے معانی میں دلچسپ فرق پیدا کرتے ہیں، یہ انفرادیت
ذاتی سطح اور علم کی بلندی اور وسعت کے ساتھ ساتھ زیادہ نمایاں
ہوتی چلی جاتی ہے۔ اس سطح سے جس قدر نیچے اترتے چلے آئیں انفرادیت
کم اور مشترک سرمایہ زیادہ ہوتا ہے یہ مشترک سرمایہ امتا محمد و داد
مختص ہو سکتا ہے کہ صرف چند سو الفاظ روزمرہ کے معمولی کاروبار کے
کافی ہو سکتے ہیں اسے زبان کا بنیادی عنصر قرار دے سکتے ہیں۔

یہ عنصر خود جامدا و مستقل نہیں ہوتا۔ زمانہ کے ساتھ
ساتھ اس میں اضافہ ہوتا رہتا ہے۔ نئی چیزیں دریافت یا ایجاد ہوتی ہیں یہ
اپنے ساتھ اپنے نام لاتی ہیں۔ بہت سی چیزیں ترک ہو جاتی ہیں ان کے
ساتھ ان کے نام بھی ترک ہو جاتے ہیں۔ انہیں اصطلاحاً متروکات کہتے
ہیں۔ یہ وہ لفظ ہیں جو کبھی زندہ تھے اور مر گئے کہ ان کی ضرورت
باقی نہیں رہی، بعض ان میں سے مرکز زندہ ہوئے لیکن نئے جنم میں
ان کی صورت اور ان کا روپ رنگ بدل گیا۔ اب یہ جن معنوں میں
استعمال ہوتے ہیں وہ ان کے پہلے اور اصلی معنی نہیں۔

متروکات کا ایک بڑا حصہ جو کسی تحریر میں محفوظ نہ رہا اب
اس کا پتہ چلانا دشوار ہے۔ ہاں جہاں سے تحریر ملے پڑتی زبان کو
محفوظ کر لیا ہے وہاں ان آثار قدیمہ کا سراغ مل جاتا ہے اور
ان کی عہد بہ عہد تبدیلیوں کا بھی پتہ چل جاتا ہے۔ ان متروکات
کا مطالعہ شاعر اور ادیب کے لئے بھی مفید ہو سکتا ہے۔ بہت سے
لفظ جو مر گئے اس قابل تھے کہ نہ مرنے تو اچھا تھا کہ ان کے مفہوم کو
ادا کرنے کے لئے اتنے موزوں دوسرے الفاظ پیدا نہ ہوئے۔ ان کو
دوبارہ زندہ کرنا چاہیے اور یہ زندہ ہو جاتے ہیں۔ بعض مردہ
الفاظ نئے معنوں کے لئے استعمال ہو سکتے ہیں لیکن شاعر ادیب،
انشا پرداز یا عام گفتگو کرنے والا ان کے مطالعے اور تلاش پر مجبور

میر کی عشقیہ مثنویاں

ڈاکٹر حکیمان چند

”اے سراپہ سہاں! میں چہ آتشے است کہ در دولت نہاں است“
یہ دس سال کے تھے کہ ان کے والد کا انتقال ہو گیا۔ باپ کی وفات کی بعد ان کے سوتیلے بھائی، حافظ محمد حسن نے بڑی بے رخی دکھائی جس کے باعث یہ گھر سے نکل کھڑے ہوئے۔ دلی کے پہلے سفر سے واپس آنے پر یہ ایک پری تمثال کو دل سے پیوستے جس نے جلتی پر تیل کا کام کیا۔ تذکرہ بہار بے خزاں میں ہے:

”بہر خوشی بہ پری تمثالے کہ از عز زانوش بود در پردہ تغش
طبع و میل خاطر داشت آخر عشق ادھا صیت مشک پیدا کردہ۔“

افشائے راز پرودہ دوبارہ ترک وطن کیسے دلی چلے گئے اور اپنے سوتیلے ماموں خان آرزو کے پاس ٹھہرے۔ ان کے بھائی، محمد حسن نے خان آرزو کو لکھ بھیجا کہ میر تقی قننہ روزگار ہے۔ اس پر خان آرزو نے میر کے ساتھ بدسلوکی کو شیعہ بنالیا۔ عجز و بزدلی کی ستم رانی اور ہجر محبوب کی سینہ کاوی دونوں نے مل کر ان کی طبیعت میں جنون کی کیفیت پیدا کر دی جس کی تفصیل مثنوی ”خواب و خیال“ اور ”ذکر میر“ دونوں میں ہے۔ ”معاظت عشق“ اور ”عشق عشق“ بھی اسی داستان کی فصلیں ہیں:

”تذکرہ خوش معرکہ زیبا“ سے بھی میر کے قیام لکھنؤ کے ایک معاشرے کا انکشاف ہوتا ہے لکھا ہے:

”آخر میر صاحب کو ولولہ عشق پیدا ہوا اور صورت کی آئینہ نور شید میں معائنہ ہوتی تھی۔ پیر جولان بہت ایسوں کو کہتے ہیں۔ کسی نے پوچھا کہ پیرانہ سالی میں کتھائی ہونے کا کیا باعث ہوا۔ فرمایا اس لئے سمرال دلتے کہیں۔“ لڑکا آیا۔“

یہ بیان کے ذریعہ تخیل کا کرشمہ معلوم ہوتا ہے۔ صاحب تذکرہ نے ”آئینہ ماہ کی جگہ“ ”آئینہ نور شید“ میں صورت پیدا کر دی

میر نے مثنوی نگاری میں ایک طرح نو ڈالی۔ وہ شمالی ہند کے پہلے بڑے مثنوی نگار ہیں۔ یوں تو انہوں نے کل ملا کر ۳۰ مثنویاں لکھیں لیکن ادبی حیثیت سے عشقیہ مثنویاں زیادہ جاذب توجہ ہیں جن کی تعداد نو ہے:

(۱) مثنوی جوان و عروس (۲) معاملات عشق (۳) جوش عشق (۴) خواب و خیال (۵) دریائے عشق (۶) اعجاز عشق (۷) شعلہ شوق (۸) مثنوی عشقیہ عرف عشق افغان پسر (۹) مورت نامہ۔

پہلی اور آخری مثنوی نو نگاشی کلیات میں شامل نہیں۔ انہیں راقم الحروف نے دریافت کر کے بالترتیب ”نگار“ جولائی ۱۹۵۵ء اور ”ادب“ جون ۱۹۵۷ء میں شائع کیا تھا۔ ڈاکٹر عبادت بریلوی نے ان کو اپنے مرتبہ کلیات میر میں شامل کر لیا ہے۔ پہلی مثنوی کے خطوط میں اس کا کوئی نام نہیں۔ مگر سہولت کے لئے ہم اسے ”جوان و عروس“ کا نام دے سکتے ہیں۔

میر کی مثنویوں کا مطالعہ ان کی ابتدا و طبع ان کے سوانح حیات، ان کے عہد کے سیاسی و معاشی خلفشار کے پس منظر میں ہی کرنا چاہئے۔ میر ایک درویش کے بیٹے تھے اور بچپن سے سیدان اللہ اور بایزید جیسے درویشوں کے زیر اثر تھے۔ تربیت پائی، مثنوی باپ میر کو ہمیشہ ہی سبق پڑھاتا تھا:

”اے پسر عشق روزہ عشق است کہ دریں کارخانہ متصرف است۔ اگر عشق نہی بود نظم کل صورت نمی بست عشق بازو۔ عشق بسوزد۔ دھماہر بہت ظہور عشق است۔“

میر کے مزاج میں ابتدا ہی سے خشکی و برہنگی بسی ہوئی تھی۔ لڑکپن کے بے فکر زمانے میں بھی یہ کھوئے کھوئے سے رہتے تھے۔ ان کے والد دریافت کرتے تھے:

لیکن یہ دسوچا کہ آئینہ خورشید پر نظر ڈالنے کی تاب کس کو ہے کسی دوسرے ذریعے سے میر کی مندرجہ بالا تصانیف کی تصدیق نہیں ہوتی۔

عشق میں ناکامی، فاقہ کشی، اہل دنیا سے مایوسی، توکل و استغنا اور آئے دن کی آفات نے انہیں بددیلم بنا دیا تھا۔ ساتھ ہی انہیں اپنے کمال کا شدید احساس اور ناقدری کا شکوہ بھی تھا جس کی وجہ سے وہ کسی کو خاطر میں نہیں لاتے تھے۔ آصف الدولہ کے حضور میں مثنوی "شکار نامہ" پیش کی تو اس کے خاتمہ میں بر ملا اعلان کیا۔

بہت کچھ کہا ہے کرو میر بس
کہ اندر بس اور باقی ہوس
جو اہر تو کیا کیا دکھایا گیا
خسر پدار لیکن نہ پایا گیا
مستراح ہنر پچھیسرے کر چلو
بہت نکھنؤ میں رہے گھر چلو

میر کی حقیقی مثنویاں ان کے مزاج و سیرت سے کلیتہاً ہم آہنگ ہیں۔ فارسی اور اردو کی رومانی مثنویاں دو گروہوں میں تقسیم کی جاسکتی ہیں۔ (۱) طویل و فوق العظمت منظوم داستانیں (۲۵)، خالص واردات عشق کو پیش کرنے والی مختصر مثنویاں۔ ان میں قہر کا پہلو کمزور رہتا ہے لیکن دل کی کیفیات اور واردات ایمان کرنے پر زور دیا جاتا ہے۔ فارسی میں ان کی مثال "یلبی جمنوں" اور شیرویں خسرو ہیں لیکن میر نے اس نوع کو ترقی دے کر ایک مخصوص رنگ روپ دیا۔ میر کی مثنویاں دراصل ایک طویل غزل ہیں۔ ان کا تقوید عشق غزل سے مستعار لیا گیا ہے۔ ان مثنویوں کا منشا عشق کی عالمگیری اور جہاں سوزی کا بیان کرنا ہے،

یہ ہے میر وہ عشق خانہ خسراب
کہ جی جتنے مائے ہیں یاں بے حساب

غزل کا عاشق، میر کی مثنوی کا ہیرو بن گیا ہے۔ ایک غزل میں فرماتے ہیں،
جان اپنا جو ہم نے ہمارا تھا
کچھ ہمارا اسی میں وار تھا
ہم تو تھے محو دوستی اس کے
گو کہ دشمن جہاں ہمارا تھا
عشق بازی میں کیا مونے ہیں میر
آگے ہی جی انہوں نے ہمارا تھا

کیا یہ ان کی مثنویوں کے ہیرو کی سرگزشت نہیں! اب معاملات عشق کی تمہید کے یہ اشعار بھی ملاحظہ کیجئے۔

کچھ حقیقت نہ پوچھو کیا ہے عشق
حق اگر سمجھو تو خدا ہے عشق
عشق عالی جناب رکھتا ہے
جبرئیل و کتاب رکھتا ہے
عشق نے چھاتیاں جلائی ہیں
آگیں کس کس جگہ لگائی ہیں
خستہ عشق کچھ نہ میر ہوئے
بادشہ عشق میں فقیر ہوئے

ان میں سے ہر شعر کسی غزل کا مطلع ہو سکتا ہے۔ ان اشعار میں اس قسم کا رابطہ نہیں کہ اگر درمیان سے ایک دو شعر نکال لئے جائیں تو معنی میں خلل پڑ جائے۔ ان میں مسلسل غزل کی سی وحدت خیال ہے۔ گویا مثنویاں تیسرے میں افسانہ ایک ایسا قالب ہے جس پر عشق مجبور کی آشفہ و داغی کا بادل ڈال دیا گیا ہو۔ قدیم مثنوی نگاروں مثلاً افضل، فصائل علی خاں، جعفر علی زکی کے یہاں عشق کا بیاں حقیقت سے قرین تھا۔ میر نے اسے ایک ناقابل حصول آرزو کا روپ دے دیا۔

میر کا تقوید عشق مشالیت کے ملا، اعلیٰ کا ہے۔ انہوں نے جذب عشق کی تاثیر دکھانے کے لئے ایک غیر منطاعانہ ہتھکنڈے سے کام لیا یعنی انجام کو غیر فطری بنا دیا۔ عاشق کی موت پر مجبور بھی جان دینے کو مجبور ہو جاتا ہے اور لاشیں اس طرح واصل ہو جاتی ہیں کہ ہزار کوشش کے باوجود جدا نہیں ہوتیں۔ یہ انوکھا خیال میر سے پہلے مقبلی کی دکنی مثنوی "چندر بدن و میار" اور اس کے بعد والد کی مثنوی "طالب و موہنی" میں پیش کیا گیا۔ ظاہر ہے کہ میر مقبلی یا والد سے واقفیت نہ رکھتے تھے۔ جہد عالم گیر کی بعض فارسی مثنویوں میں بھی وصل پس از مرگ کا بیان ہے، میر نے وہیں سے یہ معنوں اڑایا ہوگا۔ گو یا میر کے نزدیک عشق ایسا روگ ہے جو موت کے بعد بھی بچھا نہیں چھوڑتا۔ دوسرے یہ کہ اگر فریقین ایک دوسرے پر صدق دل سے فدا ہیں تو کبھی نہ کبھی مل ہی جاتے ہیں۔ اس دنیا میں نہیں تو اس دنیا میں ظاہر ہے کہ یہ غیر فطری انجام آج قانون

جوں جوں تیر صاحب کی عمر بڑھتی گئی ان کی مثنویوں میں خیر فطری عناصر زیادہ ہوتے گئے۔ شعلہ شوق میں انہوں نے فریقین کے جسم کو شعلہ میں تبدیل کر دیا۔ "عشق افغان پرستہ گناہ تھے میں ایک زندہ انسان موت کے دروازے سے گزرے بغیر ایک روح لطیف سے مل گیا۔" "موزنامہ" میں ایک طاؤس اور رانی کا عاشقہ ہے۔ اس سادہ لوح راجہ اور شاعر کو یہ موٹی سی بات نہ سمجھی کہ ایک عورت اور مور میں جنسی تعلقات ممکن نہیں۔

بظاہر تو تیر کے ہیرو اور ہیروئن طبقہ عوام سے ہیں۔ یعنی حقیقت نگاری کے تقاضوں کو داستانوں سے بہتر طریقے پر آسودہ کرتے ہیں لیکن تہ میں جا کر دیکھا جائے تو یہ حضرات اس زمین کے باشندے نہیں معلوم ہوتے۔ ان کا عشق اس بلندی پر ہے جہاں فرشتوں کے بھی پر جلتے ہیں یعنی یہ لوگ کسی اور سیارے کے باشندے معلوم ہوتے ہیں۔ ہمیں اپنے ارد گرد نہ اس طرح کے "ستیا گرو" عاشق دکھائی دیتے ہیں نہ اس طرح جاں باز عاشق یا وفا شعار محبوب کی فرمائش پر موت فوراً آموچھتی ہوئی ہے۔ ادھر کی صدیوں میں وصل بعدِ وفات کی تو رسم ہی اٹھ گئی۔ مختصراً یوں سمجھئے کہ تیر کے عشقیہ افسانے شروع سے آخر تک خلافِ حقیقت ہیں۔

تیر کی عشقیہ مثنویوں میں افسانوی دلچسپی بھی نہیں اور نہ کردار نگاری کے شاہکار ہی ہیں۔ ان کی واحد کائنات رودادِ عشق ہے اور اگر یہ بھی تشفی بخش نہیں تو پھر ان مثنویوں میں کیا ہے جس کی وجہ سے آج بھی یہ شاداب و تازہ ہیں۔

بظاہر یہ مثنویاں عشاق کی سرگزشت ہیں لیکن اس تخیلی سرگزشت کی کوئی اہمیت نہیں۔ انی نظموں میں جو چیستر جاذبِ توجہ ہے وہ عشاق کا ماجرا نہیں بلکہ مجرد مطلق عشق کا تصور ہے۔ اقبال کے یہاں عشق کائنات کو رواں دواں رکھنے والی قوت ہے۔ تیر کے عشق کا تصور بھی کچھ اسی طرح ہمہ گیر ہے۔ غزل میں کہہ ہی چکے ہیں ع

اک عشق بھر رہا ہے زمین آسمان میں

درویش باپ بھی واضح کر چکا تھا۔ "عشق است کہ درین کارخانہ مشغول است۔۔۔ در عالم ہر جہ ہست ظہورِ عشق است۔"

تیر عشق مجازی کو وہ مرتبہ بلند دیتے ہیں جو اب تک

کو نہ متاثر کرتا ہے نہ قائل۔ پھر بار بار ہر مثنوی میں اسی خیال کو دہراتا آہٹ کے تقاضوں کو نظر انداز کرنا ہے۔

تیر کی مثنوی کا ہیرو عشقیہ مثنویوں کی دوسری شق یعنی داستانِ مثنویوں کے میرا فسانہ کی بالکل ضد ہے۔ "سحر البیان" نگار لیم اور اسی قبیل کے قصوں کا ہیرو ہمیشہ دودمانِ شاہی کا چشم و چراغ ہوتا تھا۔ لیکن مثنویاتِ تیر کا ہیرو ہمیشہ طبقہ عوام میں سے ہوتا ہے۔ تیر کبھی نوابوں اور بادشاہوں کے گرد بیٹھتے تھے۔ ۴۔ پر مری گفتگو عوام سے "ان کا مسلک تھا۔ ان کا عوامی ہیرو مجنوں صفت۔ فنا فی العشق کا دنیا سے نا بلند اور بے نیاز ہوتا ہے۔ داستانِ مثنویوں کے ہیرو میں طبقہ بالا کے تمام کمالات و اکتسابات جمع کر دیئے جاتے تھے۔ وہ شجاعت کے ساتھ ساتھ دنیا دار اور مصلحت میں ہوتا ہے۔ فقرہ بازی اور ضلع جگت کے محروکوں میں کبھی بند نہیں ہوتا۔ ضرورت پڑنے پر کسی دیو یا ساحرہ کو زک بھی دے سکتا ہے اور کسی پری کو فریب بھی لکھ مثنویاتِ تیر کا ہیرو بڑا مسکین، وفادار، مغوم، بے چارہ، جہان ناز عاشق ہو سکتا ہے جس کی زندگی پر دم آتا ہے اور جس کی موت پر فریاد۔ داستانِ مثنوی کا ہیرو مخالف قوتوں کو روندنا چاہتا کامرانی کی جانب بڑھا چلا جاتا ہے۔ لیکن خالص و ارنات عشق کی مثنویوں کا ہیرو مخالف قوتوں کا شکار ہو کر جان سے گزر جاتا ہے۔

اگر داستانوں کا ہیرو ہر فن حولا تھا تو تیر کا ہیرو "ایک فنا" ہے۔ اس میں بس ایک کمال ہے کہ وہ شدت کے ساتھ عشق کرتا ہے۔ اور دنیا و مافیہا سے غافل ہو جاتا ہے۔ وہ سربراہِ یالپ باں کہیں جن کی جھلک دیکھ لیتا ہے تو دیں ڈٹ کر بیٹھ جاتا ہے۔ وہ بھی کیا زمانے تھے! شاید اس ہیرو سے بھی زیادہ قابلِ رحم محبوب کا والد ہے جس کے در پر ایک ہفتہ سے اس کی قرۃ العین کا قدر دان ستیا گرہ کئے بیٹھا ہے!

تیر کی کئی مثنویوں میں ہیرو کسی منکوحہ عورت سے عشق کرتا ہے مثلاً "جان و عروس"۔ "عشق افغان پرستہ اور موزنامہ" میں۔ نازین بھی ہیرو کی چاہ میں مبتلا ہو جاتی ہے اور وفا کے ثبوت میں جان قربان کر دیتی ہے۔ گویا تیر کے نزدیک یہ مستحسن ہے کہ ایک کنہا عورت شوہر سے خیانت کر کے ایک نامحرم سے عشق بازی کرے۔ سراج کی تنظیم خانہ کی بنا پر گئی ہے۔ تیر نے اپنی مثنویوں میں لہجہ و لہجہ ہمدرد کر کے سہل سہل ہی نہیں اخلاقی نظام کو بھی درہم برہم کیا!

عشق حقیقی کا اجمارہ تھا۔ تیر ہر مثنوی کی ابتدا میں اور کبھی کبھار خاتمہ پر بھی عشق کی طویل توصیف رقم کرتے ہیں۔

نہ ہو عشق تو افس باہم نہ ہو
نہ ہو درمیاں یہ تو عالم نہ ہو

(نہ جان و مردوس)

محبت نے ظلمت سے کاڑھا ہے نور
نہ ہوتی محبت نہ ہوتا ظہور
محبت ہی اس کارخانے میں ہے
محبت سے سب کچھ زمانے میں ہے

(”شعلہ شوق“)

نظم کل کا ڈول ڈالا عشق نے
انس سے انساں نکالا عشق نے
وہ حقیقت سب میں یاں ساری ہوئی
ہے گی ہر شے عشق کی ماری ہوئی
چار سو ہنگامہ آرا عشق ہے
عشق کیا کہئے کہ کیا کیا عشق ہے

(”مورنامہ“)

عشق ہے تازہ کار تازہ خیال
ہر گھڑی اس کی اک نئی ہے چال

(”دربائے عشق“)

مثنویات تیر کا یہی حصہ سب سے زیادہ دل نشیں ہوتا ہے بلکہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ تیر کا مثالی عشق ہمہ گیر ہی نہیں ہمہ سوز بھی ہے۔ اس کا انجام ہمیشہ امید ہوتا ہے اور یہ وہ ساتھ ہے جس سے کسی کو مفر نہیں۔ متعدد مثنویوں میں اس کی جہاں ہوگی کی طرف اشارہ کرتے ہیں:

ہے گی ہر شے عشق کی ماری ہوئی
عشق سے کیا تیر اتنی محفتگو
خاک اڑادی عشق نے ہر چار پر

(”مورنامہ“)

عجب عشق ہے مرد کار آمد
جہاں دونوں اس کے ہیں برہم زدہ (”شعلہ شوق“)

عشق کی اسی برہم زنی کو تین کی تفصیل کے طور پر تیر کوئی حکایت پیش کرتے ہیں اور اسے اسی پنج پر ترتیب دیتے ہیں۔ چنانچہ ہر مقام اور ہر قدم پر پر عشق کی دل سوزی و جاں سوزی نمایاں رہتی ہے۔ مثنوی نکتے وقت تیر کا واحد مقصد عشق کی جہاں سوزی کا بیان ہے۔ ان کی تمام توجہ اسی نقطے پر مرکوز رہتی ہے وہ وحدت اثر کے قائل ہیں اس لئے بااستغنائے اعجاز عشق مثنوی کی رسی تھید سے گریز کرتے ہیں۔ ہڈیوں کو سلگا دینے والے اور روح کو گھلا دینے والے عشق کا بیان حمد و لغت و مناجات وغیرہ کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ تیر پہلے مہر سے جو فضا قائم کرتے ہیں وہ آخر تک برقرار رہتی ہے۔ عاشق کا کردار و گفتار ہو کہ ہجر کا عالم ہو کہ بیگانہ ہو کہ عزیز ہوگی کی تمام راینوں کی شرح ہر ایک سے اسی مقصد کو تقویت پہنچتی ہے۔ تفصیلات میں جانے کا یہ عمل نہیں۔

جذبہ عشق کی شرح کے لئے تیر نے جامہ حرف بھی اسی کے مطابق ہی چنا ہے۔ ان مثنویوں کی زبان میں بھی نرمی اور گھلاؤنا خستگی و ہر شے کی رسی بسی ہوئی ہے۔ موضوع کے ساتھ ساتھ بوج بھی یاس و محرومی سے بھرا ہوا ہے:

آہ جو ہم دنی سی کرتی ہے
اب تو وہ بھی کمی سی کرتی ہے

کہتے ہیں ڈوبتے اچھلتے ہیں
لیکن ایسے کوئی نہ نکلتے ہیں
عشق نے آہ کھودیا اس کو
آخر آخر ڈوب دیا اس کو

(”دربائے عشق“)

جگر غم میں یک لخت خوں ہو گیا
رکا دل کہ آخر جنوں ہو گیا

(”شعلہ شوق“)

تیر کی طرز مثنوی گوئی اس قدر مقبول ہوئی کہ ان کی تقلید میں متعدد مثنویاں لکھی گئیں۔ راسخ عظیم آبادی کی مثنویاں تو بالکل تیر کا چربہ ہیں۔ ان کے علاوہ ذیل کی مثنویاں بھی کم و بیش تیر سے ہی متاثر نظر آتی ہیں: (باقی صفحہ ۱۱۱ پر)

”میں نے لاہور جانا ہے“

(ایک سانی تحقیق)

سیتا قدرت نقوی

ایک تک عہدِ قدیم میں کھڑی بولی کا رواج تھا اور جب اس بولی پر بیرونی حملہ آوروں کا اثر ہوا تو زبان کے تغیری اصول کے تحت کہ دس، دس، بیس بیس کو س کے فاصلہ پر زبان بدلتی جاتی ہے متاثرہ بولی کے ڈور پ ہو گئے۔ ایک اُردو اور ایک پنجابی۔ قدیم اُردو کھنی میں جو اسماء و افعال پنجابی سے متعلق بتاتے جاتے ہیں ان کا تعلق کھڑی بولی سے ہے وہ قدیم اُردو میں رائج تھے، تہذیبی مراحل میں متروک ہو گئے۔ مگر پنجابی میں تہذیبی عمل نہیں ہوا۔ اس لئے اس زبان میں تاحال وہی قدیم الفاظ پائے جاتے ہیں۔ مرحوم حافظ محمود شیرانی ”پنجاب میں اُردم کو کبھی یہی القباس ہوا۔ میری رائے میں وہ اس حقیقت کو نہ پاسکے کہ پنجابی اور اُردو کی مماثلت سے پنجابی اصل نہیں ہو سکتی بلکہ اس سے صرف یہ ثابت ہوتا ہے کہ دونوں کا منبع ایک ہے۔“

یہ بات میں نے جملہ مترشحہ کے طور پر اس لئے کہی کہ میرے نزدیک اُردو اور پنجابی دو لگی بہنیں ہیں۔ اُردو بولنے والے پنجابی کی باتیں، اور پنجابی بولنے والے اُردو کی باتیں، ساتھ سے اسی فی صد تک سمجھ جاتے ہیں وراثتِ شاہ کا یہ شعر ہے۔

علیٰ دانگ نہ سخی دلیر کوئی، پہلوان نہ مرد شہو جیہا
نیکو کار نہ دانگ حسین کوئی، بیکار نہ شمر لنگور جیہا

اس شعر میں ”دانگ“ اور ”جیہا“ کے علاوہ تمام لفظ اُردو میں جوں کے قوں استعمال ہوتے ہیں۔ پنجابی، خالہ کو ”ماسی“ کہتے ہیں، یعنی ماں کی مانند“ اور حقیقتاً اہل پنجاب نے اُردو کی خدمت میں جو کی مانند کی ہے ان کی خدمات کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔

اُردو، دو آہ سے دکن اور لکھنؤ اہل زبان کے ساتھ ساتھ گئی، جہاں بہت سی روایات دہلی کی برقرار ہیں اور تھوڑا بہت اثر علاقائی زبانوں کا بھی پڑا۔ یہ نقل مکانی ارتقاء کے تحت تھی کیونکہ خود اہل زبان پیچھے

”جزیرہ مسخروں“ کی مجلسِ کیرمیل نے زبان کی غلطی کو ایک جرمِ عظیم قرار دیا۔ وہاں کے باسیوں نے اس جرمِ عظیم کی کیا سزا مقرر کر رکھی تھی؟ اس کا علم تو غلام عباس صاحب ہی کو کر سکتا ہے۔ البتہ ان کی ”جنتِ الشوراء“ کی مصداق سرزمینِ لکھنؤ ہے جس کے رہنے والے اپنی زبان کو کوثرِ نسیم سے محلی ہوئی سمجھتے ہیں اور ان کے نزدیک زبان کی غلطی کو لہوِ اول میں سرفہرست ”زندہ دوانِ پنجاب“ ہی رہے ہیں، حالانکہ زبان کے دونوں مرکزوں (دہلی و لکھنؤ) کی باہمی آویزش میں بھی اسی جرم کی بازگشت کا پرت ہے۔ غلطی تذکر و تائید کی ہو یا کسی لفظ کے غلط استعمال کرنے کی یا کسی حرف کے بجا بہنے کی غلطی بہر حال غلطی ہے۔ اسی لئے میں نے سوچا کہ آج دہلی سے چل کر، دکن کی پریچ گھاٹیوں پر نظر ڈالتا ہوں دہلی آؤں اور پھر لکھنؤ پہنچ کر وہاں کے حسین بازار، باغوں کو چھ اور خصوصاً عمارات کو دیکھوں وہاں کے نازک مزاجوں سے گفتگو کر دوں، اس کے بعد تو یقیناً دہلی ہو کر ”میں نے لاہور ہی جانا ہے“ کراچی نہیں۔

اُردو زبان نے دیہاتوں سے سندھ کی وادی اور پانچ دریاؤں کی سرزمین سے ایک ہیولانی حیثیت میں، ایرانی، تورانی اور افغانی سپاہیوں کے ساتھ وادیِ گنگ دھن کے سبزہ زاروں میں پہنچ کر ڈیرے ڈالے اور اس کھڑی بولی پر اپنا قبضہ جمایا جو برج، ماندھی اور پائی کی بہن تھی جس کا دس کو روپا نڈو کی راجدھانی ہنستا پور کے علاقہ میں تھا یہی علاقہ میرٹھ اور مضافات دہلی کے نام سے مشہور ہے۔ یہی کھڑی بولی معمولی اختلاف کے ساتھ شمالی ہند سے ایک تک بولی جاتی تھی۔ چنانچہ اُردو اور پنجابی میں یک گونہ مماثلت اسی بنا پر ہے۔ اسی لئے پنجابی بولی میں مستعمل بعض مصداق کے افعال اور بعض اسماء کو کھنی اُردو کے قدیم آثار میں دیکھ کر یہ قیاس کر لیا گیا کہ اُردو پنجابی ہی کی جذیب صورت ہے، حالانکہ ایسا نہیں ہے بلکہ حقیقت یہ ہے کہ وادیِ گنگ و جرج سے

تھے۔ اگر انہوں نے مقامی اثر قبول کیا تو اس کو گوارا کر لیا گیا چنانچہ جب دلی کے زمانہ میں اُردو کو دہلی والوں نے شاعری کا مرتبہ دیا تو انہوں نے بھی کئی تصرفات کو ایک زمانہ تک جانز رکھا۔ اس بارے میں قائم کا یہ کہنا ہے کہ ریختہ گویان دہلی کے کلام میں جو چند غیر اوس الفاظ اور محاورے مستعمل ہیں وہ اہل دہلی کو اس لئے گوارا ہو گئے ہیں کہ دکن کی زبان کے مطابق درست ہیں (عزیز نکات ۱۳) حالانکہ وہ مدعی ہیں ۵

قائم میں غزل طور کیا ریختہ ورنہ

اک بات پھر سی زبان دکنی تھی

جس طرح دکنی اُردو، گجراتی اور مرہٹی وغیرہ سے متاثر ہوئی، اسی طرح لکھنوی اُردو، پوربی (راوڑی) سے متاثر ہوئی ہے بعض امور میں دہلی والوں سے اہل لکھنؤ کا اختلاف اسی اثر کا نتیجہ ہے۔ میں نے جھوٹ بولا (دہلی) وہ جھوٹ بولا (لکھنؤ)۔ مولوی عبدالحی مرحوم نے رواداری سے کام لیا اور دونوں کو صحیح کہہ گئے۔ (قواعد اردو محکمہ اعلیٰ دکن)۔ حالانکہ ”میں جھوٹ بولا“ اور ”میں نے لاہور جانا ہے“ ایک ہی طرح کی غلطیاں ہیں۔ ایک میں ”نے“ کا ترک خلاف قاعدہ تو دوسرے میں ”نے“ کا استعمال خلاف اصول ہے۔ لکھنوی اُردو پر راوڑی کا اثر ہے اور راوڑی میں ”نے“ کا استعمال پایا نہیں جاتا۔ اسی لئے اہل لکھنؤ بعض معوی مصاد کے فعل بھی میں ”نے“ کو ترک کر دیتے ہیں۔ وہ خوب پڑھا“ اہل لکھنؤ کے نزدیک صحیح ہے اور یہ پوربی اثر ہے۔ اُردو کا اس سے کیا واسطہ؟ اہل دہلی کہیں گے اس نے خوب پڑھا“ لہذا ”نے“ کے سلسلہ میں سفر سے پہلے تھوڑی دیر کے لئے ٹھہر کر یہ طے کر لیا جائے کہ ”میں صحیح محل استعمال کیا ہے؟“ ”نے“ اُردو میں علامتِ فاعل ہے اس کو صرف مصدر متعدی کی ماضی مطلق، قریب، بعید، خشکیہ اور تمنائی کی دو صورتوں، میں استعمال کرتے ہیں مثلاً، میں نے پڑھا، اس نے پڑھا، ہم نے پڑھا تھا، تم نے پڑھا ہوگا، کاش اس نے پڑھا ہو، اگر تو نے پڑھا ہوتا۔ اشعار ذیل سے بالترتیب یہی استعمال ثابت ہوتا ہے ۵

بہت دنوں میں تغافل نے تیرے پیدل کی

وہ اک ننگ کہ بظاہر نگاہ سے کم ہے

بھونک رہے کس نے گوشِ محبت میں اے خدا

افسوس! انتظار تمنا کہیں جسے

میں نے مجنوں پر لڑکپن میں اسد سنا تھا کیا تھا کہ سرواد آیا

یوں کہ تے تھے کب وہ دلی نادان کی شکایت
کی ہوگی فلک نے مرے انجان کی شکایت
مجھ تک کب ان کی بزم میں آتا تھا دورِ جام
ساقی نے کچھ بلانہ دیا ہو شراب میں
جول پر گزرتی ہے کیا تجھ کو خبر تاج

کچھ ہم سے سنا ہوتا پھر کو لے کہا ہوتا

”نے“ کا یہ استعمال اصول کے ماتحت ہے اس کے علاوہ کچھ متشبیہ بھی قرار دے لئے گئے ہیں۔ یہاں ایک اصول پیش نظر رہنا چاہیے کہ ”نے“ کا اثر فعل پر یہ ہوتا ہے کہ اس کا رشتہ فاعل سے منقطع ہو جاتا ہے اور مفعول سے قائم ہو جاتا ہے۔ یعنی فعل میں تبدیلی مفعول کے لحاظ سے ہوتی ہے فاعل کے لحاظ سے نہیں۔ جیسے لڑکے نے کتاب پڑھی لڑکے نے سبق پڑھا، کتاب اور سبق کی وجہ سے فعل بدلے۔ یہ اس لئے بیان کیا گیا کہ ”نے“ کے استعمال کی رستی اور ترک وغیرہ کا پتہ چلانے میں آسانی ہو۔

دہلی جو ایک شہر ہے عالم میں انتخاب درحقیقت بہت سی خرمیوں کا مرکز رہا ہے۔ زبان کے لحاظ سے یہاں دو آب کا اثر ہے۔ اُردو کا مولد و منشا ہونے کا فخر بھی اسی سرزمین کو حاصل ہے۔ بقول ڈاکٹر شریک سبزواری کوئی سورت اس کے کلام میں ”نے“ بکثرت استعمال ہوا ہے جس کی مثال ”لیک پرش نے آج میری سپنا نردس دینوں“ (آج مجھے ایک شخص نے خواب میں جلو دکھایا) دی ہے (”سور ساگر پد“ ۲۹ ص ۲۹) اُردو زبان کا ارتقا ۱۲۳۵) اور پرتھوی راج کے عہد میں بھی اس کا استعمال پایا جاتا ہے۔ اسی زمانہ سے اردو کی ابتدا کا تعلق ہے۔ امیر خسرو دہلوی ہیں جو اُردو کے پہلے شاعر تسلیم کئے گئے ہیں ان سے منسوب ایک شعر ”دو پیلیاں اور ایک کہہ مرنی ملاحظہ فرمائیے جن میں ”نے“ استعمال ہوا ہے:

میرا جو سن تم نے لیا، تم نے اٹھا غم کو دیا

غم نے مجھے ایسا کیا جیسا پتنگا آگ پر

ایک کنیہ نے بالک جایا

مارا مرے نہ کاٹا کٹے

واپاک نے جگت ستیا

واپاک کو ناری کھائے

ترد سے ایک تریا تری اس نے بہت رھایا

اپ کا اس کے نام جو پوچھا آدھا نام بتلایا

آدھا نام پتا پر پیارے بھجھ پیل موری

امیر خسرو یوں کہیں لپٹنے نام نبولی

(نمل)

تو من دمن کا ہے وہ مالک والے دیا میرے گود میں بالک

دل سے محنت جی کے کام کیوں سکھی ساجن؟ تا سکھی رام

(کہ بھولی)

امیر خسرو ۲۵ء میں وفات پاتے ہیں۔ "کا استعمال بچے

یہاں باقاعدہ اور بالآخر اس ہے۔ ان کے بعد شمالی ہند میں سکھائی بنا

فارسی تہی ہے مگر عوام کی زبان وہی کھڑی بولی فارسی و عربی آئینہ ہو

پر رب میں اودھی راج تھا۔ اودھی میں "نہیں ہے۔ اسی وجہ سے کیر

اور تہی داس کے کلام میں اس کا وجود نہیں لیکن اس زمانہ کے ریختہ

میں اس کا استعمال موجود ہے جس کی ابتدا امیر خسرو سے ہوتی ہے۔ ان کے

بعد بھی مثالیں ملتی ہیں:-

تب سب نے ہا جو کر کے تاپی مری بجائی

ہنس ہنس کے پھیل موسو کرے لگو ٹھٹولی

اکھیاں نے جھڑ گایا، برسوا کریں گی آخر

دردا کہ راز پنہاں خواہ شد آشکارا

مولانا احمد افضل، جمنہانہ، ضلع میرٹھ، کے رہنے والے تھے جو

عبداللہ قطب شاہ یا محمد قطب شاہ کے ہم عصر ہیں۔ یہ زمانہ دکن کی

شاعری کا ابتدائی زمانہ ہے۔ شمالی ہند میں مولانا کی "بکٹ کہانی" بہت

مشہور ہے۔ اس میں "نہ" کا متقل استعمال ہوا ہے:-

جنوں در ملک جاں جھنڈا اگدایا

سمجھ اربو کا تھا ناو تھا نا

جنوں کے بعد "نہ" مقدر ہے کہ مذکورہ نہیں، لیکن اکثر جگہ اس کا

استعمال قاعدہ کے مطابق ہے۔ صرت و شو مثلاً پیش ہیں سے

مسافر سے جنہوں نے دل لگایا انہوں نے سب جنم روئے گنویا

دہل رحلت کا مجھادوں لے بجایا اچھوں لک سادرا پردیں چھایا

شمالی ہند میں اردو شاعری کے آثار دلی کی آمد تک برابر پائے

جاتے ہیں مولانا افضل کے بعد گیارہویں صدی میں شیخ جیون کا کلام پایا

جاتا ہے۔ ان کے کلام میں بھی "نہ" کا استعمال موجود ہے مگر ترک ہے تو

مقد ہے:

کیا جی بکتر دھنی پاک سے پڑا عاقبت خاک پر تاک سے رنک مقد

بکتر خودی کی تھی غرور نہیں براہیم نبی سے جو مرد نہیں

غرض شمالی ہند میں محمد شاہ کے عہد تک اردو کے جواہر تھے

ہیں، ان میں "نہ" کا استعمال باقاعدہ ملتا ہے حتیٰ کہ میر جعفر زٹلی کے

کلام میں بھی موجود ہے اگرچہ مولانا آزاد نے "آب حیات" میں لکھا "زل

کا اعتبار کیا؟" مگر اس سلسلہ میں ان کا کلام "نہ" کے استعمال کی گواہ

فرد ہے۔

بادشاہ تہیں برکی، سرکی خدائے خبرکی

تاحال ہم داری حذر، کہ جعفر اب کیسی بنی

اس شعر میں ترک، مقد اور استعمال موجود ہیں۔ برکی، یعنی

تو نے برکی ہے۔ اب واضح استعمال دیکھئے۔

لزت کا کھاوتے کھانا، پیرتے ریشی بانا

انہوں کو موت نے بھاناکر آخر خاک ہو جانا

اب یہ زمانہ آتا ہے جب دکن سے دلی آتے ہیں اور یہاں

دکن کی طرز پر شاعری کی داغ بیل پڑتی ہے۔ اس لئے پہلے دکن پر ایک

نظر ڈال لی جائے مسلمان فاضلین جب دلی سے آگے بڑھے، اس زبان

کو اپنے ساتھ لے گئے۔ دکن میں یہ زبان مقبول ہوئی۔ دیاروں میں سائی

پائی، ادبی زبان سنی، نظم و شرنے ترقی پائی، لیکن مرہٹی اور گجراتی کا اس پر

بھی اثر پڑا، جس کی وجہ سے دلی کی زبان سے ذرا مختلف ہو گئی۔ اسی

لئے "نہ" کے استعمال میں بے قاعدگی ملتی ہے۔ خواجہ بندہ نواز سید محمد

حسینی گیسو داز کی "معراج العاشقین" کی اس عبارت میں "نہ" استعمال

نہیں ہوا:-

"حضرت دودھ پئے ہو عرض کئے، لے مرے خدا میں دودھ

کو قبول کیا"

اس میں دوجگہ "نہ" استعمال ہونا چاہیئے تھا۔ مگر نہیں کیا گیا۔

یہ زبان کی ابتدائی حالت ہے مگر ان سے جو شاعرانہ سبب ہیں اس میں

"نہ" موجود ہے:-

خواجہ نصیر الدین جئے ساتیاں پیو بنائی

جیو کاہوں کہ کھول کر باک آپ کھائی

"جئے" یعنی جی نے ہے۔ غرض دلی کے عہد تک استعمال اور بے قاعدگی

اور ترک ملکہ ہے اس لئے کہہ سکتے ہیں کہ دکن میں کوئی اصول نہیں تھا۔ ہر دکن کے ہر شاعر کے کلام میں یہ تینوں باتیں ملتی ہیں۔ شرم میں سب سے (مکلاوی) کی عبارت سے استعمال دینے کا انداز کی مثالیں پیش ہیں۔ گنگان دھیان کے کام تمام محمد نے لیا یا، جو کچھ پایا تھا محمد نے پایا، جو کچھ محمد نے پایا علی کو سمجھا یا۔

”جوں مرتضیٰ فرماتے ہیں جنوں کی بات دائم معرفت ربی بنفسخ العزائم“ یعنی جیوں منگتا تھا تیروں نہیں ہوا تو میں خدا کو سمجھانیا، میرے بات میں نہیں ہے کام، ہر ایک بات میں ہے تحقیق کر جانیا۔

”میں سمجھانیا“ اور ”تحقیق کر جانیا“ کے لئے ”نہ“ استعمال ہونا چاہیے تھا۔ یہی حال نظم کا بھی ہے۔ محمد قلی قطب شاہ اور قطب شاہ سے لیکر دکنی تک ترک استعمال پایا جاتا ہے۔ دیکھئے محمد قلی قطب شاہ کے ہاں ترک اور عبد اللہ قطب شاہ کے ہاں استعمال موجود ہے :-

یک پوت کو دیتے زہر ایک پوت پہ کھینچے خنجر

کافر کے کیسے تہرے روز خرم کاری ہائے ہائے

حسین کا وقت جب دانا یا تھر نہ آکلا کا تیا

حرم کا ایک سنیا پایا، بتا دینا اور اپکاری کبی

غرض دکن کے ہر شاعر کا کلام اسی بیچ پر ہے۔ دکنی اور اس کے بعد بھی یہی حال ہے۔ دکنی کے کلام سے مثالوں پر اکتفا کی جاتی ہے ”نہ“ پہلے شعریں استعمال دوسرے میں مقدر ہے :-

اہل گلشن پہ ترے قد نے جب ادا کیا

اولا سر کو غلامی ستے آزاد کیا

سدا بجا دہری چشم سوں لے نور نظر

حسن کے فرو پہ دیوان ازل صا کیا

دکنی کے اس قصیدہ میں بے قاعدگی پائی جاتی ہے مگر اسی میں

استعمال بھی پایا جاتا ہے۔ آخری شعر استعمال کی مثال ہے :-

ہر ایک رنگ میں دیکھا ہوں چرخ کے نیرنگ

ہوا ہے غنچہ صفت جگ کے باغ میں دلی تنگ

سوائے داغ کے پایا نہیں ہوں باغ میں گل

درائے خون جگر میں دسا مجھے گل رنگ

محمد شگیر علی با علی ولی اللہ

کہ اس فلک نے کیا جکال بکھر کر تنگ

دکنی کے عہد سے اہل دکنی اور دکنی طرف متوجہ ہوئے۔ دکنی میں باقاعدہ اردو شاعری کا یہ ابتدائی عہد ہے۔ اب ہم دکنی چل کر جائزہ لیتے ہیں۔ دکنی دکن سے دکنی آئے ہیں، اہل سخن کی محافل میں اپنا مقام بناتے ہیں لوگ سنتے ہیں، مطلق امتحان ہے۔ دکنی سعد اللہ گلشن سے بیعت کر کے مرید ہو جاتے ہیں مثلاً صاحب نے اپنے مرید کو راہ سمجھائی (آبجیات ص ۱)۔

”ایں ہمہ مضامین فارسی کہ بے کار فائدہ اند در ریختہ خود

بکار سیرا از تو کہ محاسبہ خواہ گرفت“ (۱) ”شکات الشعراء ص ۱۹

”شعر الہند“ جلد اول ص ۱۱

اور اصلاح زبان کے سلسلہ میں ہدایت فرمائی :-

”شما زبان دکنی را گزاشتہ، ریختہ را موافق اردوئے مطہر اختیار

آباد موزوں بکنید کہ تا موجب شہرت و رواج قبول خاطر صاحب

طبعان عالی مزاج گردو“ (تذکرہ قدرت بحوالہ شعر الہند جلد اول ص ۱۱)

مرید نے مرشد کی بات کو بچے باندھا اور عمل کیا، دوبارہ دکنی

آئے تو زبان کافی بدلی ہوئی تھی۔ دہری حضرات نے دیکھا انہیں بھی شوق

ہوا، دیکھا دیکھی فارسی چھوڑ ریختہ کو ہوا کیا، ابتدا میں دکنی کے کلام

کو نمونہ بنایا اور کچھ دن تک دکنی زبان کو اپنالے رکھا۔ اگرچہ خود دکنی نے

دکن میں اصلاح زبان کی ہم شروع کر دی تھی اور اردو نے مکمل کامیاب

دینے لگے تھے، ان کا یہ شعرو۔

اس کی تعظیم ہوئی، اہل چین ہو ا جب

بلبل باغ نے جب مہکت گل یا د کیا

بالکل آج کل کی زبان میں ہے، مگر دکنی والوں نے شاعری کے شوق میں اس

طرح تو یہ نہ کی۔ شاہ حاتم نے اصلاح زبان پر خاص توجہ دی۔ ویسا چہ

دیوان زادہ میں لکھتے ہیں :-

”دریں ولا از وہ دعانہ سال اکثر الفاظ از نظر انداختہ

والفاظ عربی و فارسی کہ قریب الفہم و کثیر الاستعمال باشند و روزمرہ دلی

کہ مرزا ابیان و ضحیمان اند و محلوہ آزد، منظور دار و آبجیات ص ۱۱

شاہ حاتم اصلاح زبان کے سلسلہ میں اتنے فراخ حوصلہ واقع

ہوئے تھے کہ اگر ضرورت شوری کی وجہ سے محلوہ کی کوئی خلاف مذہبی

ہو جاتی اور ان کا کوئی شاگرد اس سے باخبر کر دیتا تو بہت خوش ہوتے

مشہور واقعہ ہے کہ شاہ حاتم کی نشست شاہ قسیم کے کچھ میں ہوا کرتی تھی۔ ایک روز حبیب محول شاگردوں کا مجمع تھا سعادت خاں رنگیں بھی ایشا کی خدمت میں پہنچے، باتوں باتوں میں شاہ حاتم نے فرمایا کہ رات ایک مطلع ہوا ہے۔

سر کو چٹکائے کھو، سینہ کھو کوٹا ہے

رات ہم جھکی دولت سے مزا اٹا ہے

میاں رنگیں نے دست بستہ کہا، استاد اگر یوں ہو جائے تو بہتر ہے:

سر کو چٹکائے کھو، سینہ کھو کوٹا ہے

ہم نے شب جھکی دولت سے مزا اٹا ہے

شاہ صاحب سن کر بہت خوش ہوئے اور آدھیں فرمائی۔ ایک حصہ بولے کہ اُستاد کے سامنے یہ گستاخی مناسب نہیں مگر شاہ صاحب نے فرمایا کہ کوئی مضائقہ نہیں میں دیوان میں اسی طرح کھوں گا۔ (آبجیات مثلاً) شاہ صاحب کے شعر میں نے ”مقدمہ ہے، کیونکہ اگر خلافت قلعہ و پلہ ہوتا تو ”لوٹے میں“ لگتے۔ یہ ترک روضہ کے خلاف تھا میاں رنگیں نے روضہ کے مطابق کر دیا اس کا یہ مطلب ہے کہ شعر میں زیادہ جنت نہ کی جاتی تھی سہل انگاری سے ترک کر دیتے تھے مقرر جان جاہاں، قائم ہوا تیر اور انشاء نے اصلاح زبان میں کوششیں کیں اور زبان نے بہت جلد اصلاحی منازل طے کر لیں۔ انشاء تک ترک کی مثالیں ملتی ہیں۔ حاتم کے یہاں بے قاعدگی بھی ہے۔ آخر سے انشاء تک ناسندہ شعرا کے کلام سے ترک و استعمال کی ایشا ملاحظہ فرمائیے۔

آہستہ۔ ہر یک نگہ میں ہم سے کرنے لگے ہر نوک

بکھر پڑی آنکھوں کے پیر طے طور بکھا

حاتم۔ میں پایا ہوں دلے تھ چشم کا بید

نہاگوں کا کبھی ان کا اشارہ

(بے قاعدہ ترک)

قائم۔ غنچے کس کے دوسرے کو یہ لہکے ہیں جمع

گل کیوں بنائے بارغ میں صورت کنارگی

سودا۔ ناک سے تیرے صید چھوڑا نے میں

ترپے ہے مرغ قبلہ نہ آشیانے میں

۰۔ پلا ہر ایک بات میں اپنے، تیس یوں تجھ

معنی کو جس طرح سے سخن عاشقانے میں (ترک، مقدم)

میر تقی میر۔ ہلکے آگے ترا جب کسی نے نام لیا

دل تم زندہ کو ہم نے تمام تمام لیا

۰۔ اسی دوشی کہاں ہیں لے خباں

میر کو تم جھٹ اُداس کیا ترک مقدم

مضیٰ۔ میں تے بازار جن خواں سے

مول اک حشرت نظری ہے

۰۔ شب ہجر صولت ظلت سے نکلی

میں جب آنکھ کھولی بہت رات نکلی ترک۔ مقدم

جرات۔ دم وصل اس نے رخ سے جو نہ ملک نقاب اُٹا

ہمیں لگ گیا دم اس دم بعد مضطرب اُٹا

۰۔ شب وصل یہ قلع تھا پ وہ سو گیا تو منہ سے

نہ ذرا بھی تیں دوپٹہ زرہ حجاب اُٹا (ترک، مقدم)

آبجیات ۲۴۔ مولانا آزاد نے لکھا ہے ”دیکھو یہاں بھی علامت فعل

(نے) محذوف ہے اور یہ پُرانا جو ہے۔“

میر حسن۔ منزل بے غدی میں آپ کو بھی

ہم نے اپنا نہ ہم سفر دیکھا

۰۔ ہر ایک دل و جاں کے مرغوب نظر آئے

میں خوب تہیں دیکھا، تم خوب نظر آئے (ترک، مقدم)

انشاء۔ مجھ چھڑنے کو ساقی نے دیا جو جام اُٹا

تو کیا بہک کے میں نے اسے اک سلام اُٹا

یہ تمام اساتذہ دہلی کے تھے، مگر ستم ہائے روزگار کے واسطے

ہوئے۔ نوابین اودھ قدردان اہل فن تھے۔ یہ سب اودھ پہنچے اور اودھ

والوں کو انہوں نے سبق پڑھا۔ انشاء کے بعد کوئی اہل کمال لکھنؤ نہ گیا

اس لئے اب لکھنؤ چلتے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ خود اہل لکھنؤ نے ”تعلق

کیا روش اختیار کئے ہوئے ہیں۔ جائزہ سے پہلے لکھنؤ کے ماضی پر ایک

نظر ڈال لی جائے تاکہ بات آسانی سے سمجھ میں آسکے۔ دہلی پر تباہی آ رہی

تھی اور لکھنؤ ترقی پا رہا تھا۔ لکھنؤ دہلی سے قریب تھا، اس لئے صاحبان

علم و فن کلمہ کرنا۔ نوابین مرتبہ شناس اور قدردان تھے مگر صبر دکن بھی

ایسی ہی ریاست تھی وہاں بھی قدر و منزلت ہوتی تھی لیکن دہلی سے دُور

راستہ کٹیں، اس لئے اہل کمال وہاں کم گئے۔ اس کے علاوہ دہلی دہلی

سے جب کوئی ایمر کسی طرف کا حاکم مقرر ہو کر جاتا تو اپنے ساتھ کاروبار

کے لوگوں کو بھی لے جاتا۔ یہی حال حاکمان اوروں کا ہے کہ ان کے ساتھ دہلی سے کاروباری عملہ بھی آیا اور قدردانی و قدر شناسی کی وجہ سے صاحب کمال نے ادھر کا رخ کیا۔ دہلی کے باکمال شعراء لکھنؤ پہنچے جو اپنی زبان اور محاورہ کی حفاظت و دفاع پر بندوبست رہے۔ چنانچہ میرائیں ہمیشہ کہا کرتے تھے یہ میرے مگر کی زبان ہے حضرات لکھنؤ اس طرح نہیں فرماتے اور اب تک اس خاندان میں یہ خصوصیت برقرار ہے۔ غرض انشائیک یہ سلسلہ جاری رہتا ہے۔ مومن، ذوق اور غالب کا زمانہ آیا تو اہل کمال نے لکھنؤ جانا چھوڑ دیا۔ دہلی والوں میں سے بعض نے لکھنؤ کو وطن بنالیا اور انے اور ان کی اطاعت و محاورہ دہلی کو ملحوظ رکھا مگر لکھنؤ کے قدیم باشندوں کی زبان پر دہلی اثر بھی رہا۔ اگرچہ انہوں نے اردو زبان اہل دہلی سے سیکھی تھی۔ یہی دور میں دہلی والوں کا زمانہ گھٹنا اور لکھنؤ والوں نے بھی زبان کی مرکزیت کا دعویٰ کن شروع کر دیا۔ گویا اہل دہلی کے ہم مرتبہ دم پلہ بھنے میں فخر محسوس کرنے لگے۔ شیخ امام بخش ناسخ نے جہاں اصلاً لاہوری تھے مگر تعلیم و تربیت لکھنؤ میں ہوئی تھی۔ میر و مرزا کی اصلاحات زبان پر سختی سے عمل شروع کر دیا اور کچھ اصلاحات کا اپنی طرف سے بھی اضافہ کیا۔ اس زمانے میں ”نے“ کا ترک کلیتہً ناجائز قرار دیا گیا۔ لیکن مقصی کے شاگردوں میں سے بعض کے یہاں ترک کی مثال ملتی ہے مثلاً سرور:-

دوچار گھڑی دن سے جو رخصت میں طلب کی

تو جیل کے کہا جلیے میں دیر نہ کیجے

اہل لکھنؤ بعض اوروں میں محاورہ دہلی کی خلاف ورزی اس لئے کرتے ہیں کہ ان کی زبان پر دہلی کا اثر ہے۔ تذکر و تانیث میں دہلی کی مخالفت اسی اثر کا نتیجہ ہے۔ غالب لکھتے ہیں:-

”پورب کے ملک میں جہاں تک چلے جاؤ گے تذکر و تانیث کا جھگڑا بہت پاؤ گے“ (خطوط غالب ص ۵۵) پورب یعنی ضلع شرقی ہندوستان اور لکھنؤ خصوصاً تیر صاحب نے کہا تھا:-

کیا بدو باش پوچھو ہو پورب کے ساکنو

ہم کو غریب جان کے ہنس نہیں پکار کے

یہی حال بعض مصادر کے استعمال کا ہے۔ اہل دہلی جن کو متعدد استعمال کرتے ہیں، اہل لکھنؤ ان کو لازم سمجھتے ہیں۔ غالب ہی نے لکھا ہے:-

”کھور ہا ہوں، متعدی ہے۔ پورب نے اس کو لازمی جاننے ہیں۔

(پورب یعنی باشندہ پورب مشرقی اضلاع کا رہنے والا) لازمی کھویا گیا ہوں۔ ہم کہیں گے جاگتے ہیں۔ اہل پورب کہیں گے جگتے ہیں (خطوط غالب ص ۵۵) گویا اہل لکھنؤ ”کھونا“ کو لازم سمجھتے ہیں یعنی علامت طویل ”نے“ اور اس کے لئے مفعول نہیں لاتے، اہل دہلی استعمال کریں گے۔

میں جان کھور ہا ہوں ترے ہجر میں صنم (متعدی)

کھوتے گئے ہم ایسے کہ اغیار پا گئے (لازم)

اسی طرح اس نے کتاب کھوئی (متعدی) کتاب کھوئی گئی یا لڑکا کھویا گیا (لازم) مگر اہل لکھنؤ اس کے خلاف استعمال کریں گے یعنی وہ کتاب کھویا یا صرف کہیں گے وہ کھویا۔ غرض اسی طرح دیگر مصادر کے اشتقاق میں بھی اہل لکھنؤ پوربی محاورہ کی پیروی کرتے ہیں اور محاورہ دہلی کی مخالفت مثلاً سوچنا اور پڑھنا متعدی ہیں مگر اہل لکھنؤ بطور لازم استعمال کرتے ہیں۔ مثلاً گلزار نسیم کے یہ شعر ہیں:-

سوچا وہ کہ اب تو ہم میں آگاہ

جیسے ہیں تو حیت لبیں گے ناگاہ

(زندہ)

سوچی دلاشتاب ہے کیا

پھر تجھیں گے خطر اب ہو کیا

(مثنوی گلزار نسیم، طبع لاہور ص ۲۳)

”فسانہ آزاد“ کے یہ دو اقتباسات اسی کے مؤند ہیں:-

(۱) ”میں آزاد..... سوچے کہ چل کے محرم لکھنؤ کا ویکلیں“۔

(۲) ”ہم بھی سوچے کہ کہاں کی بھینٹ“ (فسانہ آزاد) بحوالہ ”کامران ادیب“ ص ۲۵۵ و ص ۲۶۱ مطبوعہ لاہور۔

دور جدید کے ممتاز شعراء میں سے عزیز لکھنوی کا شعرا اور نواب جعفر علی خاں آؤ کی نثر میں بھی استعمال پایا جاتا ہے:-

سوچے نہ یہ بتوں سے محبت بے لے عزیز

رکھتی تھی ایک آہ اثر میں بھری ہوئی

(”مکملہ“ مطبوعہ نول کشور بحوالہ ”کینفیہ“ ص ۱۳۸)

”فراق صاحب نے ان سب کا قلع قمع کر دیا اور نہ سوچے“ (اثر کے تنقیدی مضامین ص ۱۳)

اہل لکھنؤ کے ہاں اس کی مثالیں بہت ہیں۔ دہلی میں غالب کے ابتدائی دور تک لازم و متعدی دونوں طرح استعمال ہوتا رہا ہے مگر

جاسکتا۔ یا کسی ہے کہ عدد کو مؤنث نظم کیا ہوا اور پڑھی "لکھا ہوں کہ
"پڑھے" پڑھا لیا گیا ہو۔ باوی النظر میں یہ دونوں باتیں پڑھی قریح نظر آتی
ہیں لیکن حقیقت اس کے برعکس ہے۔ "عدد" بطور جمع استعمال نہیں
ہوتا کیونکہ عدد کبھی صلوات ہر جگہ واحد استعمال ہوتا ہے اس کی جمع نہیں
آتی بشرط سلام کے بالمقابل ہے۔ سلام واحد ہے یہ بھی واحد ہی ہے
مؤنث نہیں مذکر ہے۔ انیس ۵

سوتے میں شغل طاعت رب و عدد تھا

دل میں خدا کی یاد تھی لب پر دودھ تھا

خوض بحر نے لکھنؤ کے روزمرہ کے مطابق پڑھنا بطور لازم نظم کیا ہے اس
میں شک کی گنجائش نہیں ہے۔ اہل دہلی متعدی استعمال کرتے ہیں، فقہ

دیکھو تمت کا لکھا اس نے پڑھا خط سوار

دھیان پر میرا مطلب کسی عنوان چڑھا

لکھے پانی چولے منہ میں آنسو

پڑھی لبیں سرانے بکسی نے

"یہ باب ابھی میں نے تم کو پڑھا یا نہیں" (خطوط غالب ص ۳۱)

"بولنا" بطور لازم متعدی استعمال کیا جاتا ہے۔ اہل دہلی جب

مفعول مذکر موزونے استعمال کرتے ہیں جیسے اس نے جھوٹ بولا وغیرہ۔

مگر اہل لکھنؤ ایسے مواقع پر بھی "نے" استعمال نہیں کرتے اور بولتے ہیں وہ

جھوٹ بولا، وغیرہ البتہ بطور لازم لکھنؤ اور دہلی میں کوئی اختلاف نہیں

یعنی جب بولنا کے مشتقات بطور لازم استعمال ہوتے ہیں تو ان کے بعد ایک

اور جملہ آیا کرتا ہے اس کو مقلوب کہتے ہیں۔ غالب، انیس اور اکبر الہ آبادی

کے یہ شعور مثال میں ہیں:-

سرا رٹھ کے جو عدد کو کر چاہا

ہنس کے بولے کڑے سر کا تم جو چاہا

تین و پیر کو بھینک کے بولا وہ ناور

"کہہ دیجئے اے اسے کاٹ کے لیجا میں میرا تر"

چھوٹیں جو گلے آنا حشر سے اونٹ بولے

انہوں! شیخ نبی نے ہم کو پستانہ سمجھا

اہل لکھنؤ کے ہاں اب تک "نے" ترک کرنے کی مثالیں ملتی ہیں۔ بھونک کے سنا

علامت فاعل "نے" بالاتفاق استعمال ہوتی ہے۔ میں نے تم کو۔ اس پر دیگر

دنیا نے تم کو۔ وغیرہ مگر علامہ آزاد لکھنوی اس کے ساتھ "نے" ترک کر گئے ہیں

بہر اتفاق متعدی استعمال کیا جانے لگا۔ مصحفی لازم نظم کرتے ہیں:-

جب نہ بن آئی اور کچھ تدبیر

یہی سوچے کہ اب بلا تاخیر

غالب کے خطوط میں دونوں استعمال ملتے ہیں:-

۱۹ میں نے سوچا کچھ کیا زاریات غالب ص ۲۱ میں نے سوچا اگر اس

انتظار میں رہوں گا۔ (خطوط غالب ص ۱۹۱، "آرٹوئے معلی" کا پتہ

۱۹۱۱ لاہور ص ۱۱۱) میں "نے" نہیں ہے مگر "عود ہندی" ص ۱۱۱ میں

"نے" موجود ہے اور چونکہ "عود ہندی" کو اولیت حاصل ہے اس لئے

یہی صحیح ہے (۳) "حضرت جالاک اور سخن ساز اور ظریف تھے سچے

ہوں گے" (خطوط غالب ص ۱۱۱، "آرٹوئے معلی" کا پتہ ۱۹۱۱ لاہور ص ۱۱۱)

استاد فقہ متعدی نظم کرتے ہیں:-

ہم نے ان سے کوئی کی وہ ہیں کوئے دشمنی

دیکھو کیا سوچا تھا ہم نے اور مل گیا ہر گنا

جدید شعراء کلیتہً متعدی استعمال کرتے ہیں میں نے لکھا تھا:-

میں نے سوچا تھا کہ بانداز گر نظم جہاں

دور حاضر کے تقاضوں پر کرونگا قائم

میں نے سوچا کہ ہو کیوں غیر کی پیدا جھک

چاہیے رائق مطلق پہ بھروسہ مجھ کو

(علی حیدر ندوی "شعر الہند" جلد دوم ص ۲۹)

سوجان کی طرح "اہل لکھنؤ پڑھنا کو بھی لازم جانتے اور استعمال

کرتے ہیں۔ مولانا آزاد نے اشعار میں اہل لکھنؤ کا یہ قول نقل کیا ہے:

"جب کوئی (میر خلیق سے) اگر بیان کرتا کہ آج (انیس) فلاں

مجلس میں خوب پڑھے ہیں" (اشعار لاہور ص ۳۳)۔

چنانچہ اہل لکھنؤ کا عدد مروجہ ہے۔ آپ خوب رہائی پڑھے،

وہ مشاعرے میں غزل پڑھے۔ ہم عدد پڑھے۔ وغیرہ بحر لکھنوی لکھتے ہیں

کیا سلام جو ساقی سے ہم نے جام لیا

پڑھے عدد جو پیر میخان کا نام لیا

(زکات حق ص ۱۱۱)

اس شعر کے متعلق کہا جاسکتا ہے کہ "دودھ" بطور جمع استعمال

کیا گیا ہے جن کلام میں ہم پہلے مصرع میں مروجہ ہے اور اس کے ساتھ

علامت فاعل "نے" بھی ہے۔ لہذا یہ شعر بے فائدگی کی مثال پیش نہیں کیا

اردو بھی پڑھنا شروع ہے :

ہم سے کی یہ کنیاں ہیں کہ اٹھتے ہوئے آنسو

پلی جلتے پہ دروند، لمبیروں میں تھوکا

(سرلی بانسری)

قصہ کوتاہ "نے" کے ترک اور بے قاعدگی کی مثالیں اہل لکھنؤ کے

ہاں بخت ملتی ہیں جی کو ہم نے گوارا کر لیا ہے حتیٰ کہ مولوی عبدالحق بھی

رد اداریہ رہتے ہوئے وہ جھوٹ بولا کو بھی صحیح لکھ گئے۔ (قواعد اردو ۱۵۱)

طبع و کن۔

انشاء کے بعد، توہین، ذوق اور غالب کا عہد ہے ہمیں اس

دور میں دل کی زبان میں کوئی اہم تبدیلی نظر نہیں آتی۔ ذوق اور غالب

سرخیل شعلہ دہلی تھے۔ لکھنؤ کے سلسلہ میں ذوق و غالب کے کلام سے

اساد بھی گزر چکی ہیں، دل کی سیر کرنے سے پہلے دکن پر ایک نظر اور ڈال

لیں مگر دکن جانے سے پہلے چند اصلی باتیں اور بیان کی ذیلی ضروری

سمجھتے ہیں۔

اردو میں بعض مصادر ایسے ہیں جو متعدی ہیں لیکن ان کے ساتھ

"نے" استعمال نہیں کرتے۔ لانا، بھولنا، شرانا اور بھٹنا وغیرہ جیسے وہ

کتاب لایا، میں تمہاری بات نہیں بھولا۔ وہ تم سے شرایا۔ (اگرچہ ابلیس

مواقع پر جتنا حضرات "بھول جانا" اور "شرایا" کے مشتقات استعمال

کرتے ہیں جیسے : تم میں بھول گئے ہو صاحب ! وہ ہم سے شرایا گیا)

خالد اس معاملہ میں خوب بحثا وغیرہ بعض مصادر لازم و متعدی دونوں

طرح مستعمل ہیں۔ بولنا کی بحث گزر چکی، جیتنا، اڑنا، پکانا، بھڑنا،

پلٹنا اور بدلنا جیسے وہ جیتنا، اس نے بازی جیتی، وہ ہارا اس نے ریوڑ

ہارا۔

قمار محبت میں بازی صدا

وہ جیتا کیا اور میں مارا کیا (میر حسن)

تازہ جھک تھی شب کو تاروں میں آسمان کی

اس آسیا کو شاید پھر ہے کہوں نے ہارا

(میر تقی میر)

پاسے کی بدی ہے آشکارا

راجہ نلی سلطنت ہے ہارا (دیباچہ نسیم)

پکانا بھی بولنا کی طرح مستعمل ہے۔ اکبر الہ آبادی کے یہ شعر ہیں :

مذہب نے پکارا لے اکبر اللہ نہیں تو کچھ بھی نہیں

یاروں نے کہا یہ قول غلط، تنخواہ جنہیں تو کچھ بھی نہیں

(یہاں "مجھے" ضمیر مفعولی محذوف ہے۔ یعنی "مذہب نے مجھے پکارا")

جو دیکھا سانس کا یہ چکر دھرم پکارا کہ لے برادر!

ہمارے دوڑیں ہیں گن تھے تو ہائے دوڑیں پاپ خوشی میں

بھڑنا، پلٹنا، بدلنا جیسے تمہارا پیٹ نہیں بھڑا، تم نے بندوق بھری۔ اس نے

کتاب پٹی۔ میں یہ سمجھا مری تقدیر سراسر ٹٹی۔ وہ کتنی جلدی بدلا۔ اس نے

گاڑی بدل دیں لے کڑے بدلے وغیرہ۔ رونا، ہنسنا، بھٹنا کے ساتھ "نے"

استعمال نہیں کرتے جیسے وہ میرے حال پر ہویا۔ وہ بھول کر دیکھ کر ہنسا۔

باز کو ترپ بھٹا، لٹا بھڑیٹے سھڑا، لیکن رونا محاورہ میں آتے تو "نے"

استعمال کرتے ہیں، اس نے اپنا دھڑا رویا، بھٹنا اور لٹنا کے ساتھ اگر

مفعول مذکور ہو تو "نے" لاتے ہیں جیسے اس نے قلم بھٹا۔ اس نے کٹی لٹی۔

سمجھنا لازم و متعدی دونوں طرح استعمال کرتے ہیں۔ مثلاً ذوق

اور غالب کے ان شعروں میں :۔

دل شکستہ گر اس یار نے بھجا ہم کو

خط بھی جو خط شکستہ ہی سے لکھا ہم کو

وہ میری چین چین سے غم پہناں بھجا

راز کو متوب یا بریل میں عنوان بھجا

سیکھنا متعدی ہے اس کے ساتھ "نے" استعمال کرتے ہیں پھر ذوق اور

چکبست کے یہ شعر :۔

کھنا کم کم کل نے سیکھا ہے

اس کی آنکھوں کی نیم خواب سے

تری چشم نسوں گرے کہاں سیکھا تھا یہ جادو

کیا ہے اک نگہ میں لے پری سحر دل جیسا

سبق سیکھنا نہ تحافت لے تیری خود نہائی کا

لب خاموش کو دعویٰ نہ تھا رنگیں نوائی کا

مولوی عبدالحق نے اپنی کتاب قواعد اردو میں سیکھنا کو لازم بھی

لکھا ہے اور مثال میں غالب کا یہ شعر دیا ہے : (قواعد اردو ۱۵۵)

طبع و کن۔

سیکھ ہیں مری خواب کے لئے ہم متعدی

تقریب کچھ تو بہر ملاقات چاہئے

D. m. - *T. l.* - *C. l.* - *S. l.*

لیکن شاہ قاضی پروردی کسی نے نہیں کی بلکہ قذوق و غالب کی پیروی کی گئی اور اب تو پاکو۔ و ہند میں غالب ہی کا رنگ غالب ہے۔

”ہر پانوی“ مشرقی پنجاب کے راجپوتانے سے ملحق اضلاع کی زبان ہے جو اردو، پنجابی، راجستھانی، اروڑی کے مترادف ہے۔ و غامدی اگرچہ بعض نے اس کو اردو ہی کا ایک روپ بتایا ہے، مگر حقیقت یہ ہے کہ پانی پتہ کرناں اور گڑکانو سے ملحق علاقہ کی زبان اردو کا ایک روپ نہ صرف بلکہ باقی علاقہ کی زبان ہو پانوی ہے۔ ہر پانوی میں ”نے“ فاعل و مفعول دونوں کی علامت ہے۔ اس علاقہ کے رہنے والے بولتے ہیں ”بابو سی ڈاکٹر سی کی دیکھا ہے، تیندیس نے تھوڑا دودھ تو دے“ ”میر کی طرف سے“ ”بلو آیا تھا“ وغیرہ یہ استعمال راجستھانی مارواڑی کے اثر سے ہے۔

شمالی ہند، دہلی، دکن، کھنڈ اور ہریاد کی سیر کے بعد اب ہم پانی پتہ دریاؤں سے سیراب ہونے والی وادی کی طرف رخ کرتے ہیں اور یہاں اردو کی نشوونما عروج و ارتقا کا جائزہ لیتے ہیں۔ آپ نے دیکھا کہ مذکورہ علاقوں میں ”نے“ کے استعمال، ترک اور بے قاعدگی پر اچھی طرح روشنی ڈال چکے ہیں پنجاب کے باسیوں کی زندہ دلی مشہور ہے اور یہاں ادب سے لگاؤ مسلم، انشاء نے کہا تھا ”مواہل درو کو پنجابیوں نے ٹوٹ لیا“ اس میں کلام نہیں کہ ان کا کلام ہر زمانہ میں وقیع رہا ہے۔ ہماری حیرت کی انتہا نہ رہی جب ہم نے یہاں کی سیر کی تو ہمیں اردو کے آثار اسی ابتدائی زمانہ سے ملے جس زمانہ سے وادی گنگ و جمن اور دکن میں پائے جاتے ہیں۔ زبان وادی گنگ و جمن کی بنا کے مطابق ہے۔ دکن کی زبان کی مانند گنگ و جمن اور خلافت محاورہ نہیں بلکہ بہت صاف ہے۔ ان آثار کا سلسلہ بافرید گنج شکر سے شروع ہوتا ہے لیکن عہد شاہجہاں تک جو آثار ملتے ہیں وہ صحیح معنی میں ریختہ ہیں یعنی فارسی کا غلبہ ہے۔ البتہ عہد عالمگیر سے جو آثار دستیاب ہوئے ہیں وہ اردو روزمرہ میں ہیں۔ ”نے“ کے سلسلہ میں صرف نمائندہ شعرا کے کلام سے مثالیں پیش کی جاتی ہیں۔

عبدالی، علم شریعت نال کے بھیجا پاک رسول
جو کچھ بھیجا رہیں (نے) سب کچھ کیا قبول

(استعمال، ترک، مقدمہ)

ناصر علی رھندہ، سچ کے حسن کا قرآن پڑھیا ہے میں نظر کر
نہیں پائی غلط اس میں دیکھا نہ فریاد کر کر

(ترک، مقدمہ)

شاہ کا مراد، وہ نور سجن کون جس نے دیا، یہ جانچو جس کا حق نے دیا

یہ سورج ہے آپ بیبا، پر نور ہو یا مشہور ہو یا

تیرے کھڑے پر اک خال پایا جس دیکھا گھر پال کیا

یہ نقطہ ہے سیم اللہ کا، جو مصحف پر مسطور ہو یا (ترک، مقدمہ)

شاہ مراد کے زمانہ تک پنجاب و شمالی ہند میں شری سرما یہ بہت کم

پایا جاتا ہے۔ دلی کی آمد کے بعد مستقلاً اردو کی طرف توجہ کی جاتی ہے۔ پنجاب

میں ہر زبان استعمال ہوئی وہ دکن کی زبان سے مختلف ہے۔ اس کی وجہ یہی

ہے کہ گوشمالی ہند میں اردو کے ادبی آثار فارسی کے غلبہ کی وجہ سے نہیں ملے

مگر عام بول چال میں اردو کا چلن تھا جو کئی اردو سے مختلف تھی اور وہی زبان

اہل پنجاب میں رائج تھی۔ اگرچہ اہل دہلی ابتدا میں محاورہ دکن کے بھی دودھ

مگر بہت جلد اس کو ترک کر دیا۔ اہل پنجاب اس دکنی اثر سے بچے رہے کیونکہ

ان کا تعلق براہ راست دہلی کی زبان سے نہ تھا۔ تعجب ہے کہ اس دور میں ”نے“

کا استعمال بالائزام اور باقاعدہ ملتا ہے۔ چند مقدمہ شعرا کے کلام سے

مثالیں پیش ہیں۔

محمد جان، بسل ہو تڑپا ہے، سوائے کون کیا کہنے؟

کیا کام کیا دل تے بیوڑا نے کون کیا کہنے؟

میر صاحب، صابریہ بات جس کے گہی آفریں اسے

چہاں منہ سے ات گسی پائی ہو جاوے گی

نمائندہ صاحب، فرصت ندی قتلے چلا پل میں ایک پل

آیا اجل کا شہر ہر ن کے شکار پر

محمد بخش ناوی، بری ساعت اندر کیا اس نے جنگ

ہو یا قافیہ زندگانی کا تنگ

شاہ آملداد، فیض شاہ مراد سے امداد

ہم نے باندھے ہیں تختوں کی کلی

فقیر اللہ، سر کمون کا جس نے جانا

اپنے آپ کو آپ بوجھا نا

پنجاب سے ذرا بگڑ کر بھی دور میں سرحد کی سیر بھی کی گئی تھی

سرحد کے تو مندر لشکر کی خدات انجام دیتے ہوئے، دہلی اور شمالی ہند

پہنچے، شمالی ہند اور پورب میں پٹانوں کی بسیتوں سے ظاہر ہے کہ بہت

سے پٹان قبیلے ہیں آباد ہو گئے۔ مگر واپس جانے والے اپنے ساتھ اردو

لے گئے۔ شعر کا کلام بھی انہی کی وساطت سے سرحد میں پہنچا۔ یہاں کے

یہ افغانات تک میرے حافظ میں موجود ہیں۔ جنہاں اب بھٹی بجائے کوٹگا اور اس کو بمبئی کی بارود کے نام سے یاد کیا گیا تھا۔ ان کی زبان سے ہنس مکی اردو دہری جلی لگتی تھی۔ بمبئی اور اس کے قریب علاقہ میں اگرچہ گجراتی اور مرہٹی کا چلن ہے مگر اردو کا بھی سنگ چلتا ہے جو علاقائی اثر لئے ہوئے ہے۔ مگر نے کا استعمال عام بول چال تک میں ہے۔ جیسے پن نے یکام نہیں کیا؟

۱۸۵۰ء کی جنگ آزادی کے بعد جبکہ دہلی کی سرزمین مسلمانوں کے لئے تنگ ہو گئی تھی۔ اہل علم نے پنجاب کا رخ کیا مولانا محمد حسین آزاد مولانا حالی لاہور کے۔ ان کی کوششوں سے یہاں اردو کو فروغ حاصل ہوا۔ شعر و سخن کی بساط بچھائی گئی۔ مشاعرے ہوئے۔ ایک زمانہ ایسا گزرا ہے کہ لاہور، رشک دہلی و لکھنؤ، یہاں کے رہنے والوں نے شعرا و ادب کے میدان میں نمایاں ترقی کی۔ کیا بلحاظ فن اور کیا بلحاظ موضوع۔ چنانچہ خیال و موضوع کی قدرت میں ان کا در مقابل کوئی نہیں۔ جدید شعری و تحقیق زندہ دلاں پنجاب ہی کی شاعری سے عبارت ہے۔ اسی قدرت کا روی کے رشک نے اہل لکھنؤ کو ان کا لٹاف بنادیا۔ اہل دہلی اس سے بغیر جانب داسے ہے کہ جب دہلی کو حکومت کلکتہ قرار دیا گیا تو سرکاری ملازمین کی بھاری کھپ پنجاب ہی سے گئی اور انہوں نے زبان دہلی کا تہن کیا۔ مگر ان حضرات کی زبان میں کچھ علاقائی اثر بھی باقی رہا۔ جولا زمرہ نظر تھا۔ اہل لکھنؤ نے جغرافیہ شاعری کے دلدادہ رہا ہاں، ضلع جلگت کے متعلق تھے۔ اہل پنجاب کی بلند خیالی اور موضوع کی نہ رت پر رشک کیا اور زبان کی خامیاں کمال ترغید شروع کر دی۔ سب سے اگلی آبادی بھی اسی رشک کا شکار ہوئی اور علامہ اقبال کی زبان پر اعتراضات کئے۔ لیکن بہت جلد تمام اہل ہند کو اپنی شاعری کی طرز بدینی چڑی۔ لکھنؤ والوں نے بھی لگائی، چوٹی اور انجیا وغیرہ سے ہمت اٹھایا۔ خارجی امور اور ضلع جلگت کو ترک کیا۔ اب تمام ہندوستان بیان زبان کے لحاظ سے ایک ہو گیا۔ مگر اہل لکھنؤ خیال و بیان کی اس بلندی کو نہ چھو سکے جو اہل پنجاب و شمالی ہند کا حصہ تھی۔ رشک کی اسی چھٹک نے ترقی کی اور اہل پنجاب کی زبان کو مور و تنقید بنایا گیا اور اب تک وہی جذبہ کار فرما ہے۔ جوش ملیح آبادی نے قویہ روش اختیار کی کہ انہیں اپنے کلام میں جو امور قابل گرفت نظر آئے صاف لکھ دیا۔ میرے نزدیک یہ جائز ہے، میں اس کو جائز سمجھتا ہوں۔ ان کا جلدیچھا چھوٹ گیا کیونکہ ان کا شمار بھی مرزا اہل زبان میں ہوتا ہے۔ اس لئے پیشانیوں پر ہلی پڑ کر رہ گئے اور محافضین کچھ نہ کر سکے۔

اس منزل پر پہنچ کر ہم بڑے سکون و اطمینان سے ایک امر کا جائزہ

ہاں سند سے پشتو کے علاوہ اردو میں بھی اظہار خیال کرنے لگے۔ ابتدائی دور کے چند شعرا کا کلام دستیاب ہو چکا ہے۔ نے کے ترک و استعمال کی مثالیں ملاحظہ ہوں۔

آفریدی: میں یا رکنے قاصد بھیجا تو ہے پر شاید
بے نامہ اگر آیا، پیار ہے اور میں ہوں (ترک، مقدم)
دل کو دروں سے میگی راہ ہم نے نہ تھا وہادہ
کچھ بھی تو کہیے نگاہ، پیش کرم، جو ہو سو ہو
جید ساری: جب طور پر پوئی لے انوار محمد کو
دیکھا تو کہا حاشا، جو تو ہے وہی میں ہوں
ریاض: لکھا ہے وصف میں کسی بے نیاز کا
موقع ملا ہے خوب مست کم نماز کا
دلی والوں کے بھی اشعار سنے ہیں نے
پر ریاضی قرا انداز سخن کیا کہنے

میر جگر کے بعد سندھ کے ریگزار کی بھی کیوں نہ سیر کی جائے؟
ہیں وادی ہیران میں صرف ایک شاعر کا سرخ ل سکا اور وہ ہیں سچل مرست۔
ان کے کلام پر تصوف کا گہرا اثر ہے۔ نے کا ترک و استعمال ان کے کلام میں بھی موجود ہے۔

یہ درد مجھ کو جانان اب بے خبر کیا ہے
مجرد میرے دل کو اس اک نظر کیا ہے (ترک، مقدم)
اتنی بے نیازی دلبر نہ کر سچل سے
اس کی گلچ میں تم نے اکثر زکر کیا ہے

پاک و ہند کے علاقہ میں ذرائع آمد و رفت و نشر و اشاعت میں آسانیاں ہو گئیں، اردو ہر جگہ بولی اور سمجھی جانے لگی۔ غالب کے خطوط سے ان کے شاگردوں کے حالات پر کافی روشنی پڑتی ہے۔ بنگال، کاٹھیاواڑ، بمبئی، ملتان وغیرہ کا ذکر ان میں پایا جاتا ہے۔ گویا اسی زمانہ سے ادبی زبان دہلی جو دہلی کی تھی۔ سیاتس سرحدی کا شعری اسی کا موڑ ہے۔ لیکن عام بول چال کی زبان بھی اردو ہی کا ایک روپ تھی۔ سرحد، بنگال، بمبئی، مدراس وغیرہ کے علاقوں میں چلیے تو اردو کا سکھ چلتا نظر آتا تھا۔ مگر اس میں اور ادبی زبان میں کافی فرق ہے۔ مسلم لیگ کی نشاۃ ثانیہ کے بعد جب قائد اعظم صد منتخب ہوئے اور انہوں نے ہندوستان کے شہروں کا دورہ فرمایا تو انگریزی کے علاوہ کلمہ گاہ اردو میں بھی تقریر فرمایا کرتے تھے۔ چنانچہ ان کی تقریر کے

لینے کی کوشش کرتے ہیں۔ ہم نے دکن، لکھنؤ، دہلی، پنجاب، سرحد اور سندھ میں گھوم پھر کر ”نے“ کے استعمال کا جائزہ لیا جس کا نتیجہ یہ ہے کہ شمالی ہند میں ”نے“ کا ترک قریباً بے گمبے قاعدگی نہیں۔ دکن میں بے قاعدگی در ترک قدیم زبان میں ہے موجودہ ادب میں نہیں۔ لکھنؤ میں ترک دہلی قاعدگی کی مثالیں اب تک ملتی ہیں جس کو ہم گوارا کر لیتے ہیں لیکن جب اسی طرح کی کوئی بے قاعدگی اہل پنجاب سے سرزد ہوتی ہے تو اہل زبان کو سخت ناگوار معلوم آتی ہے۔ آخر کیوں؟ حالانکہ اہل پنجاب کی غلطیاں زیادہ تر بول چال تک محدود ہیں، لکھنے پڑھنے میں بہت کم ہیں۔ ڈاکٹر محمد دین تاثیر نے جب لکھا، ”تو نے الفت مجھ سے کرنی ہے تو کر میرے لئے“

ایک قیامت آگئی، ادھر سے ادھر تک ایک آگ لگ گئی، بحث شروع ہوئی اور کوئی فیصلہ نہ ہو سکا۔ اہل پنجاب کی غلطی عام ہے بلکہ کہا جاسکتا ہے جب سے اس علاقہ میں اردو کا رواج ہوا، اسی وقت سے غلطی بھی ہے۔ بڑی فتح محمد انندھری نے اپنی کتاب منہاج القواعد میں اس غلطی کے متعلق لکھا ہے۔ (منہاج القواعد صفحہ ۳۰ وغیرہ) ڈاکٹر تاثیر نے مولانا سائلک سے غلطی کو صحیح ثابت کرنے کی تدبیر بھی پتی تھی۔ وہ کہتے ہیں:

”تاثیر کی شاعری میں جدید و قدیم کا نہایت لطیف امتزاج پایا جاتا ہے۔ ابتدائی غزلوں میں ان کا مخصوص رنگ تو موجود ہے لیکن بعض مقامات پر زبان خلاف محاورہ ہو گئی ہے اور کہیں کہیں فن کے تمامحات بھی پائے جاتے ہیں۔ میں ہمیشہ انہیں ان باتوں پر توجہ کا کرتا تھا۔ لیکن وہ ہنس کر مثال دیا کرتے تھے۔ کیونکہ آجکل کے ادیبوں اور شاعروں کی خوددانی کا کچھ اثر ان میں بھی تھا۔ یعنی غلطی کرتے تھے جان بوجھ کر کرتے تھے، اور پراس کی صحت پر اصرار کیا کرتے تھے۔ ایک کا ذکر ہے، مجھ سے کہنے لگے: ”سائلک صاحب! کیا ہم نے جانا ہے، ہم نے کرنا ہے، لکھنے درست ہے؟ میں نے کہا، خلاف محاورہ اہل زبان ہے۔ مجھ کو جانا ہے اور مجھ کو کرنا ہے درست ہے۔ کہنے لگے: میں نے اپنی تکریروں میں متعدد بار اس قسم کے فقرے لکھے ہیں۔ اگر کوئی اہل زبان اعتراض کرے تو اس کا کیا جواب دوں؟ میں نے کہا، غلطی کا جواب کیا ہوگا؟ صاف

کہئے کہ مجھ سے غلطی ہو گئی۔ ہنس کر کہنے لگے: نہیں میں صرف اس لئے پوچھ رہا ہوں کہ ایسا جواب دے سکوں جو دنیا پر معقول ہو۔ میں نے کہا بھائی غلطی کو حق نہ جانتا ثابت کرنے کے لئے جو جواب دیا جائے گا وہ محض سخن طرازی اور سبکدوشی ہوگی۔ کہنے لگے: کچھ بھی ہو آپ اس کا جواب مجھے بتا دیجئے۔ میں نے کہا آپ یہ کہئے کہ ”نے“ علامت فاعلی ہے اور ”کو“ علامت مفعولی۔ اگر جانتے، کافاعل ”میں“ ہے تو اس کے بعد ”نے“ ہی درست ہے ”کو“ کیونکہ اگر درست ہو سکتا ہے۔ سن کر اچھل پڑے اور کہا، بس ٹھیک ہے اب میں جواب دے دیا کروں گا۔ میں نے کہا، شوق سے دیجئے، لیکن محاورے کا اعتراض قواعد سے اور قواعد کے اعتراض کا جواب محاورے سے دینا اصولی سانیات سے درست نہ ہوگا“ (ڈاکٹر تاثیر، ص ۲۲)

اہل پنجاب کی اردو خدمات سے انکار کرنے کی جرأت کسی میں نہیں۔ نشر و اشاعت، شعروادب میں ان کا مقابلہ مشکل ہے۔ اردو پر ان کا بھی حق ہے اور تقسیم ملک کے بعد تو ان کا بیچن اور بیچن خانن ہو جاتا ہے پس جس طرح ہم نے اہل لکھنؤ کی غلطیوں کو صحیح قرار دے لیا اور گوارا کر لیا اسی طرح اہل پنجاب کی غلطیوں کو مولانا سائلک کے بیان کی روشنی میں مستثیات کے ذیل میں بیان کر دینے میں کوئی قہاحت نہیں۔ لیکن اس کے استعمال کا بھی ایک اصولی مقرر کر لیا جائے۔ میرے خیال میں یہ قاعدہ بنالیا جائے کہ جب مصدر را دہ فعل کے اظہار کے لئے استعمال کیا جائے، اس کا تعلق خواہ ماضی سے ہو یا حال سے یا استقبال سے تو علامت فاعل ”نے“ استعمال کر لینے میں کوئی مضائقہ نہیں جیسے۔ میں نے لاہور جانا تھا، میں نے لاہور جانا ہے۔ تم نے لاہور جانا ہوگا۔ ہماری مندرجہ بالا تجویز سے یہ نہ خیال کر لیا جائے کہ ”میں نے لاہور جانا ہے“ ہمارے نزدیک صحیح ہے یا ہم اس کی صحت کے لئے وجہ پزیر کر رہے ہیں۔ ایسا ہو کر نہیں ہے بلکہ یہ ہمارے نزدیک کلیتہً غلط ہے، ہم نے صرف رواداری اور دلیری کی خاطر یہ تجویز پیش کی ہے۔ مولانا سائلک نے اس محاورہ کی غلطی بتلایا ہے مگر یہ اہل زبان کے روزمرہ بول چال ہی کے خلاف نہیں بلکہ محض قواعد بھی غلط ہے۔ اسی طرح پنڈت جرجہ بن دتا نے یہی کہتی ہے کہ میں غلطی کو جائز قرار دینے کی کوشش کی ہے۔ مجھ کھل جانا ہے ”کو کھالیت

اہل پنجاب اس غلطی کا شکار کیوں ہیں؟ جب اس کا مریخ لگایا جاتا ہے تو یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ پنجابی میں ”نے“ علامت فاعل اور ”نوں“ علامت مفعول ہے کہیں کہیں ”نے“ بھی بطور علامت مفعول استعمال کر لیتے ہیں۔ ہیر وانیٹ کے ان اشعار میں ”نے“ کا استعمال غور طلب ہے۔

ایس بند نے شاہ فقیر کیے، روٹی ٹیٹے نے وقت دہانیاں نو
نیرتس مہین کیے، کٹھے کر بلاوے شہانیاں نوں
بچہ دہوں نے رب نوں یا کرنا، انہیں شق نوں بہت لالوئا
ایس شق داوے پانا یاہا، جی جان تے سیس گواؤ ناں
دس لڈا کا لیا لڈہناوے، سٹسے پٹنگ نوں کس خراب کیا
ساڈی بھگے کون سوالیوں، میرا کچھ نہ ادب آداب کیا
کچھ بے کم دے کا نہ سٹاندا، آبا بھئی کر تو ت دکھانے نوں
دانت بندل واسطے گھیا میں آ بیٹھا عیش اوڈانے نوں

شعروں کے مصرع اول میں ”نے“ علامت فاعل اور ”نے“ بمعنی ہیں ”ہے“ مصرع ثانی میں ”حق“ حسین نے غنیمت کی ”ہونا چاہئے“ ترک میں ہے فاعل کی ہے شعر صلا میں بطور علامت مفعول ہے اور استعمال بھی مصدر کے ساتھ ہے شعر ست میں ”نے“ مقدم ہے یعنی ”کس نے خراب کیا“ ہے شعر نکل میں بطور علامت مفعول بمعنی کے لئے ہے۔ ”نوں“ ہر جگہ علامت مفعول ہے پس اہل پنجاب جب اس قسم کے جملے بولتے ہیں تو ان کے تحت اشعار میں پنجابی روزمرہ ہوتا ہے اور لا شعوری طور پر بیجا ختم۔ پنجابی روزمرہ کی یہ رویہیں ”اس نے لاہور جانا ہے“ بول جاتے ہیں۔ یعنی ”ایں نوں یس نے لاہور جا وٹلائے“ تحت اشعار سے ابھر کر لا شعوری حالت میں ”اس نے لاہور جانا ہے“ بن جاتا ہے پس یہ نہ پنجابی روزمرہ کے مطابق ہے اور نہ اردو روزمرہ کی پیروی ہے اس لئے اس سے احتراز واجب و لازم ہے۔

اہل زبان اس غلطی سے بیزاری کے اظہار میں شدت اختیار کرتے ہیں۔ شدت اظہار کے تدوین میں اہل پنجاب غلطی کا ازالہ کرنے کے بجائے اس غلطی کی صحت پر اڑ جاتے ہیں۔ یہ افراط و تفریط، احساس بہتری اور شعور کسری کے نتائج ہیں اس لئے اہل زبان کو چاہئے کہ اس غلطی کو گوارا کر لیں اور اسے دور کرنے کی مناسب تدبیر جوچیں۔ زندہ دلائی پنجاب کو اپنی زندہ دلی کا ثبوت اس طرح دینا چاہئے کہ اس قسم کے جملے بولتے وقت اصول اور روزمرہ کو پیش نظر رکھیں، تحت اشعار لا شعور کی حرکات کا شکار نہ ہوں شعور کو بیدار کریں اور غلطی سے احتراز فرمائیں ۵

مجھ پر اور میں نے لاہور جانا ہے؟ کو بجا است اختیار کی درست خیال کرتے ہیں، دو جواز میں حالت جبر کو مفعولیت سے اور حالت اختیار کو فاعلیت سے متعلق جانتے ہیں۔ ان کے نزدیک مستقبل کی حیثیت عموماً خبر پر ہو اکتی ہے۔ اس لئے انہوں نے جو قدر کی قید لگا کر ”نے“ کے استعمال کو جائز قرار دیا۔
”کیفیت“ ۱۶۵، ۱۶۶

لیکن وہ فعل کو کیسے نظر انداز کر گئے ہیں ”نے“ علامت فاعل ہے اور فاعل فعل کو چاہتا ہے۔ فعل ثابت ہونے پر استعمال درست ہو سکتا ہے۔ نیز میں نے لاہور جانا تھا کا تعلق ماضی سے ہے۔ اس کے لئے کیا وجہ؟ قراردی جاسکتی ہے؟ اس پر پور بھی کتنی صاحب نے غور نہیں کیا پس جہاں میں کدو بچویر کہ ارادہ فعل کے اظہار کا موقع ہو تو اس قسم کے جملے استعمال کر لینے کو مستحق میں شمار کرنا چاہئے، ہر پہلو سے مناسب ہے۔ اس بولانا ساکھ اور پندٹ کتنی کے بیانات کے مقابل میں غلطی کے وجہ ملاحظہ فرمائیے۔

جانا، لکھنا، پڑھنا مکنا وغیرہ فعل نہیں ہیں بلکہ مصدر بھی اور مصدر میں ام ہوتا ہے۔ اس لئے اس کا استعمال اسم کے مطابق ہونا چاہئے۔ اسم جملہ فعلیہ میں فاعل اور مفعول ہوتا ہے اور جملہ اسمیہ میں مبتدا اور خبر۔ جملہ فعلیہ میں مصدر الیہ اسم اور مصدر فعل ہوتا ہے جیسے احمد آیا، رشید خط لکھتا ہے۔ جملہ اسمیہ میں مصدر اور مصدر الیہ دونوں اسم ہوتے ہیں۔ ان کے ساتھ فعل ناقص مل کر جملہ کی تکمیل کرتا ہے جیسے رشید دھمیں ہے۔ احمد کو بخار ہے وغیرہ۔ ”میں نے لاہور جانا ہے“ جملہ فعلیہ اس لئے نہیں کہ جانا ہے ”ہے“ مصدر ہے۔ فعل نہیں ہے بلکہ ”جانا“ مصدر (اسم) اور ”ہے“ فعل ناقص۔ پس ”نے“ علامت فاعل کو بغیر فعل کے استعمال کرنا غلط ہے۔ لہذا یہ جملہ فعلیہ نہیں بلکہ جملہ اسمیہ ہے۔ جملہ اسمیہ کے لئے اصول مسلمہ ہے کہ علامت فاعل ”نے“ استعمال نہیں ہوتی بلکہ علامت مفعول ”کو“ استعمال ہوتی ہے۔ جیسے رشید کو کھانسی ہے ضمیر فاعلی تھا تو استعمال کر لیتے ہیں جیسے میں خوش ہوں تو غلغل میں ہے، تم کامیاب ہو، وغیرہ مگر ”نے“ کے ساتھ استعمال نہیں کرتے۔ البتہ ضمیر مفعولی ہوتی ہے۔ جیسے مجھے کتاب کی ضرورت ہے۔ تجھے دو اپنی ہے وغیرہ۔ پس ”میں نے لاہور جانا ہے“ اصول مذکورہ کی روشنی میں غلط ہوا۔ اس کی جگہ مجھے لاہور جانا ہے“ درست ہے۔ اساتذہ اعلیٰ غلطی کو کرتے آئے ہیں، مومن اور غالب کے یہ اشعار ہیں

کوئے دشمن میں جا پکڑتا کیوں کیا مجھے شرمسار ہوتا تھا؛
جملہ بے خودی سے ہے مومن توڑنا ہم کو شیشہ تل کا
دائے دیوانگی شوق کہ ہر دم مجھ کو آپ جانا اور دناپ ہی حیراں ہونا

علمی اصطلاحات کے اردو ترجمے

(لسانی اصطلاحات کی روشنی میں)

ڈاکٹر شکیلہ سبزواری

اصطلاح ہے۔ تحلیل زبان کا عام لفظ ہے۔ تلفظ، کلمہ، مجموعہ، مجموعہ، اصطلاحیں ہیں۔ ان کے لفظی معانی ان کے اصطلاحی معنوں سے مختلف ہیں۔ تقسیم، یا معنی، انحراف، ترمیم، تحریر، ترسیل، اولی، ثانوی، جز، عمل عام استعمال ہونے والے الفاظ ہیں۔

مختلف علوم و فنون کی اصطلاحوں میں فرق کرنا ازیں ضروری ہے۔ تاکہ ایک فن کی اصطلاحیں دوسرے فن کی اصطلاحوں میں گڈمڈ ہونے نہ پائیں۔ مثلاً تمثیل (ALLEGORY) منطق کی اصطلاح ہے۔ قوس (SEGMENT) اساس یا قاعدہ (BASE) ریاضیات کی اور استعارہ (METAPHOR) علم بیان کی۔ انہیں لسانیات کی اصطلاحات میں شامل ہونا نہ چاہئے۔ صوتیات، اشتقاقیات، صرف و نحو لسانیات کے اہم بنیادی شعبے ہیں۔ تحریر یا رسم خط کا بھی کچھ تعلق لسانیات سے ہے۔ ان علوم و فنون کی اصطلاحات کو فرہنگ اصطلاحات لسانیات میں جگہ دی جاسکتی ہے۔

اصطلاح کی تشریح و تعیین کے بعد ترجمہ کا مسئلہ سامنے آتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ ترجمے میں کس زبان سے مدد لی جائے؟ کراچی پونی ورسٹی کے شعبہ ترجمہ کے فاضل ارکان کی رائے ہے:

”اصطلاح سازی میں عربی، فارسی، ترکی، ہندی، سنسکرت اور ان تمام زبانوں سے مدد لی جائے جو ہماری زبان کا جز ہیں۔“

علمی اور فنی اصطلاحوں کا اردو میں ترجمہ کرنے سے پہلے یہ طے ہو جانا چاہئے کہ اصطلاح کسے کہتے ہیں اور اس کے کیا معنی ہیں۔ تاکہ سب (ALL) بعض (SOME) اور دلچسپی (INTEREST) جیسے زبان کے عام الفاظ جو زبانہ بات چیت میں ہر تہہ جاتے، قہریم کی تحریر تصنیف میں جگہ پالتے اور ہر مقام پر ان کے وہی ایک معنی مراد لئے جاتے ہیں، فرہنگ اصطلاحات میں شامل ہونے نہ پائیں۔ اصطلاح کے لفظی معنی ہیں اتفاق لیکن عرف عام میں وہ مصطلح یعنی متفق علیہ کے معنوں میں مستعمل ہے۔ ہم اصطلاح اس لفظ کو کہتے ہیں جس کے کسی خاص علم فن میں لغوی معنی سے الگ کوئی مناسب معنی، یا عام اور متعدد معانی میں سے کوئی ایک معنی متعین کر لئے جائیں، اور اس علم و فن کی متداول کتابوں میں وہ لفظ اپنے اس مخصوص معنی میں عام طور سے مستعمل ہو۔ مثلاً ”حرف“ کے معنی ہیں ”کنارہ“۔ اگر ارمیں حرف ایک کلمہ ہے جس کے معنی مستقل نہ ہوں۔ ”تہ“ کے معنی ہیں ”جائنا اور سمجھنا۔“ دینیات میں فقہ دین یا شریعت کا جائنا ہے۔ لغت میں یہ لفظ عام تھا، اصطلاح میں خاص کر لیا گیا۔

ہونٹ، دانت، تالو، موڑھا، حلق، حنجرہ وغیرہ الفاظ کو لسانیاتی اصطلاحات میں شمار نہیں کیا جاسکتا اس لئے کہ یہ زبان کے عام الفاظ ہیں۔ بول چال میں ان کے وہی معنی ہیں جو علم الاعضاء و تشوہجہا میں ہیں۔ ”لہوی“ ایک آواز ہے جو ”ہا“ یعنی کھسکے کی مدد سے ادا ہوتی ہے۔ یہ اصطلاح ہے۔ خود ”ہا“ کوئی اصطلاح نہیں۔ اسی طرح تحلیل

لے ملاحظہ فرمائیں زبان و علم زبان کا ضخیم اصطلاحات اس مقالے میں جو مثالیں پیش کی گئی ہیں وہ تمام فرہنگ اصطلاحات فلسفہ و طبیعیہ اصطلاحات سے ماخوذ ہیں۔

لے ملاحظہ فرمائیں فرہنگ اصطلاحات فلسفہ شائع کردہ شعبہ تالیف و ترجمہ کراچی پونی ورسٹی۔

اور پیچھے نہ پائیں گے۔ جیسے،

اجنسیائی (۱ + جنس + یائی) بازو دھرائی (بازو + دھرائی)
چکرا اصوات (چکرا + اصوات) بصوت نامت (صوت + نامت)
مورت نگاری (مورت + نگار + ی) اھکاری (۱ + اھکار + ی)
کراچی یونیورسٹی کے ارکان شعبہ ترجمہ و تالیف نے ایک طرف
یہ تسلیم کر لیا ہے کہ اصطلاح زبان اور فن کے لحاظ سے موزوں ہو۔
دوسری طرف یہ فرماتے ہیں:

”مقصور ہو تو ہندی الفاظ کے ساتھ عربی فارسی کا جو راور
سابقہ لاحقہ لگائے جائیں“

سوال یہ ہے کہ ہندی الفاظ کے ساتھ عربی فارسی جوڑنے کے بعد
کیا کوئی اصطلاح زبان کے لحاظ سے موزوں ہو سکتی ہے؟

انسان کی طرح زبان کا بھی مزاج ہوتا ہے جس کا منبع اصطلاحات
کے وقت بہر حال خیال رکھنا چاہئے۔ عام لول چال کے الفاظ پر
تو کسی کا اجارہ نہیں۔ جو لفظ عوام کی تکسالی سے چل نکلا وہ رائج آؤ
سکہ ہے۔ اصطلاح سازی البتہ اہل علم کا کام ہے۔ یہ ان کے اختیار
میں ہے کہ وہ زبان کے مزاج و منہاج کی مناسبت سے اصطلاحیں
وضع کریں۔ اصطلاح میں جو غفلت اور ایک طرح کی گمبھیرا ہوتی ہے
اس کا تقاضا ہے کہ اصطلاحی الفاظ حقوقی لحاظ سے موزوں، قواعد زبان
کے مطابق، بناوٹ میں بھاری بھر کم اور دلالت معنی کی رو سے مناسب
ہوں۔ بہر چند فارسی الفاظ کے آخر میں نسبت کی ”ی“ لاحق کر کے تہذیبی
بزاری جیسے الفاظ عام طور سے اردو میں وضع کئے جاتے رہے ہیں لیکن
مستند علمی زبان میں فارسی الفاظ پر ایسے نسبت کا اضافہ ثقافت
کے خلاف ہے۔ جیسے خردی (خود + ی) پہلونی (پہلو + ی) لمبی (لب + ی)
دوبلی (دو + لب + ی) وغیرہ۔ اور ان وضع کردہ الفاظ پر عربی کی

”ہ“ داخل کرنا یا حدیث ہندی الفاظ پر ”ی“ بڑھانا ایسا ہے جیسے کرنا
اور نیم چڑھا مثلاً جوڑی جوڑی (جوڑ + ی) تالوی (تالو + ی) دشت
بیٹھکی (دانت + میٹھک + ی) تالویہ (تالو + ی) خرمیت (خرد + ی) دہ

عربی سے لے جاتے یا فارسی سے اصطلاح کو کم سے کم زبان کے
صرفی عمومی قاعدوں کے مطابق ہونا چاہئے۔ لہا (= کو) بھٹی (= بھٹی)
معنی (= مفہوم) عربی زبان کے الفاظ ہیں۔ عربی گرامر کے مطابق لہا
سے اسم منسوب ”لہوی“ بنتا ہے۔ لہاتی“ غلط ہے۔ عقی سے عقیقت

سنسکرت سے مدد لینے کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔ سنسکرت
ہماری علمی زبان نہیں۔ ہم سنسکرت نہیں جانتے۔ ہماری زبان سنسکرت
کے تہذیبی مزاج اور اداس کی سرشت سے نا آشنا ہے۔ سنسکرت کے ترجمے
ہمارے یہاں دس دس دس کیے گئے بغیر منقسم ہندوستان میں اردو کی
گزشتہ سات سو سال کی تاریخ میں سنسکرت کے علمی و تہذیبی الفاظ اور
کوساز گار نہ ہوئے تو پاکستان میں سنسکرت زبان کی علمی اصطلاحیں
کس طرح اردو میں جرہ پڑ سکیں گی۔ فارسی سے البتہ مدد لی جاسکتی ہے
لیکن فارسی برصغیر کے مسلمان کی تہذیبی زبان رہی ہے علمی اصطلاحات
کے بار کی شاید ہی وہ متحمل ہو۔ علمی زبان کے لئے جس نوع کی ثقافت،
سنجیدگی، متانت اور بھاری بھر کم پر درکار ہے وہ صرف عربی میں ہے۔
عربی دنیا نے اسلام کی علمی زبان ہے۔ ہر خطے کے مسلمان نے اس سے
استفادہ کیا اور اس کے علمی ذخیروں سے فیض اٹھایا۔ اردو کے لئے
عربی کی وہی حیثیت ہے جو انگریزی کے لئے لاطینی کی ہے۔ اردو میں عربی
کے سوا کسی اور زبان کے اصطلاحی الفاظ کے رچنے بچنے اور گھل مل جانے
کی گنجائش مجھے نظر نہیں آتی۔ دو ایک مثالیں پیش کرتا ہوں۔

”LANGUAGE“ کا ترجمہ زبان خاصا بھلا معلوم ہوتا ہے لیکن
”LINGUISTIC“ کا ترجمہ زبانی (بجائے لسانی) شاید ہی پسند
کیا جائے۔ ”DENTAL“ کا ترجمہ ”سنائی“ دندان سے زیادہ ثقہ اور
”LATERAL“ کا ترجمہ ”مخوف“ (= حرف یعنی پہلو کی طرف) اہل
سے زیادہ با معنی اور پر وقار ہے۔

گردان، بولی، وغیرہ فارسی ہندی ترجمے اردو میں رائج ہو چکے
ہیں۔ یہ باقی رکھے جاسکتے ہیں۔ فارسی اردو کے رائج ترجموں کو چھوڑ کر باقی
تمام اصطلاحات کے ترجمے عربی کی مدد سے ہونے چاہئیں۔

اس سلسلے کا ایک اور رجحان جسے غیر منقسم ہندوستان میں
ہمگ دبار لانے کا زیادہ موقع ملا ہے یہ ہے کہ عربی ہندی یا فارسی ہندی
کے میل ملاپ سے اصطلاحیں وضع کر کے الفاظ و اصطلاحات کی گویا
مستند قومیت کا ڈول ڈالا جائے۔ یہ رجحان علمی اور ادبی نقطہ نگاہ سے
مستحسن قرار نہیں دیا جاسکتا۔ لفظوں کو جوڑنے اور دو مختلف زبانوں
کے الفاظ میں پیوند لگانے کے لئے ان میں صوتی مناسبت اور ایک طرح
فرمانی ہرما ہنگی ہونی چاہئے تاکہ مرکب الفاظ گھل مل کر ایک ہو جائیں
اور زبان پر بار اور کٹوں کو ناگوار نہ ہوں۔ انمل جڑے جڑوں گے،

DEDUCTION اور METAPHYSICS اپنی اپنی جگہ واضح ہوں تو اس کی ضرورت نہیں کہ METAPHYSICAL DEDUCTION کا ترجمہ بتایا جائے یا DEDUCTION اور CATEGORY کے ترجمے کے بعد DEDUCTION OF CATEGORY کا ترجمہ کر کے ہندی کی چندی کی جائے۔ یہ طویل لاطائل ہی نہیں تحصیل حاصل بھی ہے۔

فرسنگ اصطلاحات میں درز کا قانون، گوم کا قانون، گراس میں قانون، قانون ہار، ہالینڈی شکل جیسی ترکیبیں نظر آتی ہیں تو حیرت دلزا دامن کو کھینچتی ہے کہ خدا یا ایہ کس قسم کے ترجمے ہیں اور ان کا اصطلاح سا سے کیا تعلق ہے! قانون اور شکل کا ترجمہ کرنے کے بعد یہ کیا ضرورت تھا کہ درز، گوم، گراس میں، ہار اور ہالینڈی وغیرہ علمائے فن کے ناموں کا طرف اضافت کے بتایا جائے کہ اس طرح مرکبات بناؤ۔

غیر ضروری مرکبات کے ترجموں کی کچھ اور مثالیں فرہنگ اصطلاح فلسفہ و لسانیات سے انتخاب کر کے لکھی جا رہی ہیں۔

فلسفہ لغت، فلسفہ قانون، لغت سائنس، منطقی تجربیت، معروضی اخلاقیات، آلائی قدر، ماورائی تصویریت، ماورائی فلسفہ، ماورائیت، منطقی نحو، ترکیبی حکم، تجربی صورتیات، صوتی جدول، کلام کماہاؤ، گولایا ہوا مصوتہ، بند مصوتہ، کھلا مصوتہ، مصوتہ کی تدریج، مصوتہ کی ہم آہنگی، وسطی مصوتہ، ہم جملی مرکب، جوڑا جوڑی مرکب، تائیگی لسانہ، تقابلی لسانیات، توضیحی لسانیات، موسیقانہ (موسیقینانہ) الجبر۔

یہ درست ہے کہ فن کی جو اصطلاحیں قدیم سے رائج چلی آ رہی ہیں انہیں برقرار رکھا جائے۔ لیکن ان میں موزوں و ناموزوں اور مفید غیر مفید کی تفریق مناسب نہیں۔ قدیم سے جو اصطلاحیں چلی آ رہی ہیں ان کا تبادلہ میں عموماً برتی جاتی ہیں، اور زبان میں اچھی طرح رس بس گئی ہیں وہ عموماً ہی نہیں مفید بھی ہیں، زبان میں گھل مل گئی ہیں اس لئے موزوں ہیں ہر شخص آسانی کے ساتھ ان کا مطلب سمجھ لیتا ہے اس لئے مفید ہیں، موزونیت و افادیت کا معیار یہ ہے کہ اصطلاح زبان میں گھل مل کر اس جز میں جلتے اور اس کا مفہوم سمجھنے میں کسی کو کوئی دقت پیش نہ آئے مثلاً NASAL کا ترجمہ غنہ اردو میں عام ہے ہر شخص اسے جانتا ہے۔ منفی ترجمہ مقابلہ میں یہ موزوں بھی ہے۔ اور مفید بھی NASALISCAL کا مفہوم کہیں گے۔ انقباضی ناماؤس ہے۔ LATERAL طرف مخزن کا ترجمہ رہا صفحہ ۱۴۰ پر

دحق + ی + ہ) تو ہو سکتا ہے عفت درست نہیں۔ معنی کی طرف نسبت کی جائے تو معنوی بنے گا اور اس پر ات بڑھا کر معنویات (SEMANTIC) کہیں گے۔ معنیات (معنی + ات) یعنی بہت سے معنی بے محل بھی ہیں اور بے معنی بھی۔ حد کبریٰ اور حد صغریٰ قواعد نحو کے اعتبار سے غلط ہے۔ حد کبر اور حد اصغر چاہئے۔ فنون صغیر کی جگہ "فنون صغیرہ" صحیح ہے۔

اصطلاحات عموماً مفرد ہوتی ہیں۔ جہاں تک ممکن ہو مفرد اصطلاح کا ترجمہ مفرد لفظ سے کیا جائے۔ مرکب اصطلاحیں بھی ہیں لیکن کم۔ یہ دو طرح کی ہیں۔ کچھ ایسی ہیں جنہیں آسانی کے ساتھ ایک لفظ میں منتقل کیا جاسکتا ہے۔ انہیں ایک سے زیادہ لفظوں میں منتقل کرنا درست نہیں خصوصیت سے اس صورت میں کہ ان کے ہم معنی مفرد اصطلاحیں پہلے سے رائج ہوں جیسے: MINOR PREMISE، MAJOR PREMISE یا

MINOR TERM اور MAJOR TERM پہلی دو اصطلاحوں کا ترجمہ مقدمہ کبریٰ اور مقدمہ صغریٰ کی جگہ صرف کبریٰ، صغریٰ اور بعد کی اصطلاحوں کا اکبر (بجائے حد کبر) اصغر (بجائے حد اصغر) ہونا چاہئے۔ جن اصحاب نے عربی زبان میں منطق پڑھی ہے وہ جانتے ہیں کہ منطق کی متداول کتابوں میں صغریٰ، کبریٰ، اصغر، اکبر وغیرہ اصطلاحیں عام طور سے استعمال ہوتی ہیں۔ حد واسطہ کو اہلیت تنہا اوسط نہیں کہتے اس لئے MIDDLE TERM کا ترجمہ حد واسطہ ہو سکتا ہے۔ کچھ مرکب اصطلاحیں ایسی بھی ہیں جنہیں ایک لفظ میں آسانی منتقل نہیں کیا جاسکتا۔ جیسے: PHONETIC، VOCAL، DECAY وغیرہ۔ انہیں مناسب مرکبات کی شکل میں منتقل کیا جائے۔

ان کے علاوہ جن مرکبات کو اصطلاح کی حیثیت حاصل نہیں ان کے اجزا کا اولاً الگ الگ ترجمہ کرنا اور پھر جوڑ کر بصورت ترکیب اردو میں منتقل کرنا طویل لاطائل ہے۔ بہتر یہ ہے کہ مفردات یعنی اجزا کا ترجمہ کر دیا جائے۔ اس کے بعد فارسی کی ذہانت پر اعتماد ہو جب اس کے سامنے دو لفظوں کا کوئی جوڑ آئے تو حسب ضرورت زبان کے مقررہ قاعدوں کے مطابق اسی قسم کا ایک مرکب ڈھال لے مثلاً LAW اور POLARITY کا ترجمہ اگر فارسی کو معلوم ہے تو PHONETIC کے معنی بتا دئے جائیں تو کے ترجمہ کی ضرورت نہیں PHONETIC کے مطلب نکالا جاسکتا ہے۔

نوائے دوش

(دسے باہل معنی ہمنشین ہاشم)

جمیل نقوی

خوشتر آں ہاشم کہ مرزا دلیران - گفتہ آید دوحیدیت دیکھائی - یہ تر دلیلاں - نوائے دوش - کہ چھ میں اہم محمد علی قطب شاہ کے مرتبہ پر عید گیلانی
یہیں میں شام ہریرا راستہ کوئی ہیکل ادا میں پیش کیا گیا تھا۔

سلام اے ترکاں، بھاگیا نگر کے خسرو بانی
ترے سر تاج زر تھا، بہت میں انگشت سلیمانی
محمد قطب شہ، قطب معانی، ظل سبحانی
او شعراں کوں ٹرس بھی چلیکیاں ہو محمد نڈاں سو
اب اشعار کوں چھوٹیں توں جوڑیں، کچھ خوش داناں سے
ہوا تھا سب کشف تنہا کتاباں پوچھتے حق تھے
معبر ہر عود و مشک و زعفران بچہ دوت پایا تھا
اچھوں دن دن مبارک عید تل تل جشن سب راتاں
محمد کا غلامی بچہ خطاب سر بندی تھا
دسے جیون دھرت پٹھان سے ہیں لپا کے قدیاں سرگ ل
نقارہ بچے زبیر پٹھان سے ہیں لپا کے قدیاں سرگ ل
چمک تھے تیری مجلس کی سورج، چند اختران حیران
"ملائک نور و رسن کے، محلاں باند درپن کے
ننھی، لالہ، پیاری، ساوئی، کنولی، سجن حیدر
چرن سرخوش، چلن سرخوش، ہلن سرخوش، ڈلن سرخوش
چندم سرخوش، نقارہ سرخوش، ہلن سرخوش، ڈلن سرخوش
دسے فانوس کے درمیاں تھے جوں جوت دلیرے کا
نقارے

کہ بچ دربار کے نقشاں میں حیران تھا مانی
ترے قدر پر بہا تا تھا شہا جلا عروسانی
ازل تھے بچ کوں بخش تھا خدا کے شعر سلطانی
تمارے وصف کہنے تھے ہوا بچ منکر نورانی
سبق لینے کو آداں تا سنگل ملاں دبستانی
اسی تھے باس تیرا جگ میں کرتا تھا گلستانی
خدا تاج بخت دولت کا دیا تھا بخت شامانی
ترے سر پر دسے منج کوں چھلا جھل تلج سلطانی
بلندی تیرے محلاں کی انہر کی لوح پیشانی
چلن پگ پگ بھولیا، خوشیاں دیکھت گردن گردانی
نقارہ پگ پگ بھولیا، خوشیاں دیکھت گردن گردانی
دیکھت تال فرش رتن کئے کئے کھن گواہ افشانی
عجب پایا تھا سکیمیاں چند رکھ، نس کیس، لاشانی
پنکھی جیواں کے مرغولیں دیکھت چل بل اوستانی
دکھن کی سندریاں کے نیچ کیا جب جلوہ ارزانی

نزاکت شعر کے فن میں خدا بخشا تھا توں تاج کوں

معانی شعر تیرے کہ یا ہے شعر خاقانی

بدستِ جبا

”نصیحتِ کثرت، یادگیر و در عمل آرزو“

(حد در پاکستان کا اربابِ قلم کو پیغام)

میں گلڈ کے چوتھے سالانہ اجلاس کے لئے جو لاہور میں منعقد ہو رہا ہے، اپنے دلی جذباتِ تبریک پیش کرتا ہوں۔

گلڈ کے نام میرے سابقہ پیغامات اور اُس کی عملی اعانت اس بات کا کافی ثبوت ہیں کہ مجھے آپ حضرات کی فکری و فنی سرگرمیوں اور پروگراموں سے کس قدر گہری ذاتی دلچسپی ہے، بالخصوص اس امر سے کہ آپ کو اظہارِ رائے کی آزادی حاصل رہے۔ اس لئے میں یہاں اب اُن امور کو دہرانا نہیں چاہتا۔

نظریہ پاکستان کو بنیاد ٹھہرائے ہوئے ہم کس طرح آپس میں پوری پوری یکجہتی پیدا کریں؟ یہ ایک ایسا مسئلہ ہے جس سے ہم بدستور دوچار ہیں۔ خبر نہیں وہ لوگ جن کا اس معاملہ سے سروکار ہے، اس مقصد کو جلد از جلد حاصل کرنے کے لئے واقعی پوری پوری کوششِ عمل میں لارہے ہیں یا نہیں۔

بہرِ نوع، اس باب میں اہل قلم پر سب سے زیادہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔ آج ہم گونا گوں معاشری خرابیوں سے بھی دوچار ہیں، جن کو محض قانون کے زور سے دور کرنا ممکن نہیں۔ ان کی وسیع پیمانہ پر بے چینی کی ذمہ داری بھی آپ لوگوں ہی پر عائد ہوتی ہے۔

ہمیں آئندہ نسلوں کو یہ کہنے کا موقع نہیں دینا چاہئے کہ ایک آزاد اہلِ عظیم قوم کو تعمیر و ترقی کا کیسا عمدہ موقع ہاتھ آیا اور اس نے اُسے کھو دیا۔ آپ لوگوں کے ہاتھ میں تاریخ کو مونوں سانچے میں ڈھالنے کے لئے ایک زبردست آلہ موجود ہے۔ آپ کا قلم — اسے سب سے پہلے اپنے وطنِ عزیز کی خاطر کام میں لائیے۔

کیسے؟ یہ آپ مجھ سے بہتر جانتے ہیں۔

آپ حضرات کو ہمیشہ میرا کامل تعاون حاصل رہے گا۔

ہدیہ گرامی : وزیر اعظم لبنان، ہذا یکسیلنسی رشید کرا
کی طرف سے صدر پاکستان کی خدمت
قرآن مجید کے ایک نادر نسخہ کی پیشکش



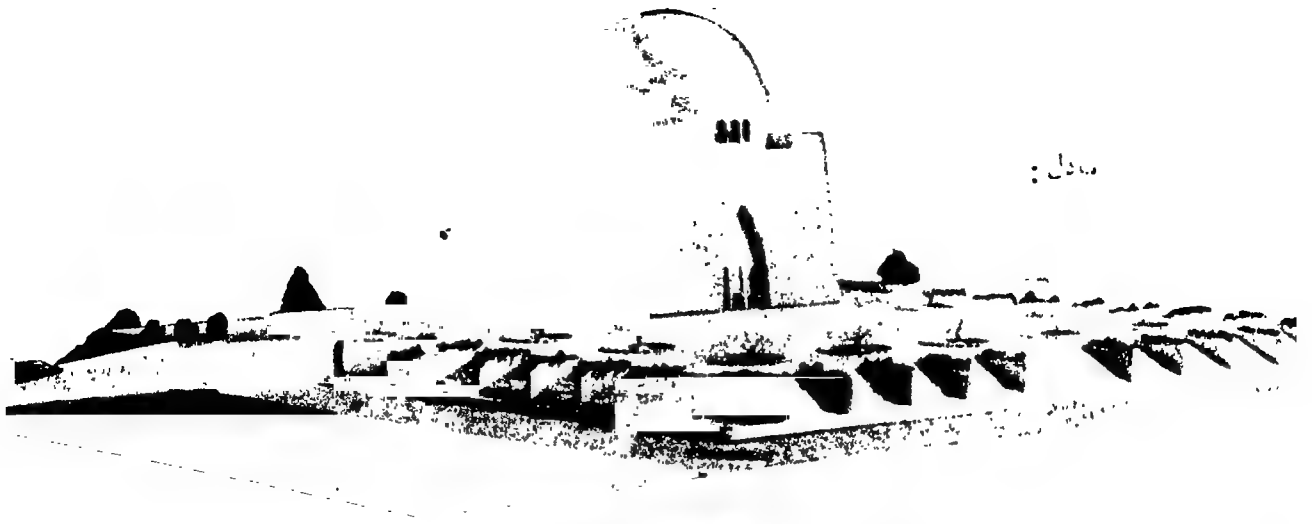
ترقی تعلیم : جامعہ تعلیم ملی (ملیر، کراچی) کے
دسویں سالانہ اجلاس سے خطاب



! نالسانی فضائیہ کے کالج (رسالبور)
میں تکمیل تربیت کی بریل

ترقیات : میدو شریف (سوات) میں ترقیاتی منصوبوں کا جائزہ



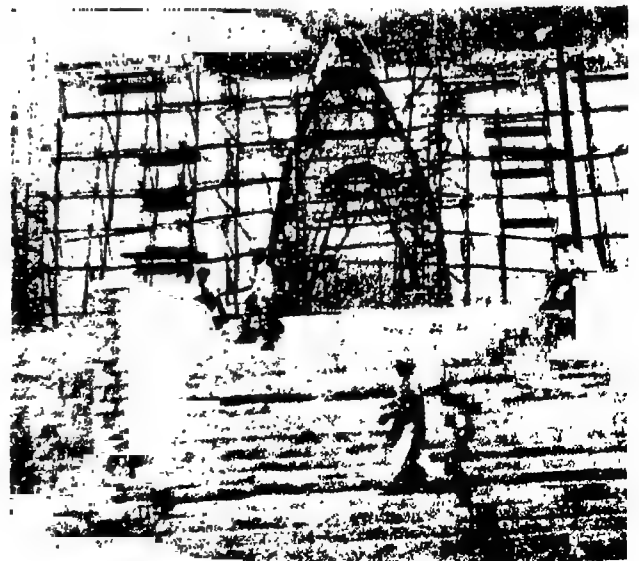
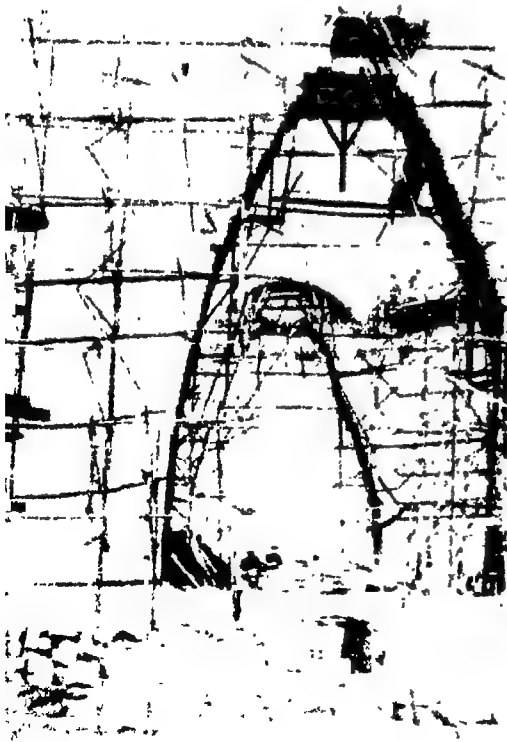
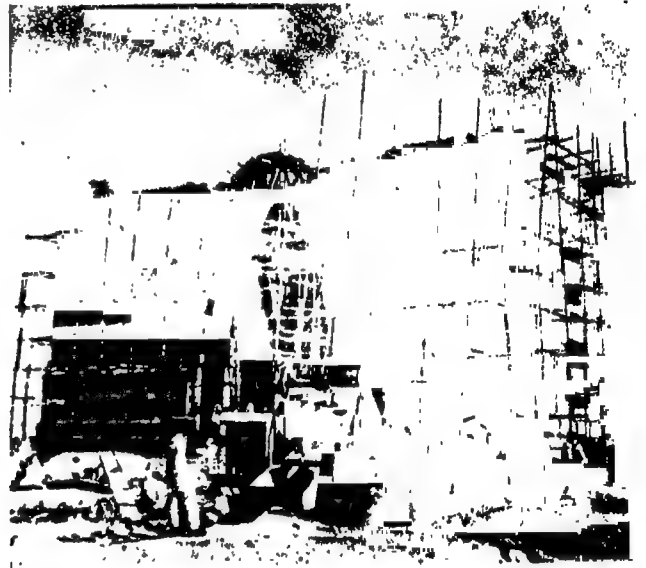


مسجد :

قائد اعظم رح کا مقبرہ

رفتار تعمیر : چند پہلو

قائد اعظم رح ۵ ماہرہ جو اسلامی عمارت اور
جدید فنی تقاضوں کے مضامی تعمیر ہو رہا ہے
اور غنیمت ہائیکہ فی کو پہنچ جائے گا۔



بہارتازہ

(انجمن مصنفین پاکستان، چوتھا اجلاس : لاہور)

صدر اجلاس دوم : جسٹس سہارا احمد خان

پیغام خصوصی : صدر پاکستان، فیڈرل مارشل محمد ایوب خان

اہم نکات : صدر پاکستان :

— ادیب کی ذمہ داریاں اہم ہیں۔

— ادیب تاریخ گر ہیں۔

— ادیبوں کو اپنا قلم ملک کی شیرازہ بندی، اصلاح مناسلوں، تہذیب و ثقافت کے کاروں کے لئے وقف کرنا چاہئے۔

— صدر اجلاس : ادیب ایسی چیزیں لکھیں جنہیں پڑھ کر دل میں حب الوطنی کا احساس اور اپنی ثقافت سے لگاؤ پیدا ہو۔

— اہل ثروت کو چاہئے کہ وہ آگے بڑھ کر ادب کی سرپرستی کریں۔

— تلمذ اللہ شہاب : گلڈ کی ترقی نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ اختلافات کو نظر انداز کر کے ہر لوگوں پر اتحاد میں ممکن ہے۔

— گلڈ نے مشرقی اور مغربی پاکستان کے درمیان فکری و جذباتی اتحاد و یکجہالت پیدا کر دی ہے۔

— ملک میں ہنر و کلا کی کاپی رائٹ ایکٹ نافذ کر دیا جائے گا جو ہمارے اہل قلم کے تمام جائز حقوق کی بوجہ احسن اور نئے نوٹوں پر حفاظت کرے گا۔

اردو : آرم جی ادبی انعام : جعفر طاہر (نظم) "ہفت کشور"
خدیجہ مستور (ناول) "آگن"

ہنگالی : قاضی عبدالمنان : "ہنگلا ادب کا تنقیدی جائزہ اور مسلمان"

شوکت عثمان : (ناول) "کرنا داسر باسی"

علاقائی زبانیں : (پنجابی) سائیں فیروز دین

محمد آصف خان

افضل احسن

جج : احمد ندیم قاسمی

رضا ہمدانی

منو بھائی

ایک اور ادبی انعام : عظیمہ : جناب احمد داؤد (صدر داؤد صنعتی گروپ)

۱۹۶۳ء : (پچیس ہزار روپے سالانہ برائے ادب، مشرقی و مغربی پاکستان)

...کہ نہ دیکھا کہ کوئی

ایک نقاش کوئی جلوہ آتشیں مشاہدہ کرتا ہے اور اس کی حکما کا کلمے کے لئے مناسب انتظام کرتا اور سرسری ملاحظہ کرنے کے بعد وہ کھلیا ہوا ہے۔
اس امر کو اپنا ہجست چھین لیتا ہے تاکہ صرف حقیقت یا منتظر ہمیشہ معقوت نظر آئے۔ یہ ایک تصویر خوب سے خوب تر کی جو کمال اس میں جانی رہی ہے۔

شیریں — جو گیا — لوبانی
 لٹ لٹ شعلے جبرٹ جبرٹ
 سیندھوڑی سیندھوڑی — مرغولہ مرغولہ !
 لو دیتے بچاک ، دیکھتے ، بہاتے
 گھونگھر گھونگھر بجلیاں !
 جوت ہی جوت طلائی باف
 عشق بیچاں ، حسن بیچاں
 گنتی گنتی بیلریاں ، گندمی گندمی
 بڑھتی چڑھتی تو بر تو !
 تہہ در تہہ شکر فی الاؤ — طور کلس !
 ناربو، نو کوں کا لد او — ہو نفس !
 کرنیں پیوستہ پیوستہ ، شعلے جبستہ جبستہ
 بیچاں بیچاں ، دستہ دستہ
 جیتی جاگتی پرافشاں
 سلف لاٹ جولا
 اطلس لاخ الحمرا
 محجرا گمبرا ، لال مھابی
 آگن ستوں ، تانجنیکی لاٹ
 لالہ لالہ گردۂ روشن
 سورج کمی سب الہ مالہ

پُورب اور اُجالا
 گردہ ہو بہو ہالہ ہالہ
 عین دہی انگڑائی جولا
 عین دہی بل کھاتی تار

 اے ذوق نگہ، اے ذوق نغز
 اے ذوق تجسس، جوش جنز
 کونے رنگ، کونے رنگ؟
 اچھوتے، البیلے، انجانے، ان چھانے، انمول
 ان دیکھے، کھوارے، نیارے، سچے سچے
 کھرے کھرے، بھڑے بھڑے
 رنگ انوکھے، رنگ انوپ!
 کیسری، خرمئی، عستانی
 گیر دا، عنبر ہی، زرنجی
 شہسوی، فاسفی، صہبائی
 ٹھکڑی، فاختی، سرخانی
 لال بھوکا دینا رہی
 خون سیاوش خونِ جگر
 رتانی — روحانی — رتانی
 کونے رنگ، کونے رنگ؟

پریت پربت، صحرا صحرا، وادی وادی
دریا دریا، ہموں ہموں، گردوں گردوں

علین دہی، علین دہی
سدا بیرن رتنار

جس سے وہ نسبتاً حقیقت روشن، وہ سنجوگ

موئے قلم؛ عکاس؛ —

سوئے قلم اک سنبلیں جاوے
 ریختے ہزاروں کائی کائی
 کرفوں سے باریک، ہمائی
 نارنجی فانوس نضائی
 لمبے اشراقی، سینائی

یہ بال تشنہ رہے پن کی نگن
کیا کج گئی بھگتی بوگ آسن
کیا چلے، تڈ پالیں ہرس
جیون پائے شہرہ ہروشن
جیوتی ہی جیوتی من در پن
سب جو گیا جو گیا تن کیامن

بہوں برسوں بیت وصال
یہی دھیان، ہو گیاں اور گن کا دھن
یونہی پشت میں اک اوندھا مہرا
بنا، موتے ہوتے ویسپ کنول

ہیرا گیتی ہوئے ہوئے

نزل نزل، سنگی سنگی

ہر ایک کنول گد را گد را

لٹ چنچل چنچل جوتی سی

اک لال بیھوکا روپ کنول

تیکسی مخروطی و دہکتی لویں

ایسی شدہ و جنگ ہر اک پتی

اک شعیبہ سنہرے پن میں رچی

رشت چور، کرومی، کچناری

سب بانگی سنہری مدھ ماتی

بہتی پتی مدر مدر

آن بہ آن اور حکام بہ حکم

برق بخاہیں انفیہار

پھیلاتی ہوئی دامن پہ دامن!

نندی دیتی ، دھوپ سرپ

تل کی بالو، سنہری روپ

کندن کی کلنار و ہک

پت جھڑکے سٹولا سے پتے

سیٹے سنہری تار نظر

سنگاپوری بید کے تنکے شفق سنہری سحرں والے

شہرِ قریاں مہربانی، پھیل چل ڈوریاں ٹھعیاں بہروں کی

زری کرشمے تانتا تانتا

چلتی تنکے بال برا برگند حکم میں سو شوب دے

جاپانی نذر تار شبیہوں کی زرکاری کرن کرن

زردوزی لچھے روغن کے

جملہ موم سفیدہ نارنجی

مانند ترجیح پرویزی

پیلہ ریشم، یہ دانے۔ کھل سنہرا نخل نخل

دینہ جو مسر کنواری

حکمت و حکمت تاراہی

آپ سنہری، تاب سنیلی

ریت پہ رنگتی رنگتی جوت کی بل کھاتی زنجبنتی لہریں

پانی پانی تیرے آتی

مقناطیسی حلقے، توسیں، خط درخط اور لہر لہر

سوریج کی زرتادہ شعاعیں، سانورے چندا کی چمپا

دردِ دل چاند۔۔ سنہری تسلی کی باریک ہالیں میں نہیں

بیوتی لہروہ کا کہشاں کی، اس کی ہوائیاں جو بہری راگھ

برق شعاعیں ٹیل اسٹاری، تاب بہ تاب

سب اور دن رات مسلسل کئی جتن اور کئی خیال

سوں تجربے لامتناہی، محمل محمل رنگ تلاش

سوہو روپ سے رنگ لے اک ایسا مثالی رنگ

۱۰ فیضانِ عین ہے روشنی ہے بکھم کہ انہی برس ہے غلامِ یاسر کی

مرغولہ، آتش رنگ ابھرا
آن انگ برنجی انگارہ
ہر انگ نرت مدرا مدرا
فورانہ پنچھی پر کھولے
کرنیں ہی کرئیں پر تولے
اور جھاڑ ہی جھاڑ ہمسکڑا سا
چندھیانا کائنات سینائی
وہ آن اک آن اک پوپر پوپر
پھٹتی — جوتی ٹہنی ٹہنی
ہراتی، تلتی، جھکتی ہوئی
بل کھائے، پھرے اپلی گہلی
مہاجال طلسمی پھیلاتی !

اب ٹکڑ ہوا ہے کیسا سے کیا
اب نور ہی نور ہے، نور ہی نور
یہ ہاتھ، یہ ہاتھ، یہ فن ہی فن
استاد جگت استادوں کے
فن کار ہیں جو فن کاروں کے
”کھل سم سم“ جن کی پوروں کی
اک عام فرائے سحرنا

ان ہاتھوں کے پاس یہ — نور ہی نور — اب آنکھوں میں
اور — دور ہی دور، اب دور ہی دور! — اب آنکھوں سے

جو بال سنہری پن کی لگن
دہی بال رو پہلے پن کی لگن
اب ہاتھ نہیں سینے تو ہیں
اب آنکھیں نہیں ہیں دل تو ہے
اے ذوقی نظر، اے ذوقی طلب
اے ذوقی نور، اے جذبہ فن !

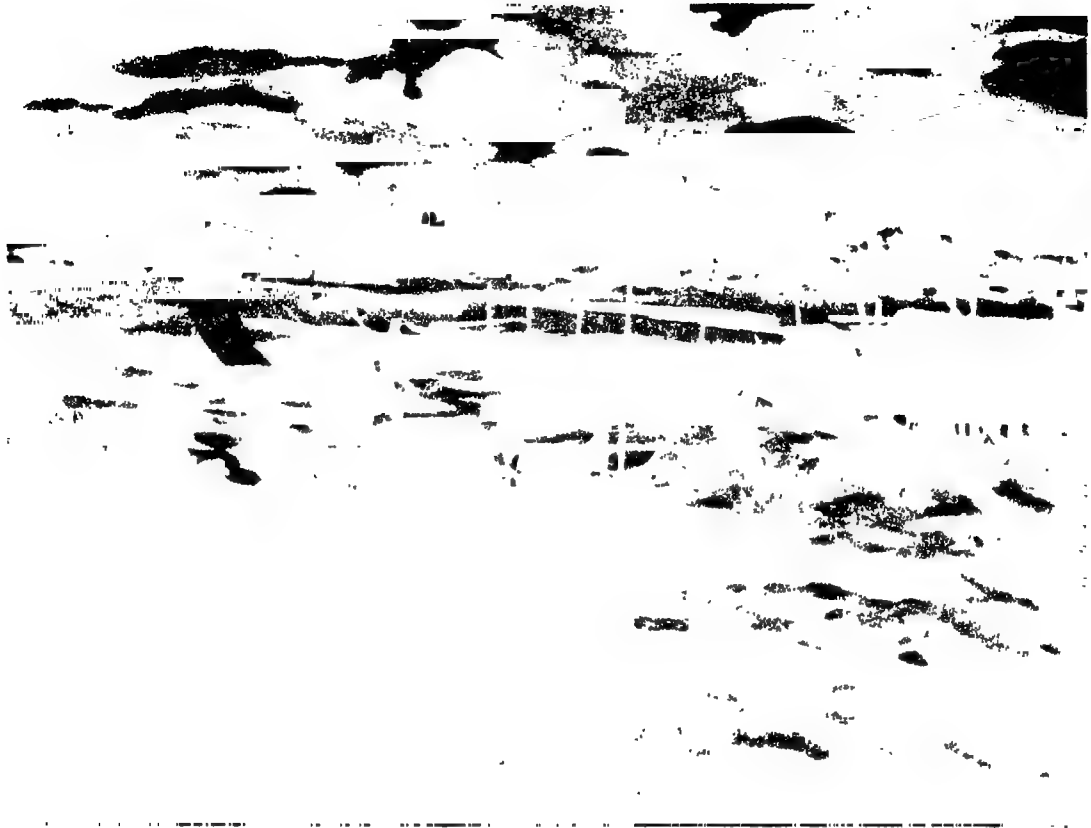
*

ہر کنول کٹورا روپ بھرا
لو، اور کٹوڑے، اور کنول !
ہر لمحہ ہر ہر آن سچل
کھلی پتی پتی کھاؤ زباں
فانوسوں کی شمع ہی شمع دویں
ہر اوندھا مہرا، شبہ تارا
یوں سلسلہ دار اوپر نیچے
سب برف آلود چنار کھڑے
جھیلوں میں روپ دکھاتے ہوئے
چندل کے گلوڑا چاندنی میں
تاوں میں دوالی سی چسپا۔
یورپی کلا دھیان میں جگ پر جگ
تب کلا کا جاکر درس ملا
تب کلا کا پورا روپ کھلا
جاگ اٹھا جسا دو سینے کا
برسوں میں ریاض کے گلشن میں
نکل تاب سنہری پھول کھلا
دیکھ کا الاؤ طور نما

وہ بال سنہری پن کی لگن
دن دی بڑھتی چمن چمن پڑھتی
دہی بال رو پہلے پن کی دھن
ہر آن بھڑکتی اور لگن

اب آخر کار — اب آخر کار
وہ رنگ بنا، وہ روپ کھلا
سانچے میں ڈھلا پستلا دل کا
سیارہ بجلی کی صورت
وہ جس کا روپ سنا بڑتی
سیمائے افق پر کوند گیا

لہ بڑھاپا ۷۰ پورا ۷۱ بے شمار



نقاش: شعیب احمد

”نو ۵“ (مشرقی پاکستان)

انصار اور مہاجرین پر اپنا رحم فرمائے

یہاں ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آنحضرتؐ نے مکان مسجد کے لئے کس نوع کی تعمیر کا فیصلہ کیا تھا؟ ایک بات تو صاف ظاہر ہے اس تعمیر میں اور اس وقت کے دیگر عرب مکانات میں کوئی فرق نہ تھا بلکہ آج بھی حجاز و مشرق وسطیٰ کی دُور دست آبادیوں میں عرب مکانات اسی وضع کے نظر آتے ہیں۔ مسجد کا پلین، یا نقشہ اس طرح کا بنایا گیا تھا جو حضورؐ کی ضرورتوں کے مطابق ہو، یہ ضرورتیں اسی تھیں جو قبل ازیں موجود تھیں۔ یہ عمارت ۸۰x۷۰ ذراع تھی، شکل میں قریب قریب مربع۔ تین طرف تین دروازے لگائے گئے تھے۔ عمارت میں کئی حجرے تھے جو ساتھ ساتھ بنے ہوئے تھے۔ صحن کے درمیانی حصہ میں مسجد تھی جس سے عام کمرے ملحق تھے۔

یہ عمارت ہجرت کے دوسرے سال صفر کے مہینے میں بن کر تیار ہوئی۔ اگرچہ سمت قبلہ حضورؐ انورؐ کے قیام مدینہ کے ۱۶ویں مہینے میں شمار کیا کوئی الہی کے مطابق تبدیل کر دی گئی تھی مگر اس سے قبل سمت قبلہ بیت المقدس کی جانب تھی۔ اس تبدیلی کا حکم الہی عین حلالہ نماز میں آیا اور حضورؐ نے اسی وقت سمت بدل لی تھی۔ ابن عمار کے قول کے مطابق آنحضرتؐ نے اپنی مسجد کی تعمیر دومرتبہ کرائی۔ پہلی بار اس وقت جب حضورؐ ہجرت کر کے مدینہ تشریف لائے، دوسری بار جب خبیثہ فح ہوا۔ اس وقت بھی صحن میں اضافہ کیا گیا تھا۔ عمارت کی تعمیر میں حوالہ سالہ لگایا گیا تھا وہ بالکل سادہ تھا۔ کھجور کے تنے، دھوپ میں نکھائی ہوئی اینٹیں، عام ملنے والا پتھر وغیرہ۔ یہ سب سامان مدینہ کے بازاروں میں عام بکنا تھا۔ یہی اطلاع ہے کہ دھوپ کی تیزی سے بچنے کے لئے دیواروں قبلہ کی طرف ایک منظرہ دھتھر بھی کھجور کے تنوں اور ٹیلوں کی مدد سے بنادیا گیا تھا۔ اس بات کا دوسرا مطلب یہ نکلا کہ کھراب کے نزدیک ایک ایوان بھی وجود میں آچکا تھا۔

حضرتؐ کی وفات گیا ربیع سن ہجری میں ۱۲ ربیع الاول کو حضرت عائشہؓ کے حجرہ میں واقع ہوئی اور حضورؐ کو وہیں دفن کیا گیا۔ اگلے بعد حضرت ابوبکر صدیقؓ مسند خلافت پر جلوہ افروز ہوئے اور ان کا انتقال تیرہویں سن ہجری میں ہوا۔ لیکن مسجد کے نقشے اور عمارت میں خلیفہ اولؓ حضرت ابوبکرؓ کے عہد تک کوئی تبدیلی نہیں ہوئی اور انہیں بعد وفات آنحضرتؐ کے ہی پہلو میں دفن کیا گیا۔

حضرت عمرؓ کے عہد میں مسلمان حقوق مدعی و دائرہ اسلام میں

بنا کھڑا تھا۔ ہر ایک ملحق تھا کہ وہ اس کے گھر پر تشریف لے چلیں۔ مگر حضورؐ نے فرمایا کہ میری ادنیٰ کو چھوڑ دو، اسے حکم مل چکا ہے۔ اونٹنی نے اپنے گزرنے اس مقام پر چھکا لی جسے قرینہ یعنی کھجور کھانے کی جگہ کہا جاتا ہے۔ یہ زمین دہقانوں، سہل و سہیل بن عمرؓ کی ملکیت تھی مگر اونٹنی پھر آئے بھی اور اس جگہ ٹھہر گئی یہاں سے حضرت ابوالیوب، خالد بن زید انصاریؓ کا مکان بہت ہی نزدیک تھا۔ حضرت ابوب انصاریؓ نے لگے بڑھ کر حضورؐ کا سامان اترنے کی برکت حاصل کی اور اسے لے کر اپنے گھر میں رکھا۔ حضورؐ نے انہی کے ہاں قیام فرمایا۔ ان دونوں بیویوں سے اس قرینہ کو خرید لیا گیا جس کی خاطر خواہ قیمت حضرت ابوبکرؓ کی معرفت ادا کر دی گئی۔ پھر آنحضرتؐ نے فرمایا کہ یہاں ایک جگہ ایسی بنائی جائے جو بادشاہ اور مسجد دونوں کا کام دے سکے۔ جب تک یہ تعمیر مکمل ہوئی آنحضرتؐ نے حضرت ابوب انصاریؓ کے مکان پر ہی قیام فرمایا۔

مسلمانوں نے اس مسجد کی تعمیر میں پورے ذوق اور دلولہ سے حصہ لیا۔ ان کی ہمت افزائی اور مساوات کے خیال سے خود حضورؐ صلعم نے بھی آگے بڑھ کر ہر ایک کام میں حصہ لیا۔ مہاجرین اور انصار دونوں ہی اس کام میں برابر شریک رہے۔ ذوق و مسرت کی ایک دالہانہ فضا طاری تھی اور عالم کیفیت میں ساتھ ساتھ یہ ترنم الفاظ بھی دہرا رہے تھے:

نحن المسلمون بنی المصید

لا عیش الا حین الاخوۃ

اللہم ارحم الانصار والمہاجر

رحم مسلمان ہیں۔ ہم مسجد بناتے ہیں۔ ہمارے لئے

سوائے آخرت کے اور کوئی زندگی نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ

ہجرت کے جہاں نے پہلے ایک جو کام

تعمیر مسجد تھا خدا نے انام تھا

اک قطعہ زمیں تھا اس کام کے لئے

واقع میں ہر لحاظ سے سوزوں تھا

وہ قطعہ زمیں تھا تیروں کی ملک خاص

ہر چند قبر گاہ و گذر جا و مسام تھا

چاہا حضورؐ نے کہ یہ قیمت خرید لیں

ان کے مریوں سے کہا جو پیسہ تھا

مطلق

المسجد الاقصیٰ (میت المقدس) اور مسجد نبوی۔

حضرت عثمانؓ کے بعد مدینہ مرکز خلافت نہ رہا اور مسجد نبویؐ میں بھی کوئی اور تبدیلی یا توسیع ۹۱ ہجری (۶۷۰ء) تک رونما نہ ہوئی تھی کہ اس سال حضرت عمر بن عبدالعزیزؓ نے انجاس وقت مدینہ کے عامل (گورنر) تھے، مسجد نبویؐ اور نبوی تعمیر کرنے کا اہتمام کیا۔ حضرت امام بخاریؒ (۲۵۴ھ/۶۶۶ء) نے حضرت عثمانؓ کے عہد خلافت تک کی مسجد نبویؐ کی تفصیل اس طرح بیان کی ہے:-

حضرت رسول خداؐ کے زمانہ میں یہ مسجد دھوپ میں سکھائی ہوئی اینٹوں سے بنی تھی اور اس کی چھت پر درختوں کی شاخیں لکھی گئی تھیں۔ اس کے ستون کھجور کے تنوں کے تھے۔ حضرت ابوبکرؓ نے اس میں کوئی اضافہ نہ کیا۔ حضرت عمرؓ نے اس کی توسیع کی۔ اس تعمیر میں بھی دھوپ میں سکھائی ہوئی اینٹیں لگائی گئی تھیں اور درختوں کے تنے بھی استعمال کئے گئے تھے۔ انہوں نے لکڑی کے ستونوں کو بھی دوبارہ بنوایا تھا۔ بعد میں حضرت عثمانؓ نے بھی اس میں کچھ تبدیلیاں کیں۔ انہوں نے ہی اس کی دیواریں تراشیدہ پتھروں اور چرنے کی بنوائیں۔ نیز تراشیدہ پتھر کے کمرے بھی گڑھوائے۔ چھت میں ”سگین“ لکڑی لگوائی گئی تھی۔“

بعض نے یہ بھی لکھا ہے کہ حضرت عثمانؓ نے جو تعمیر کرائی تھی اس میں پتھر استعمال نہیں کئے گئے تھے بلکہ پکائی ہوئی اینٹیں لگائی گئی تھیں۔ مگر یہ بات محقق ہے کہ یہ حضرت عثمانؓ ہی تھے جنہوں نے خلیفۃ المسلمین کی حقانیت کے خیال سے عوام سے تمناؤں کا ایک مقصود بنوایا۔ اس مقصود کا مقصد یہ تھا کہ حضرت عمرؓ کو جس طرح مسجد میں شہید کیا گیا تھا اور اس طاعنہ مسجد نبویؐ اسی طرح کے کسی اور قورمہ کا مقام نہ بن جائے۔ اس مقصود میں ایک راہ بھی کھلی رکھی گئی تھی تاکہ مقتدی حضرات امام جماعت کو بخوبی دیکھ سکیں۔ جب حضرت عمر بن عبدالعزیزؓ نے اموی خلیفہ، حضرت یزید بن عبدالملکؓ کے حکم سے مسجد نبویؐ کی اور نبوی تعمیر کرائی تو اس مقصود کی تعمیر لکڑی کی کر دی گئی (۹۱ھ/۶۷۰ء) (وقام الوفا باخبارنا والمصطفیٰ سنہ ۱۱۰۰ مطبوعہ مصر ص ۱۱۰ جلد ۱)۔

داخل ہو رہے تھے۔ دنیا کے ہر ملک سے لوگوں کی مدینہ میں آمد و رفت جاری تھی اس لئے مسجد نبویؐ اور اسے نماز کے لئے ناکافی ثابت ہو رہی تھی، اس لئے انہوں نے مسجد میں توسیع کا اہتمام اپنے ذمہ لے لیا۔ ان کے حکم سے مسجد کا طول ۱۴۰ اور عرض ۱۲۰ ذراع تک وسیع کر دیا گیا۔ پشت کی دیوار دو یا تین ذراع تک پیچھے ہٹائی گئی، دروازے بھی چھ کر دیئے گئے۔ ان میں سے دو قبلہ کی دائیں طرف رکھے گئے تھے اور دو بائیں جانب۔ باقی دو دروازے شمال کی دیوار میں تھے۔ انہوں نے ہی عجمی مسجد میں نیکوں کی چٹانیاں پھرائیں جو اسی عقیق میں تیار ہوئی تھیں۔ حضرت عمرؓ کو بھی ان کے انتقال کے بعد (۲۳ھ/۶۴۴ء) حضرت ابوبکرؓ اور حضورؐ کے پہلو میں دفن کیا گیا۔

حضرت عمرؓ کے بعد حضرت عثمانؓ نے مسند خلافت پر جلوہ گر ہوئے۔ اسلام اس وقت چار دانگ عالم میں پھیل چکا تھا اور اسے بڑی قوت و شوکت حاصل ہو چکی تھی۔ اس لئے بڑی ضرورت تھی کہ مرکز خلافت کو شایان شان طریق پر بنایا جائے جس سے اسلام کی سر بلندی اور شوکت و عظمت کا اظہار بھی ہوتا کہ کراہی پر اسلام نے جو پیغام حق پہنچایا ہے اور کثرت دین متین کو جو سطوت و جلالت نصیب ہوئی ہے اس کا بدیہی مظہر بھی عوام و خواص کے سامنے آتا رہے تاکہ جنتیں بلند ہوں اور جذبہ ایمانی تازہ ہو۔ دو سدا راہ عثمانؓ خاص کر بنی امیہ۔ اس بات کے بچہ خدایاں تھے کہ مرکز و مسند خلافت کو جاہ و جلال کا مظہر بنایا جائے۔ ان حضرات کبار کا حضرت عثمانؓ پر بڑا اثر تھا۔ غرض اس قسم کے ہی تقاضے تھے کہ حضرت عثمانؓ نے اپنے عہد خلافت کے چوتھے سال مسجد نبویؐ کے صحن کی دیواریں ٹھنڈی کر کے اطراف مسجد کو اور بھی وسیع کرایا یعنی ۱۶۰ × ۱۵۰ ذراع تک۔ مگر حضرت عمرؓ کے زمانے کے چھ دروازے بدستور موجود رہے۔ حضرت عثمانؓ کا دور خلافت (۳۵ھ/۶۵۵ء) میں ختم ہو جاتا ہے اور ان کے بعد حضرت علیؓ بن ابی طالبؓ مسند خلافت کو زینت بن گئے ہیں۔ سیاسی مصلح کا تقاضہ تھا کہ انہوں نے مرکز خلافت مدینہ سے کوئٹہ میں منتقل کر دیا (۳۶ھ/۶۵۶ء)۔ لیکن میری اپنی رائے یہ ہے کہ اس طرح مدینہ النبیؐ کو جو سرکاری اہمیت حاصل تھی اس کی ایک تبدیلی رونما ہو گئی، اس واقعہ سے قطع نظر آنحضرتؐ کا روضہ مبارک اور مسجد عبادت و زیارت کا محبوب مقام بھیگیں نہ اور تاقیامت ہے گا۔ کیونکہ حضورؐ نے فرمایا ہے کہ تین مقامات کا حرم سفر کرنا۔ مسجد الحرام مکہ،

میں نہ دیا مناد کا، آنحضرتؐ نے خود جو مسجد تعمیر کرائی تھی اسکا کوئی ریشہ نہ یعنی اذان کی جگہ تعمیر نہیں کرائی تھی جہاں سے گھر سے ہو کر اذان کے ذریعے مومنوں کو نماز کے لئے آئے کی عام اطلاع (باوازی بلند) دی جا سکے شروع دور اسلام میں پہوان دین حق بغیر کسی اذان کے ہی فریضہ صلوٰۃ ادا کرتے تھے مگر جب اذان کا حکم آیا تو حضورؐ نے حضرت بلالؓ کی طرف دیکھ کر فرمایا: بلال! اٹھو اور مومنوں کو صلوٰۃ کی طرف بلاؤ! یعنی بخاؤ (قید) کی ایک صورت کے بیان پر ابن اسحاقؒ سے مروی ہے:-

”مدینہ میں جتنے گھر مسجد نبویؐ کے آس پاس بنے ہوئے تھے میرا گھر ان سب میں اونچا تھا اور بلالؓ نماز فجر کے لئے اسی گھر کے اوپر چڑھ کر لوگوں کو صلوٰۃ کی طرف بلاتے تھے۔ یہاں سے سب کو آسانی کے ساتھ اطلاع ہو جاتی تھی۔“

جب آنحضرتؐ ہجرت کے ساتویں سال مکہ تشریف لائے تو انہوں نے حضرت بلالؓ کو حکم دیا تھا کہ کسی اونچی جگہ سے اذان دیں۔ چنانچہ انہوں نے ایسا ہی کیا۔ یہاں یہ ماجر اس لئے بیان کیا گیا ہے ریشہ نہ کے بنانے کا تصور حضرت بلالؓ کے وقت سے ہی پیدا ہو چکا تھا، جو بعد میں تعمیر مسجد کا بصورتِ مینارہ، ایک اہم جزو بن گیا۔

تلمیح کے یہ واقعہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اسلام میں سب سے پہلی مرتبہ ریشہ نہ کا اہتمام اموی عہد میں مسلم بن مخلدؒ، گورنر فسطاط (مصر) نے حضرت عمرو بن العاصؓ کی مسجد میں کیا یعنی چار ریشہ نہ یا میناروں کا احداث کیا جو اس کے چاروں طرف ۳۵ (۶۷۲ء) میں بنائے گئے تھے۔ اسی دور میں کوفہ اور بصرہ کی مسجد میں بھی ریشہ نہ تیا کئے گئے مگر مسجد نبویؐ میں چار میناروں کی تعمیر ۷۰۹ء میں خلیفہ حضرت ولید بن عبدالملکؒ کے حکم سے کرائی گئی۔ مگر یہ ریشہ نہ علم طور پر اپنی مستطیل شکل اور اسلامی تعمیرات میں بالکل نئے اضافے کے باعث ریشہ نہ کی بجائے ”مینار“ کے نام سے ہی مشہور ہوا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ قدیم زمانہ سے ایسی جگہ پر ریشہ نہ کی جاتی تھی اور اس سے لئے یہ نام پڑا۔ ریشہ نہ کو بھی اسی ہیئت کی بنا پر عوام نے مینار ہی کہا جو بعد میں بگڑ کر عورت عام میں مینار ہی گیا۔

یہ بات بلاخوف تردید یہی جاسکتی ہے کہ ریشہ نہ تعمیر ہونے لے مسجد کا ایک مخصوص حصہ اسی طرح بنا۔ مگر مسلمانوں نے میناروں کا استعمال مسجد کے علاوہ دوسری تعمیرات پر بھی کیا، جیسے مقابر اور دروہے وغیرہ۔

ان کے بنانے سے عمارت میں حسن و رعنائی، نیز موزونیت پیدا ہو جاتی ہے اور اس کا نقشہ عجیب رفعت و جلالت کا حامل ہو جاتا ہے۔

مسجد مسجد، اب یہاں کچھ بیان نہیں کرنا بھی ضروری معلوم ہوتا ہے۔ آنحضرتؐ اپنا خطبہ ارشاد فرماتے وقت مسجد میں کچھ کے ایک تنے سے سہارا لے لیا کرتے تھے حضورؐ کے ایک صحابی نے جب یہ دیکھا تو حضورؐ سے عرض کی کہ اگر اجازت ہو تو میں آپ کی خدمت میں ایک منبر بنا کر پیش کروں۔ حضرتؐ نے دریافت فرمایا ”منبر کیا؟“ صحابی نے عرض کیا کہ میں یہ چیز بنا کر پیش کروں گا۔ چنانچہ اس نے اہل نامی گھڑی کا منبر بنا کر دکھایا جس میں دو بیڑھیاں تھیں اور اونپر نشست کی جگہ رکھی گئی تھی۔ آنحضرتؐ نے اسے شرف قبلہ بخشا جس پر چھٹی نے یہ منبر حضورؐ کے لئے بنایا تھا اس کا نام تمیم الداری یا باقوم یا باقول بیان کیا گیا ہے۔ بہر حال مسجد نبویؐ میں منبر کا استعمال خود حضورؐ کی موجودگی میں ثابت ہے۔ یہ منبر آنحضرتؐ کے وصال کے بعد بھی استعمال ہوتا رہا جس کا وجود خلفائے عباسیہ کے عہد تک مذکور ہے بعض کا قول ہے کہ تمیم الداری نے ایسے منبر دمشق کی جگہ بنائے ہیں دیکھتے تھے۔

محراب، منار و منبر کے ساتھ محراب کی گفتگو بھی ضروری معلوم ہوتی ہے۔ اوپر کی تفصیلات میں گند چکا ہے کہ اسلام میں پہلی مسجد خود آنحضرتؐ کی مساعی مبارک کے طفیل وجود میں آئی تھی۔ یہ جو کور عات ایسی سادہ وضع تعمیر کی گئی تھی کہ جب سورہہ بعدہ صمت قبلہ شمال سے جنوب کی طرف پھیر دی گئی یعنی خانہ کعبہ کی طرف، تو اس مسجد میں تبدیلی کے لئے آنحضرتؐ کو کوئی وقت پیش نہ آئی۔ اس کے بعد توسیع کا قبلہ رخ رکھنا امر لازم قرار پایا جس کے بغیر نماز نہیں ہوتی۔

تمازت آفتاب سے نمازیوں کو بلے آرامی محسوس ہوتی تھی حضورؐ نے اس ضرورت کے پیش نظر ایک مظہر یا سایبان بنوانے کا حکم دیا۔ گویا نماز کے لئے اس طرح مرکزی ایوان یا دالان، کی پناہ پڑی۔

یہ مظہر بھی سادگی کا نمونہ تھا۔ عام لکڑیوں کے چند ستونوں پر چٹائی کی چھت یا چھتر بچھا دیا گیا تھا۔ مسجد کے صحن میں جانب قبلہ یہ پہلا اضافہ تھا جب خاص خاص اجتماع ہوتے، جیسے عیدین، اور عجم کثیر ہو جاتا تو آنحضرتؐ شہر کے باہر ادا نے صلوٰۃ کے لئے تشریف لے جاتے اور کسی کھلی جگہ پر یہ فریضہ باجماعت ادا ہوتا۔ حضورؐ کے مؤذن، حضرت بلالؓ جبکہ کی سمت ظاہر کرنے کے لئے اپنا بڑا سا تیرہ جوہر حضورؐ کے گئے

ہے کہ یہاں اگر مسلمان فرض سے ہمدوش ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت اور مقامی حالات کے مطابق مسجد ہر جگہ اور ہر وضع کی بنتی ہے۔ زمین، آب و ہوا، شکل اور قبضہ زمین وغیرہ حالات جو بھی اجازت دیں گے مطابق وضع وضع کی مسجدیں وجود میں آتی ہیں اور آتی رہیں گی۔ اکثر ملکوں کی مساجد میں وہاں کی مقامی ثقافت کا پرتو بھی نظر آتا ہے، مگر زیادہ نہیں مسجد کے بنانے میں احکام صلوٰۃ کے آداب و اصول بنیادی طور پر ہر جگہ یکساں پائے جائیں گے۔

یہاں یہ نکتہ بھی ذہن میں رہنا چاہئے کہ کسی بھی ادنیٰ دین نے عبادت گھر یا معبد کا نقشہ بطور نمونہ بنا کر اپنے پیروؤں کو نہیں دیا تھا، یہ صرف حضور اکرم کی ذات بابرکات ہی تھی جس نے ہمارے لئے ایک مقدس نمونہ اس جہت میں بھی ہم کو عطا کر دیا تاکہ اصل الاصول میں تاقیامت ہماری رہنمائی ہوتی رہے، اور جیسا کہ ابھی عرض کیا گیا حضور کا ارشاد ہے کہ پوری دنیا میرے لئے مسجد بنا دی گئی ہے۔ یعنی فریضہ نماز ہر پاک جگہ پر ادا کیا جاسکتا ہے اور اس کے لئے کسی عمارت کی بھی ضرورت نہیں ہے۔ یوں مسجد کی تعمیر کے سلسلے میں مسلمانوں کو آزادی ہے کہ وضع ہیئت اور دست کے اعتبار سے جس طرح چاہیں مسجد تعمیر کریں۔ سادگی کے ساتھ بھی مسجد تعمیر ہو سکتی ہے اور پرکاری کے ساتھ بھی، مگر مسلمانوں نے اپنے دینی جوش اور عقیدت کے تحت اور اسے اپنے لئے نوشتہ آخرت منظور کرتے ہوئے دنیا میں ایسی ایسی خوبصورت مساجد تعمیر کی ہیں کہ دنیائے فن میں ان کی نظیر نہیں ملتی۔ فن تعمیر کے باب میں مسلمانوں کی خوش ذوقی، تعمیری اہلچل اور جنت و سلیقہ نے ان کا ہر جگہ ساتھ دیا ہے۔ اگر دنیا کی خوبصورت و عظیم مساجد کا ذکر کیا جائے تو اس کے لئے ایک دفتر و کار ہو گا۔ تاہم اتنا ضرور کہ جاسکتا ہے کہ سامرو (بغداد) میں خلیفہ متوکل باللہ کے عہد میں سب سے بڑی مسجد تعمیر ہوئی جس کے ضلع ۸ فٹ اور ۵۱۲ فٹ ہیں۔ اس کا رقبہ ۵۰۰ ۵۰۴ مربع گز ہے۔ اس کے ایک رشتہ نام ملو یہ کہا جاتا ہے۔ مگر بالکل یہ مسجد آباد نہیں ہے۔ اس کے بعد دنیا کی سب سے بڑی مسجد کاغز مرز میں پاکستان کو حاصل ہے یہی مراد لاہور کی بادشاہی مسجد سے ہے، جسے اورنگ زیب نے ۱۰۸۴ھ میں تعمیر کیا تھا۔ اس کے اضلاع ۵۶۰ فٹ اور ۵۷۵ فٹ ہیں اور چوبی تعالیٰ آج بھی آباد ہے۔ حسن و زیبائی کے اعتبار سے مسجد قرطبہ کی شان نرالی ہے اور اسے بھی تعمیری عجائبات میں شمار کیا جاتا ہے۔ یہ مسجد لاہور کی

آگے اٹھا کر چلتے تھے۔ زمین میں اس جگہ کا ڈیرا کرتے تھے جہاں حضور کو مسجد کرنا ہوتا تھا۔ اس تیر کو ”مسترة المصلیٰ“ یعنی نمازی کی ڈھال حفاظت یا پردہ بھی کہا جاتا ہے۔ اس کے نصب ہونے کے بعد اسی کے سامنے آنحضرتؐ نماز ادا فرماتے تھے۔ یہ بات بھی بالکل واضح ہے کہ امام صلوٰۃ جماعت کے سامنے وسط میں کھڑا ہوتا اور اپنا رخ جانب قبلہ رکھتا تھا۔ ۹۱ء (۶۰۹ء) میں حضورؐ کی مسجد دوبارہ تعمیر ہوئی تھی اور اس وقت سوائے مزار مبارک کے، ان کی رملش کی سب جگہیں معدوم ہو چکی تھیں۔ جب مسجد وسیع کی گئی تو مزار پر انوار اس کے احاطہ میں لے لیا گیا۔ غرض اس طرح مسترة المصلیٰ کی اہمیت بنائے مسجد میں قائم ہو گئی۔ جسے آخر میں ہم محراب مسجد کی شکل میں دیکھتے ہیں۔

اب آپ غور فرمائیں کہ مسجد کے اندرونی حصوں کی ساری شوکت و جلالت اس محراب سے کس قدر بڑھ جاتی ہے، بلکہ یوں کہئے کہ محراب مسجد کے نقشے کی روح ہے۔

ان تمام تصریحات کا خلاصہ یہ ہے کہ مسجد کا کوئی مخصوص نقشہ، وضع یا طرز حضورؐ نے اختیار نہیں کی تھی، کیونکہ اس سے قبل کا کوئی نمونہ ہی موجود نہ تھا جسے حضورؐ نے اختیار کیا ہوتا۔ جو مسجد حضورؐ نے اپنے حکم سے بنوائی وہ اصول و آداب اور ضروریات احکام صلوٰۃ کے عین مطابق تھی، پھر سادگی کا نمونہ بھی تھی جو ایک مثال ہے کہ مسلمانوں کی غریب سے غریب لہجہ بھی اپنی ضرورت کے مطابق ایسی سادہ وضع مسجد بنا کر اداۓ فرض کر سکتی ہے۔ مسجد نبویؐ کی بڑی خوبی تعمیر س کی سادہ وضع و نقشہ ہے جو آنحضرتؐ کے ذہن رسا کا ایک نفیس اور پاکیزہ ہیکر ہے۔ میری ناقص رائے میں اگر حضورؐ کے پیش نظر کوئی نقشہ ہو بھی سکتا تھا تو وہ خانہ کعبہ مسجد الحرام، ہی ہو سکتا تھا جو آج بھی مسلمانان عالم کا قبلہ اور مقام رجب ہے، یہی وجہ ہے کہ جو درجہ کعبہ میں نازی سمت نہیں، نمازی مسجد الحرام میں ایک دائرہ کی شکل میں خانہ کعبہ کے گوشے قائم کیے گئے ہیں۔ ساری دنیا کے مسلمانوں کا قبلہ یہی مقام ہے، مگر ان تمام امور کے باوجود مسجد نبویؐ کی اہمیت ایک جلا کا نہ حیثیت کی حامل رہی ہے۔ اس کی پاکیزگی، جلالت اور شوکت و برکت کو دنیا نے اسلام میں جو بلقا و جگہ حاصل ہے وہ ہم سب ہمدوش ہے اور اس اہمیت کی طرف خدا و رشاوندی میں اشارہ موجود ہے، جیسا کہ اوپر بیان ہوا۔

معا یہ ہے کہ اسلام میں مسجد کی تعمیر و بنا اس جذبہ کا ثمر ہوتی

نے ۱۶۹ء میں تعمیر کرایا تھا مگر اس کی تکمیل عبدالرحمن ثالث نے کی تھی۔

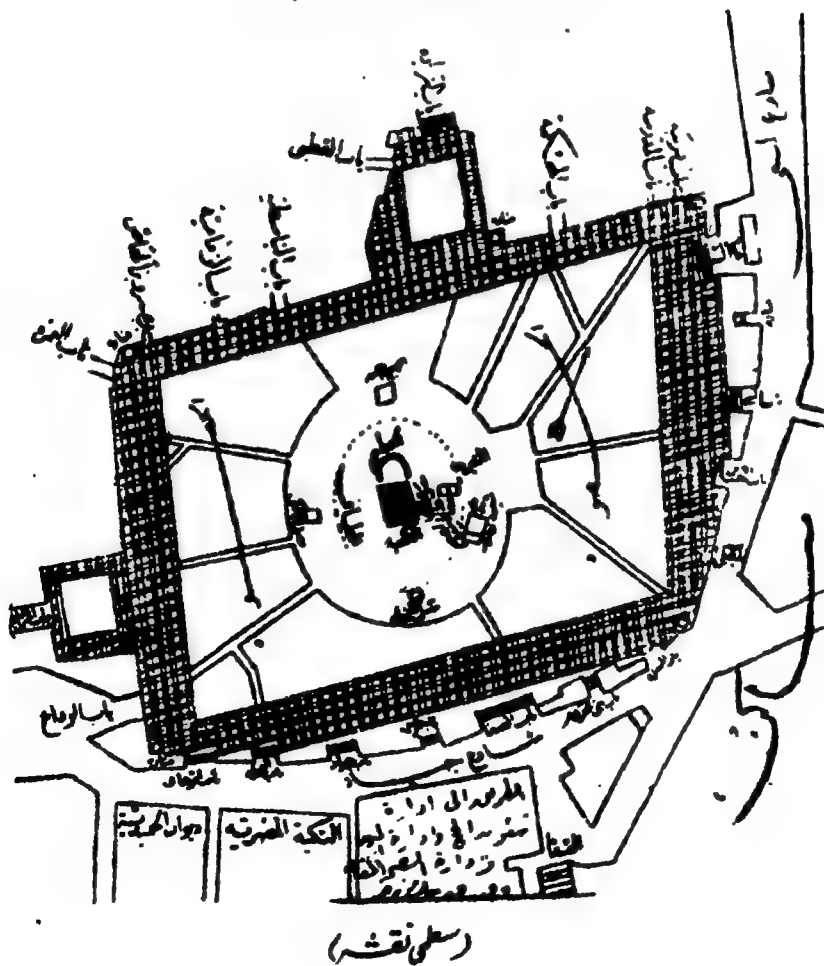
غرض دنیا کے کسی خط کی قدیم یا جدید مسجد کو دیکھیں وہ اپنے
 امتیاز کے باعث ہر جگہ پہچانی جاسکتی ہے۔ کوئی نیا اسلامی شہر یا سٹی
 بنے تو سب سے پہلے اس میں مسجد کا اہتمام کیا جاتا ہے۔ چنانچہ اب اسلام آباد

میں بھی ایک نفیس و شایان شاہی مسجد کا اہتمام کیا گیا ہے۔ مسجد کی تعمیر میں خصوصیت و امتیاز اس وجہ سے بھی پیدا ہوا کہ اسلام میں چترندہ سوں اور گلابا نے ہمیشہ بڑا اہم کردار ادا کیا ہے ۛ

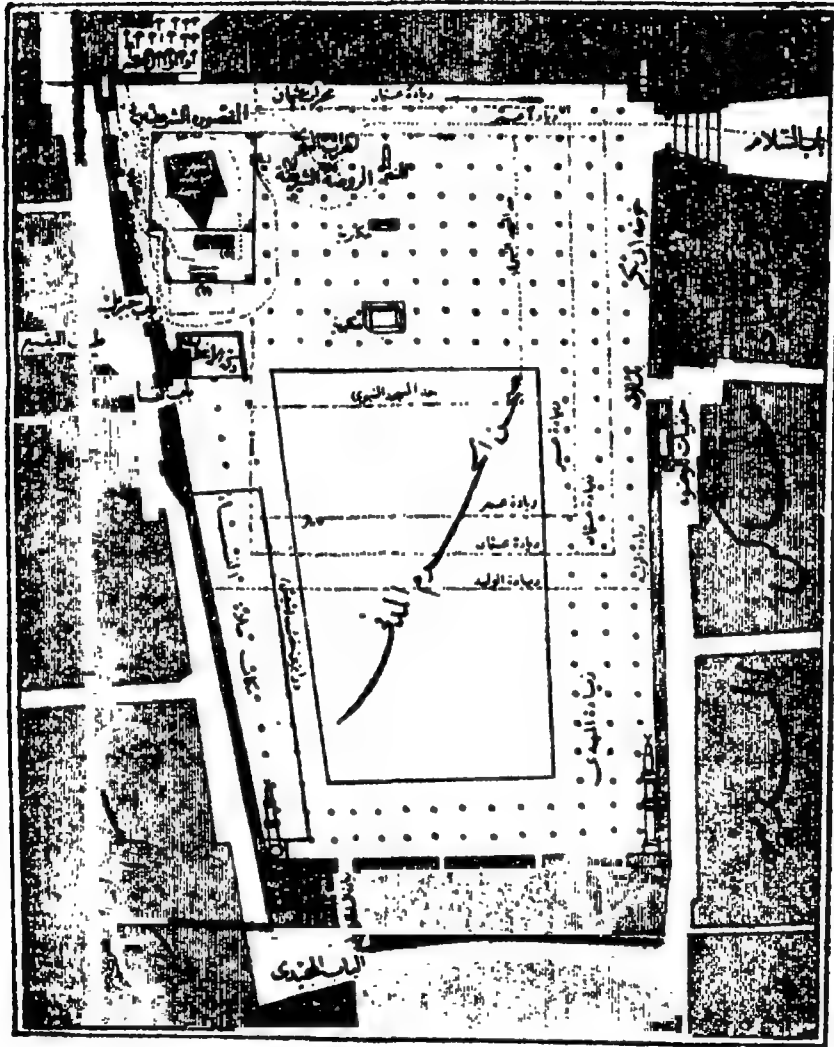


حَرَمُ كَعْبٍ

”دنیا کے تہکوں میں پہلا وہ گھر خدا کا“



حرم نبوی (سطحی نقشہ)



مسجد نبوی کا یہ سطحی نقشہ (پلین) گو قد رے پر انا ہے مگر عمارت کی بہت سی قدیم جزئیات کو دکھاتا ہے۔ جلالت الملک سلطان ابن سعود کے عہد میں باہیاں گوشہ (نقشہ پر غیلا باہیاں کو نہ) زاویہ قائمہ کو دیا گیا ہے اور اس طرح باب مجیدی عین درمیان میں آگیا ہے چاروں گوشوں پر منارے بھی ہیں:

نواب محسن الملک

ڈاکٹر مولوی عبدالحق (رحم)

دو در و در و این باغ آراستہ
در و بند ازین ہر دو برخاستہ
بیا از درِ باغ و ہنر تمام
زدیگر درِ باغ بیسروں خرام

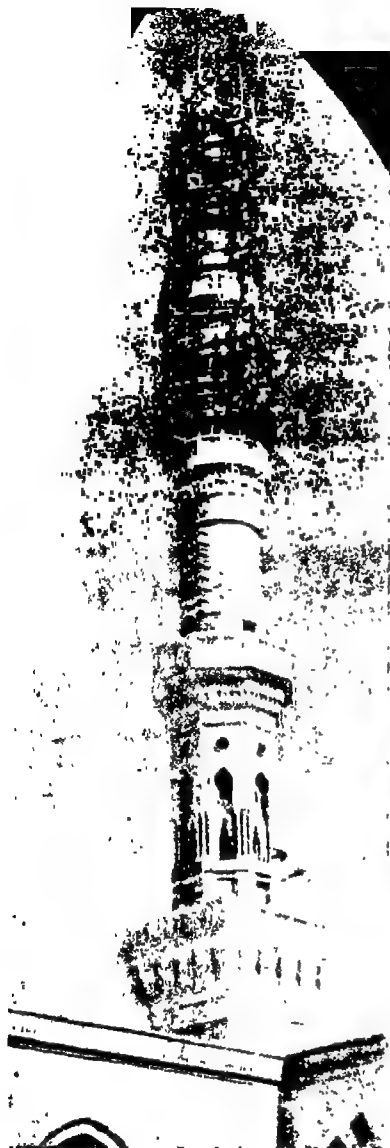
اگر غور سے دیکھا جائے تو انسان کا آنا اور جانا یعنی پیدا ہونا اور مرنا دونوں ایک سے فعل ہیں۔ دونوں فعل اس کے پس سے ماہر ہیں۔ نہ اپنی خوشی آتا ہے نہ اپنی خوشی جاتا ہے۔ اور نہ معلوم کہاں سے آتا ہے اور کہاں جاتا ہے، اور شاید جہاں سے آتا ہے آخر وہیں چلا جاتا ہے۔ یہ اسمرا ہیں اور اسمرا رہیں گے۔ لیکن اتنا یقینی ہے کہ ان دو منزلوں کے درمیان جو وقفہ ہے اور جو گنتی کے چند سانس انسان کو عطا ہوئے ہیں وہی اس کی حیات ہے اور وہی اس کا سرمایہ، وہی اس کی دنیا ہے اور وہی اس کی آخرت، اسی میں اس کی زندگی ہے اور اسی میں اس کی نجات۔ اور اسی میں اس کی موت ہے اور اسی میں عذاب گویا چند دن امتحان کے ہیں اور دنیا دائم ترغیب ہے، اس میں جو پورا اترا اس نے حیات جاودانی پائی، اور جو رہ گیا سورہ گیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون دنیا کی رونق اور ترقی انہیں نفوس کے دم سے ہے جو یہاں کی کڑی کڑی جھیل کر اوڑھ کر دریچہ دریچہ ترغیبات کے پسندوں سے نکل کر امتحان میں پورے اترتے ہیں۔ الی کی کمی سے دنیا کو زوال، اور ان کی ترقی سے دنیا کو ترقی ہے۔ اسی طرح جس قوم میں ایسے لوگ پیدا نہیں ہوتے، اور بہت کم ہوتے ہیں، وہ معرض زوال میں ہے، اور جہاں ان کا سلسلہ جاری ہے، وہاں ترقی و اقبال شامل حال ہے۔

ہماری قوم میں ایک مدت سے قحط الرجال ہے اور جو ایک آدمہ خدا کا بندہ اس زمانہ میں پیدا ہوا تو ایسے وقت میں داغ مفارقت دے کے چلا گیا جبکہ اس کی ضرورت اور بڑھ گئی تھی، اور جبکہ اس کے افادہ کا دائرہ اور وسیع ہو گیا تھا۔ سید نے اسی برس کی عمر میں

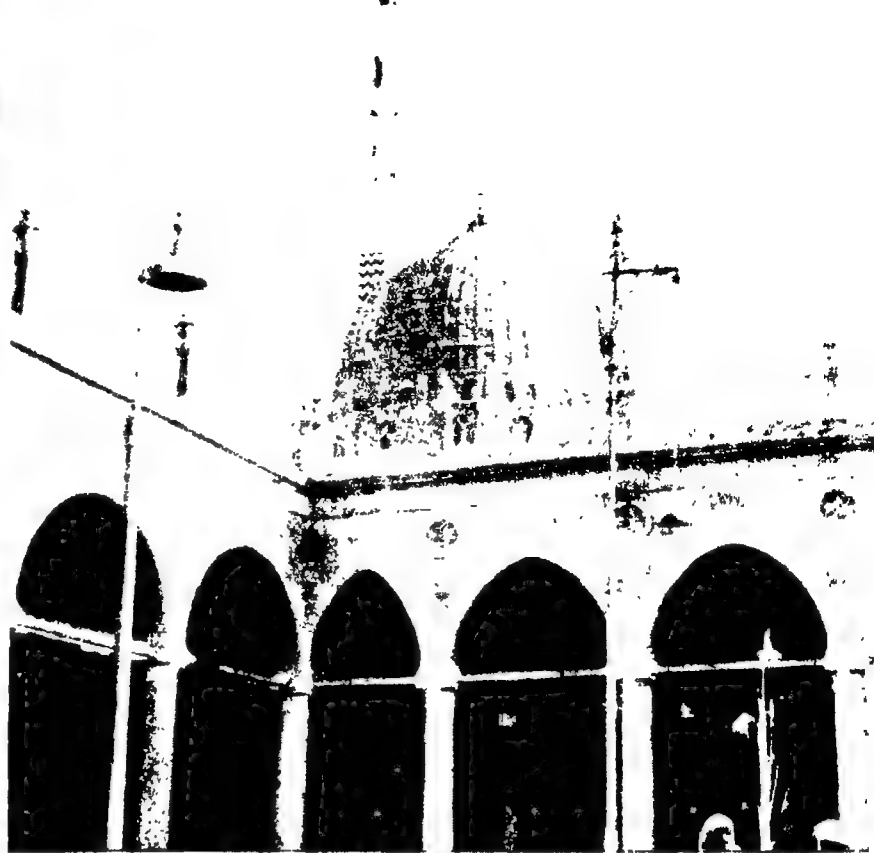
انتقال کیا لیکن ہمارے حسابوں وہ بے وقت مرے۔ اب ان کے جانشین قوم کے سردار، ملک کے محسن، محسن الملک ستر برس کی عمر میں ہمیں چھوڑ کر گئے ہیں مگر ہم یہی کہیں گے کہ یہ موت بھی ناوقت ہوئی اسلئے کہ حکام یہ بدھا کر رہا تھا وہ جوانوں سے بھی نہ ہوسکا، اس اکیلے ہڈیے کا کام اتنا بڑا تھا جس سے ہزار دو ہزار نہیں لاکھوں کے منہ پھر گئے۔ اور اگر سچ پوچھو تو اس نے ایسے وقت پر جبکہ خانہ قوم کی بنیاد متزلزل ہو رہی تھی اور مسلمانوں کی آنکھیں آسمان کی طرف لگی ہوئی تھیں اور دل دھڑک رہے تھے، وہ کام کیا جو چکر و زلفوس سے نہ ہوسکا۔ اس کی مردانہ ہمت اور اس کی مصلحت اندیشی ہماری قوم میں یاد رہے گی۔ اس نے بقول حالی سید کے مشن کو اسی طرح پورا کیا جس طرح پال نے مسیح کے مشن کو۔ اس نے اپنے ہادی کے مرنے پر ضلیب کندھے پر اٹھائی اور بزرگ سید کے قدم بہ قدم چل کر اور سارے آفات سہہ کر آخر بیڑے کو کنارے پر جاکھایا جتنا خدا کے چل بسنے سے بھنوریں بھنس گیا تھا۔

میرے خیال میں ایک بڑے شخص کی سب سے بڑی علامت یہ ہے کہ جب تک وہ زندہ ہے اور اپنے کام پر ہے، دوسرے شخص کی ضرورت محسوس نہ ہو، اور اس کے بعد سما اس کے کسی دوسرے پر نظر نہ پڑے۔ یہی حال مرحوم کا تھا۔ جب تک اس کے دم میں دم نہ مل، ساری قوم نے اسے بالاتفاق اپنا سردار تسلیم کیا۔ اور جس کام میں اس نے ہاتھ ڈالا اسے اس نے اس خوبی اور بہولت اور کمال سے ادا کیا کہ سب کو یقین ہو گیا کہ اس سے بہتر دوسرا شخص نہیں کر سکتا۔

یہ بڑے شخص کے بچانے کی علامت ہے۔ لیکن بڑا شخص حقیقت ہے کون؟ بڑا شخص اسے کہیں گے جو ایشیا کو کام فرماتا ہے، جو اپنے اغراض اور خواہشات پر لات مار کر دوسروں کی دستگیری کرتا ہے، جس طرح خود غری انسان کی سب سے مذموم صفت ہے، اسی طرح ایشیا اس کا اعلیٰ وصف ہے بلکہ سب سے بڑی نیکی اور سب سے بڑی جہاد ہے۔ کون کہہ سکتا ہے کہ

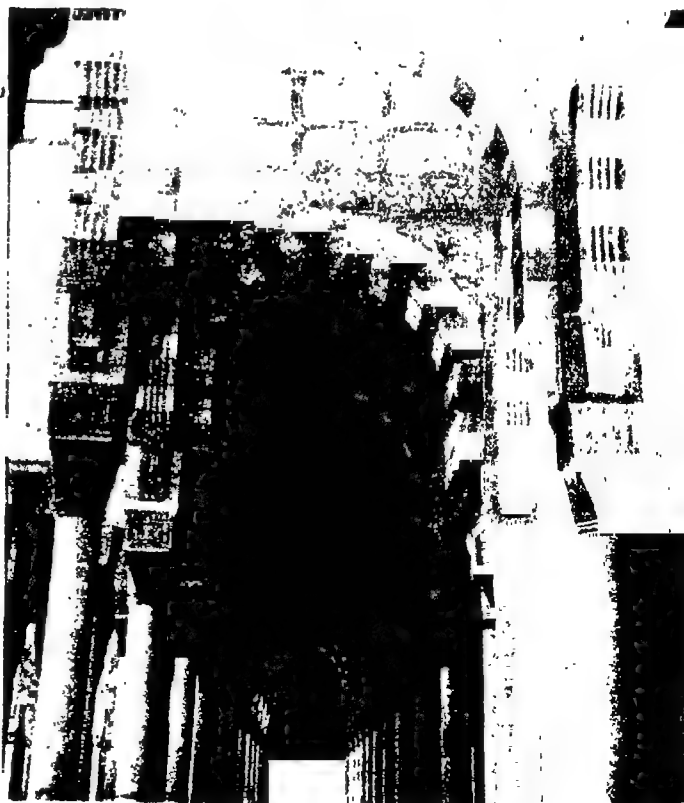


منار



نبد حضرا

در مسجد نبوی ص



مسجد نبوی ص اندرونی حصه

برصغیر میں مسلمانوں کی نشاۃ الثانیہ کے مؤسس ، نقیب اور علمبردار جن کی سیاسی ، علمی کاوشوں اور ادبی و ثقافتی سرگرمیوں سے قوم کو ایک نئی حیات ملی ، اور اس نے ایک معین نصب العین کی جدوجہد سرور کی ، جو بالآخر تاسیس پاکستان کی شہ میں ظہور پذیر ہوئی



سیر سید احمد خان



نواب میرزا اسف الدولہ (مرحوم)



ڈاکٹر مولوی عبدالحق (مرحوم)

ہے۔ ہم جب کبھی کوئی قوم کا کام کرنے کے لئے کھڑے ہوتے ہیں تو یہ سمجھتے ہیں، بلکہ حقیقت میں محسوس کرتے ہیں، کہ اس میں سستی کا ہاتھ ہے۔ اب جہدی ملی چل بسا، لیکن وہ اب بھی محسن الملک ہے۔ ان کی زندگی سے سبق سیکھو، ان سے زندگی بسر کرنا سیکھو۔ ہزار کالے اور نیوڑی سے بڑھ کر یہ علم ہیں۔ وہاں علم ہے، مگر بے فزہ ادب بے تک: ادب بہا عمل کا علم ہے جس میں اسرار حیات ہو یا رہتے ہیں، اور جس پر ہزار اولیاء قرآن ہیں۔ وہ بے جان ہے، ادب یہ جان رہے۔ وہ جگہ جگہ جگہ جگہ، ادب یہ پتہ جگہ ہے۔ اور اسی لئے یہ زیادہ کارآمد اور زیادہ پُراثر ہے۔ غرض زندگی ان لوگوں کی، اور مرنا ان لوگوں کا۔ اور بقول حالی ہمیں مرحوم نے اپنی زندگی و حیات سے بتا دیا کہ:

میںوں رہتے ہیں، یوں جیتے ہیں، یوں مرتے ہیں
اے کالج کی مبارک زمین مسجد، دیکھ! آج قوم کا جگر گوشہ اپنی
زندگی کے مچلے طے کر کے تجھ میں پناہ لیتا ہے۔ دیکھ تیرے پاس ہماری
قوم کے دلہن بے بہا اور بھی دفن ہیں، آج ایک تیسرا گھر شرب چرخ
اور آتا ہے۔ یہ اس خفتہ بخت، سراں نصیب قوم کی تین عزیمتیں ہیں
جو تجھے داد و محشر کے سلسلے میں پیش کرنی ہوں گی۔ یہ ہماری آنکھوں کے تار
تھے جو آج تجھ میں مدفون ہیں لیکن یہ غروب ہو گیا ہے اپنی روشنی چھوڑ گئے
جہاں اور شہر میں پھر چمکیں گے۔ اے روشنی جا! اے قوم کے تارے جا!
اور وہاں جا کے سو جا، جہاں قوم کے آفتاب و مہتاب پڑے سو رہے
ہیں! شاہ ظلمت آہہ نچی ہے۔ تاریکی چھا رہی ہے۔ اب اوتا تارے چمکیں گے
مگر تیری چمک کسی میں ہوگی جا اب عالم بھائیں جا! تیرا نام مبارک ہو، خدا
تیرا جانا بھی مبارک کرے! تجھ پر ہزاروں درود اور سلام ہوں اور
تجھ پر تاقیامت خدا کی رحمتیں نازل رہیں!

مرحوم ہیں یہ صفت نہ تھی، اور وہ بھی اعلیٰ درجہ کی تھی۔ اس کے کارنامے،
اس کی جہاں نشانیوں اور اس کی سحر کاریاں ایک عالم پر روشنی ہیں۔ اس
نے ہمیشہ انیاد و احسان سے کام لیا اور خاص کر اس کی زندگی کا آخری حصہ
ایسے نیک اور اعلیٰ کاموں سے ملوث تھا کہ اگر اس کا صرف ایک ایک کام
ایک ایک شخص کو تقسیم کر دیا جائے تو ان میں سے ہر ایک بڑا شخص کہلانے
کا مستحق ہو سکتا ہے۔ وہ جامع حیثیات تھا اور اس نے ہر حیثیت کو بدرجہ
اتم نبھایا۔ وہ ملک کا دوست اور قوم کا عاشق تھا اور اس نے اپنی دوستی کا
حق ادا کر دیا۔ اس کی زندگی اپنی نہیں رہی تھی بلکہ قوم کی زندگی ہو گئی تھی۔
اس کی زندگی کی ایک ایک گھڑی، ایک ایک لمحہ، دوسروں کے لئے وقف
تھا۔ وہ جب تک جیا اسی وطن میں جیا، اور جب مرا تو اسی وطن میں مرا
اور تہہ شہادت پایا۔ یہ لوگ بڑے لوگ ہیں۔ ان کے رتبے بہت اونچے
ہیں۔ یہ شاہ راؤ عالم کے پھر ہیں۔ جب تک زندہ تھے لوگوں کی رہبری
کرتے رہے، اب مرنے کے بعد بھی دوسروں کی رہنمائی کریں گے۔ وہ سحر
نہیں جیتے ہیں۔ مگر اس طرح انہیں جیسے ہم جیتے ہیں بلکہ ان کی حیات
جیات ابدی امدان کی زندگی جاوید ہے۔

اس میں شک نہیں کہ بولتی چلتی تصویر جاری آنکھوں سے
نہاں ہو گئی۔ وہ ہاتھ جس کے اٹھنے سے ہماری امیدیں اٹھتی تھیں۔ بٹھنے
کے قابل نہیں رہا۔ وہ دماغ جو اڑے وقت پر ہماری مشکلات کی گھنٹیوں
آٹاٹاٹا سلجھا دیتا تھا کام سے رہ گیا ہے۔ اور وہ زہلی جس کی جاوید بکری
تقریریں سے مجمع کے مجمع دم بخود رہ جاتے تھے خاموش ہو گئی ہے۔ لیکن
اس کے کام ہمارے ساتھ ہیں، اس کے نقش قدم ابھرے ہوئے ہیں،
اور نقش فی الجہر ہیں۔ سستی مگر گیا، مگر وہ اب تک ہمارے ساتھ ہے۔
اس کا نام اس سے زیادہ روشن اور اس کا کام اس سے زیادہ اجاگر

مآلات کی ترقی اشاعت میں حصہ لیکر پاکستانی ادب ثقافت کی اپنی عملی دلچسپی کا ثبوت دے چکے

”... باز بہ تعمیر جہاں خیر“

جناب اے کے۔ ایم فضل القادر چودھری

جناب اے کے۔ ایم فضل القادر چودھری: وزیر تعلیم و اطلاعات، وزیرک و زراعت محنت و معاشری سپرد نے پچھلے دنوں موقر عالم اسلامی کے خاکوہ (اسلام اور دور جدید کے تقاضے) منعقدہ کراچی میں جاقظاتی تقریر فرمائی اس کے اہم نکات یہاں پیش کئے جاتے ہیں۔ (ادارہ)

رہے ہیں وہ کامیابی سے جھکتا رہتی ہیں مگر ابھی عروج کی بہت سی منزلیں ہمارے سامنے ہیں جن تک پہنچنے کے لئے بڑی کوشاں ہے اور ہمیں والہانہ سرگرمی و عمل کی دعوت دے رہی ہیں۔

زندگی ایک شے واحد ہے اور اسے دین و دنیا کے دو الگ الگ خالوں میں تقسیم نہیں کیا جاسکتا۔ یہ بات روح اسلام کے منافی ہے۔ یہ دنیا سرچند کہ مشینوں میں گھری ہوئی ہے مگر پھر بھی ہم مسلمان ایک ایسا معاشرہ ضرور تعمیر کر سکتے ہیں جو عدل و انصاف پر مبنی ہو۔ کیونکہ قرآن علم و بصیرت، تدبیر فی الدین، سائنس، ٹیکنالوجی کے ہرگز خلاف نہیں بلکہ بصیرت والوں کو برابر دعوت فکر و نظر دیتا ہے اور بتاتا ہے کہ مسلمان اس دنیا میں کیا کرنا چاہتے ہیں۔ سائنس اپنی جگہ بے پناہ قوت رکھتی ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ ہم اس سے تخریبی کام لیتے ہیں یا فلاح انسانیت کا۔ اصل چیز مثبت اخلاقی اقدار میں جن کی ہمیں ہمت افزائی کرنا چاہیے۔

اسلام کسی ایسے تصور کو اختیار نہیں کر سکتا جو عدالتی نہ ہو۔ اسلام نے ہی دنیا کو امن و راستی کی صحیح راہ دکھائی اور توہمات سے انسان کو باہر نکالا ہے۔ میرا پختہ عقیدہ ہے کہ عدم مساوات، معاشری مفقودات، نا انصافی، باہمی شکوک اور فساد ہی اسلام کی دوزخ میں آسمانی امدادوں کی اس دنیا میں اسلام آج بھی بنی نوع انسان کی فحالت کا واحد وسیلہ جو مساوات و اخوت کے قدیمے صحت مند لہذا اثرات قریب کر سکتا ہے۔ اس وقت کی دنیا کو دو بڑے خطرے لاحق ہیں: نسل پرستی اور شراب۔ اعلان دوزخوں ہڑتوں سے پیدا ہونے والے تمام مفاسد اور

یہ اسلام ہی کا فیضان ہے کہ اس نے مسلم معاشرہ کو صد سال کی آزمائشوں کے باوجود برقرار و سلامت رکھا ہے اور آئندہ بھی تبت ہلاہیہ کا استقلال و استحکام ہماری مشترک ثقافتی و روحانی اقدار پر ہی مبنی رہے گا۔ نوع انسان کے لئے اسلام کی دعوت ابدی اور لاندال ہے اور امتدادیونانہ اس سے متصرف نہیں ہو سکتا۔ اسی طرح اسلام میں اجتہاد کا مقام ہے یعنی زمانہ و موقعتہ۔ اسلام کے ادبی اصول غیر متبدل ہیں مگر ان کا عملی اطلاق اصل چیز ہے۔ قرآن ہم کو ایک معین ضابطہ حیات عطا کرتا ہے اور اسوہ رسول کی روشنی ہمارے لئے رشد و ہدایت کا دوسرا بڑا سرچشمہ ہے۔ ان تعلیمات کا تقاضا ہے کہ مسلمان جو اس دنیا میں حیات انسانی کی تعمیر نو کا تاریخی کردار ادا کر سکتا ہے اسے اس منصب کی ذمہ داریاں ادا کرنا چاہئیں۔ تو ان ہی ہمیں بتاتا ہے کہ خالق اور مخلوق کا صحیح رشتہ کیا ہے۔ یہ رشتہ راستی و نیکو کاری کے سوا اور کچھ نہیں۔ مثال میں عدل و صالحیت ہی انسانی کردار کی اصل کسوٹی ہے۔ توحید اسلام کا اصل اور بنیادی تصور ہے جس سے مساوات و اخوت کے اصول اخذ ہوتے ہیں۔

ماہی میں مسلمانوں کی ہر شے زندگی میں عظیم الشان ترقیوں اور ان کے عروج و غلے دنیا کو ایک نئی تہذیب سے آشنا کیا تھا مگر ہمارا یہ ترقی اٹھارہویں صدی تک پہنچنے پہنچنے رک گئی اور بڑا شدید انحطاط آگیا۔ اس کی بڑی وجہ ہمارا فوجی و سیاسی زوال ہے۔ اہل تہذیب مغرب نے بھی ترقی شروع کر دی تھی۔ لیکن باوجود ان باتوں کے مسلمانان ایشیا و افریقہ ان پچھلے سو سالوں میں اپنی ترقی و آزادی کے لئے جو جدوجہد کر سکتے

اس مرحلہ پر اوجھڑی بڑی بنیادی اہمیت حاصل کر جاتا ہے۔ اس جوش و خروش نہیں کہ عہد حاضر کے تقاضوں کے پیش نظر اسلام کی تعمیر نو ایک عظیم مہم ہے کیونکہ اس کا مطلب ہے بیسویں صدی کے وسط میں ایک نئی حیات کی تعمیر۔ مگر اسلام نے خاصی میں جو ترقی کی ہے وہ اس بات کا قطعی ثبوت ہے کہ اسلام ہر عہد کے تقاضوں کا ساتھ دے سکتا ہے اور وہ ایک زندہ و متحرک مذہب ہے۔

حکومت پاکستان نے ان مقاصد کے حصول کے لئے ایک مرکزی ادارہ تحقیقات اسلامی قائم کیا ہے جس نے اپنے سامنے ایک بڑا مہتمم ہارٹن لائن پر رکھا ہے۔ امید ہے کہ جن دیگر اسلامی ملکوں میں تحقیقی کام ہو رہا ہے وہ بھی ان اصولوں کے اطلاق کے باب میں غور و فکر کی بیج واضح کر سکیں گے۔ نیز ایسے اداروں کے درمیان تحقیقات اور تحقیقی کام کرنے والوں کا تبادلہ بھی کیا جائے گا۔

انشاء اللہ ہم اسلام کی نشاۃ الثانیہ اپنی زندگیوں ہی میں دیکھ سکیں گے۔ مگر ہمیں یہ بات بھی یاد رکھنی چاہیئے کہ مسلمانوں کا رتبہ خود اسلام کی توانائی پر موقوف ہے، اسلام جو خالص اور تخلیقی ہو۔ مختصر یہ کہ مسلمانوں کی ترقی اور روحانی فلاح ایک مضبوط و توانا اسلام ہی میں مضمر ہے: (تخصیص)

اخلاقی گراؤ میں۔ اسلام نے ان دونوں چیزوں کی بیج کنی کی ہے اور ایک بار پھر نفع انسان کو ان سے نجات دلوا سکتا ہے، چنانچہ دنیا کے اکثر مفکرین جیسے ٹائن بی، اسلام کی ان خدایات کے معترف اور اس خیال سے متفق ہیں۔

بیسویں صدی میں تہذیب کی ایک اور خدمت جو مسلمان کر سکتے ہیں وہ آمدنیوں کی منصفانہ تقسیم ہے۔ اسلام نے قوم و معاشری ناہمواری کو دور کرنے کے لئے یہاں تک زور دیا ہے کہ نماز بھی اس وقت تک ادا نہیں ہوتی جب تک معاشی و اقتصادی انصاف قائم نہ ہو۔ مختصر یہ کہ اسلام ہر قسم کے استحصال اور طبقاتی کشاکش کے خلاف ہے اور ان مفاسد کو دور کرنے کی تدبیر بھی بتا رہا ہے۔

میرا یہ بھی ایمان ہے کہ اسلام موجودہ عہد کی تمام معاشری برائیوں کا حل بتاتا ہے۔ اسلام کے اصول جیسا کہ میں نے کئی عرض کیا، ابدی ہیں مگر ان کا جدید اطلاق اصل مسئلہ ہے۔ جو چیز تغیر پذیر ہے وہ اصول نہیں بلکہ ان کا اطلاق و استعمال ہے۔ مرحلہ اجتہاد کام لینا۔ اس ضمن میں اجراء پر بھی غور کرنا چاہیئے۔ اجراء نام ہے "اجتہاد معالیٰ اتفاق" کا۔ اجراء اسلامی عقائد، قانون اور نظم سیاست کے ہر شعبہ میں تمام باتوں پر نکالتی ہے۔ اس لئے اجتہاد کا دلیہ یعنی اصول اسلام کے استعمال پر مگر غور و خوض، ہماری تاریخ کے

پاکستان کے فضاء حکام اور خود عوام تک میں اسلامی اقدار کے قیام و استحکام کا شوق ہے۔ پایاں رکھتے ہیں، جسے دیکھ کر بڑی سرت اڑتی۔

دعوت اسلام کی روح ہے ناخیر اس و سلامتی اور اخوت و مساوات۔ ان مقاصد کے حصول کے لئے یہاں لوگوں میں بڑا محنت جذبہ کار فرما نظر آتا ہے۔ ان مقاصد کے حصول پر ہی دنیا میں ایک ارفع اور بہتر معاشرہ کی تشکیل مندر ہے۔ ایک ایسا معاشرہ جو نئی روح سے سرشار ہو اور اس کی اخلاقی سطح بلند ہو۔

تعلیم کے باب میں یہ بات یاد رکھنی چاہیئے کہ ایسی تعلیم جو دینی تعلیم پر مبنی نہ ہو انسان کو سہا مسکن نہیں جاسکتی۔ مادہ سے نری ہوئی اس دنیا میں مسلمان کا منصب ایک ارفع و صلح معاشرہ کی تعمیر ہے۔

اس وقت ہر اسلامی ملک میں مسلمانوں کو کئی خطرات درپیش ہیں اور ان میں سب سے بڑا خطرہ اس حملہ سے ہے جسے ثقافتی حملہ کہا جاسکتا ہے۔ افسوس کہ ہر اسلامی ملک میں مغرب کی بہت سی مادی و ذہنی فتوحات نظر آ رہی ہیں اور اس وجہ سے مسلمانوں کا یہ فرض ہے کہ وہ ہر جگہ اس فتنے کے استحصال کے لئے کام کریں۔

حکومت پاکستان نے ملک میں "ادارہ تحقیقات اسلامی" کے قیام سے اس فتنے پر صبح قدم اٹھایا ہے۔

واللہ اعلم بالصواب، مفتی اعظم پاکستان،

داستانِ قفس

(بہادر شاہ ظفر اور حضرت شاہ زمانہ بیگم کے دو خطوط)

شہزادِ نعیم آرزو

کی سختیاں بڑھنے اور دیگر پریشانیوں کے باعث وہ ایسا کنبھی نہیں سکتے تھے۔ مگر پھر بھی بعض خطوط جو دستیاب ہوئے ہیں ان کے ایام اسیری پر بڑی اچھی روشنی ڈالتے اور ان کی ذہنی کیفیت کی ایک جھلک دکھاتے ہیں ذیل میں ان کا ایک خط اور ان کی بہو، حضرت شاہ زمانہ کا ایک خط پیش کیا جاتا ہے۔ جہاں ہم میرے علم میں ہے دونوں خطوط غیر مطبوعہ ہیں۔ پہلا خط شہنشاہ ہند کاسے جو انہوں نے اپنی ایک صاحبزادی، حضرت کلثوم زمانہ بیگم کو رنگون سے بھیجا تھا۔ دوسرا خط ان کی بہو، یعنی شہزادہ خواجہ کی بیگم صاحبہ کاسے۔ یہ خط انہوں نے ایک بزرگ، سائیں بیکل شاہ کی معرفت دہلی اپنی والدہ صاحبہ کو بھیجوا یا تھا ان خطوط کی اصل اس وقت کہاں ہے، یہ کہنا مشکل ہے۔ بہر کیف، مجھے ان کی نقول خود اپنے ہی خاندانی کتب خانے سے دستیاب ہوئی ہیں۔ میرے پسر دادا، مجاہد الملک مولانا جعفر خاں صاحب بریلوی کے ذاتی کتب خانہ میں جہاں اور ملٹی فوار کا ذخیرہ ہے وہاں بعض مشابہت کے خطوط بھی ہیں۔ مجاہد الملک مرحوم نے یہ نقول ویونند کے ایک علم دوست سے حاصل کی تھیں اور انہوں نے یہ دہلی سے بطور خاص کسی ذریعہ سے منگائی تھیں:

(۱)

”قید خانہ رنگون۔ ۱۸ مئی ۱۸۶۰ء

تم نے اپنے قیدی: پ کو خط بھیجنا خط کیا تھا میری جان آنسوؤں تھا۔ جوں بخت بہادر شاہ کے چیتے بیٹے نے چڑھ کر ستایا ایک دفعہ نہ جانا بھلا کہا بیٹھ کر نہ پھرنا۔ وہ بھی روتا میری آنکھیں بھی آنسوؤں سے میگیں۔ میں نے کہا۔ بابا ایک دفعہ اور پھر صبر کیا کھدواؤں بیٹی۔ کہ تمہارا رستہ خد کا مجھ پہنچا ایشیہ عجمین دفعہ بخنے کے بعد بھی دل کو قرار نہ آیا۔

آخری شہنشاہ ہند، بہادر شاہ ظفر اور ان کی بہو، حضرت شاہ زمانہ بیگم صاحبہ کے یہ خطوط ایک یادگار حیثیت رکھتے ہیں۔ آخری بد نصیب شہنشاہ ہند کو دہلی سے رنگون جاتے وقت ہزینتا سخت لوبی پہرہ میں لکھا گیا تھا اور رنگون پہنچے پر بھی یہ پہرہ برقرار رہا، بلکہ سخت کر دیا گیا۔ یہاں وہ لکڑی کے ایک بنگلہ میں قید کئے گئے تھے۔ ایام اسیری کے دوران وہ اس بنگلہ سے کبھی باہر نہ نکلے۔ بستر پر پٹے حق سے شغل کرتے رہتے یا کبھی کبھی اپنے شعر گنگا یا کرتے۔ پھلی ہاتوں کی یاد آتی تو رزخوں پر تک کا کام دیتی۔ ایسے عالم میں وہ اپنے چیتے بیٹے جوں بخت کو بلا کر اس سنگدل دنیا کی بے وفائی اور سخت کی نادمی کا دکھڑا روتے۔ جب مکر و ہات دنیا سے دل بہت بڑا ہو جاتا تو اللہ سے کہتے تھے۔ دلی سے روانگی ہونے والی تھی کہ ایک غزل ہوئی جو اداسی، بیچارگی اور اوساوی کی منہ بولتی تصویر تھی۔ چند شعر ہیں:

جلا یا رنے ایسا کہ ہم وطن سے چلے
بطور شمع کے روتے اس آنجن سے چلے
نہ باخباں نے اجانت دی سیر کرنے کی
خوشی سے آئے تھے، روتے ہوئے ہم سے چلے
موت پر دامن مھولنے پر وہ پوشی کی
برہنہ آئے تھے، لپٹے ہوئے کفن سے چلے

قید کے ان پرآلام دنوں کو انہوں نے بڑے صبر و ضبط اور کامل شکیبائی کے ساتھ گزارا۔ وطن کی تباہی، دلی کی بربادی اور یادوں کے بھڑکنے پر خاص طور سے دیگر دلوں رتے تھے۔ کبھی کبھی انہوں نے کچھ خطوط بھی لکھوائے اور دلی بھیجے۔ مگر ظاہر ہے کہ مکمل کربات نہیں کر سکتے تھے۔ خطوط کے پکڑے جانے، امیر

تو سب کچھ سہنا پڑے گا۔

ایک دفعہ عید کے دن چند مسلمان کچھ محتائف لیکر آئے۔
مخبر ساتھ آئے۔ میں نے ان کے خیال سے کہا بھائی میں نہیں لے سکتا۔
انہوں نے اصرار کیا میں نے مجبوراً لے لے اور اس کے بدلے ملک کا ایک
داران کو دے دیا۔

دوسرے دن حکم آیا ان کے پاس جاہرات بہت زیادہ تھیں
جو خرچ دیا جائے وہ بہت زیادہ ہے آج سے آدھا خرچ کر کے دیکھو۔
بھی ایک بات ہو تو لکھو آؤں۔ روز ایسی ہی باتیں ہوتی ہیں۔
اب تو میرا کچھ بچہ رہ گیا ہے۔ پہلے بہت اثر ہوتا تھا کئی کئی وقت رنج
اور صدمہ کے سبب کھانا نہیں کھاتا تھا۔ مگر اب مسافات سی ہو گئی ہے۔
بھوک تو دہلی ہی میں کم ہو گئی تھی۔ یہاں کی ہوا ایسی ہے کہ کئی کئی دن کچھ
نہیں کھاتا۔

شاعری میں اشک غم بہنا، سخت دل کھانا سنا تھا، یہاں یہ
روز مرو ہے۔ اچھا بھئی اب زیادہ لکھوایا نہیں جاتا۔ علاج کو یہاں
لایا اور تم میری زندگی تک یہاں آگئیں تو دل کی باتیں کہیں کا اور وطن پر
میں جہاں جہاں نہ رہیں دکھاؤں گا۔

کیا خبر ہے یہ خط تم کو ملے گا بھی یا نہیں۔ سنا ہوں وہ آدمی
معتبر ہیں جن کے ہاتھ یہ خط بھیجا جائے گا لیکن کتنے ہی معتبر آدمی میں سے
اپنی زندگی میں دیکھے ہیں۔ جو آخر کو دغا باز اور دوسروں کے غم پر بت
ہوئے اور اس خط میں ایسا لکھا ہی ہے جس کی مجھے فکر جو ایک باپ نے
ایک بیٹی کو ایک پرزہ لکھوایا ہے نہ اس میں اپنے ملک کی کوئی بات ہے
نہ غیر ملک کا کوئی ذکر ہے۔ بس بیٹی اللہ بس باقی ہو س۔

تمہارے قیدی باپ لکھوایا۔

دیکھا آپ نے بی بی اور بے کسی کا موقع، انگریزوں کے ظلم و ستم۔
لیجے اب اس ملک کی نہان سے سنئے جس کی شادی میں غالب اور
ذوق سہرے کھ کر آپس میں اچھ پڑے تھے، جو دہلی کے آخری بادشاہ
ابو ظفر سراج الدین محمد بہادر شاہ کی بہوتھی، جس کے سرتاج کو ہندوستان
کا دلی عہد ہمارا دہنلانے کے لئے زمین و آسمان ایک کر دئے گئے تھے۔
ملک ہرما

دلی کے قیدی بادشاہ کا گھر

اماں حضرت کو آداب!

میں آپ کی بیٹی کا بے پانی میں ہوں اپنے وطن دلی سے

نکا ہتی ہو میری جان! دلی والے مجھ کو روکنے ہوں گے تو کیا
وہ نہیں جانتے کہ میں بھی ان کو روکتا ہوں۔ میں تو زندہ بیٹھا ہوں وہ
بنائی مر گئے۔ کتنوں کے باپ۔ کتنوں کے بیٹے۔ کتنوں کے بھائی
بھائیوں پر چڑھ گئے، کتنے بچے یتیم ہو گئے کتنی عورتیں لالہ ہو گئیں۔
گھر لٹ گئے نہیں بلکہ کھ گئے اور گدھوں کے بل چل گئے۔

دہلی میں جب میل مقدسہ ہو رہا تھا اسی زمانہ میں تباہی و
برہادی کے سینکڑوں قصبے سنے تھے۔ میرے یہاں آجائے کے بعد خبر نہیں
اؤں کیا کیا ہوتا تھا شہر والوں پر پڑی ہوئی۔

میری جان، یہ سب میرے اعمال کی شوقی تھی سچا ہیوں نے
بھی تو غضب کیا تھا بھلا عورتوں اور بچوں کو مارنا کس مذہب میں آیا
ہے؟ مگر کیا کسی نے بھوکسی نے بغیر شدنی ہر تھا۔ جو کس دہلی والوں
یا ہنسیں کچھ فائدہ نہیں۔

تم نے یہاں آئے کو لکھا ہے۔ تم آ سکو تو میرے قید خانے میں
عید ہوگی۔ مگر خبر نہیں فیکہ کرنے دلائم تو نہ دینگے یا روک دیں گے۔ اپنا زمان
سے تو کسی سے کہو نہ گناہ نہیں کیوں کہ شروع شروع جرات میں نے کئی
دہلی اٹھی میرے منہ ہمارے گئی اس کے بعد میں نے عہد کر لیا کہ اب
کبھی کچھ نہ کہوں گا۔ ان کو ہر بات سے شک ہوتا ہے۔ یہ نہیں سوچتے کہ
میرا یہاں کوئی ہے اور جہاں تھے وہاں انہوں نے میری کیا دیکھا۔

ایک دفعہ میں نے کہا یہاں مینہ بہت برستا ہے اور جو
مکان رہنے کو ملا ہے۔ وہ برسات کے لئے اچھا نہیں ہے۔ پکیتا ہے
بوچھا لاتی ہے۔ کوئی اور اچھا مکان ہونا چاہیے۔ جواب ملا کیا
تمہارے لئے لال قلعہ منگوا دیا جائے؟ یہاں تو ایسے ہی کھڑی کے
مکان بنتے ہیں اس لئے اچھا کوئی مکان نہیں ہے۔

جواب سنکر اپنا سامنہ نیکر رہ گیا۔ گلے لے کہ ابھی کہ جواب
دینا چاہیے کہ کھڑی کے مکان بھی یہاں اس مکان سے دس درجہ
اچھے اپنے موجود ہیں مگر میرا دل پھوٹا ہوا ہے نہیں لگی انکھیں۔
آستوائے اور چپ ہو گیا۔

ایک دفعہ بنگال کے کوئی زمیندار نے آئے۔ میرا پکا کام ہنگا
یرنے ایک غزل جو ان بخت سے لکھو کر دے دی۔ ہا ہر گئے تو ان کی
کلاشی ہوئی اور مجھ پر خطاب نازل کیا گیا کہ غزل دینے کا کیا مقصد تھا
قیدیوں کو کوئی تحریر ہا ہر دینے کی اجازت نہیں۔ گلے کو
پر غصہ آیا مگر میں نے کہا باقی خفا ہوتی۔ ہو خدا نے قیدی بنایا

ہزاروں کو س دور، یکے سے جدا اور ایسی جدا کا بھیتہ جی کبھی کسی
یکے والے سے ملنے کی آس نہیں ہے آپ کا خط سائیں سبیل شاہ صاحب
لے کر آئے تھے۔ جب وہ حضور سے باتیں کر رہے
تھے تو میں نے چمن میں سے دیکھا وہ نازدار اور رہے تھے
اور حضور کی آنکھوں میں بھی آنسو تھے۔ آپیں کر کے سائیں صاحب ان کے
ساتھ میرے کمرے میں آئے اور خط دیا خط دیتے ہی روئے گئے مجھے بھی
وہ وقت یاد آ گیا جب میری شادی ہوئی اور غالب و ذوقی کے ہر دو کا
چرچا ہوا اور میں نے آپ کے ذریعہ وہ دونوں سہرے منگوائے تو
یہی سائیں سبیل شاہ لیکر آئے تھے۔ اس وقت میں ولی عہد ہند
کی حکمت سائیں سبیل شاہ سات ڈیڑھ بیسوں اور سہرے داروں کو
عبود کر کے مجھ تک آئے تھے آج میں ایک جلاوطن قیدی ہوں اور
ایک قیدی کی جیوی ہوں۔ قیدی ساس سسر کی بہو ہوں۔

اب نہ یہاں وہ لال قلعہ ہے، نہ سات ڈیڑھ عیاں ہیں،
نہ سہرے والے بس لکڑی کا بنا ہوا ایک مکان ہے جو برسات میں ٹپکتا ہے
اور جس میں دو چانکروں کے سوا زیادہ گنجائش نہیں ہے ایک کمرے
میں حضور ملک عالم کی خواب گاہ ہے۔ دوسرے میں میرا اور ان کا بستر ہے۔
تیسرے میں تو کمر ہیں۔ چوتھے میں کھانے، ملنے جلنے کا انتظام ہے۔
مجھے یہاں کی ہوا اس نہیں آتی۔ بارش بہت ہوتی ہے۔ مجھ پر بہت
مکان بھی پہلا اور بوسیدہ ہے۔ اکثر بخار ہو جاتا ہے حضور اور ملک عالم
بھی بیمار ہوتے ہیں خدا کے فضل سے یہ بس ایسے ہیں کہ جن کو یہاں کی ہوا
سے کچھ نقصان نہیں ہوتا۔

آپ نے دہلی کی تباہی کا جو حال لکھا ہے وہ تو جب ہم دہلی
میں تھے انہی آنکھوں سے دیکھ آئے تھے ہاں آکا بھائی کی پھانسی کا
حال اس خط سے معلوم ہوا کہ تو خدا کے دونوں ہاتھ اس لئے تھے
ان کو کس خط پر پھانسی دی گئی یہ بات آپ نے نہیں لکھی۔ سائیں صاحب
میں نے پوچھا تھا کہ حضرت سید حسن عسکری قبلہ کو پھانسی دی گئی
تو کسی نے کہہ دیا کہ یہ بھی ان کی سازش میں شریک تھے اور شاہ ایران کو

جو خط لکھا تھا اس میں ان کا بھی دخل تھا اور ہمارے اسی غرض سے
گئے تھے کہ بات چیلنے کا ایک بہانہ ہو جائے میں نے آکا بھائی کا حال سنا کہ
انہیں بھی بیدار ہوئے پھانسی دی گئی اور آپ خود پھانسی کے وقت
موجود نہیں تو مجھے مائے غم کے خش آئے لگا۔ ہم جب دہلی سے جلا وطن
ہو کر چلے ہیں اس وقت تک تو وہ ہمارے آئے نہیں تھے ان کی چھوٹی
لڑکی کا بیان کر کر کے رونا سائیں صاحب سے سنا تو کلیجہ منہ کو آئے گا۔
اس کی عمر کچھ چار برس کی ہوئی۔ غریب کو کھانا خرک ہاں کہاں چلا گیا اور
جب میں نے سیدہ کی یہ بات سنی کہ آکا بھائی کی لاش گھر میں آئی تو اس
آپ سے کہا:

”ابا حضرت ہم سے خفا ہو گئے ہیں۔ بولتے نہیں۔ آنکھ بند کئے
لیٹے ہیں۔“ تو میرا کلیجہ ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا سیدہ مجھے بہت یاد آتی ہے
اور جب سے آکا بھائی کے مائے جانے کا حال سنا ہے سیدہ کا خیال
رونا کا ہے۔ موتی مٹی کی نشانی ہے۔ میں اس کو دیکھتی تو دل کے زخم پر
مریم لگ جاتا۔ مگر میں کہاں اور سیدہ کہاں اور میرے ماں باپ کہاں
اور دہلی شہر کہاں۔ اب تو کوئی امید دہلی آسکنے کی نہیں ہے۔

ہمارے ہمدردوں پر بہت ہی بڑے وقت آنکھیں میٹھوت باہر
ہم سے زیادہ مصیبتوں میں ٹپکے ہیں۔ مگر وہ اتنے مایوس نہیں تھے جتنے
مایوس ہم ہیں۔ کیونکہ ان کی ہمت کے آگے ساری دنیا کے درد و اندے
کھلے ہوئے تھے۔ ان کی تلوار میں زور تھا۔ وہ جب چاہتے تھے۔ ہزاروں
لاکھوں آدمی ان کی حمایت کے لئے کھڑے ہو جاتے تھے اور ان کی مصیبت
دور ہو جاتی تھی۔ مگر چار ہی یہ حالت ہے کہ اس شہر کا ایک آدمی بھی

تہ شاہ تاجہ رقبہ از غدا ابو ظفر سراج الدین محمد بابر شاہ اور شاہ ایران میں
خط و کتابت تھی اور شاہ کا کام سید حسن عسکری نے انجام دیا تھا۔ سید حسن عسکری
ایک بڑے خوار سید بزرگ تھے دہلی میں ان کی بزرگی کے بڑے چرچے تھے۔ اس
خط و کتابت کا بعد کو از کھل گیا اور سید حسن عسکری کو خدا کے بد پھانسی دے دیا گیا
اسی دوران میں کئی شخص نے یہ کہہ دیا کہ اس سازش میں آکا بھی شریک تھے اس لئے ان کو
بھی پھانسی دے دیا گیا۔

شاہ آکا اور شاہ زمانی بیگم کی والدہ

شاہ سیدہ سلطانہ، آکا کی چھوٹی بیٹی

شاہ زمانی بیگم کے بھائی آکا کی چھوٹی بیٹی سیدہ سلطانہ

شاہ ابو ظفر سراج الدین محمد بابر شاہ

شاہ زمانہ جو ان وقت

شاہ زمانی بیگم کے بڑے بھائی۔

اس ملک کی زبان اور ہے۔ نہ سب اور ہے۔ رہنا سہنا
کھانا پینا سب ہم سے اجنبی ہے۔ یہ جانتے بھی نہیں کہ ہم کون ہیں اور
یہاں ہم کو کیوں قید کیا گیا ہے۔ اماں بی ہمارا یہ قید ایسا قید ہے کہ
نہ ہم قید ہیں نہ آزاد، نہ زندہ نہ مردہ۔ اپنے گھر میں اپنے شہر میں اپنے
ملک میں جا نہیں سکتے اس لئے قید ہیں۔ طوق و زنجیر لگے اور پاؤں لکڑی
نہیں ہے اس لئے آزاد ہیں نہ سب دوستوں قربت داروں سے جدا
اس لئے مردہ ہیں۔ بوسے چلتے کھاتے پیتے ہیں اس لئے زندہ ہیں۔
کہاں تک لکھوں ساتیں سبیل شاہ کی زبانی سب حالات معلوم
ہو جائیں گے۔ سیدہ سلطانہ کو گود میں لینا۔ سینے سے لگا کر منہ چومنا
اور کہنا کہ بھوپا کا پیار لو۔ ابا حضرت کو یاد نہ کرو۔ یہیں بھی بھولی ہاؤ
نہ وہ میں گئے نہ ہم ملیں گے۔ وہ بھی قبر میں ہیں اور ہم بھی قبر میں ہیں۔
ان کی قبر وطن میں ہے اور ہماری قبر پر دیس میں ہے۔ جب تک ہم زندہ
ہیں قبر میں ہیں جب مر جائیں گے تب بھی قبر میں ہوں گے۔

آداب اماں جانی۔ تسلیم
خالی گود والی۔ آپ کی بیٹی شاہ زبانی بیگم۔

ہمارا ہمدرد نہیں معلوم ہوتا۔ دنیا میں ہمدردی جب ہی ہوتی ہے جب
ہمدردی کرنے والے کو کسی سے کچھ امید ہو۔ ہم سے بھلا کسی کو کیا
امید ہوگی؟ سب جانتے ہیں کہ ہمارا حکومت ختم ہو گئی ہمارے
اقبال کا چرخ گل ہو چکا ہمارے سب حمایتی مر چکے۔ اب جو ہمدردی
مدد کا ایلوہ کرے گا یا ہم سے ہمدردی رکھے گا اسے قید ہوگی یا پھانسی،
اور کوئی انعام و اکرام ہم اسے نہ دے سکیں گے۔ حضرت امام حسین
کے قاتلوں کو زندہ رکھے دربار سے بہت کم گزرا ملتا تھا یعنی فی کس
ڈیڑھ سیر جو دئے جاتے تھے اور قاتلوں نے محض ڈیڑھ سیر جو دئے
رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے کو قتل کر دیا اگر حضرت امام حسین
ڈیڑھ سیر جو شاہی فورٹ کے ہر آدمی کو دے سکتے تو وہ قاتل ان ہی کے
ساتھ ہو جاتے۔ ہمارا حال بھی ایسا ہی ہے کہ آج ہم اپنے ہمدردوں
اور حمایتیوں کو ڈیڑھ سیر جو بھی نہیں دے سکتے پھر ہم سے کوئی کیوں
ہمدردی کرے؟ اور ہماری حمایت کا خیال اس کے دل میں کیوں آئے
یہ دنیا تو امید پر قائم ہے جب ہم کسی کی کوئی امید پوری نہیں کر سکتے تو
وہ ہمارا مدد کیوں کرے؟

کشمیر: ادب و ثقافت

(زیر طبع)

کشمیر پر اس وقت سامری دنیا کی نگاہیں لگی ہوئی ہیں

جواں سال ادیب، سلیم خاں گتی

نے اس سرزمین لالہ گل کے ادب و ثقافت پر ایک عظیم دستاویزی تصنیف پیش کی ہے، جو اس جنتِ انبی کے نام
ادبی و تہذیبی گوشوں پر بڑی بیحد روشنی ڈالتی ہے۔

اشاعت کا انتظار کیجئے

ادب و مطبوعات پاکستان پبلسٹکس ۱۸۳ طراچی

شعلہ جوالہ

عارف حجازی

کنج کے آجاتے ہیں دامن میں مرے ماہ و نجوم
گیسوئے نور پریشاں کئے شانہ شانہ
دہمدم اور ابھرتا ہوا چہرہ لے کر
وادئی دل میں اتر آتا ہے ابرہیمی نور
جلتی ہر سو نگہ شوق کی لاکھوں شمعیں
پھر کوئی مطربہ شوخ و ثمریر
تازہ افکار کا شعلہ ناہید
چھیر دیتی ہے رگ جاں کا باب زلتار
پیکر شعلہ بدایا مان سرود
جو تختیل کے سبک سیر پروں پر مجھ کو
لئے جاتا ہے خلاؤں سے پرے دو کہیں
ایک بازی گرا و ہام کہ اہام کا اعجازِ بلام!

★

ایک فن کا زمرے فکر کی تصویر حسین
یہ جہاں تاب مناظر، مہ و انجم، یہ زمیں
میرے افکار سے تابندہ جہان رنگیں
فن کی عظمت کا میں شعلہ جوالہ ہوں
صبحِ افروز کہ تار کی زلفِ شب رنگ
نفسِ غم ہوں، لبِ نغمہ پر سوز ہوں میں
قصہ درو کہیں، خلد کا افسانہ کہیں
نقشِ فریا دکہ تصویرِ نیشا طِ گل کار
جھوٹے خونِ ناب سر کوئے ندامت کا حوار
رفعت و عظمت کہسا رنگوں ہے مجھ سے
دشت کی روح، خلاؤں کا ضمیر
ماوراءِ دید سے تاریک خلاؤں میں گزر
جب بکھر جاتا ہے افلاک پہ خوابوں کا فوس

غزل

شیخ افضل جعفری

محشر بکائیونی

گھر کے طاقتوں کی رکھیں گے ہم آبرو شیشہ و جام لاکر تمام ایک دن
میکدے کی نگاہوں میں گستاخ ہیں میکدے کو کیلئے سلام ایک دن
اس گراں قید نہ بخیر و بدیل سے پاؤں کھٹنے تو خود سراٹھانے توڑ
دیکھنا تم کہ مدوارہ عقل پر نقش ہوگا ہمارا بھی نام ایک دن
کام آنکھوں کا جاری ہے جاری ہے زخم کاری یونہی زخم کاری ہے
دیکے دب اگر یوں ہی جلتا رہا صبح بخائیگی گھر کی شام ایک دن
ایک اک تار و بیج نظر ہے کاب جھنجھل کی شعاعوں کے زنجیر ہے
خط رنگ نگہ بن گیا تھا اندازہ خجڑوں بارے بام ایک دن
انہی قسمت کا بھی ابراٹھے کا کہی یہ بھی ہونگے صفائے بالیدگی
یہ بے سبزہ خس یہ سوکھے شجر رک دیئے صبا کا خرام ایک دن
فرض کا جبر کو چہ بہ کو چہ لئے جا رہا ہے ہمیں پا بجلاں کئے
اتنی مہلت نہیں ہے کاب ہم کہیں زیر و بار کر لیں تمام ایک دن

اپنی سی تنہائی دے
خلوت اور پہنائی دے
وہ بندہ آرائی دے
جس پر جان خدائی دے
زگس ہوں، بینائی دے
گل کی طرح دکھائی دے
دل کے چھلکتے راوی کو
ڈونگھا کر، گہرائی دے
صامت کو نعمات سکھا
گونگے کو شہنائی دے
جھولے عرشیں معلیٰ پر
روح کو وہ انگڑائی دے
تیری بے آواز صدا
مجھ کو روز سنائی دے
سن کر یہ گبھی غزل
کیوں نہ داد بھنائی دے

غزل

شاہد عشق

مشتاق تہارک

بچینے دیا نہ کچھ تو غمِ روزگار سے
کچھ کاروانِ زبیت کے گرد و غبار سے
ہا ہوا ہوا پھر بھی نہ اٹھنے دے قدم
منزلِ رسی کے جذبہ بے اختیار سے
دل کو نشاطِ غم کا بھی محرم بنا دیا
حیرت بدوشِ عشرتِ ناپائیدار سے
کیا کیا دے فریبِ عروج و کمال کے
نوعِ بشر کو منزلتِ مستعار سے
ہونے دیا نہ باخبرِ کیفِ زندگی
مجھ کو مرے مزاجِ حوادثِ شمار سے
اس رقصِ رنگ و بو کا بھی انجام ہو بخیر
صبحِ جن میں آگ لگا دی ہوا سنے
شایانِ تخت و تاجِ نیابت بنا دیا
انساں کو دانشِ مہ و انجمِ شکا نے
شیرازہٗ حیات کو یک جان کر دیا
اس زلفِ مشکبوی کے حسین انتشار سے
اس نوہارِ ناز سے وابستگی کے بعد
رکھنا نہ پھر کہیں کا دل بے قرار سے
حاصل ہوا نہ مل کے بھی ان سے تہا عمر
وہ لطف جو دیا غمشِ انتظار سے
ہم اپنے دل کی بات کو ہرگز نہ مانتے
مجبور کر دیا نگہِ شرما نے
وہ بھی یہ کہہ رہے ہیں کہ دوچکر کر دیا
رودادِ دردِ دل کا مزا اختصار سے

دل میں عشق کی آگ ہے سر میں سودا پری جالوں کا

اپنی سمجھ میں آج آیا ہے بن بن پھر ناغزالوں کا

خفیہ سار بہرِ شہرِ بتاں میں کس کے کام آسکتا ہے

عہدِ جوانی میں مرجانا شیوہ ہے دل والوں کا

جب بھی کسی کی یاد آتی ہے شوق سوا ہو جاتا ہے

جیسے سحر کے ہوتے ہوتے پھیلے رنگِ جالوں کا

لے شبِ فرقت بھی کاٹ آئے بازیِ دل بھی ہار چکے

آج حساب چکاتے ہیں ہم سارے گزشتہ سالوں کا

یہ بے خواب نگاہیں تیری یہ ویراں ویراں چہرہ

کس کے پاس جوابِ عشقی ان خاموش سوالوں کا

یہ دین، یہ راتیں

انور

وہ اپنی جگہ پر موجود ہیں، تو پھر ثقافتی سرگرمیاں بھی یہیں نہیں ہونگی۔ ثقافت تو ایک دریا ہے۔ اس دریا کو کون روک سکتا ہے۔ اس کو قصبہ ڈور اور ہالوں کے دروازوں میں بند نہیں رکھا جا سکتا۔ ثقافت تو ہماری سرسبز کوئی پہرہ، ہماری مسجدوں میں، ہمارے لباسوں میں، ہماری باتوں میں، ہمارے سحری اور افطاری کے ساز و سامان میں، ہر جگہ، ہر مقام پر موجود ہے۔ اور عید ہماری ثقافت کا ایک عظیم الشان مظاہر ہے۔

۱
بندہ وڈا سالوں کا ایک بہت بڑا دریا بن گیا ہے، اور
صدرا سالوں کا ٹٹا ٹٹیاں مارتا ہوا سندھ یہ بے پناہ ہجوم عید کے
استقبال کی تیاریاں کر رہا ہے۔ یہ عقیدہ مند لوگ ایک جہیز میں
اپنا سب کچھ خرچ کر کے گیارہ جہیز اپنا قرضہ اتارتے رہیں گے۔
پچلے زمانے کے لوگ گیارہ جہیز کا ایک جہیز میں خرچ کرتے تھے۔
لیکن اب پہلا زائد کہاں ہے؟ پچلے اتنی مہنگائی کہاں تھی؟
اب عید کا چاند نظر آگیا ہے، ہوٹلوں نے عید کا اعلان
کر دیا ہے۔

عید کی خرید و فروخت رمضان کے آغاز سے ہی جاری تھی لیکن عید گاہ میں میں نے دیکھا کہ جناح کیپ صرف چند ایک کے سروں پر تھی، باقی سب اپنے سروں پر دو مال باندھے ہوئے ناز پر رہے تھے۔ شاہک سکین کی شیر وانی کسی کسی نے پہنی ہوئی تھی۔ زیادہ تر نمازی صاف ستھرے معمولی کپڑوں میں ملبوس تھے۔ ہاں جینکاٹی ناقابل برداشت ہے۔

عید کی نماز کے اختتام پر میرے ایک دوست نے مجھ سے
 بھگتہ ہونے کے بعد مجھے اپنا پاؤں کی ڈوبیہ کنول کمرہ ان پیش کیا ، اور
 ایک قرمز رنگ منسل کے بیٹے میں جس پر گروٹے سے گھلا ریاں

کراچی کے دن رات کے ارے میں سب سے بڑی حقیقت جو دنیا کے ہر جغرافیہ دان کو جاننا چاہیے یہ ہے کہ کراچی میں دن رات نہیں ہوتے۔ خط استوا پر دن رات برابر ہوتے ہیں۔ قطب شمالی اور قطب جنوبی میں دن رات چھ مہینے کے ہوتے ہیں اور کراچی میں دن رات بالکل نہیں ہوتے۔ کراچی میں صرف کراچی ہوتی ہے، صدر ہوتا ہے، نالوکھیت ہوتا ہے، کلفٹن ہوتی ہے، یابری کالونی ہوتی ہے۔ اور اگر جغرافیہ کی زبان میں بات کرنا بہت ضرور ہے۔ تو یہ کہنا چاہیے کہ کراچی میں صرف دن ہوتا ہے یا صرف رات۔

لیکن مجھے بتا دیا گیا کہ اپنی اس ریڈرائٹی تقریر میں مجھے کراچی کا
 نیا جغرافیہ بیان نہیں کرنا، بلکہ کراچی کی ان ادبی اور ثقافتی سرگرمیوں
 ذکر کرنا ہے جو پچھلے دو ہفتوں میں دن کے وقت اور رات کے وقت
 کراچی میں وقوع پذیر ہوئیں یعنی ریڈیو جغرافیائی زبان میں مجھے
 کراچی کے ادبی اور ثقافتی موسم کا حال بیان کرنا ہے۔

اب میں کراچی کی ادبی اور ثقافتی سرگرمیوں کی تلاش میں سرگرواں ہوں۔ خدا کا شکر ہے کہ ادبی اور ثقافتی سرگرمیاں کہیں نظر نہیں آتیں اور مجھے فرصت ہی فرصت ہے۔ لوگوں کو ادبی اور ثقافتی سرگرمیوں کی فرصت نہیں، وہ سب عید کی تیاریوں میں مصروف ہیں۔ لکرا اپنے محلے کے افسروں سے تنخواہوں کے ایڈ وائس مانگ رہے ہیں، ان کی بیگمات بند روٹو پر ہزاروں کی دکانوں سے سارا سامان خرید رہی ہیں، ان کے بچے صدر میں ٹیڈی ٹیلر زھٹا ٹپا پہناتے ہیں اور گین گین کے فراک سلوانے کے لئے اصول کر رہے ہیں اور ان کے ماں باپ خفا ہو کر کہہ رہے ہیں: ہمیں نہیں، یہ بے شرمی ہے، یہ عوامی ہے، یہ لباس ہماری تہذیب اور ہماری ثقافت کے خلاف ہے۔

کے سمجھے اس کے خاندان کی پوری تاریخ، پوری تہذیب اور پوری ثقافت ہے۔

میرے دوست نے کہا:

”اچھا ہم اس کے دہی بڑے چکھیں گے۔“

اور اس نے اپنا پان دہی بڑے کی دکان کے سامنے آکر دیا اور ہم دہی بڑے کھانے میں مشغول ہو گئے۔ دہی بڑے کھاتے ہوئے میں نے کہا:

”مجھے پان کی ثقافت، اہمیت سے انکار نہیں لیکن میں صرف

یہ چاہتا ہوں کہ لوگ پان کی ذہنی اور جہالیہ کے بڑے کے ساتھ بیک دان بھی اٹھائے پھر میں۔ اب تمہارے پاس پان کی ذہنی ہے، جہالیہ کا بڑا ہے، لیکن بیک دان نہیں ہے۔ اس لئے تم میرے دفتر کو بیک کے طور پر استعمال کرتے ہو۔ تم میرے دفتر کو بیک دان کے طور پر استعمال کر سکتے ہو کیونکہ میرا دفتر بیک دان کے سائز کا ہے، لیکن اگر کوئی تو اس آرٹ میں بہت ترقی کر لی ہے اور وہ حبیب سکوتر کو بیک دان کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔ اور اگر ترقی کی رفتار یہی رہی تو کوئی ایک دن ایک بڑا سا بیک دان بن جائے گی۔“

دیکھئے ثقافتی پروگراموں کے فقدان کے باوجود کراچی کے پچھلے دو ہفتوں میں ثقافت کتنی سرگرم کا تھی۔

ادنیٰ آب ہوا بڑی خشک رہی۔ صرف ”حلقہ ارباب ذوق“ باوجود صبر میں کجور کے درخت کی طرح اپنی زندگی کا ثبوت دیتا رہا، لیکن ”حلقہ ارباب ذوق“ ”قصر چار درویش“ بنا ہوا ہے۔ چار درویش جید نسیم، ضیاء اللہ صری، صبا اختر اور سید آہوجہ۔ دو اتوار ان کے ساتھ گزارے۔ ان کے ساتھ ان کے تین چار حلقہ بوش بھی تھے۔ پچھلے اتوار کو مجھے اجلاس کا صدر بنانے کے بعد دیا گیا کہ میں بھاگ نہ جاؤں۔ امین الرحمن نے ایک مقالہ پڑھا جس کا عنوان

معتوری میں کلاسیکیت تھا۔ محنت سے لکھی ہوئی ریسرچ کی چیز تھی جس کے بارے میں فیملی رپورٹ نے کہا کہ یہ معتوری کی تاریخ ہے کلاسیکیت نہیں۔ اور تسلیم کرنے کے بعد: جہاں تک اس مقالے میں معتوری کے یونانی جیسے کا تعلق ہے تو تین سو میں قبل مسیح میں جب سکندراعظم

نے ہندوستان پر حملہ کیا تھا، پھر آخری خاندان کی حکومت قائم ہوئی۔ ابھی حال ہی میں حکمران آثار قدیمہ نے کھدائی کے ذریعے

کی ہوئی تھیں، چھالیا اور تباہی کی طرف بڑھائے۔

میں نے کہا: ”شکریہ میں پان نہیں کھاتا“

میرے دوست نے جواب دیا: ”میں جانتا ہوں، تم پان نہیں کھاتے لیکن میں تمہیں یہ دکھانا چاہتا ہوں کہ یہ چاندی کی ڈبیہ اور یہ نعل کا بڑا مجھے میری بہن نے تحفے کے طور پر دیے ہیں۔“

بہن نے ان تحفوں کی بہت تعریف کی لیکن اس کے بعد کہا:

”یہ بڑے خطرناک تحفے ہیں۔ اب تم پچھلے بھی زیادہ پان کھاؤ گے اور عالم حیوانات کے ایک معزز رکن بن کر سارا سا راون جھگالی کر دو گے۔“

میرے دوست نے کسی قدر ناراض ہو کر کہا:

”یہ تمہاری بڑی بد اخلاقی ہے جو تم میری بہن کے تحفوں پر

اس قسم کے خیالات کا اظہار کر رہے ہو۔“ میں نے کہا:

”مجھے تحفوں پر کوئی اعتراض نہیں، میں صرف یہ چاہتا ہوں کہ تمہاری بہن ان تحفوں کے ساتھ تمہیں ایک بیک دان بھی تحفے میں دیتی۔ بیک دان بھی میں نے اخلاقاً کہا ہے، ورنہ میں آگالہ دان کہتا۔“

اس پر چل کر میرے دوست نے پان کے موضوع پر ایک مکمل تقریر عنایت کر دی جس میں اس نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ پان کے پیچھے ہمارا ایک مکمل معاشرہ، ایک مکمل تہذیب اور ایک مکمل ثقافت پنہاں ہے۔ پان ہمارے معاشرے کے نچلے سے نچلے طبقے سے لے کر اعلیٰ طبقے سے اعلیٰ طبقے کی نمائندگی کرتا ہے۔ میرے دوست نے پاؤں کی قسوں اور پاندلوں اور پان کی طشتریوں اور پان پیش کرنے کے انداز اور معنوں اور پاؤں کے متعلق تمام محاذوں پر ایک سیر حاصل تبصرہ کیا، ختم کر کے ہم لوگوں کو گراؤنڈ سے اٹھاتے ہوئے پچھلے اور میں نے اپنے دوست کی بات کاٹتے ہوئے کہا:

”آؤ دہی بڑے کھائیں۔“

میرے دوست نے جواب دیا:

”نہیں، شکریہ، میں پان کھا رہا ہوں۔ اور اب نہیں یہ بھی

معلوم ہو گیا ہو گا کہ ہاں ہم کو دوسری گندی چیزیں کھانے سے بھی بچانا ہے۔“

میں نے کہا:

”یہ دہی بڑے گندے نہیں ہیں۔ یہ دہی بڑے والا بریلی کا ہے۔“

اس کا خاندان سات پشتوں سے دہی بڑے بنا رہا ہے۔ ان دہی بڑے

اگرچہ اس نمائش کا تعلق براہ راست ہمارے ادب سے نہیں تھا لیکن پاک امریکن بچوں سنٹر نے اس نمائش کے ساتھ ساتھ انگریزی اور اردو میں مذاکروں کا اہتمام کیا تھا جس میں اردو اور پنجابی میں بچوں کا ادب پیدا کرنے والے ادیبوں کو بھی مدعو کیا گیا تھا۔ اس طرح یہ نمائش ہمارے لئے ایک مخصوص دلچسپی کی حامل ہو گئی تھی۔

مذاکرے دو دن بائوٹی میں تھے، انگریزی میں اور اردو میں۔ انگریزی کا مذاکرہ ۱۶ فروری کو تھا اور اس کی صدارت کے لئے ڈھاکہ گورنمنٹ کالج کے پروفیسر اشرف صدیقی کو بلا گیا تھا۔ پروفیسر اشرف صدیقی نے بچوں کے لئے بنگالہ اور انگریزی میں متعدد مدعوئی کہانیاں لکھی ہیں۔ اس مذاکرے میں دوسرے حصہ لینے والے مشہور جالندھری تھے۔ اور مسٹر غلام عباس جنہوں نے FOLK TALES OF PAKISTAN لکھی ہے۔ مسٹر بینکر پاکستان بچوں سنٹر کی ڈائریکٹر بھی موجود تھیں۔

مذاکرے کا آغاز پروفیسر اشرف صدیقی نے کیا۔ انہوں نے حوامی کہانیوں کی تاریخ اور فلسفے پر روشنی ڈالی اور جب مسٹر بینکر نے ان کی تقریر کے دوران میں ان کو یاد دلایا کہ انہیں یہ بھی بتانا چاہیے کہ حوامی کہانیاں بچوں کے لئے دوبارہ کس طرح لکھی جاسکتی ہیں تو ان کا موضوع بچوں کے ادب پر آ گیا۔ ضیا جالندھری اس دوران میں مذاکرے کے کنوینر کے فرائض انجام دے رہے تھے، اور بنگالی اور انگریزی ادب کے مقررہ دن میں اردو ادب کے نمائندہ کی حیثیت رکھتے تھے۔

پروفیسر اشرف صدیقی کے بعد مسٹر غلام عباس نے اپنے خیالات کا اظہار کیا اور پھر ایک عام بحث چھڑ گئی جس میں ایڈوکیٹ حیات علی اور اقرار نے بھی حصہ لیا۔

اس بحث میں یہ بات سامنے آئی کہ جس طرح انگریزی میں بچوں کے لئے اچھی اچھی کتابیں لکھی گئی ہیں اسی طرح اردو اور بنگالی میں بھی بچوں کے لئے کتابیں لکھی جانی چاہئیں۔

دوسرا مذاکرہ ۱۸ فروری کو اردو میں شاپا احمد دہلوی کی صدارت میں ہوا۔ اس میں ابو الاثر حفیظ جالندھری، ڈاکٹر منظور انسا صدیقی اور ابن انشا نے حصہ لیا۔

اس مذاکرے میں بھی بڑی بڑی ایسی چوڑی بحثوں کے بعد

باختری شہرہ دل کے کنٹریبلت برآمد کئے گئے ہیں۔ ان کنٹریبلت سے جو چھراور کتبہ حاصل کئے گئے ہیں ان کے مطالعے سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ یونانیوں کے گھوڑے بڑے قد اور تھے اور ان کے سسم بڑے بڑے تھے لیکن ان سے یونانی مصوری کا کوئی پتہ نہیں ملتا۔ اس کے برعکس یہ بات باہر ثبوت تک پہنچ گئی ہے کہ یونانی مصوری کا سر سے کوئی وجود ہی نہیں تھا۔ اس تنقید پر صدر نے بحث کو ختم کر دیا اور چونکہ اس کے بعد پروگرام کے مطابق سلیم احمد کو غزل پڑھنی تھی اور وہ غیر حاضر تھے، اس لئے اجلاس برخواست کر دیا گیا۔

حلقہ ارباب ذوق کے دوسرے اوارڈ کا اجلاس بھی قصہ چادر و رویش تھا۔ صدارت منظور رضیائی کی تھی۔ پروگرام کے مطابق حمید نسیم کو مقالہ پڑھنا تھا۔ انہوں نے معذرت کا اظہار کیا، ان کو معذرت سمجھ لیا گیا۔ غزل گو صاحب تشریف نہیں لائے تھے۔ افسر ذرے ایک لمبا افسانہ دخیال رہے کہ میں نے لمبا افسانہ کہہ ہے، طویل افسانہ نہیں) پڑھا۔ تنقید کے وقفے میں صہب اختر نے اس کو اور بھی لمبا کر دیا۔ اور حمید نسیم نے اس کو کھینچ مان کے اس سے بھی زیادہ لمبا کر دیا اور جب میں نے اس کے بارے میں کچھ کہا تو کوئی بھی نہ سمجھا کہ میں تنقید کر رہا ہوں یا تنگ آ رہا ہوں۔ اس لئے اجلاس برخواست کر دیا گیا۔

حلقہ ارباب ذوق اور ارباب حلقہ ارباب ذوق مبارکباد کے قابل ہیں کہ اس سلسلہ حالات کے باوجود وہ اپنی ادبی سرگرمیوں میں سیر متوقف نہیں آتے دیتے۔ ان کی تاریخ میں ایسے دنوں کی کمی نہیں جب حلقہ ارباب ذوق کا سیکرٹری خالی کرسیوں کے درمیان بیٹھا جلے کی کارروائی نہ رہا ہے جب وہ خود ہی جلے کا صدر خود ہی سیکرٹری اور خود ہی سامعین چوتھے۔ اب معلوم ہوا ہے کہ حلقہ ارباب ذوق کی ادارت میں ایک ادبی رسالہ بھی جاری ہونے والا ہے۔ یہ حلقے کی ادبی خدمات اور اوارڈ اعزازی کا واضح ثبوت ہے۔

ان ہی دنوں میں ادب کے ایک غیر مالوس گوشے سے ایک انوکھی آواز اٹھی، بچوں کا ادب۔ یہ امریکہ کے ایک اخبار واشنگٹن پوسٹ کی طرف سے تنظیم دی ہوئی بچوں کے لئے لکھی ہوئی انگریزی کتابوں کی نمائش تھی۔ جو ۱۸ فروری سے ۲۰ فروری تک آرٹ کونسل میں منعقد ہوئی۔

یہ طے ہوا کہ ہمیں بھی انگریزی کی طرح اردو میں بچوں کا ادب پیدا کرنا چاہیے۔

اس سلسلے میں ڈاکٹر منظور انسا صدیقی نے بچوں کے ادب کے بارے میں بڑی سیر حاصل تقریر کی۔ تقریر جب درج ذیل ہو گئی تو حفیظ جالندھری، طفیل جالبی، مجراں الحسن اور انور ایک دوسرے سے مخاطب ہو کر بچوں کے ادب کے ان نکات کے بارے میں باتیں کرنے لگے جو ڈاکٹر منظور انسا صدیقی چھوڑ گئی تھیں یا جو بحث طلب تھے۔ اس پر ایک صاحب بگڑ گئے اور کھڑے ہو کر بولے: "صاحب صدر، بڑی اہم تقریر ہو رہی ہے۔ لیکن کچھ صاحب تقریر کو خاموشی سے سننے کی بجائے آپس میں باتیں کر رہے ہیں اور جلسے میں خلل ڈالنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ میں درخواست کرتا ہوں کہ یا تو ان کو خاموش رہنے کے لئے کہا جائے یا پھر ان کو جلسے سے باہر نکال دیا جائے۔" شاہد احمد دہلوی نے ہاری طرف دیکھتے ہوئے بے بسی سے کہا: آپ سے درخواست ہے کہ آپ خاموشی سے تقریر سنیں۔ اس پر حفیظ جالندھری ہم میں سے اٹھ کر مکر و فون پر چلے گئے اور منظور انسا صدیقی سے بولے: "بیٹی، میں بات کروں گا۔ اور سائین

سے مخاطب ہو کر بولے "پیارے، کتنا میں چھاپنے کے لئے روپیہ چاہیے۔ روپیہ کہاں سے آئے گا؟" اس پر ایک صاحب حفیظ کا ہو کر اٹھ کھڑے ہوئے اور بولے: "صاحب صدر، یہ کون ہے جو ہم میں سے اٹھ کر آپ کی اجازت کے بغیر مکر و فون پر بولنے لگے۔ میں آپ سے درخواست کرتا ہوں کہ اس کو کہا جائے کہ وہ اپنی جگہ پر آ کر بیٹھ جائے اور مکر و فون ڈاکٹر صدیقی کو دے دے۔ صاحب صدر نے جواب دیا: مجھے حیرت ہے آپ ان کو نہیں جانتے۔"

ان صاحب نے کہا: "جی ہاں۔ میں انہیں نہیں جانتا، یہ کون ہیں۔"

صاحب صدر نے کہا: "یہ ابوالاثر حفیظ جالندھری ہیں، ان کو اس مذاکرے میں حصہ لینے کے لئے مدعو کیا گیا ہے۔ بعد میں جب جلسہ برخواست ہو گیا تو شاہد احمد دہلوی نے حفیظ جالندھری سے کہا:

"حفیظ صاحب، یہ دیکھ کر بہت خوشی ہوئی کہ ایسے بھی ہیں جو آپ کو نہیں جانتے۔" (دہشکر یہ ریڈیو پاکستان کراچی)

”ماہ نو“ میں مضامین کی اشاعت سے متعلق شرائط

- ۱۔ ماہ نو“ میں شائع شدہ مضامین کا معقول معاوضہ دیا جائے گا جس کے بعد وہ ادارہ کی ملکیت ہوں گے اور وہ انہیں حسب منشا ہر طور سے استعمال کرنے کا مجاز ہوگا۔
- ۲۔ مضامین بھیجے وقت مضمون نگار حضرات ماہ نو“ کے معیار کا خیال رکھیں اور یہ بھی تحریر فرمائیں کہ مضمون غیر مطلوب ہے اور اشاعت کے لئے کسی اور رسالہ یا اخبار کو نہیں بھیجا گیا ہے۔
- ۳۔ ترجمہ یا تلخیص کی صورت میں اصل مصنف کا نام اور دیگر حوالہ جات دینا ضروری ہیں۔
- ۴۔ ضروری نہیں کہ مضمون موصول ہونے ہی شائع ہو جائے۔
- ۵۔ مضمون کے ناقابل اشاعت ہونے کے بارے میں ایڈیٹر کا فیصلہ قطعی ہوگا۔
- ۶۔ ایڈیٹر کو مسودات میں ترمیم و ترمیم کرنے کا مجاز ہوگا مگر اصل خیال میں کوئی تبدیلی نہ ہوگی۔
- ۷۔ مضامین صاف اور خوش خط کاغذ کے ایک طرف تحریر کئے جائیں۔ مہتمم بہت صاف اور مکمل درج کیجے۔
- ۸۔ اپنے مضامین نظر و نشر کے نقول اپنے پاس بھی رکھئے۔ غیر طلبیدہ اور ناقابل اشاعت مضامین کی واپسی کے لئے ڈاک کے مناسب ٹکٹ روانہ کیجئے۔

بڈل

ابو سعید قریشی

ہاے تو سرکار کی طرف سے بخشش۔ برابر ہے تو حوصلہ افزائی اور مال
بھر کے لئے چارکے زمین الگ۔

لوگ بڈل سے اسی طرح آشنا تھے جس طرح دریا کی بازو سے،
جوان کو ہر سال نئی شہی دے جاتی تھی۔ رمضان اسے آلام کے جھگڑوں سے
پکڑ کر لایا تھا لیکن اس کا بچپن کسی کو یاد نہیں تھا۔ کچھ روز کے جھنڈ اور
جھنڈ کی چھاؤں میں نیلی محرابوں والے مقبرے کی طرح جس کے بارے میں
کسی کو معلوم نہیں تھا کہ وہاں کون دن ہے، لیکن اس کے باوجود وہ
وہاں موجود تھا۔ بڈل بھی علاقہ کی زندگی کا ایک ضروری جزو تھا۔
اس سے آگے سوچنے کی ضرورت نہیں تھی۔ اس کا ڈولنا ہوا سایہ۔ جیسے
پہاڑ ڈول رہا ہو۔ نوگڑ سے پرے کے غرس، کوڑی شاہ کے پہلے اور بھوک
جھوک میں دیکھا گیا تھا۔

اس کی تھوٹی پرچڑے کا پٹا چڑھا ہوا ہوتا۔ وہ طرح طرح کے
تاشے دکھاتا سنی بادشاہوں کو سلام کرتا، بچے اس کی سواری کرتے
اور قلندر کی بھوٹی پیسوں سے جھنجھٹا لگتی۔ کچھ لوگوں کا خیال تھا کہ
قلندر سے ضرور فہم کھلائے گا اور اس کی ڈاڑھیں نہیں ہیں۔ لیکن
ان لوگوں نے اس کو اکھاٹے میں نہیں دیکھا تھا۔

اس کے پاؤں بڑے بڑے تھے۔ تاخیر سلامت تھے۔ اور
ان پر بھریاں پڑی ہوئی تھیں۔ یہ بھریاں اس کی عمر کا پتہ دیتی تھیں۔
لیکن وہ کتنے سال کا تھا یہ بھید قلندر ہی جانتا تھا۔ اس بارے میں
زیادہ کریدنے پر وہ ہمیشہ ہنس دیتا۔ بھریوں کا کیا ہے حاصل
ہات تو یہ ہے کہ جان کتنی ہے کسی میں؟

بڈل کے بال کالے اور لمبے تھے اور اس کی ہالہ کوتارے میرے
کے تھیل کی مالٹا نے صحت مند رکھا تھا۔ لیکن اس کے بڈل کی
بوسے بھر گئی جانوروں میں کھلی جاتی۔ کھونٹوں سے بندھے ہوئے
ڈھونڈا نگر سنو سے زمین کھودتے گئے۔ بھڑوں کے ریوڑ مچا

پتن اوٹوں کی بلبلاتوں اور جانگلیوں کے قہقروں
سے گھبرکتا تھا

بیروں کی بجائے بیلی کی جھاڑیوں میں چھپ چھپ کر
جھوم رہے تھے کچھ بڈل کے جھنڈوں میں گھوڑوں کی
ہنہنا، ہنہن جاگ اٹھیں۔ پیرنگ رہا تھا جیسے
میلہ لگا ہو۔

جب فصیل کٹ چکتی تھیں۔ کوٹھے بھر جاتے اور فاضل اناج
منڈیوں میں پہنچ جاسا زمینداروں، کسانوں، مزدوروں اور کینوں کو
آئندہ فصل کی تیاری تک کوئی کام نہ ہوتا، دن دریا کے پاٹ کی طرح
پھیل جاتے اور وقت کاٹے نہ کٹتا تو ہر سال یہی ہوا کرتا۔ مجرے،
عشق، اغوا، افسانے، ڈاکے، گھڑ دلف، نیزہ بازی۔ مینڈھوں کی لڑائی،
بیلوں کی دوڑ..... اور بڈل دباؤں اور زچکی کا دھچک۔

دیگیوں کے منہ کھل جاتے اور کل کی کارندے مزدور
اور چھوٹے موٹے زمیندار وہ دو تین تین دن سیدوں کے مہان ہوتے۔
بڈل نے بجلی دیکھی تھی..... بجلی اور بڈل کا دھچک.....
ٹراچی سوار کسی کئی دن پہلے مربعوں میں گھوم جاتا۔ سیدوں کی رعایا
کے لئے گولہ یاہ حاضری کا حکم ہوتا۔ جھوک جھوک کے لوگ گھروں سے
نکل کھڑے ہوتے اور رشتی کے دن ایک ایک کے بارے میں پوچھا جاتا
کہ کون کہاں ہے۔ سید فضل شاہ کے بڈل اور رمضان قلندر کے بڈل کا
جوڑو سو کام کا ایک کام تھا۔

بڈل کے بارے میں مشہور تھا کہ جب وہ اکھاٹے میں اترتا
تو افق آنکھ سے اگل چوہا تھا جیسے شاہ کی آندھی ہو جیسے، کالا گولا.....
رمضان کی کو سال بھر اس دن کا انتظار رہتا۔ اس کو معلوم
تھا کہ بڈل جیتے یا ہاے میرے پانچ سو کھرے ہیں۔ جیتے تو بڈل کا حق۔

سے پوچھا۔

”جھڑے کاٹی شے ہی تھیں۔ شینہ نال سائیں :-۔۔۔ ریچھ تو کوئی شے ہی نہیں تھا۔ بجلی شیر سے بھی لڑ سکتا تھا لیکن جب زمیندار نے بجلی کے عوض چار سیکڑے زمین کی پیشکش کی تو سیکڑے کے ہکسے پر کہہ کر قبول کر کے اسے اٹھا کر دیا کہ کتنا اور ہار تو شوق کی باتیں ہوتی ہیں۔ آپ کو پسند آیا ہم نے دے دیا۔ یہی زمین تو گبولوں نے بھی کہیں گھر بنایا ہے۔ ہوا بھی کہیں بندھی ہے۔

اور آج لوگ دور دور سے پھر بجلی اور بادل جوڑ دیکھنے آرہے تھے۔ بے کار وقت کاٹنے کا ایک اور بہانہ۔ کبڈی اور چمچہ آزمائی کی طرح۔

میدان کا سورج سوائیز پر آگیا۔ اکھاڑے میں ریت کے ڈرے چمکنے لگے۔ تماشائیوں کی ٹوپیاں بٹھکیں۔ ڈھول کی آواز قریب آگئی اور تلندار کے پیچھے پیچوں بوڑھوں اور نوجوانوں کا جلوس ریچھ کو لئے اکھاڑے کی طرف بڑھا۔

تماشائی پیچھے پیچے ہٹ گئے۔ رمضان تلندار کا قول تھا کہ انسان سمیت کسی جانور کا بھروسہ نہیں کون چائے کس وقت کیا کر بیٹھے۔ ڈھول کی آواز پھر گونجی اور زمیندار لال اور فیروز کا رنگ کالا چ۔ زری کا کھوسہ اور سونے کے بٹنوں والا ریشمی کرتہ پہنے اپنے خاص کارندوں کے ساتھ آتا ہوا دکھائی دیا۔ اس کی پگڑی کا طرہ بجلی کے کالوں کی طرح کھڑا تھا۔ اس نے اچھے آصعینیں اٹھ رکھی تھیں اور اس کی فیروزہ جڑی آنگوٹھی کے گرد گنڈھی ہوئی چرمی رسی لپیٹی ہوئی تھی۔ جس کے آگے آگے بجلی یوں نظر آ رہا تھا جیسے کمان کی باہوں سے نکلا ہوا تیر۔ گرنے سے بچنے کے لئے زمیندار پیچھے کی طرف جھکا ہوا تھا اور اس کے قدم یوں زمین پر پڑ رہے تھے جیسے آدمی اور جانور میں رسہ کشی ہو رہی تھی۔

ہجوم چپ ہو گیا۔ گردنیں جھک گئیں اور سینکڑوں ہاتھ سائیں کی سلاخی کو اٹھے۔ زمیندار نے اپنی رعیت پر ایک پھل پھینکی جو محو ڈالی۔ اکھاڑے کی دوسری طرف رمضان تلندار نے زمین کو چھوا اور مالک کو دعا دی۔

”کیون ا دے تلندار چہ تیار ای.....“ زمیندار نے صحابیوں میں گندھا ہوا سوال رمضان کی طرف پھینکا۔

اور بڑے بڑے آجڑی دریلوٹ کے رکھوالے شکاری اور پٹکے کٹے دم دبائے کان سٹلے غرغر کانپنے لگے۔ ان کے کٹے ہوئے کان پھوٹی ہوئی آنکھیں اور بدن پر ناخنوں کے نشان اس بات کا ثبوت تھے کہ بدل سے لپٹنے کا کیا نتیجہ ہو سکتا ہے۔ بجلی کے علاوہ کوئی اس کے مقابلہ میں نہیں ٹھہر سکتا تھا۔

بجلی کو زمیندار نے اس دن دریافت کیا تھا جب وہ اپنی بیٹھا وہ اپنے شکاری کتوں کو ہرن کے پیچھے لپکتا ہوا دیکھ رہا تھا۔ اسے رہ رہ کر غصہ آ رہا تھا کہ ہرن کی بجائے ہرن اور کتوں کا فاصلہ ہرن بڑھتا ہی جا رہا تھا۔ قریب تھا کہ ہرن جنگل میں غائب ہو جاتا۔ اتنے میں ہانکے کی آوازوں کو دباتی ہوئی ایک اور آواز آئی۔ ”شابی بجلی!“ اور اس کے ساتھ ہی ایک سفید سی لہر کتوں کو پیچھے چھوڑتی ہوئی ہرن کی طرف لپکی اور کند کی طرح اس کے گرد لپٹ گئی۔ ہرن لڑکھڑایا، گرا، پھراٹھا لیکن بجلی اس کے سامنے دیوار بن کر کھڑا تھا۔ اس کے پیچھے فضل شاہ کے شکاری کتے تھے اور ادھر ادھر ڈھلچھی سوار اور ہانکا دینے والے تھے میں ایک کند لہرائی اور وحشی یوں بندھا چلا آیا جیسے آزادی سے آشاہی نہیں تھا۔ بجلی ایک ٹانہ ملٹا ساٹھی کا کتا کھلا جوتا شاہ دیکھنے کے لئے شکاریوں کے ساتھ چلا آیا تھا اور شاہابی بجلی کی آواز جو دوسری آوازوں پر چھا گئی تھی، اسی خانہ بدوش کی آواز تھی۔ اور کہہ بھی! کیوں اوئے جوان۔ کتا دکا ڈای؟ سٹکی سے اتنے بڑے فصیح انداز کو حمد و جبر کتوں اور سوتاؤ میوں کے ساتھ ہرن کا شکار کر رہا تھا، پہلی بار اتنا قریب سے دیکھا تھا۔ وہ گھر گیا اور ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ جیسے بات نہیں سمجھ سکا۔ لیکن جب اسے معلوم ہوا کہ سائیں (آقا)، یہ پوچھ رہا ہے کہ کتا بکا دیے؟ تو ہاتھ باندھ کر کھڑا ہو گیا اور بولا کہ حضور آپ ہی کا ہے۔ بجلی کا قد عام کتوں سے تندرے چھوٹا تھا۔ کھال سفید جس میں کہیں کہیں ایک سنہری لکیر جھلک کر غائب ہو جاتی۔ خانہ بدوش نے بتایا کہ وہ جیرنگ کی رنگ تھی۔ بجلی اپنے مالک کو دو روپے کی چھاڑیوں میں ملا تھا جہاں کبھی کبھی دن کے وقت بھی بیٹھ رہے دکھائی دے جاتے تھے۔ اس لئے یہ قرین قیاس تھا کہ اس کا باپ بھیڑ یا ہسی تھا۔ اور بجلی کا منہ تو بالکل بھیڑیے کا منہ تھا۔

”یہ ریچھ کے ساتھ لڑے گا؟ فضل شاہ نے کتے کے مالک

ریت کی جنگاریاں اڑ رہی ہوں۔ کتے کی کوشش تھی کہ ریچھ کو کمرے پہنچے اور ریچھ کی کوشش تھی کہ کتا اس کے تھپڑ کی زد میں نہ آئے۔ ان کے دانت چمک رہے تھے اور ایک دوسرے کے گوشت میں گھولنے کے لئے ملے تھے۔ کبھی وہ الگ ہو جاتے اور کبھی پھر تھپڑ مارتے۔ لڑتے۔ لپکتے۔ اچکتے۔ وار خالی دیتے۔ وہ غرارہ تھے۔ دھاڑ رہے تھے۔ چیخ رہے تھے۔ ہونک رہے تھے اور دونوں کی آوازیں مل کر عجیب، بگڑا ہوا ہٹ پیدا کر رہی تھیں۔ تماشا بینوں کی ہلاشیری اور نعروں نے اس میں بالکل جھجکل مٹی فضا پیدا کر دی تھی۔

پھرتے پھرتے پھرتے پھرتے پھرتے پھرتے پھرتے۔ گرتے۔ لڑ کھڑکتے۔ سنہلے۔ گرجتے۔ دھونے ریچھ اور کتا دونوں اور ان کے ساتھ تماشائی بھی ایک ہی حقیقت کے مختلف پہلو دکھائی دیتے تھے ساری فضا۔ سارا ہنگامہ۔ ساری حرکت! ہر ایک ایک دوسرے سے الجھ رہی تھیں۔ ایک کالی ایک سفید۔ ریت میں بھنور پڑ رہے تھے۔ زمین کھول رہی تھی۔ بادل کے کناروں پر۔ بادل کے اندر بلی چمک رہی تھی۔ گوند لپک رہا تھا۔ گرج تھی۔ چمکاڑیں تھیں۔ چنچیں تھیں..... ایسے میں عام طور پر ہار چھڑا دیا جاتا۔ کئی سال سے یہی ہو رہا تھا لیکن کسی نے کہا سرکار آج تو فیصلہ ہونا چاہیے۔ قلندر..... ہر سال ہانگ سولے جاتا۔

”ہاں سائیں حواریوں نے تائید کی کہ بڑی میں اب کیا رکھا ہے۔ اور کیا ناخن تک تو ترخ گئے ہیں سائیں اور دھڑا ہل چکے ہیں۔ رب تمہارا بھلا کرے“

”اے قلندر!..... زمیندار کی کالی جانوروں کی آواز کو دباتی ہوئی سائی دی۔

”اج فیصلہ..... اچ۔ چھ نین یا کتا نین۔ جو حکم بادشاہ ہو۔“ رمضانی قلندر نے ہاتھ بائیں کر عرض کیا بجلی بھی لٹا ڈالتے بدل دی تھوڑا پراسان فی سمجھ وج نین اور ندا کہ اک دے بغیر دو جان بدل جس نہ بجلی۔ اس کو اپنے ہانگ سولہ ہار کے زمین کی پٹری سے سائیں۔ سرکار کی خوشی

”تیا ہے سائیں۔ نوکر کس کا ہے۔ رمضانی بھی اور ریچھ بھی کھٹے کس کا ہیں موتیوں والی سرکار“

”پرندے کے چھتے کا آپ ہی تو نہیں کھا گیا زمیندار سے کہا: ”بھا بھا سائیں جو تھا ہناؤ قلندر نے ہاتھ ہانہ کر جواب دیا۔ ”کہہ دیا کیونکہ اے... خدائی دار کچھ نہ لے سکا ہوا دواے کزود ختمی جاتا ہے۔

رمضانی نے بتا کر اگر کچھ نہادہ موٹا ہو جاتا تو لڑنے کے قابل نہیں رہتا۔ اس کی ساری پھرتی ختم ہو جاتی ہے۔ زمیندار نے انہی مونچھوں کو تار دیا اور مسکرایا اسے معلوم کہ ڈھکل سے پہلے سدھے ہوئے جانوروں کی تندی کو خاص خاص کر گیا ہے اچھا لگتا ہے۔

ڈھول کی کھال پر تمپیاں پھرتی تھیں۔ تماشائیوں کا حلقہ پھیل گیا۔ قلندر نے بدل کے منہ سے چڑے کا فیٹہ کھول دیا۔ ریچھ نے جا ہی لی اور جیسے دودھیں بادل سا گرہ لٹھا۔ اس کی دائیں اور دانت کیلون کی طرح چمک رہے تھے۔ ”ساکر سرکار کو قلندر نے کیلیں فلاں کا دیتے ہوئے کہا۔ بادل کچھ پاؤں پر کھڑا ہو گیا۔ اس کا ہاتھ اپنے ماتھے کی طرف اٹھا۔ زمیندار کی باجیس کھل اٹھیں۔ دستور تھا کہ ریچھ زمین میں کھوٹا کر کر رہی رہے ہاتھ دیا جاتا تھا لیکن جب سے بھل اور بڑل کے جوڑ شروع ہوئے یہ رواج ترک کر دیا گیا تھا لیکن فضل شاہ نے کہا تھا کہ بدل کو اپنا جو مل گیا ہے۔

ڈھول کی کھال پھرتی۔ قلندر نے آواز لگائی پیچھے ہٹ جاؤ سٹیو اسٹا دے کہا ہے کہ آدم ناد اور جنا درد دونوں کا کوئی بھروسہ نہیں۔

بہت سارے ڈھول ایک ساتھ گرجے بدل اور بجلی بے ہو گئے اور پھر اور اور قلندر اور اور فضل شاہ کی جانب سے دو نعرے بلند ہوئے۔ بے معنی وحیانہ، لڑوہ خینہ اور ایک سفید شعلہ کالے بادل کی طرف لپکا جو اکھاڑے کے اندر کوئی سات فٹ اور کواٹھ رہا تھا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے وہ آسمان کو جا چھو گیا اور بارش ہونے لگے گی لیکن ہانی کے چھینٹوں کی بجائے ریت اڑی کٹا اور کچھ ایک دوسرے کا پیچھا کر رہے تھے۔ دائرہ باندھے۔ لپکتے ہوئے۔ آگ اور دھوئیں کا چکر ہر جیسے۔ اور سارے میں

خون کے پیاسے

حمید کاظمی

سے جود ملا۔ فوراً اس کا ماتھا ٹھنکا۔ زینہ کے آگے ایک بہت بڑی الماری رکھ کر بخوشی نفع کو آمد رفت کا راستہ بند کر دیا تھا۔ نفع کو تھپ کے رہ گیا۔ اس پر کچھ ایسی کیفیت طاری ہوئی جیسے وہ ایک نئے سمٹ کر زینے پر ڈھیر ہو جائے گا۔ اس نے زور زور سے الماری کے دروازے پر ہاتھ مارے بلکہ خوشی کی کہ وہ کسی طرح اسے اپنے راستے سے ہٹانے میں کامیاب ہو جائے لیکن الماری اتنی مضبوط تھی کہ اپنی جگہ پر قائم رہی جیسے کسی نے کی طرح زمین میں گڑی ہوئی ہو۔ وہ لگتا الماری کو دھکیلتا اور دھک دیتا لیکن بخوشی سے مس نہ ہوا۔ گزشتہ رات نفع کو اور بخوشی میں کسی بات پر شدید جھگڑا ہو گیا تھا لیکن اسے تو یہ نہیں بتی کہ بخوشی دراصل کے طور پر دروازہ کجا بند کر دے گا۔

نفع کو دراصل صوف اوپر ملے کمرے کا ایک کھانا اور بخوشی کے کمرے، دکان، کلاں پہلے کمرے کا زینہ کچلی دکان میں اترتا تھا اور پھر دکان سے راستہ باہر جاتا تھا۔ اس کے علاوہ اوپر ملے جانے والی کوئی دوسرا راستہ نہ تھا۔ اس عجیب و غریب سرحدی تقسیم کی وجہ سے نفع کو اور بخوشی میں ہمیشہ تکرار رہتی تھی کبھی کبھار گالی گلوں تک تو بہت پہنچ جاتی اور کئی مرتبہ تو ہاتھ پائی تک ہوتے ہوئے رہ گئی۔

آزادی سے پہلے پورا امکان چند و حلوانی کے پاس تھا۔ نیچے دکان میں چند دھماکے بچتا تھا اور اوپر ملے کمرے میں اس کے بال بچے رہتے تھے۔ فسادات میں بھاگ بھاگ کر چھوٹی تو چند و حلوانی رات دکان مکان چھوڑ بال بچے سمیت ملک سے چلا گیا۔ نفع کو اور بخوشی جو ایک ساتھ مشرقی پنجاب کے ایک ہی شہر سے آئے تھے اور چند و حلوانی کے مکان کی ناک میں بھی تھے، چند و حلوانی سے جاتے ہی اس میں برہان ہو گئے۔ بخوشی نے چند و حلوانی سے تھکا تھکا کر بیٹھ گیا اور

نفع کو نے کسی جسمانی ضرورت کے دھانکے تحت بار بار پانی سے اپنے کپڑوں کی نیکس بڑی وہ بیلا ہونے کے لئے پہلو بٹاتا تو نیکس گہرے اور دبیر سے اپنی گرفت اور زیادہ مضبوط کر لیتے اور نفع کو نے اپنے خزانے کے لئے گنا جیسے دو دھبے ہوا کہ اس کے جسم کے اعضاء اس کے اختیار سے باہر ہو رہے ہیں اور وقت برداشت جواب دے رہی ہے۔ اس کی آنکھیں پھٹنے سے کھلی گئیں اور وہ یکدم سانپ کی طرح جل کھا کر اٹھ بیٹھا۔ کمرے میں گہرا اندھیرا چھا ہوا تھا۔ اور بخوشی کھڑکی سے بھی دھکی کے کوئی دھماکا نہیں ہو رہا ہے۔ سر ملے پڑی ہوئی لاشیں اس نے ہاتھوں سے ٹٹولی کہ بے مینی کے عالم میں جلدی ملدی جاتی، اور بخوشی میں آئی ہوئی لاشیں نے صرف اس قدر بخوشی کی لکڑی کے کمرے کی آگ کی بین روشنی کا ایک ہلکا سا گلاب پڑ گیا۔ وہ اپنا پیٹ دونوں ہاتھوں سے تھام کر چار دیواری سے نیچے اتر کر چلا تو گڑی کی بوسیدہ، شکستہ اور غیر ہموار چھت چار دیواری کی چھلکی کے طرح ہر جگہ کھٹکھٹ اور جب فضا تیز چل کر بخوشی سے نیچے اترنے کا قہقہہ لپٹا رہا جیسے ابھی نیچے بخوشی کی دکان میں گرہائے گی۔ لیکن نفع کو کی اس کی خشکی اور بوسیدگی سے کوئی تشویش نہ تھی۔ وہ اس کے ہر نقص اور غامی کا عادی بن چکا تھا۔ بلکہ وہ اس بات سے ہی مطمئن اور مسرور تھا کہ ٹوٹی پھوٹی چھت اور شکستہ سی چار دیواری جیسی کچھ بھی ہے اس کی اپنا ہے، وہ خود اس کا ملک ہے اور جس کے ملک میں حقوق کے کھنڈات کو اس نے مندرجہ کی چہ میں کسی انہوں میرے کی طرح محفوظ کر رکھا تھا۔

وہ جسمانی کرب کے عالم میں بیچ و خم کھا ہوا اپنے کمرے کے شکستہ اور بھولے ہوئے زینے سے نیچے اترتا تو خلاف معمولی زینہ آگے

اور بخوشی بولے نام دودھ کا پیلا چولہے پر چڑھائے چھوٹکیں مارتا تو بڑے سارے دن میں شکل سے دو چار گاہک آجاتے تو آجاتے ورنہ دودھ جمع کر کے دی جادیتا۔ پھر دی بھی اگر بک گیا تو بک گیا ورنہ خود کسی کے پاس بیجاتا۔ ذمہ داریاں تمہیں نہیں۔ فقط اپنا اپنا پیٹ پالنا مقصود تھا۔ اوروہ بہر طور پال رہے تھے فضلو اگر شام کو اتفاقاً کہیں باہر چلا جاتا تو بخوشی دیکھتا کہ شام ہی دروازہ بند کر کے اور تہی بھٹکے سو جاتا اور فضلو کو ٹھٹھکی ہوئی راتوں میں ٹھٹھکے بھڑا ہر کھڑے ہو کر دروازے پر دستک دیتی پڑتی۔ جب کہیں بخوشیاکتا ہٹ کے ساتھ دھننا کھولتا اور ساتھ ہی بڑھنے لگتا۔

”مصیبت ہوئی میرے لئے۔ جیسے کسی کے باپ کا نوکر ہو۔ خود..... بائیسکوپ دکھیں اور میں راتوں کو اٹھ اٹھ کے دھننا کھولوں!“

”کس..... نے بائیسکوپ دیکھا ہے.....! فضلو جواب دینا ایک ذرہ سی گالی دیتا۔“

”دیکھ مہ منہ حال کے بولی فضلو۔ نہیں تو کسی دن تیرا ایل حال ہو جائے گا۔“ بخشو متنبہ کرتا۔

”اے کر کے دیکھ ناں۔ کب دیکھا تھا تو نے مجھے بائیسکوپ دیکھتے ہوئے؟“

”نہیں دیکھا تھا تو جا جہنم میں۔“ پرسن لے میں کل سے دھننا نہیں کھولوں گا۔ عزت پاری ہے تو شام سے پہلے اوپر چڑھ کے سو جا کرٹ

”سب جانتا ہوں۔“ فضلو معنی خیز انداز میں جواب دیتا۔ ”میں شام سے پہلے اوپر چڑھ کے سو جاؤں اور تو چھپے چھپے کے چھو کر دل کو تہی کر کے بیٹھ جائے گا۔“ دیکھ بک بک کر بخشو تڑپ کر بولتا۔

”اب کیوں برا لگا تجھے۔ فضلو تنک پاشی کرتا۔ اور بے تدبیر شکتہ چرچلاتا اور زمین طے کر کے اپنے اپنے کمرے میں چلا جاتا۔ کمرے میں بکلی۔ پانی غسل خانا یا اسی قسم کی ضروریات کی دوسری چیزوں میں سے کوئی چیز بھی نہیں تھی اور نہ کسی فضلو نے ان اشیاء کی کمی کو محسوس ہی کیا تھا۔ لیکن چھٹکے والی رات کو خلاف معمول جسمانی مجبوری کی وجہ سے وہ زینے سے نیچے جھڑکنا تو نہ دینا گئے سے بند ملا۔ تھلا کر رہ گیا۔“

فضلو نے اوپر والا کمرہ منہ حال کیا۔ چونکہ دونوں کا ناخاگر قبضہ تھا ہذا شروع شروع میں دونوں میں بڑا ایکارہم اور آپس میں بڑے شیر و شکر تھے اور ہر بات پر متفق رہتے تھے۔ اور کسٹوڈین کا خطرہ لگنے والی تلوار کی طرح انہیں ہر وقت اپنے سروں پر محسوس ہوتا تھا جسے ٹپانے کے لئے وہ ہر ہر سروں پر کھینچتا اور منسوبے بناتے رہتے اور اس گٹھ چلنے میں وہ ایک دوسرے کے اور لگے رفیق اور ہمہ مددگار تھے لیکن آخر کار ایک دن کسٹوڈین کے عملے نے ان کے مکان کو دریافت کر لیا اور اس پر اپنی ہتھی لگا دی، اور دونوں پر پانچ روپیہ دینے کا یہ بھی ٹھونک دیا۔ اور جب جیب سے کرایہ بھٹکنے لگا تو دونوں اپنے ہاتھ کر لے کر اپنے دارچونے کا احساس بھی ہونے لگا اور کچھ بھی کہا کر کسی بات پر تکرار بھی ہو جاتی۔ فضلو اپنے شکستہ فرش پر آکر سہائی کا ایک گلاس بھی گرا دیتا تو وہ قطرہ قطرہ بھوٹ کر نیچے بخشو کے سر پر یا پتلیوں پر گرتا۔ یا وہ کوئی چیز زور سے فرش پر پھینک دیتا تو مٹی بارش کی طرح بخشو پر برسے لگتی۔ یا بخشو اگر پتلیوں اور چوہوں کی زد سے محفوظ رکھنے کے لئے کوئی چیز حمت میں ٹانگے کی خاطر ایک کیل بھی گرتا تو وہ سیدھی اوپر فضلو کے فرش میں ٹپک آتی۔ یہ تمام باتیں دونوں کے درمیان اختلافات کا باعث بنتی گئیں اور اس، دوستی اور محبت کے دروازے آہستہ آہستہ بند ہو کر دونوں کے درمیان نفرت کی دیوار اٹھنے لگی۔ یہ کشمکش جاری تھی کہ کچھ عرصہ بعد متر و کمال کا نیلام شروع ہوا۔ لوگوں نے دھڑا دھڑا خریداری خریدیں لیکن اس عمارت کو خودوش سمجھ کر کسی نے بھی کوئی دیکھی نہیں لی۔ فضلو اور بخشو کے پاس اپنے لئے چلے دو تین ہزار کے کلیم تھے۔ ہذا انہی کلیموں پر بولی بولی کر دوڑا لے اپنا اپنا حصہ بچا خرید لیا۔ مگر مالکانہ حقوق حاصل کرنے کے بعد اختلافات اس قدر بڑھے کہ دونوں کے درمیان دشمنی اور نفرت کی ایک مستقل طلیع قائم ہو گئی۔ اب تو بات بات پر جھگڑا، گالی جھگڑا اور ہاتھ پائی ہونے لگتی۔ بخشو نیچے دھوئیں والی لکڑیاں جلاتا تو اوپر فضلو کی آنکھیں جلنے لگتیں۔ اور فضلو کا دکان میں سے گڈر کر آنا جانا بخشو کو ناگوار ہی نہیں ہوتا تھا بلکہ یہ اپنے مالکانہ حقوق میں مداخلت اور غاصبانہ حکمرانی کے مترادف نظر آتا۔

دلچسپ یہ کہ دونوں بہت ہی کم باہر نکلتے تھے۔ فضلو نے بھی کام دھند چھوڑ رکھا تھا بس سارا دن اپنے کمرے میں بیٹھا پنجم کھنکھارتا

اس نے بہت سے زور مارے لیکن الی الی اتنی مضبوطی سے اپنی جگہ پر قائم تھی کہ ایک انچ آگے کی طرف نہ سرک سکی۔ پھر فضلو کے اپنے عصا نے بھی جیسے جواب دے دیا اور اسے اپنی ٹانگوں کے سہارے کھڑے رہنے کی سکت نہیں رہی۔ پھر اسے یوں محسوس ہوا جیسے تڑپتی کرتے ہوئے اس کی گرفت سے رسہ آزاد ہو گیا ہو۔ وہ سمٹ سمٹ کے وہیں آخری زینے پر لٹا رہا کہ ساتھ ڈھیر ہو گیا۔ پھر کچھ دیر بعد وہ نہایت سیدھے سجھاؤ طریقے سے اوپر چڑھ کے اپنے کمرے میں واپس چلا گیا۔ کھڑکی سے باہر جھانک کر گھبراہٹ مٹا دیا۔ رات کا ایک نظر میں جائزہ لیا۔ اور ٹھٹھائی ہوئی تہی بچھا کر پھر چارپائی پر دراز ہو گیا۔ نیچے بخشو کو اس کی حرکت کا پتہ چل چکا تھا اور اب وہ گولیوں کی طرح تالٹر توڑ گالیاں اوپر برسسا رہا تھا اور ہر ایک ایک گالنی فضلو کی سمجھ میں آ رہی تھی لیکن وہ ان پر کوئی دھیان نہیں دے رہا تھا۔ اس وقت اسے زیادہ فکر اس بات کی تھی کہ اگر بخشو نے زینہ نہ کھولا تو وہ نیچے کیسے اترے گا۔ روزمرہ کے جھگڑوں کا تو وہ عادی ہو چکا تھا لیکن یہ اچانک پیدا ہونے والا مسئلہ اس کے لئے جان لیوا ثابت ہو رہا تھا۔ اس نے سوچا کہ صبح اٹھ کر قانونی کارروائی کرے لیکن سنجیدگی سے غور کرنے کے بعد وہ اس نتیجے پر پہنچا کہ قانون بھی دوسرے کی دکان اسے راستے کے طور پر استعمال کرنے کی اجازت نہیں دے گا۔ بصورت دیگر اسے یہ بھی خدشہ پیدا ہو رہا تھا کہ معاملے کی پیچیدگی کے پیش نظر کہیں لینے کے دینے نہ پڑ جائیں اور دونوں میں سے کسی ایک کو مکان سے دستبردار ہی نہ ہونا پڑ جائے اور وہ شخص خود ہی نہ ہو۔ لہذا مصلحتاً اس نے قانونی کارروائی کرنے کا ارادہ ترک کر دیا اور صورت حال سے خود ہی نشے کا فیصلہ کر لیا اور اس توڑ جڑ میں ابھی اس کی پھر آنکھ گام گئی اور وہ دوبارہ دودھ بلانے کے سے انداز میں خنٹے لینے لگا۔

صبح حسب معمول اس کی آنکھ تو بہت جلد کھل گئی تھی لیکن وہ بہت دیر تک پڑے پڑے یونہی کمرے میں بدلتا رہا اور دن چڑھے اس وقت اٹھا جب جتنی کھڑکی سے سورج کی شعائیں اندر داخل ہونے لگیں نیچے بخشو کی دکان اور گلی میں زندگی کے آثار معلوم

ہوئے تھے لیکن فضلو کوئی چہرہ دیکھ نہیں سکتا تھا۔ پچھلی کھڑکی ایک گندے تالے کی طرف کھلتی تھی اور سامنے کی طرف کسی قسم کی کھڑکی یا دروازہ وغیرہ کچھ نہ تھا، سوائے ایک زینے کے جو بخشو کی دکان میں اترتا تھا۔ اس نے ایک مرتبہ پھر جھانک کر زینے سے نیچے دیکھا۔ وہ ہنونا گھسے بند تھا۔ فضلو کشمکش کے عالم میں ایک دوسرے زینے سے نیچے اترتا اور بندھے کے قریب پہنچ کر اوپر واپس چڑھ گیا۔ کوئی بھی حل اس کی سمجھ میں نہ آ رہا تھا۔ اس نے اشتعال میں آ کر زینے کی طرف منہ کیا اور رہا واز بند نیچے بخشو کی دوش گالیاں دیں۔ نیچے سے بخشو نے بھی ترکی بہ ترکی جواب دیا۔

”تو ہے۔ تیرا باپ ہے“

اس نے سوچا کہ وہ جواب میں اس کے دادا اور پردادا کا نام نہ گواہے۔ لیکن آیا کرنے سے اس کی مشکل تو حل نہیں ہو سکتی تھی۔ وہ سٹپا کے رہ گیا اور بخشو کو زور کرنے کے لئے دو تین مرتبہ کچے فرش پر بند کی طرح زور زد سے قلابازیاں لگا کر فرش پر زلزلہ سا طاری کر دیا جس کی وجہ سے مٹی کی ایک بو چھالنے لگی۔ اور اس کے تبادلے میں چند صلواتیں اوپر آئیں اور فضلو ٹھٹھا ہو کر چارپائی پر بیٹھ گیا بیٹھے بیٹھے سوچنے لگا اور سوچتے سوچتے پھر چارپائی پر دراز ہو گیا۔ لیکن کوئی بات اس کی سمجھ میں نہیں آ رہی تھی کہ وہ نیچے کیسے اترے۔ اس نے ابھی ناشتہ بھی نہیں کیا تھا اور جانے کی طلب تو خاص طور سے اسے بہت پریشان کر رہی تھی۔ وہ ہوٹل والے کو آواز دے کر جانے کا کپ اوپر بھی منگوا لیا کرتا تھا لیکن آج تو کوئی آواز دینے کی جگہ تھی اور نہ جانے والا ہی کسی طرف سے اوپر نہ سکتا تھا۔ اسے محسوس ہوا جیسے بخشو نے اس کے آنے جانے کا راستہ ہی نہیں بلکہ کھانے پینے اور فراغت پالنے کے تمام راستے بھی بند کر دیے ہوں۔ نفرت اور حقارت کے جذبے سے اس کے سینے میں ایک بھٹی سی دکنے لگی اور انتقام کے شعلے اس کی آنکھوں میں بھر گئے تھے۔ وہ جھٹ لگا کر چارپائی سے اٹھا اور نیچے زینے کی طرف منہ کر کے گر جھڑا قانون میں دودھ بکا رہا۔

”زیرید!۔ زیرید!“

”شہیدا۔ شہیدا“ بخشو نے ترکی بہ ترکی قافیہ ملایا۔

فضلو وانت پیتا ہوا واپس آیا اور وہ خالی الما ہن ہو کر چارپائی پر

جواس نے نالے کی طرف جھکی کھڑکی کے ساتھ لگا دی۔ اور پھر اس کے
فدیے اور پرچہ دیا۔

کچھ عرصہ تک تو وہ یونہی کسی کوہ ہمایا کی طرح نالے کی طرف
کھڑی بیٹھی رہی۔ چڑھتا اترتا رہا۔ لیکن یہ عارضی سیڑھی اتنی غیر محفوظ تھی
کہ اسے ہر وقت اپنی جان کے خطرے سے پہچنے کہ ڈرنا پڑا۔ وہاں پہلے تو وہ
ایک لمحے کے اندر دو نشیب کی طرف نالے میں پڑا ہوا تھا اور ایک دن
تو صبح اس کے پاؤں کے نیچے سے سیڑھی نکل ہی گئی تھی لیکن غرض قسمی
سے اس وقت وہ اوپر والی کھڑکی میں ہاتھ ڈال چکا تھا اور اس طرح
سوت کے منہ میں گرے سے ہال ہل چکا گیا۔ اس دن تو اس کی روح فنا
ہو گئی تھی۔ وہ ایسا خوفزدہ ہوا کہ دوسرے دن کمرے سے باہر ہی نہیں
نکلا۔ اور تمام دن یوں بے مقصد بیٹھا رہا جیسے قید تہائی جگت رہا ہو۔
پہلے سا دن اس نے بند کمرے میں سونے کی صاف روشنی اور دھوپ
دیکھی بغیر گزار دیا۔ پھر سبیت ناک رات سر پر آگئی اور اسے اگلے
دن کی فکر ستانے لگی۔ اب وہ جسمانی اعتبار سے بھی اس قابل نہیں
رہا تھا کہ دوسرا دن بھی بند کمرے میں گزار دے۔ لہذا اگلے دن کے
فکر سے رات اسے سخت بے چینی رہی اور نیند اس کی آنکھوں کے
قریب نہ پہنچی۔ وہ اپنے ذہن میں برابر کوئی کھڑکی بچاتا رہا۔ پھر جب
دور کسی گھر والے نے رات کے ایک بجے کی گھنٹی بجائی تو وہ چپکے سے
اٹھا اور تباہی جلائے بغیر اندھیرے ہی میں راستہ ٹھونکا۔ دسے قدموں سے
سے نیچے اتر آیا۔ اور راستہ روکنے والی الماری کا جائزہ لینے لگا۔
اندھیرے میں بختو کے خزانے لینے کی آواز سے صاف سنائی دے
رہی تھی۔ اور اس کی گہری نیند سے مطمئن ہو کر فضلو نے آہستہ آہستہ
الماری کو کھولا۔ دھکیلتا شروع کیا۔ اس نے اپنے دونوں پاؤں
پچھے زینے میں جمائے اور کندھا لگا کے پوری الماری کو زور
جو دیا تو الماری آگے مرک گئی۔ اور اسے محسوس ہوا کہ آدی کے
نکلنے کا راستہ بن گیا ہے۔ تجربے کے طور پر وہ الماری کے پچھے سے
گزر کر بختو کے کمرے میں اتر آیا۔ صبح اسی وقت بختو نے "چور۔
چور!" کی آوازیں لگاتے ہوئے لائٹیں روشن کی اور مٹی پھٹی
آنکھوں سے فضلو کی طرف دیکھنے لگا۔ جواب اور پر بھاگنے کی نگر
میں تھا۔ لیکن بختو نے اسے موقع ہی نہیں دیا اور نہایت پھرتی سے
چھلانگ لگا کر اس کی گردن پیچھے سے اپنے بازوؤں میں جکڑ لی۔

بیٹھے بیٹھے اسے ادراحت کی گہری سیچھنے لگی تو اچانک اسے دھماکا
خیال آگیا۔ وہ فوراً اٹھا اور اڈاٹن کھولنی شروع کر دی۔ اسے خاص طور پر
اور مضبوطی مل آئی۔ اس نے ایک سوکس کے جھکی کھڑکی کے ساتھ ہاتھ
دیا۔ اور دوسرا سر نیچے نالے کی طرف بھینک دیا۔ اگرچہ اس کا جسم بھاری
تھا لیکن ڈونکا کا پتلا ٹک کر وہ محفوظ طریقے سے نیچے اتر گیا۔ نیچے پہنچ کر
اس کی جان میں جان آئی۔ وہ نالے کا ایک طویل چکر کاٹ کے دکان کے
سانے کی طرف گئی۔ آگیا بختو بیٹھا دو دھڑکی کھڑکی میں کڑھی چلا رہا
فضلو پر نظر پڑی تو ہاتھ اچانک رک گئے اور کچھ حیرت زدہ سا ہو گیا۔
— فضلو کے چہرے پر نفرت، حقارت اور انتقام کی سلوٹیں گہری تھیں۔
اس نے آؤ دیکھا دتا تو ایک نعرہ لگایا اور تہی کی طرح کو دکر بختو کی
گردن دبوچ لی۔ بختو نے بھی جواب میں ایک چھپا اس کے سر پر جڑ دیا
لیکن پیشتر اس کے کہ جھٹکا اثر تھا کچھ لوگوں نے بیجا ذکر کے چہرہ دیا۔
فضلو کو دو آدمی پکڑ کر دکان سے باہر لے آئے۔ اور بختو دکان کے
اندھیرے کی تاب کھاتا رہا۔ دو من آدیوں نے اسے اپنی گرفت میں
لے رکھا تھا اور وہ اپنے آپ کو پھرنے کی بھرپور کوشش کرتے
ہوئے پیچھے چھ کر رہا تھا۔

"مجھے چھوڑ دو۔ خدا کے لئے مجھے چھوڑ دو۔ میں آج اس کا
خون پی کے رہوں گا! اور جب لوگوں نے خدا کے نام پر بختو کو
چھوڑ دیا تو وہ چپکے سے دو دھڑکے پتیلے کے پاس بیٹھ کر اس میں چھپ
چلائے لگا۔ یوں وقتی طور پر جھگڑا تو ٹل گیا لیکن فضلو کے لئے ایک
مستقل مسئلہ پیدا ہو چکا تھا۔

وہ اپنے نصف مکان کا مالک ہونے کے باوجود
اس میں داخل ہونے کے راستے سے محروم ہو گیا تھا۔ اس نے گلی کے
چند پڑوسیوں سے شکایت کی۔ پڑوسیوں نے سمجھایا بھائی لیکن بختو
نے ایک نہیں سنی۔ صاف کہنے لگا: "میں اپنی دکان سے راستہ نہیں
دونگا۔ فضلو اوپر والے حصہ کا مالک ہے، نیچے والے کا نہیں۔ نہ میں اس کے
کمرے میں جاؤں نہ وہ میری دکان میں آئے۔"

فضلو جواب سن کے آگ بگول ہو گیا۔ لیکن پھر مصلحتاً خاموشی
اعتبار کی کہ شاید دیرینہ تعلقات کے پیش نظر بختو اپنے فیصلے پر نظر ثانی
کر ڈالے۔ اس کا سارا دن ادھر ادھر یونہی بے مقصد گھومتے گزر گیا۔
اور شام کو جب واپس آیا تو اس کے پاس ہاس کی ایک کچی سیڑھی تھی۔

اور والی منزل کی افادیت کا احساس ہو رہا تھا اس نے اللہ سے دعا کی کہ بارش کا سلسلہ ہفتے بھر تک تو جاری رہے تاکہ انتقام کے دیکھے ہوئے الاؤ میں سے ایک ایک چنگاری باہر نکل سکے۔

غالباً زندگی میں پہلی مرتبہ اس کی دعا قبول ہوئی تھی اور سادق کی بھرپوری کا سلسلہ ہفتے بھر تک تھمے میں نہ آیا اور وہ اپنے کمرے سے ایک لمحے کے لئے بھی باہر نہ نکل سکا۔ اس دوران میں وہ کھانے پینے کی چیزیں اندر ہی سے جیسا کرتا رہا۔ کچھ تلخے اندر پڑے تھے وہ اس نے کھائے۔ ڈبے میں چنے رکھے ہوئے تھے وہ ختم کئے۔ گڑا دہنی چٹ کر ڈالی اور کچی سوگی روٹیوں تک کا صفایا کر ڈالا۔ اور کبہ ہی سے لیشی نالے کو بھی استعمال میں لاتا رہا۔ یہاں تک کہ وہ خود بیمار ہو گیا۔ اور انتقام کا شائبہ تک اس کے سینے میں باقی نہ رہا۔ اگرچہ اسے بخشود کی صحیح حالت کا اندازہ نہیں تھا۔ تاہم اسے ہمدردی ہو چلی تھی اور وہ اپنے کئے پر ندامت بھی محسوس کرنے لگا تھا۔ اور اس کی اپنی حالت بھی تدریجاً نرم ہو چکی تھی۔ اس کے گھر کی کوئی چیز پانی کی زد سے محفوظ نہیں رہی تھی اور کمرہ ایک مستقل دلیل کی صورت اختیار کر چکا تھا۔ اس نے کئی مرتبہ سیڑھی سے چڑھ کر چھت کا سوراخ اندر کی طرف سے بند کرنے کی کوشش کی لیکن کوئی کوشش کامیاب ثابت نہ ہوئی۔ پانی کا نالہ بدستور بہتا رہا۔ اس کا خیال تھا کہ بخشود بے بس ہو کر آمد و رفت کا راستہ کھول دے گا اور ضرور اوپر چڑھ آئے گا۔ لیکن اس کا یہ خیال بھی غلط نکلا اور شکست خوردگی اور ندامت کے احساس نے جیسے اسے فضا میں معلق کر دیا۔ پھر اسے اچانک محسوس ہوا کہ مکان کے فرش میں کچھ اسی جنس ہو رہی ہے جو کبھی پہلے پیدا نہیں ہوئی تھی اسے اپنے پاؤں کے نیچے سے فرش کھسکتا ہوا محسوس ہونے لگا۔ پھر بیکار ایک خوفناک گرد گردلے سے ساتھ شہتیرے ٹوٹنے کی آواز آئی اور بوسیدہ فرش فضلو کو اپنی لپیٹ میں لئے گرد گردلے ہوا ریزہ ریزہ ہو کر نیچے گر گیا! پہلے تو غصا تو خون اور دہشت سے بے ہوش ہو گیا۔ اس خیال سے کہ وہ مبلے کے نیچے دب گیا ہے۔ لیکن غصہ بڑی دیر بعد اسے خود ہی احساس ہوا کہ وہ تو بالکل محفوظ ہے۔ اور مبلے کے نیچے نہیں بلکہ مبلہ اس کے نیچے آ گیا ہے۔

ہو چکی تھی۔ اور چھت پر پٹاخ پٹاخ۔ جیسے پٹاخوں کی لڑیاں چھوٹ رہی ہوں۔ چاروں طرف سے سیاہ کالے بادل اٹلا مڈ کر گئے تھے اور بارش لفظ بہ لفظ تیز ہو رہی تھی۔ وہ چپکے سے اپنی جھولنا چار پائی پر بیٹھ گیا۔ اچانک اسے نیچے کی طرف کچھ دھماکے سے محسوس ہوئے اور سارا مکان تھر تھرنے لگا۔ اس نے لپک کر نیچے سے نیچے دیکھا تو بخشود نے پھر الماری رکھ کر زینہ بند کر دیا تھا۔ اور مضبوط کر کے لئے اب دبا دبا کیلیں ٹھوک رہا تھا۔ فضلو سٹپا کے رہ گیا اور ٹہرنا ہوا واپس آ کر چار پائی پر بیٹھ گیا۔ بارش کی رفتار دہم تیز تر ہو رہی تھی۔ اور مین کی بوسیدہ چھت نے ہاجا کھلنا شروع کر دیا تھا۔ اپنے بستر کو پانی سے محفوظ رکھنے کے لئے کبھی پائنتی اور کبھی سرولنے کی طرف کھینچ دیتا۔ اور جب پانی کے چھت سے ٹپکنے کی رفتار بھی تیز ہو گئی تو اچانک اسے ایک تھوڑی اور انتہائی کارروائی کا خیال آ گیا اور اسے فوری طور پر بروئے کار لانے کے لئے عقیقہ کھر کی کی طرف سے ہانس کی سیڑھی اس نے اندر کمرے میں کھینچ لی۔ اور دیوار کے ساتھ لگا کر اوپر چڑھ گیا اور لوہے کی ایک سلاخ کی مدد سے چھت میں اندر کی طرف سے بہت بڑا سوراخ کر دیا۔ سوراخ کا ہونا تھا کہ پانی کا پر نالہ اندر کی طرف بہنے لگا۔ پھر اس نے زینے کے قریب اپنے فرش میں بھی اسی قسم کا ایک سوراخ کر دیا۔ پھر کیا تھا پانی دھان کے کھیت کی طرح کمرے میں پھیل کر آبشار کی طرح سوراخ سے نیچے بخشود کے کمرے میں بہنے لگا۔ چند لمحوں میں گندے تھے کہ بخشود نے نیچے کھلبلی چا دی تھی۔ علوم ہوتا تھا جیسے سیلاب آ گیا ہو۔ اس کی دکان ویسے ہی سطح زمین سے نیچے تھی اور پانی کی کھاسی کا کوئی بندوبست نہ تھا اور بخشود کے برتنوں سے پانی نکال پھینکنے کی آواز بادلوں کی گرج میں شامل ہو کر اوپر فضلو کو اس وقت ٹرامزہ دے رہی تھی۔ وہ پانی سے محفوظ جگہ منتخب کر کے بیٹھا تھا ٹھوسے ٹیرے کے کش لگا ہوا تھا۔ اور سہانے کے پر تالے کو عجیب نظروں سے دیکھ جا رہا تھا۔ نیچے بخشود کی دکان میں چھی ہوئی آفراتفری سے اسے بڑا اطمینان محسوس ہو رہا تھا۔ اگرچہ اس کا اپنا کمرہ بھی زیر آب آ چکا تھا تاہم پانی کا بہاؤ نیچے کی طرف ہی تو تھا اور وہ اس بات سے مطمئن تھا کہ بخشود اس سے کئی گنی زیادہ مشکل میں مبتلا ہو چکا ہے! اسے پہلی دفعہ

اس نے آنکھیں کھول کر اس درست کرنے کی کوشش کی اور پھبت کی طرف اس طرح دیکھا جیسے ایک طویل خواب سے بیدار ہوا ہو۔ پھر کھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھتا ہی رہا۔ اس کے کمرے والی منزل ہی غائب ہو چکی تھی۔ اور پانی کا پستال کافی بلندی سے بہتا ہوا معلوم ہو رہا تھا۔ اس کے جسم پر اگرچہ کوئی ضرب نہیں آئی تھی لیکن وہ سر سے پاؤں تک کچڑ میں لت پت ہو گیا تھا۔ اور اعضا بے جان معلوم ہو رہے تھے۔ اس نے برابر میں پڑی ہوئی کسی چیز کا سہارا لے کر اپنے پاؤں پر کھڑے ہونے کی کوشش کی تو اچانک اس کے کان میں ایک دبی دبی گھٹی گھٹی دردناک آواز پڑی۔ وہ چیخ اٹھا۔

”بخشوا! بخشوا! اس نے دیوانہ وار آوازیں دینی شروع کیں۔ پھر اسے بخشوا ایک جگہ نظر آگیا۔ اس کا سر باہر تھا اور باقی تمام دھڑلے کے نیچے دیا ہوا تھا۔ اور سر پر بھی بے شمار خراشیں نظر آ رہی تھیں۔

فضلو کو جیسے کوئی بجلی کی لہر چھو گئی۔ وہ تڑپ کر اٹھ بیٹھا۔ اور مشین کی سی تیزی کے ساتھ ملبہ اٹھا اٹھا کے پھینکنا شروع کر دیا۔ اس کے ہاتھ کٹ کر ہو ہان ہو چکے تھے مگر آخر کار اس نے بخشوا کا سارا جسم ملبے کے باہر نکال لیا۔ لیکن اس کی ایک ٹانگ اب بھی ٹوٹے ہوئے شہتیر کے نیچے دبی ہوئی تھی۔ وہ بالکل بے ہوش ہو چکا تھا اور خون کے لوتھڑے اس کی ٹانگ کے آس پاس جمع ہو گئے تھے۔ اور کچڑ اس طرح سرخ ہو چکی تھی جیسے خون میں گوندھی گئی ہو۔ فضلو نے جھک کر غور سے دیکھا تو اس کی ران تقریباً نصف کٹ گئی تھی۔ بڑی نسل سے اس نے شہتیر مٹا کر اس کی ٹانگ باہر نکالی۔ اور پھر اس پر دقت طاری ہو گئی۔ وہ اس سے لپٹ کر رندھی ہوئی آوازیں بکارنے لگا۔ بخشوا اور محمد بخش میرے بار۔ آنکھیں کھولو۔ دیکھو میں فضلو لول رہا ہوں۔ میرا مکان تو گر چکا ہے۔ اب سب تیرا ہی ہو گیا ہے۔ دیکھو

سہی۔ اور پھبت کی طرف دیکھو۔ تم جو نہی آنکھیں کھولو گے میں چلا جاؤں گا۔ لیکن تم یہ کیا کر رہے ہو۔ ایسا نہ کرو۔ میں اکیلا رہ جاؤں گا۔ مجھے یہاں تمہارے سوا کوئی نہیں جانتا۔ اور تم بھی..... اور بخشوا..... بخشوا! اس کی آواز رندھی گئی اور وہ پھوٹ پھوٹ کر مرنے لگا۔

کچھ دیر بعد ایک میونس نے بخشوا کو بے ہوشی کے عالم میں ہسپتال پہنچا دیا۔ اور فضلو ہسپتال کے بمقامے میں مرخ کی طرح سکو کر ایک بچی پر بیٹھ گیا۔ اور وہ اندر سے آنے جانے والے ہر آدمی کی طرف یوں بے تاب نظروں سے دیکھتا جیسے کوئی مسیحا آ رہا ہو۔ پھر اس کی نظر آپریشن کرنے والے ڈاکٹر پر پڑی جو غالباً ابھی بخشوا کے پاس سے ہو کر آ رہا تھا۔ وہ یکدم اٹھ کھڑا ہوا اور سہمے ہوئے انداز سے ڈاکٹر کے قریب پہنچ کر سوالیہ نظروں سے اس کے چہرے کی طرف دیکھنے لگا۔

”تم ہو اس کے حادث؟“ ڈاکٹر نے فضلو سے پوچھا۔

”جی، جی، ڈاکٹر صاحب“ فضلو نے دھڑکتے ہوئے دل سے جواب دیا۔

”اس کا خون بہت ضائع ہو گیا ہے۔ اسے کافی خون کی ضرورت ہے۔ کون کون دے گا خون اس کے لئے؟“ اور تو کوئی نہیں پر میں دونوں کا اکیلا ڈاکٹر صاحب۔ میرا تمام خون بچہ بچہ اسے دے دوں وہ بچ جائے! فضلو تجس آمیز لہجے میں بولا۔

”اچھا تم میرے ساتھ اندر آؤ“ ڈاکٹر نے اسے کمرے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

فضلو کے سینے میں تناؤ پیدا ہو گیا اور وہ خون کا ابنا ہوا چشمہ بن کر ڈاکٹر کے ساتھ اندر کمرے میں داخل ہو چکا تھا۔

”دکھی شاہ زادی“

(بنگلہ لوک کہانی)

یونس احمد

ہنگو ذیلی ڈویژن کے رہنے والے ایک صاحب ہیں، مولوی ابراہیم صاحب انہوں نے مجھے اس کے چند بند ضرور سنائے جو انہیں یاد تھے۔ انہوں نے یہ بھی کہا کہ ہنگو میں، جس کا جدید نام ہونگ ہے، شہزادہ کے نام پر ایک مسجد اور تالاب اب بھی بنا ہوا ہے اور تاریخ اتحاد و ملاقات ہے کہ شہزادہ ادھر ضرور آیا تھا اور یہیں عالم جلاوطنی میں وہ اس دنیا سے سدا رہا ہے۔

بہر حال اصل تاریخی واقعہ کچھ بھی ہوا تھی بات ضرور ہے کہ شہزادہ کو اراکان میں حادثات ضرور پیش آئے تھے۔ پری بانو کے علاوہ ”شاہ زادی کا نام“ کے عنوان سے ایک اور منظوم کہانی بھی یہاں چاکھٹام کے اندرونی علاقوں میں بڑے شوق سے پڑھی اور سنائی جاتی ہے۔ اس کے واقعات بھی کم و بیش اسی طرح کے ہیں۔

”پری بانو“ کی منظوم کہانی کس نے لکھی اور کب لکھی گئی اور اس کی اصل تاریخ کیا ہے، اس کا کوئی سراغ نہیں ملتا۔ اس لئے اس کہانی کو محض حوامی قصہ گوئی کا نمونہ ہی سمجھنا چاہئے۔ اس کہانی کی سب سے بڑی خوبی فضا اور ماحول ہے جو خالص مقامی ہے۔ اصل زبان بھی بڑی رسیلی اور دل پر فوری اثر کرنے والی استعمال کی گئی ہے۔ اب میں اس کہانی کو پیش کرتا ہوں:

قسمت بھی کیا کیا لیل و نہار دکھاتی ہے۔ پری بانو کو دریا کی غضبناک لہروں نے نکل لیا! میں یہ المیہ کیسے بیان کروں۔ الفاظ نہیں ملتے کہ اُس کے آخری سانسوں کا حال بیان کر سکوں، کیا درد بھری کہانی ہے!

اس دنیا میں سکر، فریب، چھل اور کپٹ کے سوا کچھ نہیں

مشرقی پاکستان کی لوک کہانیوں میں ”پری بانو“ کی کہانی بڑی ہی دل گداز ہے اور درد و سوز سے لبریز۔ اس میں ایک مغل شہزادے اور اس کی لڑکی، پری بانو کی بے بسی و بیکسی کی جو تصویر کھینچی گئی ہے وہ کہاں تک قابل قبول ہے اور تاریخی اعتبار سے کہاں تک درست، اس کے بارے میں کئی رائے ہو سکتی ہیں۔ مگر لوک کہانیاں یونہی مشہور ہو جاتی ہیں اور جرح و نقد کی محفل نہیں ہو سکتیں۔ یوں اس بات سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ یہ شہزادہ بنگال دیس سے ہو کر آتھائی بے بسی کے عالم میں اراکان ضرور پہنچا تھا۔ پوربو بگو گیتیکا (مشرقی بنگال کے گیت) کے فاضل مصنف ڈاکٹر ویشیش چندر رھن نے بھی اس سلسلہ میں کچھ لکھا ہے۔ ایک جگہ کہتے ہیں:

”پری بانو کی کہانی چاکھٹام کے علاقوں میں بچہ مقبول ہے۔ یہ کہانی منظوم ہے اور اتنی پرتاثر کہ تاثر میں اضافہ کے لئے سارنگی، خنجری، یا دوسرے کسی ساز کے استعمال کی ضرورت ہی نہیں ہوتی۔ کچھ عرصہ ہوا آسو تو شچو دہری نے چاکھٹام سے ”پری بانو“ سے متعلق مجھے حسب ذیل تحریر روانہ کی تھی:

”آزاد آباد کے ایک صاحب، خلیل الرحمن کی زبانی پری بانو کی منظوم کہانی کا مختصر حصہ میں سن چکا ہوں۔ یہ کہانی میرے دل کو بہت بھائی اور میں اس کی تفصیل جاننے کے لئے بڑا بیتاب رہا۔ کچھ دن کے بعد ”مہیش کمالی دیپ“ میں دھن جے بروا کے ساتھ میں نے اس موضوع پر تبادلہ خیال بھی کیا۔ انہوں نے مجھے ”گورستان“ نامی ایک مقام میں جانے کی ہدایت کی کیونکہ انی کے قول کے مطابق انہوں نے یہ منظوم کہانی وہیں پڑی تھی۔ چنانچہ میں وہاں گیا لیکن تلاش و جستجو کے باوجود اس کہانی کی تاریخی اصلیت اور حقیقت کے جاننے میں کوئی کامیابی نہ ہوئی۔ البتہ اراکانی کے اندرونی علاقے

جہد و دیکھو قتل و غارت گری کا بازار گرم ہے، خریدیں
نیام سے باہر نکل رہی ہیں اور کشتوں کے پستے لگے جا رہے ہیں۔
یہ تخت و تاج، یہ دھن دولت، یہ جہان بانی و جہان گیری
کچھ بھی تو نہیں!

شہزادہ کی داستان آج بھی خون کے آنسو رلاتی ہے۔
تخت و تاج سے محرومی، بھائیوں سے نزاع، جلاوطنی
کی زندگی — اُس کی زندگی بالکل بے کیف اور بے رس تھی، ہر
سے محروم، یہ جاہ و جلال اور مال و متاع کس کام کے جب بھائی بھائی
میں کشن جائے! ایسی شاہی سے تو بھکاری بننا بہتر جو دوسروں کے
محتاج تو ہیں پر سوتے ہیں سکھ کی نیند۔

یہ تخت و تاج، یہ دھن دولت، یہ جہان بانی و جہان گیری کچھ
بھی تو نہیں!

روز بروز کے جنگ و جدال سے تنگ آکر آخر ایک دن شہزادہ
نے رخت سفر باندھا — مایوس، بے مراد شہزادہ — پرستی بانواس کے
ساتھ تھی۔ زادراہ کے لئے خزانہ شاہی سے کچھ اشرافیاں اور سونا چاندی
اس نے ساتھ لے لیا تھا۔ دونوں سفر کی سختیاں، صعوبتیں برداشت
کرتے غنیمتوں سے بچتے چاہتے تھے۔

جلاوطنی نے آخر کار دونوں کو نڈھال اور بے سدھ کر دیا تھا۔
دونوں کی آنکھوں سے نہ جانے آنسوؤں کے کتنے دریا بہہ گئے تھے۔
چاروں طرف محرومی و نامرادی تھی۔ تاریکیوں کی چادریں دبیز سے
دبیز تر ہوتی چلی گئیں۔ ایک گہرا سناٹا تھا جو ان کی ہنگامہ آفوں
زندگی میں داخل ہو چکا تھا۔

چانگام کے قیام کے دوران جب ان کی قسمت کا اندیزہ
دور نہ ہوا تو وہاں سے بھی ان کے قدم اکڑ گئے اور دونوں ہاتھی پر
سوار ہو کر جنوب کی اُور روانہ ہوئے۔ پرستی بانوکا حسن چودھویں
رات کے چاند سے بھی زیادہ روشن تھا — لیکن حسن کی چمک
وقت کے بیرحم ہاتھوں سے آہستہ آہستہ دھندلائی جا رہی تھی۔

دونوں چپ چاپ آگے بڑھتے گئے۔ منزل سے بے پروا!
انہیں منزل تک پہنچنے کی کوئی لگن بھی نہ تھی۔

ہواؤں کا تیز جھونکا آتا تو پرستی بانوکے ریشمی ملبوس کا
آنچل پرچم کی طرح لہرانے لگتا — اور چند لمحے کے لئے اُس کے لوہاں
رخساروں پر سرخ سیدب کا سارنگ دوڑ جاتا۔

پرستی بانوکے جسم پر جو گھنے تھے وہ سورج کی روشنی میں یوں
دکھ رہے تھے جیسے روشنی کا فوارہ پھوٹ رہا ہو۔ جس نے بھی ان کو
دیکھا ان کی تکلیفیں دیکھ کر کلچر منہ کو آتا اور اُس کی آنکھیں بھرتیں۔
کون تھا جو ان کی بے بسی پر نہ رویا ہو۔ عورتیں ان کی مصیبت دیکھ کر آہ و بکا
کرتے گھٹکتیں۔ جوان لڑکیاں دھاڑیں مار مار کر رونا شروع کرتیں۔
ہائے رسی قسمت کی ستم ظریفی! گاؤں کی ناریوں میں باتیں ہوتیں۔
"یہ کون بہشتی حور ہے جو یوں جنگل جنگل بھنگ رہی ہے؟"

یہ بے مثال حسن، یہ پُر وقار چہرہ
یہ طلائی زیوروں کی نور افشانی،
زندگی کا یہ المیہ کتنا سبق آموز ہے!

گاؤں کی اُن ناریوں کو شہزادہ اور پرستی بانوکے حالِ زار پر
رحم آگیا۔ کسی نے آگے جانے سے منع کیا۔ کسی نے دوسری اُور جانے
کا اشارہ کیا۔ کسی نے اپنے گھر میں جہان بنانے کی دعوت دی۔
کسی نے کہا —

"شہزادی تم میرے گھر جاؤ۔ میں تمہیں تلسی جیسا خوشبودار
چاول کھلاؤں گی۔ میں تمہیں پان کی ایسی نکلوری بنا کر دوں گی جسے
کھا کر تمہارے خشک لب تازہ اور سرخ ہو جائیں گے!"

کسی نے کہا:
"دکھن اُور نہ جاؤ۔ پہاڑوں کا لامتناہی سلسلہ اور جنگل تمہاری
راہ میں حائل ہوں گے جہاں خونخوار شیر رہتے ہیں۔"

ادھر نہ جاؤ خدا کے لئے ورنہ شیر تمہیں اپنا لقمہ بنائیں گے۔
کچھ اور آگے بڑے بڑے دریا ملیں گے جن کی سرکش موجوں
سے کسی کو مفر نہیں — ان موجوں کے نیچے گہریال بھی تاک میں رہتے
ہیں۔ نہ جاؤ اُدھر نہ جاؤ اُدھر!

کوئی کہتی رہی:
آگے گھنے جنگل ملیں گے جہاں نہریلے سانپ رہتے ہیں،

آ نکلا۔ وہ ہاتھی پر سوار تھا اور شاہی جاہ و جلال سے پوری نفاذ
ساکت و خاموش تھی۔ یکایک اس کی نگاہوں نے پرستی بانو کو دیکھ لیا۔
وہ ٹھٹھک گیا۔ ہاتھی کے قدم بھی رک گئے۔

پیلے کو پانی اور بھوکے کو روکھے کے سوا اور کیا چاہئے۔
کہتے ہیں راجہ پرستی بانو کے تصور میں کھو گیا۔ وہ سچ بچ
دیوانہ ہو گیا۔

اراکان کے راجہ کی داستانِ عشق جب شہزادے کو معلوم ہوئی
تو اس کی آنکھوں سے سادون بھادوں کی جھڑی لگ گئی۔ اس نے اپنا
دل دوتا ہوا محسوس کیا۔ اس کی کائناتِ زندگی میں اور رہ گیا تھا۔
— نہ تخت و تاج کی تمنا تھی، نہ دھن دولت کی آرزو۔ اس کے لئے
پرستی بانو ہی دنیا کی سب سے بڑی دولت تھی۔ اس نے گلوگراواز
میں پرستی بانو سے کہنا شروع کیا:

"تخت و تاج ہاتھ نہ آیا، ملک چھوٹا، اپنے پرانے ہوئے،
احباب نے منہ موڑ لیا۔ تمہارے علاوہ دنیا میں میرا اب ہے کون؟
تمہاری ہی وجہ سے میری بے کیف زندگی میں تھوڑی سی رفق باقی
رہ گئی ہے۔ اگر تم کو بھی کسی نے مجھ سے چھین لیا تو میں کیا کروں گا۔
میرے دل کی دنیا سوتی ہو چلے گی۔"

شہزادے کی اشک آلود آنکھیں دیکھ کر اور یہ غم انگیز باتیں
سن کر پرستی بانو کا دل بھی بھر آئینہ سوچنے لگی۔ — مصائبِ آلام
کے اتنے سارے پہاڑ ایک دم سے یکایک کیوں لوٹ پوٹ پڑے۔
اب راجہ ہمارا دشمن ہو جائے گا۔

آخر کار دونوں نے ملک کو چھوڑ دینے کا منصوبہ بنایا۔
آخر شب کو دونوں چپ چاپ، چھپتے چھپاتے نکل گئے اور
انہوں نے پیچھے مڑ کر بھی نہ دیکھا۔ ان کے پاؤں اتنی تیزی سے
اُٹھ رہے تھے جیسے اُن میں بجلی ساگئی ہو۔

چلتے چلتے دونوں ایک دریا کے کنارے پہنچے۔ — سخت حال
اور بے جانی۔ ڈر خوف اور پریشانی سے دونوں مضطرب ہو چکے تھے۔
بارے ایک ماہی گیر کی ناؤ نظر آئی۔ جان میں جان آئی۔ شہزادے
نے ماہی گیر کی منت کرتے ہوئے کہا۔

"تم ہمیں اپنی ناؤ دے دو۔ اس کے بدلے میں تم کو لالہ مال
(بقیہ صفحہ ۱۰۰ پر)

جن کے کاٹنے کا کوئی علاج نہیں

ایسی موت سے بھلا کیا حاصل!

پرستی بانو، خدا کے لئے ان جنگلوں میں نہ جاؤ۔ کہتے وہاں آدم خور

بھی ہوتے ہیں! —

کسی نے نصیحت کی:

ادھر دریائی ڈاکو ہیں جو مسافروں کو پل بھر میں لوٹ لیتے ہیں۔

میری بات مانو تو ادھر کا رخ نہ کرو!

لیکن دونوں ہاتھی کی پشت پر بیٹھے چلتے رہے۔ — انجم

سے بے پروا۔

یہاں تک کہ تیرہ دن کی صعوبتیں پھیلنے کے بعد ان کے سامنے
نہاٹھیں مارتا ہوا دریا حائل ہو گیا۔ موجیں ساحل سے یوں سرپیٹ
رہی تھیں جیسے دریا بھیا نک اندھی سے لڑ رہا ہو۔ شہزادے کی
ہمت جواب دے گئی۔ پرستی بانو کی آنکھوں تلے اندھیرا چھا گیا۔ —
اتنا بڑا دریا کیسے پار کیا جائے گا۔

اسی پریشانی کے عالم میں تین دن بیت گئے۔ چوتھے روز
ایک اراکانی ادھر آ نکلا۔ اس نے شہزادہ کی دل گواہ داستانِ سنی تو اس کا
بھی جی بھر آیا۔ اس نے شہزادہ اور پرستی بانو کو اراکان چلنے کی دعوت
دی۔ دونوں تیار ہو گئے اور اس طرح وہ اراکان پہنچ گئے۔ یہاں کا
حکمران شہزادہ کی آمد کی خبر سن کر گنبد اُٹھ گیا۔ اس کو گمان ہوا کہ شہزادہ
چڑھائی کی غرض سے اس کے ملک میں داخل ہوا ہے۔ چنانچہ اس
نے فوراً فوجیں جمع کیں، لیکن بعد میں جب اسے اصل حالات کا
علم ہوا کہ شہزادہ بالکل نہتہا ہے اور اس کی حالت بڑی زبوں ہے
تو اس نے شہزادہ کو اپنے یہاں پناہ دے دی۔

آگے کی بہ روحِ فرسا داستانِ بائے کیسے بیان کروں! —
طبع اور لالچ کا بندہ انسان خود غرضی اور ہوس دنیا کے
معاظ میں اپنا کوئی جواب نہیں رکھتا۔ یہ دودن کی مختصر اور
بے ثبات زندگی ہمیں کیسے کچھ نہیں دکھاتی۔

ایک دن کا واقعہ سنو!

پرستی بانو عمل کے باہر ورتک پھیلے ہوئے فطری مناظر کو
دیکھ رہی تھی کہ اراکان کا حکمران ہوا خودی کرتے کرتے ادھر

”ناشنا“

اصغر بیٹ

سے داخل ہوتا ہے۔ شرم، حساس اور ذہین چیز
جو خوبصورت تو نہیں لیکن پرکشش ضرور ہے۔ وہ
ذرا تجسس سے چاروں طرف مگرے کو دیکھتا ہے۔
باہر کا دروازہ بند ہونے کی آواز۔

★

نور وارو۔ (پلٹ کر آواز دیتا ہے): تو رگل! بھئی میرا بچہ لیٹے آنا۔
(بچہ دروازے سے ایک ٹھکان شور مچانے لگتا ہے)
دروہ پھنسا ہوا تھا میں ابھی لے، داخل ہوتا ہے)
تو رگل۔ یہ تو بیلنے خود ہی کھال لیا تھا، صاحب۔
نور وارو۔ ہاں کچھ بدل گیا ہے۔ جب میں بچہ دفن ہوا
آتا تھا.....

تو رگل۔ جی ہاں، بیگم صاحب نے سب چیز بدل دی ہے۔
آپ کا کمرہ تو ادھر ہی ہو گا نا!
سیڑھیوں کی جانب چلتا ہے۔

نور وارو۔ ڈیلی فون کو دیکھ کر حیرت سے: اور یہ ٹیلی فون!
یہ کب لگا؟

تو رگل۔ درگ کسی کوئی ایک مہینہ ہوا صاحب۔

نور وارو۔ اچھا، خان نے مجھے نہیں بتایا۔

تو رگل۔ بڑا رقم خرچ ہو گیا صاحب۔ ریلوے اسٹیشن سے
لائسنس کرایے میں۔

نور وارو۔ یعنی پانچ میل سے!

تو رگل۔ سارا اپنے خرچہ پر کیا صاحب، ٹیلی فون والا کہتا تھا

غیر ملاتے میں ہم ٹیلی فون نہیں لگا کر دے گا۔

نور وارو۔ پھر؟

وقت: صبح۔ ایک امیر گھر میں ملاقات کا وسیع کمرہ۔
بچہ دیا میں ایک بڑا خوشی دروازہ جو ڈیوڑھی غائب ہو
میں کھلتا ہے۔ برآمدے سے پرے پورے اور اس سے
پرے باغ۔ آنسوئی دروازے کے سامنے چونکہ دبیز
فصل کے پردے ٹک رہے ہیں اس لئے سونے پچھلے برآمدے
کے آوازوں کے حاضرین تک اور کوئی آواز نہیں
پہنچ سکتی۔ کمرے کے بائیں کونے میں سیڑھیاں جو
گھوم کر دائیں جانب اور پھر کچھ ہتی ہیں۔ چمکدار
نکڑا کا کتہہ کمرے میں بیل کی طرح لہرا کر ٹھک گیا ہے۔
سیڑھیوں کے نیچے بچہ دیا سے لگا ہوا ایک
معر آدھی کا جسم۔ بائیں جانب سامنے تین گڈے دار
آرام کرسیاں۔ ان کے سامنے ایک تپائی تو انیں جانب
سامنے ایک خوبصورت بڑی سیاہ تپائی پر سفید
رنگ کا ٹیلی فون۔ دائیں جانب کچھ کونے میں ایک
صوفہ اور اس کے ساتھ صوفے کی دو کرسیاں۔
دو گھوٹی تپائیوں پر چاندی کے گلدان اور لکھوان۔
پورے کمرے میں بڑا ایرانی قالین۔ دائیں دیوار میں
بھی ایک دروازہ نظر آتا ہے جس پر دیوے ہی دبیز فاصلی
پر دیوے ٹھکے ہوئے ہیں بچہ دیا اور پر ایک چھوٹا سا
نیستی قالین لگا رہا ہے جس پر کوئی طعنا ہوا ہے۔
کمرے کا فرنیچر جدید اور رنگ جدید و قدیم امیرانہ
ذوق کے اختراع کا نمونہ مجموعی تاثر ہے جدا چھا۔
پردہ اٹھانے تو تقریباً پینتیس برس کا ایک مرد
جس نے قیمتی سوٹ پہن رکھا ہے پچھلے دروازے میں

انہوں نے اپنے آنے کی اطلاع دی تھی اور ان سے کہا گیا تھا کہ گاڑی انہیں لینے کے لئے اسٹیشن آئے گی۔
تورگل :- صاحب یہ تارا آیا ہے۔ آپ یہ لیں۔ میں بات کرتا ہوں
(تارا دیکر نوید کے ہاتھ سے ٹیلیفون لے لیتا ہے)۔
صاحب میں خان کا ڈرائیور بول رہا ہوں۔ ہم خود اسٹیشن پر خان کے جہان کو لانے کے لئے گیا تھا۔ نوید جو کچھ سوچ میں ہے۔ تارا کو الٹ پلٹ کر کھول لیتا ہے اور جلدی سے ٹرمہ کر تورگل کو متوجہ کرنے کی کوشش کرتا ہے اچی بیگم صاحب نے سرف یہ بولا تھا کہ ہمارا جہان آ رہا ہے۔ ان کو لے آؤ۔ جب ہم اسٹیشن پر پہنچا تو نوید صاحب ہمیں نظر آیا۔ اگر وہ بولتا کہ کوئی اور بھی جہان ہے ایک منٹ صاحب
تورگل نے نوید کی پریشانی دیکھ لی ہے اور وہ ٹیلیفون پر ہاتھ رکھتا ہے)۔

نوید :- (جلدی سے) یہ میرے آنے کی اطلاع کا تا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ خان کو میرے آنے کی خبری نہیں ہوئی۔ تم ٹیلیفون مجھے دوا اور فوراً گاڑی لے کر ڈاکٹر صاحب کو اسٹیشن سے لے آؤ۔

تورگل :- ٹیلیفون نوید کے حوالے کر کے بہت بہتر رہا تھا
ہوا پچھلے دروازے سے نکل جاتا ہے)۔

نوید :- (میں نے لمحے میں) معاف فرمائیے ڈاکٹر صاحب، آپ کو زحمت ہوئی۔ میں نے ڈرائیور کو بھیج دیا ہے۔ وہ ابھی پانچ منٹ میں پہنچ جائے گا۔ ادھر سے پہاڑ کی اترائی ہے، اس نے گاڑی جلدی پہنچ جائے گی۔

جی ہاں مجھے معلوم ہے کہ یہاں سواری نہیں ملتی اور غیر حالتے میں گزر کر آنا بھی آسان نہیں نہیں نہیں گھبرائیے نہیں آپ اسٹیشن پر ہی رہئے۔ یہاں سب کو معلوم ہے کہ آپ خان کے جہان ہیں۔ کوئی آپ سے کچھ نہیں کہے گا۔ جی ہاں مجھے معلوم ہے

اسٹیشن ماسٹر ٹپا اچھا آدمی ہے۔ اصل میں گڑبڑ یہ ہوئی کہ میں نے اپنے آنے کا جوتا رکھ دیا تھا

تورگل :- بیگم صاحب نے خان سے بولا لاٹ صاحب کو چھی لکھو اور کہو کہ جب ہم سارا خیر خود سے گا تو ٹیلیفون والا کیوں گنگا کر نہیں دیتا۔

نو و ارد :- ہاں لاٹ صاحب، خان کی بڑی عزت کرتا ہے۔
تورگل :- خان بولتا تھا چھوڑو۔ لیکن بیگم صاحب نہیں مانتا تھا۔ دو چینی ہوئے جب لاٹ صاحب ادھر دور سے پر آیا تو بیگم صاحب نے خروان سے بولا۔

نو و ارد :- (پچھ کرے کو چاروں طرف دیکھ کر) بیگم صاحب نے واقعی نقشہ بدل دیا ہے۔ تورگل سے جو سیر میوں کی طرف جا رہا ہے) تو کیا بیگم صاحب نے کہا تھا کہ ہمارا کمرہ اوپر ہو گا؟

تورگل :- نہیں صاحب۔ لیکن آپ جب بھی کبھی آتا ہے تو اوپر ٹھہرتا ہے۔

نو و ارد :- وہ بیگم صاحب کی حکومت سے پہلے کی بات ہے۔ خان کی شادی کے بعد میں پہلی دفعہ آیا ہوں۔ ممکن ہے میرا انتظام ایک جہان خستے میں ہو۔

(پچھلا دروازہ کھٹکھٹایا جاتا ہے)

تورگل :- اچی سیر میوں کے پاس رکھ کر پلٹتا ہے) میں دیکھتا ہوں صاحب، کون ہے۔

(پچھلے دروازے سے نکل جاتا ہے۔ ٹیلیفون کی گھنٹی بجتی ہے)

نو و ارد :- (ٹیلیفون اٹھا کر) ہیلو! میں شاہ ماں خاں کے گھر سے بولی رہا ہوں جی نہیں میسرانام شاہ زمان خاں نہیں ہے۔ میں ان کا ایک دوست ہوں جی مجھے معلوم نہیں۔ ابھی ابھی آیا ہوں میرا خیال ہے آپ مجھے نہیں جانتے جی میرا نام نوید ہے جی میرا سٹر نوید بڑی خوشی کی بات ہے آپ مجھے جانتے ہیں

تورگل ہاتھ میں لفافہ لئے داخل ہوتا ہے)

ایک منٹ ٹھہریے۔ میں پوچھتا ہوں ٹیلیفون پر ہاتھ رکھ کر تورگل سے) یہ ڈاکٹر قاسمی بول رہے ہیں۔ کچھ نہیں

وہ آج میرے یہاں پہنچنے کے بعد آیا ہے۔ اس لئے بیگم شاہ زماں کو صرف آپ کے آنے کی اطلاع تھی اور انہوں نے ڈرائیو سے بھی ایک ہی جہان کا ذکر کیا۔ ڈرائیو نے مجھے جانتا ہے اس لئے اس نے پلٹ کے دیکھا ہی نہیں کہ کوئی اور بھی ہے۔۔۔۔۔ (منہس کر) جی ہاں اچھا خاصا لطیفہ ہو گیا۔ بہر صورت معذرت چاہتا ہوں کہ میری وجہ سے آپ کو زحمت ہوئی۔۔۔۔۔ جی ہاں، ابھی ملاقات ہو گئی آپ۔ انشا اللہ! ٹیلیفون بند کر دیتا ہے۔

دائیں جانب پردہ ہٹا کر تقریباً پچیس برس کی ایک خوبصورت عورت داخل ہوتی ہے۔ اس نے قیمتی نشلوار اور دوپٹہ پہن رکھا ہے۔ آنکھوں میں تیزی حرکات میں بھرپور جوانی کی خود اعتمادی۔

بیگم زماں: السلام علیکم، میں نے سارے آواز سنی تو آگئی۔ ابھی خان کو آپ کے آنے کا پتہ نہیں چلا۔ مجھے بے حد خوش ہے کہ آپ توقع سے دس منٹ پہلے ہی پہنچ گئے۔

نوید: وعلیکم السلام (درا تذہب کے ساتھ) اگر ڈاکٹر دس بعد پہنچ جاتا تو کیا فرق پڑتا۔

بیگم زماں: پھر وہ مجھے آپ سے بات نہ کرنے دیتے۔

نوید: (جو ابھی تک تذہب میں ہے) تو کیا کوئی ایسی بھی بات؟ جناب خان سے چھپا کے کہنا چاہتی ہیں؟

بیگم زماں: ڈاکٹر صاحب آپ میرے میاں کو نہیں جانتے۔ وہ بڑے ضدی آدمی ہیں۔ انہوں نے سوچ لیا ہے کہ میں آپ کو واقعات ٹھیک طور سے نہیں بتاؤں گی۔

نوید: جی۔

بیگم زماں: اور اب آپ سے کیا پردہ۔ وہ دراصل آپ کو بلولنے کے سرے سے خلاف تھے۔

نوید: بیگم زماں میں اپنا تعارف کرا دوں۔ میں دراصل۔۔۔

بیگم زماں: (ڈٹوس کر) نہیں نہیں، آپ خواہ مخواہ برامان گئے۔ یہ ان کا ڈاکٹروں سے بجا بذات خود غور طلب ہے۔ آپ نثر لکھتے تھے۔ میں جلدی جلدی آپ کو ان حالات

سے آگاہ کر دوں جن سے ان کے علاج میں بڑی مدد ملے گی۔

ڈسٹر صوبوں پر سلسلے پڑی ہوئی تین کرسیوں میں سے درمیان کرسی پر بیٹھ جاتی ہے نوید بائیں کرسی پر بیٹھ جاتا ہے۔

نوید: دیکھئے ہوا یہ کہ میں مصروفیت کی وجہ سے اپنے آنے کی اطلاع بروقت نہ بھیج سکا۔۔۔۔۔

بیگم زماں: (پھر بات کاٹ کر) نہیں آپ کے آنے کی اطلاع تو بروقت مل گئی تھی۔ میں نے جان بوجھ کر سارے واقعات لکھ کر بھیجنا منا سب نہیں سمجھا۔ مجھے معلوم ہے آپ بہت مسرور ہیں۔ لیکن چونکہ آپ کو واپسی کی گارڈی پانچ گھنٹے سے پہلے نہیں ملے گی اس لئے میں نے سوچا زبانی بتا دوں گی۔ یہ اور بھی اچھا ہو کہ خان کو دیکھنے سے پہلے ہی ہماری بات ہو گئی۔

نوید: (مسکراتے ہوئے) بیگم زماں، میرا خیال ہے آپ کو اپنے میاں سے الگ کوئی بات مجھے نہیں بتانی چاہیے۔ خصوصاً جب میں آپ کے میاں کو پہلے سے بھی جانتا ہوں۔ مجھے مرض یہ کرنا تھا۔۔۔۔۔

بیگم زماں: (درا تہمان کر اور پھر بات کاٹ کر) ظاہر ہے آپ میرے میاں کو جانتے ہوں گے۔ وہ کوئی ایسے گنہگار تو نہیں ہیں۔ لیکن ڈاکٹر ولس ہر طرح کی بات کی جاسکتی ہے۔

اور آپ پر تو مجھے یوں بھی حق ہے۔ آپ کو شاید معلوم نہیں۔ آپ میرے بڑے بھائی زقار کے معالج بھی رہے ہیں۔

نوید: (سوچتے ہوئے) زقار؟

بیگم زماں: زقار جہاں جکل کشنر ہیں۔ انہوں نے ہی تو آپ کا نام تجویز کیا تھا۔

نوید: جی ہاں میں زقار صاحب کو جانتا ہوں۔ لیکن بحیثیت ڈاکٹر کے نہیں۔ میں انہیں۔۔۔۔۔

بیگم زماں: بیشک۔ انہوں نے کہا تھا آپ ڈاکٹر کے علاوہ ان کے بہت اچھے دوست بھی ہیں۔

نوید: (مسکرا کر) میں زماں صاحب کا بہت اچھا دوست ہوں اور میرا۔۔۔۔۔

بیگم زماں: ظاہر ہے ڈاکٹر کو مرض کا بے حد اچھا دوست

بیگم زماں :- اطلاع معج نہیں ہے آپ خود خیال فرمائیے میرے
میاں اچھے بھلے کپتان تھے جیسا اچھے افسر سمجھ جاتے تھے،
لوگوں کا خیال تھا کہ اگر وہ اسی عہدے پر فائز رہتے
تو جانے کہاں سے کہاں پہنچ جاتے۔ ان صاحب نے مشورہ
دیا چلو رائڈنگ کلب کے ممبر بننے ہیں۔ چلے یہاں تک
بھی ٹھیک ہے۔ میرے میاں بڑے اچھے سواری تھے۔
سب ٹھیک رہنا۔ لیکن اس نے مشورہ دیا پو لو کلب
کے ممبر بنو۔ انہیں جو حادثہ پیش آیا وہ اس ہی کے
سبب تھا۔ گھوڑے سے گھرے اور دونوں گھٹنے
ٹوٹ گئے۔

نورید :- لیکن یہ تو محض حادثہ ہے، اس میں اس بچا رے کا کیا
قصود؟

بیگم زماں :- اس کا یہ تصور ہے کہ خود تو رائڈنگ کلب ہلکے ممبر ہے
اور پو لو کھیلنے کے لئے میرے میاں کو آگے کر دیا!
نورید :- تو کیا آپ کا خیال ہے وہ پو لو کلب کا ممبر ہو جاتا تو یہ
حادثہ پیش نہ آتا؟

بیگم زماں :- ہو سکتا ہے۔ ہو سکتا ہے یہ حادثہ اسے پیش آ جاتا۔
نورید :- بڑے چینی سے گردٹ بدل کر بیگم زماں تقدیر میں
جو کچھ ہوتا ہے ہو سکے رہتا ہے۔

بیگم زماں :- خیر یہ بات تو یونہی چلی نکلی۔ مجھے دراصل آپ سے
کہنا یہ تھا کہ آپ کو اس کے علاج میں جو سب سے بڑی
وقت پیش آئے گی وہ جراحی کی نہیں نفسیات کی ہوگی۔
نورید :- نفسیات؟

بیگم زماں :- جی ہاں نفسیات۔ اس افسوسناک حادثے نے انہیں
جسمانی طور پر ہی نہیں، روحانی طور پر بھی ناکارہ
بنا دیا۔

نورید :- (پریشانی میں) مگر مجھے ابھی تک جو اطلاع ملی ہے
اس سے مطابق تو ان کی ذہنی حالت بالکل ٹھیک ہے۔
بیگم زماں :- جی ہاں یوں تو وہ بالکل ٹھیک ہیں لیکن ان میں
زندگی سے نبرد آزما ہونے کا جذبہ ختم ہو چکا ہے۔
ان کے سامنے ایک دیران مستقبل ہے اور اسے

ہٹنا چاہیے اور بیشتر اس کے کہ وہ آجائیں اور ہمیں بات
کرنے کا موقع نہ ملے، میں جلدی جلدی عرض کر دوں انہیں
ایک سید مخلص اور اچھے دوست کی ضرورت ہے۔ ابھی
انہوں نے صرف ایک شخص سے دوستی کی ہے اور میرے
خیال میں وہ خاصا غلط آدمی ہے۔

نورید :- (تجسس سے) وہ کون ہے؟

بیگم زماں :- لاہور کا ایک بیرسٹر، نورید۔

نورید :- (دچمک کر) جی!

بیگم زماں :- آپ کی حیرت بالکل بجا ہے۔ یہ بیرسٹر لوگ خاصے غلط
دوست ثابت ہو سکتے ہیں۔

نورید :- مگر مجھے تو یاد نہیں پڑتا کہ مجھ سے کوئی ایسی غلطی سرزد
ہوئی ہو۔

بیگم زماں :- آپ سے نہیں۔ تو یہ آپ غالباً میری بات نہیں
سن رہے ہیں۔ میں نورید بیرسٹر کا ذکر کر رہی ہوں۔ اگر
اس نے ان کو غلط راستے پر نہ لگایا ہوتا تو آج آپ کو
رحمت اٹھا کر یہاں آنا نہ پڑتا۔

نورید :- (نگاہ صاف کرتا ہے) بیگم زماں حاشا وکلاء، مجھے
زماں صاحب کی غلط حرکتوں کا علم نہیں تھا اور نہ...

بیگم زماں :- (جلدی سے بات کاٹ کر) نہیں نہیں میرا یہ مطلب
نہیں۔ مجھے معلوم ہے آپ سرجن ہیں اور آپ کو ایسے
امراض سے واسطہ نہیں اور خدا نہ کرے
میرے میاں کو کوئی ایسی بیماری ہو۔ میں نے آپ کو
کھد دیا تھا جہاں ان کے گھٹنوں کے بارے میں مشورہ
کرنا ہے۔ میں بیرسٹر۔ نورید کا جو ذکر کر رہی تھی تو اس
کہ ان کو اس حالت تک پہنچانے میں ان حضرات کا بڑا
ہاتھ ہے۔

نورید :- جی؟

بیگم زماں :- جی ہاں۔ وہ اصل میں کوئی بڑے "ڈان جوان" قسم
کے نوجوان تھے اپنے وقتوں میں!

نورید :- (دھچکناک) میرا خیال ہے آپ کی اطلاع اس سلسلے
میں صحیح نہیں ہے میں خود.....

تھی، میری نظر میں بہار۔ میں نے سوچا اتنی اچھی شخصیت اس گوشہ نشینی اور تنہائی میں تلف ہو جائے گی۔ اسے بچانے کا ایک ہی طریقہ ہے۔

نوید ۱۔ شادی؟

بیگم زماں۔ جی ہاں، لیکن ایسی شادی جس میں عورت اپنا تمام خوشیوں کو ان کی خاطر قربان کرے کہ وہ تیار ہو جائے، ان کے ساتھ گوشہ نشینی اور تنہائی کی زندگی بسر کرنے میں اسے حذر نہ ہو۔

نوید ۲۔ رکھنا اس کو یعنی محض خدایت خلق کا جذبہ تھا؟

بیگم زماں۔ دیکھ جھینپ کر کہ کوئی عورت محبت کے بغیر ایسی قربانی دینے کو تیار نہیں ہوتی۔

نوید ۳۔ اور چونکہ آپ نے گوشہ نشینی اختیار کر لی ہے اس لئے اب آپ کی نظر میں بھی زندگی خزاں ہو گئی ہے۔

بیگم زماں۔ (بیکار ہو جانا جاتی ہے اگر ہوتی تو کتنا اچھا ہوتا!) نوید ۴۔ (دیکھی سے) کیا مطلب؟

بیگم زماں۔ میں اس کشمکش میں تو نہ ہوتی جس میں کہ ہوں۔ نوید ۵۔ (آہستہ سے) یعنی کیا آپ نے شادی کر کے غلطی کی؟

بیگم زماں جو دائیں جانب دیکھ رہی ہے فوراً ہونٹوں پر اٹھتی رہتی ہے،

بیگم زماں۔ میرا خیال ہے خان آدھے ہیں (کرسی سے اٹھ کر دائیں جانب چلتی ہے، دائیں جانب مریضوں کی

پہٹیوں والی کرسی کو دھکیلتا ہوا ایک باوردی اردلی داخل ہوتا ہے کرسی میں تقریباً نوید کی

عمر کا ایک خوبصورت مرد ہے۔ بھورے گھونٹھوٹے بال، بھوری بھری بھری سی مونچھیں، بڑی بڑی روشن

اور سنجیدہ نیلی آنکھیں ایک دم متوجہ کر لیتی ہیں۔ مضبوط بازو اور فراخ خانے۔ ٹانگوں پر سرخ

خاتون والا کبیل)؟

بیگم زماں۔ ان سے ملے، یہ ڈاکٹر قاسمی ہیں۔

شاہ زماں۔ (حیرت سے) ڈاکٹر قاسمی؟

نوید ۶۔ ہیلو پیارے میں معذرت چاہتا ہوں میرے

بساتے کو وہ بالکل تیار نہیں۔

نوید ۷۔ (مسکراتے ہوئے) تو ایسا نظر آ رہا ہے کہ انہوں نے بسا لیا بیگم زماں۔ (دجلے میں طنز کو نظر انداز کرتے ہوئے) تو کیا آپ کے خیال میں انہیں شادی نہیں کرنی چاہئے تھی؟

نوید ۸۔ (جلدی سے) جی نہیں میرا مطلب یہ نہیں تھا۔ میں نے تو یہ عرض کیا کہ جب انہوں نے شادی کا فیصلہ کیا تو ظاہر ہے وہ اپنے مستقبل کو ویران نہیں دیکھ رہے ہوں گے۔

بیگم زماں۔ یہی تو بات ہے۔ انہوں نے شادی کا فیصلہ نہیں کیا۔ نوید ۹۔ جی؟ یہ کیا سمجھا نہیں۔

بیگم زماں۔ شادی کا فیصلہ میں نے کیا۔ نوید ۱۰۔ یعنی آپ نے ان کی طرف سے بھی خود ہی فیصلہ کر دیا؟

بیگم زماں۔ جی ہاں۔ نوید ۱۱۔ خوب! وہ آپ نے جو ان کی ذہنی کیفیت والی بات کہی تھی وہ کیا تھی؟

بیگم زماں۔ (بیکار ہو کر آپ سے) آپ سمجھ نہیں۔ ہوا یہ کہ میں پچھلے سال کالج کی لڑکیوں کو لیکر یہاں کا تاریخی قلعہ دکھانے آئی تھی.....

چا وید ۱۲۔ جی؟

بیگم زماں۔ میں نے آپ کو بتایا نہیں کہ میں لاہور کالج میں تواریخ کی لکچرار تھی اور ہسٹریکل سوسائٹی کی صدر۔

پچھلے سال ہم نے قلعہ دیکھنے کی اجازت طلب کی۔

مگر میرے بھائی کے ماتحت کام کر چکے ہیں۔ انہوں نے صرف سادے انتظامات کر دیے بلکہ میرے ٹہرنے کا

انتظام بھی زماں صاحب کے ہاں کر دیا۔ ایک روز کیلئے ہم آئے تھے لیکن اتفاقاً دس روز ٹھہرنا پڑا۔

نوید ۱۳۔ اتفاقاً! عمداً؟

بیگم زماں۔ جی نہیں اتفاقاً، ایک لڑکی بیمار ہو گئی تھی۔ نوید ۱۴۔ (شرارت سے) تو تاریخی قلعے کے ساتھ ساتھ ایک تاریخی واقعہ بھی پیش آیا۔

بیگم زماں۔ جھینپ کر، جی ہاں۔ کم از کم ان سے جو چارگیپ چلتی رہی وہ بڑی تاریخی تھی۔ ان کی نظر میں زندگی خزاں

نویید :- (ریڑھوں کے سامنے ٹہری ہوئی دائیں کرسی پر بیٹھتے ہوئے) میں نے تو تمہیں لندن سے لکھ دیا تھا کہ شادی کی تاریخ چار چھینے بعد رکھو۔ مجھے یورپ میں کئی جگہ دکان ہے۔

خان :- مہر تیرے کی! تم ان فرنگوں کے چکر میں رہو اور ہم یہاں اپنی شادی ملتوی کر کے چلے جائیں۔ تمہارا یہ نوکر تیرا!

نویید :- دیکھو یا لڑکی بیگم کے سامنے لڑکیوں اور لڑکیوں کا ذکر نہ کر دیتا۔ وہ پہلے ہی مجھ سے بہت خفا ہیں۔ سبھی جی جی کے لئے کیسا آزارہ آدمی ہے۔

خان :- تو نہیں ہو گیا؟
نویید :- باطل نہیں وہ لاڈلہ نام لڑکی کی بیٹی تو چلنے پوانے کبھی بھی جوئے جایا کرتا تھا تو اس کا یہ مطلب تھوڑا سا کہ میں —

خان :- اچھا یہ بتاؤ تم اپنی بیوی سے لاڈلہ نام لڑکی کی بیٹی کو دکر کر دیا کرتے تھے؟

نویید :- ذکر کرنے کو تو کر دیتا لیکن بیوی کی ذات ہی اللہ میاں کچھ بڑی سنگی بنا دی ہے۔ وہ بچی بان کے چوسرے نکالتی رہتی، جینا حرام کر دیتی۔

خان :- اچھا یہ بتاؤ بیوی کو علاقے کے لئے لئے تھے۔ اس کا کچھ علاقہ بھی کر یا تم نے لندن میں یا اپنے ہی درددل کا علاقہ کراتے رہے؟

نویید :- کئی ڈاکٹروں کو دکھایا۔ کرسی سے اٹھ کر اس ان ادھر ادھر دیکھتا ہے، لیکن ہوا کچھ نہیں۔

خان :- یعنی تمہارا مطلب ہے تجھے نہیں ہوا؟

نویید :- بچہ تو بعد کی بات ہے، پہلے تو وہ خود ٹھیک ہو جاتی۔

خان :- کھڑے کیوں ہو گئے ہو۔ بیٹھ جاؤ (نویید بیٹھ جاتا ہے) میں تمہارا یہ غم اور تمہاری اداسی سب نراؤں ہے۔

میں خوب جانتا ہوں نہیں۔

نویید :- والد اب تو تنگ آ گیا ہوں۔

خان :- کس سے بیوی ہے؟

آگے کی اطلاع تمہیں بروقت نہ مل سکی۔

خان :- (تپاک سے ہیلو) تمہیں معلوم ہے کہ میں تم سے ناراض ہوں۔

ریگم زمان حیرت سے کبھی اپنے شوہر بھی نوید کی طرف دیکھتی ہے)

خان :- (ریگم سے) نصرت بھی یہ تو نوید ہیں (ریگم زمان بھونچکا ہو کر نوید کو دیکھتی ہے)

نویید :- (آداب عرض) (خان سے) دراصل ان کا قصور نہیں، میں نے اپنا تعارف نہیں کرایا۔ (وہ یہ مجھے ڈاکٹر قاسمی سمجھ بیٹھیں۔)

خان :- (مسکرا کر) اچھا تو انہوں نے اپنا تعارف کر دیا، تم بھی ان کو کوئی اور سمجھے۔

نویید :- انہوں نے تو اپنا تعارف نہیں کروایا لیکن میں سمجھ گیا تھا تمہارے جیسے بدم کے پاس اور کون رہ سکتا ہے۔

ریگم زمان ایک دم غصے میں پلٹ کر (اُمیں جانب سے باہر چلی جاتی ہیں)

خان :- (گرم سے) سب لوگ تمہاری طرح نہیں ہیں! (نویید :- (لوگ کس میرا خیال ہے آپ کی بیگم ناراض ہو گئی)

خان :- جس نے پہلی دفعہ بیگم کی عدم موجودگی پر دھیان دیا ہے، اچھا کہاں گئیں وہ؟

(آواز دے کر) نصرت.... نصرت....

(پھر نوید سے) واقعی وہ تو غائب ہو گئیں۔ دراصل تم بد تمیزی سے باز نہیں آتے۔ (اردلی سے) تم جاؤ، ہم ابھی آتے ہیں۔

(اردلی پچھلے دروازے سے باہر چلا جاتا ہے)

نویید :- (یاد واقعی غلطی ہو گئی۔ فقرہ آگیا زبان پر اور روک نہ سکا۔ مجھے خیال ہی نہیں آیا کہ وہ برامان جائیں گی۔

خان :- (وہ میری معذوری کے معاملے میں بہت حساس واقع ہوئی ہیں۔ خیر چھوڑو اس بات کو۔ یہ تینا میری شادی پر کیوں نہیں آئے؟

جھگڑ رہی تھیں تو وہ بولا اگر دونوں اکٹھے لے لو تو
دوسرے سیٹ کی قیمت آدھی لوگیا۔ بیگم نماں اور
چھوڑ کر چلی آئیں۔ میں نے بعد میں جا کر چپکے سے دو
سیٹ لے لئے۔

خان :- تو جب تم نے وہ سیٹ لاکر بیگم کو دکھائے تو وہ
بگڑیں نہیں؟

نوید :- میں نے دکھائے ہی کب؟ ایک لادوڑی کی بیٹی
کو دیدیا دوسرا بھائی کے لئے لے آیا۔

خان :- بہت خوب! بچاری بھائی!
نوید :- انہی بیگم کے بارے میں کہہ رہے ہو یا ہماری بیگم
کے بارے میں!

خان :- رسوال کو نظر انداز کرتے ہوئے اور سیٹ نوید
کو لوٹاتے ہوئے، تم خود ہی انہیں دے دینا۔
نوید :- نہیں بھائی تم دیدینا، مجھے ان سے ڈر لگتا ہے۔

خان :- پاگل ہو گئے ہو! خفلائے ہو تو دو اپنے ہاتھ سے
(نوید سیٹ لے کر بیٹی میں رکھ لیتا ہے) ہاں، اور
وہ ڈاکٹر تاحسی کیا ہوا؟

نوید :- تو رگل نے اسے دیکھا نہیں، بس مجھے لے کر چلا آیا۔
اب اسے لینے گیا ہے۔ ہاں یہ پتاؤ اپریشن کرانے کا
ارادہ ہے کیا؟

خان :- دچرے پر بیک ایک قنوطیت برسنے لگتی ہے، خدا
جائے بیکار کا قصہ ہے سارا۔ نصرت کا خیال ہے
شاید میں پھر چلنے پھرنے کے قابل ہو جاؤں۔

نوید :- تو نہیں چلنے پھرنے پر کیا اعتراض ہے؟
خان :- اول تو اپریشن ہو نہیں سکتا۔ اور اگر ہو بھی جائے
اور میں چلنے پھرنے بھی لگوں تو کیا فرق پڑتا ہے،
مجھے بھاگ دوڑ میں اب کوئی دیکھی نہیں۔

نوید :- تم تو روز بروز زیادہ قنوطی ہوتے جا رہے ہو۔
خان :- جانتا ہوں۔ میں نے محسوس کیا ہے کہ جب سے میری ٹانگیں بیکار
ہوتی ہیں، میرا ذہن زیادہ صاف ہو گیا ہے۔ کہتے ہیں
جسم کا ایک عضو کمزور ہو جائے تو کوئی دوسرا مضبوط

نوید :- بیوی کی بیماری سے۔

خان :- ایک ہی بات ہے۔

نوید :- نہیں بھائی میں مذاق نہیں کر رہا۔ والٹر ٹنگ، گین پلا
اب تو پانچ برس ہو گئے اس بیماری کو۔

خان :- دیکھا یک سنجیدہ ہو کر، تو بھائی کیا ہستی ہے؟

نوید :- وہ بھی تنگ آگئی ہے کہتی ہے دوسری شادی کرلو۔
خان :- پھر؟

نوید :- دوسری شادی کھدینا آسان ہے، برداشت کرنا
مشکل ہے۔ وہ اس قدر چاہتی ہے مجھے کہ اگر میں نے کبھی
دوسری شادی کر لی تو وہ یا اسے مار دے گی یا خود
مر جائے گی۔

خان :- (سنجیدگی اب اداسی میں بدل جاتی ہے) مجھے بھی تو
چار سال ہو گئے اسی کڑی کے ساتھ۔

نوید :- (چونک کر اپنا اٹیچی اٹھاتا ہے اور اسے دکھاتا ہے)
تمہاری شادی کا تحفہ تو میں دینا ہی قبول کیا
(اٹیچی میں سے سنہری نوٹیں پن کی ڈبیہ نکالتا ہے)
یہ لندن سے پارکر کا جوڑا لیتا آیا تھا۔

خان :- (لے کر ٹھینک پو۔ یہ ہماری بیگم کو دے دو تو
زیادہ خوش ہوں گی۔

نوید :- نہیں بھئی یہ تمہارا ہے۔ ان کے لئے اور چیزیں لگئی
اتفاق سے۔

خان :- اتفاق سے؟

نوید :- ڈائمنڈ ٹیکس کا ایک سیٹ (اٹیچی سے ڈیپیں
بنڈیکس کا سیٹ نکالتا ہے)

خان :- بیوقوف! اتنا پیسہ کیوں برباد کیا؟ ہیرے سے
کم کوئی چیز نہیں مل سکتی تھی کیا؟

نوید :- ذرا سٹائل گیا۔ دیکھو کیسا ہے۔

خان :- بے حد خوبصورت آخر کتنا سستا ہوگا (ہاتھ لپکا
لے کر دیکھتا ہے)

نوید :- اصل میں جوہری کے پاس ملتے جلتے تقریباً ایک ہی
دام کے دو سیٹ تھے ہماری بیگم ایک کی قیمت پر

خان - ہمارے طرف سے تم وکالت چھوڑ کر گھسیارے ہو جاؤ۔
ہمیں تمہاری وکالت سے کیا فائدہ۔ ہمیں اکون سے راز
تمہارے پاس رکھنا نہیں۔ ایک دہ لاہور میں ہمارے
جاٹا کا مقدمہ ابھی تک چل رہا ہے، وہ تو تم نے
جیت کے دیا نہیں۔

نوید - بھئی وہ تو دیوانی مقدمہ ہے۔ اس میں تو وقت
لگے گا ظہراؤ نہیں زمین کا جتنے پیسوں میں سودا ہوتا
اتنے ہی میں دلوڑوں گا۔ زمیندار عہد شکنی نہیں کر سکتا۔
پھر جانک بات بدل کر ہاں بیگم زماں! میں آپ کی
شادی پر حاضر نہیں ہو سکا تھا۔ اس موقع پر جو تحفہ
پیش کرنا تھا وہ اب حاضر کرتا ہوں۔ راجھی سے
ڈبیہ نکال کر بیگم زماں کو دیتا ہے

بیگم زماں - (لیتے ہوئے) شکریہ! اچھا اب چلے اندر چلیں میں نے
کچھ کافی بنوائی ہے۔
خان - ذرا ڈبیہ کھول کر نو دیکھو۔ اس احمق نے ڈائمنڈ
نکس خرید مارا ہے۔

بیگم زماں - (دکھول کر دیکھتی ہے) واقعی بے حد خوبصورت ہے
یہ انہوں نے زحمت کیوں کی؟

(خان محسوس کر لے کہ اس کی بیوی کو
اس تحفہ سے کوئی خوشی نہیں ہوئی اور
وہ حیرت اور پریشانی کے بے جا جذبات
سے اسے دیکھتا ہے)

نوید - معلوم ہوتا ہے آپ کو تحفہ پسند نہیں آیا۔
بیگم زماں - (دکھولنے کی کوشش کرتے ہوئے) وہ کیوں؟ اتنی
اچھی چیز کیسے پسند نہیں آئے گی۔

دباہر کا کارڈ دروازہ بند ہونے کی آواز
بیگم زماں - میرا خیال ہے ڈاکٹر صاحب آگئے۔

پچھلے دروازے میں تو درخت نمودار ہوتا ہے
اور ایک ہاتھ سے دروازے کے سانے سے
پردہ اٹھاتا ہے۔ اس کے پیچھے ڈاکٹر قاسمی
ہاتھ میں ڈاکٹر والا سیاہ رنگ کا بیگ لئے داخل

ہو جاتا ہے۔

نوید - تمہاری باتوں سے تو ایسا لگتا ہے کہ تمہارا ذہن پہلے سے بھی
کمزور ہو گیا ہے۔

خان - اس کی بات کو نظر انداز کرتے ہوئے، بین کی ڈبیہ
اٹھا کر اس لحاظ سے دیکھا جائے تو تمہارا یہ تحفہ بہت
مناسب ہے۔ کتا میں پٹھتے پٹھتے تنگ آ گیا ہوں۔
اب کچھ کمنا شروع کر دوں گا۔

نوید - دیکھو پیارے، مان لیا اب تم فلا سفر ہوتے جا رہے ہو۔
لیکن اس ڈاکٹر کے معاملے میں تمہیں چاہئے کہ بھابی سے
پورا پورا تعاون کرو۔

(دائیں جانب سے بیگم زماں داخل ہوتی ہے۔

وہ اپنے غصے پر تالیاں کچھ پر سرکاٹ لے کر آتی ہیں)

ہو گئی ہے)

نصرت - (نوید سے) معاف کیجئے اس وقت میں آپ کو خوش آمدید کہنے
چلی گئی۔ دراصل میں کچھ بیکاپ پریشان سی ہو گئی۔ نصرت کا
انداز مخاطب رسمی طور پر خوشگوار ہے لیکن اس میں ذرا برابر
بھی گرمجوشی نہیں)

نوید - غلطی میری تھی۔ ہم ہمیشہ سے ایک دوسرے کو یونہی چھیڑتے
رہے ہیں۔ لیکن آپ کی موجودگی میں ایسی چھیڑ خانی بدتمیزی
نہی۔

نصرت - نہیں نہیں کوئی بات نہیں۔ مجھے خان کے دوست بہت
عزیز ہیں۔ ان کی بے تکلفی قابل معافی ہے۔

نوید - (بیکاپ سنجیدہ ہو کر) خان کے دوست بہت کم ہیں۔
خان - دوست کم ہوں تو اچھا ہے۔ وہ زیادہ مخلص ہوتے ہیں۔

نصرت - اور اگر کوئی دوست دیکل، یا ڈاکٹر ہو تو اور بھی اچھا ہے۔
دوسروں کے ڈانپنے دلیں، رکھنا ان کی تربیت کا حصہ ہوتا ہے۔
انہیں بہت سی باتیں معلوم ہوتی ہیں لیکن وہ کسی ایک کی
بات دوسرے کو نہیں بتاتے (معنی خیز نظروں سے نوید کو
دیکھتی ہے)۔

نوید - بھائی! آپ نے ڈکیل کے لئے راز دانی ٹری اہم ہے۔
اس کے پاس ہر طرح کے راز محفوظ رہتے ہیں۔

ہوتے ہیں کوئی پچاس برس کی ہٹ شش آدھی ہیں۔
سر کے بال کچڑی، ڈاڑھی موچھ سقا پٹ۔ اکھڑا
عینک اور چہرے پر مسکراہٹ

خان: ایسے ڈاکٹر صاحب، معاف فرمائیے آپ کو اسٹیشن پر انتظار
کرنا پڑا۔ میرا نام شاہ زمانہ ہے۔

ڈاکٹر قاسمی: (ہاتھ ملا تے ہوئے) سلام سلیم۔ جی نہیں کوئی بات
نہیں آپ کے دوست نوید صاحب نے وجہ بتا دی تھی۔

خان: (نوید کی طرف اشارہ کر کے) اور ان۔ سہیلے یہ ہیں
وہ نوید صاحب۔

(ڈاکٹر قاسمی اور نوید مسکراتے ہوئے مصافحہ کرنے ہیں)

خان: یہ ہیں ہماری بیگم (ڈاکٹر قاسمی آداب بجالاتے ہیں)

ڈاکٹر: جی ہاں اگرچہ ان سے پہلے کبھی ملاقات نہیں ہوئی۔

لیکن زوارہ صاحب میرے بڑے کرم فرما ہیں اور دوست

بھی۔ اس نسبت سے یہ میری بیٹی ہیں۔

بیگم زماں: (مسکراتے ہوئے) بہت شکریہ ڈاکٹر صاحب۔

ڈاکٹر: اگر آپ اجازت دیں تو معائنہ شروع کر دیا جائے۔

پھر کچھ دیر بیٹھ کر یا نہیں بھی کرنا ہیں۔

بیگم زماں: جی ہاں (دائیں جانب اشارہ کرتے ہوئے) ایسے اس برابر

دلے کمرے میں چلتے ہیں۔ (خان کی کمری کی طرف بڑھتی ہیں)

خان: نہیں نصرت تم نہیں بیٹھو۔ نوید اکیلے ہوں گے۔

ڈاکٹر: (نصرت سے) آپ زحمت نہ کیجیے، میں انہیں خود ہی لے جاؤں

اپنی رائے قائم کروں، اس کے بعد آپ سے تباہ ڈھیل

کروں گا (کمری کو دائیں جانب دھکیلتے ہوئے) ادھر جا

کو جانے نا؟

خان: جی ہاں۔

ڈاکٹر کمری کو دھکیلتا ہوا دائیں جانب نکل

جاتا ہے۔ کمرے میں خاموشی چھا جاتی ہے۔ نوید

بیگم زماں کی طرف دیکھتا ہے لیکن وہ نظریں

جھکا کر دائیں جانب چلی دیتی ہیں اور سیلفیون کے

قریب پڑی ہوئی ایک کرسی پر بیٹھ جاتی ہیں۔ نوید

سیر میزوں کے سامنے پڑی ہوئی کرسیوں میں سے

ایک پر بیٹھ جاتا ہے۔

نصرت: (شکریہ! آپ نے خان سے ہماری گفتگو کا ذکر نہیں کیا۔

نوید: آپ نے خود ہی فرمایا تھا نا کہ ہم وکیلوں کو تو ملازمداری

کی عادت ہوتی ہے۔

نصرت: چونکہ آپ سے یہ بات برحیثیت وکیل کے نہیں ہو رہی تھی

نوید: برحیثیت ڈاکٹر کے تو ہو رہی تھی۔ چلئے ہٹائیے اس

قصے کو آپ نے یوں بھی میرے بارے میں اب رائے

بدلی ہوئی۔

نصرت: (طنز پر) بدلتی تو چلے گئے۔ ایک تو آپ نے راز کو راز

رکھا اور دوسرے اتنا بڑھیا تحفہ لا کر دیا۔

نوید: (جھینپ کس جی نہیں اس خیال سے نہیں۔ بلکہ یوں

کہ جب تک کسی کو ذاتی طور پر آدمی نہ جانتا ہو ممکن ہے

اس کے بارے میں اچھی رائے نہ ہو۔ دوستی اور خیر گلی

کی ملاقات کے بعد رائے بدل سکتی ہے۔

نصرت: جی ہاں، اگرچہ بدلنے میں وقت لگتا ہے۔

نوید: (سوچتے ہوئے) اور وقت نہیں ہے۔

نصرت: کیوں آپ بھی شام کی گاڑی سے واپس جائیں گے؟

نوید: جی ہاں۔ چند کاغذات پر دستخط کرنے کی غرض سے

آیا تھا، اس زمین کے مقدمے کے سلسلے میں۔ اس کے بعد

مجھے فوراً لوٹنا ہوگا۔ پرسوں عدالت میں حاضری ہے۔

نصرت: (بے تعینی سے) لیکن یہ کاغذات تو آپ ڈاک کے ذریعے

بھی بھیج سکتے تھے؟

نوید: اس کے علاوہ زمان سے مدت ہوئی ملا بھی تو نہیں تھا۔

اگر آپ ناراض نہ ہوں تو عرض کروں آپ سے بھی ملنے کو

جی چاہتا تھا۔

نصرت: (ذرا جھینپ کس) شکریہ! مجھے افسوس ہے آپ کو

اس ملاقات سے ناامید ہوئی۔

نوید: جی نہیں، میں آسانی سے ناامید ہونے والوں میں سے

نہیں ہوں۔

نصرت: امید قائم رکھنے کے لئے بھی تو وقت چاہیے۔ اور وقت

ہے نہیں!

سوچتی۔

نوید :- میگم زماں، دنیا کا ہر شخص ایسی قربانی کر کے لئے تیار نہیں ہوتا۔ زندگی کی تلخ حقیقت آہستہ آہستہ اسے تصور کی بلندی سے نیچے اتار دلاتی ہے۔ میں نے سال بھر بیوی کے لئے حد خدمت کی، دنیا بھر کے ڈاکٹروں کو دکھایا، انہیں چکروں میں اپنی پریکٹس کو بھی نقصان پہنچایا۔ لیکن آخر مجھے بھی زندہ رہنا ہے۔ آپ بہ سنیاں لے سکتی ہیں کیونکہ آپ کے لئے زندگی کی دوا ہم نہیں ہے۔ میں تو اس دوا میں شریک ہوں اور شریک رہوں گا۔

نصرت :- مگر بیوی بہر حال آپ کی ذمہ داری ہے۔

نوید :- دمسکر کسا جی ہاں آپ نے صحیح فرمایا۔ اس ذمہ داری کی وجہ سے ہی آج شام واپس جا رہا ہوں۔

نصرت :- جی نہیں، آپ اس لئے لوٹ رہے ہیں کہ آپ کو ہلکا گھر گوشہ عافیت نظر نہیں آیا۔ بہت ممکن ہے آپ گھر لوٹنے کے بجائے کسی اور گوشہ عافیت کا رخ کریں۔

نوید :- سوچتے ہوئے یہ آپ نے واقعی اچھی بات سمجھائی:

.....

۱۔ مقامات آہ و فغاں اور بھی ہیں!

نصرت :- مجھے واقعی آپ کی بیوی سے ہمدردی ہوتی جا رہی ہے۔ میں انہیں جب جا کر یہ بتاؤں گا تو انہیں بڑی خوشی ہوگی۔

نصرت :- (الحمد للہ) آپ طرز فرما رہے ہیں۔

نوید :- جی نہیں۔ میں نہایت دیانت سے عرض کر رہا ہوں۔

نصرت :- مجھے آپ کی دیانت پر شبہ ہے۔

نوید :- (یکایک چونک کر) اس بات کے کئی مطلب ہو سکتے ہیں (رک کر ذرا غراوت سے) معلوم نہیں آپ کے ذہن میں کس قسم کی بددیانتی ہے۔

نصرت :- اب کے نصرت چونکتی ہے جی نہیں یہ بددیانتی

نوید :- دذرا کسا کسا جی ہاں یہ مجبوری تو ہے۔ لیکن انشاء اللہ پھر ملاقات ہوگی۔ ابھی تو پوری زندگی بڑی ہے۔

نصرت :- (اچانک) آپ کچھ بتائیے کہ آپ کا اصل میں ارادہ تو چند روز قیام کا تھا نا۔ یہ آج ہی شام نوٹے کا فیصلہ آپ نے ابھی ابھی کیا ہے؟

نوید :- (چونک کر) میں آپ سے جھوٹ نہیں بولوں گا، میرا ارادہ واقعی چند روز ٹھہرنے کا تھا۔

نصرت :- اور عدالت میں پرسوں حاضری؟

نوید :- ظاہر ہے وہ بات میں نے کھڑی تھی۔

نصرت :- دمسکر کسا لیکن آپ کا جھوٹ بڑی جلدی پکڑا گیا۔ بہر حال آپ اپنا ارادہ بدل لے رہے ہیں آپ کے آرام کا ہر طرح سے خیال رکھیں گے۔

نوید :- شکریہ! مجھے معلوم ہے کہ مجھے یہاں کوئی تکلیف نہیں ہوگی لیکن جس بات کے لئے آیا ہوں وہ منتشر نہ آئی تو میرا ٹھہرنا بیکا رہے۔

نصرت :- تو آپ کس غرض سے آئے ہیں؟

نوید :- کچھ دنوں کام کی بہتات سے میرے اعصاب ذرا جھنجھٹائے تھے میں نے سوچا یہاں پر مجھے ذہنی سکون مل جائے گا لیکن اب یہ مشکل نظر آتا ہے۔

نصرت :- (دو روایات بدل کر) خان کہہ رہے تھے آپ کی بیوی مستقل بیمار رہتی ہیں

نوید :- جی ہاں۔

نصرت :- تو اب وہ گھر میں اکیلی ہیں کیا؟

نوید :- جی نہیں ان کے پاس خادما ہیں۔

نصرت :- نہیں میرا مطلب ہے ان کا کوئی عزیز ان کے پاس نہیں؟

نوید :- (ذرا بچھ کر) جی نہیں۔

نصرت :- میں تو یہ سوچ بھی نہیں سکتی کہ اپنے آرام کی خاطر خان کو تنہا چھوڑ کر کہیں چلی جاؤں۔

نوید :- آپ کی شادی ہوئے چند ہی مہینے ہوئے ہیں۔

نصرت :- اگر چند سال بھی ہو چکے ہوتے تو میں پھر بھی یہی

نصرت :- بہر صورت یہ بحث بیکار ہے۔ ہم ایک دوسرے کو سمجھنے میں کامیاب نہیں ہو سکتے۔

نوید :- زبان یا دین ترکی دین ترکی ہی دامن۔

نصرت :- مگر جواب تو آپ ترکی بہ ترکی دیتے ہیں۔

نوید :- اگر گستاخی نہ ہو تو میں بھی کچھ پوچھنے کی جرأت کروں؟

نصرت :- فرمائیے؟

نوید :- آپ کی شادی کی بنیاد کیا ہے؟

نصرت :- (اطمینان سے) محبت۔

نوید :- (منہں کس ہو گئی ہے غیر کی شیریں بیانی کا رگڑ عشق کا اس کو گماں ہم بے زبانون پر نہیں!)

مرزا غالب :- یعنی ہماری ہی طرف سے یہ عند

دوستی ناقابل قبول تھا۔ آپ کی طرف سے

یہ بنیاد نہایت معقول ٹھہری۔

نصرت :- (ذرا طنز سے) تو کیا آپ کا خیال ہے کہ میں نے

زمانے سے پیسے کے لئے شادی کی ہے؟

نوید :- جی نہیں، مجھے معلوم ہے آپ کے یہاں پیسوں کی کمی نہیں تھی۔

(ڈاکٹر قاسمی دائیں جانب سے داخل ہوتا ہے)

ڈاکٹر قاسمی :- خان کہہ رہے ہیں آپ سب لوگ ڈرائنگ روم آجائیے، کافی تیار ہے۔

نصرت :- آپ نے معائنہ کر لیا؟

ڈاکٹر قاسمی :- ابتدائی اور سرسری معائنہ تو کر لیا ہے، تفصیلی معائنہ

آپ سے گفتگو کرنے کے بعد کروں گا۔

نوید :- اگر جائز ہو تو میں لپک کر پہلے پہنچ جاؤں۔ کافی کی

طلب ہو رہی ہے اور پھر ڈاکٹر صاحب کے ساتھ لوٹا بھی

ڈاکٹر قاسمی :- اچھا تو آپ بھی آج ہی جائیں گے؟

نوید :- دو دنوں کے بعد آئے ہیں جی ہاں آپ کی محبت، واللہ،

ازیں کہ خوش آئی ہے۔

ڈاکٹر قاسمی :- خوش ہو کر، شکریہ (نوید دائیں جانب نکل جاتا ہے۔)

نصرت کی طرف توجہ ہو کر یہ دیکھیں کہ شاعر؟

میرے ذہن میں ہیں آپ کے ذہن میں ہے۔

نوید :- (مسکرا کر) اچھا وکیل وہ ہے جو سخت سے سخت جرح

سن کر بھی مسکراتا رہے۔

نصرت :- (ذرا تشریف سے) اگر آپ کے ذہن میں بددیانتی نہ ہوتی

تو اپنا تعارف کرنے میں اتنی تاخیر نہ کرتے۔

نوید :- (سجیدگی سے) آپ دیانت کی بات پوچھتی ہیں؟

نصرت :- جی ہاں سچ بتائیے۔

نوید :- میرا ارادہ تھا اپنا تعارف کر دوں لیکن آپ کی گفتگو

اتنی — (ذرا رک کر) اتنی یعنی دلچسپ ہوتی چلی

کہ اگر میں زبردستی بول پڑتا تو سارا مزہ کر کر لیا ہو جاتا۔

نصرت :- خیر، اس سے یہ ثابت ہو گیا کہ آپ کے بارے میں

میری رائے — (دھڑک کر) اچھا آپ یہ بتائیے کہ

آپ کی اور خان کی دوستی کس بات پر قائم ہے؟

نوید :- محبت پر۔

نصرت :- (ذرا الجھتا کر) جی نہیں میرا مطلب یہ نہیں تھا۔

ظاہر ہے کہ محبت آپ کو کوئی اور اسی قسم کی چیز ہو

میں پوچھنا یہ چاہ رہی تھی آپ کی دوستی کی بنیاد کیا ہے۔

نوید :- یعنی یہ کہ زمانے مجھے کیوں اچھا لگتا ہے۔

نصرت :- جی ہاں، یوں بھی کہا جاسکتا ہے۔

نوید :- زمانے میں بہت سی خوبیاں ہیں۔ اکثر ایسی جنہیں محسوس

کیا جاسکتا ہے، بیان نہیں کیا جاسکتا۔

نصرت :- مثلاً؟

نوید :- (ذرا طنز سے) آپ کو شاید وہ نظر نہ آئیں۔

نصرت :- (بھراؤ لے کر) نوید صاحب میں ان کی بیوی ہوں

اور بیوی سے زیادہ — (رک کر نرم لہجہ میں)

اصل میں میں انہیں شوہر کی حیثیت سے جانتی ہوں،

دوست کی حیثیت سے نہیں۔ ہو سکتا ہے ان کی شخصیت

کا وہ رخ جو دوست دیکھ سکتے ہیں — میں نہ دیکھ سکی

ہوں۔

نوید :- (نصرت کی نرمی سے متاثر ہو جاتا ہے) میرا مقصد آپ کے

جنوبات کو ٹھیس پہنچانا نہیں تھا۔ میں معافی چاہتا ہوں۔

نصرت :- (طنز سے) معلوم ہوتا ہے دونوں کی خرابیاں آپ میں ہیں۔

ڈاکٹر قاسمی :- جی؟ خیر۔ لیکن آدمی دلچسپ معلوم ہوتا ہے۔
چلے سفر اچھا کٹ جائے گا۔

نصرت :- (موضوع بدل کر) تو اس ابتدائی معاملے کے بعد آپ کی رائے کیا ہے؟

ڈاکٹر قاسمی :- ہاں، فی الحال کچھ نہیں کہا جاسکتا۔ ہمارا تجربہ یہ ہے کہ اگر کوئی عام مریض ایک چوبیس گھنٹہ لیٹا رہے تو اس کی ٹانگوں کے نیچے بہت کمزور ہو جاتے ہیں۔ ان کا علاج الگ کرنا پڑتا ہے۔ اور انہوں نے تو اپنی ٹانگوں کو چار برس سے حرکت ہی نہیں دی۔
نصرت :- یعنی امید نہ زیادہ نہیں۔

ڈاکٹر قاسمی :- زیادہ تو یقیناً نہیں۔ انل میں سب سے پہلے انہیں اس ذہنی منزل پر لانا ضروری ہے جہاں وہ بہت سی تکلیف اور محنت برداشت کر سکیں جہاں انہیں صحت یاب ہونے کے لئے بہر حال کرنی پڑے گی کیا آپ کے خیال میں آپ انہیں اس منزل پر لاسکتی ہیں؟

نصرت :- (سوچ کر) اداسی سے مشکل ہی نظر آتا ہے۔
ڈاکٹر قاسمی :- تو کیا ان کا کوئی دوست ایسا نہیں جسے دیکھ کر انہیں زندگی کی اچھی باتیں یاد آئیں جو انہیں

ڈونے سے بچا سکے، انہیں ہاتھ پاؤں مارنے کو کہے اور آہستہ آہستہ ابھرنے کے لئے اکسا سکے؟
نصرت :- (اداسی سے) نہیں کوئی نہیں..... (پھر یکایک چونک کر) ہاں شاید نوید۔

ڈاکٹر قاسمی :- لیکن نوید تو آج شام واپس جا رہے ہیں اور اس کام کے لئے وقت درکار ہے۔

نصرت :- تو آپ کو کیا خیال ہے اگر انہیں روک لیا جائے تو خانہ کے صحت یاب ہونے کی کچھ امید ہو سکتی ہے؟

ڈاکٹر قاسمی :- میں قطعی طور پر ناامید بھی نہیں ہوں۔
نصرت :- اگر ایک فی صد بھی امید ہو تو میں انہیں روکنے کی کوشش کروں گی۔

ڈاکٹر قاسمی :- (مسکراتے ہوئے) فائدہ ہو یا نہ ہو، انہیں روکنے میں کوئی نقصان تو نہیں ہے۔

(اندرونی زبان کی آواز)

زمان :- بھائی آپ لوگ ابھی چکو۔

نصرت :- آ رہے ہیں۔ (ڈاکٹر قاسمی سے) اچھا ڈاکٹر صاحب! میں کوشش کرتی ہوں۔

(دونوں دائیں جانب چلے جاتے ہیں)

(پروہ گرتا ہے)

*

مسلم بنگالی ادب

بنگلہ سے ترجمہ

ڈاکٹر انعام الحق، ایم۔ اے۔ پی۔ ایچ۔ ڈی

اس کتاب میں بنگالی زبان و ادب کی مکمل تاریخ اور اس کے ثقافتی، ملی و تہذیبی پس منظر کا جائزہ لینے کے بعد بتایا گیا ہے کہ اس زبان کی نشو و نما اور ترقی و تہذیب میں مسلمان حکمرانوں، صوفیاء، اہل قلم، شعرا اور ادباء نے کس قدر حصہ لیا ہے۔ یہ جائزہ بہت مکمل اور تحقیق و تفصیل کا شاہکار ہے۔

پوری کتاب نفیس اردو ٹائپ میں چھاپی گئی ہے۔ اور جلد سے، سرورق دیدہ زیب اور رنگین صفحات پر چھاپی

ادارہ مطبوعات پاکستان - پوسٹل کسٹمر ۸۵۳۳ کراچی

بدل: ————— بقیہ صفحہ ۷۷

طرح چپ چاپ پڑا تھا۔

ان کی نگاہیں اکٹھے لڑے کے اندر لوٹ آئیں۔ آواز ایک بار پھر ابھری۔ پہلے سے کہیں زیادہ بلند اور پھر کیا ایک خاموشی چھائی اور اس کے ساتھ ہی ریت، اور ٹی کا کھوٹا ہوا کڑھاڑ سا جہاں رہ چکا اور کتا لڑ رہے تھے اٹھ اٹھ ہو گیا۔ بگولا بلیہ گیا۔ ہر انگریز۔ طوفان تھم گیا۔

تلندرا اور زمیندار دونوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور اکٹھے لڑے کے مرکز کی طرف پلٹے پیٹھی ہوئی ریت میں رکھ کر مردہ پڑا تھا اور اس کے سائے میں تنسل شاہ کا کتا چیتے سنا رہا تھا۔ اور فضا مبارک بادوں سے گونج اٹھی۔ لیکن فیصل شاہ کچھ اور ہی سوچ رہا تھا بدل دی تباہی و تباہی۔ پرہیزگار بغیر دوا آسان دی سمجھ دیجئے کوئی نین آنا۔ اوسے؟

دکھی شاہزادی: ————— بقیہ صفحہ ۷۸

بنالیا تو —! بے بسی کے اس عالم اس نے خدا سے دعا مانگنی شروع کیں۔

کچھ دیر بعد شہزادے نے مایوس ہو کر پرستی بانو سے کہا۔
"باتو آج ہماری آخری ملاقات ہے۔ شاید اب ہم ایک دوسرے سے ہمیشہ کے لئے بچھڑ جائیں گے۔ پھر ہی ہوئی موجیں ہماری تباہی کی نشاندہی کر رہی ہیں؟"

رات بیت چکی تھی!

یورپ اور سے سورج نے آہستہ آہستہ سر نکالا شہزادے نے آخری بار پرستی بانو کے اُداس اور مضمحل چہرے کو دیکھا اور پل بھر میں ناؤ کو موجیں نکل گئیں!
قیمت بھی کیا کیا لیل و نہار دکھاتی ہے +

تھوڑی منظر ہے..... کو۔

"کیوں اوسے" زمیندار کی آواز میں غصہ تھا۔ رمضان فی نے اپنی پگڑی گالے میں ڈال لی اور ماتہ باندھ کر کھڑا ہو گیا۔ تو پھر ڈرتا کیڑا ہے۔ ہونے دے فیصلہ۔

اور زمیندار کے اشارے پر ایک مرتبہ پھر بلاشیر کا شور بلند ہوا اور اس کے ساتھ ہی اکٹھے لڑے کے مرکز سے ایک بگولا سا تھا جس میں دو سائے۔ ایک سیاہ ایک سفید حرکت کرتے ہوئے نظر آتے اور پھر کیا ایک ایک خوفناک آواز ابھری جیسے زلزلے۔ طوفان اور آندھی کی سی آواز۔

تماشا بینوں کے دل دھل گئے اور ان کی نگاہیں اس آواز سے منع ڈھونڈنے کے لئے سائے میں گھوم گئیں لیکن آسمان نیور کی طرح صاف۔ زمین اپنی جگہ پر قائم تھی اور انہیں ہر حال طبعیاتی کی مٹی اور قاتلہ فصیلیں دے جانے والا دریا تین کے پرے ریت کی

کردول گا۔ ہم تمہارا یہ احسان کہیں نہ بھولیں گے۔"

ناکھی رضا مند ہو گیا تو پرستی بانو نے اپنا طلائی ہار اس کی طرف پھینک دیا۔

اس وقت دریا کی لہریں غضبناک ہو رہی تھیں۔ دوڑی ناؤ پر بیٹھ گئے۔ شہزادے نے پتوار سنبھال لیا اور ناؤ آگے بڑھنی شروع ہوئی۔ سرکش موجوں کے ٹکرائے سے کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی تھی۔

اتنا لمبا چوڑا دریا، طوفان بدوش لہریں اور چھوٹی سی ناؤ زندگی جیسے بھنور میں گھر گئی ہو۔

پرستی بانو دم بخود صرف شہزادے کی اور دیکھتی رہی —
زندگی میں پہلی بار اس نے پتوار ہاتھ میں لیا تھا۔ — ناچو کارا لال جا اس کا دل دھڑکنے لگا۔ اگر ناؤ کو غضبناک لہروں نے اپنا لقمہ

”جہاں رنگینیاں گنتی ہیں“

(افسانہ واقفوں کی سرزمین، ہفتہ دیگر)

اللہ بخش راجپوت

اس علاقہ کے اُدھر وسط ایشیا کا مشہور سلسلہ گورہ پتھر کو چمکے تو اُدھر پاکستان کا اپنا کوہستانی رقبہ۔ مگر ہزاروں سال سے یہ سرزمین سوداگروں، سیاحوں، کوہ پیماؤں، مبلغین یا تہذیبوں، ہم پسندوں اور جہاں گروں کی توجہ کا مرکز رہی ہے۔ یہاں کے پہاڑ بڑے ٹیکے بہت ہیبتناک اور نہایت بلند ہیں، راہیں پر تھکی اور دسے بڑے بھیانک مگر انسان کی ہمت بلند کرنے والے۔ مشکلوں کو سر کر تے اور عزم و ارادہ، ہر دشواری کو فتح کر لیتے، جب سفر کی اتنی آسانیاں نہ تھیں، سفر تو اس وقت بھی ہوتا تھا، اور اب بھی ہو رہا ہے، مگر دو حادثہ، الگ تھلک، اور دشوار گزار راہوں نے اسے محصور اور محدود کر رکھا ہے۔ یوں چودھویں صدی میں یورپی سیاح، مارکو پولو بھی اُدھر سے گذرنا چاہے چین کے حاکم قبلائی خان سے ملنے جا رہا تھا اور اب اس عہد میں فرنگی اور چین شہر جیسے شہر دیدہ و سراہا جہاں نور دہی یہاں پہنچتے رہے ہیں۔ ان لوگوں نے جو حالات سفر کئے ہیں انہیں پڑھ کر گریں چوٹیاں اسی چلنے لگتی ہیں اور ہول سے رو جگے کھڑے ہو جاتے ہیں۔

یہ مقام ہمارے ہی ملک کا ایک حصہ ہے۔ بالکل شمال میں۔ اسے انتظامی اصطلاح میں ”مملکت ایجنسی“ کا علاقہ کہا جاتا ہے۔ مقبوضہ کشمیر کی سرحد سے شروع ہو کر مغرب کی جانب چترال و افغانستان تک پھیلا ہوا ہے اور اس طرف شمال میں چین کا سرحدی صوبہ سنکیانگ لگتا ہے۔ اور جنوب میں ہزارہ اور ایبٹ آباد کے اضلاع آن ملتے ہیں۔ اس علاقہ میں آج کل حقارت اور نگرانی ریاستیں ہیں۔ نقشہ دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ شمال کی جانب ”دنیا کی چوٹ“ سے شانہ ملائے

نہ یہاں کوئی طلسم بند ہے نہ یہاں پر یاں رہتی ہیں اور نہ یہاں کوئی جادو اور سمیہا کے شعبے ہی دکھائے جاتے ہیں، مگر پھر بھی اس خطہ کو سیاحوں کی داستان طرازیوں نے ایک طلسمی صفت ضرور عطا کر دی ہے اور فطرت کی قیاسیوں نے اسے جس طرح مالا مال کیا ہے اس کو کہانیوں میں کچھ اس طرح بن دیا گیا ہے کہ حیرت و استعجاب کے سوا اور کوئی احساس پیدا نہیں ہوتا۔ بظاہر اس کی ایک وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ بہت کم لوگ اس علاقے تک پہنچتے ہیں اور بیرونی دنیا سے اس کا ربط اتنا محدود رہا ہے کہ باہر والے اسے الف لیلوٰی سرزمین سمجھتے ہیں، حالانکہ وہ پاکستان ہی کا ایک حصہ ہے، اپنے ہی شمالی کوہستان کا جگر گوشہ۔

اسے داستانی طہرت یوں حاصل رہی ہے کہ اس کے چاروں طرف ناقابل عبور پہاڑوں کا حصار کھنچا ہوا ہے۔ ان پہاڑوں کو عبور کر کے یہاں تک پہنچنا جوئے شیر لانے سے کم نہیں۔ مگر جو حصار اور ذوقِ فطارت کے شہلاہیں اُدھر آتے ہی بسے ہیں۔ صدیوں سے یہ مقام انسانی قدموں کی جانب منتا رہا ہے، مگر کبھی کبھار۔ یہاں قدیم پہاڑی راستے ہیں جو مصیبتیں بھییلے بغیر عبور نہیں کئے جاسکتے۔ صرف مصیبتیں اور سفر کی صعوبتیں ہی نہیں، جان جو کھوں میں ڈالنی پڑتی ہے۔ اب فضائی سفر نے ان ہولناک سفروں کی کہانیاں دہرانے کا موقع کھودیا ہے مگر جو لوگ اب بھی قدیم طریقہ سفر سے کام لیتے ہیں طرح طرح کے دکھ جھیل کر ہی یہاں تک پہنچتے ہیں۔ اور ان ملک بوس پہاڑوں پر سے گذرتے ہوئے ان جزائی جہازوں کو بھی ہر وقت خطرے سے ہی واسطہ رہتا ہے۔

کھڑے آج کل کے فہم جویوں کے لئے اس داستانی سرزمین تک پہنچنا ایسا ہی رومانی تجربہ ہے جیسے کسی وقت میں خیالی "بحر ظلمات" تک پہنچنا تھا۔ ہم پسند جہاں نور دوں کے لئے تو ایسے ہی دشوار گزار خوفناک، ناہموار اور پہلے صراحتاً قطعاً ارض ہی توجہ کا مرکز ہوتے ہیں۔ یہ سرزمین اپنے کو ہستانی حصار کے سبب بیرونی دنیا سے بہت کم واسطہ رکھتی ہے اور صفر کے حکمران کو تو لوگ شاہ و پادشاہ کہتے ہیں۔ یوں تو یہاں، وہ خیالی سرزمین جسے یونانیوں کے نقشے دنیا میں اتنا مشہور کر چکے ہیں۔

صفر کی سرک کا حال کیا بیان کیا جائے۔ بس ایک قدیم الایام راستہ پہاڑوں پہاڑوں چلا گیا ہے جس پر خچر اور پاک ہی آج سکتے ہیں اور وسط ایشیا کے کاشغریہ پاکستان کے مملکت تک پھیلا ہوا ہے۔ اس تمام علاقہ کی شہرت اس کے پراسرار اور تپہ ہولی اس راستہ کی وجہ سے ہی ہے۔ آدمی وہاں صرف قدرتی نظارے دیکھنے نہیں جاتا بلکہ اطراف کی دنیا سے رابطہ پیدا کرنے کا واحد زمینی راستہ یہی ہے اور دنیا کا کوئی بھی خطہ کبھی بھی ایسا نہ رہا کہ باہر کی دنیا کے لئے سر بہر کتاب کی مانند ہو۔ انسان ہر گز گنجائش ہے اور ہر مقام کی حقیقت ایک نہ ایک دن اسے ذاتی تجربوں سے معلوم ہو گئی ہے۔ صفر اور مملکت کے علاقے میں اس سرک کی لڑخیز داستانیں اس قدر دود و در پھیل چکی ہیں کہ شاید لوگوں کا حوصلہ اسی وجہ سے پست ہوا ہے اور یوں یہ مقام اپنے "گوشہ عافیت" میں اپنے الگ تنگ وجود کو لئے صدیوں سے ایک پراسرار زندگی بسر کرتا چلا رہا ہے۔ اب زمانہ بدل چکا ہے۔ زمینی سفر کی بھی آسانیاں ہیں اور اس تک پہنچنے کے لئے۔ "اٹرن کھٹولا" بھی موجود ہے جو ذرا سی دیر میں ہمیں اس سرزمین پر پہنچا دیتا ہے۔

جیسا کہ میں نے عرض کیا تاریخ کے ہر عہد میں دنیا کے بعید ترین گوشوں سے لوگ یہاں پہنچتے رہے یہ ملاحوں اور سوداگروں کا تانا نہیں بندھا تو آمد و رفت ایسی کم بھی نہیں رہی ہے۔ ہم سب جانتے ہیں کہ چین اور وسط ایشیا کے مال سے لدے ہوئے کارواں اسی تاریخی سرک سے گزرتے تھے۔ چین کا ریشم، تبت کا مشک، وسط ایشیا کی کالیجین، سمورا اور نوادادھر آتے رہے ہیں۔ پھر

یہاں سے پاک و ہند کی تجارتی منڈیوں تک پہنچتے تھے اور سوداگر منہ مانگے دام ہالتے تھے۔ اس مال کا تبادلہ طرح طرح کی چیزوں سے ہوتا جیسے گرم مصالحے، کپڑا، جوتا، جواہر۔ اگر ایک دفعہ بھی کوئی سوداگر اپنا مال لیکر ادھر آ گیا تو ساری عمر کی کمائی ہو گئی۔ مگر کارواں کے کارواں غائب بھی ہو جاتے تھے۔ سوداگروں کو یہاں کے پہاڑ ٹہر کر جاتے اور یہ بھی پتہ نہ چلا کہ وہ اور ان کا مال کیا ہوا۔ اس کی وجہ یہاں کی آفات ارضی و ساری ہیں۔ ہر وقت پہاڑوں کا ٹوٹ پھوٹ، تو دوں کا گرنا، راستوں کا مسدود ہو جانا ایک عام حادثہ ہے۔ دریاؤں کے کٹاؤں سے پھسل جاتے ہیں، چٹانیں آنسو گئی ہیں۔ آندھیاں، جھکڑ، بجلی۔ رعد۔ طوفان، اولے، برف، الامان و الحفیظ! کونسی قیامت ہے جو یہاں نہیں ٹوٹی۔ اور نہ اس کا کوئی مقرر وقت ہے نہ جگہ۔ فطرت انہی پوری رعنائی کے ساتھ جلوہ گر ہے تو یہاں اس کی زبردست سفاکی اور فیض بھی اسی شدت کے ساتھ اپنا روپ دکھاتا ہے۔

ہزاروں سال سے سیاحوں کے قدم یہاں پہنچتے رہے ہیں۔ ان کے کلمے ہوئے سنسنی خیز حالات پڑھنے سے کچھ معلومات تو حاصل ہوتی ہیں مگر اس سلسلے سرزمین کی اصل کیفیت آنکھوں دیکھے حال سے بھی معلوم نہیں ہوتی۔ بس وہی بات کہتی ہے کہ ایک بار دیکھا ہے، بار بار دیکھنے کی ہوس ہے!

سفر کی صعوبتیں، پرہوں رائے اور خطرے ضرور لاحق ہوتے ہیں مگر اس سفر میں جو تھر تھری ہے اسے انگیز کر لینے کے بعد پھر انسان کو یہ گلبوش وادیاں مسحور بھی اتنا ہی کرتی ہیں۔ اسے جنت ارضی کہنا بیجا نہ ہوگا۔ چاروں طرف برف پوش چوٹیاں، پہلوں سے لدے ہوئے اشجار، خوب فدان، بھی انسان کو طلسم و جحر کی دنیا میں لے جاتے ہیں۔

ہم پسند، کوہ پیا، شکاری، — مناظر قدرت کے شیدا کئے یہ مقام عجیب ہے۔ آپ کو پچھلی کے شکار کا شوق ہو، پولو کے دلدادہ ہوں، عکس کشی سے دلچسپی ہو تو یہاں بڑے خوبصورت مواقع موجود ہیں۔

آج سے بیس سال پہلے یہ کوہستانی خطہ چاروں طرف سے گھرا ہوا ہونے کے سبب دنیا سے بہت ہی الگ تھلگ تھا۔ اب

کر رہے تھے جو ہمیں محنت لے جانے والا تھا۔ جوں جوں منزل قریب آتی جا رہی تھی شوق دیدن میں تر ہوتا جا رہا تھا لیکن یہ چند لمحات فرصت کچھ بے مصرف ہی نظر آ رہے تھے اور اس وقت ہماری طبیعت میں یہ بے لطفی قدرتی بات تھی۔ مگر یہ حالت بہت جلد تبدیل ہو گئی کیونکہ قافلہ سفر میں ایک عجیب اضافہ ہوا۔ کیا دیکھتے ہیں کہ ایک غیر ملکی جوڑا چلا آ رہا ہے۔ بعد میں معلوم ہوا کہ یہ سویڈن کے رہنے والے ہیں۔ دونوں کے لبوں پر دو رنگ پھیلی ہوئی مسکراہٹا ہر ایک کو خوش انداز کرتی چلی آ رہی تھی۔ معلوم ہوا دونوں شاگ جوم سے سیدھے چلے آ رہے ہیں اور لازماً سفر سے ہر طرح لیس ہیں۔ نمبندی کا سامان، صدا بندی کے آلے۔ کوہ پیمائی کے جسد ساز و سامان۔ اللہ اللہ ایہ ذوق سفر بھی کیا چیز ہے جو وقت اور فاصلے کی طنائیں کھینچ کر انسان کو کہاں سے کہاں پہنچا دیتا ہے۔ یہ دیکھ کر عجب مستر ہوئی کہ آج کا مصروف انسان بھی اگر چاہے تو اپنی ہم جوئی کی سپرٹ زندہ رکھنے کے لئے کچھ نہ کچھ وقت بحال ہی لیتا ہے۔ اصل چیز ذوقِ نگاہ ہے یا نظرت کے چیلنج کو قبول کرنے کی لگن۔

صبح کا وقت اور ستمبر کا دہینہ تھا۔ دھوپ غیب کھلی ہوئی تھی۔ ہوائی سفر مختصر تھا، یہی کوئی گھنٹہ بھر میں ہم پتہ کی سے محنت پہنچ جائیں گے۔ راہ میں وہ گلیبوش وادی پڑتی تھی جسے عالمی نقشہ سیاحت پر اب ایک ممتاز جگہ حاصل ہو چکی ہے، — وادی کا خان۔

ایبٹ آباد پر سے گزرے تو چوٹیوں کا ایک لامتناہی سلسلہ شروع ہو چکا تھا۔ آدھرا دلوں کا ہجوم سیل تاتار کی طرح اٹھا چلا آتا تھا۔ پائیلٹ ان کی زد سے بچنے کے لئے کبھی بندریں کو چھوٹے گھٹا بھی نیچے غوطہ لگا تا یہاں تک کہ ہم کوئی پندرہ ہزار فٹ کی بلندی پر پہنچ گئے۔ فضا اجلی اجلی، جہاں بیکرا نہ کے معنی کچھ ابھی سمجھ میں آئے۔

اور پھر دیکھا کہ ہمارا طیارہ بیکلیک بل کھاتا وادی سندھ کی تنگ راہوں پر سے گزر رہا ہے۔ بل صراط سے زیادہ باریک راہیں یوں لگتا تھا جیسے طیارہ تلوار کی دھار پر چسل رہا ہو۔ کبھی یوں لگتا کہ اس پہاڑ سے ٹکرایا کبھی اُس چوٹی سے بل بل

ان حصاروں کو عبور کرنا ایسا دشوار نہیں رہا۔ اس کے ایک طرف نلک بوس ہمالیہ کی چوٹیاں ہیں تو دوسری طرف قراقرم کا پتھر گھوڑا سلسلہ کوہ۔ ان پہاڑوں تک پہنچنے کے لئے اب پاکستان بچنے کے بعد سے بڑی سہولتیں پیدا ہو چکی ہیں۔ ہمارے موجودہ دارالحکومت، راولپنڈی، سے محنت تک ایسی مشترک بن چکی ہے جس پر جیب خرچے سے چلتی ہے۔ راستہ میں وادی کا خان کی ایک دوسری انگریز بہشت پڑتی ہے۔ باجوہ سرکا ۱۳۰۰۰ فٹ بلند درہ بھی یہیں ہے۔ مزید آسانی کے لئے محنت اور ملت ان کے صدر مقام سکر دوسکے ساتھ فضا کی سرسوس قائم ہو چکی ہے۔ راستہ یہی کوئی دوسو میل کا ہوگا۔ جب ہوائی جہاز سے آمدی سفر کرے تو ان بلند و بالا برف پوش پہاڑوں کی چوٹیوں پر سے گزرتے وقت دل ہولنے لگتا ہے۔ نیچے دیکھو تو دریائے سندھ کی وادی شروع ہے۔ غرض ہر نظر نگاہوں کی کثرت ہے، ہر قدم پر سفر کی تھر تھری موجود ہے۔ چنانچہ جب میں نے کچھ دنوں موسم خزاں کے دوران اس سفر کا ارادہ کیا تو یہی مناسب سمجھا کہ پتہ ڈی نک طیارہ سے پہنچنا چاہیے اور پھر وہاں سے محنت۔ محنت سے معززہ، ٹکڑ اور دیگر شمالی علاقوں کی سیر بندرلیج جیب کرنی چاہیے۔

میرے ہمسفر ایک نوجوان فلسفہ دان تھے۔ انہیں بھی اس فلسفی سر زمین کو دیکھنے کا شوق تھا اور چونکہ میں پہلے ادھر کا سفر کر چکا تھا اس لئے میں نے وہاں کے حیرت افزا نقشے سنا سنا کر ان کی آتش شوق کو اور بھی بھڑکا دیا تھا۔ یوں میری اور ان کی سرحدیں الگ الگ تھیں۔ میرا تعلق لوح و قلم کی پرورش سے ہے اور وہ سلولائیڈ کے فنکار ہیں، مگر دونوں کا مقصد ایک ہی تھا۔ اس علاقہ میں جو جاوے جو رعنائی و زیبائی ہے، اس کو ایک دستاویزی فلم میں سمود دیا جائے، اور میں اس داستانِ سرزمین کی کہانی آپ کے سامنے اس طرح بیان کر سکوں کہ اس آنکھیں دیکھے حال کے کہنے اور سننے کا مزا آ جائے اور میرے پڑھنے والے اس بات کا کچھ اندازہ کر سکیں کہ مشاطہ فطرت نے اس عروسِ ارضی کی زلفیں کن کن سدا بہار پھولوں سے سجائی ہیں۔

ہم کراچی سے بندرلیج طیارہ راولپنڈی کے ہوائی اڈہ پہنچے، پتہ پتہ۔ پی۔ آئی۔ اے کے کمرہ انتظار میں بیٹھے اس جہاز کا انتظار

بچا۔ ۱۷ سالہ تیناؤ کی کیفیت محسوس ہونے لگی۔ میں نے اپنی آنکھیں بند کر لیں اور ٹانگیں پھیلا دیں۔ اگر ہمارے منہ سے کافر طیارہ نہ ہو اور چھپائی میں ڈرا سی غلطی کی تو بس خدا ہی حافظ ہے! مگر کیا بھی کیا جائے، آسمان دور تھا اور زمین بھی دور۔ بہت دور۔ اور بہت سخت!

مگر سفر، خاص کر ہوائی سفر میں اس قسم کے خدشے تو مول لینے ہی پڑتے ہیں۔ میں ہم اندر عاشق ... بہر حال ایک عالم مسکروے نیازی کا طاری تھا۔ الحمد للہ! یہ بڑے خطرے جلد ہی گزر گئے۔

ملاقاتیوں میں بھی خطرناک ہے۔ ۱۳۳ اونچی اونچی نہایت بلند چوٹیاں، چوبیس ہزار فٹ سے بھی اوپر۔ گویا آسمان کی قریبی پڑوسا مشہور تنکا پریت یہیں تو واقع ہے۔ ۶۶۰ فٹ اونچا پہاڑ اور وہ عالمی شہرت کا مالک، اکے، ٹو، تین، چار، پانچ، اور دس جیسے دنیا کی دوسری بلند ترین چوٹی کہا جاتا ہے۔ تنکا پریت پر دنیا کی بلندیوں میں پندرہ ہزار فٹ اونچی چوٹی، یہیں تو ہے۔ بس یوں لگتا کہ ایک دیوار سنگ ہے جو فرش سے عرش تک پہنچ گئی ہے۔ الغلطی نہ! مگر ان بلندیوں کی پستی بھی دیدنی تھی۔ پہاڑی ڈھلانیں، ہر طرف سبز، ہر طرف نظر جاتی تھی فرش زمردیں بچھا دکھائی دیتا تھا۔ ایسی ہر یاد کہ آنکھیں تراوت سے ٹھنڈی ہو جائیں۔ اور تصور دہم میں آجائے۔ تیز وندیوں۔ وہ ہلکشان ارضی، الگ جلوہ فروش تھیں۔ اونچے اونچے برف پوش پہاڑوں کے دامن میں گلیشیروں سے نکل کر بل کھاتی، اٹھاتی اور گنگناٹی نیچے اتاری چلی آرہی تھیں۔ طیارہ ایسے ہی ماحول سے گزر رہا تھا۔ نیچے واڈی مندھ کی شروعات تھی۔ بال سے باریک بچہ دھم۔ یہ ننھا سا طیارہ فطرت کے ان عظیم مظاہر کے بیچ میں ایک ذرہ بے مقدار سے زیادہ نہ تھا۔ مگر پائیڈ کی چابکدستی اور سہرندی کا قائل ہونا پڑا کہ وہ تمام مقامات خطرے میں صاف بچا کر لے گیا۔ مگر یہ لمحہ میری زندگی کے کبھی نہ بھولنے والے واقعات کی ایک کڑی ضرورت بن گیا۔

طیارہ تنکا کے نزدیک پہنچا تو یوں لگا جیسے پہاڑوں نے ہمیں راہ دیدی جو۔ اب سامنے ایک کشادہ وادی تھی۔

معلوم ہوا کہ ہم گلگت کے ہوائی اڈہ پر اترنے والے ہیں لیکن گلگت کی ہوائی جی کے اوپر چکر لگا رہا تھا۔ آج واحد میں جہاز کے پٹیوں نے اس طے سرزمین کے دامن کو بوجھ دیا کہ متوازی چلا گیا تھا پہلی بار بوسہ دیا۔

سب سے پہلے سوڈی جی جوڑا طیارہ سے باہر نکلا۔ اس جنت ارضی کی سرحد میں پہلی بار داخل ہونے پر کچھ مستر، کچھ حیرت کے لیے جلے جذبات چروں پر لئے ہوئے۔

گلگت کا یہ ننھا سا ہوائی اڈہ بھی بڑی دلچسپ جگہ ہے۔ جیسے ہی جہاز رکنا جانے سے کدھر سے بہت سے گلگتی مزدور ہماری طرف دوڑ پڑے۔ سامان اتارنے چڑھانے کا شور و غوغا بلند ہونے لگا۔ ان لوگوں کی بھرتی دیکھنے کے قابل تھی۔ وہ جلد سے جلد مال اتارنا اور چڑھانا چاہتے تھے۔ کیونکہ جہاز واپس پنڈی جا رہا تھا۔ جلد سے جلد واپس کی ہر ممکن تدبیر کی جا رہی تھی۔ جہاز بہت سال لے کر آیا تھا۔ چنچڑائیاں مین جہاز کے پاس آن گئیں۔ یہ مال لے کر سیدھی شہر کا رخ کر رہی تھی۔ جہاز کی عمارت بڑی تیزی سے کام کر رہا تھا۔ ہر طرف بھگدڑ مچی ہوئی تھی۔ یہ ساری عجلت یوں تھی کہ موسم کا کوئی اعتبار نہیں۔ تجربہ کار سے تجربہ کار ماہر موسمیات بھی یہ نہیں کہہ سکتا کہ ذرا سی دیر میں فضا کیسی ہو جائے گی۔ یہاں ذرا سی دیر میں موسم کا مزاج برہم ہو جائے گا۔ جبیں انہی پر ٹکنیں پڑنے سے پہلے پہلے چاند کو خطرہ کی حد سے نکل جانا ضروری تھا۔ کچھ دنوں جب میں چند دن کے لئے گلگت گیا تھا تو واپس میں کئی دن کے لئے لکنا پڑا کہ نہ کہ دادوں بلکہ دل دادوں، لے پوری داوی کو گھیر رکھا تھا اور یہ سارا علاقہ باقی دنیلے منقطع ہو چکا تھا۔

ہوائی اڈے پر ہمارا استقبال یہاں کے ایک افسر صاحب صاحب نے کیا۔ یہ صاحب شمالی اضلاع کے پولیسکال ایجنٹ کے نائندے تھے۔ انہوں نے ہمیں گلگت ریسٹ ہاؤس کے ایک انگارے کمرہ میں ٹھہرایا۔ ستاروں اور مہانوں کو جو سہولتیں اس دوست مقام پر پیش کی جاسکتی ہیں وہ سب بڑے اخلاق و محبت کے ساتھ ہمیں یہاں دینا کر دی گئی تھیں۔

گلگت کا چھوٹا سا شہر نے تعمیر شدہ ہوائی اڈے کوئی میل بھر دور ہو گا۔ آجکل یہ جگہ گلگت ایجنسی اور "شمالی اضلاع"

۱۹۷۳ء

۱۱ میں

ایکٹ

دوب روام

ساتھ

سادری سترہ

معتک

ننگے

پہ پاتے

پہلے گئے

ہے مگر

انہیں

تھے کہ

کا ایک

لئے

رک

ہنزہ و ڈیر

(چند مناظر سے)

زادہ سی کہ ایک

تھے۔

بطور

ہیں

مدے

سرف

پراؤتھا

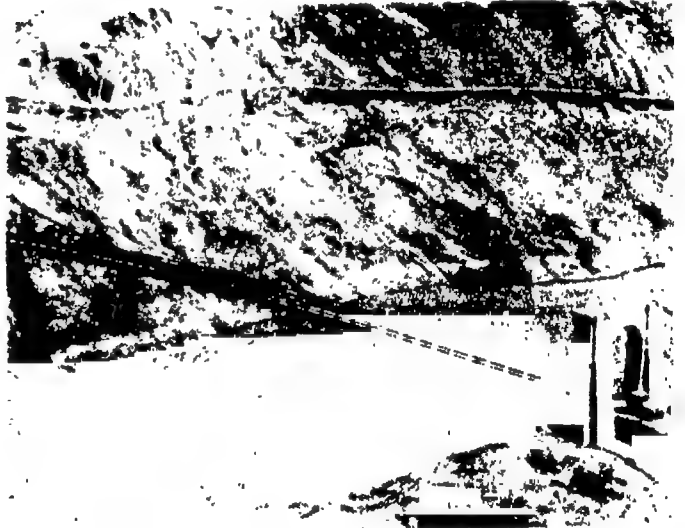
درتھا

خیر ہوتا

نرمال

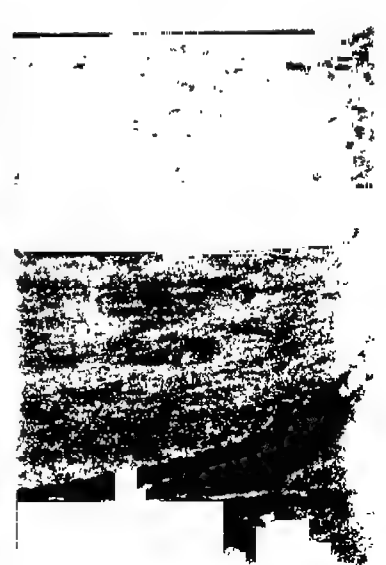


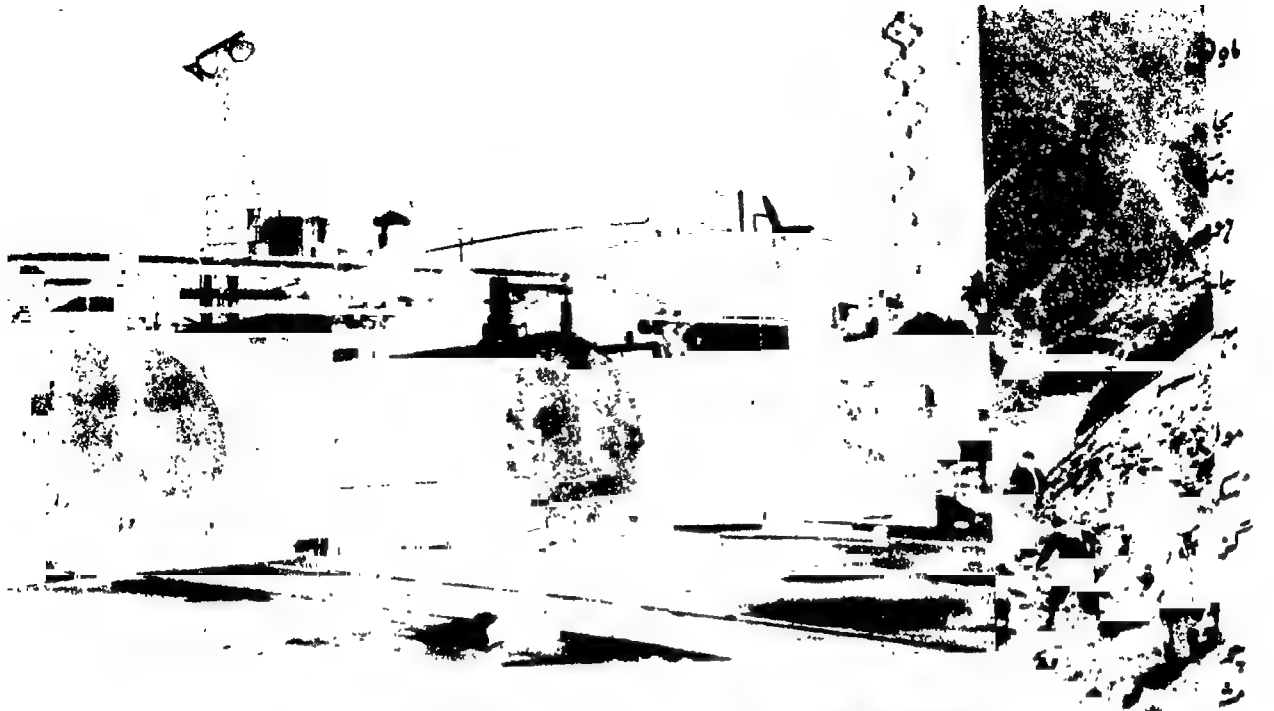
نہارہ کے ذریعے دریائے ہنزہ کا پانی عبور کرنے کا طریقہ



ہنزہ رود پر لٹکوان ہل

ہل کا پل (ہنزہ رود کے کنارے)





مغربی پاکستان کی طرح مشرقی پاکستان میں صنعتی ترقی کی رفتار دو تیز سے تیز تر کرنے کی مساعی پورا زور دیا جا رہا ہے تاکہ ہمارا یہ بازو بھی، جو دیگر وسائل سے مالا مال ہے، اپنی صلاحیتوں کو بحوبی بروئے لا سکے۔

مشرقی پاکستان کی صنعتی ترقی کے لئے کاغذ، کھاد بنائے اور دریاؤں کی تسحیر کے منصوبوں کا مہابی کے ساتھ عمل لیا جا چکا ہے۔



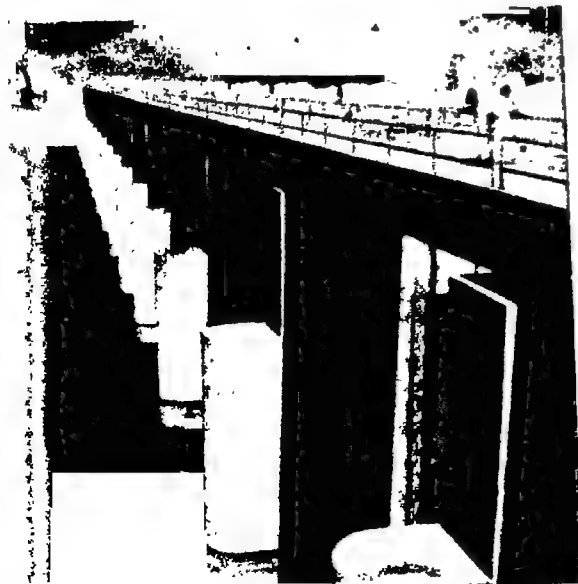
آئرن سٹون ہو جانے



فروری ۱۹۶۵ء میں

رخانہ (ٹوٹنا) :

خود کئی ہو چکے ہیں
(۱۹۶۵ء)



تسحیر سے تعمیر : شہابی پر بند کی تعمیر

جاٹسے اور یہ عجوبہ روزگار پل تباہی سے بچ گیا۔ ان بھول میں گھسے ہوئے پھول کو محفوظ کر لیا گیا ہے۔ اور آجکل پورے ملک ایجنٹ صاحب کے بچے پر بطور یادگار رکھ دئے گئے ہیں۔

دربار کے مشرقی کنارے کو عبور کر کے ہم جانب جنوب روانہ ہوئے۔ سڑک پر بڑی خاک تھی جو ایک پہاڑی کے ساتھ ساتھ کوئی تین میل تک چلی گئی تھی۔ یہ سفر کرتے ہوئے ہم وادی منترہ میں داخل ہو گئے جو کافی چوڑی مگر بے برگ و گیاہ ہے۔ جھٹک کوئی سیرگاہ بھی نظر نہ آتا۔ دونوں طرف تو دہریہ کے رنگ سے ملتی جلتی پہاڑیاں، یا سرسبز پہاڑ تھے جن میں سے تنگ ٹہنچے لڑتے جلتے چلے گئے تھے۔ یہ راستے کیسی کیسی صنایع کے ساتھ بنائے گئے تھے، اس کا اندازہ صرف دیکھنے کے بعد ہی کیا جاسکتا ہے۔ مگر ہم لوگ ان پر خطر راہوں کے ایسے عادی ہو چکے تھے کہ انہیں دیکھ کر کسی قسم کا اعصابی تناؤ محسوس نہ ہوتا تھا۔

مگھت سے ہم کوئی بارہ میل اُدھر آئے ہوا تھے کہ ایک نئی آفت کا سامنا کرنا پڑا۔ راستہ میں کسی پہاڑی کا ایک تودہ گر کر سڑک کو مسدود کر چکا تھا۔ مزدور سیلے لئے صاف کرنے میں مشغول تھے مگر انہوں نے بتایا کہ سڑک کھلنے میں کوئی چار گھنٹے لگ جائیں گے!

پہلے سوچا اب کون اتنا انتظار کرے اور مگھت واپس چلیں، مگر پھر خیال آیا کہ وادی شوق میں قدم رکھنے کے بعد آگے ہی بڑھنا چاہیے۔ اسی اثنا میں کیا دیکھتے ہیں کہ ایک اور جیپ چلی آرہی ہے۔ لیجئے وہی اپنے پرانے دوست تھے۔ سوئڈن کے رہرو۔ ان کے ساتھ ایک مقامی افسر بھی بطور گائیڈ آئے تھے۔

ہم لوگوں نے فیصلہ کیا کہ اپنی اپنی جیپیں تو یہیں چھوڑیں اور خود آگے بڑھیں۔ چند مزدوروں کی مدد سے اس تودہ سنگ کے اس طرف پہنچیں اور ٹوٹل کی طرف پیدل چل پڑیں، جو ہماری اگلی منزل تھی۔ یہ ہالا پہلا ٹپڑا تھا۔ یہاں ریلوے اسٹیشن کا ٹرکس جاہل ہے اور کوئی پانچ میل دور تھا۔ وہاں ہم کھلنے کے وقت پر پہنچ سکتے تھے۔ ڈیڑھ دو گھنٹہ پہلے دی گئی کہ جیسے ہی راستہ کھلے وہ سامان اور جیپیں لیکر فوٹل

کا انتظامی مرکز ہے یعنی صدر مقام اس کی آبادی چند ہزار ہے اور ایک تنگ وادی میں واقع ہے۔ سطح سمندر سے تقریباً ۴۵۰۰ فٹ بلند۔ چاروں طرف سرسبز رنگ منہایت بلند پہاڑوں کا سلسلہ ہے اور دریائے مگھت پر سے علاقے کو محیط۔ غرض یہ مقام اپنی قدرتی خوبصورتی اور نفیس ویرسکون ماحول کے اعتبار سے بڑا ہی راحت فرا اور قابل دید مقام سیاحت ہے۔ یہاں ایک چھوٹا سا بازار بھی ہے جو اب ایئر پورٹ تک پھیلتا جا رہا ہے۔ اس بازار میں شمالی اضلاع کے ہر مقام کے لوگ چلتے پھرتے نظر آئیں گے۔

تاریخی عہد سے لیکر اب تک مگھت اطراف و اکناف کا تجارتی مرکز رہا ہے۔ کسی زمانہ میں وسط ایشیا کے کارواں یہیں آکر دم لیتے تھے۔ سنکیا گ سے اس علاقہ تک جو اب پاکستان کہلاتا ہے جو رشتہ موافق قائم تھا، مگھت اس کا مرکزی نقطہ تھا۔ کارواری لوگ اُدھر سے اُدھر کرتے جاتے رہتے تھے۔ چین اور وسط ایشیا کا مال تجارت، نوادرات اور سوغاتیں یہیں پہنچتی تھیں۔ پھر یہاں سے بہت سا مال و اسباب لے کر سرحد چلا جاتا تھا۔ پہاڑی سفر کی خطرناک ہمیں، پرچہ ڈراؤنے راستے جیسے پہلے تھے اب بھی ہیں مگر حوصلہ مند جاہلوں اور رورڈ ان شوق ان سب مشکلوں کو حل کر لیا کرتے تھے۔ آج کل مگھت کے کارواری تعلقات اپنے ہی ملک کے دوسرے حصوں سے قائم ہیں۔ یعنی مگھت سے ہندوستان کے درمیان ہر وقت کارواری سلسلے چلتے رہتے ہیں۔ سڑک کے راستے سے بھی اور ہوائی جہاز سے بھی۔

ہاں، تو میں ذکر کر رہا تھا کہ ہم لوگ بحیرہ مگھت پہنچ گئے، اور دوسرے روز صبح جیپ میں سوار ہو کر مگھت سے آگے چل پڑے۔ ہماری منزل مقصود گنگا اور منترہ تھی۔ مگھت تو سمجھنے ایک ابتدائی مستقر تھا، یعنی، وہی بات۔ آگے چلیں گے دم لے کر؟

عظیم دریائے مگھت پر برف کی چادر جم چکی تھی۔ اسے عبور کرنے کے لئے ہمیں اس جھولے قابل پر سے گذرنا تھا جس کے بارے میں ہمیں معلوم ہوا کہ یہ ایٹا میں سب سے لمبا پل ہے۔ یہیں یہ بھی بتایا گیا کہ ۱۹۴۸ء میں جب ہندوستانی فوج کے طیاروں نے مگھت پر حملہ کیا تھا تو اس کو بھی تباہ کرنے کی کوشش کی تھی مگر خوش قسمتی سے کوئی بھی بم اس پر نہ گرا، یعنی ہم اُدھر اُدھر دیا میں

پہنچ جائیں۔ مسٹر اور مسز آلسینز نے بھی تدریس اختیار کر لی۔

پیدل کا راستہ کوئی گھنٹہ بھر میں طے ہو گیا۔ راہ میں ہمیں کئی پہاڑیوں کے اوپر تک پہنچنا پڑا اور جب نیچے اترے تو ہری بھری وادی ٹول میں داخل ہو چکے تھے۔ دو پہر کے کھانے کا وقت بھی آن پہنچا تھا۔ ریٹ ہاؤس بڑی پر فضا جگہ بنا ہوا ہے۔ چاروں طرف پھلوں کے باغات ہیں۔ کھانا بڑا نفیس تھا اور کوئی تین گھنٹے تک ہم لوگ خوب سستائے۔ چار بجے کے قریب ہمارے ڈرائیور اپنی اپنی جیبیں لیکر آگئے تھے۔ اب ہماری اگلی منزل صفحہ تھی جس کے لئے ہم تیار تھے۔ سوئیڈی جوڑا بھی روانگی کے لئے تیار تھا اس کے ساتھ ایک مقامی گاؤں اور بارہا بھی تھا۔

ٹول سے آگے بڑھے تو عجیب عالم تھا۔ جس طرف نگاہ مانتی تھی وہاں پہاڑوں کا ہیڈناک سلسلہ تھے ہوئے سنتریوں کی طرح سینہ تالے راستہ روکے ہمارے آگے کھڑا تھا۔

گواچ کے مقام تک ہماری جیب ابھی پہنچی ہی تھی کہ ایک دم کسی پہاڑ کے نیچے اترتی شروع ہو گئی اور اچانک ایک گہری ندی میں داخل! الامان! اخیر، اس تجربے سے ابھی حواس قائم ہوئے ہی تھے کہ ایک اور پرہول مقام آ گیا۔ یہاں گاڑی ہو یا کوئی حیوان بہتے پانی سے گندے بغیر دوسرے آدمی نہیں پہنچ سکتا۔ ایک گہری کھدی ہوئی آبی راہ کے گرد چکر کاٹتے ہوئے ہم آہستہ آہستہ آگے بڑھے۔ سر چکر دینے والی چڑھاٹیاں تو ابھی آگے آنے والی تھیں اور ہم ذہنی طور پر ان کے لئے تیار تھے۔ گاڑی انتہائی سستی کے ساتھ چل رہی تھی۔ ہر موڑنا خطرناک تھا کہ زندگی کا موڑ معلوم ہوتا تھا۔ ہر خم پر جیب جوں کی چال چلتی تھی اور یہ تو بہت ہو کہ اس کے چاروں پیسے سنگریزوں میں پڑے پوری رفتار سے گھر گھر کر رہے ہیں مگر گاڑی یکدم ایک جھٹکے کے ساتھ ٹھہر گئی! لیجئے آگے ایک "لا" کی شکل کی گولائی آگئی۔ اب اس پر چکر کاٹتے تو آگے بڑھیں! فرض سفر کا ہی عالم رہا۔ سوچا ایسے خطرناک راستوں کو عکس کی قید میں لایا جائے مگر ہم نے سوچا اگر عکاسی کے

چکر میں پڑے اور ڈرائیور کو ذرا بھی گر بڑیا تو پوری پارٹی کی جانیں خطرہ کے منہ میں پہنچ جائیں گی! لیجئے ایک ایسا سخت مقام بھی آ ہی گیا۔

آلسینز کی جیب ایک تیکے سے خم پر پہنچی ہی تھی کہ ایک دم اٹلی چڑھنے لگی! معلوم ہوا کہ ڈرائیور صاحب نے الٹا گیز لگا دیا حالانکہ اس سیدھی تہی چڑھاٹی پر ایکسیلیٹر دباننا چاہیے تھا! اودیہ قطعی معجزہ ہوا کہ جیب اترائی کے پاس پہنچتے ہی زبردست جھٹکے کے ساتھ خود ہی رگ لگی، ورنہ حشر معلوم تھا!

اس خوفناک واقعہ نے ہمارے بھی اوسان خطا کر دیے تھے۔ کم از کم ہندو منٹ تک ہم اپنے اعصاب پر قابو نہ پاسکے۔ خیر یہ لمحات بھی گزریں گئے اور ہم نے پھر سفر شروع کر دیا۔ جب آلسینز کی جیب اٹلی چڑھنے لگی تھی تو مسز آلسینز اپنی سیٹ سے اچھل پڑی تھیں اور دوبارہ اس پر بیٹھنے کے لئے تیار نہ ہوتی تھیں۔ ہم سب دیکھ رہے تھے کہ خوف کے مارے ان کا چہرہ زرد تھا، بری طرح بدحواس تھیں۔ اس صورت حال کا مقابلہ ایک حین تدبیر سے کیا گیا۔

طے ہوا کہ ہم ان کی جیب پر پیچھے پیچھے چلیں۔ اگر اتفاق ایسا ہی کوئی حادثہ رونما ہو جائے تو ہم فوراً مدد کو دوڑیں، ویسے حوصلہ مارنے کی کوئی بات نہیں تھی۔ اس طرح کی باتیں کر کے ہم نے آلسینز کو پھر روانہ کر دیا۔ انتان و خیزاں ہم بھی چھاٹ تک پہنچ گئے۔ یہ جگہ ٹول سے ۱۵ میل سے زیادہ نہ تھی، مگر پہنچتے پہنچتے کوئی تین گھنٹے لگ گئے! شکر ہے ہمارے اندیشے غلط ثابت ہوئے۔

ہم لوگ رات بھر یہاں کے ریٹ ہاؤس میں ٹھہرے۔ جہاں ہمیں دو نہایت آرام دہ کمرے مل گئے تھے۔ کچھلے تجربات کی یادیں کچھ ایسی و فحوش کن بھی نہ تھیں مگر یہاں اگر ایسا معلوم ہوا کہ آغوش راحت نے ہمیں اپنے بیچ میں لے لیا ہے اور ساری کوفت اب دودھ ہو جائے گی۔ چاروں طرف اونچے اونچے برف پوش پہاڑوں کے سنتری چپ چاپ ہاتھ باندھے کھڑے تھے اور ان کے سلسلے یہ بھی سی خوبصورت بستی تھی، اس کا یہ ہماقی خانہ تھا جس کے سبز و نارنگی ہم لوگ بیٹھے تھے، تاروں بھرا آسمان اودے

شاو اب ہے بلکہ اطراف و جوانب کے علاقوں کی خشک اور مٹی لریٹ اڑاتے سرخی رنگ پہاڑوں کے مقابلے پر تو یہاں کے پہاڑ بڑے ہی شاو اب تھے، ہر طرف خضرا ہی خضرا پھیلا ہوا تھا۔ تحریثِ نعت کے طور پر عرض کرتا ہوں کہ مینا پن میں دوپہر کے کھانے پر ہمیں وہ وہ انواع و اقسام کے کھانے کا اتفاق ہوا کہ طبیعت سیر ہو گئی۔ روٹ جکین، آلو، تازہ پھل، اور آخریں، بڑی نفیس گرم گرم چائے۔ یہ سب ضیافت یوں اور بھی مفید ثابت ہوئی کہ ہمیں ابھی ۱۹ میل کا سفر اورد کرنا تھا۔ نگر کے صدر مقام تک۔

یہاں جس راستے سے واسطہ پڑا اس کی بابت مشہور ہے کہ بڑا ہی پرخطر ہے۔ پر خطر ان معنوں میں کہ دونوں جانب نرم مٹی کے بنے ہوئے اونچے اونچے ٹوڈے ہیں اور وہ پھسل پھسل کر نیچے گرتے رہتے ہیں۔ اسی لئے وادی میں اکثر راستے محدود ہو جاتے ہیں جنہیں بڑی مشکل سے صاف کیا جاتا ہے۔ یہاں بڑی تند ہوائیں چلتی ہیں یا بارش ہو جاتی ہے، نتیجہ یہ کہ مسافر جہاں کے تہاں رکتے رہتے ہیں اور کوئی نہیں کہہ سکتا کہ راستے صاف ہونے میں کتنا عرصہ لگے گا۔

ہر میل کے بعد نئے نئے گاؤں پڑتے تھے۔ چاروں طرف ہلکول یا کہیں کہیں آبپاشی کی نمود دکھائی دی۔ غرض جو کچھ نظر آیا نظروں کی آسودگی کا سامان تھا جس نے سفر کی صعوبتوں کو کم کرنے میں بڑی مدد دی تقریباً پانچ بجے شام ہم نگر کے قریب پہنچ گئے۔

نگر کے آس پاس کا علاقہ حقیقت میں بہت ہی سرسبز ہے۔ ایک بہار بدایاں وادی۔ نرم روئیوں کا جال، پھلدار درختوں کی کثرت سے پورا علاقہ مالا مال۔ شکر ایک تنگ میدان میں سے نکلتی ہوئی آگے چلی جاتی ہے۔ اس میدان کو میر صاحب حقہ پور ٹوٹل کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔ شکر ریٹ ہاؤس تک پہنچتی ہے اور میر صاحب کا محل بالکل ملحق ہے۔

میر صاحب کے مستعد و تمیز دار ملازمین نے ریٹ ہاؤس میں ہمیں خوش آمدید کہا اور بڑے آرام سے ٹھہرا کر یہ لوگ نہ جانے کہاں چلے گئے۔ تھوڑی دیر بعد کیا دیکھتے ہیں کہ بڑے بڑے خالوں میں طرح طرح کے فواکھات اور لوازمات خورد و نوش لئے چلے

تھا۔ فضا میں سکون تھا اور یہ سب اعصاب کو راحت پہنچا رہے تھے۔

صبح اٹھے تو تازہ دم تھے صحت افزا مقام کی تازگی بخش ہوا ہمارے رگ و پے میں سرایت کر رہی تھی۔ ذہنی کوفت، جسمانی کمزوری اور اعصابی کھچاؤ کی تمام کیفیتیں اب دور ہو چکی تھیں اور راج کے سنسنی خیز سفر کے لئے ہم بالکل تیار تھے۔

پھلت سے، جو نگر اسٹیٹ کا ایک گاؤں ہی ہے، ہم نے میر صاحبہ والی حقہ کو بذریعہ ٹیلیفون اطلاع بھیجی کہ ہم لوگ کب کہاں پہنچ رہے ہیں۔ ہمارا لادو یہ تھا کہ میر صاحب نگر کے صدر مقام پر پہلے پہنچیں اور وہاں سے ہو کر پھر بارہ میل دسپا اگر حقہ کی طرف رخ کریں۔ میر صاحب کے علاقے تک پہنچنے کیلئے ہمیں ایک دریا عبور کرنا تھا جس کے لئے چرخی نا ایک کل لگی ہوئی تھی۔ یہ کل ایک کھٹولے کو تاروں کے رستے پر چلاتی تھی۔

پھلت سے ہم مینا پن کی طرف روانہ ہوئے۔ بڑی لمبی لہکاری چڑھا جاتی تھی جو تقریباً اٹھارہ میل تک چلی گئی تھی۔ جہر دیکھو مجھو توں جیسے پہاڑ سنبہ اٹھائے کھڑے تھے یا دیو داؤں کے دامن تھے۔ بہت سی جگہیں تو ایسی آئیں کہ انجن نے آگے بڑھنے سے انکار کر دیا اور اس ڈر سے کہ کہیں گاڑی پھر الٹی نہ چل پڑے، فوراً بریک لگائے پڑتے تھے۔ بعض دفعہ پھرتی سے اتر کر بڑے بڑے پتھر پھیلے پیوں کے نیچے روک کے لئے لگانے پڑتے۔ پھر یہ تو بہت ہوا کہ جیب نے چڑھائی کے آگے اپنے ہتھیار ڈال دیئے اور ہمیں دھکا لگا لگا کر تنگی چڑھائی پر اسے پہنچا نا پڑا۔ وہی مثل ہوئی کبھی نا ڈپانی میں، کبھی پانی ناؤ میں!

اکثر جگہ ہم اتر کر پیدل نہ چلتے، تو کیا کرتے۔ اٹھنے سے تو یہی بہتر تھا کہ اپنے کس بل کے جوہر دکھانے کے اس موقع سے فائدہ اٹھایا جاتا۔

اسی قصہ میں دوپہر ہو گئی اور ہم لنگ کے وقت مینا پن پہنچ گئے۔ یہاں کا ریٹ ہاؤس بھی خوب ہے۔ بڑی پر فضا جگہ بنا ہوا ہے۔ چاروں طرف ہریا ول ہی ہریا ول اور پھلوں نے نفیس باغیچے۔ یوں مینا پن کا سارا علاقہ نہایت سرسبز اور بڑا

آرہے ہیں۔ یہ سب مختلف شاید اس وجہ سے بھی تھا کہ ہم لوگ خود میر صاحب حنزہ کے ہمارے ہمارے میزبان گرامی کے مزاج ناساز تھے اور وہ ہمارے ساتھ چائے میں شریک نہیں ہو سکتے تھے، مگر اطلاع یہ تھی کہ صبح ناشتہ پران کے محل میں ضرور ملاقات ہو سکے گی۔

شب کو کھانے کا اہتمام اور بھی پر تکلف تھا جسے لگانے اور کھلانے کے لئے کوئی نصف درجن ملازمین تعینات تھے، کھانے کے شائبہ التزام کے ساتھ ساتھ قیام شب کا بندوبست بھی ایسا ہی پر تکلف تھا۔

پوری دادی نگر کو پانی رکا پوشی نامی پہاڑ کے گلشن سے فراہم ہوتا ہے۔ سارے جاڑے سورج کی شکل نظر نہیں آتی۔ اس کے مقابلہ پر دادی حنزہ میں سارے سال سورج خوب چمکتا ہے، جس نے اسے بڑا سرسبز اور ہر اہمراہ بنا دیا ہے۔

نگر کی بستی بلقیت کے عین مقابل واقع ہے۔ جو دریا کے اس پار حنزہ کا صدر مقام ہے۔ ان دونوں نواح کو ملائے کے لئے تاروں کا بنا ہوا کوئی بارہ میل لمبا پل ہے جو دریائے حنزہ کی ۵ فٹ چوڑائی پر پھیلا ہوا ہے۔ اس پر سے گزرتے وقت اچھے اچھے منجھے ہوئے سیاحوں کے بدن میں بھی سنسنی سی دوڑنے لگتی ہے!

صبح کو جب ہم لوگ اس مقام پر پہنچے تو پھر آئینہ چھپے چھپے انہی جیب میں آتے دکھائی دیئے۔ یہاں ایک اور تماشا دکھایا دیا جو دیکھنے کے لئے دو گہواروں کو کام میں لایا جاتا ہے۔ ایک تو اتنا ٹہلے کہ اس میں بس ایک جیب سما سکتی ہے، مگر دوسرا ایک چھوٹی سی چوٹی پر سے زیادہ بڑا تھا۔ بس کوئی دو آدمی کھڑے رہ سکتے تھے۔ یہ دونوں گہوارے تاروں کے رستے کے ساتھ ٹھک رہے تھے جو اس کنارے سے اس کنارہ تک تنا ہوا تھا۔ گہواروں کو چلانے کے لئے وہی چرخہ سی تھی جو ایک چٹان پر نصب کر دی گئی تھی۔ چھوٹا گہوارہ سن کے رستوں سے ٹھک رہا تھا اور دونوں کناروں پر سے ہاتھ کے ذریعے چلتا تھا۔ مگر اس وقت فروغ موجود نہ تھی اس لئے جیبوں کو دریا پار کرنا بجائے خود ایک مسئلہ بن گیا۔

دونوں پارٹیوں نے مل کر یہ طے کیا کہ امداد باہمی کے اصول سے کام کیا جائے۔ اس کا طریقہ یہ سوچا گیا کہ سب مل کر ایک جیب کو مع ڈرائیوڈ لٹے گہوارے میں داخل کر دیں اور دوسرے کنارے سے چرخہ کو چلا یا جائے۔ اس عمل میں ہمارے بھی چو لیں ہل گئیں اور جڑ ثقیل کے اس کارنامے کو مکمل کرنے میں تین گھنٹے لگ گئے۔ مگر شکریہ کہ کوئی حادثہ پیش نہ آیا اور ہم لوگ مع اسباب حنزہ کی طرف پہنچ گئے۔ واپسی میں یہ جانکاہ محنت نہیں کرنی پڑی کیونکہ مقامی مزدوروں کا انتظام ہو چکا تھا۔ انہوں نے ایک جیب اسی طرح کھینچ کھینچ کر دریا پار کرادی مگر دوسری جیب پار کرنے کے موقع پر عجیب ماجرا ہوا۔

چاروں طرف نہایت بلند و بالا پہاڑوں کا عجیب سلسلہ ہے۔ جب دوسری جیب پار کرانی جا رہی تھی ان بلند پہاڑوں میں زور کے جھکڑ چلنے لگے۔ جو نہی گہوارہ کنارے بالکل قریب پہنچا سن کے وہ رستے جو گہوارہ کے نچلے حصہ میں گئے ہوئے تھے چٹان سے ٹوٹ گئے! ادھر ڈرائیوڈ، جیب کو باہر نکالنے کے لئے انہیں اشارت کر چکا تھا۔ جیب بجائے زمین پر آنے کے پھر اپنے گہوارے کے ساتھ تار کے رستے پر دوڑے واپس ہونے لگی! کیا قیامت تھی!

ہم سب لوگ کھلی کی سبیزی کے ساتھ لب دریا پہنچے اور گہوارے کو پکڑا جو بڑا جان جو کھول کا کام تھا۔ یہ محض ایک معجزہ تھا کہ گہوارہ دک گیا ورنہ جیب اور ڈرائیوڈ کی خبر نہ تھی۔ اتفاق ایسا ہوا کہ شمالی اضلاع کی مقامی پلیٹن کے کچھ جوان جو گلگت واپس جا رہے تھے عین موقع پر آگئے ان دوستوں نے بڑے بڑے ہتھ پتھر اٹھا کر گہوارہ کے نچلے حصے میں رکھ کر اسے قابو میں کیا۔ وہ جگہ جہاں سے ہم نے تار کے رستوں کے ذریعے دریا عبور کیا تھا ہندی کہلاتی ہے۔ یہاں سے بلقیت کے مقام پر پہنچنے کے لئے ہمیں اس قدیم راستہ پر بھی چلنے کا اتفاق ہوا جو ۱۴ میل لمبا ہے اور جس پر سے کبھی مشہور بودھی سیاح مارکو پولو گزرتا تھا۔ یہ بڑی تنگ راہ ہے، بس جیب کے چار پہیے بھٹکی جم سکتے ہیں بلا سہ کبھی سیدھی چڑھاٹی، کبھی اتراٹی، کبھی ندی ماکن اور تھروں کی سلوں پر سے گزرتا۔ ہولے ہولے چلتے رہے کہ ناگاہ ایک بڑا

محترم ہمالا انتظار چائے کی میز پر کمرہ ہے ہیں۔ خدام نے بتایا کہ ہم لوگ کپڑے بدلنے کے تکلف میں نہ ٹہریں۔ میر صاحب خود بہت بے تکلف انسان ہیں اور تکلف و رسوم ملاقات کی اتنی پروا نہیں کرتے۔ چنانچہ ہم سفری لباسوں ہی میں جو گروہ لے آئے ہوئے تھے، روانہ ہو گئے اور محل کی سیڑھیاں چڑھ کر شاہی میز پر پہنچ گئے۔

یہ جگہ محل کا ایک سجا ہوا پائیں کمرہ تھا جہاں سے وادی حنزہ کا دور دور تک نظارہ کیا جا سکتا ہے۔ جس مراد و جہ سے دلی گر محوشی کے ساتھ ہمارے ساتھ مصافحہ کیا اور ہمیں خوش آمدید کہا وہ خود میر صاحب حنزہ ہی تھے۔ جمیل، فکیل، وقار و نمکنت کی تصویر، نیوں پر قسم۔ ہر ادا سے اخلاق و شائستگی شکستہ ہوئی۔

چند ہی منٹ بعد حضور آئی صاحبہ بھی تشریف لے آئیں۔ ہمراہ ایک چھوٹی سی بچی تھی، ان کی دختر نیک اختر دولوں نے بڑا نفیس خالص پاکستانی لباس پہن دکھا تھا۔ لمبی سی رنگین بھولہ رنگیں قمیص، بڑے گھیر کی سلکی شلوار اور اوپر سے ایک باریک لٹھی چادر اوڑھی ہوئی تھی ان دولوں کا ہم سے تعارف کرایا گیا۔

تپاک اور گر محوشی کی فضا میں چائے نوشی کا سلسلہ شروع ہوا۔ ہم لوگ اپنے مسافرت کے لباس کو دیکھتے تو ہر طرح کٹے۔ عجب حلیے بنے ہوئے تھے۔ مگر ایک والٹی ریاست اور ان کی عالیہ رانی صاحبہ نے ہم ہمالوں کا جس طرح استقبال کیا وہ رسوم و قیود سے بلند تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ میر صاحب بڑے چھوٹے کا خیال کئے بغیر ہر ایک کو اس خندہ پیشانی سے اور اپنی روایتی جہان نوازی کے ساتھ ہشرف ملاقات بخشنے ہیں۔

یہ مقام دنیا کے آس سرے پر واقع ہے۔ چاروں طرف بلند ترین پہاڑوں نے اسے بانی متمدن دنیا سے الگ تھلک کر رکھا ہے مگر ان قدر قوی مشکلات کے باوجود میر صاحب کے محل شاہی میں ہم ہمالوں کے لئے وہ سب آسائشیں مہیا کر دی گئی تھیں جن کی شاید اس دور افتادہ

پہاڑی درہ آگیا۔ پھر غمک کر اس جگہ ان پہنچے جسے منظر آبا دیکھتے ہیں۔ ایک خوبصورت گاؤں۔ اس کے آگے میں بھرے کم ہریا دلی کا ٹکڑا آگیا۔ یہاں ایک اور گاؤں ملتا تھا آبا دہاڑی۔ آگے وادی چوڑی ہوتی چلی گئی ہے۔ جا بجا پہاڑی ڈھلانوں پر بنے ہوئے کھیتوں کے تختے چلے گئے ہیں جو بلند ہوتے ہوئے قلعہ کوہ کو چھوتے معلوم ہوتے ہیں یہیں قلی آباد ہے جو بہت خوش منظر جگہ ہے۔ خوبصورت صاف ستھرے بچے، شائستہ لباس میں طبوس یہاں کی عورتیں، سردی ہلال فال کرٹھی ہوئی ٹوپیاں اوڑھے ہوئے۔ جو تھا ہرے بھرے کھیتوں میں کسی نہ کسی کام میں لگا ہوا تھا۔ کھیت تھے کہ یہاں سے ویاں یکساں بھرے پٹے تھے۔ آگے بڑے تو حیدر آباد آگیا۔ یہ سستی بھی بڑی سرسبز نظر آئی۔ نہر طرف بلند اشجار کھڑے جمجوم رہے تھے۔ کھیت کھلیان کی بہار الگ تھی۔ گاؤں کوئی دو میل کے احاطے میں تھا اور دوسو کے قریب مکا کا ہوں گے۔ یہ جگہ بلقیت جانے والی سڑک پر واقع ہے۔

پھلوں کے باغات اور ہرے بھرے کھیتوں کے بیچ میں سے گزرتے ہوئے ہم کوئی دو میل آگے گئے ہوں گے کہ بلقیت کی بستی آگئی۔ یہ ریاست حنزہ کا صدر مقام ہے۔ سڑک پر یہاں کے باشندے بھی نظر آئے جن کی طرے کنارے والی نرہ کی ٹوپیاں الگ پہچانی جا سکتی تھیں۔ بدن پر لمبے لمبے چنے ہر ایک نے پیٹھ پر کوئی بوجھ اٹھا رکھا تھا۔ تازہ کٹی ہوئی فصل معلوم ہوتی تھی۔ میر صاحب حنزہ کی سرکاری رہائش گاہ دلا آگے کہ قریب آبادی ہے۔ جو سڑک یہاں تک پہنچتی ہے اس پر بالوہی بالوہی اور دن سے دھنس جاتی ہے۔ دولوں طرف بلند قامت اشجار سنترلیوں کی طرح کھڑے ہیں۔ بائیں جانب ایک نہر چلی گئی ہے جس میں پہاڑ کی پٹلی ہوئی برف کا پانی دوڑتا رہتا ہے کوئی چار بجے سہ پہر کو ہم شاہی محل کے دروازے پر پہنچ گئے جہاں میر صاحب کے خدام نے بڑے تپاک سے ہمالا استقبال کیا اور کہا کہ ہم اپنی میپیں سیدھی جہان غلے تک لے جائیں جہاں ہمارے قیام کا بندوبست کیا جا چکا تھا۔

یہاں ہمیں اپنے اپنے کمروں پر سرسری سی نظر ڈالنے میں ابھی ایک دو منٹ ہی گزرے تھے کہ پرچہ لگا، میر صاحب

کے ہمراہیوں سے ملتی ہے۔ ان کی اپنی ہی ایک زبان ہے جس کو "شکی" کہتے ہیں۔ اس کی اصل کا بھی سراغ نہیں لگایا جاسکا۔ مردوں کا بہت سمھڑے پاکیزہ پھولدار لباس استعمال کرتے ہیں۔ ہنزہ کا موجودہ شاہی خاندان کوئی چھ سو سال پرانا ہے اور باخندے قریب قریب سب ہی اسماعیلی دآغا خانی ہیں۔

اونچے اونچے پہاڑوں کے بچ میں جو پتلے پتلے زمینیں قطعے پائے جاتے ہیں بڑی محنت سے تیار کئے جاتے ہیں اور انہیں دلچسپ دارکھیتوں میں تبدیل کر دیا گیا ہے، آب رسانی کے لئے عجیب عجیب کمالات دکھائے گئے ہیں۔ برف پوش پہاڑوں سے اترنے والے پانی کو بڑی کائیگری کے ساتھ کھیتوں تک پہنچایا جاتا ہے۔ آب دھواٹری عمدہ ہے۔ پھلوں کی انواع اور بہتات کا تو کچھ نہ پوچھو۔ پیداوار میں گندم، مکئی اور جو بہت ہوتا ہے۔ کچھ چارل بھی پلایا جاتا ہے۔

باشندوں کی اپنی مخصوص روایات ہیں۔ ان کے تہوار، لگ ہیں۔ جون کے آخری ہفتے میں یہاں ایک میلہ ہوتا ہے جو فصل کا جشن سمجھا جاتا ہے۔ اس موقع پر میر صاحب ہر گناؤں کے ٹائمر اور چودھریوں کو شرفِ ملاقات بخشتے ہیں۔ ہر ایک اپنی فصل کا نمونہ شعی میں لے کر آتا اور میر صاحب کی برکت حاصل کرتا ہے۔ اس کے قص و سرود کی محفل جیتی ہے۔ ہر طرف خوشیاں منائی جاتی ہیں۔ مگر کے علاقہ میں سب سے بڑا تہوار عید الفصحی مانا جاتا ہے۔ گاؤں کا چودھری اچھے اچھے لباس پہن کر میر صاحب کے پاس عید کے سلام کے لئے حاضر ہوتے ہیں اور وہ بھی ان سے مل کر عید کی مبارکباد دیتے ہیں۔ ساری رعیت خوش ہے۔ ان تقریروں میں مرد و عورت بچے، جوان بوڑھے سب ہی شوق سے شریک ہوتے غرض اسلامی مسافات کا نمونہ ہر جگہ نظر آتا ہے۔

ہر سال دسمبر کے اواخر میں شادیوں کا ورع ہے۔ یہ وقت فصلوں کے پکنے کا ہوتا ہے اور اگلی فصل کے دالے بو دیے جاتے ہیں۔ بچن بھی بڑا خاندان ہوتا ہے۔ چودھری بھی دیکھو دیکھو: لئے دھن کے گھر جانا نظر آتا ہے۔ آگے آگے ہمارے دالے ہوتے ہیں ہر طرف خوشی کا دودھ دودھ ہوتا ہے۔ ضیافت کے لئے "پاک" کی قربانی کی جاتی ہے کیونکہ اس موسم میں بھیڑ مکرے ملنے مشکل

جگہ پر توقع نہ کی جاسکتی تھی۔ اب مثلاً چائے ہی پر ایسی عمدہ پیشکش ایسے خوش ذائقہ کیک۔ سینڈویچ اور شکلیں چنے گئے تھے کہ کسی اعلیٰ درجہ کے رستورینٹ ہی میں ملنے ممکن ہیں۔ میزبانی کا یہ اہتمام بلیغ، اور جیسا کہ میں نے ابھی عرض کیا، ایسے دور دست مقام پر ہمارے لئے ایک حیرت انگیز بات تھی۔

جب تک ہم بلیت میں بسے تھے اور ڈنر شاہی محل میں ہی کھاتے رہے۔ ہر موقع پر میر صاحب اور علیہ رانی صاحبہ نفسِ نفیس موجود تھے۔ کھاؤں میں خالص پاکستانی کھانے بھی ہوتے اور انواع و اقسام کے انگریزی کھانے بھی۔ یہ سب اس قدر نفیس اور خوش ذائقہ ہوتے کہ دنیا کے جدید شہروں ہی میں میسر آسکتے ہیں۔ بعض دفعہ ہمانوں کی خاطر وسط ایشیائی اور چینی کھاؤں کا بھی اہتمام کیا گیا۔ میر صاحب نے فرمایا کہ یہ سب کھانے شاہی محل میں ان کے اپنے باورچی اور بکالوں تیار کرتے ہیں۔ آئینہ تو اس ہمانداری کے بہت ہی گہرے دیدہ ہو گئے اور کہنے لگے مجھے ایسا لگ رہا ہے جیسے سو پڑن میں بیٹھے ہوں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مشرقی ہمانداری اور اسلامی ہمانداری کا انہیں یہ پہلا تجربہ ہوا تھا۔ ان غیر ملکی مسیحوں کو میر صاحب کے ننھے ننھے بچے بڑے پیار سے لگے اور بہت جلد ان سے مانوس ہو گئے۔ پھر ایک شام کو عجیب حیرت کی بات ہوئی۔

کیا دیکھتے ہیں کہ ڈنر کی میز پر مسٹر آئینہ ہنزہ خواتین کے لباس میں بھی چوٹی ملی آندی ہیں۔ ہنزہ خواتین کا ریشمی ملبوس اور اس ہنزہ کی رانی ٹوپی، اوپر سے ریشمی چادر لگتی ہوئی!

ہم لوگ میر صاحب اور علیہ رانی صاحبہ کے تین دن پہلے سے اور اس جنتِ ارضی تک پہنچنے میں ہمیں جو جو خطرے اور خوشیاں پیش آئی تھیں انہیں اس اثنا میں ذہن سے محو کر چکے تھے۔ اتفاقاً شاہا اور میزبان کے ان لوازمات نے ہمیں ہر چیز بھلا دی۔

اس میں شک نہیں کہ وادی ہنزہ اپنے فطری جمال و عنایت کے باعث ایک بے مثل جگہ ہے۔ اسے اگر لوگ جنتِ ارضی کہتے ہیں تو بجا نہیں۔ چاروں طرف اونچے اونچے قلعہ بٹے کہنے سے گھیر رکھے۔ یہ پہاڑاں سلاک سے بائیں کرتے ہیں۔ یہاں جو لوگ بے ہوش ہیں وہ پاکستان کے باقی ماندہ علاقوں کے مقابلے پر دوسری نسل سے ہیں۔ ان لوگوں کا کہنا تو یہ ہے کہ ہماری اصل سکندراعظم

ہوتے ہیں۔

ضیافت کے بعد چھ گھنٹہ کا مقابلہ ہوتا ہے۔ پولو (چوگان) ہاں کا قومی کھیل ہے اور ہر جوان اس میں دلچسپی لیتا ہے۔ شادی کے موقع پر دو پارٹیاں بن جاتی ہیں۔ ایک دولہا والوں کی، دوسری دلہن والوں کی۔ پولو یہاں کا محبوب مشغلہ ہے، بلکہ پوری وادیاں اس کھیل سے دلچسپی ہے کیونکہ یہ ان کی مردانہ نمونندی اور ریش شہسواروں کا پولو سامان دیکھتا ہے۔ میرا خیال ہے کہ پامیر وسط ایشیا کے پہاڑ بالکل لے ہوئے ہیں اور وہاں انسانی ذخائر بدوشی کے عہد میں سب سے پہلے گھوڑے کو ہی سدھایا۔ اس لئے یہ کھیل آدھر سے یہاں تک پہنچا ہے۔

ہر گاؤں میں ایک قطعہ زمین پولو گراؤنڈ کے لئے پونڈ دیا جاتا ہے۔ اس کے گرد چھوٹی سی ایک دیوار بنادی جاتی ہے۔ کوئی موقع ہو چوگان کا مقابلہ ضرور ہوگا، باجے والے پہلے سے وجود ہوتے ہیں۔ جب مقابلہ کا جوش و ولولہ عروج پر پہنچتا ہے، ان کی دھما دھم بھی اونچی ہوتی چلی جاتی ہے۔ آلات موسیقی میں ارج طرح کے ڈھول، تاشے، نفیریاں وغیرہ ہوتی ہیں۔ جوں جوں کھیل کا جوش بڑھتا ہے اور ایک سو اور دوسرے سو پر چڑھ دوڑنے کے لئے آگے بڑھنا یا گھوڑے کو اڑنے لگاتا ہے، باجے بھی زور زور سے بجنے لگتے ہیں۔ غرض عجب سماں ہوتا ہے۔ یہاں یہ بھی قاعدہ ہے کہ کوئی کھلاڑی مقابل کے گھوڑے کو مارے یا اس کی پولو اشک لڑوڑے لے تو بھی فاول نہیں مانا جاتا۔ جیتنے کے لئے پانینٹ حاصل کرنے ہوتے ہیں، ان شاملی اضلاع کے لوگ اپنی صحت و توانائی اور ناک نقصان کی خوبی کے لئے دور دور مشہور ہیں۔ مگر سب سے زیادہ شہرت یہاں کے لوگوں کی دراز کی عمر ہے۔ اسیاتے ماہروں نے یہ معلوم کرنے کی کوشش کی ہے کہ اس خطے کے لوگوں کی چھلکتی ہوئی جوانی، تنومندی اور حیرت انگیز طویل العمری کا عمل باعث کیا ہے۔ اس کی اصل وجہ یا راز کو سمجھنا کچھ مشکل نہیں۔ یہ لوگ اپنی عادتوں میں سادہ ہرید غذا پوری سادہ کھاتے ہیں اور پانی بڑا صحت بخش ہے۔ ان باتوں نے ملک ہاں کے لوگوں کی صحت و عمر دونوں میں بڑا اضافہ کیا ہے۔ یہاں کا آدمی ۹۰ برس کی عمر میں بھی کچھ ایسا بوڑھا نہیں لگتا۔ جسے دیکھو

چہرہ سے خون چمکتا ہوا ملے گا۔ سو سال کی عمر بالینا یہاں عام بات ہے۔ پھر غوی یہ کہ ان کی متعدی ویسی ہی رہتی ہے۔ یہاں لوگ کہتے ہیں کہ حقیر کا آدمی ویسے تو مرتا نہیں بس کسی پہاڑ سے گر پڑے تو در بات ہے ا طویل العمری کے سلسلے میں یہ بات بھی سمجھ میں آتی ہے کہ گلشیر پولو سے کھیل کر آنے والا پانی اپنے ساتھ پہاڑوں کے دوسرے جوہر بھی بہا لاتا ہے جن میں سناہے سونے تک کے ذرات موجود ہوتے ہیں۔ ویسے پانی میں ابرق کا جز غالب نظر آتا ہے۔ جب قدرت نے ہر چھوٹے بڑے کو اپنے خزانے کی یہ لازوال دولتیں اس طرح عام دے دی ہیں تو وہاں کے لوگوں کی عمریں لمبی نہ ہوں گی تو پھر کن کی ہوں گی؟ میر صاحب، والئی حقیر کی اپنی ریاست میں ٹہرے گا جہوری طریقے پر حکومت کرتے ہیں۔ انہیں ہر علاقہ سے روزانہ ذرا ذرا سی پولو رٹ ملتی رہتی ہے۔ اس کام کے لئے پرانی وضع کا "لش" ٹیلیفون استعمال کیا جاتا ہے۔ اس کا سلسلہ سارے علاقے سے ملا ہوا ہے۔ وہ بلذیت میں اپنے محل کے سامنے ایک کھلا یعنی عام دربار بھی کرتے ہیں جس میں عوام کے نمائندے اگر جمع ہوتے ہیں۔ اسے مقامی اسمبلی سمجھنا چاہیے۔ باہمی گفت و شنید سے آپس کے سب مسئلے جلد از جلد طے کر دئے جاتے ہیں۔ زیادہ تر جھگڑے ہنری پانی کے مسئلے سے تعلق رکھتے ہیں یعنی اس دیہاتی نے اُس دیہاتی کا پانی کاٹ لیا۔ چوری، تھل اور اغوا کے واقعات دنیا کے اس حصے میں خاندانی ہوتے ہیں۔

ہنزہ کے آدھر جو علاقہ ہے وہ بڑے شکار کے لئے بہت موزوں ہے۔ یہاں ایک قسم کی جنگلی بھیڑ ہوتی ہے جسے مشہور سیاح مارکو پولو کے نام پر شہرت ملی ہے۔ مارکو پولو چودھویں صدی میں پامیر کی سطح مرتفع کو عبور کر کے اس نواح سے گزرا تھا اور اسے یہ عجیب بھیڑیں نظر آئی تھیں۔ ان بلند و بالا پہاڑوں پر آج بھی "مارکو پولو بھیڑ" خمیدہ سینگوں والا بکرا اور مارخور ملتے ہیں بعض دفعہ کوئی تیرو ہزار فٹ کی بلندی پر۔ شکار کی سنسنی کے رشتہ یہاں تک پہنچ کر ایسے شکار مار لیتے ہیں تو ان کے خنجر کی کوئی انتہا نہیں رہتی۔ یہ حیوانات شاید اسی حصہ ارض میں ملتے ہیں اور جانبات حیوانی میں شمار ہیں۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دنیا کے اس رقبے میں وقت اپنا ساری اہمیت سے دستبردار ہو چکا ہے۔ زندگی ایک طویل پُر راحت کہیں، عالم سرخوشی میں تبدیل ہو جاتی ہے جس کا تجربہ آگیا جا سکتا ہے مگر قیدِ بیان میں لانا محال ہے۔ یہاں کی زندگی ماحول اور کیفیت کا عالم دیکھئے جو صدیوں پہلے تھا۔ مسافروں اور جہان گردوں کو یہاں جو دنیا اس وقت نظر آتی اب بھی شاید ویسی ہی ہے یعنی جدید تمدن کی مشینیں باتیں اور ہرگز نہیں۔ اس لئے طلسمی ماحول جوں کا توں مل جائے گا۔

یہاں کی روحانی فضا کو منتشر کرنے والی یا تو جیب کی آواز ہے یا سر پہ سے گزرتے ہوئے کسی چوٹی جہان کی غول اور یہ جیب بھی عجیب سواری ہے، نئی سواریوں میں شاید ہی کوئی سواری ایسے دشوار گزار راستے طے کر سکے۔ یہ بڑی عمدہ خدمت گزار ہے۔ میرے سفر میں بڑے بڑے بچے و خیم آئے۔ کیا کیا شیب کیسے کیسے فراز، پُر ہول راستے، کھنڈر کھائیاں ہر جگہ ہمت کا امتحان تھا، ہر جگہ حوصلہ کا ہاتھ تھی مگر میرا یہ رفیق سفر بڑا ہی مستعد ملا تھا اور ہر موقع پر آگے بڑھنے میں مدد دیتا تھا۔ یہاں کے لوگ اپنی پُرسکون دنیا میں بسے ہوئے اور اُسی میں کھوئے ہوئے ہیں کہیں کجین کلیان ہے، کہیں فصلیں کٹ رہی ہیں، کہیں پھل توڑے جا رہے ہیں۔ کوئی شکار کو کل گیا ہے کسی نے پھل پکڑنے کے لئے ندی کا رخ کیا ہے اور ہاں میں بھولا جا رہا تھا۔ پولو سے کون دل نہیں بہلاتا اور باہر والے کے لئے بہت کچھ ہے۔ نلتر کی برف بستہ ڈھلاؤں پر سے پھسلنے کا کھیل بھی ایک عجیب تحریر ہے جس لطف یہاں پہنچ کر ہی اٹھایا جا سکتا ہے۔ میرا احساس ہے کہ جس نے یہ خط اٹھایا، راحتِ دنیا کا ایک بڑا حصہ اسے مل گیا!

غرض اس وادی میں ایک عجیب سکون ہے۔ سکونِ مطلق۔ یہ ایک ابدی راحت کا گہوارہ ہے جس کے طلسم کو دنیا کی کوئی بھی پھل نہیں توڑ سکتی۔

ہنترہ اور ہنگر کے علاقوں کے علاوہ مملکت و بلتستان کی ایکسی میں اور بھی کئی مقامات اپنے قدرتی حسن و رعنائی کے باعث مشہور ہیں۔ مثلاً سکر دو کے ارد گرد کا ہی علاقہ چاروں طرف گلشیر سے ڈھکے ہوئے پہاڑ ایک بیاہ کی طرح مدور چلے گئے ہیں۔ بچہ میں جا بجا سبز رنگ جھیلیں اگلی میں نکلنے کی طرح جڑی ہوئی نظر آتی ہیں۔ جمیل سن پڑ کے وسط میں تو واقعی ایک پرستانی جزیرہ بھی موجود ہے۔ اس تک پہنچنے کے لئے بھی خاصی خوبصورت کشتیوں سے کام لیا جاتا ہے جن کی سجادٹ اور سطح آب پران کی آہستہ روی انسان کو واقعی پریوں کی دنیا میں پہنچا دیتی ہے۔ اس جمیل میں ٹراؤٹ مچھلی بھی بہت ہے اور مچھلی کے شکاری خاص طور پر اس جگہ کو پسند کرتے ہیں۔ مملکت کے اطراف و جوانب اور چترال کی راہ پر ہمیں جو بھی جگہ بڑی پاکیزہ، خوبصورت اور سری بھری تھی۔ جدھر نظر اٹھتی تھی تنہا و درختوں کی قطاریں، پھلوں سے لدے ہوئے پیر اور شاداب وادیوں کے قطعے چلے گئے ہیں۔ خاص کر پڑیاں، گونیاں اور پھنڈر جمیل کے اطراف میں۔ جوندی راہ میں پڑی بلور کی مانند صاف، سوتی کی جھلک والے پانی سے چمکتی ہوئی۔ انسان حیران رہا کہ ان دو آنکھوں سے کیا کیا دیکھے!

مملکت میں ہر طرف کا آدمی نظر آتا ہے۔ خاص کر گرمیوں میں دنیا کے ہر خطے کے لوگ ادھر اکٹھے ہیں۔ کوئی سیاح ہے۔ کوئی کوہ پیما، کوئی کاروبار کے ارادہ سے آیا ہے۔ غرض فرصت کے اوقات گزارنے ہوں یا تجارت کرنا جو یہاں آکر وقت اچھی طرح کٹتا ہے۔ اور راستے کی صعوبتیں جھیلنے کی باتیں تو ہمیشہ ہی یاد آتی ہیں۔

مملکت سے واپسی پر عام طور پر وہ راستہ اختیار کیا جاتا ہے جو وادی کا خان کے نام سے اب ہر جگہ مشہور ہے۔ راستہ اچھا ہے، جیب بہ آسانی گزر سکتی ہے۔ یہاں پہنچ کر ۱۴ ہزار فٹ بلند باؤنٹر پاس ہے۔ وہاں سے بیچے چلیں تو جمیل "سیف الملوک" کا مقام آتا ہے۔ ہر اچھا زمرہ علاقہ۔ اسی طرح نالان، بالا کوٹ، ایبٹ آباد اور پھر پاکستان کے میدانی علاقے آ جاتے ہیں۔

سنہرے بالوں والی شہزادی

(پنجابی لوگ جھانی)

شفیع عقیل

آدمی ملا۔ اس آدمی کے پاس بہت سے طوطے تھے۔ سوداگر کے بیٹے نے اس سے پوچھا: کیا تم طوطے بیچ گئے؟
اس نے جواب دیا: بچوں گا۔ مگر ایک طوطے کی قیمت سودا پرے ہوگی؟۔

سوداگر کے بیٹے نے اسی وقت جیب سے سودا پرے نکال کر اس کے ہاتھ پر رکھ دئے اور اس سے ایک طوطا خرید کر اگے چل دیا۔ ابھی اس نے چند منزلیں اور طے کی تھیں کہ راستے میں اسے ایک آدمی ملا، اس آدمی کے پاس بلیاں تھیں سوداگر کے بیٹے نے اس سے دریافت کیا: کیا تم بلیاں بیچ گئے؟
اس آدمی نے جواب دیا: ہاں، میں بیچوں گا لیکن ایک بلی کی قیمت ایک سودا پرے ہوگی؟

سوداگر کے بیٹے نے اسی وقت سودا پرے دے دئے اور اس سے ایک بلی لے لی۔ اب اس کے پاس ایک سانپ، ایک طوطا اور ایک بلی تھی اور ان کے دئے ہوئے تین سودا پرے ختم ہو چکے تھے۔ اسلئے وہ آگے بڑھنے کے بجائے واپس اپنے شہر کی طرف چل پڑا۔

جب وہ واپس گھر پہنچا تو اس کی ماں نے اسے خوشی کے اس سے پوچھا: ”بتاؤ بیٹا، کیا سوداگری کر کے لائے ہو؟۔ مجھے بھی تو دکھاؤ؟“

اور جب اس کی ماں نے یہ دیکھا کہ اس کا بیٹا تین سودا پرے میں صرف ایک سانپ، ایک طوطا اور ایک بلی خرید کر لایا ہے تو وہ بہت پریشان ہوئی۔ لیکن پھر اس خیال سے خاموش ہو رہی کہ ابھی انجان سے خدا اور شہا ہو گا تو خود بخود سمجھ جائے گا۔ اب سوداگر کے بیٹے کو بھی احساس ہوا کہ وہ بڑا نادان ہے اور اس نے تین سودا پرے کو یہی بیکار مصائق کر دئے۔ مہلا یہ فعلی سی چیزیں ایسے کیا فائدہ پہنچا سکتی ہیں۔ وہ اداس بیٹھا اپنے دل میں یہی کچھ سوچ رہا تھا کہ سانپ اسے دیکھ کر بولا: تم اداس نہ ہو۔ میں تمہیں اپنی قیمت دلوا دوں گا؟
اس پر طوطا بولا: میری طرف سے بھی بے فکر ہو میں بھی ایک نہ لیکھ

کہتے ہیں کسی شہر میں ایک سوداگر رہتا تھا۔ اس کا کام یہ تھا کہ وہ دوسرے شہروں میں جانکاردوں سے طرح طرح کا مال اسباب خرید کر لاتا، اسے بیچتا اور خوب نفع کما تا۔ اس طرح وہ انداس کی بڑی ہنسی خوشی زندگی بسر کرتے رہے کچھ دنوں بعد ان کے ہاں ایک لڑکا پیدا ہوا جس نے ان کی سونی سونی زندگی میں خوشیاں برسوں لیکن ابھی بڑا چھوٹا سا ہی تھا کہ سودا گرفت ہو گیا۔ اس نے تجارت اور سوداگر سے خاصا روپیہ کمایا تھا اس لئے اس کی بڑی گھر کی چھ پونجی پر گز رہا بسر کرنے لگی۔

اب اس کی امیدوں کا تار اور زندگی کا سہارا صرف اس کا بیٹا تھا۔ دن رات ایک دوسرے کے پیچھے بھاگتے دوڑتے گزرتے گئے اور سوداگر کا بیٹا جوان ہوتا گیا۔ اس کی ماں نے اسے پڑھایا لکھایا اور جب وہ جوان ہو گیا تو اس نے اپنی ماں سے پوچھا: ماں میرے والد کیا کام کرتے تھے؟

ماں نے اسے بتایا کہ وہ سوداگری کرتے تھے اور اس طرح دوسرے شہروں سے سامان خرید کر لاتے تھے اسے اپنے شہر میں لاکھ بیچتے تھے اور نفع کما تے تھے۔ یہ سن کر لڑکا کہنے لگا: ماں، میں بھی سوداگری کروں گا؟

اس کی ماں نے پہلے تو اسے سمجھایا کہ وہ کسی دوسرے دیس نہ جائے لیکن جب اس نے بیٹے کی فصد دیکھی اور یہ سوچا کہ آخر اسے کچھ نہ کچھ نوکرناہی ہے تو اسے اجازت دیدی۔ اس نے اسے تین سودا پرے دئے اور سوداگر کا بیٹا ماں سے رخصت ہو کر سوداگری کے لئے روانہ ہو گیا۔

وہ اپنے شہر سے نکل کر کچھ کی طرف چل پڑا۔ چلتے چلتے وہ اپنے شہر سے بہت دور نکل گیا۔ جب وہ ایک جنگل میں سے گذر رہا تھا تو اسے راستہ میں ایک عورت ملی۔ اس عورت کے پاس قسم قسم کے سانپ تھے۔ سوداگر کے بیٹے نے اس سے پوچھا: کیا تم سانپ بیچ گئے؟

عورت بولا: ہاں بیچوں گا مگر ایک سانپ کی قیمت ایک سودا پرے ہوگا۔ سوداگر کے بیٹے نے فوراً اسے سودا پرے بھال کر دے دئے اور اس کا ایک سانپ لے کر اگے چل دیا۔ ابھی وہ تھوڑی دور ہی گیا تھا کہ اسے ایک اور

تہیں دلوادوں گا؟

بلی نے سانپ اور طوطے کو یہ کہتے ہوئے سنا تو کہنے لگی، "میں تو یہی چاہتی تھی۔"
دلائی ہوں کہ ایک نہ ایک روز تمہیں تمہاری قیمت فرو دلوادوں گی؟
ان تینوں کی باتیں سن کر سوداگر کے بیٹے کی کچھ بہت ہنسی۔ اسے امید
کی کرن دکھائی دی اور وہ سانپ، طوطے اور بلی کی دل دھان سے پرورش
کرنے لگا۔

کچھ عرصہ بیت جانے کے بعد ایک روز سانپ سوداگر کے بیٹے سے کہنے
لگا، "ہلو۔ آج میں تمہیں اپنی قیمت دلاؤں؟"

اتنا کہنے کے بعد اس نے سوداگر کے بیٹے کو ایک جگل کا آتا پتہ بتا کر
یہ کہا، "اس جگل میں سانپوں کا بادشاہ رہتا ہے۔ تم مجھے اس جگل میں لے جاؤ۔
راستہ میں تمہیں سب سے شہر چھوٹے بڑے سانپ اور بچھو دکھائی دیں گے۔ وہ تمہاری ٹکر
بڑھیں گے کرتے ان سے ڈرنا نہیں۔ وہ تمہیں کاٹیں گے نہیں اور نہ کوئی نقصان
پہنچائیں گے۔ تم سیدھے چلے جانا۔ یہاں تک کہ ایک جگہ تم کو وہاں بہت سے
چھوٹے بڑے سانپ بیٹھے نظر آئیں گے۔ ان انگنت سانپوں کے درمیان ایک
بڑا سا ایسا سانپ بیٹھا ہوگا جس کے سر پر کھٹی ہوئی اور اس کے ماتھے پر ایک عورت
موتی بھی چمک رہا ہوگا۔ تم مجھے اس سانپ کے آگے رکھ دینا۔ یہ سانپ جگل کے
تمام سانپوں کا بادشاہ اور میرا باپ ہے جب وہ مجھے دیکھے گا تو بہت خوش
ہوگا۔ وہ تم سے کہے گا، مانگو جو کچھ مانگتے ہو۔ تم جواب میں کہنا۔ خدا کا دیا آپکا
دیا سب کچھ ہے۔ وہ وہ ساری بات کہے گا، تم میری جواب دینا اور جب
وہ تیسری بار تم سے پوچھے تو کہنا، پہلے مجھے قول دیں۔ وہ قول دیدے تو
پھر کہنا، آپ کے ماتھے پر جو موتی چمک رہا ہے، یہ مجھے دیدیں۔ اس موتی
میں یہ خاصیت ہے کہ تم اس سے جو مانگو گے وہ پلک جھپکتے تھا را کہسا
کر دے گا۔"

سوداگر کے بیٹے نے سانپ کو اٹھا لیا اور اس کے بتائے ہوئے
راستہ پر اس جگل کی طرف چل دیا جہاں سانپوں کا بادشاہ رہتا تھا۔ وہ
کئی دن اور کئی راتیں چلتا رہا۔ آخر کار اس جگل میں پہنچ گیا جو اس کی منزل
مقصود تھی۔ اس نے دیکھا راستے میں ہر طرف چھوٹے بڑے سانپ اور
اُدھر وینگ رہے تھے۔ کہیں خوفناک اژدہ لپیٹے ہوئے تھے اور کہیں
چھوٹے نظر آ رہے تھے۔ سب کچھ دیکھ دیکھ کر وہ دل ہی دل میں ڈر رہا تھا،
لیکن سانپ کے کہنے کے مطابق اس نے بہت زیادہ اڑا گے ہی بڑھتا
گیا۔ اس نے دیکھا کہ جرجوں جوں وہ آگے بڑھتا جاتا ہے، راستے میں بیٹھے

ہوئے سانپ اور بچھو اسے راستہ دیتے چلتے ہیں۔ اسی طرح آگے بڑھتا
ہو وہ اس جگل پہنچ گیا جہاں اس نے دیکھا کہ وہاں بہت سے چھوٹے بڑے
سانپ جمع تھے اور ان کے درمیان ایک بڑا سا سانپ بھی بیٹھا تھا۔ اس کے
سر پر کھٹی موتی نور ماتھے پر چمکتا ہوا موتی بھی دکھائی دے رہا تھا۔ سوداگر کے
بیٹے نے آگے بڑھ کر اس سانپ کو سانپوں کے بادشاہ کے آگے رکھ دیا
اور کہنے لگا، "اس سانپ کی زندگی میں نے بچائی ہے۔ اسے ہالہ اور
اب یہ آپ کی امانت ہے اور آپ کے پاس لایا ہوں۔"

جونی سانپوں کے بادشاہ نے اپنے ماتھے پر دیکھا تو وہ خوشی سے
ناچ اٹھا، اور خوش ہو کر سوداگر کے بیٹے سے ہوا، "میں تم سے بہت خوش
ہوا ہوں۔ تم نے میرا بیٹا مجھے ملا دیا؟ اتنا کہنے کے بعد اس نے سوداگر کے بیٹے
کو دیکھتے ہوئے کہا،

"مانگو جو کچھ مانگتے ہو۔" اس پر سوداگر کے بیٹے نے سانپ کے
بتانے کے مطابق جواب، "خدا کا دیا آپ کا دیا سب کچھ ہے؟"
سانپوں کے بادشاہ نے دوبارہ کہا، "مانگ لو جو کچھ تمہاری
مرضی ہے؟"

سوداگر کے بیٹے نے پھر وہی جواب دیا، "خدا کا دیا، آپ کا دیا
سب کچھ ہے؟"

یہ سن کر سانپوں کا بادشاہ بہت خوش ہوا اور اصرار کرنے لگا،
"یہ تیسری اور آخری بات ہے۔ مانگ لو جو کچھ مانگتے ہو؟"

جواب میں سوداگر کا بیٹا کہنے لگا، "پہلے مجھے اپنا قول دیں!"
سانپوں کا بادشاہ خوش تو تھا ہی۔ برسوں کے بعد اسے اس کا
پیارا بیٹا ملا تھا۔ اس نے فوراً قول دے دیا۔ سوداگر کے بیٹے نے جب قول
لے لیا تو وہ اس کے ماتھے کی طرف اشارہ کر کے کہنے لگا، "اگر آپ کو مجھے
کچھ دینا ہی ہے تو وہ موتی دیدیں جو آپ کے ماتھے پر چمک رہا ہے؟"

اتنا سننا تھا کہ یہ ایک سانپوں کا بادشاہ حقہ میں آگیا، لیکن
وہ اسے اپنا قول دے چکا تھا۔ اس نے سوچا، مجھے اپنا جھوٹا راکرنا پڑا ہے۔
اور یہ سوچ کر اس نے اپنے ماتھے سے وہ موتی اتار کر اسے دے دیا اور
کاٹیا موتی لے کر خوشی خوشی گھر لوٹ آیا۔

گھرا کر سوداگر کے بیٹے نے سوچا، ذرا میں موتی کو آڑاؤں تو
ہوں۔ دیکھوں، سانپ کی بات صحیح ہی ہے یا نہیں، چنانچہ اس نے موتی کو
ہاتھ میں لے کر کہا، "اے موتی! میرے سونے کے محل میں جاؤ؟"

اس نے اپنے دل ہی دل میں سوچا، جس عورت کے اتنے خوبصورت بال ہیں خدا جانے وہ خود کتنی حسین و جمیل ہوگی۔ وہ اس سونے کے بالوں والی آن دیکھی شہزادی پر عاشق ہو گیا۔ وہ اداس اداس گھرا یا اور اسی ٹنگہ میں دن رات کھویا کھویا سارہنے لگا۔ وہ نہ کسی بات میں دلچسپی لیتا اور نہ کہیں آتا جاتا۔ اس کے باپ یعنی بادشاہ کو جب اس بات کی خبر ہوئی، تو اس نے شہزادے کو پاس بلا کر اس کی اداسی کی وجہ پوچھی۔ جواب میں شہزادے نے سہرے بالوں کا وہ گچھا پیش کر دیا اور کہا، ”جب تک مجھے یہ سونے کے بالوں والی شہزادی نہیں ملے گی، میری رزیت ممکن نہیں!“

بادشاہ نے اسے سمجھایا؟ خدا جانے یہ کون ہے۔ کہاں ہے۔ تم اپنی ضد سے باز آ جاؤ؟

لیکن شہزادے نے کہا: اگر مجھے یہ شہزادی نہ ملے تو میں زہر کھا کر مر جاؤں گا؟

بادشاہ کا اکیلا بیٹا تھا، وہ اس کی خواہش رو نہ کرنا چاہتا تھا لیکن وہ اس کی خواہش کیسے پوری کرے؟ اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔ ادھر بیٹے کی اداسی بھی اس سے نہیں دیکھی جاتی تھی۔ وہ بڑا پویشان تھا اس نے اپنے دانا دیر کو بلا کر اس سے مشورہ کیا اور اس کی رائے مان لی تو وزیر کہنے لگا:۔

”جہاں پناہ! یہ کام تو کنٹیوں کے ذریعہ ہو سکے گا۔ اور کسی کے بس کا نہیں؟“ بادشاہ نے حکم دیا، اسی وقت شہر بھر کی کنٹیاں ہمارے سامنے پیش کی گئیں۔ حکم کا ہونا تھا کہ تمام کنٹیوں کو طلب کر لیا گیا۔ جب تمام کنٹیاں حاضر ہو گئیں تو بادشاہ باری باری ان کی ذہانت اور چالاکائی کا اندازہ کرنے لگا۔ ہر کنٹی ایک دوسری سے بڑھ کر اپنی مکاری اور رہارت کے قصے بیان کرنے لگی۔ ایک نے کہا: ”بادشاہ سلامت! میں آسمان پر جا سکتی ہوں مگر واپس نہیں آ سکتی؟“

دوسری بولی: ”جہاں پناہ میں آسمان پر جا بھی سکتی ہوں اور پھر واپس بھی آ سکتی ہوں!“

اس پر تیسری نے کہا: ”حضور! میں آسمان پر جا کر واپس بھی آ سکتی ہوں اور آسمان کی تھلی بھی لا سکتی ہوں، مگر اسے دوبارہ اس جگہ لگانا نہیں سکتی؟“

جب ان تینوں کنٹیوں نے اپنے اپنے کمالات اور مکاری کے قصے بیان کر دیے تو ایک اور بڑی کنٹی آگے بڑھی۔ اس نے دونوں ہاتھ بائیں ہاتھ سے عرض کی: ”بادشاہ سلامت! میں آسمان پر جا کر واپس بھی آ سکتی ہوں۔ اس کے علاوہ میں آسمان کی تھلی بھی لا سکتی ہوں اور اسے دوبارہ اس کی جگہ لگا بھی سکتی ہوں۔“

اس کا اسیا کہنا تھا کہ آٹا ٹاٹا اس کا گھر سونے کے محل میں تبدیل ہو گیا۔ اس کے چاروں طرف جگمگ جگمگ کرتی دیواریں اور چمکتے دکتے دروازے بنے ہوئے تھے۔ اسے یوں محسوس ہوا جیسا آٹکھ کے پلکارے میں وہ کسی خواب کی دنیا میں پہنچ گیا ہو۔ پھر اس نے کوئی کو باتیں لے کر کہا: ”اے موتی! میں اس ملک کا بادشاہ بن جاؤں؟“

یہ کہتا تھا کہ وہ اس ملک کا بادشاہ بن گیا۔ اس کے ارد گرد ذکر چاکر، اور کنیزیں حاضر تھیں، ہا ادب درباری بھی موجود تھے اور وہ بڑی شان و جلال سے تخت پر بیٹھا تھا۔

اس نے ایک بار موتی سے کہا: ”اے موتی! میری ملکہ سونے کے بالوں والی شہزادی ہو؟“

انفاظ اس کے منہ سے نکلنے کی دیر تھی کہ اس کے سامنے ایک حسین و جمیل فوجان شہزادی پیش ہوئی تھی جس کے بال سونے کے تھے۔ یہ دیکھ کر سو داگر کا بیٹا بہت خوش ہوا۔ اس نے اس خوبصورت سہرے بالوں والی شہزادی کو اپنی ملکہ بنا لیا اور ملک میں راج کرنے لگا۔ اس نے اپنے طوطے اور بٹی کی حفاظت کے لئے نوکر مقرر کر دیے تھے اور اپنی ماں کی خدمت کے لئے کنیزیں بھی تعینات تھیں۔ اور اس طرح اب وہ سو داگر کے بیٹے سے بادشاہ بن چکا تھا۔

دن بیت رہے تھے۔ ایک روز شہزادی ندی پر نہانے گئی۔ اس کے ساتھ اس کی کنیزیں بھی تھیں۔ جب وہ نہا چکی تو اس نے وہیں پر اپنے گیلے بال گندھوائے۔ بالوں میں ٹنگی کرتے وقت کنگھی کے دانٹوں میں جو چند بال ٹوٹ کر رہ گئے تھے کنیز نے ندی میں پھینک دیئے اور شہزادی کنیزوں کے ساتھ واپس محلوں میں چلی آئی۔

کرنا خدا کا ایسا ہوا کہ کنیز نے شہزادی کے سہرے بالوں کا جو گچھا ندی میں پھینکا تھا وہ بہتا ہوا کسی دوسرے ملک میں جا پہنچا۔ اس ملک کے ایک شہر کے قریب ہی سے یہ ندی گذرتی تھی اور اس وقت وہاں اس ملک کا فوجان شہزادہ اپنے دوستوں کے ساتھ نہا رہا تھا۔ سہرے بالوں کا وہ بہتا ہوا گچھا اس کے ہاتھ آ گیا۔ اس نے اپنے قریب سے کوئی سہری چن کر پھینک دیا۔ دیکھی تو ہاتھ پڑھا کر اسے پکڑ لیا۔ اور جب اس نے دیکھا کہ یہ کسی عورت کے بال ہیں تو وہ چند لمحوں کے لئے حیران رہ گیا۔ اس نے آج تک کسی عورت کے اس قدر خوبصورت اور حسین بال نہیں دیکھے تھے۔

یہ لوڑھی کشتی اسی سب سے زیادہ ہوشیار و درجہ بندی تھی۔ ہندو نے بادشاہ سے کہا: "جہاں پتاہ! اس غلام کی ماٹے میں تو یہ کشتی ہی ٹھیک رہے گی۔ یہ کام اسی کے سپرد کیا جائے گا۔"

بادشاہ کو بھی اس رائے سے اتفاق تھا۔ اس نے اس کشتی کو ساری بات بتائی اور سونے کے بالوں والی شہزادی کا پتہ لگانے والے سے لائے کا کام اسی کے سپرد کر دیا۔ اسے بہت سا زر و دولت دینے کے بعد بادشاہ نے کہا: "اگر تم نے یہ کام کر دیا تو تمہیں مالالال کر دیا جائے گا۔"

اس کشتی پھر بولی! حضور والا! اس سلسلے میں مجھے چند یادیں مل رہی ہیں۔ کشتی دیکھی جائے۔ اس کے علاوہ اتنا خرچہ بھی دے دیا جائے کہ ہم کئی ماہ تک باہر رہ کر گئے رہ سکیں؟

بادشاہ کے حکم کی دیر تھی۔ اسی وقت وہ سب کچھ کشتی کو پیش کر دیا گیا جو جس نے طلب کیا تھا کشتی نے ان آدمیوں کو ساتھ لیا اور ضروری سامان کے ساتھ کشتی میں بیٹھ کر ندی کے کنارے کتا سے پانی کے بہاؤ کے خلاف روانہ ہو گئی۔

وہ کئی دن اور کئی راتیں کشتی میں سفر کرتے رہے۔ جب تھک جاتے تو کچھ دیر کے لئے سستا لیتا اور سجتا نہ دم ہو کر آگے چل پڑتے۔ جہاں کوئی شہر آتا وہاں کشتی روک لیتے۔ کشتی شہر میں گھر گھر جاتی، شہزادی کا اپنا معلوم کرنے کی کوشش کرتی اور جب اسے شہزادی کے بارے میں کچھ معلوم نہ جوتا تو وہ دوبارہ کشتی میں بیٹھ کر سفر کرنے کی نکل پڑتی۔ اس طرح وہ کئی شہروں کے پاس رُکے۔ کشتی نے گھر گھر جہاں مارا مگر اسے شہزادی کا کہیں پتہ نہ چل سکا۔ لیکن اب یہ لوگ واپس ہی نہیں جاسکتے تھے۔ کشتی کو معلوم تھا کہ سونے کے بالوں والی شہزادی کے بغیر وہاں جاناموت کو دعوت دینا ہے۔ بادشاہ اس کا جن بچہ کو لھو پلا دے گا۔ اور یہی سوچ کر انہوں نے اپنی تلاش جاری رکھی۔ یہاں تک کہ ایک حرم کی کوشش اور تلاش کے بعد آخر کار وہ اسی شہر کے پاس پہنچ گئے، جہاں سونے کے بالوں والی شہزادی رہتی تھی۔ کشتی نے اپنے آدھیں کو کشتی میں چھوڑا اور وہاں انہیں وہاں رہنے کی ہدایت کر کے خود لوگوں سے چھپ چھپاتی شہزادی کے محلوں میں جا پہنچی۔

محلوں میں پہنچ کر اس نے جو بھی شہزادی کو دیکھا ہلک کر اس کو گلے لگا لیا اور بوسے بہاتے ہوئے بولی: "بیٹی! میں تجھے دھونڈتے دھونڈتے تھا گل ہو گئی۔" تو نے تو مجھے بالکل ہی بھلا دیا!

شہزادی ایک اجنبی بھائی کو دیکھ کر حیران تھی کہ یہ کون ہے جو اس سے

اس طرح کی باتیں کر رہی ہے۔ اس نے تو اسے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ مکالمے نے شہزادی کو اس طرح حیران دیکھا تو بڑے سیارے سے بولی: "تو نے پہچانا نہیں بیٹی! میں تو تیری خالہ ہوں۔ بچپن میں مجھ کو کھانا تھا۔ پھر قمر: کچھ ایسا ہوا کہ ہم دوسرے میں چلے گئے۔ خدا کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ۔" تجھے ملا دیا۔ ورنہ میں تو یہ سوچ بیٹھی تھی کہ بیٹی کو دیکھنے بغیر ہی انکھیں بند شہزادی اب بھی تک حیران و پریشان تھی۔ اس نے تو کبھی اپنا خالہ کے بارے نہ سنا تھا اور نہ اسے خود دیکھا تھا۔ یہ دیکھ کر کشتی بھرے بھو میں بولی: "میں نے دل میں سوچا اگر بیٹی نے پہچان لیا تو ورنہ اسے دیکھ کر اپنا دل ٹھنڈا کر لوں گی۔"

شہزادی بولی جالی تو سی ہی۔ اوپر سے کشتی نے یہ باتیں کچھ کہی تھیں کہ اس کا دل پیچ گیا۔ وہ اس کی کشتی چڑی باتوں میں آگئی۔ سوچا، جو سکتا ہے یہ یہی خالہ ہی ہوا اور میں اسے پہچان نہ سکی ہوں! وہ کہنے لگی: "خالہ! خدا کا شکر ہے کہ اس نے تجھے مجھ سے ملا دیا۔ میں تو دیکھنے کے لئے ترس گئی تھی۔ بڑی تمنائی تم سے ملنے کی؟"

کشتی نے اپنا حادہ چلتا دیکھا تو اصرار دوسرے دسوں باتیں بن کر کرنے لگیں۔ اور اس طرح شہزادی نے اسے اپنی خالہ سمجھ کر اپنا جہان رکھا اس کی بڑی عزت کرتی اور جہاں نوازی میں کسی قسم کی کسر نہ تھا۔ کشتی کے بھین میں ہر طرح سے چوکتی تھی۔ وہ بات بات کی خبر کشتی، محل کے ہر بارے میں جاننے کی کوشش کرتی اور ذرا انداز میں چنے کے متعلق پوچھ کر کشتی کا بیٹا جواب بادشاہ تھا اور سونے کے بالوں والی شہزادی اس کی خالہ تھی پاس جو سا انہوں کے بادشاہ کا واپس ہوا موتی تھا، وہ اسے اپنی جان سے رکھتا تھا۔ اس نے اسے ایک پتیل کی انگشتری میں جڑھا کر انگلی میں پہن رکھا ایک ہل کے لئے بھی اپنے سے جدا نہیں کرتا تھا۔ کشتی بھی جب سے یہاں دیکھ رہی تھی کہ بادشاہ کے ہاتھ میں سونے کی بھلے پتیل کی انگشتری ہے، اس میں ضرور کوئی ماز ہے۔ اس نے یہ بھی دیکھا کہ بادشاہ اسے اپنے کبھی نہ اتارتا تھا اور نہ اس کے لئے کسی پہچوسہ ہی کرتا تھا۔ یہ دیکھ کر ایک روز شہزادی سے کہا: "بیٹی! بادشاہ نے ہاتھ میں پتیل کی انگشتری رکھی ہے، یہ بادشاہ کی شان کے خلاف ہے۔ ان سے کہو کہ وہ سونے جزی انگشتری پہنا کریں؟"

اس شہزادی نے جواب دیا: "خالہ! تمہیں نہیں معلوم کی انگشتری کی وجہ یہ ہے تو ہم بادشاہ ہونے میں۔ یہ سونے کے محل، یہ با



”نمود“ (ایک تجریدی مطالعه)

نقاش: امیر

کہنے لگی: "خدا! کشتی ہے۔ اس میں بیٹے کے والد کی سیر کرتے ہیں۔"
اس پر کشتی نے کہا: "بیٹی! میں نے تمہیں اس میں بیٹے کے سیر کرنے کی
چند منٹ کے لئے مجھے بھی ندی کی سیر کرا دو؟"

شہزادی نے دل میں خیال کیا، چند منٹ میں بھلا کیا دیر بچ جائے گی،
چلو اسے ندی کی سیر کرا دوں۔ اس نے کشتی والوں کو اشارہ کیا تو وہ فوراً کشتی
قریب لے آئے اور وہ دونوں کشتی میں بیٹھ گئیں۔ جتنی شہزادی اور کشتی کشتی
بیٹھے کشتی نے اپنے آدمیوں کو اشارہ کیا اور دیکھتے ہی دیکھتے کشتی شہزادی
کو لے کر ندی کے درمیان پہنچ گئی اور پانی کے بہاؤ پر چلنے لگی۔ شہزادی بڑی
پریشان ہوئی۔ یہ سب کچھ اس قدر جلد ہی ہوا تھا کہ وہ کچھ سوچ ہی نہ سکی۔
کشتی۔ اس نے شور کرنے کی کوشش کی تو کشتی کے آدمیوں نے آگے بڑھ کر اس کا
منہ باندھ دیا۔ کشتی نے اسے بے بس دیکھا تو بحث سے اس کے ہاتھ سے
وہ موتی والی انگشتری اتار لی اور وہ شہزادی کو لے کر اپنے شہر کی طرف چل پڑے۔
مہینوں کا سفر دونوں میں باور دونوں کا سفر گھنٹوں میں طے کر کے پہنچے
وہ اپنے شہر پہنچ گئے۔ کشتی نے سونے والی شہزادی کو ساتھ لیا اور بادشاہ کے
سامنے لے جا کر پیش کر دیا۔ بادشاہ شہزادی کو دیکھ کر بہت خوش ہوا۔ اس نے
کشتی کو انعام و اکرام سے الامال کر دیا اور اس سے وہ انگشتری بھی لے لی
جس میں سانپوں کے بادشاہ کا موتی چڑا ہوا تھا۔ شہزادے کو جب یہ چلا کہ
سونے کے بالوں والی شہزادی آگئی ہے تو اس میں جیسے سہرے زندگی آگئی ہو
بھوں میں ہر طرف خوشیاں منائی جانے لگیں، شہزادی کی شہزادے سے شادی
کر دی گئی اور اس کے ساتھ ہی بادشاہ نے وہ انگشتری شہزادے کو لے کر لکھا،
"یہ انگشتری اپنے پاس بڑی حفاظت سے رکھنا۔ مجھے کشتی نے بتایا ہے کہ اگر یہ
انگشتری ہٹائی گئی تو سونے کے بالوں والی شہزادی بھی چلی جائے گی۔"

شہزادے نے باپ کی نصیحت کے مطابق وہ انگشتری ہاتھ میں
پہنی اور اسے اپنی جان سے زیادہ عزیز رکھنے لگا۔

دوسری طرف جہاں سوداگر بادشاہ کو لاکھا تو اس نے دیکھا وہاں
سونے کے محل تھے۔ نہ سونے کے بالوں والی شہزادی، نہ کینڑیں اور نہ زار باری۔
وہ پہلے کی طرح ایک سوداگر پر چکا تھا۔ سانپوں کے بادشاہ والا موتی جانے کے
ساتھ ہی ہر چیز غائب ہو چکی تھی۔ اس کے پاس صرف ایک موطا تھا اور ایک تیلی ہوا
پھوس کی بوتلیں ان جو اس کے ہر دم کے ساتھ تھیں۔ سوداگر بڑا پریشان ہوا
لیکن باب کیا کر سکتا تھا۔ اسے اندیشہ ہی نہ تھا کہ اس نے شہزادی کو انگشتری
کیوں دیدی تھی۔ مگر وہ سوچتا تھا، کیا تھا؟ کیا تھا؟ اس کا دماغ دھنچکا

سب اسی کو وجہ سے ہے؟

کشتی کا قیاس ٹھیک تھا۔ وہ دل ہی دل میں بہت خوش ہوئی۔ اسے
کامیابی کی امید نظر آ رہی تھی۔ وہ شہزادی سے بڑے پیار سے کہنے لگی،

"بیٹی! اگر ایسی ہی بات ہے تو میرا اس قسم کی چیز تو نہیں اپنے پاس رکھنی
چاہئے۔ مردوں کا کوئی بھروسہ نہیں کسی وقت عورت سے بد دل ہو جائیں۔
یا ان پر کوئی مصیبت ہی آجائے۔ میری تو رائے یہ ہے کہ آج رات جب
بادشاہ محلوں میں آئے تو تم اس سے یہ انگشتری لے لینا؟"

مردوں کی بے وفائی کے قصے شہزادی نے بھی سنی رکھے تھے۔ وہ کشتی
سے اور بھی مانوس ہو گئی۔ اس نے سوچا، خالہ ٹھیک ہی تو کہتی ہے۔ مردوں کا
کیا بھروسہ؟ چنانچہ اس رات جب بادشاہ محل میں آئے تو اس نے اس سے وہ
انگشتری مانگی۔ بادشاہ نے بہتیرا اسے سمجھا لیا کہ اس کا میرے پاس ہی رہنا
ٹھیک ہے مگر شہزادی صبر کرنے لگی۔ بادشاہ شہزادی کو دل سے جاتا تھا۔
وہ اسے ناراض نہیں کر سکتا تھا۔ اسلئے اس نے انگشتری انکار کر کے دیدی اور
کہا: "مجھ کو سے حفاظت سے رکھنا!"

اور اب وہ انگشتری بادشاہ کے بجائے شہزادی کی نگل رہی تھی۔

کئی دن گزر گئے۔ کشتی یہ تو سمجھتی تھی کہ وہ انگشتری جس کی وجہ سے
محل سونے کے تھے، اب بادشاہ کے قبضہ سے نکل کر شہزادی کے پاس آئی۔
اس سے اس کا حاصل کرنا کوئی مشکل چیز نہ تھی لیکن وہ اس بات سے قطعی
متوافق تھی کہ آخر ایک انگشتری کی وجہ سے بادشاہت کیسے مل سکتی ہے؟
محل سونے کے کیونکر ہو سکتے ہیں۔ مگر اسے یہ سب کچھ جاننے کی ضرورت
بھی نہیں تھی۔ وہ تو سونے کے بالوں والی شہزادی کو لینے آئی تھی اور بس۔
اور یہی سوچ کر ایک روز جب بادشاہ سو رہا تھا اس نے شہزادی سے کہا،

"آؤ بیٹی! آج وہ ندی کی سیر کرائیں؟"

بھلا شہزادی کو اس پر کیا اعتراض ہو سکتا تھا۔ وہ تو سمجھتی تھی کہ
اپنی خالہ کے ساتھ سیر کرنے جا رہی ہے لیکن جب وہ دونوں ندی پہنچیں
تو کشتی بالوں باتوں میں ملے وہاں لے آئی جہاں اس کے آدھی کشتی میں بیٹھے
اس کا انتظار کر رہے تھے۔ انہوں نے کشتی کو دیکھا تو اس طرح ہو گئے جیسے
وہ اسے جانتے ہی نہ ہوں۔ ادھر کشتی جب ندی کے کنارے کشتی کے قریب
پہنچی تو اس نے انہیں بٹتے ہوئے شہزادی سے پوچھا: "بیٹی! یہ کیا ہے
پانی میں؟"

شہزادی کو اس کی بیوقوفی پر بڑی ہنسی آئی اور سمجھاتے ہوئے

خواب گاہ بتادی اور تکی اور طوطا دونوں شہزادے کی خواب گاہ میں چھپ کر رات جوئے کا انتظار کرنے لگے۔

جب رات ہو گئی تو انہوں نے دیکھا کہ شہزادہ سونے کے لئے اپنی خواب گاہ میں آیا ہے۔ اس نے اپنا لباس تبدیل کیا اور انگشتی اناکر منہ میں رکھ لی اور پھر سونے کے لئے لیٹ گیا۔ تکی اور طوطا ایک کونے میں چھپے ہوئے یہ سب کچھ دیکھتے رہے۔ جب انہوں نے دیکھا کہ شہزادہ سوچا ہے تو وہ آہستہ سے آگے بڑھے۔ تکی دے پاؤں، ہولے ہولے شہزادے کے پیچ پر چڑھ گئی۔ پلنگ پر چڑھنے کے بعد اس نے اپنی دم کے چند بال شہزادے کی ناک میں ڈال دیے جس کی وجہ سے شہزادے کو زور کی ایک چھینک آگئی۔ اس کا چھینکنا تھا کہ اس کے ساتھ ہی اس کے منہ میں رکھی ہوئی سانپوں کے بادشاہ کے موتی والی انگشتی پھل کر دوڑ جا گئی۔ یہ دیکھ کر طوطا پھل کی سی تیزی سے آگے بڑھا اور اس نے انگشتی اپنی چوخی میں پکڑ لی اور دونوں فوراً وہاں سے بھاگ کر شہزادی کے پاس پہنچ گئے۔ اور کہا:

”شہزادی ابے فکر مچاؤ۔ ہم نے انگشتی حاصل کر لی ہے اور اب ہم واپس جا رہے ہیں۔ اللہ نے چاہا تو چند دن کے اندر سوداگر کے بیٹے کے پاس تو پہنچ جائے گی۔“

اتنا کہنے کے بعد طوطا اور تکی جس طرح آئے تھے اسی طرح ندی کے کنارے کنارے واپس چل دیے، تکی نیچے نیچے چلتی اور طوطا اس کے اوپر اوپر اڑتا چلا جاتا۔ اس طرح وہ دونوں کا سفر ٹھنڈوں میں طے کرتے ہوئے آخر کار سوداگر کے بیٹے کے پاس پہنچ گئے۔ سوداگر کا بیٹا ان کے اس طرح اچانک گم ہو جانے پر پہلے ہی سخت پریشان تھا۔ وہ اپنے دل ہی دل میں سوچ رہا تھا۔ بادشاہی گئی۔ سونے کے محل گئے۔ سونے کے بالوں والی شہزادی گئی۔ سب کچھ چلا گیا اور اب طوطا اور تکی بھی چلے گئے۔ یہی سب کچھ سوچ سوچ کر وہ بہت زیادہ پریشان ہوتا۔ لیکن جب طوطا تکی اس کے پاس پہنچے تو وہ انہیں دیکھ کر خوش ہو گیا۔ اس نے دیکھا سانپوں کے بادشاہ کے موتی والی انگشتی طوطے نے اپنی چوخی میں پکڑی ہوئی ہے۔ اس نے آگے بڑھ کر دونوں کو گود میں لے لیا اور پیار کرنے لگا۔ اس کے بعد اس نے طوطے سے انگشتی لے کر اپنے ہاتھ میں پکڑ لی اور بولا: اے موتی! میرے سونے کے محل واپس مل جائیں؟

اس نے دیکھا وہ سونے کے عاید خان محلوں میں کھڑا تھا۔

(باقی صفحہ ۱۳۴)

لگا۔ نہ کچھ کھانا نہ پیٹل۔ ہر وقت کھو یا کھو یا سارہتا۔ طوطے اور تکی نے جب اسے اس طرح اداس دیکھا تو آپس میں مشورہ کرنے لگے اور ایک دوسرے سے کہنے لگے: ”سانپ تو اپنی قیمت چکا چکا ہے۔ اب ہماری بانی ہے۔ ہمیں سوداگر کے بیٹے کو اپنی قیمت دلانی چاہئے؟“

پھر وہ دونوں کچھ طے کرتے ہوئے بولے: چلو، ہم شہزادی کو ڈھونڈ کر لے آئیں۔“

یہ طے کر کے طوطا اور تکی خاموشی سے چل دیے، وہ دونوں بھی ندی کے کنارے کنارے پانی کے بہاؤ کی طرف چل دیے۔ تکی نیچے نیچے چلتی چلتی جاتی اور طوطا اس کے اوپر اڑتا جاتا۔ اور اس طرح وہ دونوں اپنی شہزادی کی تلاش میں دن رات سفر کرتے گئے۔ راستہ میں جو شہر آتا وہ وہاں جاتے۔ طوطا اڑ کر اور تکی گھوم کر گھر گھر شہزادی کو تلاش کرتے اور جب سارا شہر دیکھنے کے بعد واپس ہو جاتے تو دوبارہ ندی کے کنارے چل دیتے۔ کرنا خدا کا ایسا ہوا کہ یہ دونوں بھی چلتے چلتے کسی دوسرے ملک کے اسی شہر میں پہنچ گئے جہاں سونے کے بالوں والی شہزادی بھوری اور بے بسی کی زندگی گزار رہی تھی۔ طوطا اور تکی دونوں گھومتے گھماتے اور ڈھونڈتے ڈھونڈتے بادشاہ کے محلوں میں چلے گئے۔ اور پھر شہزادی کے محل میں جا پہنچے۔ جو بہی شہزادی نے انہیں دیکھا، دیکھتے ہی پہچان گئی کہ یہ طوطا اور تکی اسی کے اپنے ہیں اور اس کی تلاش میں آئے ہیں۔ اس نے انہیں گلے لگایا، پیار کیا اور سوداگر کے بیٹے کا حال دریافت کرنے کے بعد بتایا کہ مجھے اس طرح ایک کشتی دھوکے سے یہاں لے آئی ہے۔ میں جیسے خالہ سمجھتی تھی وہ تو اصل میں کشتی تھی اور یہ مجھے یہاں لے آئی۔ تکی نے شہزادی سے پوچھا: وہ موتی والی انگشتی کہاں ہے؟

شہزادی نے انہیں بتایا: وہ شہزادے کے پاس ہے اور وہ اپنی جان سے زیادہ اس کی حفاظت کرتا ہے۔ وہ ہر وقت انگشتی ہاتھ میں پیٹے رکھتا ہے۔ اور جب رات کو سونے لگتا ہے تو انا کر اپنے منہ میں رکھ لیتا ہے تاکہ اس کے کھو جانے کا خطرہ ہی نہ رہے؟

یہ سنی کر تکی بولی: شہزادی! تو نہ کر، ہم انگشتی ضرور حاصل کر لیں گے۔ تو ہمیں صرف اتنا بتا دے کہ شہزادہ سوتا کہاں ہے؟ شہزادی طوطے اور تکی کے آنے سے بہت خوش تھی۔ اس کی امیدیں پھر سے زندہ ہو رہی تھیں۔ اس نے تکی اور طوطے کو شہزادے کی

سلیم خان گمتی

کہاں چھائے یہاں کے حوذا دار اند جعدار اور کہاں ولایت۔
لیکن رویہ کپڑا لنگ تو منڈ میں گزریں اس معاملہ میں پہل کر چکا ہے۔ ...
..... اس لئے اس نام میں تو کوئی اچھے کی بات تھی۔
اور اپنی اگھلتان کے لئے تو خوں جگر ہمنے تک سے زیادہ جو قصہ
کا پہلا رخ ہے، بہر حال جعدار ہی زیادہ دلچسپ ہے۔ کیونکہ دوحالی
جنگوں نے بھینچ کر ان جاننا زلو کو ایک عالم سے روشناس کر دیا ہے۔
مگر میرے لئے تو پہلے دوسرے رخ کے علاوہ، جن کے قول دوم ہونے کا
فیصلہ میں ابھی نہیں کر سکا، زیادہ اچھے کی بات یہ تھی کہ جس بات کا ذکر پہلے
کرنا چاہیے تھا وہ بالکل آخر میں بیان کی گئی تھی یعنی انگریزی رخ جناب
رفیق خاور کامرواری مفت ہے کیونکہ میرے سامنے تو تصویر کا ایک اور
ایک ہی رخ ہے اور میری ہٹ و دم طبیعت کچھ ایسا ہی تصور کرنے
پر مصرعے۔ یوں یہ بات خود تجربہ سے بھی صاف جھلکتی ہے۔ کیونکہ تصویر،
پوری طرح ہوتی ہوئی تصویر، جسم بن سکتی تھی اور جعدار کو جعدار یعنی دلچسپ
نہا سکتی تھی۔ نقاد رہا، نقاد نہ رہے اور تاہم ترسل بن جائے۔

دو بخش و پنج کی بات تھی 'اب بھی ہے۔ میں یہ یاد نہیں
کر سکا کہ پہلا رنج پہلا سی ہے اور دوسرا رنج دوسرا۔ اور یہ یونہی نہیں
ہے۔ دونوں کے بعد ہی ایسے ہیں۔ مثلاً ناول کا پہلا سی پیرا گراف جیسے:

"It was an exhilarating gaily
morning in 1939; The entire land
of Bengal seemed to be bathed in
green. The rippling sea of paddy
fields was fringed by tall, delicate
betel-nut trees, here and there
rose groves of coconut and palm
trees, and thick, dark clumps of
bamboo."

*Islam, Praised of Two hours ,
Glory of God.*

ایسی آئے سائنس کی باتوں کا تقابل لطف سے خالی نہیں۔
ایک جگہ ایک بزرگ آتے ہیں پیر الاسلام۔ بڑا اٹو کھانا نام ہے
ہم لوگ جو پیر کھاتے ہیں سنتے ہی پیر کا مزہ ہی لینے لگے ہیں، اور میں نے
ترکیب کا بھی۔ یقین ہے انگریز بھی *The chess of Islam*
سے اتنے ہی محظوظ ہوتے ہوں گے۔

آپ پوچھیں گے کہ اگر ایسی ہی بات تھی اور سارا ناول بنگال
ہی کی خطا میں رسا ہوا تھا۔ نام، جیس، اجناس۔ سب کے
سب بنگال ہی بنگلاتھے۔ یہاں تک کہ یہاں کے مشہور عالم رس گلے
بھی تھے اور جلیبیاں بھی جن کا ایک دو جگہ ذکر آیا ہے تو اس رخ کی
دوسرے رخ میں کایا پلٹ ممکن ہی کیسے تھی؟ یہ بڑا پتہ کا سوال ہے۔
اس میں تو کہیں نہ کہیں دوسرا رخ بنانے والے کو اراستانی ہی پڑے گی لیکن
جراتی ہی ہے کہ کہیں ویٹا نہیں ہوا۔ جی جیجے پھر وہی پرانی بات دہرائی پڑتی ہے۔
یہ شش و پنج کہ کس رخ کو اصل رخ کہا جائے۔

کھانے پینے کی چیزوں میں دن رات پھلی، مچات، دال کا استعمال
عام ہے جی تو دال گلنا نہ گلنا جیسا عموماً محاورہ بن چکا ہے۔ یہ دال اپنے
یہاں تو خیر کسی نہ کسی طرح گل ہی جاتی ہے، لیکن کہیں اور کیسے گلے
بڑا پیر صامعہ ہے۔ اگر ہم پنج ولایت جا کر دال گلانے لگیں تو کیا ہوگا۔
لکھنے والے نے تو یہ بات بڑے مزے لکھ دی تھی کہ :

”دال گلتی نظر آرہی تھی۔ انہیں مناسب معلوم ہوا کہ وہ دو
ایک آپ بچ جگہ کے خود دے آئیں تاکہ جو کچھ کر گئے ہیں وہ گئی ہو وہ
بھی پوری ہو جائے“

اب یہاں سارا سلسلہ ہی دال۔ آپ بچ۔ کسر اور گنے کا ہے نہ
انگریز دال پکائیں نہ کھائیں۔ ان کے یہاں اس عمل کا کیا جواب ہے؟
دیکھئے۔

*He felt that the achievement of
his cherished object was at hand,
and he deemed it proper to push
the advantage home. A little
more steam and his stew would
be ready.*

اسے دیکھتے ہی گمان ہوتا ہے کہ یہ رخ دوسرا رخ نہیں ہو سکتا۔
اور چراغ سے چراغ جلانے والے نے بڑے سلیقے سے کام لیا ہے۔ اس نے
اپنے رخ پر دوسرے کا سایہ نہیں پڑنے دیا۔ قلم اس کا اپنا ہی قلم رہا ہے
اور تیرہویں اس کے اپنے ہی تیرہ رہے ہیں۔ بالخصوص خط کشیدہ جملہ
کتنا عمدہ ہے۔ بیان میں وہ چیزیں جسے انشا پر دازی کہتے ہیں۔
حسب معمول کوئی بات بڑھا کر ٹھکر یا شاعری کا رنگ دیکر نہیں پیش کی گئی۔
دوسرا رخ ہونے کی بات جب بنتی کہ عبارت میں کوئی جھول
ہوتا۔ کوئی عبارت تشریح کے لئے اضافہ کی جاتی۔ خطوط عدالتی بکثرت
برستے جاتے اور جا بجا حاشیے ہوتے۔ ایسی سب باتیں تو بیان ہی میں
سمجھ گئی ہیں جس سے اور بھی کسی اور رخ کا شائبہ نہیں رہتا۔ مثلاً
ایک چھٹی ہی بات لیجئے۔ ہمارے یہاں روزہ، نماز، تہجد کون نہیں
چانتا مگر اہل مغرب انہیں کیا جانتیں؟ ان کے لئے تو کوئی ایسی ترکیب
کرتی ہوگی کہ وہ ان کا مطلب سمجھ جائیں۔ اگر کہیں ذرا بھی مشتبہ پیدا
ہوگا کہ جو کچھ کہا گیا ہے وہ کافی نہیں تو بات بگڑ جائے گی۔ شرط یہی ہے کہ
ایک رخ کے پس پردہ کوئی دوسرا رخ نہ دکھائی دے۔ چنانچہ تھوڑے
کے سلسلہ میں کہیں *pre-dawn prayer* اور کہیں
optional early morning prayer کہہ کر
کسی تشریح کی گنجائش نہیں رہنے دی گئی۔ بات ہر جگہ پوری ہے اور اس
پر وہی چھاپ ہے جو اصل پر پہلی چھاپ ہے۔

ایک اور منہ لیجئے، بہت گراں پایہ، عزیزہ المیہ۔ ہر شہر اپنی
نصف بہتر کو اس ہی نام سے یاد کرتا ہے۔ مگر انگریز لوگ اسے کس طرح پچھتے
ہیں، انہیں یہ نازک رشتہ کیونکر سمجھلا جائے، یہ بات اچھے اچھل کو چکولے
دینے کے لئے کافی ہے۔ پھر اس کے لئے کیا حکمت برتی جائے کہ سب عزیزہ
المیہ کو جامع جائیں؟ انگریزی میں اس کو *dear spouse* کہا گیا
ہے۔ اور اس کی جڑ کے اس علاقے میں دوپٹے محظوظا ہرے پتھر نہیں رہ سکتا۔

ایسے ہی خبر نہیں کہتے نام اور بھی۔ مثلاً محمد مصباح کے مہاراجا
شان یا چھانو کو لے لیجئے۔ شاہی کے جو معنی ہیں وہ تو ہم جانتے ہیں۔ مگر انگریزی
کو اس شان یا اس کی شان نزول کا کیا علم اور وہ ان کے خطابات و القاب کو
کیا جانتیں جن سے ہم اپنے یہاں خود کو یاد دیر چلا کر نوازتے ہیں۔ پور نام
یہ ہے ”ابو البرکات تاج الاسلام محمد ذوالقرنین شان خدا“۔ انگریزی
میں جو کچھ کہا گیا ہے وہ اس کا درستہ جواب ہے :

Father of blessings, crown of

the black-market, and the rich sucking the blood of the poor, people hailed him; but when, like a pedigree cock, the gamador, replied with a deadlier thrust, they started saying: "Go on! Go on!"

ایک روز اور متعہ دیجیے:-

(۱) وقت گزرتا گیا، لڑائی زور پکڑتی گئی قیمتیں ایک کی دس پہنچ گئیں، بازار میں چیزیں دس کی جگہ ایک نظر آئے لگیں۔ جیسے بھرنے لگیں پیٹ خالی پونے لگے۔

(۲) جمعدار صاحب کی مالی حالت یوں بھی تیلی ہو رہی تھی۔ اب ایک نہ شدہ و شدہ مفلسی میں آگیا گیا۔

ان سے زیادہ خطرناک بہرے شاید ہی چنے جاسکیں اور باری خانہ سے فی صد پٹ نظر آتی ہے۔ کیونکہ ان پہ در پے چالوں کا جواب تقریباً بحال ہے۔ مگر جو ایک فیصد امکاں باقی رہ گیا تھا اس نے لایا ہی پٹ دی ہے:-

1. During the following months, the war spread and its effects became worse. Prices shot up tenfold and the quantity of goods on the market shrank by nine-tenths. As some pockets swelled other stomachs became empty.

2. The gamador's financial position was already precarious. The involvement in a criminal case came as another bolt from the blue.

اسی طرح بساط پر ہروں کی نشست اتنی مضبوط ہے کہ کسی بھی بہرے کو اوپر اڑھانا جملانا بعد از امکان نظر آتا ہے:-
"بہت سے مردہ دلوں میں زندگی کی لہر دوڑ گئی۔ اُمید کی دیوی کی آنکھوں میں مسکراہٹ کھیلنے لگی۔ اس کی نگاہ غلط انداز ہر طرف پڑی

ہم سے اس کا بدلا ہوا زہب کہہ سکتے ہیں۔ بلکہ یہ تو بالکل الگ چیز ہے۔ روپ رنخ کی بات تو ملنے نہیں بن پڑتی۔ خیر یہ جانے دیجیے۔

ٹینی مرغا، ہیل مرغا، ان کی بالیاں اور نوک جھونک کا تماشہ تو ہم آئندہ دیکھتے ہی رہتے ہیں۔ خیر نہیں مغربی ملکوں میں بھی مرغوں بیروں، مینڈروں وغیرہ کی کشتیاں دھکل جاتے ہیں یا نہیں۔ ہوتے ہیں تو اس فن کے ہر ہر داؤ بیچ کی اصطلاحیں ہی ہوں گی۔ اور جو کوئی ایسا سین دکھانا چاہے وہ اس کی بخوبی پیش کر سکتا ہوگا۔ مگر یہاں کے آدمی کسے لٹے وہاں کی ان پیشہ ورانہ باتوں کا علم اور ان کو اکرنا کافی طبیعتی کھیر ہے۔ اب دیکھتے دو مرغوں کی مہر کہ آرا لڑائی کا جو نقشہ نیچے پیش کیا گیا ہے۔ وہ کیا دشواریاں پیدا نہیں کرے گا۔ اور سات سمندر پار رہنے والوں کے سامنے اس کا ٹھیک ٹھیک نقشہ پیش کیا جاسکے گا تو کیسے۔
"جلو دھرنے ٹینی مرغے کی طرح جب امیر غریب، بلیک مارکیٹ گرائی، خون چوسنے وغیرہ کی چورچامی ترجمہ اسے شاہی دے رہا تھا" مگر جب جمعدار صاحب نے ہیل مرغے کی طرح پیرمیاں کو فلاحی کی ضرب کاری لگائی تو ان کی واہ وا ہونے لگی۔

ہم واقعی کٹھن ہے۔ اور بظاہر میدان چھوڑے بغیر چارہ نظر نہیں آتا یعنی یا تو سارے معاملے ہی کو گول کر دیا جائے یا کوئی راہ فرار اختیار کر لی جائے۔ انگریزی رنخ کی بڑی خوبی یہ ہے کہ اس میں نہ تو کڑی سے کڑی صورت حال سے گریز کیا گیا ہے اور نہ لکیر کا فقیہ بنکر ہر جہ استادانہ گفت ہماں می گویم کا طریقہ اختیار کیا گیا ہے بلکہ ہر اور پنج کا پورا پورا سامنا کیا گیا ہے اور اسی راہ اختیار کی گئی ہے جو بالکل اپنی ہوس

آئی ہے شہ تو اپنی جگہ سے ٹلے نہیں

ایرا ہی نے کے ہم نے بچا ہے کشت کو

مگر کشت اور ایرا کی بات تو حجب پیدا ہوتی ہے کہ واقعی شہ آئی ہو اور بچا گیا ہو۔ یہاں بچنے بچانے کا سوال ہی نہیں۔ شاطر کو صرف اپنی چالوں سے سروکار ہے۔ اس لئے بازی سراسر اس کی اپنی ہے۔ وہ اپنے حریف کے ہشکندے کو ایک نظر دیکھ کر آنکھیں میچ لیتا ہے اور پھر اسی چال چلتا ہے کہ وہ دیکھتا ہی رہ جائے اور یہ کہیں لاکھیں کل چلتے۔

When Galadhee, like a common cock, struck a blow against

were coming from every direction. As far as the eye could see, the river was like a rainbow of red, blue and yellow sails, pennons and flags. On the bank temporary shops made of bamboos and tin sheets had been set up. There were all kinds from restaurants to trinket shops. Some boats were loaded with coloured bundles. When they came near, the bundles suddenly became alive. In their laps other smaller bundles in the form of children sprang up. Every big bundle had three or four smaller ones with it. The male passengers began to alight from other boats, all adorned with beards in various styles and waist-bands of different hues. Some beards had an aura of saintliness, some were well-shaped....."

قد، قی ط پر حال چلتے وقت ہاتھ اسی کا اونچا ہوتا ہے جو پہل کرے۔ مذوقا کا ہاتھ جی اونچا ہوتا ہے کہ وہ چال کا توڑ کرے۔ مثلاً کھیل کے اس روپ میں ہار نہیں تو آدمی کیس نہیں گئی ہوئی:-

یکایک زمین و آسمان جنبش میں آئے، زمین پر ہوا کے گھونٹے دوڑنے لگے، آسمان پر بجلی کے نیرے چمکنے لگے، کچھ دیر بعد ان پر اگلے ہتھیاروں کی جگہ نئے ساہاں عرب ہتھال کے جانے لگے، جوانی بھار اٹھنے لگے، توپیں گرجنے لگیں، بم پھٹنے لگے۔ جمعدا صاحب نے بیچا الرعد سمجھا، کہتے ہوئے کان میں اٹھلے۔ اہمال دھرم دھرم کر ہاتھ گرجا کی آواز سے جلد دھرم دھرم بول بول کر اٹھ بیٹھے، ہوا زور پکڑتی

تھی۔ ہر ایک ہی محسوس کر رہا تھا کہ کبھی پر پڑ ہی ہے اور شبید ہوا جا رہا تھا ہیر میاں قدر نا ایسے شبیدوں کی صف اول میں تھے۔
مگر ایک ہی ہاتھ میں جہاں جہاں کالے ہرے تھے وہاں سفید ہی سفید ہرے دکھائی دیتے ہیں:-

Many dead hearts started pulsating with new life. The goddess of Hope was all smiles. Her glances fell meaningfully on all sides. Everyone felt that they were focussed on him and was thrilled accordingly. Panir Miyan was naturally in the forefront.

کھیل کی خوبی وہاں دکھائی دیتی ہے جہاں ایسی ہی اٹھی سے اٹھی چالوں کے ساتھ بسا بھی یہی طرح دود دود پھیل چکی ہوئی ہے۔ اور فیل فرزیں دود لے کے لئے میدان بہت ہی کسیت ہے۔ یہیں شاطر کے جوہر سب سے زیادہ کھلتے ہیں اور دیکھنے والا اس کی چاکلہ تھی کی داد دے سکتا ہے۔ جتنی شئی گم کر دینے والی چالیں پڑتی ہیں اتنی ہی اس کے ذہن کی تیزی پر متحی جاتی ہے۔ اور اپنا رنگ دکھاتی ہے۔ اسی سے کھیل کی سطح بہر حال اونچی اور اونچی ہوئی۔ ایک مقام پر یہ نقشہ دکھائی دیتا ہے۔
"کالی گینچ میں بڑی دھوم دھام نظر آرہی تھی۔ سینکڑوں کشتیاں چلی آرہی تھیں۔ تاحد نظر سرخ پیلے پیلے بادلوں، جھنڈیوں اور جھنڈوں کی بدولت ساری فضا توں قرح بنی ہوئی تھی۔ کنارے پر بانس اور بین کی عارضی دکانیں لگاں جا رہی تھیں۔ ہر طرح کی دکانیں تھیں، کھانے پینے سے لے کر بنازے تک، کچھ کشتیاں رنگین گھٹریوں سے لدی ہوئی تھیں، قریب آئیں تو گھٹریاں بولتی چلتی جاندار نظر آئیں، ان کی آغوش میں چھوٹی چھوٹی گھٹریاں بچوں کی صورت میں اچھلیں، ہر بڑی گھٹری کے ساتھ تین تین چار چار چھوٹی گھٹریاں تھیں۔ مرد و عورتی کشتیوں سے آتے طرح طرح کی ڈاڑھیوں اور رنگ رنگ کے تہموں سے بنے سنوے کچھ ڈاڑھیاں نرانی تھیں، کچھ شعل:-

اور بسا لائے ہی صورت حال یوں اگر گوں ہو جاتی ہے:-

There was great activity at Kaliganj. Gaily coloured boats

”رم جھم یہ پھوار“

خواجہ غلام فریدؒ
ترجمہ: حشمت فضلی

۳۰

برسوری اگھینویر سجا کے

جیسے گھٹائیں برسیں جھاکے

ساون آیا بن سجنائے کے بدے ہوئے طوفان بلا کے

وعدے کر کے بھی نہ آئے بھولے دل پر چوٹ لگا کے

دل چھینا راول جو گئی نے بانسریا کی تان اڑا کے

اتنا ظلم مناسب ناپیں سجنائے سے پریت لگا کے

مجھ کو اکیلی چھوڑ کے تھل میں جا بیٹھے پردیس میں جا کے

روٹھ نہ جانا راجہ مجھ سے میرے اہڑے من کو سب کے

ڈھونڈھوئی تھک کو جو گن بن کر اپنے بدن پر رکھ رکھا کے

پاپی سپینہ خیم نہ چھیرا ب پھونک کوئل کوک سنا کے

ہجرت کی آگ پہ لوٹ رہی ہو بے بسی میں پریت لگا کے

تم بن مجھ کو چین نہیں ہے شاد کر و دل چوب کھلا کے

بادل گر میں بجلی چمکے رجم جھم بارش نور گھٹا کے

مشکل بار اٹھا کے فرید اب

جینا ہے دو بھرن سجنائے کے

پردیس پیا
پردائی ہوا
ہولے ہولے لہرائے
برسات آئی، خوشیاں لائی
ہر شے پر ہے سستی جھائی

چوٹ مٹنے لگی
کھپ (۱) کھلنے لگی
سبزہ جو ہے اٹھلائے

پردیس پیا
پردائی ہوا
ہولے ہولے لہرائے
بادل گرے، بجلی کو ندی
مٹی سے اٹھی خوشبو سوندھی

گرمائے جگر
قلب اور نظر
مستی میں من لہرائے
پردیس پیا
پردائی ہوا
ہولے ہولے لہرائے
جب تک ہے یہاں بیکارانی
تلاشوں میں ہے جب تک پائی

بھریں مجھے ہیں
جائیں نہ کہیں
کیوں کوئی یہاں سے جائے
پردیس پیا
پردائی ہوا
ہولے ہولے لہرائے
شاداں ہے فرید اس موسم سے

جوسے ہر سو میں رم جھم کے
میٹھا میٹھا
اک فٹ سا
جذبات میں گھٹتا جائے
پردیس پیا
پردائی ہوا
ہولے ہولے لہرائے

جسیم الدین

(شخصیت اور شاعری)

وفاراشدی

ابتدائی تعلیم مقامی مدرسوں میں حاصل کی اور اعلیٰ تعلیم کے لئے کلکتہ پہنچے۔ یہاں کی یونیورسٹی سے ہنگلا ادب میں ایم۔ اے کی سند حاصل کی۔ انہیں ہنگلا ادب کی وہ شلخ جو مسلمان مائجیوں سے مخصوص ہے اور اس عوامی ادب سے جسے پوتھی ادب کہا جاتا ہے، خصوصی لگاؤ تھا۔ انہوں نے گاؤں گاؤں پھر کر پوتھی ادب کے وہ پارے جمع کئے جو تلف ہوتے جا رہے تھے اور لوگوں کو صرف زبانی یاد تھے اور جن کی طرف غیر مسلم ادیبوں نے کبھی نگاہ التفات بھی نہ ڈالی تھی۔ مسلم لوگ گیتوں اور مسلم عوامی ادب کے یہ جواہر ریزے بڑی حد تک جسیم الدین کی انتھک مساعی کی بدولت ہی مستقر عام پر آکر محفوظ ہوئے۔

پاکستان جنم کے بعد جسیم الدین ڈھاکہ یونیورسٹی میں آگئے اور ہنگالی ادب و زبان کی تدریس کا شغل اختیار کیا۔ آج کل وہ مشرقی پاکستان کے شعبہ اطلاعات سے متعلق ہیں۔

ملا مالاب کے کنارے ناریل اور کیلے کی حسین قطاریں بھالیہ کے اونچے اونچے شریلے پیڑ، حد نظر تک دھان کے ہلہاتے کھیتوں کا سلسلہ، ہر طرف بل کھاتی ندیاں، ندیوں پر ریگتی ہوئی طح طرح کی خوبصورت رنگین کومل کول کشتیاں، آسمان پر رنگ برنگے چوہ کی طرح لہراتے بل کھاتے بادل — یہ ہیں وہ حسین مناظر، وہ دلنظر خوبوگن نظارے جن سے مشرقی پاکستان کے حوام کے دلوں میں مدعاں کی ہریں اٹھتی اور ذہنوں میں گمازا اور نغمہ و شعریت کی تصویریں ابھرتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ یہاں شعل و نغمہ و موسیقی لوگوں کی گھٹی میں پڑا ہے۔

مغربی پاکستان کی طرح مشرقی پاکستان کی آبادی کا بھی

جنگور کی زندگی کا آخری دور تھا کہ ہنگلا ادب میں جدید بھانپ پیدا ہوئے۔ میری مراد جنگ عظیم اول (۱۹۱۴-۱۹۱۸) سے ہے۔ اس جنگ کا اثر بڑے صغیر کے معاشری حالات اور سیاست دونوں پر پڑا۔ قدرتی بات تھی کہ ہنگال کے مسلم اہل قلم بھی اس طوفانی جہد کے تقاضوں سے روشناس ہوئے۔ اور ان میں بھی اپنی انفرادیت کا جذبہ جاگا۔ چنانچہ قاضی محمد اسلام نے مسلم ہنگالی ادب میں اپنے نئے گہوار آہنگ اور اسلامی تعلیمات سے ایک نئی جوت جگانی شروع کی۔ پھر تو ایک باقاعدہ تحریک کے طور پر مسلم ہنگالی ادب کی ایک تحریک سی چلی پڑی اور مسلم تاریخ و ثقافت اور اسلامی رجحانات و احساسات نے ہمارے ہنگالی ادب پر اپنا اثر مرتب کرنا شروع کر دیا۔

جب تحریک پاکستان کا آغاز ہوا تو مسلمانوں میں نئی فکری بیداری کی ایک نئی لہر دوڑ گئی جس سے ادب بھی متاثر ہوا۔ ادیب قلم سے ہی نہیں عمل سے بھی اس ملی جہاد میں شریک ہوئے اور حصول پاکستان کی جہد و جہد میں انہوں نے مصعوتیں بٹھائیں اور مسلمانوں میں اپنی خودی کا احساس پیدا کیا۔

جن مسلم فنکاروں نے آزادی ملک و ملت کے لئے اپنے قلم سے بیداری کی روح پھونچی اور مسلم ثقافت کی روح کو پانے کی کوشش کی ان میں جہاں اور ممتاز اہل قلم کے نام لئے جاسکتے ہیں وہاں ہنگلا کے مشہور شاعر جسیم الدین کا نام خاص طور پر قابل ذکر ہے۔

جسیم الدین کی شخصیت سے تعارف حاصل کرنے کے سلسلے میں ان کی ابتدائی زندگی کا کچھ احوال بیان کر دینا بجا نہ ہوگا۔ موصوف مشرقی پاکستان کی دھرتی کے لال ہیں۔ ان کا گھر فریدپور کے مقام قبول خانہ میں ہے۔ وہ ۱۹۰۳ء میں پیدا ہوئے۔

بے حال ہوں میں روتے روتے

اس پار تو ہے میری کنیا

اور ندی کے اُس پار ہے تو

(جو لوٹ گیا)

اُس پار سے کیسے آئے گا تو

اب ملنے کی امید نہیں

میں گھول رہی ہوں کالی لٹیں

کالی راتوں کے سایوں نے

سارے سنسار کو گھیر لیا

آکاش پہ جتنے تارے ہیں

ہر ایک کوٹھ کر جیسی ہوں

ہر آس ملاپ کی لوٹ چکی

ہر آن بہار کی بیت چکی

یہ جیم الدین کی بنگلہ کتاب ”دیگلیا نامہ“ بھی ”دیگلیا نامہ“ کا مطلع

سے براہ راست ترجمہ ہے۔ ان کی ایک اور کتاب ”پنڈا پار“

(پنڈا۔ ندی کے اُس پار) بھی شائع ہو چکی ہے۔ جو ایسی ہی

نفیس بھائیالی گیتوں کا مجموعہ ہے۔

ان کے نیکے ہونے لوگ گیتوں کی طرح ان کی لوگ کہانیاں

اور لوگ ڈرلے بھی بڑے اچھوتے، نفیس اور مقبول عوام

ہیں اور ان کہانیوں اور ڈراموں کو بنگلہ ادب کے انمول رقی

سمجھا جاتا ہے۔

ہر بچہ کہانیاں سنتا ہے۔ جیم نے بھی اپنے بچپن

میں بہت سی کہانیاں سنی تھیں۔ جن کو وہ بھلا نہ سکے۔

اور جب بڑے ہوئے تو لا شعور سے یہ کہانیاں پھر ابھر آئیں اور

انہوں نے ان کہانوں کے تانے بانے جوڑ کر اپنے مخصوص البیلے

انداز میں پھر مرتب کر دیا۔ دو کہانیوں ”آسمان سنگھ“ اور ”دھومالا“

نے ناموں کی شکل اختیار کی جنہیں بے پناہ مقبولیت حاصل

ہوئی۔ آسمان سنگھ کی تحریر و ترتیب کی بابت خود جیم الدین

نے اپنی بنگلہ تالیف ”دھومالا“ (مٹل) میں کیفیت اس طرح

بیان کی ہے:-

”میں نے یہ نامک آسمان سنگھ، آج سے

بڑا حصہ دیہات میں ہی بسا ہوا ہے۔ یہاں کے بامیوں کی زعفر

زندگی پر یہاں کی نرم نرم مٹی اور سبک رو ندیوں کا بڑا اثر ہے اور

آپ حد ہر جائیں فضا لوگ گیتوں کی جھنکار سے ملو اور عوامی کہانیاں

اپنی دھرتی کے رنگ آہنگ سے مرتب پائیں گے جن کے ہر لول اور ہر

روپ میں یہاں کے عوام کے دل کی دھڑکنیں اور ان کی زندگی کے

سوز و گداز کی گونج نظر آئے گی۔ جیم الدین کی شاعری میں جو لوح

تاثر اور نما ہٹ آئی ہے وہ اسی ماحول کی دیں ہے۔

جیم الدین نے یوں تو بہت سے موضوعات پر لکھا ہے

مگر لوگ گیت لوگ کہانیاں اور لوگ ڈرلے ان کے مخصوص موضوعات

ہیں۔ ان کی شاعری کا سب سے زیادہ حصہ عوامی گیتوں پر مشتمل

ہے۔ اس باب میں پروفیسر سید علی حسن نے بالکل صحیح کہا ہے کہ

ان کے کلام کا محور ”میں سنگھ گیت کا“ یا ”میں سنگھ (مطلع)

کے گیت ہیں یا وہاں کی حیات پر در ومانی کہانیاں اور وہاں

کے مقبول عوام رقص۔ انہوں نے ہی ہمیں دیہاتی نعیموں سے

بھر پور طریقہ پر روشناس کرایا ہے۔ ان کے مستعمل الفاظ خصوصاً

ام اور صفتیں، تلمیذات اور تشبیہیں، سب میں عوام کی اصل

زندگی جھلکتی ہے۔ دوسرے شعرا نے بھی اس میدان میں قدم رکھا

ہے مگر جیم الدین نے عوام میں رہ بس کر اور ان کی روح میں

جھانک کر جس طرح عوام کے دل کی دھڑکنیں سنی ہیں، کوئی نہ

سن سکا۔

شرقی پاکستان کے لوگ گیتوں کی کئی قسمیں ہیں جیسے معرفتی،

مرشدی، باطل، زاری، گم بھیر اور بھائیالی وغیرہ۔ جیم الدین

نے ان تمام اقسام کی چھائی بن کی ہے اور ان گیتوں کو جمع کیا ہے۔

شرقی پاکستان کے گیتوں میں سب سے زیادہ دلنواز و دلنشیں گیت

بھائیالی گیت کہلاتے ہیں۔ جب کسی دیہاتی لڑکی کے لبوں سے

اس قسم کے گیتوں کا سرچشمہ پھوٹتا ہے تو فضا نغمہ ہی نغمہ بن جاتی

ہے۔ جیم الدین نے ایک گیت لکھا ہے۔ جس میں بیان ہوتا ہے

کہ محبوبہ اپنے پریمی کے انتظار میں ہے اور سوز و گداز سے بچونک

رکھا ہے۔ اس پند و اندیش کی یاد اس طرح دہرائی گئی ہے:-

گنگا کا کنارہ لوٹ گیا

لے دوست جدائی میں تیری

کوئی پچیس سال قبل لکھا تھا، مگر اشاعت کی نوبت نہ آ سکی۔

روپ دسے کر یہاں پیش کیا ہے، کاش! میرے یہاں جو بیٹا تھا اس وقت موجود ہوتے۔ وہ اسے سن کر کتنا خوش ہوتے۔

جسیم الدین نے دیہی زندگی پر ایک اور ڈرامہ لپی بودھو۔ "۱۹۷۱ء" بھی تحریر کیا ہے جو ۱۹۵۵ء میں "نوروز کتابستان" ڈھاکہ نے شائع کیا تھا۔ اس کے علاوہ ادبی کئی ڈرامے منظر عام پر آچکے ہیں اور ان کی ادبی دفنی صلاحیتوں کا لوہا منوا چکے ہیں شعر و نثر کا ایک عجیب امتزاج اس ڈرامہ میں بھی پایا جاتا ہے جسے "بیدیرے" (پنیرے کی لڑکی) کا نام دیا گیا ہے۔

جیسا کہ ابتدائی سطور میں عرض کیا گیا قدیم بنگالی ادب پر ہندو تہذیب و ثقافت اور ہندو تاریخ و روایات کا اثر غالب تھا اور دیگر کے عہد تک یہی رجحانات بنگالی ادب میں ایک نمایاں حیثیت رکھتے تھے مگر مسلم نشاۃ الثانیہ کا جب ایک دور شروع ہوا تو مسلم فنکاروں نے اسلامی نظریات، تاریخ اور ثقافت کا عنصر اپنے ادب میں داخل کرنا شروع کیا۔ اس کی ابتدا کلکتہ میں مسلم انشورہ ادیبوں اور شعرائے اہتمام سے ہوئی۔ ان مسلمان اہل قلم کے ناموں میں جو اس تحریک میں نمایاں حصہ لے رہے تھے مولانا اکرم خان، سید امجد علی، قاضی نذیر الاسلام اور کوئی غلام مصطفیٰ کے ناموں کا خاص طو پر ذکر کیا جاسکتا ہے جنہوں نے اپنی سیاسی مصروفیات کے ساتھ ساتھ ادبی محاذ پر بھی مسلم فکر و فن کے احیاء کی عملی کوششیں کیں جو بالآخر تشکیل پاکستان کی صورت میں منتج ہوئیں۔ ان انشورہ کی کوششوں سے ہی بنگالی ادب ایک نیا رخ اختیار کرتا ہے۔ ان لوگوں کی سہلی یہ تھیں کہ ادب کے ذریعہ ہم اپنی تاریخ کو دہرائیں، اپنے کلہو کی ہیبت سے مسلم عوام کو بیدار کریں۔

تحریک قیام پاکستان (لاہور، ۱۹۴۰ء) کے فوراً بعد، یعنی ۱۹۴۱ء میں کلکتہ کی ایک ادبی مجلس، "پوریو پاکستان..." موسائی نے اس کام کو آگے بڑھایا اور پھر ۱۹۴۲ء میں ڈھاکہ کی مجلس "پوریو پاکستان" شہید شنگدہ قائم ہوئی جس نے پہلی انجمن کے ساتھ اشتراک عمل کیا اور مسلم بنگالی ادب کو اسلامی روایات اور اسلامی مزاج سے مالا مال کرنے کے لئے ادیبوں کو ترغیب دی۔ سچا پھر مسلم پویتی ادب کی دریافت اور تحفظ کا بڑا کام اس دور میں ہوا۔ زبان کی اصلاح کے سلسلے میں عربی، فارسی اور اردو کے عام فہم مروج الفاظ کو نہایت

اس بیان سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ جسیم الدین کتنے طویل عرصہ سے عوامی ادب پر کام کر رہے ہیں اور ان کے قلم نے کیا کیا جوت جگائے ہیں۔

"آسان سنگھ" حقیقی معنوں میں عوامی ڈرامہ ہے۔ اس کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ اس میں دیہات کی ٹھیک زبان کے بجائے کلکتہ کی آسان اور عام فہم بنگلا استعمال کی گئی ہے تاکہ شہری اور دیہاتی سب ہی اس ڈرامہ کو سمجھ لیں اور اسٹیج کی عوامی ضروریات بھی پوری ہو سکیں۔

"مدھومالا" بھی ڈرامہ ہے اور بڑا ہی دلکش۔ اس کی کہانی کو ایک حسین و رنگین خواب کہا جاسکتا ہے جس میں حیات و کائنات کی تمام رنگینیاں، رعنائیاں اور دلچسپیاں سمٹ کر آگئی ہیں۔ اس ڈرامہ کی زبان میں یہ التزام رکھا گیا ہے کہ دیہات کی پوری فضا کو برقرار رکھا جائے۔ وہاں کے عوامی محاورے، سادگی اور کیف پوری طرح جلوہ گر نظر آتے ہیں۔ جگہ جگہ ایسے گیت بھی آتے ہیں جن سے فضا نغمگی سے ملو ہو جاتی اور ذہن ایک عجیب کیفیت محسوس کرتا ہے۔ "مدھومالا" بہت مقبول ڈرامہ ہے اور اس کے کئی ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔ کتاب کے دیباچہ میں خود جسیم الدین نے اس کی کیفیت اس طرح بیان کی ہے:-

"میں نے یہ ناول اپنے ایک دادا سے سنا تھا یہ میرے والد کے چچا تھے اور اس کہانی کے گیتوں کو اپنی مخصوص نواز اور مخصوص ٹونوں میں سنایا کرتے تھے۔ یہ بول سن کر میری روح جبر کرنے لگتی تھی اور میرا وجود کیفیت، سرور اور رقص و اسرار کی دنیا میں تحلیل ہو جاتا تھا۔ میں بہت چھوٹا تھا اور یہ ڈرامہ سننے سننے میں اپنے دادا کی گود میں سو جاتا تھا۔ اور اکثر سہنوں میں مجھے کہانی کی ہیروئن، مدھومالا اور اس کا ہیرو ملک کما نظر آنے لگتے تھے کہ پیار کے جھولے میں جھول رہے ہیں اور بس یہ لگتا تھا کہ ساری کائنات و فورالفت سے ہمہ نغمہ ہمہ رقص بنی ہوئی ہے۔ آج میں نے اس کہانی کو ایک نیا

کے بھی کئی مجموعے ہمارے سامنے آچکے ہیں جیسے "رکھائی"۔
 "بالوچر" (ریٹیل میڈان)۔ "وہاں کھیت مائیں گینا" (نور افروز)۔
 ان کے منظوم افسانوں میں "نقشی کا ترماٹھ" (منقش کپڑوں کا پیر) اور
 "سویان ما دیا گھاٹ" کو تو بین الاقوامی شہرت حاصل ہو چکی ہے۔
 اول الذکر کا انگریزی میں منظوم ترجمہ بھی شائع ہو چکا ہے۔ (منظر
 لے۔ ایم طفور ڈا۔ THE FIELD OF EMBROIDERED QUILT)
 ان نظموں میں بھی وہی زندگی کی عکاسی بڑے ماہر اور فنکارانہ
 طریق پر کی گئی ہے۔ کتاب مشرقی پاکستان میں پہلے ہی بہت مقبول
 تھی مگر انگریزی ترجمہ اور پھر اس کے اردو ترجمہ کی وجہ سے اس کی
 شہرت دور دور تک پہنچ گئی اور دو دوں طبقہ جی اس عظیم منظوم فنانے
 سے روشناس ہو گیا۔

جسیم الدین مشرقی پاکستان کے ان عظیم فنکاروں میں سے
 ہیں جو شعر و ادب اور ثقافت کی ہم آہنگی کے دل سے قائل، بوجد
 محبت وطن اور ملک کے دونوں بازوؤں کی یکا نگشت کے دلدادہ ہیں
 اور اپنی تحریروں اور عملی اقدامات کے ذریعے آپس کی محنت اور
 افہام و تفہیم کے راستے پیدا کرنا چاہتے ہیں اور اپنی نرے خلوص کو عشقوں
 میں بڑے کامیاب ہیں۔ ان ہی کی وجہ سے ہم مشرقی پاکستان کے
 ادب سے اور بھی زیادہ قریب آ گئے ہیں۔ اقبال پرمان کی شہرہ نظم۔
 "پوتھ بھولا کو بی" ان کی اردو سے محبت اور شاعر مشرق سے ان کی
 واپس عقیقت کی عکاس ہے۔ ان کی اور بھی کئی نظمیں حب وطن
 قومیت اور ملکی شیرازہ بندی کے موضوع پر موجود ہیں۔

"ادارہ مطبوعات پاکستان" (کرچی) نے اپنی وقیع تالیف
 "خیابان پاک" میں جسیم الدین کی ایک نظم "چرما ہے کادل" شامل کی
 ہے، (ص ۳۱) جو ان کے مخصوص عوامی رنگ، اسلوب اور فنی
 میلان کی بڑی اچھی مثال ہے اور میں اسے آخر میں قارئین کے مطالعہ
 کے لئے پیش کرتا ہوں جس سے ہمیں مشرقی پاکستان کے اس عظیم
 فنکار کے فکر و نظر کی وسعت کا کچھ اندازہ ہو سکتا ہے،

"چرما ہے کدل کا دد کسے معلوم؟

ہم اپنی خوشیوں میں، اپنے درد کے اندر

اُس کے دل کے سجد کو ناحق ڈھونڈ رہے ہیں

ہم نے اپنے درد کتابوں میں، نظموں میں

(باقی صفحہ ۱۹۳ پر)

سادگی و صفائی کے ساتھ اپنی تحریروں میں شامل کیا۔ یہ ایسے
 الفاظ تھے جو یہاں کے مسلمان ہر وقت اپنی روزمرہ زندگی میں
 استعمال کرتے تھے مگر غریبوں کی روش نے انہیں ادبی اہمیت
 کے حق سے محروم کر رکھا تھا۔

اس تحریک کے زمانہ میں یہ بھی ہوا کہ مسلم اخوت کا جذبہ
 پیدا ہوا اور ترجمہ کے ذریعہ اسلامی ملکوں اور عالمی اسلامی ادب
 کے ساتھ رشتے استوار کئے گئے۔ ڈھاکہ یونیورسٹی کی شائع کردہ
 تاریخ ادب بنگالہ (ص ۱۸۷) کے حوالہ سے یہ بات بلا خوف تردید کہی
 جاسکتی ہے کہ مسلم دانشوروں اور اہل قلم میں، جو اس تحریک میں
 نمایاں حصہ لے رہے تھے، جسیم الدین کا نام ایک ممتاز جگہ پر
 نظر آتا ہے۔

جسیم الدین نے اپنی نظموں میں ہدیت اور آہنگ کا
 تجربہ بڑی کامیابی کے ساتھ کیا ہے انسان کی برتری، اعلیٰ انسانی
 اخلاق و اقدار کی فتح، ان کے خاص موضوعات سخن ہیں۔ ان کی
 معرکہ الاثر نظم "قبر" میں یہ خصوصیات خاص طور پر نظر آتی ہیں۔
 ہر چند کہ یہ نظم موصوف کے ابتدائی کلام کا نمونہ ہے مگر وہ ان کے
 آنے والے ادبی دور کی جھلک بھی رکھتی ہے۔ طبیعت میں جو
 جدت اور خیال میں جو ندرت و روحنائی ہے اس کا سرخس اس نظم
 میں ملتا ہے۔ پرانے خیالوں کو نئے اسلوب و پیغام کے ساتھ ترمیم
 سخن بنانے کی یہ بڑی اچھی مثال ہے۔ مثلاً اس نظم میں ایک
 رسی رسیدہ دیہاتی بزرگ ہیں جو اپنی چپیتی پوتی کو اپنی زندگی۔
 ایک درد بھری زندگی — کی کہانی سناتے جاتے ہیں۔ بوڑھے
 بزرگ اس بچے کو اپنے ساتھ لے جاتے ہیں اور اپنی پوری کی قبر
 دکھاتے ہیں، پھر دوسرے عزیزوں کی قبروں پر سے جا کر ہر ایک
 کی خوبیاں گناتے ہیں اور نغمہ جی کو اعلیٰ انسانی اقدار کی اہمیت
 ذہنی نشین کراتے ہیں۔ بوڑھے کی باتوں میں بڑی صفائی، سچائی
 اور گہرائی و خلوص ہے۔ انسانی زندگی اور موت کا تاثر ایک بھرپور
 وار کرتا ہے اور میرا خیال ہے کہ بنگالا ادب میں شاید ہی کوئی نظم
 ایسی ہو جو دل پر اتنا گہرا اور اتنا دیر پا اثر چھوڑتی ہو۔ شاید یہی
 سب سے کہ جسیم الدین کی نظموں میں سب سے زیادہ
 شہرت "قبر" کو حاصل ہوئی۔ یوں ان کی نظموں

ایوانِ نرین

(اباسین آرٹ سینٹر، پشاور کی نمائش تھائی)

محققہ اعلیٰ

یہ دیکھ کر مسرت ہوتی ہے کہ ادھر کے مشہور فن کا شہزاد سلطان احمد کی مساعی سے یہ مرکز برابر ترقی کر رہا ہے اور یہاں کے زمین نوجوان طبقہ میں نقاشی سے لگاؤ پیدا ہو رہا ہے۔ نمائش میں جو تصاویر پیش ہوئیں وہ آب رنگی بھی تھیں اور روغنی بھی۔ مجھے اس نمائش میں بطور فنکار اور بطور مبصر دونوں طرح شریک ہونے کا موقع ملا تھا۔

میں اولاً خواتین فنکاروں کا ذکر کروں گا۔ آنسہ فرزانہ حنیف کی کئی نقاشیاں اس نمائش میں موجود تھیں۔ اس سے قبل ایدورڈ کالج (پشاور) میں جو نمائش فن تریب دی گئی تھی اس میں بھی ان کے کئی نقوش منظر عام پر آئے تھے۔ یوں تو فرزانہ کو ڈیزائن یا مہیت نگاری سے لگاؤ ہے مگر عہد جدید کے فنی میلان کا تقاضہ یہ کہ اب ان کے کام میں تحریریت کی جھلک بھی آئی شروع ہو گئی ہے۔ شلا ان کی ایک تصویر ”مچلی“ — جسے یہاں بہت سراہا گیا اور فنی انعام کی مستحق قرار پائی۔ اسی طرح ”آہوان صحرا“ کو بھی بہت پسند کیا گیا۔ وہ ان تجریدی نقوش میں سکون کی مدد سے اپنے خیال کا اظہار کرتی ہیں۔ ان کے نقش ”انتظار“ میں بھی گہرے احساس کی جھلک نظر آتی ہے جس کے لئے انہوں نے پیکر کی ترکیب انکھوں میں نظر آنے والی ایک کیفیت سے کام لیا ہے۔ فرزانہ کے علاوہ آنسہ ایس بخش نے بھی حصہ لیا تھا وہ کافی عرصہ سے پورٹریٹ میں مصروف ہیں۔ ان کی ایک تصویر ہے ”مجددات خاں کا مینار“ یہ مسجد پشاور کی عظیم و قدامت بلدیہ عمارت

تاریخ اپنے آپ کو دہرائی ہے۔ اس کا ثبوت ہمیں زندگی کے ہر شعبے میں نظر آتا رہتا ہے۔ خاص کر تہذیبی و ثقافتی حوالے کے لئے ہر شعبے کی داستان تو ہمیں ہر وقت ہی اس مشہور مقولہ کی صحت کا یقین دلاتی رہتی ہے۔ اس وقت بھی سابق صوبہ سرحد کی ثقافتی زندگی، بالخصوص فنی دنیا میں ایک نئی تحریک اور نیا جذبہ شوق کا رفرما نظر آتا ہے، بالخصوص نوجوان فن کاروں میں اپنی ثقافتی میراث کے تحفظ اور اسے ترقی دینے کا احساس قوی تر ہوتا جا رہا ہے۔ شاید لاکھ ٹیڑھی وجہ یہ ہے کہ یہ خطہ گندھارا آرٹ کا گہوارہ رہا ہے اور گندھارا تہذیب کا مسکن ہونے کے باعث اسے فن کی دنیا میں ہمیشہ ہی ایک ممتاز جگہ دی گئی ہے۔ آجکل گندھارا آرٹ کے نمونوں کی نشان دہی پرانے شاہکاروں کی حضری دریافت اور تاریخی آثار کی برآمدگی کے باعث یہ حصہ ملک عالمی شہرت کا مالک بن گیا ہے اسی وجہ سے یہاں کے نوجوانوں میں فنونِ جمیل کی طرف زیادہ رجحان پیدا ہو رہا ہے اور فرزندِ ان کو بھی قلم و مددِ قلم سے نئے نئے احسانِ خیالی اور نئے نئے پیکرِ جمیل دیکھیں سطحِ قلم پر منتقل کرنے میں لگے ہوئے ہیں۔ یہاں کے نوجوانوں میں فن سے کسی برابر بڑھ رہی ہے اور یہاں کی مشہور فنی درسگاہ ”اباسین آرٹ سینٹر“ نے جس کا قیام اب سے کوئی آٹھ سال قبل ہوا تھا، بڑا اہم کردار ادا کیا ہے۔ اس مرکزِ فن نے ہی پچھلے دنوں اپنی سالانہ نمائش فن کا اہتمام کیا جس میں کوئی پندرہ مصوروں نے حصہ لیا اور تقریباً اسی نمونہ فن اس نمائش میں پیش کئے گئے جن کا ذکر میں یہاں کرنا چاہتا ہوں۔

ملتان، کراچی، شاہہ خصوصی پبلشنگ ۱۹۶۳ء

غامی میڈیکل کالج کا طالب علم ہے
ضخ کو پہچانتے پریمی گفتگو کرنا نہیں
سرس چاہتا ہے۔ اس سیلاب و طغیانی
کے ناگوں مظاہر سے بڑی دلچسپی ہے۔
لیز تیز اور شوخ آبی رنگ استعمال
کے کو مسخر کرنے میں بڑی مدد دیتی ہے۔
بھی بڑا عمدہ مطالعہ ہے۔



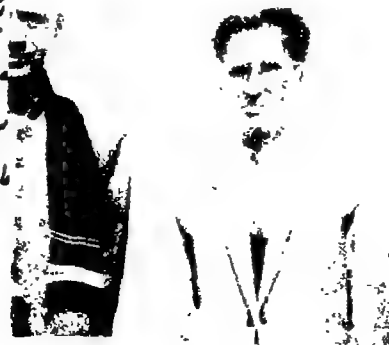
لی اعزاز: سید جعفر طاہر
ادبی انعام (۱۹۶۲ء) — طویل نظم:
”ہفت کشور“
دوسرا انعام: خدیجہ مستور:
(ناول ”آئین“)

رکشی میں مصروف ہے اور اس کے
انجمن مصنفین پاکستان کا
سکریٹری جنرل، انجمن مصنفین پاکستان، اُچی ہے۔ خاص کر غروب آفتاب
پاکستان پر کچھ بے ہوشے باولول کے
ست کے ساتھ اپنی آخری آب و تاب
کے عطا کرتا ہے۔



عام کی بابت کچھ عرض کرنے کی اجازت
اپنے چند نقوش کا ذکر کرتا ہوں —
سج پریش سے گئے تھے۔ مجھے یوں تو
اب معروضی نقش بنانے کی طرف رہتا
استعمال کرتا ہوں اور وہ بھی
انہوں کی کیفیت کا اظہار مقصود ہوتا ہے۔
ثروں کی مدد لیتا ہوں۔ میرا ایک
شی کے نمونوں سے بھی بہار تعلق برقرار

یا اور الف بلکہ کچھ ایسی ہی سوچ
ہم صفران چمن: احلاس کے موقع پر
برقی درگاہ ابا سین آرٹ سینٹر کی
پہلی کیلے، مگر نکتہ وروں نے یہ کہہ کر
بڑی اور اسی ہے۔ معلوم نہیں کہ یہ خوب
نصیب العین کے مطابق جو کچھ بھی
سانے آچکا ہے، اب یہ ان دیدہ و
مال کریں؟



سید قدرت نقوی



سید وفا

رفیق خاور



معصومیت : (روحانی نقش) : بیگم رسیده



لڑکا : (آب رنگی) : شمس : محمد صادق



نہ سوسائیتی (سور)
سامہ بھونے والی اور
فن کے حارہ نقوش

خٹک فلیچ : (روحانی نقش) : محمد عادل

آہوان صحرا : (روحانی نقش) : عزیز احمد



عہد صادقوں تو مقامی میڈیکل کالج کا طالب علم ہے، مگر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ نبض کو پہچاننے پر ہی اکتفا کرتے نہیں جانتا بلکہ نبض حیات پر بھی دسترس چاہتا ہے۔ اس سیلاب و طغیانی جو حیات انسانی کے گونا گوں مظاہر سے بڑی دلچسپی ہے۔ "فوت رٹو" میں اس نے بوتیز تیز اور رشوح آبی رنگ استعمال کئے ہیں اس نے ماحول کی روح کو مسخر کر کے میں بڑی مدد دی ہے۔ اس کا ایک نقش "پٹھان" لڑکا بھی برا عمدہ مطالعہ ہے۔

دارق خاں بھی منظر کشی میں مصروف ہے اور اس کے نقش میں بڑی جاذبیت نظر آتی ہے۔ خاص کر غروب آفتاب میں دریا کے اوپر پھیلے ہونے آسمان پر کھمرے ہونے بادلوں کے پیچھے ڈوبتا ہوا سورج بہت نفاست کے ساتھ اپنی آخری آب و تاب دکھاتا اور منظر کو ایک عجیب کیف عطا کرتا ہے۔

اگر ایک فنکار کو اپنے کام کی بابت کچھ عرض کرنے کی اجازت دی جاسکتی ہے تو آخر میں میں بھی اپنے چند نقوش کا ذکر کرتا ہوں۔ میرے کوئی چودہ نقوش اس موقع پر پیش کئے گئے تھے۔ مجھے یوں تو چہرہ نگاری سے دلچسپی ہے مگر اب معروضی نقش بنانے کی طرف رجحان ہو رہا ہے۔ زیادہ تر آبی رنگ استعمال کرتا ہوں اور وہ بھی بڑے جگے جگے جن سے ایک خوابوں کیفیت کا اظہار مقصود ہوتا ہے۔

تجربیت میں قوسوں اور دائروں کی مدد لیتا ہوں۔ میرا ایک تصور یہ بھی ہے کہ اسلامی نقاشی کے نمونوں سے بھی ہمارا تعلق برقرار رہنا چاہیے۔ چنانچہ "محرابیں" اور "الف لیلہ" کچھ ایسی ہی سوجھ بوجھ کے نمونے ہیں۔ میں نے اپنی فنی درسگاہ ابا سبیل آرٹ سینٹر کی عمارت کو بھی کینوا اس پر منتقل کیا ہے، مگر نکتہ وروں نے یہ کہہ کر مجھے چوکا دیا کہ اس نقش میں بڑی اداسی ہے۔ معلوم نہیں کہ یہ غلط ہے یا غامض؟ بہر کیف میں اپنے نصب العین کے مطابق جو کچھ بھی بنا سکا ہوں وہ اہل نظر کے سامنے آچکا ہے، اب یہ ان دیدہ و نظر کا کام ہے کہ وہ میری نگاہ کو نالی کریں؟

★

ہے اور اس کے مینار کا یہ نقش مسجد کی عظمت و رفعت کا بڑا اچھا پہلو پیش کرتا ہے۔

بیکم رشیدہ کو آواز نے اس نمائش میں پانچ نقوش پیش کئے تھے۔ وہ بھی اسی مرکز کی پرانی طالبہ ہیں اور گو مصوری کے لئے انہیں وقت کم ملتا ہے مگر پھر بھی جو نقش مکمل کر لیتی ہیں وہ خیال جذبا و درترتیب و تکمیل کے اعتبار سے بہت نفیس چمن ہوتا ہے۔ ان کی تصویر پر اپنے موضوع کا بڑا اچھا اظہار ہے۔

ایک فنی فنکار بھی ہے، زاہدہ سلیمی۔ یہاں کے فنی حلقے کی سب سے کم عمر فنکار۔ اس چھوٹی سی عمر میں اس نے فن سے اپنی دلچسپی اور اپنے فنی مستقبل کا بڑا اچھا ثبوت دیا ہے۔ نمائش میں اس کی پانچ تصویریں آئی تھیں، زیادہ تر رنگین پینلوں کا عمل تھا اور ہر نقش خوش ذوق کی جھلک تھا اور انہیں دیکھ کر یہ کہا جاسکتا تھا کہ صحیح رہ نمائی میں وہ ایک دن ضرور ایک اچھی فنکار ثابت ہوگی۔ اب میں کچھ ذکر فنکار طلبہ کا بھی کرنا چاہتا ہوں جن کے فنی ذوق کی جھلکیاں اس نمائش میں دیکھنے کا مجھے اتفاق ہوا۔

فرزانہ حفیظ کے بعد سلیم اصغر مرکز کے سب سے پرانے طالب علم ہیں اور اس اثنا میں ان کے فن میں کافی ترقی پیدا ہوئی ہے۔ وہ زیادہ تر منظر کشی کی طرف لاجع ہیں۔ منظر ہر فطرت اور مناظر قدرت سے انہیں طبعی لگاؤ ہے۔ انہوں نے اٹھارہ آب رنگی وود غنی نقوش اس نمائش میں پیش کئے تھے۔ ان نقوش میں اس نے ہر حد کی قدرتی کیفیتوں اور یہاں کے باشندوں کے چہروں کو دکھایا۔ سلیم جہاں گرو بھی تو ہے اور اسی وجہ سے وہ مناظر قدرت کو بڑی مددگی کے ساتھ اپنے کینوا اس پر منتقل کرتا رہتا ہے۔ ترتیب کی غلبہ و در رنگوں کے مسخرے استعمال کا اسے خاص خیال رہتا ہے۔ سے ناؤچی رنگ مرغوب ہے اور وہ اس کی ذہنی افتاد کا خوب سا قند دیتا ہے۔ "غروب"، "مخزن" اور "آدہ سرا" تو ناظر کو اذکم ہی بات سمجھاتے ہیں۔

”کون ہے جو نہیں ہے حاجتمند؟“

امید حسن سنیاں

کی زیادہ سے زیادہ مرفوہ مالی کی افیل ہوں، عوام کی ذاتی طور پر حصول معاش اور مال و زر کو بڑھانے کی کوششیں بجا و درست۔ انہیں اسکاں بھر اپنی ثروت کو بڑھانے کی کوشش کرنی چاہئے لیکن حکومت کی حقیقی غرض مفاد اور فائدہ ہی ہے۔ کہ وہ ان کی اوقات کو بہتر بنانے کی تدبیریں سوچے، انہیں مل میں لائے اور آمدنی بڑھانے میں سب کی مدد کرے۔

سوال یہ نہیں کہ نہ پیدا کیا جائے بلکہ اس کو بڑھایا کیسے جائے۔ تاکہ ہر انسان کی آمدنی بڑھے اور جہاں چھوٹے بڑے شہری آمدنی میں اضافہ سے زیادہ خوش حال ہوں وہاں ساری قوم میں بھی اس خوش حالی کا کس دکھائی دے۔ دولت چلتی پھرتی چھاؤں ہے۔ اور یوں ہی لوگ باگ چاہتے ہیں کہ دولت چلتی پھرتی ہی رہے، مگر بعض خدا کے بندے تو ایسے ایسے طریقے اختیار کرتے ہیں کہ چلنا پھرنا تو کجا وہاں گئے لگتی ہے۔ وہی حالی کی بات۔ انہیں کرتے خست لٹانے میں اس کے!

کون نہیں چاہتا کہ مدد پر ایسے کاموں پر لگایا جائے جی سے وہ بڑھ چڑھ کر ان کے ہاتھ واپس آئے تاکہ وہ بھی خوش و خرم ہوں اور ان کے عزیز اقربا بھی۔ اور وہ خوش حال تو ساری دنیا خوش حال۔ مدد پر شکیں خرچ کرنا، بچانا اور اس کو بڑھانا، یہ سب اپنی اپنی جگہ ضروری ہیں۔ اور ہمیں ہر وقت اس تاک میں رہنا چاہئے کہ کس طرح وہ بڑھے کیلئے کاموں پر لگائیں کہ زیادہ سے زیادہ فائدہ ہو۔

مدد پر بڑھانے کا ایک طریقہ تو رقم آئے وہ سیرا زار دیکھتے ہی رہتے ہیں۔ کوئی ملازمت یا پتہ باز راستے میں کھڑا ہو جاتا ہے۔ اور پاک چھپنے میں ایک کے دو تین چلندو بے بنا دیتا ہے۔ یا کوئی پیرقہ بیک چاندی کے زیور کو سونے کا زیور بنانا پھر کہے اور اس طرح سادہ لوح لوگوں کو تھک کر نوادگیارہ ہو جاتا ہے۔

شعبہ بازی سے قطع نظر ایک طلسمی طریقہ بھی ہے۔ یعنی ”کھل سم سم“ کہلاؤ خزانوں کے دوا دے آپ ہی آپ کھل گئے۔ یا

”ہم نے یہ مانا کہ دلی میں رہیں کھائیں گے کیا“ غالب نے یہ کہا ہی تو کہا تھا۔ قیو ظم انفع ہی کے بارے میں بھی۔ مگر غم جاناں کے ساتھ ساتھ غم وعداں بھی تو ہے۔ اس سے نہ کبھی مغرور ہو نہ ہوگا۔ ہمارے اہل الا با! حضرت آدم سے بھی تو خوشنہ گندم ہی نے باغ بہشت چھڑایا تھا۔ اور اب کون ہے جو حاجتمند نہیں؟ امیر ہو یا غریب، بادشاہ ہو یا فقیر، سب کے سب کسی نہ کسی طرح ضرورت حاجت مند ہیں۔

مگر کس کی حاجت مدد کرے کوئی؟ ہم یہ نہیں مانیں گے۔ آپ نے سنا ہی ہوگا۔ کار ساز زباں فکر کا رہا۔ شیخ سعدی کے صدمہ سال بچے غالب کا بہت جیسے جواب دے دیا تھا۔

اے کریمے کہ از خزانہ غیب

گہر و ترسا و ظلیفہ خود داری

دوستان را کجا کنی محروم

تو کہ بادشہاں نظر داری

اور یہ کہ :

ہ ناداں آں چنان روزی رساند

کہ دانا اندراں حیراں بساند

اور صرف کار ساز حقیقی ہی نہیں، اُس کے زیر سایہ ہزاروں دنیاوی کار ساز بھی تو ہیں جو شب و روز و ماہ و سال خلق خدا کی حاجت مدد کر رہتے ہیں۔ تاکہ خدا بقول شخصے، قاضی الحاجات ہے جس سے آسودگی و خوش حالی میسر آتی ہے لیکن اس کا سر و سامان کرنے والے بھی تو موجود ہیں۔ دنیا کی اکثر ملکیتیں کیا ہیں؟۔ رفاہی ادارے جو کہ مقصد اپنے شہریوں کے لئے زیادہ سے زیادہ آسائشیں اور راحتیں مہیا کر رہے۔ وہ اپنے سینکڑوں کارکنوں کی آنکھوں سے دیکھتے اپنی زیر نگرانی بندگان خدا کی حاجتوں کا سرور لگاتے اور پھر صدمہ پیدا مفرار باپ فکر و نظر کے ذریعہ اسی تدابیر اختیار کرتے ہیں جو ان کے دایرہ تکلیفوں کا

درحقیقت ہماری قومی کامیابی ہے۔ اور قومی خوشحالی کا ایک بہت ہی اہم ذریعہ۔ ایسے ادارے بھی، ظاہر ہے، روپے پیسے ہی سے چل سکتے ہیں جسے عام طور پر سرمایہ کہا جاتا ہے۔ یہ سرمایہ جس شخص کی ذرخف سے حاصل ہوتا ہے۔ قطرہ قطرہ بہم شورو دریا۔ چھوٹے بڑے شہری اپنی اپنی استطاعت کے مطابق جتنے خریدتے ہیں اور ان سے جو سرمایہ ملتا ہے اس سے ہر قسم کے کاروباری ادارے چلتے رہتے ہیں۔ مگر ان حصوں کی قدرت کیساں نہیں رہتی۔ اگر وہ پیش کے حالات ان پر برابر ڈالتے رہتے ہیں۔ اور انہی سے مارکیٹ کے حالات پیدا ہوتے ہیں۔

یہ وہ چیز ہے جسے اچھے اچھے ماہرین اقتصادیات بھی مشکل ہی سے سمجھ سکتے ہیں۔ چہ جائیکہ عام لوگ، خاص کر ان بڑے لوگ انہیں سمجھ سکیں۔ اگر وہ کسی کاروبار میں روپیہ لگائیں یا جتنے خریدیں تو خبر نہیں ان کا کیا حشر ہو۔ کیا معلوم بہتر ہونے کی ہر کوشش ہی انہیں نے فوجے اور جھوٹا بہت سرمایہ یا بچہ پونجی ان کے پاس ہے وہ اسے بھی کھو بیٹھیں۔ کون نہیں جانتا کہ سہہ کھیلنے سے کتنے لوگ تباہ ہو جاتے ہیں۔ یہ تو ایک طرح کا جوا ہے۔ سوچ سمجھ کر جتنے خریدنے میں کوئی ہدایت نہیں لیکن عام ناواقف انسانوں کے لئے یہ اندیشہ سے خالی نہیں ہندو زرعی کشکال کا لطف کسے یاد نہیں کسی شخص کے پاس ایک ہی اشرفی تھی۔ اس نے کسی مہتر کے یہاں اشرفیوں کا اتنا بڑا انبار لگا دیکھا۔ اس نے کہا اس سے بہتر قسمت آزمائی کا موقع اور کیا ہوگا۔ آؤ دیکھنا تاؤ، جھٹ اپنی اکلوتی اشرفی اس ڈھیر پر پھینک دی اور لگا پڑ پڑ دیکھنے کو کب جا دو کے زور سے وہ دھیر دھیر اڑ کر اس کی طرف آ جاتا ہے۔ گریٹ! اس خیال است و محال است وجوہ " نہ وہ ڈھیر ہی آیا، نہ وہ اشرفی ہی پھینک آئی۔ اور وہ حضرت خالی ہاتھ ملے رہ گئے۔ پھر کسی نے سمجھایا۔ نہ اس طرح زکوٰۃ نہیں کھینچا کرتا۔ اس کے ادھی عقل مند نہ طریقے ہوتے ہیں۔

یہی کیفیت سرمایہ لگانے کی بھی ہے۔ کہیں وٹا کس کو نہ بازار کے حالات کا علم ہوتا ہے، نہ سرمایہ کاری کے اندیشہ کی خبر۔ یہ دیکھتے ہوئے حکومت نے ایک بہت ہی عمدہ قدم اٹھایا ہے۔ یہ کہ جس طرح دوسرے ترقی یافتہ ملکوں — امریکہ، جرمنی، برطانیہ، سوئٹزرلینڈ — میں اس مقصد کے لئے ماہرین کے ادارے موجود ہیں، اسی طرح ہمارے یہاں بھی سرمایہ لگانے کا ادارہ قائم کیا جائے، جس کا کام یہ ہوگا کہ سرمایہ لگانے والوں کی خاصی بڑی تعداد کو، خصوصاً وہ جو اپنی جیب میں ایک ہی اشرفی

الہ دین نے جا دوئی چراغ کو گرگڑا اور حضرت جن نے دنیا جہاں کی دولت اور صل و جوا ہر لاکھ قدروں میں ڈھیر کر دئے۔

یہ طریقے بھی شیخ جلی کی تدبیروں سے زیادہ نہیں ہیں۔ ایسے طریقوں سے کیا فائدہ؟ ہمیں تو ایسے طریقے آزمائے چاہئیں جو محفوظ بھی ہوں اور فائدہ مند بھی۔ اگر کم سوچیں اور اپنے گرد و پیش نظر ڈالیں تو ایسے طریقے دستیاب ہونا مشکل نہیں۔ ہم خود ایسے طریقے نہ سوچ سکیں تو جیسا کہ کچھ بیان کیا گیا ہے، دوسرے کارسان تو موجود ہیں۔ اور سب سے بڑھ کر خود حکومت موجود ہے جو عوام کو برابر ایسے طریقے سمجھاتی رہتی ہے۔ سیدنگ مرٹھلوں کا تو آپ کو غالباً پہلے ہی علم ہوگا۔ انعامی بانڈوں کو دیکھئے یہ کتنے مفید ثابت ہوئے ہیں۔ ان کی بدولت ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے کتنے ہی لوگ لالال ہو گئے۔ اور مزید یہ کہ اصل رقم حیل کی توں سلامت رہی۔ ایسی ہی ایکس ہیں جن سے ہم آج ڈھیروں زرعیہ دولت کما رہے ہیں۔ یہ نہ سمجھئے کہ اس میں دوسروں یا حکومت ہی کا فائدہ ہے۔ دوسروں کی بھلائی اور حکومت کی اچھائی بالآخر ہماری اپنی ہی بھلائی اور اچھائی نہیں تو اور کیا ہے؟

ہم خوش قسمت ہیں کہ آج حکومت ہماری اپنی حکومت ہے۔ عوام کی حکومت، ایک خیر خواہ حکومت جو عوام کی حالت کو زیادہ سے زیادہ بہتر بنانے میں برابر کوشاں ہے جس کا واضح ثبوت وہ بے شمار منصوبے اور تدبیریں ہیں جو اس نے رفا و عامہ کی خاطر اب تک اختیار کی ہیں ظاہر ہے کہ اقتصاد کا مسئلہ زمانے میں بہت ہی اہم بنیادی مسئلہ رہا ہے۔ اور آج کل کے مشینی اور سائنسی زمانے میں تو یہ قوموں کی خوشحالی اور بڑائی ہی کا مسئلہ نہیں بلکہ ان کے جینے مرنے کا سوال ہے کسی نے نہ کوئی نئی قوت اضیٰ الحاجات نہیں کہا۔ اسی لئے ہماری حکومت نے ملکی معیشت ہی کو بہتر سے بہتر بنانے کے لئے ایک اقتصادی کونسل قائم کر رکھی ہے۔ اور اس کے مشورہ، نیز دیگر مشیران کار کی صلاح کے مطابق وقتاً فوقتاً نئی تدبیر اختیار کرتی رہتی ہے۔ انعامی بانڈوں کا شمار ایسی ہی نفع بخش تدبیر میں ہے۔ اور اب حال ہی میں ایک اور بہت اچھی تدبیر بھی کی گئی ہے جس کی بڑی ضرورت تھی اور جس سے بہت ہی عمدہ نتائج رونما ہونے لازم ہیں۔

مشرقی پاکستان ہوا مغربی پاکستان۔ ان میں بے شمار صنعتی، تجارتی اور کاروباری ادارے ہیں، جو اپنے اپنے طور پر ملکی ضروریات کو پورا کرتے اور ملکی معیشت کو بہتر بنانے میں مدد دیتے ہیں۔ ان کی کامیابی

یعنی بہت تھوڑا سا سرمایہ رکھتے ہیں، جنہیں اترے چڑھے بھاؤ شیر مارکیٹ فائدے نقصان کے امکان وغیرہ کا کوئی علم نہیں ہوتا، انہیں حصص اور امانیت یعنی سیکیورٹیوں کی خرید میں حصہ لینے کے مواقع سے بہرہ ور کیا جائے۔ وہ خود ان کی خرید و فروخت کرنے کی بجائے اس ادارہ میں جس کا پورا نام "نیشنل انویسٹمنٹ ڈیپازٹ ٹرسٹ" ہے، اپنی اپنی رقم جمع کر دیا۔ اس طرح سرمایہ کا بہت بڑا ذخیرہ فراہم ہو جائے گا۔ یہ سرمایہ ان لوگوں کی تحویل میں ہوگا جو حصص و امانیات میں بھی سرمایہ کاری کے مواقع سے پوری پوری واقفیت رکھتے ہیں۔ بالفاظ دیگر وہ اس نوعیت کے کاروبار کے ماہرانہ خصوصی ہیں۔

اس مشترکہ فنڈ کے عملاً استعمال کی صورت یہ ہے کہ سرمایہ متفرق قسم کی عمارت میں لگایا جاتا ہے تاکہ چھوٹے درجے کے سرمایہ کار کا دوسرا ایک ہی آدمی نہ لگے جس سے اس کو نقصان کا احتمال ہو۔ تھوڑی بونڈوں کے لئے تو معمولی نقصان بھی بہت ہے۔ اسلئے یہی بہتر ہے کہ سرمایہ کسی ایک جگہ نہ لگا جائے۔ اس طرح سرمایہ کار کو یہ سہولت ملتی ہے کہ وہ پونٹ ٹرسٹ کے ذریعہ گونا گوں سلسلوں میں سرمایہ لگائے۔

یہ بلاشبہ ایک بڑا سنہری موقع ہے اور آپ کو یہ جاننے میں یقیناً دلچسپی ہوگی کہ اس اسکیم کی پوری تفصیلات کیا ہیں۔ آئیے ہم اس پر ایک سرسری نظر ڈالیں۔

کسی پونٹ ٹرسٹ میں دو فریق ہوتے ہیں۔ ایک بندوبست اور دوسرا کارکنانہ دلی کا فیصلہ۔ انتظامی فریق حقیقت ایک انتہائی کمپنی ہوتا ہے۔ اور دوسرا ٹرسٹ بنک۔

یہ دونوں فریق مل کر ایک دستاویز مرتب کرتے ہیں جس میں دونوں کے اختیارات اور وظائف دیے ہوتے ہیں۔ موٹی بات یہ ہے کہ انتظامی کمپنی ٹرسٹ کی سرمایہ کاری کا انتظام کرتی ہے۔ اور ڈویڈنڈ یا پونٹ سرٹیفکیٹوں کی واپسی کے بارے میں اناؤنسمنٹ کرتی ہے۔ اس کے برعکس بنک، ٹرسٹ کے فنڈ اور دیگر املاک کا تحفظ ہوتا ہے۔

یہ بات دلچسپی سے خالی نہیں اور سرمایہ کاروں کے لئے بڑا محکمہ افزا بھی ہے کہ میر جس ملک میں اس طرح کے ٹرسٹ قائم کئے گئے ہیں وہ بہت کامیاب اور چھوٹے سرمایہ کاروں کے لئے نعمتِ عظمیٰ ثابت ہوئے ہیں بعض ممالک میں تو وہ ایسے مالیاتی ادارے ثابت ہوئے ہیں جو اور سب اداروں سے زیادہ تیزی کے ساتھ ہر دان چڑھے اور دونوں میں کہیں کہیں پہنچ گئے۔

یہاں تک کہ ان میں دلچسپی لینے والے سرمایہ کاروں کی تعداد ہزاروں تک پہنچے۔ اس سلسلہ میں اکثر پونٹ ٹرسٹوں کا ریکارڈ حیرت انگیز ہے چنانچہ یہ حقیقت ہے کہ پچھلے دس سال ہی کے عرصہ میں بعض پونٹوں کے اثاثے ۵۰ فیصد کی حد سے بھی اس پانچ گونے ہوئے ہیں۔

ایسے پونٹوں کی کارکردگی کے لئے بے انتہا محاذ قسم کی مگرانی لازم ہے۔ بالخصوص ہمارے ملک میں جہاں سرمایہ کی مارکیٹ پوری طرح ترقی یافتہ نہیں ہے۔ اور غیر مستند رستوں سے حصول سے بچنا سب سے مشکل ہے۔ دوسرے ملکوں میں پونٹ ٹرسٹ بھی ادارے ہیں لیکن ہمارے ملک کی بات اور ہے۔ اس میں سرمایہ کاری کی مارکیٹ ابھی ابتدائی نشوونما کی حالت میں ہے۔ اس لئے ضروری تھا کہ اس کی عنایت کا حکومت ہی کے ہاتھ میں رہے۔ چنانچہ ایسا ہی کیا گیا ہے۔ آگلاس کو حکومت کے ہاتھوں میں نہ رکھا جاتا تو اور کئی باتوں کی طرح جن کا ہم سب کو تجربہ ہے قحطِ خودیا اور دوسرے بد قماش لوگوں کی بنائی۔ ہر طرح انہیں کی چابھنی ہوتی، دستاویز کمپنی جو بڑے بڑے صنعت کاروں اور ملک کے اہم مالی اداروں پر مشتمل ہے قطعاً ایک خدائی ادارہ ہے نہ کہ منفعت کو ش ادارہ۔ مدعا یہ ہے کہ ہمارے ملک کے جو لوگ مال و دولت سے بہرہ ور ہیں وہ اپنے کم حیثیت بھائیوں کو زیادہ خوش حال بننے میں مدد دیں۔ اور اپنی دولت کا کچھ حصہ اس کا بیڑہ میں لگائیں۔

ظاہر ہے کہ اس اسکیم میں بھی زیادہ سے زیادہ لوگ شریک ہوں گے۔ اور دوسری اسکیموں کی طرح اس سے بھی روپیہ گردش میں آئے گا یعنی ایک ہاتھ سے نکل کر دوسرے ہاتھوں میں جائے گا، گھومے پھرنے لگا۔ اور ایک ہی جگہ جم سمٹ یا بند ہو کر رہنے کا نہیں ہو جائے گا۔ یہ کاروبار، تجارت اور صنعتوں وغیرہ میں لگ کر اور بھی دولت پیدا کرے گا۔

اس طرح اس لوگوں کی دولت بھی ان کے پاس بند نہیں رہے گی بلکہ باہر اچھے اچھے صنعتوں میں کام آئے گی۔ اس سے سب کو فائدہ ہوگا۔ اور اہل ثروت بھی اپنے دھن دولت میں ایسے لوگوں کو حصہ دار بنائیں گے جو زیادہ نہیں کما رہے ہیں۔ اس طرح ہر لحاظ سے توازن ہی توازن پیدا ہوگا۔ اور یہ سب آپ کے اپنے ہاتھوں میں ہے۔ آپ چاہیں تو اپنی طاقت بھی سنوار سکتے ہیں اور دوسروں کی اوقات بھی بہتر بنا سکتے ہیں۔ ویسے کام کے لئے تو ہم اپنے ہاتھ روک کر کچھ بچا بھی لیں اور اس بچٹ کی رقم ہاتھوں میں کو انویسٹمنٹ سرٹیفکیٹوں پر لگا دیں تو دونوں میں کہیں کہیں پہنچ جائیں گے۔

کے مطابق، معینہ میعاد پر تقسیم کر دی جائے گی۔
۱۷) حکومت پاکستان نے ان رقم کو ٹیکس معاف قرار دیا ہے جو یونٹ سرٹیفکیٹوں پر لگائی گئی ہوں۔
۱۸) صوبائی حکومتوں نے یونٹ سرٹیفکیٹوں کی فروخت و انتقال کو اسٹامپ فیس سے مبرا قرار دیا ہے۔

۱۹) حکومت نے یہ بھی منظور کیا ہے کہ ہرنے اجراء سے سرمایہ پر یہ شرط غائد کی جائے کہ اس میں نیشنل انوٹمنٹ لمیٹڈ کے لئے معقول رقم شامل ہو۔ اس سے یونٹ ہولڈروں کی ایک جڑی تعداد کو یہ موقع ملے گا کہ وہ نئے سرمایوں کے اجراء سے سرمایہ میں جو اضافہ ہو اس سے فائدہ اٹھائیں۔

ظاہر ہے کہ ایسے عمدہ منصوبے کا جلد از جلد جاری کر دینا ہی مناسب تھا۔ تاکہ عوام اس سے فی الفور فائدہ اٹھا سکیں۔ لہذا ہمارے وزیر خزانہ جناب محمد شعیب نے بڑی مستعدی اور ذرا دلنشینی سے کام لیتے ہوئے گزشتہ سال ختم ہونے سے پہلے ہی ۲۶ دسمبر کو اس نہایت اہم اور منفعت بخش اور داد کا اقدار کروایا۔ اور اب مختلف دیکڑوں میں فروخت کا سلسلہ بڑی تیزی سے شروع ہو گیا ہے۔ یہ ایک نہایت عمدہ اقدام کا بروقت آغاز ہے اور یقیناً کہا جاسکتا ہے کہ پاکستان کا ہر شہری یہ سنتے ہی کہ اس قسم کا ٹریڈ قائم ہو چکا ہے، اس سے گہری دلچسپی محسوس کرے گا۔ اور چند افراد ہی نہیں بلکہ ساری قوم اس سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کرے گی۔ بلاشبہ اس کے نتائج نہایت معرنا دار ثابت ہوں گے۔ ہمارے ملی خواہوں کی ایک اور شاندار تعمیر ہے۔

غالب کی تصویر آفرینی : بقیہ صفحہ ۲

میں دیدہ و زاہد ہوں، ابتداً صرف مجھ ہی وقت پیچیدہ بیانی اور فکر تخیل ان کا خاص رجحان بن گیا ہے۔ یہ ان کی تصویر سازانہ میں بھی ظاہر ہو رہے اور وحشت الحال میں بھی۔

مجھے کچھ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ غالب کی ان ذہنی خصوصیات نے ان کی تصویر سازی کو بہاؤ انفرادیت اور نہایت تخیل سے مل کر ان کا عالم تصویر کی جلوہ گری پر کچھ پہرے بھی بٹھا دئے ہیں۔ مقابلہ و موازنہ کچھ انہی عادت نہیں مگر تیر کی تصاویر میں جو وسعت ہے، اس سے ان کے حق میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ وہ مشاہدات کے وسیع تر رقبے کے ناظر اور مبصر تھے جو اگرچہ غالب کی دسترس سے باہر تھا مگر غالب نے اپنے ذہنی رجحان کی وجہ سے اس کو اپنے لئے قابل اعتبار بنا لیا۔

انویٹمنٹ یونٹ کی اسکیم اور اس طرح کے لوگوں کے لئے تو بہت ہی مفید ہے۔ مگر نہیں جانتا کہ توسط طبقہ ہی دراصل ہماری قوم اور ملک کی ترقی کی ہڈی ہے۔ یہ مضبوط تو وہ مضبوط، یہ کمزور تو وہ کمزور۔ اور جب اس طبقہ کو طرح طرح کی اسکیموں سے فائدہ پہنچے گا اور یہ زیادہ آسودہ و خوش حال ہوگا، تو بالآخر ساری قوم ہی مضبوط ہو جائے گی۔

ہمارے یہاں اس منصوبے نے جو صورت اختیار کی ہے۔ اس کے مطابق انتظامی کمپنی کا نام ہے "نیشنل انویٹمنٹ ٹرسٹ لمیٹڈ" جس کی شرکت محدود ہے۔ اس کے تمام شرکاء نے کمپنی کے ایک ایک لاکھ روپے کے حصے خریدے ہیں۔ اس منصوبے کی نمایاں خصوصیات حسب ذیل ہوں گی:
(۱) ٹرسٹ کے یونٹ سرٹیفکیٹ بینک دولت پاکستان اور اس ایجنٹ۔ حبیب بینک لمیٹڈ، مسلم کرشل بینک لمیٹڈ اور یونائیٹڈ بینک لمیٹڈ۔ فروخت کریں گے۔ چنانچہ یہ سرٹیفکیٹ ان بینکوں سے حاصل کئے جاسکتے ہیں۔ اس اسکیم کو مشرقی پاکستان میں وسیع طور پر پھیلانے کے لئے ایٹرن مرکٹسٹل بینک لمیٹڈ کو بھی ایجنٹ مقرر کیا جا رہا ہے۔ سرٹیفکیٹ ابتدائی مرحلوں میں چیدہ چیدہ مرکزوں سے فروخت کئے جائیں گے۔ اگر ضرورت محسوس ہوئی تو بعد میں اس مقصد کے لئے اور مرکز بھی قائم کئے جائیں گے۔

(۲) سرٹیفکیٹ ۵، ۱۰، ۱۰۰، ۱۰۰۰ اور ۱۰۰۰۰ روپے کے یونٹوں پر مشتمل ہوں گے۔ کسی یونٹ کی قیمت فروخت ابتدائی مرحلے میں ۱۰ روپے ہوگی۔

ابتدائی دور کے بعد قیمت، ٹرسٹ کے اثاثے کے مطابق اڑھائی میں قیمت کے مطابق بدلتی رہے گی۔

(۳) انتظامی کمپنی نے خصوصی رعایت کے طور پر ابتدائی دو برس سرٹیفکیٹوں کی فروخت پر ابتدائی مجرا کی وصولی معاف کر دی ہے۔ اس ابتدائی مجرا میں سے فروخت کرنے والوں کو کمیشن واجب الادا تھا۔ اس امر کے پیش نظر فروخت کرنے والے بینکوں نے یہ منظور کیا ہے کہ وہ یہ کام بلا معاوضہ کریں گے۔

(۴) جب بھی کوئی چاہے ٹرسٹ کے یونٹ سرٹیفکیٹ، ٹرسٹ کے منظور کردہ ایجنٹوں کو واپس کر کے نقد قیمت وصول کر سکتا ہے۔ اگر اس دوران میں یونٹوں کی قیمت بڑھ گئی ہو تو فروخت کرنے والے کو بڑھی ہوئی شرح کے مطابق رقم دی جائے گی۔

(۵) انتظامی کمپنی وقتاً فوقتاً یونٹوں کی فروخت اور دوبارہ قیمتیں خریدیکا اعلان کرتی رہے گی جو ٹرسٹ کی سرمایہ کاری کی قیمت پر موقوف ہوں گی۔

جسیم الدین، بقیہ صفحہ ۱۲۷

لکھ ڈالے، دنیا نے پڑھے، دنیا نے جلنے
لیکن اٹھ چڑھا ہے کے دکھ کی باتیں
کس کو خبر کے معلوم
اُن کو ہنسی کی تان بتا سکتی ہے
چرواہے کے اٹھ رول کی لوح کے اوپر
صدیوں کا اک درد دکھا ہے
اس کو ہمارے شاعر نے کب شعر کے اندر نظم کیا ہے۔
میں اس درد کی — چرواہے کے دل کی تڑپ کا
کھوج نکاؤں

جب دھرتی پر کان دھروں میں
دھرتی کی آواز، زمین کے دل کی دھڑکن
مجھ سے بات کیا کرتی ہے۔

شام گیت لکھا کرتے ہیں بر ندان کے
دیوتاؤں کی عجیب کرامتوں کی باتیں
بادشاہوں اور شہنشاہوں کے دکھ سکھ کی
لیکن کھیت کے بیٹوں کے دل کا بھید کسے معلوم!

جسیم الدین نے ملک کے نو بہاؤں کو بھی لپٹنے کلام کے نول
خزانوں سے محروم نہیں رکھا ہے اور بچوں کے ادب کو مالا مال کرنے
کے لئے کئی اہم کتابیں ان کے قلم سے نکلی ہیں۔ بچوں کے ادب کے سلسلے
میں بھی ان کی ذہانت اور تحریر کی دل آویزی نمایاں ہے۔ ہر کتاب
بچوں کی نفسیات، مزاج اور افتاد طبیعت کو سامنے رکھ کر لکھی گئی ہے۔
میں ”بجاشو“ اور ”پیشیرانشی“ (ایک پیسہ کی بالسی) بچوں میں بڑے
شوق سے پڑھی جاتی ہیں۔

جسیم الدین بڑے ملنا زہمت ہی نہیں مکھ اور دل موہ لینے والی
شخصیت کے حامل ہیں۔ ان کے مزاج میں گھنگنی اور باتوں میں رس ہوتا ہے۔
جنگل ادب طنز و مزاح کے سد بہار گونوں سے بھی خالی نہیں اور جسیم الدین نے
اپنی باغ و بہار طبیعت کے جوہر اس میدان میں بھی دکھائے ہیں۔ ان کے
فکاہی افسانوں کا ایک مجموعہ ”جنگلیں رائیہ گلہو“ (ہنسی کی برنگی کہانیاں)
بھی شائع ہو چکا ہے اور ان کی طبیعت کی گھنگنی، لطافت اور البیلا پن ان کہانیوں
میں جا بجا جھلکتا ہے بلکہ بقیہ قاضی مہر حسین یہ تحریریں ”ہمارے مزاج و ذہن
سرایہ میں ایک بیش قدر اضافہ ہیں“۔

سنہری بالوں والی شہزادی، بقیہ صفحہ ۱۲۸

اس کے کہا، ”اے موتی! میری بادشاہت واپس مل جائے؟“
اس نے دیکھا، وہ شاہی لباس میں کھڑا تھا اور درباریوں
سائے میں مرجھانے کھڑے تھے۔ اس نے کہا: ”اے موتی! میری سونے کے
بالوں والی شہزادی واپس مل جائے؟“

اس نے دیکھا، سونے کے بالوں والی شہزادی اس کے سامنے
کھڑی تھی۔ اس نے بڑھ کر اسے گلے سے لگا لیا۔ اور جب یہ بچہ
ہو چکا۔ سو داگر کے بیٹے کو اس کی بادشاہی مل گئی، اس کے سونے کے
محل واپس مل گئے، اس کی سونے کے بالوں والی شہزادی اس کے
پاس آگئی تو طوطا ادب نے اس سے کہنے لگے: ”اے بادشاہ! اب ہمیں
رضعت کر دے!“ اس نے حیران ہو کر ان کی طرف دیکھا تو وہ بولے:
”ہم نے تم سے وعدہ کیا تھا کہ ہم تمہیں اپنی قیمت دلائیں گے۔
ہم نے وہ وعدہ پورا کر دیا۔ اب ہمیں جانے کی اجازت دے!“
اس نے انہیں بہت روکا مگر طوطا اور بٹی نہ ملے اور وہ اس
جل دے۔

اس واقعہ کو بیتیہ ہوئے صدیاں گز گئیں مگر سنا ہے لوگ
اب بھی بتائیں اور طوطے اس لئے پالتے ہیں کہ شاید کہیں وہی طوطا باقی
مل جائے جو سانپوں کے بادشاہ کے دے ہوئے موتی والی انگشتری کے
بارے میں جانتے ہیں۔ کچھ لوگ یہ بھی کہتے ہیں کہ سو داگر کے بیٹے کے
مرنے کے بعد وہ موتی پھرا پنے آپ سانپوں کے بادشاہ کے پاس
واپس پہنچ گیا تھا۔ اسی لئے سپرے سانپ کپڑے ہیں کہ شاید
وہ سانپ پھرا پنے باپ سے ناراض ہو کر چلا آیا ہو!

ادارہ کو تمام پاکستانی اہل قلم کے حالات
درکار ہیں۔

التماس ہے کہ وہ اپنے حالات جلد اطلاع
ہمیں ہتیا فرمادیں۔

(ادارہ مطبوعات پاکستان پوسٹ بکس ۱۱۱)

”راہ سخن واکرے کوئی“

د-خ

ہے۔ اور ستاروں اور دریا کی روانی کی وہ تصویر بھی جو اس کے بعد پیش کی گئی ہے۔ اتنی سی بات تھی جسے افساد کر دیا۔ افسانہ کی لئے یہیں ختم نہیں ہو جاتی۔ بلکہ اس کا سلسلہ کچھ اور آگے بڑھتا ہے۔ ”اگر میں تناسخ کا قائل ہوتا“ تو ضرور کہتا۔ یہاں بھی مقرر کے راوی کا روپ جانے میں تناسخ ہی کی کرشمہ آرائی ہے۔ اسکے بعد سرورق کے ان اشعار کی صداقت میں کوئی شک نہیں رہتا کہ

خورشید کو کچھ حاجت زیور نہیں زہار
پھولوں پہ کوئی عطر لگائے تو بے بیکار
اعلیٰ ہے اگر جنس تو کیا حاجت اظہار
خود مشک ہو خوشبود نہ خوشبو کہے عطار
ٹائپ میں طبع شدہ یہ رسالہ جو عطار کی خدمات سے بے نیاز
ہے مصنف سے ۱۳/۱۱/۱۳۷۱ھ جہاد راولپنڈی سے دستیاب ہو سکتا ہے۔

دور جدید کے عنوان — حالی، کی یاد اب بھی تازہ ہے۔ جس کی ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ اپنے پر مغال، سرسید علیہ الرحمہ کی طرح وہ بھی ہماری اچانکے ثنائیہ کا نفس نا طبق تھے — تنقید میں ایک نئے تصور اور دستور العمل کے بانی مبنی۔ نثر میں ایک خالص نثری اسلوب کے حامل۔ اور شاعری میں اولین شخص جس نے وہاں زخم سے راہ سخن واکرے — زندگی ہو، یا تنقید یا ادب، وہ بدستور زندہ ہیں اور ان کا اثر کارفرما۔ انہوں نے تنبیہ کی تھی کہ..... حالی نہ چیرتا تھا۔ دور خزان کا قصہ فصل گل و سمن میں۔ آج جب بہار ہی بہار ہے۔ حالی شیوا بیابان کو یقیناً دور خزان کی شکایت نہ ہوئی۔ اور اگر بعد کے حریفانی بچہ فگن کی اکھاڑ کھاڑ کے باوجود وہ زندہ ہیں تو ان کے ساتھ ان کی صف کے دوسرے لوگ بھی زندہ ہیں۔ ان کی پورے برابر تانہ ہے سب سے پہلے سر سید رح۔ اور پھر درجہ بدرجہ وہ اشخاص جنہوں نے ان کے جہد میں یا ان کے بعد ان کا سلسلہ جاری رکھا۔

وہاں زخم ہونہ ہو، راہ سخن تو کسی نہ کسی طرح وا ہو ہی جاتی ہے۔ جیسی کہ پروفیسر میرزا حسن غازی کی ایک حالیہ مطبوعہ تقریر پر جنرل ”اقبال“ (شائع شدہ کلکتہ) سے وا ہوئی ہے۔ موصوف لکھتے ہیں۔ ”ایک روز ایسا اتفاق ہوا کہ باوجود کوشش کے اقبال شعر نہ کہہ سکے۔ خیال ہوا کہ شاید شعر کہنے کی قوت و توفیق قدرت نے سلب کر لی ہے۔ مجبوراً اردو نثر لکھنے کی طرف توجہ کی اور تقریباً ایک سال تک بس اردو نثر ہی لکھتے رہے۔ ایک رات ہاتھ سر پر لگائے آسمان کی طرف ستاروں کو دیکھ رہے تھے کہ دفعتاً دل میں ایک دلولہ اٹھا اور جوش میں آکر شعر گوئی کی طرف خود بخود مائل ہو گئے۔ پھر کیا تھا شعر دیا کی مدائی کی طرح زبان سے نکلنے لگے۔ اور شعر گوئی کی یہ روحانی آخر وقت تک جاری رہی اور کمی نہ ہوئی۔“

بڑی شکل سے ہوتا ہے جن میں دیمہ وریدا۔ اور جدید وہ ہیں وہ اصل حقیقت کو بھانپ ہی گئے ہوں گے کہ اس حکایت یا روایت کا سرچشمہ سر عبد القادر مرحوم ہیں۔ جنہوں نے اس کو ”بلبل را“ کے دیباچہ میں نقل کیا ہے۔ مگر جیسا کہ افواہوں کے سلسلے میں اکثر ہوتا ہی ہے بات پہلے راوی سے دوسرے راوی تک پہنچتے پہنچتے کچھ کی کچھ ہو گئی ہے۔ بانی روایت نے صرف تنابہ ہی کہا تھا کہ جب حکیم ملت ولایت تشریف لے گئے تو انہوں نے دیکھا کہ لوگ کس طرح شب و روز سرگرم کار رہتے ہیں۔ اور جس نذر و ثمر سے ہمارے یہاں کے لوگ شعر و شاعری میں غرق بلکہ غافی الشعر رہتے ہیں، اس کا دلہا میں شائبہ تک نہیں۔ اس لئے وہ ترک شعر گوئی پر آمادہ ہو گئے تھے ادا انہوں نے مرید غرق کو یہ حکم دیا تھا کہ۔ جو کام کچھ کر رہی ہیں تو میں انہیں مذاق سخن نہیں ہے۔

دوسرے راوی نے اس کی جو تفسیر کی ہے۔ وہ اس ہی کا حصہ

چونکہ تحریک پاکستان کی جڑیں درحقیقت اسی دور کے اربابِ فکر و عمل کی سرگرمیوں میں پیوست ہیں۔ اس لئے دورِ آزادی میں، بجا طور پر ان کو خصوصاً مرکزِ توجہ بنایا گیا۔

اس قافلہ کے سالار اعظم سرسید تھے۔ جو اسلامی نشاۃ الثانیہ کی روح رواں ہوتے ہوئے دو قومی نظریہ اور بالآخر تحریک پاکستان کے حقیقی بانی مبنائی بھی تھے۔ یہ حقیقت قبل ازیں نظروں سے اچھل رہی۔ لیکن قیام پاکستان پر اسباب و علل کی تلاش نے اسے واضح و آشکار طور پر ظاہر کر دیا۔ چنانچہ ”ماہ دو“ ہی میں بعض مضامین شائع ہوئے جن میں سرسید کے اس مرکزی کردار کی توضیح کی گئی تھی۔ وہ کردار جو انہوں نے تحریک پاکستان کے محرک ادلی کی حیثیت سے ادا کیا تھا۔ اور جس کا سلسلہ بعد میں اقبالؒ اور قائد اعظمؒ تک جاری رہا۔ اس سے قطع نظر بعض امور بھی ہیں۔ سرسیدؒ اور

ان کا دور درحقیقت اُن گونا گوں مسائل کا آئینہ دار ہے جو دورِ جدید کے طلوع ہونے پر نمودار ہوئے تھے۔ ان میں سیاسی، معاشرتی اور مذہبی مسائل کے علاوہ زبان، ادب اور تعلیم کے مسائل بھی تھے۔ چونکہ سرسید اور ان کے رفقاء کار کی حیثیت مقیاسِ حیات کی تھی، اس لئے انہیں ان سب معاملات کی طرف اعتنا کرتے ہوئے مندرجہ بالا مسائل کو حل کرنے پڑے۔ آج کم و بیش ایک صدی کے بعد حالات کہاں کہاں کے پہنچ چکے ہیں۔ اور ہم ان سے واقف ہونا تو کجا ان کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔ خصوصاً سرسید نے جو کچھ لکھا یا کیا تھا۔ یاد دہانی کے لئے ان کے بارے میں بیان اور تحریر کیا تھا، وہ بڑی حد تک ہماری نظروں سے پرے ہٹ چکا ہے۔ اور ہم اس سے مطالعہ و تحقیق ہی کے ذریعہ روشناس ہو سکتے ہیں۔ ان حالات میں یہ ضروری تھا کہ اس اہم دور اور اس کی تہذیب و شخصیت کو پھر ہمارے قریب لایا جائے اور موجودہ حالات و ظروف کو پیش نظر رکھتے ہوئے ان دونوں پر نئے سرے سے روشنی ڈالی جائے۔

مولوی محمد آجین زبیری مرحوم کی تصنیف ”تذکرہ سرسید“ میں، جسے یونائیٹڈ پبلشرز لاہور نے شائع کیا ہے، ان امور کا بوجہ احسن اہتمام کیا گیا ہے۔ سوانح نگاری میں ذہنی کاوش سے زیادہ یہ سلیقہ درکار ہوتا ہے کہ کسی فرد کے حالات، کوائف اور اس کی شخصیت کے اہم پہلو اچھی طرح سامنے آجائیں۔ اور یہ بھی حتی الوسع معروضی پیرایہ میں۔

اس لحاظ سے یہ کوشش خاصی کامیاب ہے۔ اس سے اس دور اور سرسید کی واضح تصویر نظروں میں پھر جاتی ہے۔ عام طور پر معلوم و معروف امور کے علاوہ ایک مستقل باب دو قومی نظریہ اور زبان و تہذیب کے مسائل کے لئے وقف ہے۔ جو بالوقوع و بالفعل تحریک پاکستان کے محرکات ہیں۔ سوانح اور شخصی اوصاف بجائے خود دلچسپ ہیں جن میں سرسید کی فکر سلیم، معاملہ فہمی اور علمی صلاحیت خاص طور پر نمایاں ہیں۔ جدید ناظران کے فیہم علی ادراک و فہم، تجربہ علمی، ذوقِ تحقیق، روشن خیالی، شوق و شغف، نمونہ پیکر صحیح نباضی اور حالات کے مطابق تبدیلی، روش سے متاثر ہوتا ہے۔ نشاۃ الثانیہ کے اکثر فکری، دینی، تعلیمی، تہذیبی، تعمیری اور اصلاحی معاملات کا سنگ بنیاد سرسید ہی نے رکھا۔ اولیات کی ہمیں انہیں نے سرکیں۔ پیش قدمی ان کی اور پیشترفت دوسروں کی۔ چنانچہ سرسیدؒ کی اور اقبالؒ نے بعد میں انہی کے روشن خیال مشرب حیات کی بنا پر علاماتِ تعمیر کیں۔ یہ سرسید ہی تھے جنہوں نے نئی تصورات، معتقدات اور رسم و رواج کو بدلائل و شواہد حقیقی اسلام سے دور ثابت کر کے ایک زندہ مذہب کو قابل اختیار قرار دیا۔ اور یہی روش ہے جس پر فکری و عملی حیثیت سے آج صدر پاکستان بھی گامزن ہیں۔

مرتب خود اسی دنیا کا فرد تھا جسے سرسید نے پیدا کیا تھا۔ اور جس میں کم و بیش اسی وضع کے بے شمار انسان پیدا ہوئے تھے۔ اس لئے گو اس کا اٹھان وہ نہیں پھر بھی وہ اسے پیش کرنے میں کافی کامیاب رہا ہے۔ بالخصوص ایسے دور کے لئے جو نہ اُس کا دور رہا ہے نہ سرسید کا۔ یہ کہ ہم اس سے بہت کچھ حاصل کر سکتے ہیں، کتاب کے لئے بھی اعتبار افزا ہے اور مرتب کے لئے بھی۔

تحریر میں سبک سرسید کی سلاست بھی جھلکتی ہے اور قدرت بھی۔ پیشکش — طاعت، کتابت، صحت اور کاغذ — کا اہتمام حسبِ دلخواہ نہیں۔

سرسید ہی کی ادبی کف کے دو اور فرد ہیں؛ محمد عزیز مرزا اور سید وحید الدین سلیم جن کے ”مجموعہ تصنیفات“ کو انجمن ترقی اردو پاکستان نے ”خیالات عزیز“ اور ”مضامین سلیم“ کے نام سے پیش کیا ہے۔ حال میں انجمن نے ”اس قسم کی بہت سی کتابیں شائع

بابر کی اداسی (دکڑا) نے چاروں طرف سے ماروس ہو کر پٹھانوں کی خانہ جنگیوں کی بدولت ہندوستان میں پالوں رکھنے کی جگہ پائی تھی کہ عام روایت کے بموجب جنت پداری کے جوش میں اپنی جان بیٹے کی صحت پر قربان کی اور اس کا لاڈ لا بیٹا ابھی عروس سلطنت سے ہم آغوش بھی نہ ہونے پایا تھا کہ پٹھانوں کی متفرق قوت شیر خاں کی حوصلہ مندی کی شکل میں نمودار ہوئی۔

ظاہر ہے کہ اس قسم کی استعارہ آمیز انشا پر داری لوٹ بچہ آج کل کے سنجیدہ ذوق کے منافی ہے جسے صاف سیدھی، سلیجی ہوئی، تیرہ بات ہی پسند ہے۔ مذکورہ مضمون سارے کا سارا "قصص ہند" کے پیرائے میں لکھا گیا ہے۔ اور جدید قاری کے لئے اس کی چند سطریں عبور کرنا بھی دشوار ہے۔ اس لئے کہ انداز بیان بالکل تھکری ہے اور جو اسلوب تاریخ یا سوانح نگاری کا ہونا چاہئے، وہ یکسر مفقود ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہمارے یہاں تاریخ کا چچا تدا، تینیں اسلوب ابھی تک کم ہی پیدا ہوا ہے۔ بد قسمتی سے انشا پر داری کے پرانے تقورات اب بھی ہمارے دل و دماغ پر چھائے ہوئے ہیں۔ اور تنقید کی ایک بہت بڑی ہم یہ ہے کہ ادب و فکر کے راستے سے اس سنگ میل کو پرے ہٹایا جائے۔ ظاہر ہے کہ اس کے لئے خود تازہ فکر کی ضرورت ہے جس میں جدید عالمی انداز نظر اور بصیرت کو زیادہ سے زیادہ سمویا گیا ہو۔ غور سے دیکھا جائے تو جس چیز کو فی زمانہ ادب و فکر کا استعمال یا جمود قرار دیا جا رہا ہے۔ اس کا بنیادی سبب یہی ہے۔ کیا ہمارا شعور اس اہم تقاضے سے عہدہ برآ ہو سکے گا یا نہیں۔ ہماری آنکھ ترقی کا دار و مدار تین م تر اسی بات پر ہے۔

کہتے ہیں تلخ گل کو دیکھ کر ایک فرنجی خاتون نے بے اختیار یہ کہا تھا کہ اگر اسے یقین ہو کہ وفات پانے پر اسے بھی ایسا ہی شاندار مقبرہ نصیب ہو گا تو وہ بھی مرنے کو تیار ہے۔ محشر بدالونی کے "شاعر نامہ" کو دیکھ کر جس کے جنت بستہ، اوق دوش ہوا اور اس سے بڑھ کر دوں خنہ پھاڑنے ہوئے چھوٹوں بڑوں سب تک پہنچتے ہی رہے ہیں۔ اور اس کے خنہ پارے ہیں بھی چھوٹوں بڑوں سب کے لئے۔ اگر کسی شاعر کے دل میں یہی تمنا پیدا ہو تو عجب نہیں "محشر نامہ" کہئے شاعر نامہ کو "حقیقہ ہوشیار پوری" کے ان الفاظ نے اس کو تاریخ بنا دیا ہے۔ گو وہ خود اس محشر نامہ عرف شاعر نامہ میں شامل نہیں ہیں کیونکہ ہماری طرح ان کے لئے بھی۔ روز محشر کہ جاگداز بود۔ ابھی دور ہے جن بگوش

کی ہیں جو غالباً حسن کارکردگی کی ایک پُر زور ہم کا نتیجہ ہیں۔ اور ان کے مسودات بابائے اردو کے فراہم کئے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ جواب کافی عرصہ کے بعد منظر عام پر آ رہے ہیں۔ اور بھی کئی اداروں نے ماضی کی ایسی ہی کتابوں کی اشاعت کا بیڑا اٹھایا ہے۔ جو اپنی جگہ خوب سے بشرطیکہ ان کا صرف یہی مطیع نظر بن کر نہ رہ جائے۔ اور جس قسم کی تازہ بہ تازہ نو بنوا علی تخلیقی تصنیفات بروئے کار آتی چاہئیں، ان کی تعداد برائے نام ہو۔ موجودہ صورت حال کچھ اس کا کے لگ بھگ ہے۔

کہنگی کو تشریف نوی پہننے کا اتنا فائدہ ضرور ہے کہ جن مصنفین کو کسی زمانے میں شہرت حاصل رہی ہے جن کے افادات سے پھر روشناس ہو جاتے ہیں۔ اس دوران میں ان کی شہرت اور افادیت کئی مرحلوں سے گزر چکتی ہے۔ اور اس کا چل بسا اوقات اچنبھے سے خالی نہیں ہوتا۔ مثلاً "خیالات عزیز" کو نواب وقار الملک مرحوم نے ان الفاظ میں پیش کیا ہے۔

"اب اس دیباچہ کے ہیرو مولوی عزیز مرزا صاحب کے اس مجموعہ تصنیفات کو امید ہے کہ تمام پبلک بلا لحاظ قوم و ملت یکساں دلچسپی کے ساتھ مطالعہ کرے گی اور مصنف کو دعائے خیر سے یاد کرے گی۔"

دعائے خیر تو بہر حال لازم ہے لیکن یکساں دلچسپی کے امکانات بعید نظر آتے ہیں۔ ہم دیباچہ میں بڑے شوق سے "ادبی و لٹری فریڈ" "لٹری مشاغل" "لٹری قابلیت" کا تذکرہ ان الفاظ میں پاتے ہیں کہ "آج ان کا شمار ملک کے مشہور و معروف جادو نگاروں میں ہے اور سرسید مرحوم کے لگائے ہوئے علمی جن کے پہلے موسم گل ملک خوبصورت و شاداب پھول ثابت ہوئے۔" مگر دیباچہ کے ہیرو میں کوئی ایسے تیور نظر نہیں آتے۔ اسے بہن و اسفندوار کا حریف بنادیں اس کے طرز بیان سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ اس پر مولانا محمد حسین آزاد کا سایہ ہے۔ جن کی کہتے ہی ادیبوں نے ریس کی ہے اور بہک گئے ہیں۔ بلکہ اب تو یہ بات بھی غوطہ ہے کہ وہ خود اپنی ہی سے کس قدر بیگ ہوئے ہیں۔ زیر نظر مجموعہ کا پہلا ہی مضمون "اکبر اعظم" بری طرح اس حقیقت کا غماز ہے۔

"نام کو اللہ اکبر کیا ترے توقیر ہے
داخل ہر باغ ہے شامل بہر تکبیر ہے"

جگہ پیدا کر لی ہے۔ ”چاقو“۔ آپ اسے روشنی کہہ لیں۔ شیشہ اور خوب بولتا ہوا پنجابی لفظ۔ پنجابی میں مضامین کے اس اولین مجموعہ کی برعکس حکایت کرتا ہے۔ زبان، لیکچر، شہباز ملک، کی اپنی ہی زبان تھی۔ اس نے اس کا بھی بھر کر جا دو جگہ پالے ہوئے مضمون عام پاکستانی دلچسپی کے موضوعات ہیں۔

سال نو کی تشریف آوری کے باعث آج کل ہمارے رسائل و جرائد کے خصوصی شماروں کا دور معلوم ہوتا ہے۔ اس کا ثبوت خود شہباز ہے۔ اس کے علاوہ کراچی ہی کے دو ماہناموں ”نگار“ اور ”جام نو“ کے خاص شمارے بھی ہیں جنہیں خاص خاص کہنا چاہئے۔ کیونکہ وہ اسی اہتمام ہی سے پیش کئے گئے ہیں۔ دونوں خاصے وزن دار۔ یوں بھی اور یوں بھی۔ یعنی ظاہری اعتبار سے بھی اور معنوی اعتبار سے بھی۔ انھوں نے دونوں افسانہ نمبر ہیں۔ اس لئے کہ پہلے کی طرح اب بھی لوگ افسانہ ہی کہتے ہیں۔ ”نگار“ میں ”روپ روپ“ کے تحت جس طرح روپ و نٹ کا دھوکا سنوارا گیا ہے۔ وہ ابنِ آفشاہی کا حصہ ہے۔ یہ چہنچہا، یہ بھولپن سے بہتے ہوئے ایسی ایسی کائیاں چالیں کہ چمکیوں پر چمکیاں لیتے جائیں اور کوئی آف ذکر سکے ”مگر“ ”انشائی“ کی بات ہی کیا ہے۔ وہ یکمیل برسوں سے مکمل رہے ہیں جسے کوئی دیکھتا ہی نہیں۔ کون ہے جو بھولے سے ہڈے آفشاہی طرح پھوٹے آفشاہ کے بارے میں بھی یہ کہہ دے کہ اس نے ایجاد کی تھی میں غرافت کے پھول لگائے ہیں۔ کوئی محمد حسین آزاد ہو تو یہ بات کہے۔ اور ہم آپ آزاد نہیں ہیں۔ اسی لئے کسی نے ابھی تک آفشاہ کو دکاہ کی سند نہیں دی۔

دونوں رسالوں کے خصوصی شماروں میں نام بھی اچھے کام بھی اچھے ہیں۔ اور شاید ان کے دام بھی اچھے ہی ہیں۔

”صدف“ کراچی پورٹ ٹرسٹ کا ماہنامہ رسالہ ہے جس میں زیادہ تر اسی ادارہ کے اراکین ہی حصہ لیتے ہیں۔ اور ”گہریں جیب“ میں اس کی تمام یکدہ نہ ہوتی۔ پھر بھی جو کچھ ہے خوب ہے ”صدف“ نے اپنے ہی موتیوں پر قناعت نہیں کی بلکہ دور نزدیک سے امداد کے موتی بھی سینے کی کوشش کی ہے۔ جو بہت اچھا ہے۔ اس کے ذوق و شوق کی جتنی علامت۔ اس لئے کہ — سماج کو نہیں پہناتے فطرت میں مرا سودا! ۹

سے قطع نظر پیش کش کے باب میں روایتی حسن کاری بھی اس میں ذوقِ تاملہ قہر م کرشمہ کار ہے۔ اس لئے کیا اس کے محترم نامہ ہونے میں کوئی شک ہے؟ یہ جنس گراں مایہ کسی قیمت پر بھی ارزاں ہے۔

ریپلیکا ہی کی ایک اور حالیہ پیشکش اصغر پٹ کا چار بابی ڈرامہ ”امانت“ ہے۔ اردو میں ایک نادر صنف کا نادر منظر۔ پلاٹ دوہری بلکہ تہری مثلثوں یا مثلث نماؤں سے گزرتا ہے۔ ایک تہری یعنی ہیر ستر، ایک جنگلی یعنی جنگلاتی افسر، اور ایک سید سے سادے انسانی سے ہوتے ہوئے مثلثیں اور مثلث نمائیں تبدیلی کی چھٹی جاتی ہیں اور بالآخر وہی ضلع رہ جاتے ہیں۔ جن کے اولاً مل جانے کا کوئی گمان نہیں ہوتا۔ گو سجدہ قاری کا ماتھا پہلے ہی ٹھنک جاتا ہے۔ کہ اونٹ کس کروٹ بیٹھے گا یا اسے بٹھایا جائے گا۔ یوں جس واقعہ پر پلاٹ کی بنیاد ہے وہ ہونے سے زیادہ بنانے سے تعلق رکھتا ہے۔ مگر اس بنانے اور مثلث نماؤں سے دو ضلعوں تک پہنچانے میں جس صفائی سے کام لیا گیا ہے۔ وہ بہت خوب ہے۔ اور اس صفائی کے معنی ہیں چابکدستی۔ استاد ہنرمندی۔ بات اور اس کے ساتھ بات چیت کو ڈرامائی سلخے میں ڈھالنے کا سبھاؤ۔ بلکہ ان کو ڈرامائی رو میں بہا دینا۔ ایسے کہ وہ نہایت بے تکلفی سے اس میں پہننے لگ جائیں۔ ظاہر ہے کہ اس کے لئے خاص ہیر ستر کی ضرورت ہے۔ ایسے پلاٹ کے لئے زیادہ تر طباعی اور اس سے بھی زیادہ زندہ دلی اور بذاتِ خیال کی ضرورت ہے۔ اور یہ کہنا کہ ڈرامہ نگار نے شروع سے آخر تک ایسا سلسلہ پیدا کر دیا ہے۔ ایک ہی معنی رکھتا ہے۔ یہ کہ وہ ان تمام ڈرامائی صلاحیتوں سے بخوبی بہرہ ور ہے۔

بہر حال امانت مختلف باتوں سے گزرتے ہوئے بلا خیانت صبح با صبح تک پہنچ جاتی ہے۔ بلکہ وہ خود ہی اپنے آپ کو لکھ چکا ہوتا ہے۔ اور پردہ عین وہیں گرتا ہے جہاں گرنا چاہئے۔ بڑے ہی ڈرامائی طور پر اس کے بعد کچھ کہنا امانت میں خیانت ہے۔ اور ہم اس دستِ بدست سلسلہ میں چوتھی مثلث بننا پسند نہیں کرتے۔

ایک نگاہ غلط اندازہ پنجابی کی طرف بھی۔ آج کل اس زبان میں خاصی ہنگامہ آرائی دکھائی دیتی ہے۔ اور دیکھنے والے کافی ذوق و شوق سے رسالے بھی شائع کر رہے اور کتابیں بھی۔ بلکہ بعض اردو اخباروں اور رسالوں نے بھی عام دلچسپی کے پیش نظر پنجابی نقوش کے لئے مستقل

فردوس جو فردوس نہیں : بقیہ صفحہ ۲

کشمیری عوام اپنی رائے کا بہترین استعمال کرنے کی پوری پوری صلاحیت رکھتے ہیں اور ان کا یہ بنیادی حق اُن سے نہیں چھینا جاسکتا۔ اس لئے انہیں آزادی دلوانے کی جدوجہد برابر جاری رہے گی۔

ابھی کراچی میں جو آخری اجتماع ہوا تھا اس سے قبل انگلستان کے ایک فوجی ممبر و ماہر نے جو چومکا دینے والے حقائق بیان کئے انہیں سامنے رکھا جائے تو وہ گہری سوچ بچار اور کسی فیصلہ کن نتیجہ کی اہمیت کو اور بھی نمایاں کر دیتے ہیں۔ دیوار پر کی تصویر تو بہر حال موجود ہی ہے۔ اور یہ تحریک کشمیر کے کہساروں کی دیوار پر بھی موجود ہے، اگر ہم اسے پڑھنے کی رحمت گوارہ کریں اور یہ تحریک پختہ گردانی نظر آئے اور تاریخی جسور حقائق کے اور کچھ نہیں۔ ماعتہ دیوار اولیٰ اللہ بھاء

کچھ تحریزیں پیش کی ہیں ظاہر ہے کہ تقسیم کی تجویز کو کسی حال قابل قبول نہیں ہو سکتی سب یہ مذاکرات کلکتہ میں ہوں گے۔ اور بھارت کو سوچنے کا بڑا موقع ہے، خاص کر اس امر کے پیش نظر کہ اگر دو پیش منڈلانے والے خطرات زیادہ سنجیدہ طریق فکر کی دعوت دے رہے ہیں۔

مسئلہ کشمیر پر کلکتہ میں ہونے والی متوقع بات چیت کس پہنچ پر ہوگی اور اس کا کیا نتیجہ نکلے گا اس پر جتنی رائے کا اظہار اس وقت ممکن نہیں۔ تاہم ایک بات ضرور کہی جاسکتی ہے، جس کی طرف خود صدر پاکستان، فیلڈ مارشل محمد ایوب خاں نے بھی اشارہ کیا ہے۔ آپ نے لندن کے اخبار "سٹنڈے آبزرور" کے نمائندے کو راولپنڈی میں انٹرویو دیتے ہوئے کہا ہے کہ پاکستان کا موقف شروع ہی سے یہ رہا ہے کہ اہل کشمیر کو اپنی رائے ظاہر کرنے کی آزادی ملنی چاہئے۔

علمی اصطلاحات کا اردو ترجمہ : بقیہ صفحہ ۳

کرتے وقت زبان الٹ جاتی اور لپٹ کر دہری ہو جاتی ہے۔ اسی طرح "مغروف" وہ آواز ہے (ل) کہ بوقت تلفظ زبان کے کناروں سے ہوا سرسرا کر نکل جائے۔ voiced کا ترجمہ مصیبت (= آواز دینے والا) اور سمرج (= سنا ہوا) کیا گیا ہے۔ مجبورہ ان سے بہتر ہے، اس لئے کہ ان آوازوں میں ایک طرح کی جھٹکا رہتی ہے۔ اس مغروف کو ادا کرنے کے لئے مجبور (= جہر اور جھٹکا روالا) سے بہتر لفظ جاری زبان میں نہیں۔ اس کے مقابلے کی آوازیں کمزور اور دھیمی ہوتی ہیں۔ انگریزی میں انہیں (unvoiced) کہتے ہیں۔ اہل اردو نے اس کا ترجمہ غیر مصیبت (= جس کی آواز نہ ہو) کیا۔ یہ اصطلاح اور اس کا ترجمہ دونوں غیر واضح ہیں۔ ان سے آوازیں کی حقیقت بے نقاب نہیں ہوتی۔ میں نے مجبورہ (= دھیمی آواز والے) تجویز کیا ہے جو ان آوازیں کی حقیقت پر دلالت کرتا ہے۔ سنسکرت میں مجبورہ کو گوش وٹ (= جھٹکا روالا) اور مجبورہ کو گوش وٹ کہتے ہیں +

ہے۔ اس کو سمجھ کر پہلوئی ایک نیا لفظ گھڑنے کی کیا ضرورت ہے جس کی افادیت اور موزونیت دونوں مشکوک ہیں۔

یہاں سے ایک اصول یہ دریافت ہوا کہ اصطلاحات کا ہر ایک زبان میں کوئی قدیم ترجمہ موجود نہ ہو تو نیا لفظ وضع کیا جائے۔ وضع اصطلاح میں عموماً لغوی معنی کو سامنے رکھ کر اس کا لفظی ترجمہ کر دیا جاتا ہے۔ جیسے CEREAL (مغنی) LATERAL (پہلوئی)

(منفوس نفسی) VOICED (مصیبت) وغیرہ۔ یہ درست نہیں۔ لغوی معنی کی جگہ اصطلاحی معنی کو پیش نظر رکھ کر ایسا لفظ وضع کرنا چاہئے جو اصطلاحی مفہوم کو واضح کر دے اور تناوروش ہو کہ مزید تشریح تعریف کی ضرورت پیش نہ آئے۔ ترجمے کا مقصد اصطلاح کی توضیح ہے جو اصطلاح کے لغوی مفہوم کی رعایت اور اس کے پابند لفظی ترجمے سے نہیں، اصطلاحی مفہوم کو اردو میں منتقل کرنے سے حاصل ہوتی ہے مثلاً مغنی (= داخلی) سے ہیں کوئی روشنی نہیں ملتی۔ اس کے مقابلے میں لغوی (= لپٹے ہوئے) سے چاہتا ہے کہ یہ وہ آوازیں ہیں جن کو ادا

تیر کی عشقیہ مثنویاں : بقیہ صفحہ ۳

”جذب الفت“ (قاہم)، ”تیرنگ عشق“ (مرزا علی لطف)،
”سحر المحبت“، ”جذبہ عشق“، ”شعلہ عشق“ اور ”گلزار محبت“ (معنی)
”حسن و عشق“ اور ”پارسا نامہ“ (سید فیض آبادی)، جعفر علی خاں
راغب دہلوی کی ایک مثنوی شامل دیوں، ”سراپا سوز“ (قاضی خیر)
”سوز و ساز“ (طالب علی خاں)، شیخ عبدالرؤف شعور شاگرد معنی کی
مثنوی، ”آہ و زاری مظلوم“ (مومن)۔

لکھنؤ پر جب تک دہلوی اثرات رہے واردات عشق کی
مثنویوں میں تیر کی تقلید فرض تھی۔ جب لکھنؤ نے دہلی سے اپنی
برأت اور اپنی خود مختاری کا اعلان کیا تو مثنوی میں بھی اپنی ذر
جدا نکالی۔ ادھر زمانہ بھی بدل چکا تھا۔ لوگوں کے مزاج لڑائی اور
لہو و لعب کی طرف مائل ہو گئے تھے۔ ذاب و زانیق نے اپنی
کارستانیوں کا ڈھنڈھورا اس زور سے پیٹا کہ تیر کی مہذب اور
خیف آواز دب کر رہ گئی، لیکن وقت منصف ہے۔ آج تیر کی
تصانیف کو اثر و مثنوی کی ایک گراں بہا طرز تسلیم کیا جاتا ہے
اور اس طرز کے متعدد لکھنے والوں میں تیر کے رشحات فکر ہی
سرفہرست نظر آتے ہیں :

ایک تصویر دور رخ — بقیہ صفحہ ۱۱۹

گئی۔ اڑیل خاں صاحب جوش میں آ گئے۔ غصے میں بھر گئے۔ ہر مروج
پہلے سے زیادہ اونچی آنے لگی کتھی کسی ڈرلوک کے دل کی طرح ڈھبے
اچھنے لگی۔۔۔۔۔۔ کیا ایک بھلی زور سے چمکی، جلو دھڑلے کہا۔ ”ذرا
کنارے کی طرف دیکھو۔ کنارے کی طرف“ سب کی نگاہیں اٹھ گئیں۔
جھلیاں چمک رہی تھیں، ان کی روشنی میں کنارے پر عجیب تماشا نظر
آیا، فضا میں نرالا رقص ہو رہا تھا، طوفان اپنے مرکز پر یکایک ناچنے لگا
تھا، زمین سے کئی سو فٹ اوپر مکانوں کے تین ناچ رہے تھے اور آسمان
کی طرف ناچتے چلے جا رہے تھے، یہ رقص یکایک رقص بسل بن گیا مٹی
ناچتے ہوئے آئے۔ غریب سے سرکٹ کے الگ ناچنے لگا، دھڑا لگا اچھا
رہتا۔ ایک عورت کا سر بھی بکھرے ہوئے بالوں کے لٹکے درمیان ناچنے
لگا۔ ایک لکڑے کا سر بھی ناچ اٹھا۔ اور چھٹک کے آدمی کے پیٹ سے
”نچوایا۔ پیٹ میں سنگینیں گھس گئیں۔ اب فضا میں بہت سے سراور
بہت سے دھڑا لگ الگ ناچ رہے تھے۔ جانوروں کے، مردوں کے

عورتوں کے، بچوں کے، آنا نانا یہ ناچتی گولی فضا میں بکھر گئی۔ نلچے
والے زمین پر اس طرح گرے جس طرح بطنیں شکاری کی بندوق
سے گرتی ہیں“

مگر جس رزلٹ کے ساتھ غضبناک طور پر یہ گونانی ریل گیا
گیا تھا۔ اس کے سامنے وہی خون خرابہ لازم تھا جس کا نقشہ اس میں
پیش کیا گیا ہے مگر شاعر نے اپنے آپ کو پوری طرح سنبھالے رکھا ہے۔
چند اور مقابل کی چوئیں دلچسپی سے خالی نہ ہو گئی۔

”بنگال کی فضا غزل تو اب بھی بنی ہوئی تھی مگر اب تیر کی غزل
کی جگہ حافظ کی غزل لے رہی تھی، اساقی مائل بہ کرم تھا۔ شراب و شادی کا
دور دور تھا، گاک اڑ رہے تھے، شراب بوتلوں سے اچھل رہی تھی
جستی کافی، قہقہے لگاتی، لوگ بھی ہنس رہے تھے، گارہے تھے، قہقہے
لگا رہے تھے، سیم تنوں پر کاندھ کی شکل میں چابی برسائی جا رہی تھی
سیم تن بھی نفرتی تبسم کی بارش کر رہے تھے، دونوں طرف سخاوت کا چوٹا
تھا، یہ کہنا مشکل ہوا جا رہا تھا کہ کون زیادہ سخی ہیں، پیسے والے یا پتلے
والے، بھال کی نگین فضا کو یہ رنگ دلیاں اور بھی زیادہ رنگین بناتے دے رہی تھیں“

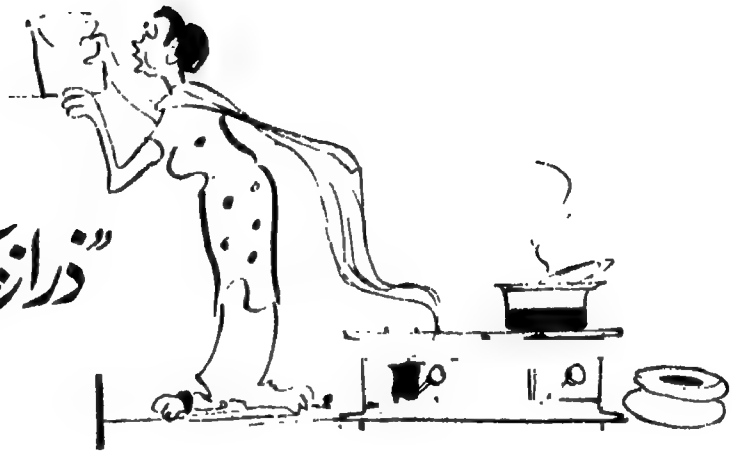
”بنگال کا جاوہر شباب پر تھا، آسمان کے سر پر چڑھ کر لیل رہا تھا
زمین کے سر پر چڑھ کر لیل رہا تھا، گھٹاؤں کے بھیس میں پریاں قطاؤں پر
تظار آ رہی تھیں۔ رنگ و رنگ کی ساٹیاں پہنے، طرح طرح کے دوپٹے اوڑھ
گوٹے لچکے سے آرامتہ پر اسے، کسی رنگین مزاج نے پوری توں قزح ہی
اتھا کے زیب تن کر لی تھی، کسی چمپل نے لپک کے سرچم کی ترتیبی ہونی
بجلیاں اپنے آنچل میں ٹانگ لی تھیں۔ اودے اودے، نیلے نیلے، چلے
چلے پیرن والی آب و رنگ و نور کی پریوں کی مسکراہٹ پھوار کی صورت
میں دم جھم دم جھم برتی، کبھی کالے کالے دیوؤں کے دل باؤل پہاڑ کے
پہاڑ اینڈ تے ہوئے، اگر چتے ہوئے چھا جاتے ہیں

اس کے انگریزی رخ میں کچھ اور ہی عالم دکھائی دے گا۔
تو کیا کھیل مقامی بازی سے ہی سمجھتے عالمی سطح پر نہیں چلا گیا۔ میں تو
کچھ ایسا ہی سمجھتا ہوں۔ یہی میں نے اس کی دونوں صورتوں کو برابر
الگ الگ ہی رکھا ہے۔ ایک کا دوسرے سے کوئی میل نہیں۔ وہ اور
یہ اور۔ اور انہیں رخ کہتے بھی نہیں جن پڑتی کیونکہ یہ دونوں
اپنی اپنی جگہ پر ہیں۔ ایک ادھر کا روپ، دوسرا ادھر کا۔

اور وہ خش و پنج جس کا میں نے ذکر کیا تھا، پہلے بھی تھی،
اب مجھے۔ اور آئندہ مجھ رہے گی :

* ”ذرا بچ بچ کے چل!“ *

صلیبا اختر
کارٹون: برکات



اقرنے وقت بالکل محسوس نہ ہو سکی! اس لئے کہ ان کی آن میں، وہ کسی تکلیف کو محسوس کئے بغیر زمین پر ڈھیر ہو چکے تھے۔ وقت اور محنت بچانے کا ایک طریقہ یہ بھی تو ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ حضرت شیخ چلی خود بھی بہت بڑے منطقی واقع ہوئے تھے۔ وہ شاید سبب اور مسبب کے نظریہ کو بوری طرح سمجھ چکے تھے۔ انہوں نے ”حادثہ“ کو سمجھنے اور سمجھانے کے لئے ایک ہورے پروگرام پر عمل کیا اور اسکا خود تجربہ بھی کیا۔

شیخ چلی مرحوم جسمانی طور پر نہ سہی بچوں کی کتابوں میں آج بھی موجود ہیں۔ لیکن بعض لوگوں کا خیال ہے کہ شیخ چلی تبدیلی آب و ہوا کے طور پر غذائی دنیا سے نکل کر اب بھی انسانی برادری میں کبھی

بچوں میں بہت سے دانایان روزگار کی کہانیاں سننے تھے اور ان کہانیوں کے سب سے بڑے ہیرو، حضرت شیخ چلی آج بھی ذہن کی بھول بھلیوں میں اپنی لمبی سی ناک اور لمبی سی ڈاڑھی کے ساتھ لہراتے نظر آتے ہیں۔

ان کی دانائی کا ایک واقعہ آپ نے بھی سنا ہوگا کہ ایک دن وہ جنگل میں لکڑی کاٹنے کیلئے تشریف لے گئے۔ ایک درخت کو بڑی چھان بین کے بعد منتخب فرمایا۔ درخت پر بڑی مشکل سے چڑھے اور بطور خاص جس شاخ پر سب پہلے آ رہ چلا وہ حسن اتفاق سے وہی شاخ تھی جس پر خود تشریف فرما تھے۔ نتیجہ ظاہر ہے۔ شیخ صاحب کو درخت پر چڑھتے وقت جو زحمت برداشت کرنی پڑی تھی وہ

* زندگی کی رہ میں چل لیکن ذرا بچ بچ کے چل یہ سمجھ لے کوئی مینا خانہ بار دوش ہے! (”اقبال“ رح)

کی طرح مہکتا ہوا چہرہ ، سلک کی شلوار ، نائلون کی قمیص اور شیفون کا دوپٹہ۔ ”ماتھے بندیا ہاتھ میں کنگن گلے میں چندن ہار“۔ سر سے پیر تک ریشم ہی ریشم اور اس پر عطر اور لونڈر کی بھوار۔ یہ سب کچھ ٹھیک ! بیگم کے سولہ سنگھار سر آنکھوں پر۔

ہمارا کیا جانا ہے اگر بیگم۔ بیگم کم اور حور یا ہری زیادہ نظر آتی رہیں۔ ان کے اس حسن اور اس ”حسن اہتمام“ کے والہ و شیدا چلتے ہم ہو گئے مگر یہ باورچی خانہ اس سلسلے میں انتہائی بد مذاق واقع ہوا۔ لیکن بیگم نے ہمارے اس مشورے کو ہمیشہ اپنے حسن اور اپنے فیشن کے خلاف ایک قدامت پسندانہ نظریہ سمجھا۔ بیگم ہر چند کہ کبھی کبھی ہمارے دلائل اور ہمارے نصیب دشمنان قسم کے اندیشوں سے قائل بھی ہو گئیں۔ مگر اس کو کیا نیا جائے کہ باورچی خانہ میں بھی انہیں اس بات کا دھڑکا لگا رہتا ہے کہ نہ جانے کب کوئی پڑوسن آٹھکیں ، اور پڑوسن تو خیر پڑوسن ہیں اگر کوئی میکے یا سسرال سے ہی آگیا تو کیا ہوگا۔ بیگم اس قول کو اثر دھراتی رہتی ہیں کہ موت اور مہمان کے آنے کا کوئی وقت مقرر نہیں۔ اور وہ موت کی نہ سہی مگر مہمان کی ضرور متوقع رہتی ہیں۔ اسی لئے ہر وقت لیل کانٹے سے لیس رہتی ہیں۔

کچھ دنوں کے بعد بیگم کو فیشن کے ساتھ ساتھ موسیقی سے بھی لگاؤ ہو گیا تھا۔ اس کے لئے فوراً ریڈیو خریدنے کا ”بیگم شاہی“ حکم صادر ہوا۔ خادم نے تعمیل کردی۔ ریڈیو پہلے تو ڈرائنگ روم کی زینت بنا رہا ، پھر ڈرائنگ روم کی میز سے اٹھ کر باورچی خانے میں رکھے ہوئے نعمت خانے پر رکھ دیا گیا۔ وجہ پوچھی تو کہنے لگیں ”ارے تو اور کیا کروں ، دوپہر کو کھانا پکاتی ہوں اور اسی وقت ریکارڈنگ ہوتی ہے۔ بھاگ بھاگ کے ڈرائنگ روم میں جانا پڑتا تھا۔ اس لئے میں نے سوچا کہ ریڈیو بھی یہیں اٹھا لاؤں۔ آخر آپکو وقت پر کھانا بھی تو دینا ہوا۔“ بیگم کی اس دلیل کے آگے ہم ہمیشہ کی طرح چپ ہو کر رہ گئے لیکن ریڈیو میں نہ جانے کیا جادو تھا کہ

کبھی رونما ہوتے رہتے ہیں۔ ان کے سر پر ایک سلیمانی ٹوپی ہے ، اسلئے سب کو نظر نہیں آتے۔ مگر وہ جس کی ٹوپی چاہیں اتار لیتے ہیں یا جسکی چاہیں پگڑی اچھال دیتے ہیں یہ ان کے بائیں ہاتھ کا کرتب ہے ، ممکن ہے دائیں ہاتھ کا ہو۔



نیا راکٹ ؟!

گاہ باندہ نہ دودک نادان از غلط ہر هدف زند بیرت !

یوں تو حضرت شیخ چلی نو گھریلو زندگی اب بھی بہت پسند ہے ، اور وہ ہر گھر میں کسی نہ کسی طرح موجود رہتے ہیں لیکن بہت کم اس بات کو ماننے کے لئے تیار ہونگے کہ ان کے گھر میں بیگم کے علاوہ کسی اور کی بھی حکمرانی ہے۔ بیگم کو تو خدا نخواستہ اگر کوئی ایسا گمان ہو جائے تو سیدھی میکے میں جا کر دم لیتی ہیں۔

آپ کو اس بات سے انکار ہے تو چلتے پونہی سہی۔ مجھے آپ کی توہین اور آپ کی گھریلو آزادی میں دخل در معقولات کا مجرم بننے کا کچھ ایسا شوق بھی نہیں مگر مجھے آپ بینی سنانے کا تو حق حاصل ہے۔

لپ اسٹک سے لال بھہو کا ہونٹ۔ پاؤڈر، کریم کی آمیزش بلکہ آویزش سے آٹھ پھر سورج کی طرح چمکتا ہوا اور گلاب

کہ ریڈیو سے کوئی ریکارڈ۔ صوتی تائر کے ساتھ۔ پیش ہو رہا ہے، کہ دوسری چیخ سنی۔ دوڑ کر باورچی خانے میں پہنچے تو دیکھا کہ بیگم کا دوپٹہ شعلہ جوالہ بنا ہوا ہے اور قریب تھا کہ بیگم خود ایک بقعہ نور میں تبدیل ہو جائیں کہ ہم نے وہ دوپٹہ فوراً نوچ پھینکا اور جلدی سے دوپٹے پر گھڑا انڈیل دیا۔ بیگم جو بات بات پر آتش زیر پا رہتی تھیں آج واقعی نذر آتش ہی ہو جاتیں۔ پوچھا ”کیسے ہوا؟“ کہنے لگیں ”ارے ذرا ریڈیو کی سونی ٹھیک کرنے کے لئے مڑی تھی کہ دوپٹے کا پلو چولہے پر جا پڑا۔“ بیگم کی جان بچنے کی حوشی میں ہم نے فوراً مٹھائی منگائی جو فی الفور پڑوسنوں میں، اس حادثے کی خبر کی طرح، تقسیم ہو گئی۔

خدا کا شکر ہے اس دن سے بیگم نے باورچی خانے میں ریشم اور نائلون کے کپڑے پہن کر جانا تو چھوڑ دیا ہے اور ریڈیو بھی حسب دستور ڈرائنگ روم میں رکھ دیا گیا ہے۔

ہم تو خیر شاعر ہیں ہی ہماری بیگم کو بھی یہ ناز ہے ان کے پرانا مولانا حالی کے ہم رتبہ شاعر تھے۔ لہذا انہیں ورثہ میں دولت سخن نہ سہی مگر فکر سخن کی دولت خداداد ضرور مل گئی تھی اور وہ اپنے بھولن کا مظاہرہ کرنے کے لئے کسی نہ کسی بھول کا مظاہرہ روز کرتی رہتی ہیں۔ ایک دن بیگم کی فرمائش پر ہم بہت سے کیلے لے کر پہنچے۔ بیگم نے یہ کیلے کچھ خود نوش فرمائے اور کچھ اپنے ”خانہ زادوں“ کو کھلائے۔ ایک دو کیلے از راہ کرم یا برائے تفتن ہماری طرف بھی بڑھا دیئے۔ اور باقی ریزرو فنڈ میں شام کے لئے رکھ دیئے گئے۔ یہ ریزرو فنڈ دراصل ان سہانوں کے لئے مخصوص تھا جو اگر آ بھی جائیں تب بھی کوئی ایسی شے ان تک نہیں پہنچ سکتی جو بیگم کو بذات خود اس قدر پسند ہو۔

ابھی ”کیلا نوشی“ یا ”کیلا خوری“ کا دور ختم بھی نہ ہونے پایا تھا کہ باہر کسی دوست نے آواز دی۔ ہم بیگم

جس دن سے ریڈیو کچن میں پہنچا ہمارے لئے کھانا تریاق سے زہر بنتا چلا گیا۔ ہمیں ہر لمحے پر پیاس لگنے لگی۔ اگر مرچوں کی شکایت کی تو بیگم نے کہا ”زبان دکھائیے“ اور صاف و شفاف زبان دیکھی تو کہنے لگیں۔ ”آپکے منہ میں دانے نکل آئے ہیں!“ اور اگر کسی دن کھانے کو بد مزہ کھدیا تو حکم دیا ”ڈاکٹر کو دکھا آئے۔ معلوم ہوتا ہے کہ کسی آنے والی بیماری نے آپ کے ذائقے کی قوت پہلے سے سلب کر لی ہے“ اور جب جلی ہوئی روٹیوں کا منہ بولتا ثبوت پیش کیا تو روٹیوں سے زیادہ جل کر کہنے لگیں: ”مٹی کے تیل کے چولہے پر روٹیاں پک ہی نہیں سکیں۔“ مگر وہ اس ناممکن کو معجزاتی طور پر ممکن بناتی رہیں۔ ہم نے لکڑیاں جلانے کا مشورہ دیا تو فرمائے لگیں: ”دھواں سیری آنکھوں کو خراب کر دے گا۔“ کوئلے کی طرف توجہ دلائی تو کہنے لگیں۔ ”کوئلے کی گیس میرے لئے ناقابل برداشت ہے اور دوسرے یہ کہ بجٹ میں اس آئیٹم کی گنجائش بھی تو نہیں ہے۔“

”جی ہاں اس فیشن کے بعد بجٹ میں کوئلے کی ایک پوری کی گنجائش کہاں باقی رہ سکتی ہے۔“

بیگم نے پوچھا ”کیا کہا؟ ذرا زور سے کہئے۔“

ہم نے جذباتی طور پر بات کھدی تھی۔ دھرانے کی ہمت کس میں تھی۔ فوراً کھدیا۔ ”جی کچھ نہیں، میں صرف یہ کہہ رہا تھا کہ آپ کا خیال درست ہے۔“ بیگم مسکرا دیں اور ایک آئی ہوئی آفت ٹل گئی۔ ہم نے بھی جواباً جیڑا بھارتے ہوئے پوری مسکراہٹ سے جواب دیا۔

ایک دن دوپہر کو گھر پہنچے۔ بیگم سر سے ہر تک ”نائلون کی گڑیا“ بنی باورچی خانے میں موجود تھیں۔ ریڈیو سے فلمی گانے نشر ہو رہے تھے۔ بیگم بھی آواز کے ساتھ آواز ملانے کی ناکام کوشش میں مصروف تھیں۔ ہم انہیں مصروف دیکھ کر ڈرائنگ روم میں آ بیٹھے۔ ابھی کچھ دیر ہی گزری تھی کہ ایک چیخ سنی۔ ہم نے سمجھا

بیگم کا موڈ اب اس قابل ہو گیا کہ وہ اپنے دوست کو اس زبان درازی کے باوصف گھر میں لے جاسکتے لہذا قریب کے ایک ہوٹل میں چائے پاؤں کر کے بالائی بالا رخصت کر کے گھر پہنچے تو دیکھا کہ صاحبزادے آٹھ منزلہ بلڈنگ کی فلک بوس چھت کے کونے پر کھڑے ہیں۔ شاہین بچے کے میں مصروف ہیں۔ ہر چند کہ ہم ”اقبال“ کے شاہین بچے کے بہت قائل ہیں۔ اور اس مصرعے کو بار بار گنگنااتے بھی رہے ہیں کہ ”تو ماہیں ۷ بسرا“ اور پہاڑوں کی چٹانوں میں ”مگر ایسے تماشاں بچے کو اس سے پرانی سے ادنی بلندی پر دیکھ کر جان میں نکل گئی۔ ایسی ساری چوٹ بھول کر سڑھوں پر دروازہ وار چڑھے ہوئے جیک اس وقت پہنچے جب صاحبزادے رنگ لے بیچے ایک بلڈنگ سے دوسری بلڈنگ میں دھڑلے لڑنے لے لے رہے ہیں چکے تھے۔



ہونہار بڑا : وہ ایک ٹم ہے ہمت کے لئے بام بلند !

معین قدرتی طور پر یہ حق حاصل نہیں تھا کہ صاحبزادے کو خود سزا دے سکیں۔ لہذا فوراً صاحبزادے کو لے کر ہانپتے کا نپتے بیگم کی عدالت عالیہ میں پہنچے۔

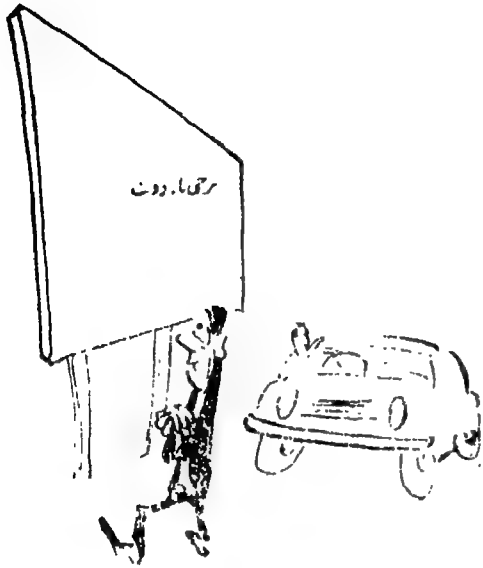
کی وجہ سے وہ سونے کو سونے ہی سے نہ ہونے نہی۔ مدب کے بعد ایک ایسا آواز آئے کہ سن کر لگی ”دروازہ سے قدم



لہیل لڑکوں کا ہوا : نے ہاتھ بیگ پر نہ پاٹ ...

نکالتے ہی ایسے رہے کہ دوست کی آنکھوں نے بچانے چاروں خانے چت قدموں میں جا پڑے۔ ابھی ہم شرمندگی اور چوٹ سے سہا ہی طرح اٹھ کر بیٹھنے بھی نہ پائے تھے کہ ہمارے دوست نے اپنے پیروں سے لیلوں کے چھلکوں کو ایک طرف دھکیلتے ہوئے اور ہمیں ہانپوں سے اٹھاتے ہوئے کہا ”ارے یہ کس ذلیل نے اس پر پروائی ہے تمہارے دروازے ہر کیلے کے چھلکے پھینک دئے ہیں“۔ یہ جملہ سن کر ہماری روح ہی نکل گئی۔ فوراً دروازے کی طرف مڑ کر دیکھا۔ بچے کھلکھلا کر ہنس رہے تھے مگر بیگم کی آنکھوں سے چنداریاں نکل رہی تھیں۔

ہم نے جھینپ مٹاتے ہوئے فوراً کہا۔ ”ارے ہار اس میں کیلے کے چھلکوں کا کیا قصور ہے۔ قصور تو میرا اپنا ہے“ قبل اس کے کہ ہم اپنی بات پوری کریں بیگم نے مصرع ثانی کے طور پر جملہ داغ دیا۔ ”آخر اللہ نے آنکھیں کس لئے دی ہیں ذرا دیکھ کے چلا کھینے نا۔“ قبل اس کے کہ ہم کوئی جواب دیں دروازہ ایک چٹاخ کے ساتھ بند ہو چکا تھا۔



اپنا کارنامہ سنایا اور شکایت کرتے ہوئے مناسب سزا کے اعلان کی درخواست کی -

بینک نے تنک لر جواب دیا "اس کی نو ہڈیاں ہسلیاں میں ابھی توڑ کر رکھ دوں گی - وہ ہے کس کا بچہ! مگر آپ پہلے یہ بتائیے کہ جناب اپنے اس زباں دراز دوست کو لے کر کہاں چل دئیے تھے - آخر آپ دوستوں کے ساتھ یہ 'ہوٹل بازی' کبھی ختم بھی کرینگے نہ نہیں" - ہم نے بھائی جرم کے طور پر فوراً اپنا پرس بینک کے حوالے کرنے ہوئے تھے "نو ٹن لو، تمہارے دئیے ہوئے روپے میں سے صرف بین اے دو پیلی چائے پر خرچ کئے ہیں" - بینک نے ہنسے ہوئے کہا - "جی ہاں میں اپنے نو آپ کی نظر میں دن پٹاں ہیں" سزا کے طور پر بینک نے ۱۳ آے سبب کر لئے اور خالی پرس ہمیں لوٹا دیا - اب صاحبزادے کی ہاری بھی -

جان جانے یا رہے : چھوڑ کے ہم نہ اس بت زفر کو دیکھنا !

ہر جا بڑے - سر کر دیکھا تو سوئر کی لہڑی سے ایک صاحب سر نکلتے ہوئے کہے ہوئے سنائی دئیے : "میاں کیا جان سے بزار ہو - اگر اس تصویر کے ایسے ہی عاشق ہو تو یہ تصویر بورڈ سے اتار کر گھر لے جاؤ - خود زندہ نہیں رہنا چاہتے تو نہ سہی ، ہمیں کیوں پھانسی کے تعے پر چڑھانے ہو" - "ڑوں" پھر ایک آواز آئی اور سوئر ایک اڑتے ہوئے پرندے کی طرح نظر سے اوجھل ہو گئی - موڈ خراب ہو چکا تھا - ہم خان کی سلامتی پر شکر کے کلمے ادا کرتے ہوئے چپ چاپ گھر واپس آ گئے -

بینک کے ہاتھ زیادہ بیز بھی یہ صاحبزادے کی چبھیں ہم اس کا اندازہ لٹے پھر باہر نکل آئے - کئی کے سوئر پر سوزے میں چھپائے ہوئے ہر سے حال لر پرس میں ڈالے اور چھل قدمی کے لئے سڑک پر آ گئے - خود پر فریج کا موڈ طاری کیا اور پکچر جانے کی ٹون لی تھی - دل سے نہ لہر آ کر دیا جراب دوڑے - دل کی اس بات پر ذرا قدم ہٹائے تو سامع سے آواز آئی - "میاں میرے ہوتے ہوئے دیوں کھیرائے ہو" میں ڈوٹی پہنا گھڑ رلھونکہ تم پکچر تو دیکھو" - ابھی چھل قدمی کے ساتھ یہ سوال جواب کا سلسلہ جاری تھا کہ عصری نظر سڑک پر لگی ہوئی "برجی باردوت" کی تصویر پر جا پڑی - برجی باردوت اور پرس فراس کی یہ دو چیزیں ہمیں ہمیشہ سے محبوب رہی ہیں - تصویر کو دیکھتے ہی ایسے کھوئے کہ دنیا و مافیہا کی خبر ہی نہ رہی - تصویر کیا تھی ایک جادو تھا جس کے زور سے ہم خود بھی رنگوں میں تحلیل ہوئے جاوٹ بیٹے - ابھی رنگ سازی کا کارخانہ ذہن میں جمنے بھی نہ پایا تھا کہ "ڑوں" کی ایک آواز آئی - ہم سڑک سے اچھل کر مٹا ہاتھ

شعر لکھے بہت دن ہو گئے تھے - ایک دن بینک کی نظر بچا کر چبکے سے ڈرائنگ روم میں پناہ لی اور موضوع کی تلاش میں محو ہو گئے - کوئی موضوع نہ سوجھا تو سکرپٹ لکھنا اور حسب دستور دھوئیں کے مرغولے بنانے لگے - ناگہاں مصرع یاد آیا "اس گھر کو آک لک گئی گھر کے چراغ سے" اس شعر کا پہلا مصرع لیا تھا - حافظہ پر بہت زور دیا مگر یاد نہ آتا تھا نہ آیا - سوچا کہ خود ہی کوئی مصرع

دھوپیں سے بھر گیا۔ ارے غضب خدا کا۔ سارا صوفہ جل گیا اور آپ کو خبر تک نہیں۔ ”کچھ آگ کا اور کچھ بیگم کا ڈر، جلدی سے اچھل کر، آنگن میں ”پانی پانی“ کرتے دوڑے اور جب سلکتی ہوئی آگ بھڑکنے سے پہلے بچھ گئی تو دیکھا کہ صوفے کی سیٹ کسی عاشق کے سینے کی طرح داغ داغ ہو چکی تھی۔ وہ نو خدا کا شکر ہے کہ بیگم نے اس فکر سخن سے چونکا دیا ورنہ سارا گھر خاکستر ہو کر اس مصرع کی، جس پر ہم طبع آزمائی کرنے بیٹھے تھے، سچی تصویر بن جاتا۔

نو دیکھا آپ نے کیا ہم، کیا بیگم اور کیا صاحبزادے اور کیا آپ۔ معاف کیجئے گا، کیسے کیسے خطرناک حادثوں کو دعوت دیتے ہیں اور خود ہی ان کا سنار ہو کر — کبھی قسمت — کبھی حالات — اور کبھی زمانے پر الزام دھر کر اپنے آپ کو بے قصور ثابت کرنے کے کوساں رہتے ہیں۔

ہاں نو بنائیے — آپ شیخ چلی کے فائل ہونے کہ نہیں؟ ”کوشش کیجئے کہ آپ پر شیخ چلی حاوی نہ ہونے پائیں ناکہ یہ چھوٹے موٹے حادثے بڑے بڑے ”سائنس“ نہ بن جائیں!



گھر بھونک تماشا: اس گھر کو آگ لگ گئی گھر کے چراغ سے!

موزوں کیا جائے اور اسی سوچ میں سکریٹ ہانڈ سے نہ جانے کب کر گیا اور سوچ کا یہ سلسلہ ناگہاں بیگم کی صلواتوں سے ٹوٹا۔ ”ارے۔ ارے یہ کیا! سارا کمرہ

* * * *

صحت اور دانست



صحت کا دار و مدار دانتوں پر ہے۔ دانتوں کو مضبوط اور مسوڑھوں کو صحت مند رکھنے کے لئے ضروری ہے کہ انھیں کیڑا لگنے سے محفوظ رکھا جائے کیونکہ اس سے بڑی بڑی بیماریاں پیدا ہو سکتی ہیں۔ ہمدرد منجن' جسے بے شمار تجربوں اور تحقیقات کے بعد مکمل کیا گیا ہے دانتوں کے لئے بے حد فائدہ مند ہے۔ مندرجہ ذیل اسباب کی بنا پر آپ کو کسی کا انتخاب کرنا چاہئے۔

صفائی اور مالش :- ہمدرد منجن اند تک پہنچ کر دانتوں کو اچھی طرح صاف کرتا ہے۔ انگلی کی مدد سے مسوڑھوں کی بھی مالش اور ورزش ہو جاتی ہے جو دانتوں کے لئے بے حد ضروری ہے۔

ہمدرد منجن کے باقاعدہ استعمال سے بخونین وغیرہ کے دھبے دور ہو جاتے ہیں اور دانتوں میں قدرتی چمک پیدا ہو جاتی ہے۔

خوش ذائقہ :- ہمدرد منجن خوش ذائقہ ہے اور اس کے ٹھنڈے اثرات بچے اور بڑے سب پسند کرتے ہیں۔

خوش گوار :- ہمدرد منجن کی دیرپا خوشبو منہ کی بدبو کو دور کرتی ہے۔



ہمدرد منجن

اسکراہٹ پیش کش اور دانتوں میں پتھریوں کی چمک پیدا کرتا ہے

ہمدرد دواخانہ (وقف) پاکستان
کراچی ڈھاکہ لاہور



موجود ہے !

رستم سائیکل

چین سے دو خط



دل روز تمام لا علاج جلدی امراض

ہر قسم کے پھوٹے پھینسی لاہوری پھوٹے
منگلائی پھوٹے یا سٹور ٹیکٹس۔ بال ٹورڈ او پینیل۔ خارش
گج خیش زیر کچھالی۔ گھٹی۔ رولی۔ ماسخو پینڈی۔ سترہ مہار۔
ورد۔ ملین۔ جو بن چوٹ۔ نئے اور پرانے زخم اور زہریلے جانوروں
کے کاٹے اور ڈسے کا بغیر اور تیرہ ہدف علاج ہے۔

چیر بھاڑ اور مریم پٹی سے نجات دلاتی ہے
 ابراہیم خاں

دور وید — ایک روپیہ — آٹھ آنے

افزون کنی جزل
چنگ کنگ چین
... گزشتہ روز

.....گزشتہ پندرہ کی ڈاک میں آپ کی ارسال کردہ
 دل و دوزخ کی شہنشاہی شکر ہے۔ مجھے دس سال کے علم سے
 یہ عجیب تھی۔ ہر جسم کی ویسی دھنگرینی ادویات استعمال
 کیں مگر کچھ بھی آپس نہ ہوا۔ دل و دوزخ صرف
 چھ دن لگانے کے بعد تمام شکایت مابقی رہی۔
 کاش! مجھے پہلے ایسے تیرہ ہدف ملان کا علم ہوتا.....

۱۰۰-۱۰۱

انڈین انجینیئر
چنگ گنگ سین

..... بلے کو عمر سے گردن پر ایک قسم کی کھینٹ ہے
خلفے ہیں جن کی وجہ سے غارت بہت ہو رہی ہے
نشانات تو بیکاروم سے مل جاتے ہیں مگر باوجود
انگریزی علاج کے آفاقہ نہیں ہوا افضل میں آپ
کی والدی ڈل دن تو شہزادہ کی کیا خیال ہوا کہ آپ سے بھی
استعمال کر کیوں کریں کہ آفاقہ نشانی کی کیا آپ
مہربانی فرما کر ایک شیشی میں ڈل کر قریب تر پہنچا دیں
جس پر آپ اس کو دیکھ کر کہتے ہیں.....

ن۔ ۱۔ رخ میسر

ن-۱-۲ میجر

۱۹۴۰ء سے استعمال میں ہے

حکیم طاهر الدین ایندسنز دافوز دالہ فیروز پور روڈ لاہو پنجاب

ہر مشہور و افروز سے طلب کریں

آسٹرمیلک کا زمانہ مسترتوں سے بکھر پور ہوتا ہے !

دنہ زمانہ جب بچے کی پرورش آسٹرمیلک پر ہوتی ہے، ماں اور بچے دونوں کے لئے مسترتوں کا زمانہ ہوتا ہے۔ آسٹرمیلک بچے کو تندرست و مطمئن رکھتا ہے جس کی بدولت اسے چین و کام نصیب ہوتا ہے۔ دوسری طرف ماں کی مسترتوں کی کمی حد نہیں رہتی کیونکہ وہ اپنی اولاد کو ہر طرح خوش و خرم رکھتی ہے۔

ہی ماں ! آسٹرمیلک بچے کی صحت اور مناسب نشرو نمائے مضبوط بنیادیں قائم کر دیتا ہے۔

آسٹرمیلک اعلیٰ اور خاص قسم کے دودھ سے تیار کیا جاتا ہے۔ اس میں نوادہ پایا گیا ہے۔ ہمارے بچوں میں خون کی کمی نہ ہونے پائے، اور ہڈیوں اور دانتوں کی مضبوطی کے لئے ڈامن کی بھی شال کیا گیا ہے۔ اسی لئے، اپنا دودھ چھٹ جانے پر یا اس کی کمی پوری کرنے کے لئے دانشمند مائیں پورے اعتماد کے ساتھ بچوں کو آسٹرمیلک دیتی ہیں۔

آسٹرمیلک ماں کے دودھ کا بہترین نم البدل

بچوں کی پرورش پر ایک مفید کتاب
آسٹرمیلک کی کتاب اب اردو میں دستیاب
ہو چکی ہے۔ بچے دینے ہونے پتہ پر ۵۰ پیسوں کے
محنت کیجئے اور ایک کتاب مفت حاصل کیجئے۔
پی۔ او بکس نمبر ۴۶۴۴۔ کراچی ۴



خیابان پاک

پاکستان کی علاقائی شاعری کے منظوم تراجم کا انتخاب

علاقائی شاعری کی روایات، سہانے گیت اور میٹھے بول پاکستان کی نغمہ ریز سرزمین کی خاص پیداوار ہیں۔ ان کے منظوم تراجم کا یہ انتخاب چھ زبانوں کے اصل نغمات کی صدائے بازگشت ہے۔

ساتھ سے زیادہ مقبول شعرا کا کلام

نفیس اردو ٹائپ کی چھپائی

ضخامت تین سو صفحات - قیمت صرف چار روپے -

ادارہ مطبوعات پاکستان پوسٹ بکس نمبر ۱۸۳-کراچی

ہندوستان کے خریداروں کی سہولت کے لئے

ہندوستان میں جن حضرات کو ”ماہ نو“ اور ”مطبوعات پاکستان“ کراچی کی کتابیں، رسائل اور دیگر مطبوعات مطلوب ہوں وہ براہ راست حسب ذیل پتہ سے منگا سکتے ہیں۔ استفسارات بھی اسی پتہ پر کئے جا سکتے ہیں۔ یہ انتظام ہندوستان کے خریداروں کی سہولت کے لئے کیا گیا ہے۔

پتہ:

ادارہ مطبوعات پاکستان

معرفت پاکستان ہائی کمیشن - شیرشاہ میس - نئی دہلی (ہندوستان)
منعائب: ادارہ مطبوعات پاکستان، پوسٹ بکس نمبر ۱۸۳-کراچی

شمارہ ۴

ماہ نو

جلد ۱۶

اپریل ۱۹۶۳ء

مدیر: ظفر قلیسی

۶	شیر افضل جعفری	یزداں گیر (نظم)	تب و تاب جاوداں :
۷	عبد الغنی شمس	شعلہ نفس (نظم)	(اقبال کی یادیں)
۸	عزیز احمد	اقبال کی آفاقیت کا مسئلہ	
		قرآن السحرین	
۱۱	سید قدرت نقوی	دغالب اور اقبال : (ایک تقابلی مطالعہ)	
۱۸	سحر یوسف زئی	اقبال کا انسان کامل	
		"مطرب غزل بیتے از مرشد روم آور"	
۲۶	ابن علی امروہوی	(دشنوی مولانا روم رح کا ایک نا درخطوط) :	
		★	
۲۹	عوفان احسان	حجاب تجلی (غلاف کیمہ)	مطالع انوار :
۳۳	غظیم سرور	آخر شب کے مسفر (کہانی)	افسانے، ڈرامے، رپورٹاژ :
۳۶		تجملہ شرق اشرقی پاکستان میں چند دن، (رپورٹ) عبد الحمید دتانی	
۳۹	سلیم خاں گئی	تہذیب و فن (ڈرامہ)	
۴۲	سلطان زبیری	طلوع نو (نظم)	نظمیں :
۵۶	صادق مصوٰر	قصہ شہر و برقی (نظم)	
۴۲	اکبر جاوید	رسم جہاں (نظم)	
۵۰	زہرا دار	آئے گی رت سادک کی (نظم)	
۵۵	بشیر فاروقی	محمود صدیقی	غزلیں :
۴۷	ارشاد سلمان	شگفت گل (ڈرامہ) میں بچوں کی نمائش فن)	فن :
۵۱	سید غلام حسن شاہ خاں	"ما و قاسقا" (چتران)	تعارف :
۴۵	لطیف جلیلی	حق بہ حق دار...	تائثریہ :
۵۹	رفعت جاوید	اک بار پھر	
	حفاطت حسین	دائے راز	سرورق :
		زین نقاش :	

فی کاپی،
۵۰ پیسہ

شائع کردہ :
ادارہ مطبوعات پاکستان پوسٹ بکس نمبر ۱۸۳ کراچی

سالانہ چندہ :
پانچ روپے ۵۰ پیسہ

”بزدل گیسر“

شیر افضل جعفری

چمن میں طرزِ فغاں کو اثر دیا تو نے
شبِ سیاہ میں گم گشتہ آدمیت کے
سخن میں سرورِ باں کو شمر دیا تو نے
جگر کے داغ کو بہت اب کر دیا تو نے

دغا میں جھوم کے آنا سکھا دیا تو نے
عمل سے آنکھ چراتی ہوئی تو تکل کو
لہو میں تیر کے جانا سکھا دیا تو نے
عدو سے جان لڑانا سکھا دیا تو نے

بغل میں لیکھ ستارے دلوچ لیتا ہے
تری آنا کا جو پر تو ملنگ پر جھبکے
بہت ہی دُور کی لحظے میں سوچ لیتا ہے
تو عزرائیل کے شہر بھی نوچ لیتا ہے

سمجھ رہا ہے پہاڑوں کو روٹی کے کالے
تری غزل کے نشے میں فقیرِ نعرہ طراز
ہیب سلسلوں کو عنکبوت کے جلے
کنڈکیوں نہ مدد مہر و عرش پر ڈالے؟

فضا کو، برق و خلا کو شکار کرتا ہے
تری خودی کے اشاروں کی چاندنی میں دل
قلم کو، لوح و فضا کو شکار کرتا ہے
قلندرِ سی سے خدا کو شکار کرتا ہے



فرشتہ صیدِ مملکت شکارِ دوزخ و دہلیز (دردی)
بزدل بکشتہ اسے بہت مروانہ (اقبال)

بزدل بکشتہ کبریا شمسِ مردِ اشد
دردِ شبِ جنوں میں جہول زبوں صید

شعلہ نفس

عبدالغنی شمس

پھر موج ہوائے دستک دی، یادوں کے دریچے کھلنے لگے
 شبِ نیم کی تراوش ہونے لگی، پھولوں کے چہرے دھلنے لگے
 مشرق کی شاخ کہنے میں، اک پھول کھلا تھا، یاد آیا
 گلشن کو بہارِ تازہ کا، پیغام ملا تھا یاد آیا
 دل سوزِ یقیں سے گرمائے، تشکیک کے بندھن ٹوٹ گئے
 نو میدی کے زندانوں سے، آخر سب قیدی چھوٹ گئے
 کچھ ایسی بانگ درا گوئی، پھر تازہ گلن ترپا پائے لگی
 بغداد و قرطبہ یاد آئے، تاریخ ورقِ ثنائے لگی
 پیدا ہوئی اک صبح روشن، تاریکیِ شامِ مشرق سے
 بیداری کی رود و رگئی، مشرق میں، پیامِ مشرق سے
 امرا و عو دی نے فاش کئے، کوئین کے سارے راز نہاں
 انجامِ خرد آئینہ ہوا بجنے لگے دل کے ساز نہاں
 ذہنوں کو رموزِ بنجو دی سے، سوچوں کے نئے انداز طے
 ہر دم و پروں گروہ ہوئے، ذروں کو پر پر واز طے
 روحِ داؤدی بھوم اٹھی سکر نغزاتِ زبورِ عجم
 تنخیرِ جان فوکے لئے پیدا ہوا ایک نیا آدم
 آذر کے صنم خانوں میں مچی، اک ضربِ بلیسی سے لمچل
 انجانے ڈر سے کانپ گئے تہذیب کے سارے رنگِ محفل
 انگڑائیاں لیتا برسوں کا خوابیدہ مسلمان جاگ اٹھا
 قرآن کو لگائے سینے سے پھر حاملِ قرآن جاگ اٹھا
 اک شعلہ نفس کے نغموں نے بھر کا دی آگ سی سینوں میں
 پاکیزہ سجدے تڑپنے گئے الحاد آلودہ جبینوں میں
 وہ جس نے قلبِ مومن کو ایساں کی صفائی بخشی ہے
 چکا کے خودی کا آئینہ گو یا کہ خدا کی بخشی ہے
 اے پاک زمیں! اک رنگِ حقیقت ہے تیرے افسانے میں
 دھارا ہے اسی کے تخیل نے تخلیق کا روپ زمانے میں
 اے ارضِ وطن! ہر آفت سے ہم تجھ کو بچائے رکھیں گے
 اک مردِ قلندر کا حنفہ سینے سے لگائے رکھیں گے

اقبال کی آفاقیت کا مسئلہ

عزیز احمد

اس میں اقبال کی مابعد الطبیعیات سے دلچسپی کو بھی دخل ہے۔ یہ دلچسپی ان کی شاعری میں بھی نہ چھپ سکی چنانچہ تصور مکان و زمان اور تصور خودی خالص مابعد الطبیعی نوعیت رکھتے ہیں۔ اور یہی ہے ہماری مشکلات شروع ہوتی ہیں۔

اس حیثیت سے اقبال کی آفاقیت تسلیم کہ ان کا بیجا عالمگیر اور ساری انسانیت کے لئے ہے اور ان کا تصور حیات وسیع ہے لیکن اس حقیقت کو طے بغیر بھی چارہ نہیں کہ فکر و علمیت کا غلبہ اتنا زیادہ ہے کہ اسے اچھی طرح سمجھنے کے لئے بڑی کدو کا دوش اور وسعت مطالعہ کی بھی ضرورت ہے۔ اور یہ ہر ایک کے بس کی بات نہیں۔ اس لئے اقبال کے قارئین کا دائرہ محدود ہو جاتا ہے۔ ویسے تو ہر شاعر اور ہر ادیب کا مطالعہ ایک خاص ذخیرہ معلومات کا متقاضی ہوتا ہے مثلاً زبان اور اس کے مزاج سے واقفیت اور روایات و علامات سے آگہی۔ بہر حال لازمی ہے کہ اس کے بغیر شعر و ادب سمجھنا نہیں آسکتا۔ لیکن بحکلاف اور شعر کے اقبال کے افکار و خیالات کو سمجھنے کے لئے اس کے علاوہ اور بہت کچھ جاننے کی بھی ضرورت ہے جیسے فلسفہ و مابعد الطبیعیات، تاریخ و سیاسیات، عمرانیات و معاشیات، حدیث و علم کلام وغیرہ۔ اس علم کے بغیر اقبال کا مطالعہ کرنے سے افکار اقبال کا محض سرسری اندازہ ہی ہو سکتا ہے جو غلط نہیں پرنتج ہو جاتا۔ چنانچہ اس قسم کی غلط فہمیاں اقبال کے بارے میں بھی پائی جاتی ہیں۔ کوئی انہیں رجعت پسند کہتا ہے، کوئی ترقی پسند، کوئی اشتراکی، کوئی فسطائی، کوئی صوفی، کوئی تصوف دشمن، غرض ہر جتنے منہ افک باتیں۔ یہ اختلاف کچھ اس وجہ سے نہیں ہے کہ اقبال کے اظہار میں کوئی خامی یا ابہام ہے نہیں، بلکہ اس وجہ سے ہے کہ اقبال کے

اقبال کے خیالات سے کوئی اتفاق کرے یا نہ کرے مگر اقبال کو بڑا شاعری تسلیم کرتے ہیں۔ اعلیٰ شاعری کی کونسی خصوصیت ہے جو اقبال کے ہاں نہیں؟ فکر کی بلندی و کھینچی، تجل کی وسعت اور گہرائی، جذبات کا خلوص اور پاکیزگی، حسین ادا اور موسیقی۔ مگر کونسی چیز سب سے نمایاں ہے؟ میرزا اثر تو یہ ہے کہ فکر اقبال کی شاعری کی نمایاں ترین خصوصیت ہے۔ اقبال کا کلام ٹپکتے ہوئے ایسا محسوس ہوتا ہے، گماں میں جذبات اور تخیل دونوں نکلے تالیق ہیں اور شاید یہی وجہ ہے کہ سستی جذباتیت یا سطحیت اقبال کی شاعری میں کبھی نظر نہیں آتی اور نہ ہی ہمارے اے اساس تخیل و موضوعاتی ہی نظر آتی ہے۔ یہی کجنگی و بلندی فکر ہے جو اقبال کو دنیا کے تمام بڑے شعرا سے ممتاز کرتی ہے اور اقبال بنا لے۔ ہانگ درا کو اقبال کی نمائندہ تصنیف کیوں نہیں قرار دیا جاتا؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ گو شاعر کی حیثیت سے اقبال کی عظمت ہانگ درا میں بھی کئی مقامات پر ظاہر ہوتی ہے لیکن اس میں فکر کا وہ عنصر بہت کم ہے جو اقبال کا اصل طرہ انبیاء ہے۔ بلاشبہ اقبال کا نمائندہ ترین مجموعہ اردو میں بال جبریل ہے اور فارسی میں جادینا ہے۔

فکر کی فراوانی نے اقبال کے بارے میں یہ عام خیال پیدا کر دیا ہے کہ وہ ایک باقاعدہ فلسفی ہیں جس کا ایک مستقل نظام فلسفہ ہے۔ بات صرف یہ ہے کہ ہر بڑے شاعر کی طرح اقبال کا بھی تصور حیات و کائنات تھا اور چونکہ اس تصور کو اقبال نے جزئیات کی تصریح کے ساتھ پیش کیا اس لئے انہیں اصطلاحی معنوں میں فلسفی قرار دیا جاسکتا ہے۔ ویسے کچھ

لے "ادارہ" کا صاحب تحریر کے ہر خیال سے متفق ہونا ضروری نہیں۔

خدا اور اس کے رسولؐ سے عشق رکھے، اسلامی تعلیمات کی حرکی روح کو سمجھے اور اس پر عمل کرے تو وہ حقیقت میں خدا کا جانشین بن سکتا ہے اور اپنی تقدیر کا آپ مالک بن سکتا ہے۔ اس کے علاوہ جو کچھ ہے وہ اقبال کے خصوصی اسکا کرول کے لئے مخصوص ہے، اسی لئے فہم عام کا سوال نہیں اٹھانا چاہیے۔ اقبال کی آفاقیت اسی مرکزی بات کو شاعرانہ طور پر پیش کرنے میں پنہاں ہے نہ کہ فلسفیانہ نکتہ آفرینوں کے حجابوں میں۔

اقبالؒ کے کلام کا وہی حصہ میری رائے میں آفاقی ہے جس میں فلسفیانہ نکتہ طرازیوں نہیں ہیں۔ کیونکہ اسی کلام میں شعریت ہے۔ وہی عام فہم بھی ہے اور اسی میں عالمگیر اپیل بھی ہے۔

علیت اور فکر سے انگریزی کے مشہور شاعر ملٹن کا کلام بھی بوجھل ہے لیکن اقبالؒ کو ملٹنؒ اس لحاظ سے ضرور فوقیت حاصل ہے کہ جہاں ملٹنؒ کی شاعری کی بنیاد صرف تخیل پر ہے وہاں اقبالؒ کی شاعری میں سوز و خلوص نے ایک تڑپ پیدا کر دی ہے۔ ان نکتہ نگاروں کا کہنا ہے کہ انسانیت کی پسمنظر اور قوم کے درونے ان کی فکر کو اکسا یا لیکن جب فکر کو حرکت آئی تو ان کے سامنے ذہن پرانی کا رعب ہو گیا۔ یہ ہر بات کو سوچنا سمجھنا تو لانا پرکھنا شروع ہوا اور حیات و کائنات اور اس کے مختلف مظاہر کے بارے میں خیالات معین ہونے لگے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ زندگی اور اس کے مسائل تک اقبالؒ فکر کے ذریعے سے پہنچے، احساس و تجربہ کے ذریعے سے نہیں۔ مگر جن نتائج پر وہ پہنچے ان پر اس شدت سے انہیں یقین تھا کہ یہ یقین بچانے خود احساس کا بدل بن گیا۔ اور اسی یقین کی وجہ سے ان کی باتوں میں ایک وزن پیدا ہو گیا۔ مگر میرا خیال ہے کہ وہ اثر پیدا نہیں ہو سکا جو ایک محسوس شدہ تجربے یا تاثر کے موثر اظہار سے پیدا ہوتا ہے۔ حال اور حال میں فرق تو ہوتا ہے۔ ہاں جب کبھی اقبالؒ آنحضرتؐ صلعم کا ذکر کرتے ہیں یا ملت اسلامیہ کی نبروں حالی وستی کو محسوس کرتے ہیں اور اس کی قوت کی تمنا کرتے ہیں تبھی ان کا انداز حال کا نہیں حال کا ہوتا ہے اور کلام کی تاثیر کئی گنا زیادہ ہو جاتی ہے۔ حال اور حال کے اس نکتہ کی وضاحت روحی اور اقبالؒ کے تقابلی مطالعہ سے بھی بہ آسانی ہو سکتی ہے۔ دونوں کا تصور عشق بڑی حد تک یکساں ہے لیکن صاف محسوس ہوتا ہے کہ

خیالات و انکا ایک کل کی سی حیثیت رکھتے ہیں اور کل حیثیت سے ہی مطالعہ جاتے ہیں۔ اور اس کے لئے خاصی علمیت کی ضرورت ہے۔ اس طرح وہی بات جو اقبالؒ کی عظمت کی ضامن ہے یعنی بلند پایہ وسعت فکر انہیں ایک عامی کی دسترس سے دور رکھتی کرتی ہے۔ اور اگر یہ صحیح ہے کہ کافی شاعری وہ ہے جس سے ہر زمانے میں سمجھ بوجھ والا طبقہ لطف اندوز و متاثر ہو سکے تو اقبالؒ کی شاعری میں آفاقیت کچھ ہے اور کچھ نہیں ہے عمومی نقطہ نظر سے اقبالؒ کا درس خودی جس سے انسان کی قوت اور ادوی و قوت عمل کے لامحدود امکانات کا تصور وابستہ ہے کسی قدر مبہم ہے۔ آمیز سی لیکن ایک آفاقی چیز ضرور ہے اور ہر کسی کو اپیل کر سکتی ہے۔ مگر خودی کا وہ تصور جس پر اقبالؒ کی فکر کی تمام عمارت کھڑی ہے ایک پیچیدہ اور متعلق چیز ہے جو صرف ماہرین فلسفہ مابعد الطبیعیات کی ہی سمجھ آ سکتی ہے۔ دوسروں کے بس کی نہیں۔ یہی بات تصور عشق پر صادق آتی ہے۔ اس کا عام مفہوم تو سمجھ میں آتا ہے لیکن جب اس کے دائرہ برتسوں کے تخلیقی ارتقاء و وجدان اور نقطے کے میلان اقتدار سے جاملنے میں تو ہم پھر منہ دیکھتے رہ جاتے ہیں کہ یہ سب کیا ہے تصور کیا تو ان سب سے پیچیدہ چیز ہے، اس کا ذکر ہی کیا۔ اسی طرح ان کے کلام میں امدادیت نبویؐ اسلامی فلسفہ و حکمت، متکلمین و حکاک کے شہ پارے، صوفیہ وائمہ کے خیالات، اہل عرفان اور ارباب کشف کے مقامات و احوال کی طرف جا بجا اشارے اور گزشتہ سطر سے تیرہ سو سال میں اسلام کے آغوش میں پلنے والی مذہبی، علمی، سیاسی اور ذہنی تحریکوں کی تاریخ، اقوام عالم کے قدیم و جدید معیانات، ملل و مذاہب کا جدید ارتقاء، خلافت، سلطنت اور ملوکیت کا عروج و زوال، مغرب اور حکمائے مغرب کے نظریے اور تصورات، غرض انسانی تہذیب تمدن کے تمام اہم پہلوؤں پر حکیمانہ تبصرے ملتے ہیں۔ جن سے واقفیت کلام اقبالؒ کے مقصود تک پہنچنے کے لئے ضروری ہے۔ یوں تو اقبالؒ کا نام سن کر ان کے کلام کو پڑھ کر بہت سے لوگ سردھنٹے ہیں اور واہ واہ کہتے ہیں مگر ان میں زیادہ تر ایسے ہیں جو فیشن اور نمائش کی خاطر ایسا کہتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اقبالؒ کا سا کلام پڑھنے کے بعد ایک سیدھی سادی بات جو ایک عامی کی سمجھ میں بھی آتی ہے وہ یہ ہے کہ انسان اپنی صلاحیتوں اور قوتوں کو پہچانے اور ان سے کام لے،

روحی اپنے تجربہ و احساس کے راستے سے اس تصور تک پہنچے ہیں اور اقبال فکر کے راستے سے۔ اسی لئے اقبال کے ہاں وہ مستی و سرشاری، وہ دازنگی، وہ سپردگی، وہ سیلابی کیفیت نہیں پائی جاتی جو روحی کے ہاں ملتی ہے۔ تجربہ و تائثر کی شاعری میں جو عالمگیر اپیل ہوتی ہے وہ خیالات و افکار کی شاعری میں نہیں ہو سکتی یہی وجہ ہے کہ جب اقبال بچہ و ناب راہی کے زیر اثر شعر کہتے ہیں تو خشک و بے مزہ فلسفہ طرائق ہوتی ہے اور جب سوز و ساز روحی کے زیر اثر تو تیغ آبدار۔ اور یہی حصہ کلام آفاقی کہلاتے کا مستحق ہے کیونکہ یہ پُرہذا تاثیر ہے اور اس کی اپیل عام ہے۔ منظوم خیالات و افکار بطور ضرب المثل اور قابل حوالہ بجائے QUOTABLE MAXIMS کے تو خوب ہوتے ہیں لیکن ان کا خطاب زیادہ تر پڑھنے والوں کے دماغ سے ہوتا ہے نہ کہ دل سے۔ اس بات کی وضاحت کے لئے ”ساقی نامہ“ پر نظر ڈالئے۔ یہ اقبال کی بہترین نظموں میں سے ایک ہے لیکن اس کا سب سے زیادہ اثر انگیز اور کامیاب حصہ وہ نہیں ہے جہاں زندگی موت اور خودی کے مسائل چھیڑے گئے ہیں بلکہ یہ ہے :

شراب کہن پھر بلا ستیا	وہی جام گردش میں لانا
مجھے عشق کے پر کا کر اڑا	مری خاک جگنوین کر اڑا
خرد کو خلائی سے آندا کر	جوانوں کی پیروں کا اناؤ کر
ہری شاخ ملت ترے نام سے ہے	نفس اس بدن میں تیرے دم سے ہے
تیرے پھر کھلنے کی توفیق دے	دل مرتضیٰ سوز صدیقی دے
جگر سے وہی تیر پھر پاؤ کر	تنہا کو سینوں میں بیدار کر
تمہے آسائوں کے تاروں کی خیر	زمینوں کی شب زندہ طوں کی خیر
جوانوں کو سوز جگر بخش دے	مرحشقی میری نظر بخش دے
مری ناؤ گر داب سے پاؤ کر	یہ ثابت ہے تو اس کو سیار کر
بنا مجھ کو اسرارِ مرگ و حیات	کیتی نگاہوں میں ہے کائنات
مرے دیدہ ترکی بے خوابیاں	مرے دل کی پوشیدہ بے تابیاں
مرے نازیم شب کا نیاز	مری خلوت و انجمن کا گداز
انگیں مری آرو میں مری	امیدیں مری جستجو میں مری
مری فطرت آئینہ مر و زگار	غزالان افکار کا مرغزار
مرا دل مری زندہ نگاہ حیات	گمانوں کے لشکر عین کائنات
یہ کچھ ہے ساقی متایعِ فخر	اسی سے فقروں میں میں ہوں کبر

مرے قافلے میں ٹانگے سے ٹانگے ٹھکڑے لگا دے لے
اس حصہ نظم میں اقبال کی قلبی کیفیت اور تڑپ لے تاثیر پیدا
کی ہے اور ممکن نہیں کہ کوئی اسے پڑھے اور متاثر نہ ہو اب درامقابلہ
کے لئے ان اشعار کو بھی دیکھیے :

یہ موج نفس کیا ہے ؟ تلوار ہے
خود کی کیا ہے ؟ تلوار کی دھار ہے
خود کی کیا ہے رازِ درد و حیات
خود کی کیا ہے بیدار کی کائنات
خود کی جلوہ بدست و خلوت پسند
سند رہے اک بوند پانی میں بند
اندھیرے اجالے میں ہے تاب ناک
من و تو سے پیدا من و تو سے پاک
ازل اس کے پیچھے ابد سامنے
نہ حد اس کے پیچھے نہ حد سامنے

وغیرہ، وغیرہ۔ یہ پڑھتے ہوئے ہم ہر شعر پر لک کر سوچنے اور
سمجھنے کی کوشش میں لگ جاتے ہیں کچھ سمجھ میں آتا ہے، کچھ نہیں آتا۔
غرض دماغ کو حرکت ہوتی ہے دل کو نہیں کیونکہ ایسے مقامات پر
منکرہ اقبال شاعر اقبال پر مادی ہے۔

علیت اور فکر کے غلبے نے اقبال کے کلام پر جو اثرات پیدا
کئے ہیں ان کا سرسری سا جائزہ ہم لے چکے ہیں۔ آئیے اب اک اور
نکتہ پر غور کریں۔ اقبال کی رفعت و تخیل اور بلند فکری نگاہیں
ایسے اونچے مقام پر پہنچا دیا کہ ایسا معلوم ہوتا ہے وہ ہماری
اس دیکھی بھالی دنیا اور اس کی مادی جذبہ بانی زندگی سے قطع نظر کے
اونچے اونچے بادلوں میں بیٹھ چکا نہ مشورے عمومی انداز میں دے
دے ہیں اور اگر کہہ دے آپ کے مابین نہیں آتے۔ ہمارے روزمرہ
کے دکھ درد اور لطف و مسرت ہمارے روزمرہ
کے تجربات و مشاہدات میں شریک نہیں ہوتے۔
نہ ہمارے ساتھ جیتے ہیں نہ ہمارے ساتھ دوتے
ہیں۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اقبال کی دنیا تصورات اور فکر و تخیل
لطیف و نیلے ہے جہاں مادی زندگی خال خال ہے۔ وہاں فرشتے حور
ہلیں اور مختلف رنگوں کی روئیں تو بہت ہیں مگر گوشت پوست کے
بقیہ ص ۵۸

قرآن السعیدین

(غالب اور اقبال: ایک تقابلی مطالعہ)

سید قدس ت نقوی

تا کا لہر سد کہ دیوار کا رخ والائے سخن در چہ پایہ بلندست و سررشته رکند
خیال در آں فرازستان بکد امیں ذرہ بند
دقیقت ہمیں بغاں بگزرم ز رشک غار صفت پہلے غزیاں خلیدہ باد
اس دعا کے مستجاب ہونے کا اظہار شیخ عبد القادر رحمہ نے اس طرح کیا،
غالب اور اقبال میں بہت سی باتیں مشترک ہیں۔ اگر میں تناسخ
کا قائل ہوتا تو ضرور کہتا کہ مرزا سید احمد شاہ غالب کو اردو اور فارسی شعر کی
سے جو عشق تھا اس نے ان کی روح کو ہم میں جا لگایا۔ چنانچہ دیکھو اور مجبور
کیا کہ وہ پھر جس جہد خاکی میں جلوہ افروز ہو کر شاعری کے چمن کی آبپاری کرے
اور اس نے پنجاب کے ایک گوشہ میں جسے سیالکوٹ کہتے ہیں دوبارہ جنم
لیا اور محمد اقبال نام پایا۔

لیکن میرے نزدیک روح غالب کو تناسخ کے چکر میں مبتلا کرنے
کی ضرورت نہیں بلکہ ان کی آرزو ”چوں من بجز دسرا پاے گفتار گردیدہ“
باب اہمیت تک پہنچی، مستجاب ہوئی اور محمد اقبال کا قالب اختیار کیا۔
دعائیں اتفاق ہے کہ جاوید نامہ میں بھی غالب نے اقبال کو ”چوں من“
ہی سے خطاب کیا ہے، جس نے ”دیوار کا رخ والائے سخن“ کی بلندی
اور ”کند خیال غالب“ کی رسائی کے متعلق کہا ہے

فلک انساں برتری ہستی سے یزدن ہوا ہے پر مرغ تخیل کی رسائی تاکھا
اقبال و غالب ہیں قدر مشترک، ایک حقیقت ثابت ہونے کے
باوجود، تحقیق و جستجو کی محتاج، اور اتنی طولانی جگہ ”سفینہ چاہیے اس بحر
بیکراں کے لئے“ مگر کراہیاں دراز سے دراز تر ہیں کی بدولت، مضمون
کا دوبارہ شوق کہاں؟ ”بیان مجل ہی ہر گفتار کرتے ہیں پڑی، لیکن
”میرے اجمال سے کہتی ہے تراوش تفصیل“ چنانچہ جس سبک کا سلسلہ
فغانی سے شروع ہوا وہ غالب و اقبال پر اگر ختم ہوا، غالب کے خیال میں

ہر نابغہ دہر کی نگاہ ماضی پر بہت گہری ہوتی ہے۔ بادی نظر
میں جو امداد غیر اہم اور جرقہ شوق بہم دینے والی ہو تو اس کو خام و خوار
قابل اعتنا نہیں گروانتے، عظیم ہستی اپنی سے حال کی زبونی کا اندازہ اور
مستقبل کی درخشاں کاسمان بہم پہنچاتی ہے گویا ماضی سے فیض پاتی اور
حال و مستقبل کو فیض یاب کرتی ہے۔ اس اکتساب کو تقلید سے موسوم نہیں
کیا جاسکتا۔ دینے سے دیا جلتا ہے تو روشنی میں اضافہ ہی ہوتا ہے۔ اسی ماضی
قدر مشترک کا راز پنہاں ہے۔ غالب اور اقبال دونوں عظیم شاعر ہیں۔
غالب پیشرو، اقبال دیر با بعد کے نمائندہ۔ اسی لئے اقبال نے غالب
سے آگے قدم رکھا۔ غالب اپنے تجربے، ذوق، شوق، کاوش سے
کا رواں کو جس منزل پر چھوڑ گئے تھے اقبال نے اس منزل سے فاصلہ کو آگے
بڑھایا۔ غالب نے جو چند بہم نقوش، ناقص خاکے اور دھندلے تصور چھوڑے
تھے وہ ایک دور آئندہ دور ارتقاء کی طرف راہنمائی کرتے تھے۔ بات یہ تھی
کہ فاش تر کہنے کا زمانہ ابھی نہیں آیا تھا۔ یہ فاش تر گوئی ازل سے اقبال کے
لئے مقدر ہو چکی تھی۔ غالب نے جس ساز کو چھڑا تھا، لوگوں کے کان اس
سے نا آشنا تھے۔ مگر غالب کے اس ساز کی صدا نے اقبال کے تیز آہنگ
کے لئے ایک فضا ہموار کر دی۔ اس ساز کی صدا سے عوام کی نا آشنائی کا
لمحہ غالب نے متعدد بار کیا اور آئندہ مقبولیت کی پیش گوئی، ان کے
ذوق سلیم، شعور کامل، و جلال خاص اور خود اعتمادی نے کراہی دی:

گو کہم لا بد عدم ادب قبولی بودہ است

شہرت شعور بہ گیتی بعد من غا ہد شدن

اس پیش گوئی کے حق ثابت ہونے میں کسے کام؟ بالکل اسی طرح تمام

بال ان کی آرزو بھی پوری ہو کر رہی:

”یاد ابیں از من چوں من بجز دسرا پاے گفتار گردید یا دینی“

فارسی شاعری کے یہ ادوار تھے :

”رودکی و فردوسی سے لیکر غنائی و سنائی و افریقی و غیر ہم تک ایک گروہ۔ ان حضرات کا کلام تھوڑے تھوڑے تفاوت سے ایک وضع پر رہے۔ پھر حضرت سعدی طرز خاص کے موجد ہوئے۔ غنائی اور ایک شیوہ خاص کا مہذع ہوا، خیال ہائے نازک و معانی بلند لایا۔ اس شیوہ کی تکمیل کی ظہوری و نظیری و عرفی و لونی نے، بجان اللہ قالب سخن میں جان پڑ گئی۔ اس روش کو بعد کے صاحبان طبع نے سلاست کا چرہ دیا۔ صائب و کلیم و سلیم و قدوسی و حکیم شغالی اس زمرے میں ہیں۔“

یہ آخری سبک غنائی کا ہوا جس کے اوصاف، خیال ہائے نازک، معانی بلند، سلاست بیان اور جدت ادا ہیں۔ جس میں بعد کو خیال بندی، مضمون آفرینی اور دقت پسندی کا اضافہ ہوا۔ مولانا شبلی نے اس اضافہ کو عرفی سے متعلق قرار دیا ہے۔ غالب و اقبال کے کلام میں یہ اوصاف بدرجہ اتم موجود ہیں۔ یہ سبک جو غنائی سے شروع ہوا وہ برصغیر پاک و ہند میں اور کمال پر پہنچا۔ کیونکہ ہندو کبریٰ میں جو شعراء ایران سے آئے اپنے ساتھ ہی طرز لائے، پاک و ہند کی آب و ہوائ نے اس میں رنگ و بو دے دیا اور ”ورلے شاعری چیزے دگر“ بنا دیا اسی بنا پر ”سبک ہندی“ ایک الگ نام قرار پایا۔ یہ سبک غالب تک پہنچے پہنچے بڑا بگھیرا ہوا جاتا ہے اور سلجھ بھی جاتا ہے۔ غالب نے اس کے بہترین اور نمائندہ شعراء کا ذکر کر دیا ہے۔ ناصر علی اور بیدل اہم شاعر ہوتے ہوئے بھی اس گروہ سے الگ ہو جاتے ہیں کیونکہ اس طرز میں بے اعتدالی سخت مضرتناج پیدا کرتی ہے۔ خاص طور پر بیدل بے اعتدالی کے شکار نظر آتے ہیں۔ یہ بے اعتدالی، پُر بیچ تشبیہات و استعارات اور صرف خیال بندی ہے۔ بیدل کے ہاں دلی کیفیات و واردات کا فقدان ہے اور خیال بندی کی بہتات۔ مگر غالب نے مشق سخن طرز تبدیل ہی کر شروع کی اور کہہ اٹھے :

طرز تبدیل میں رختہ لکھنا اسد اللہ خاں قیامت ہر

یہ غالب کا پہلا اجتہاد تھا کہ اردو میں ایسی طرز کی بنیاد رکھی جس کو فارسی میں نہانا کارے دارو، چہ جائیکہ اردو میں طرز بیدل میں مشق سخن کرنے سے غالب کو نقصان بھی پہنچا اور فائدہ بھی۔ نقصان یہ کہ ایک مدت تک وہ ”مضمون خیالی“ نظم کرتے رہے اور بقول خود ”بیشتر از فراخ روی ہے جاہ ناشناساں برداشتے و کثری رفتار آناں را لغزش مستأ

انکاشے“ اور فائدہ یہ کہ دوز کار تشبیہات و استعارات کی جستجو میں قوت مخیلہ تیز سے تیز تر ہوئی گئی جس نے سلامت روی کے دور میں بڑا فائدہ پہنچایا۔ اقبال بیدل وغیرہ کی بے اعتدالی کے شکار نہیں ہوئے کیونکہ ان کے سامنے غالب کا ہوا رکھا ہوا راستہ موجود تھا۔

غالب اور اقبال دونوں اردو اور فارسی کے شاعر ہیں۔ انداز سخن و علوئے تخیل میں یکساں، فلسفہ کے مذاق اور ژرف نگاہی میں ہم یکہ۔ اقبال نے اسلوب بیان غالب ہی کا اختیار کیا۔ وہی نادر تشبیہات و استعارات، وہی جدت ادا، وہی نزاکت خیال، وہی معانی کی بلندی وہی دقت پسندی غالب کا طرہ امتیاز، قدر تو انائی لہجہ، اقبال کے ہاں دو آتشہ، سہ آتشہ، بلکہ چہار آتشہ بن گئی ہے دیکھئے :

مکن نہیں کہ سب کو لے ایک سا جواب

آؤ نہ ہم بھی سیر کریں کوہ طور کی

یہی بات اقبال کے ہاں چہار آتشہ بن کر کچھ اور صورت اختیار کر لیتی ہو۔ غالب سوال دیدار بامید جلوہ کے قابل ہیں مگر اقبال کہتے ہیں :

تا کجا طور پر در پوزہ گری مثل کلیم

اپنی مٹی سے عیاں شعلہ سینائی کر

نادر تشبیہات و ترکیب الفاظ و جدت ادا، استعارات، بیچ کی دونوں کے ہاں بہتات ہے۔ چند مثالیں ملاحظہ فرمائیے : غالب :

دام ہر موج میں ہو قطعہ صد کام نہنگ

دیکھیں کیا اگر مے ہو قطرے پر گہر مجھے نہنگ

ہر تو خولہ سے ہے شبنم کو فنا کی تعلیم

ہم بھی ہیں ایک غنایت کی نظر بونے نہنگ

حسن در جلوہ گر بہانہ کشد منت غیر

ہر گل از خوشن مست آتش داماں زود

شادی و غم ہمہ سر گشتہ تراز یکد گراند

روذر روشن بود اوج شب تار آمد و رفت

اقبال کے کلام سے اردو میں ”ماہ نوہ“ اور ”مجنون“ سے چند شعر کافی ہیں۔

اور دو تین شعر فارسی کلام سے جتہ جتہ پیش کئے جاتے ہیں :-

فیٹ کر خورشید کی کشتی ہوئی عرقاب نیل

ایک منکر اتیرا پھر تلہے روئے آب نیل

چرخ نے بالی چلائی ہے عرو میں شام کی
نیل کے پانی میں یا بھلی ہے سیم خام کی

جگنو کی روشنی ہے کاشانہ چمن میں
یا شمع جل رہی ہے پھولوں کی بچن میں
چھوٹے سے چاند میں ہے غفلت بھی روشنی بھی
نکلا کبھی گہن سے آیا کبھی گہن میں

ہمہ آفاق کہ گیسرم ہنگامہ ہے اورا
حلقہ ہست کہ از گردش پرکارن ہست
یک نوا، بے سینہ تاب آورده ام
عشق را بعد شباب آورده ام
کرم شب تاب است شاعر و شبنان وجود
در پرو بالش فروغی گاہ ہست و گاہ نیست
واقبال کی غزلوں کا ہر حیثیت سے موازنہ کیا جاسکتا ہے لہٰذا
یہ قدر مشترک کی بہترین مثال ہیں:

غالب:-

سوفت جھرتا کھانج چکیدن دہم
رنگ شولے خون گرم تا بہ پیدن دہم
اختری خوشتر از نیم جہاں می باہست
خرد سپر مرا بخت جوان می باہست

اقبال:-

مثل شرر ذرہ راتن بہ پیدن دہم
تن بہ پیدن دہم بال پیدن دہم
باریں عالم درینہ جوان می باہست
رنگہ کابش صفت کہ گران می باہست

تمام تر شہرت ان کے پیام بیداری اور فلسفہ خودی کی وجہ
۔۔ غالب کے ہاں یہ دونوں باتیں منظم و مربوط یا باقاعدہ صورت
ماہیں لیکن ان دونوں کے نشانات ضرور ملتے ہیں جن سے
، غائب کو ایک آئندہ دور ملتقا کا قوی احساس ضرور تھا۔ یا یہ
دہ زمانہ کو ایک ایسی آواز سے آشنا کرنا چاہتے تھے جس کی نے

آئندہ دور میں تیز ہونے والی تھی

بندگی میں بھی وہ آزادہ خود ہیں ہیں کہ ہم
اُٹنے پھرنے در کعبہ اگر دانا ہوا
معنی بیگانہ خویشم تکلف بر طرف
چوں مسہ ذمصرع تابیخ ایجاد خودم
ز آفرینش عالم غرض جز آدم نیست
بگرد نقطہ ما دور ہفت پر کار ہست
زما گرم ست ایں ہنگامہ بگر شور ہستی یا
قیامت می دمدار پردہ خلک کے انسان شد

پیام بیداری کے متعلق بہت سے استعارے ہیں متعدد غزلیں ہیں پسند
غزلوں کے مطلع لکھے جاتے ہیں:

خیز بے باور دے واسرا ہے دریاب
شورش افزائے وصل کا ہو دریاب
سحر و سیر و گل درد میدانت محب
ہلن جہاں گل نفل چیدنت محب

یہاں اقبال کی نظر ”از خواب گران خیز“ سے اس غزل
کا مقابلہ کیجئے، خیز و محب کا انداز بھی دیکھئے

تراخامعنیان از شراب خانہ رست
فون البلیاں فصلی ز زمانہ رست
مژدہ صبح دریں تیرہ شعبانم دادند
شمع کشتہ وز خورشید نشانم دادند
بہا باغ و نقاب از رخ چین برکش
دل مدونہ اگر خون شود در آذر کش
لے ذوق فواہی بازم بخسروش آذر
غوغائے شبیہوں نے بر رنگہ بوش آذر
چوں کس پل بسمل بدوق بلا برقص
جارا نگاہ دار دہم از خود جدا برقص
زخم کہ کہنگی ز قاسا براقتنم
دہم رنگہ بونٹے دینچرا منتنم
بخت دروہا بست بخوام کہ بیدار ش کنم
پانہ غوغائے عشر کو کہ در کار ش کنم

اے عشقِ فانی خیر کنیم طبع
درگسبِ سہرگم درکنیم طبع
صبحِ ست خیز تافسے در ہم انگنم
از نالہ لرزہ در فلکِ عظم انگنم
یہا کہ قاعدہ آسمان بگردانیم
قضا بگردش رطل گراں بگردانیم
اگر بشرِ سخن مد بیان بگردانی
ز سوسے کعبہ رخ کارواں بگردانی

اردو کا مشہور قطعہ "اے تازہ فارہان بساطِ ہولستہ دل" بھی

اسی انداز کا ہے۔

غالب اور اقبال دونوں تقلید سے متفرق تھے۔ دونوں نے
تقلید سے گریز کیا۔ دونوں کے ہاں اس کی مخالفت بھی موجود ہے۔ غالب:

قطرہ اپنا بھی حقیقت میں ہے دریا لیکن
ہم کو تقلید تنک ظرفی مفسور نہیں
تیش بغیر نہ سکا کوہن اسد
سرگشتہ شمار رسوم و قیود تھا
ہاں دیا ویزا لے پیر، فرزندِ آفرم را نگ
ہر گناہ صاحبِ نظرین بزرگان خوش نگ
انہی خیالات کو اقبال کے ہاں دیکھئے

تقلید کی روش سے تو بہتر ہے خود کشی
رستہ بھی ڈھونڈ خضر کا سودا بھی چھوڑے

چہ خوش بودے اگر دیکھو پے زبندِ پاستان آزا درفتے
اگر تقلید بودے شیوہ خوب بے سیر ہم رہ اجداد درفتے

چاک کن پس ازین تقلید را تا بیا موزی از تو حمید را
چند متغیر خیال متفرق اشعار دونوں کے کلام سے پیش کیے جاتے
ہیں تاکہ اقدار مشترک کا صحیح طور سے اندازہ کیا جاسکے:

غالب:

حسنِ فردغِ شمع سخنِ دود ہے اسد
پہلے دل گداختہ پیدا کرے کوئی

آفتہ ایم ہر سر خار سے بخون دل
قانون باغیاتی صحرانوشہ ایم
ہے کہاں تمنا کا دوسرا قدم یارب
ہم نے دشتِ امکان کو ایک نقش پایلا
دہر جز جلوتِ یکتائی مستحق نہیں
ہم کہاں ہوتے اگر حسن نہ ہوتا غنیمت
آرائشِ جمال سے فارغ نہیں ہونہ
پیش نظر ہے آئینہ دائم نقاب میں
مذاقِ شربِ فقر محمدی دلی
مئے مشاہدہ حق خوشش دودم درکش
گزرے علمِ خیال، گل میں شوق کا ذال
موجِ محیط آب میں اسے ہر دست دیا کپڑا
گلستِ رازِ زنگستِ راتِ شام
تو طامی بہارے کہ عالم نزارد
اقبال:

نفس میں سب نامِ تمام خون جسکے بغیر
نفس ہے سولے تمام خون جسکے بغیر
برگ گل ریش ز معنوں میں است
محصورہ من قہر فون من ہمت
تبی زندگی سے نہیں یہ فضا میں
یہاں سینکڑوں کارواں اڑتی ہیں
صوت گرے کہ بیکر درو شب آؤید
از نقشِ این واکں بتلاشتے خود رسید
یہ کائنات ابھی نامِ تمام ہے شاید
کہ آہی ہے فادم عدائے کس کیوں
مقامِ خویش اگر خواہی دریں دہر
بجز دل بند و راہ مصطفیٰ اد
تو شناسی ہنوز شوقِ میر و ز وصل
جلیستِ حیاتِ دودم، سوختنِ ناتمام
لا لائیں گلستانِ دارغِ منشا داشت
تر گس طناز او چشم تماشا داشت

گھبرائے گی؟ وہی زمین کاغذی طوبی کی ایک شاخ، چشم بددور ادھی
ایک حوریت

منشوی: اگر گہرا رہے میں یہ بات بڑے لطیف پیر میں بیان کی
ہے۔ خدا سے شکوہ کیا جا رہا ہے کہ دنیا میں مجھے مصیبتوں کے علاوہ اور کچھ
نہ ملا، زندگی درد و غم حسرت و یاس میں گزری۔ اگر مجھے بہشت ملی بھی
تو میرا دل ناامیدلوں کو یاد کر کے وہاں بھی سکون نہ پاسکے گا۔ وہاں کی نعمت
دنیا کی نعمات کے مقابل میں بے کیف ثابت ہوں گی۔ کیونکہ شورش بہنگامہ
خروش اور نیرنگیوں سے جنت خالی ہے

صبحی خرم گزرتا رہا طہور کجا زہرہ صبح دھام بلور
دم نہروی ہاں مست نہ کو بہنگامہ: غوغائے مست نہ کو
دل پاک مجاہد پے فروش چنگا نش شورش نائے فروش
سیہ سنی ابریاں کجا خزاں چہ نباشد بہاراں کجا
اگر درد دل خیاں کچھ غم بھر دوڑ وصال کچھ
چہنت نہ نہاں سناں کچھ چہلنت دہدو صلی بے انتظار
گر یزدوم بوسہ اش کجا فریب بوسہ گند و نیش کجا
بر دھم دوش تلخ گوئی دیکام و غمکش کام جوئی
نظر بازی و ذوق دیدار کو بفر دوس روزن بدیوار کو
چشم آرزو و مندر و لالہ نزل آشنہ ماہ پر کالہ

غالب کے انہی خیالات کو برنگ و گزاقبال کے کلام میں اس طرح دیکھئے

کجا این روزگارے شیشہ بانے بہشت این گنہ گروں ندارد
عیدہ درد زنداں بوسہ او زینجانش دل نالاں ندارد
خلیل او حرف آتشے نیست کلش یک شرر درجاں ندارد
ہر مرد و نیمقد ز ذوق او خطر از طمہ طوقاں ندارد
کجا آن لذت عقل غلط سیر اگر منزل رو بہ پیاں ندارد
مزی اندر جانے کو ز دوتے کہ یزداں دار و دوطیطان ندارد
پیام مشرق میں ایک نظم بعنوان "حور و شاعر" ہے، حور شاعر سے کہتی ہے
نہ با یادہ میل داری، نہ میں نظر کشائی

عجب این کہ تو ذاتی رہ درسم آشنائی
ہوا کے آفریدی چہ جہان دل کشائے
کہ ارم بخشم آید چوں طلسم سیمائی!
شاعر جس نے پہلے حور و جنت کی طرف آنکھ اٹھا کر کئی نہیں دیکھا تھا

دو ذوق بالکمال شاعروں کے کلام میں قدر مشترک کا جلوہ فرا ہوا
موجود ہے لیکن اس کی سب سے نمایاں مثال تصور جنت ہے۔
غالب واقفان زندگی میں بہنگامہ، رستخیز، عمل سیم، حرکت مسلسل، بہر
لحظہ رنگ و گراور حیرتوں کے تمام کے قائل ہیں۔ حیات کو شوق و ذوق
دار و ذوق سے مضطرب مسلسل اور مسلسل نقصان دیکھنے کے خواہاں ہیں جنت میں
ایک سکونی کیفیت ہوگی اور زندگی میں حرکت و تیرنگی کا فقدان اسی نے
دونوں جنت سے بیزار ہیں۔ مگر حرکت و تیرنگی حیات کے مشاہدہ کا انداز
دونوں کے ہاں جلا کا نہ ہے۔ غالب زندگی کی حرکت، عشق کی زندگی سی
اور اقبال عشق کی مسانت و سنجیدگی بتاتے ہیں۔ مگر یہ عشق دونوں کو کسی
ایک مقام پر گم ہونے نہیں دیتا۔ غالب کے خیالات و دھنوں میں بٹے
ہوئے ہیں ایک تو یہ کہ

ہم کو معلوم ہے جنت کی حقیقت لیکن دل کے خوش کھنے کو غالب بغیر اچھا
دو چیز جس کے لئے ہم کو بہشت عزیز سوائے بادۂ کلام و مشکو کیا
طاقت میں تار ہے نہ دے دلوں کی لگا دوزخ میں ڈالو کوئی لیکر بہشت کو
خوش است کوثر و پاک است بادۂ دروست

ازاں ریح مقدس دریں غمار چہ حظ
اور دوسرا یہ خیال کہ بہشت منزل نہیں بلکہ راہ طلب میں سستائے کامقا
ہے قیامت میں بہشت تو ایک طرف جو جان ہمیں دی جائے گی وہ بھی
نثار دوست دانش کردوں گا

راہیست ز عبد تا حضور اللہ خواہی تو دراز گیر، خواہی کوتاہ
این کوثر و طوی لے کنشائے دارد سرچشمہ و سایہ ایست و تہمت راہ

اور است اگر ہزار چہریم بخشند اور است اگر بہشت نیزم بخشند
بر دست فدائیم بصد گونہ نشاط جانے کہ بروز رستخیزم بخشند
غالب نے بہشت کے متعلق اپنے خیالات جن میں عشق کی زندگی
دستی کا اظہار شرمی کے ساتھ ہے ایک خط اور منشوی اگر گہرا رہیں ظاہر کئے
ہیں۔

"میں جب بہشت کا تصور کرتا ہوں اور سوچتا ہوں اگر مغفرت
ہوگی اور ایک قہر طرا اور ایک حور ملی۔ اقامت جاودانی ہے اور اس
نیک بخت کے ساتھ زندگی گانی ہے۔ اس تصور سے جی گہرا رہا اور کلیجہ
منہ کو آتا ہے۔ ہے ہے! وہ حور جہین ہو جائے گی۔ طبیعت کیوں نہ

شوق بے حد پروہ دارا بردو کہنگی را از تماشای برو
یہ دونوں شعر غالب کے اس شعر کی تفسیر میں ہے
رقم کہ کہنگی ز تماشای را فگنم

دربزم رنگ و بونٹے دیگر فگنم
قرۃ العین طاہرہ کا جواب ختم ہوتے ہی زندہ رود غالب سے
اردو کے اس شعر کے معنی پوچھتا ہے :-

قمری کف خاک تر و بلبل نفس رنگ
لے لالہ نشان جگر سوختہ کیا ہے؟
علامہ نے "نشان جگر سوختہ" حیثیت سے ترجمہ میں مذمت پیدا
کر دی ہے۔ اس شعر کا جو مطلب علامہ کے ذہن میں تھا۔ اس کو انہوں
نے غالب کی زبانی ادا کر لیا ہے۔ ماحصل اس شعر میں آگیا ہے :-
توزدانی این مقام رنگ بوست
قیمت ہر دل بقدر لہائے ذہن بوست

اس کے بعد زندہ رود غالب سے مشہور مسئلہ "اعتناع النظیر
خاتم المسلمین" کے متعلق سوال کرتا ہے کہ اس نیلی فضا میں سیکڑیل چہا
ہیں کیا برو نیا کے لئے الگ الگ اولیا و انبیا ہوتے ہیں؟ غالب کے
جواب میں ایک شعر خود لکھا ہے اور دوسرا غالب ہی کہے:

نیک بنگر اندریں بود و نبود پے بسے آید جہاں باور وجود
ہر کجا ہنگامہ عالم بود رحمتہ للعالمین ہم بود
غالب سے "فاش ترکو" کی فرمائش ہوتی ہے جواب "فاش"
گفتن خطاست" ملتا ہے۔ غالب "گفتگوئے اہل دل بے حال است؟"
کے جواب میں نکتہ برابر رسیدن مشکل است" کہہ دیتے ہیں۔ اس پر
زندہ رود کہتا ہے :-

توسرا پا آتش از سوز طلب بر سخن غالب نیابی لے عجب!
اس کے جواب میں غالب تھوڑی سی وضاحت اور کرتے ہیں
کہ خلق و تقدیر و ہدایت ابتدا اور رحمتہ للعالمین انتہا ہے مگر زندہ رود
اس سے زیادہ اسرار کی نقاب کشائی کا طالب ہوتا ہے۔ غالب جواب
دیتے ہیں :-

لے چوں من بیندہ اسرار شعر این سخن افزوں ترست از اسرار شعر
شاعران بزم سخن آراستند این کلیہاں لے بد بیضا مستند
آہنچہ تو از من بخواہی کافری کافری کو باور لے شاعری

باقی صفحہ ۵۷ پر

غالب کی شخصیت اقبال کے لئے بڑی پرکشش رہی ہے جس
کا اظہار مختلف مواقع پر وہ کرتے رہے ہیں جو ایک طرح سے اعتراض و عظمت
غالب اور اتحاد و معنی کا پہلو ہے۔ علامہ کو یہ شعر بہت پسند تھا جس کو
بعض اوقات غالب انہوں نے جبکہ دی ہے:
تا بادہ رنگ تر شود و سینہ زین تر

بگدا ز دم رنگینہ و در ساغر فگنم
اقبال کے نزدیک یہ شعر غالب کی زندگی کا حاصل تھا۔ اعتراض و عظمت
و اتحاد و معنی کا پہلو "جاوید نامہ" میں بہت نمایاں ہے۔ اراج حلیہ
حلاج و طاہرہ کے ساتھ غالب کی روح بھی ہے۔ غالب کا وہی تصور
جنت کہ اس میں ہنگامہ حیات نہیں، ان کو جنت میں نہیں رہنے دیتا
اور "میر دوام" میں مبتلا رکھتا ہے۔ اقبال کا "جاوید نامہ" ان کا ادبی
معراج نامہ ہے جس میں اپنے خیالات کو ایک نئے انداز سے پیش کیا ہے
"جاوید نامہ" کا سلسلہ معراج ناموں سے ملتا ہے۔ دانتے کی "طرہ" بہ
خداوندی، بھی اس سلسلہ میں زیر بحث آسکتی ہے۔ غالب نے بھی
اپنی مثنوی گہوار میں "معراج" کو نظم کیا ہے۔ دونوں میں فرق ہے
غالب نے معراج نبوی کو بیان کیا ہے اور اقبال نے اپنی معراج ذہنی
نظم کی ہے۔ البتہ کہیں کہیں مراحل و منازل کے بیانات میں مماثلت
بھی پائی جاتی ہے۔ علامہ کی مثنویوں کے مقابلہ میں غالب کی مثنویوں
کا پلہ بھاری نظر آتا ہے۔ یہ اجمال ذرا تفصیل کا محتاج ہے اس لئے کسی
آئندہ صحبت میں عرض کروں گا۔

"جاوید نامہ" میں فلک مشتری پر اراج حلیہ و حلاج و
غالب و قرۃ العین طاہرہ کو پیش کیا ہے۔ آخر میں اہلس نمودار ہو کر
زندگی کا راز، سوز و ناتمام و فراق دوام بتاتا ہے۔ منصرف حلاج کے
افکار علامہ نے خود ایک غزل کے ذریعہ پیش کئے ہیں۔ غالب کی مشہور
غزل "بیا کہ قاعدہ آسمان بگردانیم" غالب ہی کی زبان سے ادا کرائی ہے
طاہرہ کی بھی ایک غزل اسی طرح پیش ہوئی ہے۔ پیر روی زندہ رود
سے کہتے ہیں کہ ان سے سوالات کر کے اپنے دلی شکوک دور کر لے زندہ رود
اپنی مشکلات بیان کرتا ہے۔ پہلے حلاج سے سوالات ہیں وہ جواب
دیتا ہے۔ طاہرہ سے کوئی سوال نہیں کیا گیا وہ حلاج کے بعد ہی اسی
سوال سے متعلق اپنا بیان شروع کر دیتی ہے :-

از گناہ بندہ صاحب جنوں کائنات تازہ آید بروں

اقبال کا انسان کامل

سحر یوسف زئی

آتی ہے کہ اقبال کو قوم کی زبوں حالی نے بہت بے چین کر رکھا تھا مگر درد و کادریاں کیا ہونا چاہئے، اس کی صحیح راہ بھائی نہ دیتی تھی۔ تاریخ، فلسفہ اور روایات، ان سب کو اقبال نے مولانا گرامی میں جو گرمی اور روشنی بعد کو پیدا ہوئی اس کا سراغ ابتدا میں کم ہی نظر آتا ہے، گو صبح صادق کا کرن دکھائی دیتی شروع ہو گئی تھی۔ مدعا یہ ہے کہ یہ دور تلاش و تجسس کے عالم میں گزرا۔

تم بتا دو راز جو اس گنبد گرداں میں ہے
موت اک چھپتا ہوا کا شا دل انسان میں ہے

مگر دیگر مصلحوں کے مقابلہ پر اقبال کی سوچ مختلف تھی اور خود اپنے قول کے مطابق خودی کا تصور ان کے سفر انگلستان سے قبل ہی ذہن میں مرتب ہونا شروع ہو گیا تھا۔ خودی کی تلقین سے انہیں قوم کی اصلاح کی راہ نظر آتی تھی۔ چنانچہ قیام یورپ کے دوران جب ڈاکٹر بیٹ کے لئے مقالہ تحریر کرنا شروع کیا تو اس میں بھی انہوں نے اپنے اس نقش اول کو شامل کر لیا تھا مگر اس خیال کو بچگی اور بلوغ بعد کو پہنچا۔ یہ کیا عناصر تھے، اس کا ذکر آئندہ سطروں میں آئے۔ ہمیں معلوم ہے کہ اقبال نے فارسی کی ابتدائی تعلیم مولانا میر حسن سے حاصل کی۔ قیاس ہے کہ رومی کی شہنوی سے ذوق بھی اسی دور میں پیدا ہوا ہوگا، چنانچہ بعد میں تو انہوں نے رومی کو اپنا پیر و مرشد معنوی قرار دے ہی لیا تھا۔ ممکن ہے ان کے ذہنی علمبان کو رنغ کرنے میں رومی نے رہنمائی کی ہو کیونکہ وہ انسانی ارتقاء وادی و روحانی دونوں کے قائل اور وقت عمل کے شیدائے تھے۔ وہ انسان کے جمادات سے نباتات تک اور پھر حوا و نباتات تک ارتقاء کو کافی نہ سمجھتے تھے بلکہ ملائکہ حتیٰ کہ مسجد ملائکہ تک انسان کے عروج کو دیکھنا چاہتے تھے۔

لیکن اقبال کو سب سے بڑی تحریک خود غنیم قرآن سے پیدا ہوئی تھی وہی بتاتا ہے کہ انسان کی برگزینی کا مقام کیا ہے اور وہ نیا بت الہی لاکھ

انسان کامل کا تصور اقبال کے فلسفہ کا محور ہے اور یہی ان کی شاعری کی اساس۔ اقبال نے انسان کے کردار کو بھارنے میں اپنی شان کے ہلکے اور نیچے دونوں ہی رنگ استعمال کئے ہیں اور اپنے فلسفے کے تانے بانے میں بن کر اسلام کی اصل روح اور اس کی بلند اقدار کو ایک لڑی میں پرو دیا ہے۔ خودی، عشق اور فقر تینوں ان کے مقامات تک ہیں مگر فلسفے کی موٹنگا فیوں اور مسائل کو سمجھنے کے ساتھ ساتھ ان حوال پر بھی ایک نظر ڈالنا ضروری ہے جنہوں نے اقبال کو امتیاز بخشا۔ اقبال کو جو عہد ملا اس میں صحت مند اور غیر صحت مند دونوں ہی عناصر پوری شدت کے ساتھ ایک دوسرے کے ساتھ دست و گریبا تھے۔ قومی زوال تو ابھی چکا تھا مگر اسے سحر کرنے کی تدابیر بھی ہو رہی تھیں۔ مہر سید نے قوم کے مرض کا حل سوچا تھا اور اس کے لئے بڑا کام کیا۔ حال، شبلی، اور اکبر نے اس کام کو آگے بڑھایا اور ان سب اکابر نے مسلمانوں کے زوال کے اسباب پر سوچنا شروع کیا اور اپنے اپنے فکر و فن سے قوم کی اصلاح و تعمیر کی تدابیر بتائیں مگر سوال یہی تھا کہ نئے علوم اور نئی روشنی سے مسلمانوں کا گریز ختم ہو۔ حالی نے ماضی کا افسانہ چھوڑا اور نئے عہد کا ترانہ بھی سنایا۔ مقصود یہی تھا کہ قوم کو نئے برگ و بار نصیب ہوں اور وہ پھر فاتح عالم بننے کا کردار ادا کر سکے۔ اسی طرح شبلی اور اکبر کا کام تھا۔ یہ سب کوششیں اچانے لی میں بڑی محنتا بہت ہوئیں۔ اقبال نے ان درو مند ان قوم کی جلالتی ہوئی مشعل کو اور زیادہ فروغ دیا۔

اقبال شروع ہی سے قوم کے درد سے آشنا اور دلگیر تھے اور مدد و اکی تلاش میں تھے۔ ابتدائی کام میں بھی اصلاح کا پیغام اور قوم کو ابھارنے کی صدا گونجتی سنائی دیتی ہے۔ کچھ اور اس لوگ بھی شعر کے وسیلے سے قوم کی اصلاح و ارتقاء کا کام لے رہے تھے مگر ان میں بھی اقبال متاثر نظر آتے ہیں۔ بانگ درا کے مطالعہ سے یہ بات تو بخوبی سمجھ

نتیجہ یہ ہوا کہ عام مسلمانوں کے تو اُسے بلی مضحکہ ہو گئے۔ مذہبی حلقہ ہی نہیں سالہ معاشرہ فراریت کا شکار ہو گیا۔ اس کے نتائج سن سناؤں گے انقلاب تک ہی محدود نہ رہے بلکہ اس کے بعد بھی مسلمانوں کی رہی ہی قوت کا تعطل و مجہولیت کی زندہ ہو گئی مسلمان ان قدروں سے دور ہو گئے جو دنیا میں خواجگی و سریندی کا موجب بنتی ہیں۔ معاشرہ کے اس آشوب میں معاشی تار و پود بھی بکھ گیا اور مسلمان قومیت کے قبضے میں چلے گئے۔ اگر قومی یا سمیت کی تصویر کھینی ہو تو اردو شاعری پر نظر ڈالئے۔ تیسرے ذاتی نمک ہر شاعر ہی زہر ناک نشتر شعوری یا لاشعوری طور پر جسم ملت میں پرست کرنا نظر آتا ہے۔ اقبال کی تمام تحریریں اس فلسفہ اور اس سے پیدا شدہ نتائج کے خلاف ایک جہاد ہیں۔ گمراہیوں نے اس کا مدد ابھی بتایا ہے اور انسان کامل کا تصور ہمارے سامنے رکھا ہے جس کے لئے خودی کو بیدار کرنا پہلی منزل ہے۔

تصوف کی ایک غلط تاویل توکل و تقدیر بھی ہے۔ جب تو اُسے عمل مفلوج ہو جائیں تو مستقبل کی تاریکی سال میں بھی بھاگتی ہے۔ ہر طرے بیکراں اندھیل پھیل کر ترقی کی راہوں کو مسدود کر دیتا ہے اور سکون یونہی ملتا ہے کہ اپنی بے عملی کے نتیجوں کو کسی اور کے سر ٹھوپ دیا اور عمل کی بجائے یہ کہہ کر بیٹھ رہیں:

رات دن گردش میں ہیں سات آسمان

ہو رہے گا کچھ نہ کچھ گھبراہٹیں کیا

اقبال نے یورپ جا کر دیکھا کہ اس قسم کے حالات میسیت

کو بھی پیش آنے لگے۔ ان کا مقابلہ کرنے کی بجائے وہ نیکی اور فلاح کا راستہ اس ہی میں سمجھنے لگے تھے کہ ”بھٹیس بن جاؤ“ اگر کوئی بھٹیا یا تھاری بڑیاں چباتا ہو تو چبانے دو، کان تک مست ہلاؤ ورنہ زندگی میں فرق آجائے گا۔ اس کے خلاف ڈارون کا انقلاب انگیز نظریہ نتائج للبقا، کاسہلہ کے لٹھے نے ایک احتجاجی آواز بلند کی اور اس غلامانہ اخلاق کی بجائے شاملہ اخلاق یعنی جرأت، تہور، زور سمجھی، قوت اور پندار و اقتدار کو ہی زندگی کی اعلیٰ قدریں قرار دیا۔ وہ عیسائیت سے اس قدر نفور ہو گیا تھا کہ مذہب و تہذیب سے اسے خدا کے دجہ سے بھی منکر ہو گیا اور تفاخر کو ہی اخلاقیات کی اساس قرار دیا۔ اس نے جذبات میں آکر غصہ

جلالی اخلاق پر ہی اپنے فوق البشری سیرت استوار کی جس میں روحانیت اور بقا کا کوئی شائبہ نہ تھا۔ اس کی بہترین مثالیں ملاکو، چنگیز، نوبلین،

مناو اس ہے۔ یہ سب باتیں اقبال کے فکر میں موجود تو تھیں مگر لاشعری طور پر۔ مغرب میں پہنچ کر انہیں مادہ کی سریندی دکھائی دی، معاشی و فطری انگریزیت ہی اخلاقی بستی بھی مشاہدہ کی۔ یہاں انہیں اصلاحی تحریک اور سیرت سازی کے مواد پر بھی عبور حاصل ہوا۔ تیسرا عنصر جس نے فکر اقبال پر اثر ڈالا تھا، ابن عربی کے خیالات تھے۔ اپنے مقالہ کی تحریر کے وقت انہیں تصوف کی تباہ کاریوں کا بھی علم ہوا۔ اور انہوں نے اسے زوال ملت اسلامیہ کا ایک سبب مانا۔ مغرب کے مشرق پر تباہ کن اثر بھی ان کی نظر میں آئے اور انہوں نے تمام باتوں پر غور و فکر کا سلسلہ جاری رکھا۔ یہی چیزیں بصیرت اقبال کی اساس بنیں۔

اقبال نے تصوف کو بھی مسلمانوں کی تباہی کا اصل سبب مانا ہے۔ خاص کر وحدت الوجود جس نے مسلمانوں کو بڑا نقصان پہنچایا۔ یہ مسئلہ خالصتاً علمی نثر ادب ہے۔ ایران سے ہوتا ہوا ہندوستان میں فعل ہوتا ہے شعر واد و موصیاء اس کے خاص طور پر شائق بلکہ مبلغ تھے۔

میر درد کا یہ شعر اس فلسفہ کی ایک مختصر تعریف ہے،

جگ میں آکر ادھر ادھر دیکھا

تو ہی آیا نظر جدھر دیکھا

رفتہ رفتہ یہ عوام پر چھانے لگا اور وہ عمل اور جہاد زندگی کے میدان سے دور ہونے لگے دنیا کو کارزار حیات سمجھنے کے بجائے اسے بھگ اور صرف گزشتہ شے بلانے کی دھن ہر ایک پر ہوا رہی۔ ہر ایک اسے فریب اور دام خیال ہی سمجھتا تھا:

ہستی کے مت فریب میں آ جاؤ اسد

عالم تمام حلقہ دام خیال ہے۔

اس پر اقبال نے اپنے ایک خط میں یہ احساس ظاہر کیا ہے

”ہندی اور ایرانی صوفیہ میں سے اکثرے مسئلہ

فنا کی تفسیر فلسفہ ویدانت اور بدھ فلسفہ کے

زیر اثر کی ہے جس کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ مسلمان

اس وقت عملی اعتبار سے ناکارہ ہے۔ میرے

عقیدہ کی رو سے یہ تفسیر بغداد کی تباہی سے

بھی زیادہ خطرناک ہے“

اس فلسفہ میں اپنی ہستی کو بھلا دینا اور یا اسے دامن بچا کر نکل جانا ہی بڑی حیات ناما گیا ہے۔ یعنی دنیا میں سے کم سے کم حصہ لینا ایک نیکی شمار ہوتی۔

اور پیکر میں نظر آتی ہیں۔

مقصداً قیل ہے۔

ان مقالات میں سے اکثر کی تشریح علوم جدیدہ کی روشنی میں کی جاسکتی ہے مگر بعض نکات ایسے ہیں کہ کھنکھنا مشکل ہو جاتا ہے۔ اگر صرف ہمارے سے کام لیا جائے تو اندیشہ ہے کہ مجموعی بہتیت کو نقصان پہنچے۔ بہر کیف خودی کے باب میں خود اقبالؒ کا ارشاد یہ ہے:-

زمانہ کے دریا میں بہتی ہوئی
ستم اس کی موجوں کا بہتی ہوئی
تجسس کی راہیں بدلتی ہوئی
و مادہ نگاہیں بدلتی ہوئی
ازل سے یہ کشمکش میں اسیر
ہوئی خاک آدم میں صورت پذیر

خاک آدم میں صورت پذیر ہونے اور زمانے کے دریا میں بہتے رہنے سے ایک ارتقا پذیر انسان کی شکل ذہن میں ابھرتی ہے۔ یہ شکل اس انسان کی ہے جس میں ابھی خودی کا نشیمن نہ بنا تھا۔ جس میں روح پھولنے کے بعد سے ارتقا جاری تھا۔ قرآن حکیم کی روش سے انسان کے پتلے کو مٹری ہوئی کیچڑ سے بنایا گیا۔ پھولس میں نفس، جو امری تھا پھول بگا گیا۔ پھول اس کے جسم سے حق کا پیدا ہونا بھی ملتا ہے۔ انسان کو خدا اپنے نائب کا مقام عطا کرنا چاہتا تھا۔ اسی لئے اسے جب دیگر انواع اور فرشتوں پر فضیلت دینی مقصود ہوئی تو علم لاسما دیا گیا۔ یہ علم لاسما فرشتوں کے علم سے زیادہ تھا۔ اس لئے ان پر فضیلت کا موجب بنا۔ علم لاسما کی توحید اور تشریح طوالت طلب ہے۔ اگر اس سے بحث نہ بھی کی جائے تو بھی یہ ماننا پڑتا ہے کہ انسان کو شعور سادہ حاصل ہوا۔ یا اس میں خودی کی پہلی کیفیت پیدا ہوئی۔ اس کے بعد جنّت آدم اور ابلیس کا مسئلہ بھی چلے سارے سامنے آتا ہے۔ انسان نے جو پہلی حکم برداری کی اور اپنے ادا دے اور عمل کی نگرانی کا اعلان کیا۔ وہ خودی کے پورے طور پر طے کی طرف اشارہ ہے بہر حال آدم کے بارے میں اقبالؒ "اہیات اسلامیہ کی تشکیل جدید میں لکھتے ہیں:

"جنت میں آدم کی زندگی دراصل انسانیت کے
اس ابتدائی دور سے عبارت ہے جبکہ اس میں
احساس خود کا پیدا نہ ہوا تھا۔ اور اس لئے اپنے
ارادے اور علم کی قوت سے ماحول سے مطابقت
کرنا نہیں سیکھا تھا۔ اس کا دل آرزو اور حقیق

جیسا کہ ابھی عرض کیا گیا، انسان کامل کے بارے میں اقبال کے فکر میں کچھ مضمّنات طویل و پرامن جاننے سے قبل ہی پیدا ہونے شروع ہو گئے تھے مگر جب خارجی تحریکات قوی ہو گئیں تو ان کی تمام تر وجہ اس سلسلہ پر مرکوز ہوئی۔ اقبال اور دیگر مفکرین کے یہاں انسان کامل کے ارتقائی صفات میں کہیں کہیں مماثلت یا تطابق پایا جاسکتا ہے۔ بعض ناقدین نے ان کا غلط تاویل کی اور اقبال کے خالص اسلامی تصور کو مٹ کر دیا ہے۔ یہ غلطی اس لئے پیدا ہوئی کہ اسلام اور اسلامی عقیدوں کے علاوہ اقبال کے فکری حلقے میں توجہ نہیں سمجھا گیا۔ مگر اب ہم اقبال کا سلسلہ دراز تر و تاجا ملے اور امید ہے کہ ان غلط تاویلات کی صحت ہو جائے گی۔ لفظی کا انقباض کے فوق البشر کی دو دنیاوی صفات میں سے ہے، ڈارون مادی ارتقا کی طرف، مادی کرتا ہے اور ہجرتاں زمان و مکان کا ایک تصور پیش کرتا ہے۔ یہ تینوں اقبال کے فکر سے قریب ہو گئے ہیں۔ ادھر ابن عربی کا روحانی ارتقا، روحی کا تصور عشق اقبال سے ہم آہنگ ہیں۔ غرض یہ سب دھارے نکر اقبال میں اگر ملتے ہیں مگر ان کا اصل سرچشمہ قرآن ہے۔

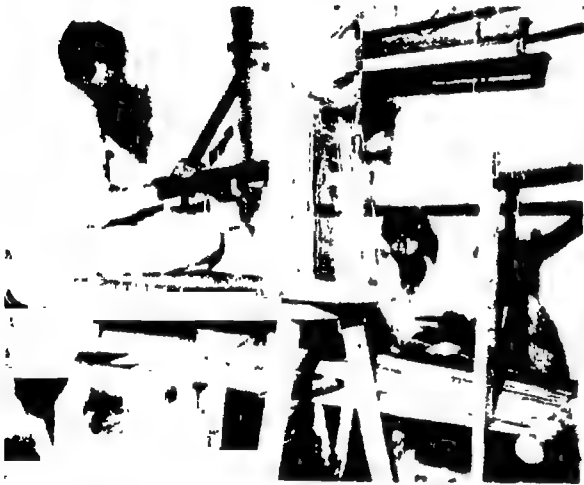
اقبال کا انسان کامل درحقیقت ایک ایسی بلند قامت شخصیت ہے جس میں مادی و روحانی ترقی کا ارتقا مکمل ہوتا ہے اور جس میں اخلاقی اقدار کی بصیرت افزا و مینرش بھی نظر آتی ہے۔ وہ روح اور جسم کی دونوں کا قائل نہیں بلکہ ان کی تفریق کو غلط سمجھتا ہے۔ اس میں جسمانی ارتقا کے بعد شعوری اور روحانی ارتقا بدرجہ ظہور میں آتا ہے۔ یعنی وہ اسلام کی بہترین اقدار کا پھول ہے۔ اس کے ارتقا کے مقامات اقبال نے کمال فنی سے متعین کئے ہیں اور اس کو زیادہ سے زیادہ سنوار کر اس مقام تک پہنچایا گیا کہ بعض کی خام خیالی اس کی کم کو نہیں پاسکتی اور اسے ایک مثالی کردار کہہ کر چھوڑ دیا گیا ہے۔ بلکہ بعض نے تو یہاں تک کہا ہے کہ اس کا وجود اس دنیا میں محال ہے۔ آپسے اس پر غور کریں۔

اقبال کے کلام سے انسان کامل کا ارتقا اس طرح ذہن میں آتا ہے،
دل آدم یا انسان کی پیدائش اور انسان کی شکل میں اس کا
تدریجی ارتقا۔

(۲) شعور یا خودی کے وسیلے سے ایوان کا نمود۔

(۳) مادی اور اخلاقی رفعتوں کی تسخیر خودی کی عملی قوتوں سے۔

(۴) خودی کی تکمیل سے روحانی ارتقا کی رفعت کا حصول، جو



غلاف کعبہ

ہے کی سعادت اس سال پاکستان کے نصیب میں آئی۔
 مرقی پاکستان میں لاکھوں انسانوں کے مجمعوں نے دلی
 دت کے جذبات کے ساتھ اس کی زیارت کی۔
 اھرین ”زری“ اور غلاف کعبہ کی تیاری کے محتاج مراحا





صدر پاکستان کی خدمت میں وائے دہی کمیشن کی رپورٹ



یدالفطر کے موقع پر اخوت و مساوات کا روح پرور نظارہ (راولپنڈی)



دورہ مشرقی پاکستان کے سلسلے میں صدر پاکستان،
مارشل محمد ایوب خان کی ڈھاکہ میں آمد - ہوائی اڈے
پر عوام کے ہرخلوص تباک کا جواب



مشرقی پاکستان رائیفلز کے ہاتھ
کی طرف سے کارڈ آف آر

لے کر موت تک اس کے ساتھ رہتی ہے (اور شاید اس سے آگے بھی)۔
چھٹیوں - جوانی اور بڑھاپے کے اکثر تضاد قسم کے واقعات ایک
انسان اپنے ہی سمجھتا ہے۔ باوصف اس کے کہ اس کی شکل میں کافی
تبدیلی ہی کیوں نہ آچکی ہو۔ اگر دو سال سے لے کر ساٹھ سال کی عمر تک
کی مختلف تصویریں کسی کو دکھائی جائیں تو عمل کے تسلسل کی طرح وہ
ان کو اپنی ہی کہے گا۔ اس کا جواب یہی ہوگا کہ یہ میرے عکس ہیں،
تو شکل سے زیادہ عمل کا تعلق "میں" سے ہوتا ہے۔ عمل سے "میں"
بنتی اور ارتقا کرتی رہتی ہے:

یہ موج نفس کیا ہے تنوار ہے
خودی کیا ہے تلوار کی دھار ہے
خودی کیا ہے راز درون حیات
خودی کیا ہے بیداری کا کائنات
پھر زندگی کے باب میں فرماتے ہیں:-

مادم رواں ہے یم زندگی
ہر اک شے سے پیدا و زندگی
اسی سے ہوئی ہے بدن کی خود
کہ شعلہ میں پوشیدہ ہے موجِ مد
من و تو سے ہے انجنِ آفریں
مگر ملین محفل میں خلوت نشیں
پھر آگے ارشاد ہے:

ٹھہرتا نہیں کاروانِ وجود
کہ ہر لمحہ تازہ ہے شانِ وجود
سمجھتا ہے تو راز ہے زندگی
فقط ذوق پرواز ہے زندگی

جتنے مختلف تجربات اور کشمکشوں سے اسے گزارا
جائے گا اتنی ہی اس میں وسعت پیدا ہوتی جائے گی۔
انسان نے بقول ڈیکارت جب سوچنا شروع کیا تھا تو
اسے اپنے وجود کا ادراک ہوا۔ خودی کے اس ادراک سے
اس نے خارج کو سمجھا۔ پرکھا اور برتا۔ اس شعور ذات سے
انسان "جلب منفعت، دفع مضرت، یقین عمل و ذوق حیات
حالیہ، یا انفعیات کی رو سے، شعور کائنات کہنے لگتا ہے۔ تو شعور

کی غلش سے بچنا نہ تھا۔ یہ واقعہ حقیقت اس حقیقت
کی یادگار ہے کہ کس طرح انسان نے اپنے جنی مدانات
کے دائرہ سے باہر قدم نکالا۔ اور ایک آزاد اور انفعی
ایفروہ کا مالک بنا۔ اس میں آگہی - وقوف - شک -
اور خلاف ورزی کی صلاحیت پیدا ہو گئی۔"

رومی بھی جمادات سے نباتات - حیوانات اور آخر میں انسان
نک کے ارتقا کا قائل ہے۔ بلکہ وہ روحانی رفعتوں اور بلند یوں تک انسان
لے پہنچ تسلیم کرتا ہے۔

اگر علوم جدیدہ میں مادیات کے ارتقا کے تصور ہم دیکھیں تو
زارون بائیں اور گری سے کچھ پیدا ہونے اور پھر اس میں عناصر میں
بہتر ترتیب سے ایک ایمبیا کے پیدا ہوجانے کا قائل ہے۔ اگرچہ
اس میں ارادے کا کوئی دخل نہ تھا۔ پھر یہی ایمبیا پھٹ کر زواوہ
بن بٹ جاتا ہے۔ اور ارتقا کے مختلف حیوانی مدارج طے کرتا بند
سے انسان تک جسمانی ارتقا کر کے پہنچ جاتا ہے۔ اس میں تنازع للبقا
یا قوت ارادہ، بہر حال اسے شعور سادہ سے شعور ذات حاصل ہوا۔
انسان کہلانے کا مستحق ہوا۔ اس نظریہ میں اور قرآن کے نظریہ میں
ادویہ نگاہ کے علاوہ بہت کم فرق ہے۔ وہ کسی خاص مقصد اور رفیع مقصد
تسلیم کرنے کی بجائے ابتدا سے انتہا تک قیاسی کڑیاں ملا کر خلطی کہے
ماہس لئے کہ وہ خدا کے دھوکہ تسلیم کرنا پسند نہیں کرتے شعور بھی جسمانی
انفعیات بقول بیچل طبعی انفعالات کا نتیجہ ہے۔

قرآنی اور علم جدید سے ہمیں یہ پتہ لگا کہ انسان کو خودی، شعور
ت، الیزبائیں عطا ہونے ہی سے انسانیت کا درجہ ملا۔ ان سب
ظول کے معنی میں فرق نہ ہوتے ہوئے بھی فرق ہے۔ اس لئے کہ یہ
خاص خاص خاص زلویہ نگاہ کی تراشید ملائیں ہیں۔ جن سے بعض
میں مہرہم ہی ذہن نشین ہوتے ہیں۔ اس میں اقبال کا تصور خودی ان
ب کا مجموعہ بھی ہے۔ اور ان سے آگے بھی بعض معنی لئے ہوئے ہے۔
سب سے پہلے "میں"۔ انا۔ یا ایفروہ کو اپنے طور پر سمجھ لینا چاہئے تاکہ یہ
ملو ہو سکے کہ آخر انسان کو کیا ملا جس سے جمادات یا جانوروں کی بہتر
خاند ہوا۔ یا وہ چیز ہمارے اندر کیا ہے جس کی ترقی پر اقبال اتنا
دوبلتا ہے۔

پھر شخص کے اندر ایک "میں" ہوتی ہے۔ یہ میں بیدارش سے

حوال اور تحریکات انسانی کے عمل کی وسعت کے ساتھ ساتھ خودی میں وسعت پیدا کرتی ہیں۔ فرد ذاتی اور روحانی لحاظ سے بلند ہونے لگتا ہے۔

خودی کی ترقی یا وسعت کے لئے اقبال تین باتوں کو بنیاد بناتا ہے۔ سب سے پہلے وہ اطاعت پر زور دیتا ہے جس کا مفہوم ہے قانونِ فطرت یا دینِ فطرت کی پابندی۔ اس کا تعلق حیات سے ہے۔ یعنی معاشرے کا پاس کر کے خود اپنی قوت عمل کے لئے ترقی کے مواقع فراہم کرنا۔ اس کے بعد ضبطِ نفس کا مقام آتا ہے۔ اس کا مفہوم ہے خود اپنی خواہشات پر پابندی لگانا اور ان خواہشات کو بحال باہر کرنا جن سے خودی کمزور ہوتی ہے اور ان کی جگہ ان آرزوؤں اور تمناؤں کو فروغ دینا جن سے خودی کی ترقی زیادہ سے زیادہ ہو سکے۔ اور جب خودی ان دونوں عملی اور فکری قوتوں سے لیس ہو جاتی ہے اور ساتھ میں متحد بھی ہو تو نیا ہمت الہی کے مقام پر فائز ہونے کے قابل ہو جاتی ہے۔

خودی کی ترقی دو چیزوں سے ہوتی ہے، تطہیر فکر اور عمل۔ ان سے انسان کی قوتِ تسخیر صلاحیت پاکر زیادہ سے زیادہ پھیلاؤ کے ساتھ خودی کے احکام کے لئے ذرائع فراہم کرتی ہے۔ اپنے اوپر قابو رکھنے اور عمل کو صحیح راہ پر لگانے کے لئے اقبال جس جذبہ پر زور دیتا ہے۔ اب ذرا اس پر بھی غور کریں: مادین دنیا کو دو حصوں میں تقسیم کر دیتے ہیں۔ ایک مادہ اور دوسرا انرجی ENERGY۔ مگر اقبال اس کو خودی اور غیر خودی میں تقسیم کرتے ہیں۔ خودی کے مقابل غیر خودی سے اس کی مراد عالم خارجی سے ہے جس پر خودی اپنے زور عمل سے قابو پا کر ذاتی اور روحانی فیوض سے اپنا دامن بھرتی ہے۔

خودی کی تسخیری قوت کے لئے وہ جس لفظ کو استعمال کرتا ہے وہ ہے عشق۔ اس لفظ کے اندر بڑی ہی وسعت ہے۔ اقبال کے کلام کو اگر سامنے رکھا جائے تو اس لفظ سے عشق مجازی اور حقیقی کے علاوہ ایک نئے معنی بھی ذہن میں آتے ہیں۔ اس مفہوم میں ایک بے کراں سمندر پنہاں ہے۔ جس طرح کہ اقبال روح اور مادے کی دونوں کافال نہیں اسی طرح وہ عشق کی زندگی میں تسخیر کائنات کو بھی نہیں بلکہ روحانی رفعتوں کو بھی پہنچاتا ہے۔

کافیہ لفظ پھیل کر ذات سے نکل کر خارج پر چھا جاتا ہے۔ وہ سوچنے سے ہی اپنے آپ کو نہیں پاتا بلکہ عمل سے اپنا وجود ثابت کرتا ہے۔ ”ہمیشہ شعور میں ایگو کو اس طرح مختلف ادراکات کے ذریعہ سمجھانا چاہتا ہے جس کو میں اپنی ذات یا خودی کہتا ہوں جب اس کے اندر داخل ہو کر دیکھتا ہوں تو ہمیشہ سردی گرمی، روشنی تاریکی محبت نفرت، لذت و الم کسی نہ کسی خاص ادراک پر ہی پاؤں پڑتا ہے۔ بغیر کسی ادراک کے اپنی ذات کو کسی نہیں پکڑ سکتا۔ نہ اس ادراک کے سوا کسی اور شے کا مشاہدہ ہو سکتا ہے۔ خودی اور اکات کے مجموعے کا نام ہے جو ہمیشہ بہاؤ میں رہتے ہیں۔“ (ڈاکٹر میر ولی الدین)

اقبال خودی کو وحدت و جدائی یا شعور کا روشن نقطہ کہتا ہے جس سے ”تمام انسانی تخیلات۔ جذبات۔ تمنیات مستبیز ہوتے ہیں۔“ یعنی شعور ذاتِ حامل ہو جانے سے انسان کے اندر آوازِ حق اور عمل کی گونج پیدا ہوتی ہے۔ پھر یہ روشنی کی وہ کرن ہے جس سے ہر چیز میں زندگی بھی پیدا ہوتی ہے۔ اور اس کے حصول کے لئے فکر اور عمل کا توازن بھی قائم ہوتا ہے۔ اس سے انسانی میں توانائی بھی پیدا ہوتی ہے۔ اور حصولِ مقصد کی راہیں بھی ہموار ہوتی ہیں۔ پھر یہ بذاتِ خود قوتِ خاموش ہے۔ جو کہ انسان کی منتشر قوتوں کی شیرازہ بند ہے۔ جب انسان تعین ذات کر کے عمل سے اپنی خودی کو وسعت بخشتا ہے تو وہ ارتقا کرتا رہتا ہے۔ اس کے ارتقا کی بھی وہی بے مقصد یا مقصد شکل ملتی جس سے وہ عرفان ذات تک پہنچا۔ پھر اس کے بعد وہ اپنی قوتوں کو اس سے بھی بلند تر مقاصد کے لئے استعمال کرنے کے لئے خودی کی کھلی کوتاہی کر کے آگے بڑھتا ہے۔ اور جتنی بھی اس کی خودی میں کٹاں زیادہ ہوگی۔ اتنی ہی مستحکم ہوتی جائے گی:

بڑھے جا یہ کوہ گراں توڑ کر
طاسم زمان و مکاں توڑ کر

اور پھر:

جہاں اور بھی ہیں ابھی بے نمود
کہ خالی مہنیں ہے یہ غیر از وجود

انسان جب تعین ذات کر کے عمل شروع کرتا ہے تو اس کے ادراکات میں وسعت پیدا ہوتی ہے۔ مگر اس وسعت میں بھی ایک وحدت ہوتی ہے۔ جس کا مرکز خودی ہوتا ہے۔ یہ تمام

مجھاتی ہے اور جس پر عمل کی قوت سے جذبہ فتح پالیتا ہے۔
انجی۔ سی۔ وائل کہتا ہے کہ "عقل اس ذہنی عمل کا نام ہے۔
جو اپنے جذبات کو نامحسوس طریقے سے کامیابی سے آشنا
کرتے۔" فرائڈ کہتا ہے کہ "عقل ان عقائد کیلئے جو ہم کھنا
چاہتے ہیں دلائل فراہم کر دیتی ہے۔" اس بارے میں ایک
اور مغربی مفکر کی رائے بھی بڑی نتیجہ خیز ہے: "عقل بھی
جذبات پر غالب نہیں آسکتی۔ ایک جذبہ کو دوسرا جذبہ ہی
مغلوب کر سکتا ہے۔" یونیورسٹی رپورٹ ۱۹۶۱ء کا یہ جملہ
قابل غور ہے کہ "انسان کی عقل اس کی رہنمائی اور صریح کرتگی
جو اس کے حق میں مفید ہوگا۔"

جذبات اچھے اور بُرے دونوں ہوتے ہیں۔ اور اسی
لحاظ سے اس کے نتائج مرتب ہوتے ہیں۔ اقبال کا عشق اچھے
اور تخلیقی جذبات کا مفہوم ادا کرتا ہے۔ اقبال کے ہاں اچھے
جذبات کو ایک ہی کسوٹی میں کسا جاسکتا ہے اور وہ ہے
خودی اگر ایک جذبہ خودی کو طاقت، رفعت اور وسعت
بخش دیتا ہو تو اچھا ہے ورنہ برا۔ پھر یہ اچھا یا برائی
صرف ذات تک محدود نہیں رہتی بلکہ اقبال خودی کے ساتھ
بنوردی کا بھی مبلغ ہے۔ اس لحاظ سے اچھے اور برے جذبات
میں انفرادی پسند یا خیر کو ہی کسوٹی نہیں بنایا جاسکتا اگر ذاتی
منفعت یا استحکام کو ہی ضمیر کی آواز سمجھ لیا جائے تو اجتماعی
شیرازہ منتشر ہونے کے علاوہ فرد کی اپنی خودی بھی خطرے
میں آجاتی ہے۔ اس لحاظ سے رہنا کا ہونا ضروری ہے بغیر
اس کے جذبات کسی وقت بہک کر غلط رخ اختیار کر کے
خودی کو برباد کر سکتے ہیں۔ لہذا سیدھا سا نتیجہ یہ نکلا کہ قرآن
جو خدا کا کلام ہے بہترین رہنما ہے۔ قرآن پر عمل ایک طرف
تو خودی کو مستحکم بنیادوں پر کام کرنے کی توانائی بخشتا ہے،
دوسری طرف اس کے دل سے خوفِ خیر اللہ کو ختم کر دیتا ہے۔
اس لئے موعود کا ہر کسی اور کے آگے جھک ہی نہیں سکتا۔
اور نہ خیر اللہ سے اس کے دل میں خوف ہی پیدا ہوتا
ہے۔ جس کا منصب یہ ہو کہ "وہ خدا سے راضی ہو۔
اور خدا اس سے راضی ہو۔" تو اس کے اوپر "حزن و خوف"

مقاصد سے بچنے، تعمیر اور تخلیق میں غیر مغربی اہمک اسی سے
پیدا ہوتا ہے۔ یہ اگر مقاصد متعین کرتا ہے تو پھر ان کو تسخیر اور
جذب کرنے کی قوت عمل بھی بخشتا ہے۔ اقبال نے عشق اور
عمل میں خاص امتیاز قائم کیا ہے:

"عقل اسباب و علل کی پابند ہوتی ہے۔"

کسی کو اپنے قابو میں لانے کے لئے طرح طرح
کے جال پھیلاتی ہے پھر بھی عقلی تقورات
کی بنیاد ہمیشہ شک پر ہے۔ اس کے برعکس
عشق میدانِ عمل میں بے دھرمک کو دہشتا ہے۔
مکر و فریب کی جگہ اسے اپنی قوت پر اعتماد
ہوتا ہے اور اس کی بنیاد عزم و یقین پر
ہوتی ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ عقل کے تعمیری
کام بھی عمل سے دوچار ہوتے ہیں مگر عشق
کی ظاہری تباہیاں بھی انجام کار آبادی و
کامرانی سے دوچار ہوتی ہیں؟

(ڈاکٹر محمد طاہر فاروقی: اقبال کا تصور انسان کامل)

اقبال عقل بے عمل کے خلاف ہے۔ وہ تقورات کے گمراہوں
میں بسنے اور گمراہ نشینی کے بھی خلاف ہے۔ وہ اس علمیت
اور عقلیت کو بیکار سمجھتا ہے جس میں ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ رہنا
اور خیالی قلعے بنانا ہی سب کچھ ہو۔ وہ عقل کو عشق کے بغیر ایک
بیکار شے تصور کرتا ہے۔

اگر عشق کو علوم جدیدہ کی روشنی میں سمجھا جائے تو یہ
ماننا پڑتا ہے کہ اقبال نے اس کو بلند جذبات کے معنی میں
استعمال کیا ہے۔ اور یہ ماننے کے لئے ہمارے پاس یہ دلیل
ہے کہ اقبال فلسفہ اور نفسیات سے بخوبی واقف تھے اور
اسی لئے انہوں نے مجرد عقلیت پر جذبات کو فوقیت دی ہے۔
اگر نفسیات کے ماہروں اور فلسفیوں کی آراء کا اس باب میں
تجزیہ کیا جائے تو اقبال کی یہ کوشش مستحسن نظر آتی ہے کہ
انہوں نے عشق کو عقل پر فضیلت دی۔ جو فطری بات ہے۔
اس لئے کہ عقل جذبات کی لونڈی ہے عقل یا علم بذاتِ خود
کوئی عملی قوت نہیں بلکہ جذبہ کی شہ پاکر کام کرنے کی صحیح راہ

اور اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ اپنے اعمال میں اپنے خلیج جگر کی آمیزش کرتا ہے تب ہی کائنات اور زندگی میں دیک اور حسن آنکھیں کھولتا ہے۔

نقش ہیں سب ناتمام خون جگر کا بغیر

نغمہ ہے سودائے خام خون جگر کے بغیر

اقبال کو اپنے اس قول کی صداقت پر یقین تھا کہ ہر صحیح

مومن فوق البشر ہے۔ اور اسلام وہ بہترین سانچہ ہے جس میں فوق البشر

ڈھلتے ہیں۔ اسی لئے انہوں نے فوق البشر کے ارتقاء میں اسلامی

حقائق کو بڑی خوبصورتی سے فلسفیانہ اور نیم شاعرانہ انداز سے

واضح کیا ہے۔ وہ مسائل حاضرہ کے الجھے ہوئے مسائل کا بہترین

حل اسی کی ذات کو سمجھتے تھے کہ یہ گمنمایاں بغیر اس کے حل نہیں ہو سکتیں۔

اس لئے کہ آج نہ تو انسان کامل ہے اور نہ یہ موجودہ سانچے ہی اس

قابل ہیں کہ کائنات کو بلند ترین مقامات تک لے جا سکیں۔ اس لئے

کہ ان سانچوں کو خود ثبات نہیں۔ ہر لحاظ میں انقلابات رونما ہو رہے

ہیں۔ ان کا صحیح حل اسلامی عقائد سے اٹھا ہوا انسان کامل ہی ہے۔

اقبال اس بارے میں کہتے ہیں :

"مسلم وہ خاک نہیں کہ خاک اسے جرب کرے۔

یہ ایک قوت نورانیہ ہے جو جامع ہے۔ جو ہر

موسویت اور ایذاہمیت کی آگ اسے چھو جلتے

تو بر دو سلام بن جلتے۔ پانی اس کی حیثیت

سے خشک ہو جائے۔ آسمان و زمین میں یہ سما

نہیں سکتی کہ دونوں ہستیاں اس میں سمائی

ہوئی ہیں۔ پانی آگ جذب کر لیتا ہے۔

عدم بود کو کھا جاتی ہے۔ پستی بلندی میں سما

جاتی ہے۔ مگر جو قوت جامع اعداد ہو اور

محل تمام تناقضات کی ہو اسے کون جذب

کرے۔ مسلم کو موت نہیں چھو سکتی کہ اس کی

قوت حیات موت کو اپنے اندر جذب کر کے

حیات و مات کا تناقض منہا چکی ہے مسلم

حنیف جذبات متناقض یعنی قہر و محبت

اپنے قلب کی گرمی سے تحلیل کرتا ہے اور

اس کا دائرہ اثر اخلاقی تناقضات تک پہنچتا ہے۔

کے پیدا ہونے کا خیال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اس لحاظ سے اقبال

رسول کریم کی تقلید پر بھی زور دیتا ہے۔ جو کہ قرآن کی عملی شکل ہیں۔

جن سے بہتر کوئی بھی اس عملی شکل کو پیش نہیں کر سکتا۔ جب خودی۔

عشق یا جذبہ والہانہ کی آگ میں تپ کر عمل اختیار کرتی ہے۔ اور اس

میں وسعت اور گہرائی پیدا ہوتی ہے۔ تو اس سے انسان ارتقاء کر کے

مرد فقیر کے مقام تک پہنچتا ہے۔

فقر اقبال بے دولتی اور رنجوری کے مفہوم میں نہیں لیتا۔

بلکہ یہ استغنا کے مترادف استعمال ہوا ہے۔ "مرد فقیر جاہ منصب۔

مال عزت فہرت۔ اور سوال سے بلند ہوتا ہے۔" اسلام فقر میں

پیدا ہوا۔ فقر کی گود میں ہلا اور فقری نے ہی اسے ہشتاد ہائی بخشی جھوڑ

کا ارشاد ہے : "الفقر فخری" مومن جب اس راز سے واقف ہو جاتا

ہے تو معاشی یا مادی مسائل اس کے جذب و تسخیر کی قوت کہ نہیں روکتے۔

بلکہ فقر پر بھی وہ فخر کرتا ہے۔ وہ اپنی خودی کو وسعت دینے اور معاشرہ

کی بہتری کے لئے بغیر کسی مالی لاچ کے کام کرتا ہے۔ دولت بھی اسے

ملتی ہے اور حکومت بھی۔ مگر اس کا مقصد اس سے بلند تر ہوتا ہے۔

اک فقر ہے شبیری اس فقر میں ہے میری

میراث مسانی سرمایہ شبیری

جب خودی میں جذبہ والہانہ اور عشق پیدا ہو جاتا ہے

تو وہ آرزو و جستجو کی تلوار سے جذب و تسخیر کرتی جاتی ہے۔ جیسے

جیسے خودی میں وسعت اور طاقت پیدا ہوتی ہے۔ ویسے ویسے

انسان فقری کے مقام پر سفر کر ہو کر مومن کہلانے لگتا ہے۔

یہی مومن ہے کائنات میں خالق کی حیثیت سے جلوہ گر ہو کر

روحانی بلندیوں پر پہنچ جاتا ہے۔ اور خدا پر خلیفہ اللہ کہلانے

لگتا ہے اور اللہ کا ہاتھ بن جاتا ہے :

ہاتھ ہے اللہ کا بندہ مومن کا ہاتھ

غالب و کار آفریں کار کشا کار ساز

خاک و نوری نہاد بندہ مولا صفات

ہر دو جہاں سے غنی اس کا دل بنیاد

اور خدا کا مقصد ہی ایسے مومن پیدا کر کے کائنات کو سنوارنا ہے۔ اور

اس سے کائنات میں ترقی کی راہیں ہموار کرنا ہے :

عقل کی منزل ہے وہ عشق کا محال چوہ حلقہ آفاق میں گرمی محفل وہ

ان معمولی چیزوں کو مستروں کا منبع جان لیتے ہیں مگر جلد ہی یہ راب ٹوٹ جاتا ہے اور غم ہی غم چاروں طرف لپٹا ہوا نظر آتا ہے۔ انسان کامل اس تاریکی کے بے کراں سمندر میں روشنی کا منیار ہے جس کی اپنی خودی کا نور چین چین کر عالم کے نقورات اور تغلیرات پر پڑے گا جس سے یہ کائنات بقعہ نور ہو جائے گی۔ اسی کے دم سے انسانیت کے رستے ناسوروں اور غم اور خوف کی بھٹی میں جلتے ہوئے دل و دماغ کو سکون حقیقی اور مسرت لازوال نصیب ہوگی۔ اقبال کا تمام کلام انسان کامل کے ارتقائی منازل کی تفسیر اور تشریح ہی ہے:

اس کا مقام بلند اس کا خیال عظیم
اس کا سرور اس کا شوق اس کا نیاز اس کا ناز

نیم دم گفتگو گرم دم جستجو
رزم ہو یا بزم ہو پاک دل و پاکباز

نقطہ پر کار حق مرد خدا کا یغی
اور یہ عالم تمام وہم طلسم و مجاز

عقل کی منزل ہے وہ عشق کا حاصل ہے وہ
حلقہ آفاق میں گرمی محفل ہے وہ

محدود نہیں بلکہ تمام طبعی تناقضات پر حاوی ہے۔ پھر مسلم جو حامل ہے محمدیت کا اور وارث ہے موسویت کا اور اہل بیت کا کیونکہ کسی میں جذب ہو سکتا ہے۔ البتہ اس زمان و مکان کی مقید دنیا میں ایک ریگستان ہے جو مسلم کو جذب کر سکتا ہے۔ اور اس کی قوت جاذبہ دنی اور فطری نہیں بلکہ مستعار ہے ایک کھوپا سے جس نے اس ریگستانی کے چمکتے ذروں کو کبھی پامال کیا تھا:

ان باتوں میں کتنی گہرائی اور وسعت ہے۔ اس پر غور ضروری ہے ورنہ انسان کامل کے تمام راز منکشف نہ ہوں گے۔ انسان کامل نہ صرف کائنات کو بہتہ اور بلند مقاصد کی طرف لے جائے گا بلکہ اس کی اپنی زندگی بڑی وقیع و رفیع ہو جائے گی۔ اس کو خوف اور غم سے نجات ہوگی۔ اسی جہان میں ہی وہ خوش و خرم نہ رہے گا بلکہ دوسرے جہان میں بھی اس کی زندگی مستروں سے لبریز ہوگی۔ کائنات کے تمام فلسفے کا بخور سچی مسرت ہے۔ دارِ حق تنازع للبقا۔ مارکس روٹی۔ فرائد جنس، اور نطشے تغاخر کو ہی اصل حیات سمجھتے ہیں مگر یہ سب زندگی کی معمولی ضروریات ہیں۔ اگر ان سب کو اکٹھا کیا جائے تب بھی وہ مسرت جو کہ انسان کامل کو حاصل ہے طئی مشکل ہے۔ اس لئے کہ مسرت کی خواہش کہیں اور سے ہی پھوٹتی ہے۔ ہم غلطی کر کے

★

نقد

جز بقدر آں ضعیفی رو با بخت
فقر قرآن اصل شاہنشاہی است
فقر قرآن اختلاط ذکر و فکر
نکدہ واکا بل ندیدم جز بندہ
(اقبال)

”مطب غزلے بیتے از مرشد روم آور“

(مثنوی مولانا روم کا ایک نادر مخطوطہ)

ابن علی امر وہوی

اگر تاریخ ابن داری تو امید
رُخِ ابرہہؑ ہمیں مانند خورشید
گر ہی خواہی تو تاریخ کتاب
ہست رزمِ مثنوی اندر حساب
اگر تاریخ این مکتوب خواہی
فسر خوانی تو از ذوق الہی
عالمگیر کی ایک ہر دفتر اول کے خاتمہ پر ہے۔ باقی دوسرے
دفتروں پر۔ اول الذکر ہر میں صاف نہیں مگر دفتر مشتمل کے
خاتمہ پر جو مہر ہے وہ کافی روشن ہے :

عالمگیر

(اورنگ زیب محمد)

اس ضمن میں اگر مثنوی کے چند دیگر نایاب مخطوطوں کا ذکر
بھی یہاں کر دیا جائے تو بیجا نہ ہوگا۔ دنیا کے اہم کتب خانوں میں ان
مخطوطوں کا موجود ہونا ثابت ہے :

- ۱۔ کتب خانہ خدیویہ - مصر - مکتوبہ ۴ صفحہ ۶۵۔
صرف دفتر پنجم نامکمل۔
- ۲۔ قونیر، ترکی، عجائب خانہ آثار قدیمہ مکتوبہ
۶۵ رجب ۶۷۷ھ بخط محمد بن عبد اللہ القونوی۔
کامل۔
- ۳۔ کتب خانہ خاند پاشا، قسطنطنیہ، مکتوبہ۔
۱۵ ربیع الاول ۶۸۰ھ بخط اسماعیل بن سلیمان
القیصری۔ نامکمل۔
- ۴۔ برٹش میوزیم - لندن - مکتوبہ ۱۷۸ھ بخط
علی بن محمد الحولوی۔ کامل

مثنوی کے کئی متن اور متعدد تراجم دنیا کی ہر ترقی یافتہ زبان میں
شائع ہو چکے ہیں مگر اس کے قدیم ترین نادر نسخوں اور مخطوطوں کی تلاش
کا سلسلہ ہنوز جاری ہے۔ مجھے بھی ایک ایسے ہی قدیم نسخہ کے دیکھنے کا
کا اتفاق ہوا ہے جس کا ذکر یہاں مقصود ہے۔ یہ نسخہ دکن کے مشہور
محقق مولوی حکیم سید شمس الدین قادری کے گراں مایہ کتب خانہ میں موجود
ہے۔ یہ نسخہ رومی کی وفات کے صرف چالیس سال بعد لکھا گیا تھا۔
ترقیمہ ۷۱۲ھ اس بات پر شاہد ہے۔ یہ نامعلوم ہاتھوں سے گزرتا ہوا
شہنشاہ اورنگ زیب عالمگیر کے ذاتی کتب خانہ میں داخل ہوا جس کی
سند میں خود عالمگیر کی مہریں ثبت ہیں۔

اس نسخہ میں پورے چوبیس دفتر اور ۶۵ صفحات
کو محیط۔ ہر صفحہ پر ۱۷ سطروں اور ہر سطر میں چار مصرعے لکھے گئے ہیں۔
پہلے تین دفتروں کا خط نسخ اور آخری تین دفتروں کا نستعلیق ہے۔ ہر عنوان
کے لئے تین تین روشنائیاں برقی گئی ہیں۔ اول سنہری، دوسری لاجوردی
اور آخر میں شکر فی۔ تیسرے دفتر کے اختتام پر تاریخ نسخ اس طرح ہے :

”تم المجلد الثالث عن کتاب المثنوی

المعنوی بعون الخالق العوی فی ثانی

عشر من شهر ربیع الثانی سنہ اثنی

عشر و سبع مائتہ“

متن کے اطراف میں جو حاشیہ ہے اس کو بعض اشعار و مقامات کی توضیح
کے لئے استعمال کیا گیا ہے اور اکثر جگہ محجب نکات پیدا ہوتے ہیں بعض
جگہ نئے ابیات کا اضافہ بھی ہے مگر جن جگہ کی تحریر ہے ان کا کوئی تعارف
دفع نہیں البتہ کتابت کی جو تین منظوم تاریخیں پہلے تین دفاتر کے
اختتام پر درج ہیں اس بات کو ظاہر کرتی ہیں کہ یہ ۸۵۳ھ
میں لکھی گئیں :

۵۔ میونخ اسٹیٹ لائبریری۔ جرمنی۔ مکتوبہ
۴، شعبان ۱۳۵۶ھ، خط موسیٰ بن یحییٰ
المولوی۔ دفتر دوم نامکمل۔

اس لحاظ سے مذکورہ نسخہ کی قدامت پانچویں نمبر کے بعد اور
قدیم ترین مکمل ہونے کی حیثیت سے تیسرے نمبر پر آتی ہے۔
اقبال کے مرشد معنوی، مولانا جلال الدین رومیؒ
کے علم و فضل کا عظیم ترین مظہر مشنوی ہے۔ مولانا کی علمی و نگاہ
تفسیر و حدیث پر ان کی نظر، تصوف و علوم کے اسرار کی عقدہ کشائی
جو ان کے ہاں ملتی ہے وہ اسلامی فکر و فن کی دنیا میں بے نظیر ہے۔
شرح قرآن اور بیان ارشادات نبویؐ میں انہیں جو بہرہ و خاص
عطا ہوا تھا اس کی مثال بھی کیا ہے۔ دلنشین حکایتوں، مثالوں
و مفید نصائح کا اہتمام، جسے جو امع الکلام کہا جائے تو جاسے۔
ان کے ہاں بڑی خوبصورتی سے نظر آتا ہے جو دل میں گہرا اثر
باتا ہے۔ مشنوی میں جو جوش، جولانی اور انداز گفتار ہے
سے مولوی معنوی پر بس سمجھنا چاہئے۔ ریادہ نمود، خود غرضی
فسانیت اور اہل مدرسہ پر ان کی گرفت خاص طور پر قابل نظر
ہے۔ ان کے ظاہری الفاظ پر نثری لے دے بھی ہوتی رہی ہے
مگر ان کی نیت کے خلوص اور ولولہ ایمانی پر کسی نے شک ظاہر
ہیں کیا ہے۔ غرور و لہو ریا کے پتلوں، پیران سالوس کی
میسہ کاریوں اور ابلیمیت کے غلوں پر مولانا کی خاص نظر
آنانے جو کچھ کہا ہے استعارہ کے حجاب میں رہ کر کہا اور اس
ایک اثر یہ ہوا ہے کہ ان کے فرمودات کی آفاقیت مسلم ہوئی
ہے چنانچہ ہر مذہب و دین کے پیرو اپنے اصول و تعلیمات پر اسے
نطبق کر لیتے ہیں اور اس طرح اسلام کی آفاقی تعلیمات عام ہوتی
آتی ہیں۔

بعض اشعار کو الحاقی کہہ کر مشنوی سے خارج سمجھا گیا ہے۔
لانکہ قدیم نسخوں میں یہ سب موجود ہیں۔ مثلاً میں نے جس خطوط
ذکر کیا اس میں بھی وہ مشہور شعر موجود ہے جسے مطبعہ نے نہیں
خارج کر دیا گیا ہے اور جس پر بڑی بحثیں ہوتی ہیں۔ یعنی:
من ز قرآن مغز را برداشتم
استخوان پیش سگان انداختم

اس شعر پر اہل مدرسہ کا اعتراض ہے کہ اس سے قرآن پر
حرف آتا ہے۔ مگر میری رائے ناقص میں مولانا کا یہ مقصود نہیں
ہے۔ وہ کہنا یہ چاہتے ہیں کہ میں نے محرمات منصوص فی القرآن
سے صرف نظر کر کے صرف محرمات و مباحات پر نظر رکھی ہے۔
مثلاً یہ کہ قرآن نے خرید و فروخت کو حلال قرار دیا اور سود کو حرام۔
میں نے بیع کو قرآن سے لے لیا اور سود کو سود خوروں کے لئے
چھوڑ دیا ہے۔ خود قرآن میں بھی ارشاد ہے کہ ناپاک چیزیں
ناپاکوں کے لئے ہیں۔

منجد اور اشعار کے یہ شعر بھی الحاقی سمجھ لیا گیا ہے:

پچو سبزہ بار بار روئیدہ ام
ہفت صد ہفتاد قالب دیدم

اعتراض ہے کہ اس سے تنازع کا استدلال ہوتا ہے اور وہ غیر مسلم
جو آواگون کے قائل ہیں اس شعر سے سند لیتے ہیں اور اسی لئے
مشنوی کے گرویدہ ہو گئے ہیں۔ مگر مجھے یہاں بھی کوئی اشکال
نظر نہیں آتا اور شعر کو تنازع سے متصل کرنے کا کوئی قرینہ
نہیں سوچتا۔ اصل میں یہ صوفیاء کے عقیدہ تجد و امثال کی
طرف ذہن کو رجوع کرتا ہے۔ مدعا یہ کہ انسان ہر وقت تبدیل
ہوتا رہتا ہے اور اس تغیر احوال کو ہی برزخ کہا گیا ہے۔ یہ
برزخ بھی کئی مدارج میں رہتا ہے۔ برزخ شیخ، برزخ رسول اور آخر
میں برزخ خدا۔ یہ برزخ بھی بدلتا رہتا ہے صوفیوں کے اکثر اشعار
میں یہ معنوں اسی طرح آتا رہتا اور ہمہ اوست تک منہی ہوتا
ہے۔ یہی وحدۃ الوجود کا تصور ہے۔ خلاصہ یہ کہ انسان کسی
وقت بھی ایک حالت پر نہیں رہتا اور ہر قالب بدلتا رہتا
ہے۔ خوشی، غمی، غضب، رحم، جرات، بردی، غرض ہر لمحہ ایک
نیا تجربہ اور احساس ہے جس سے یہ فانی انسان دو چار رہتا
ہے۔ یہاں مولانا نے حیات بعد ممات کا کہیں ذکر نہیں کیا
بلکہ اسی دنیا میں انسان جن احوال و ظروف سے گزرتا چلا جاتا ہے
اس کی طرف ہمیں متوجہ کیا ہے۔ مولانا کا یہ ارشاد نہیں ہے کہ
میں نے سات سو قالب بدلے ہیں، بلکہ یہ کہ اتنے قالب دیکھے ہیں۔
گویا کبھی غافل رہا، کبھی ہشیار، کبھی صحبت حاصل رہی تو
کبھی صحبت طلح۔ غرض گونا گوں ماحولوں سے واسطہ پڑا۔ ایک لہ

جگہ بھر اسی طرف اشارہ ہے:

من بہر جمعیتہ نالال شدم

جفت خوشحالال و بدحالال شدم

مولانا کے ایک اور شعر پر بھی بہت قیل و قال ہوئی ہے

کور کوراز مرد در کر بلا

تا نیفتی چوں حسین اندر بلا

اس کی شرح میں بھی عجیب عجیب موثر گافیاں کی گئی ہیں علامہ قاسم کا حلقہ کہتا ہے کہ یہ شعر منصور حلاج کی طرف راجح ہے۔ اس کا لغز انا الحق حد شرعی کا موجب بنا تھا۔ ان منصور کا پیدائشی نام حسین تھا اور باپ کا نام منصور، یعنی حسین بن منصور الحلاج مگر شہرت باپ کے نام سے ہی پائی۔ یہ بھی کہاجاتا ہے کہ شعر میں "کر بلا" اصل میں "کرب لا" ہے۔ مدعا یہ ہے کہ "مصیبت" جو حسین بن منصور کو لاحق ہوئی خدائی کا دعویٰ کرنے اور اپنی بشریت کے انکار سے ہوئی۔ مگر میرا خیال یہ ہے کہ اس توضیح پر دلی شککتا نہیں۔ میری دانست میں یہاں حسین سے مراد حسین بن علیؑ کے علاوہ کسی کی ذات گزراہی نہیں اور مخاطب سے "کور کوراز" کہہ کر بات صاف کر دی ہے یعنی "تو اندھوں کی طرح کر بلا میں نہ جا" کیونکہ یہ تیرے منصب و مرتبہ سے بعید ہے، کیونکہ جب تک حسینؑ کی طرح امتحان میں پورا اترنے کی صلاحیت نہ ہو اپنے آپ کو آزمائش کے میدان میں اتارنا نہیں چاہئے۔ بلا سے گزرتا تو معراج عاشقین ہے مگر جن میں صلاحیت نہیں انہیں اندھوں کی طرح اس

وادی پُر خار میں قدم نہیں بڑھانا چاہئے۔ یہاں "بلا" سے مراد عام مصیبت نہیں بلکہ ابتلا (امتحان) ہے جو اہل باطن کے لئے آہِ رحمت ہے اور جسے وہ ہر وقت لبتیک کہتے ہیں۔ خود قرآن میں ارشاد ہے "بھیکو آزمایا خدا نے ابراہیمؑ کو چند کلمات سے"۔ تو اس کا یہ مفہور لینا غلط ہوگا کہ خدا نے ابراہیمؑ کو مصیبت میں ڈال دیا کیونکہ خدا تو خود انبیاء علیہ السلام کا محافظ و نگہبان ہوتا اور اس کا ہاتھ انبیاء کے ہاتھ پر ہوتا ہے۔ یہاں بھی مدعا آزمائش و امتحان سے ہے، جس میں ابراہیمؑ پورے اترے۔

غرض مثنوی ایک ایسی تصنیف ہے جس کے پہلو دار معانی شعری آہنگ جوش بیان اور معنویت نے اسے دنیا کی امہات الکتاب میں جگہ دے دی ہے۔ قبول عام کا یہ حال ہے کہ شاید ہی کسی کتاب کو نصیب ہوئی ہو۔ علماء، صوفیاء، اہل ظاہر و اہل باطن سب ہی اس کے مضامین سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔ اس کے پڑھنے کا ایک مخصوص آہنگ ہے اور جو لوگ اس کے غوامض پر نظر نہیں رکھتے ان پر بھی اس کا اثر ضرور ہوتا ہے اور جب بطریق سند اس کا کوئی حصہ پیش کر دیا جائے تو توجہ میں لطف و حاذ بیت دو بالا ہو جاتی ہے۔ غرض مثنوی دنیا کی ایک عظیم کتاب ہے اور جیسے جیسے زمانہ گزرتا جا رہا ہے اس کے متن کی تکمیل و تشریح اور تراجم و تفسیر کی حکایت بھی دلاڑتر ہوتی چلی جا رہی ہے:

☆

چوں شمسائے جہادی روید

عزم جانی جہاد اں کے شوید

ان جہادے عالم جاں در روید

ظفل اجرائے عالم بشنوید

(دعویٰ)

حجابِ تحبلی

عرفان رحمان

زیادہ بابرکت اور ہر کھڑے سے زیادہ پاکیزہ منزہ اور بصیرت افروز ہے۔ پاکستان آج اس بات پر حقیقتاً رجبی فخر کر رہا ہے کہ اس سال اس غلاف کے تیار کرنے کی سعادت اس کے مقدور میں بھی گئی۔

ایک تاریخی روایت یہ بھی کہتی ہے کہ اب سے نو سو سال پہلے بھی ۱۰۷۴ء میں یہ سعادت سرزمین پاکستان کو حاصل ہو چکی ہے۔ پاکستان کے شہر کراچی اور لاہور جتنا بھی ناز کریں بجا ہے کہ اس سال وہاں غلافِ کعبہ کے حصے تیار کئے گئے۔ غلافِ کعبہ کی تیاری کے سلسلے میں حکومت سعودی عرب نے پچھلے سال اگست میں تین افراد پر مشتمل ایک وفد پاکستان اس غرض سے بھیجا تھا کہ وہ یہاں آکر اس کی تیاری کے امکانات کا جائزہ لے چنانچہ دس گز کپڑا بطور نمونہ تیار کر کے سعودی عرب بھیجا گیا جسے سلطان سعود کی منظوری حاصل ہو گئی۔ اس کے بعد یہ کام باقاعدہ پاکستانی ہنرمندوں کو سپرد کر دیا گیا۔ حکومت سعودی عرب کے سفارتی حکام نے اس کام کی نگرانی کی۔ علمائے کرام کی سرپرستی اور ہمارے ہنرمندوں کی محنت و ذہانت سے یہ کام بہت ہی کم وقت میں مکمل ہو گیا۔ جن لوگوں کو یہ کام سونپا گیا تھا وہ وہی حضرات ہیں جنہیں ”بنارسی“ کام کے ماہر کہا جاتا ہے اور جن کے ہنر کا اب دنیا کے ہر ہر گوشے میں تعارف ہو چکا ہے۔ اس طرح پاکستان کے ان صنایع کو ہر جگہ قدر کی نگاہ سے دیکھا جا رہا ہے۔

غلافِ کعبہ تیار کرنے کا کام دو شفٹوں میں ہوتا تھا۔ پہلی شفٹ سولہ گھنٹے مسلسل کام کرتی تھی پھر دوسری شفٹ کام سنبھال لیتی تھی۔ غرض اس طرح شبانہ روز محنت سے اسے مکمل کیا گیا۔ اس کے ریشمی کپڑے کا رنگ سیاہ ہے۔ اس سے قبل مصر سے جو غلاف آتا تھا اس کا رنگ گہرا نیلا ہوتا تھا۔ کپڑے کی بہت میں

گھرجی وہ جو خدا کا گھر ہے بیت الحرام اور بیت اللہ ہے جو اس گھر میں داخل ہوا ہے اللہ کی امان اور سلامتی کی ضمانت مل گئی۔ وہ گھر جو مسلمانوں کا قبلہ ہے۔ وہ گھر جو ہر گھر سے زیادہ برگزیدہ ہے جو دنیا کے جکڑوں میں خدا کا پہلا گھر ہے، جسے ایک لق و قح صحرا — ایک وادی غیر زنی ندی — میں حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے فرزند جلیل حضرت اسمعیل علیہما السلام کے ساتھ مل کر بنا با تھا جس کی دیواریں اٹھاتے وقت وہ اپنی نسل میں ایک ایسے فرزند کی ولادت کی دعا مانگتے جاتے تھے جو اللہ کے دین کی سر بلندی اور اس کے اس گھر کی عظمت کو دو بالا کرنے والی مبارک ہستی ثابت ہو۔ اللہ کے حضور میں یہ دعائے خلیل مقبول ہوئی اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت باسعادت نے دنیا کے ظلمت کردہ میں نور ہی نور پھیلا دیا۔ آج ہی گھر ساری دنیا کے مومنوں کا قبلہ ہے ان کے ایمان کا مرکز و محور ہے جس کی برکتوں سے مالا مال ہونا ہر شیعہ مسلمان پر فرض قرار دیا گیا ہے۔

یہی پاکیزہ مقام مقامِ حج ہے۔ مسلمانانِ عالم کے لئے اپنی جمعیت و مرکزیت برقرار رکھنے اخوت کو ترقی دینے اور دین و دنیا کی برکتیں حاصل کرنے کا گہوارہ ہے۔ یہاں ہر سال دنیا کے ہر گوشے سے مسلمان حج کے لئے آتے ہیں یا عمرہ کرتے ہیں۔ راستے کی تکلیفیں اور طرح طرح کی صعوبتیں بھی خندہ پیشانی سے برداشت کیتے اور رضائے الہی کے جویا ہوتے ہیں۔ جب دور سے یہ پاکیزہ بستی نظر آئے لگتی ہے تو خوشی سے پھوٹے نہیں ساتے۔ ہر ایک کی زبان پڑ لیک! لیک! کانرہ ہوتا ہے۔

اس گھر کی زینت وہ غلاف ہے جو دنیا کی ہر پوشش سے

یہاں آئے تھے۔

کعبہ کی اونچائی ۱۷ گز ہے۔ اس پاکیزہ غلاف کے ۱۷ گز کے مختلف حصے تیار کئے گئے ہیں جنہیں بڑے بڑے کے لئے پاکستان سے ہی کاٹ کر لایا گیا ہے۔

پچھلی جنگ عظیم کے دوران مصر سے غلاف کعبہ کا آہندہ ہو گیا تھا اس لئے سعودی عرب ہی میں اس کی تیاری کے لئے کئے گئے اور اس کام کے لئے برصغیر سے "بنارس کام" کے ماہر بلوائے گئے تھے۔ اس سال غلاف کعبہ کا ایک حصہ تیار کر کے والہ فرم کے مالک کے دادا کو اس موقع پر سعودی عرب بلوایا گیا تھا اب یہ سعادت پھر اسی خاندان میں منتقل ہوئی ہے۔

جب سے یہ خبریں عام ہوئی تھیں کہ اس سال غلاف کعبہ پاکستان میں بن رہا ہے اور وہ بھی کراچی والا ہو۔ کے دو بڑے شہروں میں تو لوگوں کا اشتیاق بہت بڑھ گیا تھا۔ ہر جگہ یہ اسرار کیا جا رہا تھا کہ اس متبرک شاہکار فن کو دکھانے کا اہتمام کیا جائے۔ چنانچہ کراچی اور لاہور میں یہ غلاف حکومت سعودی عرب کے نمائندوں کو سپرد کرنے کی بڑی ہمتورائشان تقریبات منعقد کی گئیں جن میں سفارتی نمائندے، ممتاز اراکین حکومت، ایمان شہر اور قادیان ملت نے خصوصییت کے ساتھ شرکت کی۔ بعض اداروں کی طرف سے بھی غلاف کی زیارت کے لئے خصوصی انتظامات کئے گئے۔ اس کے بعد زیارت عام کے لئے غلاف جابجہ پہنچا یا گیا عدائے کرام اور قومی کارکنوں نے اس کام میں ہاتھ بٹایا۔ ادھر پاک وائسٹن ریلوے نے اسپیشل گاڑیوں کے ذریعے پشاور سے کراچی تک اس کی زیارت کا اہتمام کیا۔ راستے میں پڑنے والے تمام بڑے شہروں کے اسٹیشنوں پر یہ گاڑیاں ٹھہریں۔ دود و نزدیک کے قصبوں دیہاتوں بلکہ دور افتادہ مقامات تک سے لوگ جوق در جوق اسے دیکھنے کے لئے اسٹیشن پر پہنچ گئے۔ ٹرے شہروں میں تو مشتاقان دید کی تعداد لاکھوں تک پہنچ گئی جن میں خواتین نے بڑے چڑو کو حصہ لیا۔ شہروں کے مرکز و مقامات ملکی کوچوں بازاروں اور شاہراہوں سے جہاں جہاں غلاف کعبہ کا جہوس نذرانوں کوں کے ٹٹ کے ٹٹ لگ گئے اور ایسے اہتمام و انتظام سے جلوس نکلتے کہ بہت کم دیکھنے میں آئے ہیں یہ سب ہمارے دلی جذبہ عقیدت کے مظاہرے تھے۔ بعض نے دور سے نظارہ کیا

کلمہ طیبہ نظر آتا اور آنکھوں کو نور بخش ہے۔ اس کا ڈیزائن تیار کرنے والے پاکستانی ہنرمندوں نے اپنی پوری مہارت کا ثبوت دیا ہے۔ یہ غلاف جسے تین دن قبل تیار کیا گیا ہے۔ اس سے قبل کعبہ کو دھونے کی رسم ہی ادا کی جاتی ہے۔ اس مبارک تقریب میں خود جلالہ سلطان سعود و زائکین سلطنت اور اعیان ملک شریک ہوتے اور برکت حاصل کرتے ہیں۔

یہی اطلاع سن کر کعبہ کے گرد حوٹل فرش لگا ہوا ہے اس کی جگہ پاکستانی مہر کا فرش لگا یا جائے گا جن کا رنگ سر ہے۔ اس پتھر کی جانچ کی جا رہی ہے۔ وہ امید ہے کہ یہ سعادت بھی پاکستان کو ہی نصیب ہوگی جس کے لئے ہم حضور باری میں جیتھو بھی شکر ادا کریں گے۔

کعبہ کو غلاف پوش کرنے کی رسم نہایت قدیم ہے۔ قبل اسلام بھی اس پر عمل ہوتا تھا۔ حضور ﷺ کے ہند میں بھی کفار کی طرف سے چڑھایا ہوا غلاف موجود رہا مگر پھر قرابت حق نے یہ شرف بھی مسلمانوں کو پہنچا دیا جس کی تفصیل آگے آئے گی۔

ہمیں معلوم ہے کہ بیت اللہ ایک نہایت کفار کے قبضہ میں رہا۔ یہاں انہوں نے ۱۳۶۰ ہجرت سحر لکھے تھے جن میں لات منات سب سے بڑے تھے۔ جب اللہ نے کفر کی طاقتوں کو شکست دی اور یہ گھر تحقیق معذوں میں عدا کا گھر بنا تو پھر غلاف چڑھانے کی رسم بھی مسلمانوں ہی کے پاس آگئی۔ اور جیسا کہ ابھی عرض کیا گیا اسلام کے ابتدائی دور تک غلاف کعبہ کفار ہی چڑھایا کرتے تھے۔ گھر اس دو میان میں ایک عجیب واقعہ رونما ہوا۔

ایک منی عورت کے ہاتھوں اتفاق سے غلاف کعبہ میں آگ لگ گئی۔ یہ خبر حضور مقبول صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچی تو حضور ﷺ نے فرمایا "پلو اچھ ہوا۔ کفر کی یہ آخری نشانی بھی ختم ہوئی" کفار کے چڑھائے ہوئے آخری غلاف کو اللہ کی حکمت نے اس طرح اپنے گھر سے دور کر دیا۔ حضور ﷺ نے حکم دیا کہ میں میں ہی دوسرا غلاف تیار کر لیا جائے۔ چنانچہ حضرت ابو بکرؓ کے عہد تک یہ غلاف بین سے بن کر آتا رہا۔ حضرت عمرؓ کے زمانہ میں یہ سعادت مصر کو مل گئی اور ہمارے عہد تک یہ سلسلہ جاری رہا۔ اس طویل عرصہ میں چند ہی بار مسلمان سلاطین کے بھیجے ہوئے غلاف

کھائے ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کو شش کرتے تھے۔ جہاں جہاں سے جلوس گزرا اللہ اکبر کے فلک شکافی قندوس سے فضا معور ہو گئی۔ لاکھوں انسانوں کے اس جوش عقیدت اور ایمان ہمدردانوں کو دیکھ کر ہی چاہتا تھا کہ بارگاہ الہی میں قدم قدم پر جدہ شکر ادا کیا جائے۔

یہ چومایہ جوش یہ عقیدت یہ حصول برکت کا جذبہ قدرتی بات تھی۔ مسلمانان پاکستان کے ایمان اور ان کے گہرے دینی شغف کا یہ بڑا روح پرور منظر تھا۔ ہم اس بات پر حیرت مند بھی ہو کر ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے پاکستان کو یہ عازت عطا کی۔ امید ہے دہلے اسلام آباد اس خدمت کو حسین کی نظر سے دیکھا جائے گا۔

یہ نہ صرف ہمارے اہل کمال کے ہنر کی داد اور قدردانی ہے بلکہ یہ پیغام بھی ہے کہ ہمیں اسلامی رہدایات کو برقرار رکھنے، عالمگیر اسلامی اخوت کو ترقی دینے اور اسلام کی پاکیزہ تعلیم پر عمل کرنے میں اور بھی کوشاں ہونا چاہیے، یہ امید رکھتے ہوئے کہ ہماری یہ خدمت مقبول یادگار ہوگی اور اس کے طفیل اللہ کی نعمتیں اور برکتیں تمام مسلمانان عالم اور اہل پاکستان پر ہمیشہ ہمیشہ نازل ہوتی رہیں گی۔

بعض خوش نصیبوں کو نزدیک سے زیارت کا شرف حاصل ہو رہا تھا جہاں آدمی کھڑے ہو کر نظارہ کر سکتا تھا، جہاں سے بھی اس کی زیارت کی جاسکتی تھی وہاں لوگ گھنٹوں پہلے سے جمع ہو جاتے تھے۔ لاہور میں صنعتی ترقیاتی کارپوریشن کے شوروم میں بھی اس کے ایک حصہ کو زیارت کے لئے رکھا گیا۔ اس موقع پر پرنسپل مصری خلافت کے ایک جزو کی زیارت بھی کرائی گئی تھی۔ لوگ انہوہ دریا بنوہ آتے جاتے تھے اور اپنی آنکھوں کو نور بخشے تھے۔

مشرقی پاکستان میں زیارت خلافت کعبہ کا یہ اہتمام ہوا تو جلد یہ کیسے ممکن تھا کہ مشرقی پاکستان کے بھائی اس سعادت سے محروم رہتے چنانچہ ان کو بھی اس سعادت میں شریک کرنے کے لئے ہوائی جہاز سے خلافت مشرقی پاکستان بھی بھیجا گیا۔ ڈھاکہ، چائنا گرام وغیرہ میں لاکھوں انسانوں نے عقیدت کی بجھا ہوں سے اسے دیکھا اور اللہ کا شکر ادا کیا کہ پاکستان کو اس خلافت کے بنانے کی سعادت نصیب ہوئی۔ یہاں بھی جن جن راہبوں سے اس جہاں گزرا لوگوں کا سنا پناہ مجمع ہوتا تھا۔ مشتاقانِ دید بہاں بھی ہر اس جہے پہ نظر آتے تھے جہاں سے وہ اس کی زیارت کر سکیں۔ وہ اس کی زیارت

۴

مسلم شعرائے بنگال

پچھلے چھ سو سال میں مسلمانوں نے بنگالہ شعر و ادب میں شیا بہا اضافے کئے ہیں۔ یہ ان کا ایک مختصر، مگر سیر حاصل انتخاب ہے جو عہدِ قدیم سے معاصر شعرا تک پیش کیا گیا ہے۔

یہ ترجمے احسان احمد اشک اور جناب یونس آحمر نے ہمراہ راست بنگالی سے اردو میں کئے ہیں۔

ضخامت ۲۵۰ صفحات۔ کتاب مجلد ہے پارہہ کی

نقصیں جلد۔ طلافی لوح سے مزین۔ قیمت

چار روپے ۱۰ پیسہ۔ یہی کتاب سادہ جلد میں چاندی

ادارہ مطبوعات پاکستان پوسٹ نمبر ۸۳۔ کراچی

رسم جہاں

اختر جاویدا

ڈھل گئی دھوپ، بڑھ گئے سائے

صحن گلشن میں مسکراتی ہوئی

رقص کرتی ہوئی بہار آئی

ایک گل، آخری ہنسی نہیں کر

نوشگفتہ گل سے کہنے لگا

ہم چلے، رنگ و بو کی محفل سے

(ایک بچکی، سکوت، تنہائی)

خاک پر پتیاں نظر آئیں

اور وہ بھی کہاں نظر آئیں

ڈھل گئی دھوپ، بڑھ گئے سائے

نوشگفتہ گل، بہ اذن حیات

لے کے انگڑائی، ایک پھول بنی

پھر وہی گلستاں، وہی حالات

طلوعِ نو

سلطانِ زیہری

رات بھر بیٹھی ہوئی گوشہ تنہائی میں

اوس روتی رہی گلزار میں آٹھ آٹھ آنسو

جھاملاتے رہے آنکھوں میں ستارے بہیم

جگمگاتے رہے پلکوں پہ گہر بارہ سہی

مسکراتے رہے آکاش پہ بکھرے تارے

گنگناتے رہے سرمست ہوا کے جھونکے

مثل بیگانہ گذرتی رہی آوارہ صنبا

کھلکھلاتے رہے ایلیے رسیلے غنچے

سربہ زانو رہی غم روتی رہی شب بھر بنیم

کوئی مونس، کوئی عزم، کوئی ہجوم نہ ملا!

بستر شب سے کسی شوخ کرن نے اٹھ کر

پھینک دی دور اندھیرے میں ملگتی چادر

حجلہ شوق کے پُر نور درتپے کھولے

گل بداماں، شفقتی پردے ہٹا کر جھانکا

اوس کو باغ میں بیٹھے ہوئے روتے دیکھا

درد انگڑائیاں لیتا ہوا دل میں جاگا

بامِ نور شید سے وہ زینہ بہ زینہ اتاری

مسکراتی ہوئی، ہنستی ہوئی، چمچم کرتی

نرم شیخون سے آجمل سے بے پایاںے ساتھ

چشمِ بنیم سے ڈھلکے ہوئے آنسو پونچھے

مسکراہٹ سی فضاؤں کے لبوں پہ ڈھری

دکھ کی ماری ہوئی دنیا میں اجالے جاگے

آخر شب کے ہم سفر

عظیم سرور

جبار نے "اس" کے ساتھ اپنی آواز طانی شروع کر دی۔
اس ذرا سے ہنگامے میں آدمی رات بیت گئی کہتے ہیں
قدرت شکار یوں کی عمر میں اتنا اضافہ کر دیتی ہے جتنا وہ شکاریں
صرف کرتے ہیں۔

بارہ بجے کا محل ہوگا۔ سچی قریب قریب تیار تھی۔ اسی
وقت انہیں دور کوئی سایہ ساپنی طرف آنا نظر آیا۔ تینوں اُس طرف
دیکھنے لگے اور جب وہ سایہ قریب آیا تو دیکھا کہ بے چوڑے جسم
کا ایک خوبصورت نوجوان ہتھلے پر کالی بگڑی باندھ رکھیں تھی۔
پوستیں میں اُس کا جسم بہت خوبصورت دکھائی دے رہا تھا۔ کانٹھے
پر رانفل تھی۔

"اسلام علیکم"

"وعلیکم السلام" تینوں نے گرمجوشی سے جواب دیا۔
"کہو اس طرف کیسے آئے؟" جبار سمجھا کچھ اور لوگ بھی شکار
کو آئے ہوں گے۔ اور یہ شخص الاؤ دیکھ کر اس طرف نکل آیا ہے۔ لیکن
اجنبی کا جواب بڑا غیر متوقع تھا:
"یوں ہی رات گزارنے کے لئے۔"

"بسم اللہ! بیٹھ جاؤ یہیں" فتح نے مکرانے ہوئے کہا۔
جبار نے بات کا سلسلہ آگے بڑھانے کی خاطر کہا۔ "کہاں
سے آئے ہو؟"

"خارستان سے۔"

"خارستان سے؟"

"اتنی دور سے؟ مگر کب؟"

"ابھی ابھی آیا ہوں۔ اور صبح جب سورج نہ نکل رہا ہوگا
میں یہاں سے چلا جاؤں گا۔"

جتنی دیر میں جبار نے سجدا اور شینے کی سوکھی جھاڑیوں کا بڑا
ڈھیر بنایا۔ عبد القصد اور فتح گئے مل کر مارخور کی کمال اتاری۔

شام کے سائے پھیل رہے تھے۔ اور اس سے قبل کہ پہاڑ
شام کی سرمئی شالی اوڑھ لیتے انہیں الاؤ روشن کرنا تھا پھر مارخور کا گوشت
شہتوت کی پتلی شاخوں پر چڑھا کر الاؤ کے گرد لگاتا تھا کہ لٹن کی شب
بسری کے لئے سچی تیار ہو سکے۔ گوشت کی یہ بہترین قسم لذیذ و خیر
ہوتی ہی ہے مگر جسم کو پہاڑوں کی خنکی سے محفوظ بھی رکھتی ہے۔

مقد، جبار اور فتح آج دوپہر ہی زرغون پہاڑ پر آئے تھے۔
پہاڑ پر آنے کے بعد تھوڑی سی دیر ہی میں انہیں مارخور دکھائی دیا جبار
نے خاموشی سے اُس پر فائر کر دیا۔ ایک گولی کھا کر تو مارخور باسانی بھا
جاتا لیکن وہ غصے میں پلٹا اور پہاڑ کے سینے سے باہر کی طرف نکلے ہوئے
ایک پتھر کے ساتھ اُس کا سر ٹکرایا اور وہ چکر کر گر پڑا۔ اس عرصے
میں عبد القصد اور فتح گئے کی رائفلوں نے بھی آگ اٹھائی اور مارخور
تڑپنے لگا۔ پہاڑ پر آتے ہی بسم اللہ ہو گئی تھی اور اب تینوں کا یہ
خیال تھا کہ اس بار خوب شکار ملے گا اسی لئے تو وہ پورے جوش کے
ساتھ خوشی خوشی اپنے کام میں مشغول تھے۔

جبار نے ایک جگہ کچھ جھاڑیاں جائیں اور انہیں آگ دکھائی۔
سوکھی جھاڑیوں سے ایک دم شعلے بلند ہونے لگے۔ تھوڑی سی دیر
میں مقد اور فتح نے مارخور کا گوشت بھی شہتوت کی ٹہنیوں پر چڑھا لیا
اور الاؤ کے گرد گھاڑ دیا۔

اب محض جم چکی تھی — تھوڑی دیر انہوں نے پہاڑ کی
خوشگوار ہوا، بلندی اور دادی کی خوبصورتی اور حسن کی باتیں کیں۔ انہی
باتوں کے درمیان مقد نے اٹھائی اور کاکڑی غاڑے گانے لگا۔
فتح اور جبار واہ واہ کرتے جاتے۔ پھر فتح نے کچھ بند لگائے اور

”خیریت تو ہے؟“

”ہاں کچھ خیریت ہے بھی اور کچھ نہیں تھی۔“

فتح کھٹے، محمد اور عبدالعجبار کے منہ سے قہقہہ نکل پڑے۔

اجنبی خاموش اُن کے چہرے سے سمکتا رہا۔

پھر جبار بولا۔ ”صاف صاف بتاؤ یا ربات کیا ہے؟“

”کوئی بات؟“

”یہی کہ کس سلسلے میں یہاں آئے ہو تم۔“

”میں اگر تم لوگوں کو نہ بتاؤں تو تم میرا کچھ بھی نہیں گلا سکتے

اور اگر بتاؤں۔۔۔ تب بھی تم کچھ نہ کر سکو گے۔“

”پھر وہی بات۔۔۔ ہم تو بونہی پوچھ رہے ہیں۔ تم بگڑ رہے ہو۔“

محمد نے ذرا دمیر سے کہا۔

اجنبی اُسے گھورنے لگا۔ محمد ہراسا گیا۔

”لو فتح گئے! اپنے بار کو مار خور کی ران تو کھلاؤ۔“

”نہیں! نہیں! میں کچھ نہیں کھاؤں گا۔“

”تو اس کا مطلب ہے کہ یاروں سے ہی ناراض ہو گئے۔“

جبار نے کہا۔

”نہیں۔ میں تم لوگوں سے بھلا کیا ناراض ہوں گا۔“

کتھڑی دیر وہ بونہی بیٹھا رہا۔ پھر جیسے اپنے آپ سے باتیں

کرتے لگا۔ ”جب مولوی اذان دے رہا ہو گا میں لوہڑا کا زینہ پار کر پکا

ہوں گا۔ میرے ساتھ پرسی گل ہوگی۔ اور سورج نکلنے سے پہلے پہلے

میں یہ پہاڑ پار کر جاؤں گا۔ پھر مجھے کوئی نہ روک سکے گا۔ کوئی نہ

روک سکے گا۔ میں پرسی گل کو خاورِ تاشی لے جاؤں گا۔ پھر میری

پرسی گل مجھے ٹپٹے سنا سنائی گی اور میں اُس کے سرے لگے کی تانب

سن کر وجد کرتا رہوں گا۔“

”اچھا تو اس ہم پر آئے ہو تم ادھر سے۔“

”ہاں اور یہ ہم سر کر کے آج فریہ خاں اپنے گھر واپس چلے جائے گا۔“

”اپنی پرسی گل کے ساتھ؟“ محمد نے نغمہ دیا۔

”ہاں! اپنی پرسی گل کے ساتھ۔ پرسی گل کو میں نے پہلی بار

میں کارپز پر دیکھا تھا۔ وہ مشکیزے میں پانی بھر رہی تھی۔ کالے

بچے میں اس کا چہرہ یوں لگ رہا تھا جیسے برف کے درمیان

۔۔۔ میں چاند ہو۔ میں یہاں سے گزر کر خاورستان جا رہا تھا۔ پرسی گل

کو دیکھا تو میریں ڈیرہ کر لیا۔ پھر میں پرسی گل کے باپ، سردار شرب خاں کے

ہاں ذکر ہو گیا۔ اور ایک دلی جب سردار اکیلا تھا میں نے اُس سے کہہ دیا کہ

پرسی گل کی شادی مجھ سے کر دے۔ سردار شرب خاں پہلے مجھے گھورتا رہا۔

پھر بولا۔ ”پرسی گل کے جہیز کے لئے پانچ ہزار روپے دو۔ اگر اتنی رقم

لا سکو تو پرسی گل سے شادی ہو سکتی ہے ورنہ نہیں۔“ شرب خاں کو

یہ معلوم نہیں تھا کہ میں کس باپ کی اولاد ہوں۔ میں نے رات کی

تاریکی میں پرسی گل سے کہا۔ ”میں خراسان جا رہا ہوں۔ وہاں سے تمہارا

جہیز کے لئے روپیہ لے کر آؤں گا۔ اور تمہیں بیاہ کر کے جاؤں گا۔ پرسی گل

رونے لگی۔ وہ کہتی تھی۔ ”میرا باپ دن کی روشنی میں جہیز کے عوض مجھے

تمہارے والے کر دے گا۔ یہ تمہیک ہے مگر میں جہیز کی رسم کو بالکل

فضول سمجھتی ہوں۔ اگر تم مجھے خوش رکھ سکتے ہو تو میں عمر بھر کا ساتھ بنا لینے

کو تیار اور اس رات کی تاریکی میں تمہارے ساتھ چلنے کو آمادہ ہوں۔

مجھے اپنے وطن لے چلو۔۔۔ لیکن میں نے اُسے تسلی دی اور جلد آنے کا

وعدہ کر کے اپنے گاؤں پہلا گیا۔ گاؤں پہنچا تو پتہ چلا میرا باپ مریا ہے،

میں نے اپنے بڑے بھائی سے رقم مانگی لیکن اس نے پیسے دینے سے

انکار کر دیا۔ اگر مجھے اپنے بھائی کے لڑکے سے پیار نہ ہوتا تو میں اُسے

اُسی وقت کوئی کانش نہ بنا دیتا۔ میرے ذہن میں یہ خیال پیدا ہوا کہ

پرسی گل تو میرے ساتھ دیسے بھی آنے کو تیار ہے۔ میں اُسے رات

کی تاریکی میں اُس کے گاؤں سے نکال سکتا ہوں اور جب میں واپس

یہاں پہنچ جاؤں گا تو کوئی۔۔۔ بڑے سے بڑا سردار بھی مجھے اس

سے جیاد نہ کر سکے گا۔ میں یہی سوچ کر اپنے گھر سے نکلا ہوں۔ ابھی میں

پہاڑ پر چڑھ رہا تھا کہ گاؤں کا۔۔۔ پھر پچھلے پہر میں پرسی گل کے پاس جاؤں گا۔

وہ مجھے دیکھے گی تو کتنی خوش ہوگی۔ میں یہاں سے نہیں آؤں گا۔“ میں دن کی روشنی

تو تمہارے لئے نہیں خرید سکا اب رات کی تاریکیوں کی بھیک مانگتا

ہوں! پھر وہ میرے ساتھ چلی آئے گی اور صبح کی روشنی سے پہلے پہلے

ہم یہ پہاڑ پار کر چکے ہوں گے۔ چند ہی دنوں میں ہم اس طرف آ پہنچیں گے

جہاں پرسی گل مجھے ٹپٹے سنا سنائی گی اور میں اُس کے سرے لگے کی تانوں

پر وجد کروں گا۔ بس یہی زندگی ہے، یہی زندگی ہے۔“

جبار، فتح، اور محمد تینوں پر سکتہ سا طاری تھا۔

”ہاں اور سنو! میرے راستے میں تب بھی آیا۔ اُس سے

میری رائے بات کرنے لگی۔ اس کی آواز سے میرے علاقے کے پہاڑ

نے سمجھا ابھی جا کر آپ کو خبردار کر دیں۔ ایک نوجوان خارتھانی سے آیا ہے اور وہ آپ کی لڑکی کو آج رات لے جانا چاہتا ہے۔ آپ ہوشیار رہیں۔ چراغ کی دھندلی سی روشنی میں ردا کا چہرہ ہستیاک دکھائی دینے لگا۔ پھر وہ بولا۔

”مجھے افسوس ہے کہ تم اس وقت میرے گھر پر آئے ہوئے اگر تم لوگوں نے یہی بات باہر سے کہی ہوتی تو میں اس مذاق کا ایسا مزہ چکھاتا کہ ساری دنیا تماشہ دیکھتی ہو۔“

”سردار مذاق نہیں، حقیقت ہے یہ۔“
”کیسی بے وقوفی کی بات کرتے ہو۔“

”سردار ہم سچ کہتے ہیں۔ سردار اس نوجوان کا نام بھی بتا سکتے ہیں۔ اس کا نام فرید خاں ہے۔“

”کیا بات کرتے ہو۔ فرید خاں کو تو آج سے پانچ سال پہلے میں نے خود مار دیا تھا۔ زرغون پہاڑ اور اس وادی کے لوگ اس کے گواہ ہیں کہ میری رائفل کی پہلی گولی نے فرید خاں کا خاتمہ کر دیا تھا۔ اور دوسری گولی پر ہی اسے جگر کے پار ہوتی تھی۔ ان دونوں نے رات کی تاریکی کو دیکھ لیا تھا۔ انہیں یہ معلوم نہیں تھا کہ سورج کی پہلی کرن کے ساتھ ہی وہ موت کے منہ میں بھی چلے جائیں گے۔“ غصہ سے شراب خاں کا سر پھول گیا تھا۔ صدمہ فوج لگے اور جبار تینوں پر ہنسنے لگا۔

ان کی نظریں ایک نوجوان کا ہونٹوں پر تھا جو آگ کے سامنے کھڑا تھا اور کہہ رہا تھا۔

”میں سورج نکلنے سے پہلے پہلے لوہڑ کا کارینر پار کر چکا ہوں گا، میرے ساتھ پر ہی کل ہوگی۔ پھر مجھے۔۔۔ میرا مطلب ہم دونوں کو۔۔۔ کوئی بڑے سے بڑا سردار بھی نہ روک سکے گا اور میری پر ہی کل مجھے طے سنائے گی اور میں اس کے سر پر لے گلے کی تائیں سن کر وجہ کرتا رہوں گا۔“

اور وادیاں خوب آٹھا ہیں۔“

یہ کہہ کر وہ اٹھ کھڑا ہوا اور وادی کی طرف اترنے والے راستے کی بجائے اوپر کی طرف جانے لگا۔

”مٹھروا سہتی تو کھاتے جاؤ۔“

”جہاں بھی۔۔۔ ہم اپنے علاقے میں جا کر اپنے دنبوں کی سہتی کھائیں گے۔“

مٹھروا دیر بعد جب وہ نظروں سے اوجھل ہو گیا تو جبار بولا۔
”اس مقاموں میں سردار شراب خاں کون ہے، اور یہ نام بھلا کیسا ہے؟“

”معلوم نہیں۔“

”میرا خیال ہے ہمیں اسے تلاش کر کے خبر کرنی چاہیے۔“

”ویسے ایک بات کروں“ فتح نے اٹھتے ہوئے کہا۔ اس

نوجوان نے جن دو چیزوں پر بھروسہ کیا ہے وہ دونوں ہی ناقابل اعتماد ہیں۔ سچو دوستو! عورت اور بدوق پر بھی کوئی شخص بھروسہ کر سکتا ہے۔ ہمارے ہاں تو اکثر لوگوں کا عقیدہ یہ ہے کہ معلوم نہیں یہ کب بگڑ جائیں۔“

”لیکن فتح تمہارے یہ بھی سہ بھولو اگر یہ دونوں چیزیں کسی کی ہوجائیں تو لوگوں کے لئے کتنا بڑا مسئلہ بن جاتی ہیں۔ جبار نے رائفل کا منہ پرمچالی۔ ”چلو، روانہ ہو جاؤ۔“

اور تینوں وادی کی طرف اترنے لگے۔

رباب کی آواز نے انہیں ”داشت“ کا پتہ دیا۔ نوجوانوں

کی محفل جی ہوتی تھی۔ یہاں سے ایک نوجوان ان کے ساتھ ہولیا۔

سردار شراب خاں ”موٹی موٹی آنکھوں اور بڑی ڈری گھنی مونچھوں والا وجیہ شخص۔“

طویل خاموشی کے بعد جبار نے کہنا شروع کیا ”سردار! ہم شکار کے لئے زرغون پہاڑ آئے تھے۔ وہاں ایسی بات ہو گئی کہ ہم

رپورٹ تازہ

حجلہ شرق

(مشرقی پاکستان میں چند دن)

عبدالصمد درانی

کی رہائش ہے۔ یہاں مجھے جا بجا تالاب نظر آئے جہاں عورتیں، مرد اور بچے نہاتے دھوتے اور کپڑے برتن وغیرہ صاف کرتے ہیں۔ اس کالونی میں آب رسانی کا بہت اچھا انتظام ہے۔ مولیشیل کے لئے بھی انہی تالابوں سے پانی لیا جاتا ہے۔ میں نے ایک روز اپنے میزبان سے پوچھا کہ لوگ اتنی کثرت سے پانی استعمال کرتے ہیں، سورج کی کرنیں بھی پانی کو سکھاتی ہیں مگر پھر بھی پانی کی مقدار میں کوئی کمی نہیں آتی۔ آخر اس کی وجہ کیا ہے؟ میرے میزبان نے بتایا کہ ”بہت پہلے یہاں بیشمار بھیلین تھیں اور ان میں دریائے پانی برس برس کر کے آتا تھا۔ جب بارشیں ہوتیں تو تالاب کیا پورا میدان اور سڑکیں تک تہہ آب ہو جاتیں۔ پانی اب بھی اسی طریقے سے آتا ہے۔ مگر تالابوں کو مٹی سے بھر دیا گیا ہے اور وہاں عمارتیں تعمیر ہو گئی ہیں۔“

مشرقی پاکستان کو قدرت نے بڑی زرخیز زمین عطا کی ہے۔ اس لئے یہاں مصنوعی ذرائع سے آب پاشی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ یہاں پانی لانے کے لئے نہریں نہیں بنائی جاتیں بلکہ زائد پانی کی نکاس کا مسئلہ ہے اور اس کے لئے نہریں بنائی جاتی ہیں۔ یعنی مغربی پاکستان کے برعکس معاملہ ہے۔ پھر جب یہ نہریں بن جاتی ہیں تو وہ صرف عام ضرورت کو ہی پورا نہیں کرتیں بلکہ معاشی حیثیت سے بھی بڑی مفید ہو جاتی ہیں کیونکہ یہ نہریں آبی شاہراہیں بن جاتی ہیں اور آمد و رفت کا بڑا سہولت وسیلہ۔ جنگلوں سے بانس اور چھاتی لکڑی کاٹ کاٹ کر ان میں بہائی جاتی ہے اور چند نگرانوں کی مدد سے وہ منزل مقصود تک پہنچا دی جاتی ہے۔ دریائی سفر کے دوران کھانا بھی بانس سے ہی پکنا ہے اور وہ بڑا اچھا ایندھن ثابت ہوتا ہے۔ بانسوں کے تحت بنا کر ان پر سوتے بھی ہیں۔ یہاں تو ایسے بہت خاندان ملیں گے جو خشکی پر رہتے ہی نہیں۔ کشتیوں میں ہی

مغربی پاکستان کے لوگ جہاں نوازی میں مشہور ہیں مگر مشرقی پاکستان پہنچ کر محسوس ہوا کہ ہماری یہ قدر بھی مشترک ہے اور یہاں کے لوگ بھی جہاں نوازی میں کسی سے پیچھے نہیں۔ مجھے تو ڈھاکہ پہنچنے کے بعد یہ محسوس ہی نہیں ہوا کہ میں غیروں میں ہوں۔ وہی محبت، وہی عزت، وہی ہلاؤ سلوک جو اسلامی روایات کا نتیجہ ہے۔

ڈھاکہ پہنچنے کے دو تین دن بعد میں نے غسل کرنا چاہا تو اپنے میزبان سے پوچھتے ہوئے ذرا جھجک ہوئی، اس لئے مکان سے نکل کر ایک رکشا والے سے کہا کہ اسی جگہ لے چلو جہاں نہانے دھونے کا بندوبست ہو۔ میری مراد حمام سے تھی مگر وہ مجھے ایک تالاب کے کنارے لے آیا اور کہنے لگا۔ ”صاحب، یہاں آرام سے نہائیے۔“ میں نے ادھر ادھر نظر ڈالی۔ اس پاس کے محلے کے لوگ بڑی کافی تعداد میں اس تالاب کے کنارے نہادھو رہے تھے۔ مگر میں اس طرح نہانے کا عادی نہیں۔ سوٹ بھی پہنے ہوئے تھا۔ اس لئے مجھک تھی۔ خیر رکشا والے کو سمجھا یا کہ میں حمام میں نہانا چاہتا ہوں وہاں لے چلو۔ مگر وہ میری بات بالکل نہیں سمجھا۔ اس کا نہ سمجھنا بالکل قدرتی تھا کیونکہ یہاں حمام کا رواج نہیں ہے۔ مغربی پاکستان میں چونکہ حمام ہر شہر اور قصبہ میں عام پائے جلتے ہیں اس لئے ہم ان کے عادی ہو چکے ہیں۔ مشرقی پاکستان میں حماموں کو عدم موجودگی کی بڑی وجہ یہ ہے کہ یہاں فیاض فطرت نے پانی بڑی افراط سے فراہم کر دیا ہے اور لوگ تالابوں پر نہاتے ہیں۔ مشرقی پاکستان، دریاؤں، ندیوں کی سرزمین ہے۔ بعض بعض جگہوں پر یہ تیز کرنا مشکل ہو جاتا ہے کہ دریا، ندیاں، زمین پر بہتی ہیں یا بانی کے ایک وسیع سمندر کی کشتی خشکی ابھرائی ہے۔

ڈھاکہ کی ایک مشہور جگہ ہے ”موتی جمیل کالونی“۔ یہاں آج کل نئے قسم کے مکانات بن رہے ہیں۔ زیادہ تر حکام اور سرکاری افسران

کو یاد کر لیں۔ اقبال، شاہ لطیف، رحمن بابا، وارث شاہ، خواجہ غلام فرید، نذیر الاسلام، کوئی جیسر الدین اور دوسرے شعراء کے میٹھے ریلے بول بچوں کو ازبر کرانے چاہئیں۔ بچوں میں فلمی گانوں کا میلان روکنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ انہیں اپنے شعری ورثہ سے آشنا کر دیا جائے۔ مشرقی پاکستان کے لوگوں میں ثقافتی اقدار کی حفاظت کا بڑا جذبہ ہے جس کی ہر جگہ تعقید مہنی چاہئے۔ انہوں نے بنگلہ زبان سے غیر مسلم اثرات خاص کر سنسکرت کے الفاظ اور ان کی بجائے آمیزش کو دور کرنا شروع کر دیا ہے اور ہر جگہ اسلامی تہذیب کا چاؤ نظر آتا ہے اور اس طرح مغربی پاکستان کے ساتھ ہم رنگی پیدا ہو رہی ہے۔ رسم الخط سے قطع نظر بنگلہ میں خالص اسلامی تہذیب و روایات کی علمی و ادبی نشانیاں منتقل کرنے کا کام بہت عرصے سے ہو رہا ہے، راز ادبی کے بعد سے تو اس کو خاص جہت ملی ہے۔ بنگلہ شاعری کی بعض اصناف تو خالص اسلامی اثر کا نتیجہ ہیں جیسے لوگ گیتوں میں مرشدی اور معرفتی گیت۔ رابندر سنگھت کے مقابلہ پر نذر گیتی کی گائیکی اس طرف اشارہ کرتی ہیں۔ ہر چند کہ مشرقی پاکستان اسلامی مراکز سے دور افتادہ ہے مگر اسلامی شاعر کی پابندی اور اسلام کی روایات سے وابستگی و شیفتگی وہاں بہت پائی جاتی ہے۔ ذہاک شہر میں مساجد کی کثرت، دینی اشغال سے گہرا لگاؤ، روزہ داری کا اہتمام بلیغ بہت ہی نظر آیا۔

صلہٹ تو گویا اسلام کا ایک اویٹھنڈ قلعہ ہے۔ بہت ہزنفا اور باعونی شہر ہے۔ ایک جانب حضرت شاہ جلالؒ کے جسد خاکی کو محفوظ کئے ہوئے ہے تو دوسری طرف حضرت شاہ قزاق جیسی برگزیدہ ہستی کا فرار ہے شہر میں دیکھو تو جا بجا بانسوں اور درختوں کے جھنڈوں میں درویشوں اور انبیاء اللہ کے مقبرے نظر آئیں گے۔ انہی فقر کی بدولت اسلام اس دور دراز علاقے تک پہنچا ورنہ کسی زمانہ میں یہ علاقہ کفر میں گمراہ ہوا تھا۔ اب یہ ایمان کی دولت سے مالا مال ہے اور ہر شخص دین واسے۔ ادھر جمعہ کی اذان ہوتی اور ادھر کاروبار بند ہونے شروع ہوئے۔ لوگ جمع ہو ہو کر مسجدوں کی طرف دوڑ پڑتے ہیں اور خدا کے حضور میں پہنچ کر اپنے سینوں کو روحانی پاکیزگی کے نور سے بھر لیتے ہیں۔ مذہبی شغف کے باوجود غیر مسلموں کے ساتھ ان کا سلوک بڑا اچھا اور میں تعلیم اسلامی کے مطابق ہے۔ رمضان میں ہندوؤں کے ہونٹ

پیدا ہوتے ہیں، وہیں پر دان چڑھتے ہیں اور پھر ساری عمر سینہ بھر پر رواں دواں رہتے ہیں۔ کبھی خشکی پر آتے ہی ہیں تو صرف فردیات زندگی لینے کے لئے جیسے مروج، وال، تیل، چاول، چنا، وغیرہ ان چیزوں کا ماحول پر پھیلی سے تبادلہ کیا جاتا ہے یا پھر اس کنارے سے اس کنارے تک پہنچانے کا معاوضہ وصول کر کے ضروری اشیا خریدی جاتی ہیں۔ میں نے ان کی زندگی پر غور کیا تو محسوس ہوا کہ مغربی پاکستان کے خانہ بدوشوں اور ان لوگوں میں بس خشکی اور تری کا فرق ہے۔ مغربی پاکستان کے خانہ بدوش زمین پرادیہ لوگ پانی پر ہی گھومتے پھرتے ہیں اور ان کی نہ کوئی مستقل جگہ قرار ہوتی ہے نہ کوئی معین منزل۔ موجودہ دور میں مشرقی اور مغربی پاکستان کے ان فرزندوں کو بھی تعلیم و تمدن سے بہرہ مند کیا جائیگا اور ان کی معاشی و معاشری حالات کو بہتر بنایا جائیگا۔

مشرقی پاکستان کے لوگوں میں بھی مذہب، ثقافت اور اپنی طرز حیات کو برقرار رکھنے کا بڑا زبردست جذبہ ہے۔ یہاں کے بٹار لوگ اعلیٰ تعلیم حاصل کر کے غیر ملکوں سے واپس آتے رہتے ہیں مگر ان کا رہن بہن سادہ ہی رہتا ہے اور وہ ظاہری مغربی اثرات قبول نہیں کرتے۔ چاول، پھلی، جو ان کی مرغوب غذا ہے بڑے سادہ طریقہ سے بیٹھ کر کھاتے ہیں اور اپنی قومی زبان کی پرورش دسر پستی کا بھی بڑا خیال رکھتے ہیں۔ انہوں نے اپنی موسیقی کو بھی مغربی اثرات سے پاک رکھا ہے۔ عوام میں بھی اپنی موسیقی سے ہی لگاؤ ہے۔ مشرقی پاکستان کے کسی بھی ہوٹل یا رستوران میں چلے جائیے کسی غیر ملکی ریڈیو سے فلمی گانے نہیں سنے جاتے بلکہ اپنے ڈھاکہ اسٹیشن کو ہی سنتے ہیں۔ علی الصبح قرآن مجید کی تلاوت کی آواز ہر گھر سے آتی ہے۔ اس کے بعد وہ بچے جنہیں موسیقی سے دلچسپی ہے کسی نہ کسی ساز پر کچھ سیکھتے اور مرگم لاپتے بھی سنے جاتے ہیں۔ کہیں دیکھو تو کوئی صاحب سا راٹھارے کسی استاد کے گھر کی طرف دوڑتے نظر آتے ہیں مجھے یہ دیکھ کر بڑا تعجب ہوا کہ میرے زبان کا ساڑھے چار سال کا بچہ کھیل کود کے دوران قاضی نذیر الاسلام کی ہڈی دباؤی، بڑے نرم سے گاسا پھرتا تھا۔ جب دیکھو چل رہے چل، اکی وحن اس کے لبوں پر ہوتی تھی۔ یہ ایک جاندار قومی ثقافت کی دلیل ہے۔ مشرقی پاکستان میں بھی بولیوں کا اختلاف ہے مگر کسی کی بولی کوئی حق نہیں ہوتا اور سب اپنے دیس کی بولیوں کو ترقی دینے کے لئے کوشاں رہتے ہیں۔ ہمیں چاہئے کہ مدوں بازوؤں میں قومی شعرا کے کام چوں

کھلے رہتے ہیں اور کوئی تعرض نہیں کیا جاتا۔ سرسوتی پوجا کا جلوس نکلتا ہے، بیشمار ہندو مرد و زن سرسوتی (علم کی دیوی) کے جیکارے لگاتے ہوئے گزرتے ہیں، مگر کوئی ناخوشگوار واقعہ پیش نہیں آتا مسلمانوں کی اس رواداری کو اسلام کی سچی روح سمجھا جاتا ہے اور مسلمانوں کے اس سلوک کو اسلام کے عالمگیر پیغام اخوت و سلامتی کا منظر سمجھا جاتا ہے۔

میں نے دیکھا کہ یہاں لوگوں میں مغربی پاکستان کے لوگوں سے گہری وابستگی ہے۔ اسلام دوستی، حب وطن اور ثقافتی یکجہتی کے مظاہر میں وہ ہر طرح ہم رنگ ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ مغربی پاکستان کے شمالی علاقوں سے گئے ہوئے سینکڑوں لوگ وہاں جا کر مستقر آئیں گئے ہیں اور سب بھائیوں کی طرح رہتے ہیں۔ وہ اب اچھا کاروبار کر رہے ہیں۔ اناس کے باغوں کے مالک ہیں یا چائے کے باغیچے خرید لئے ہیں۔ وہ کبھی کبھی اور مغربی پاکستان کی طرف بھی آتے ہیں اور کچھ دن رہ کر پھر اُدھر ہی چلے جاتے ہیں اور ہر طرح مطمئن ہیں۔ ان کے بچے خوب بنگلہ سیکھ گئے ہیں، بنگلہ گانے گاتے ہیں اور رہن رہن سے بھی ایسے لگتے ہیں کہ جیسے سدایہیں رہے ہوں۔

چانگنام سے پچیس میل دور پہاڑیوں کے درمیان کونٹالی دریا کے کنارے پاکستان کا سب سے بڑا کاجانہ کاغذ سازی بنا ہوا ہے۔ یہاں مغربی پاکستان سے آئے ہوئے سینکڑوں نہیں ہزاروں مزدور، کاریگر، کلرک، ڈرائیور وغیرہ کام کرتے ہیں۔ اس کاخانہ کا افراتظامیہ سابق صوبہ سرحد کے ایک ریٹائرڈ لفٹنٹ کرنل ہیں۔ انہوں نے مجھے ڈیڑھ دو گھنٹے تک اپنے کاخانے کے مختلف شعبے دکھائے۔ وہ جس شعبے میں جاتے، مزدور اور کاریگر بڑے ادب اور احترام کا مظاہرہ کرتے۔ میں نے یہ بات خاص طور پر محسوس کی کہ اس میں ذاتی تعلقات کو بڑا دخل تھا، خوف یا رعب کا کوئی بھی شائبہ نہ پایا جاتا تھا۔ ادب قاعدہ کے ساتھ ایک نمونہ کی بے تکلفی بھی تھی جو باپ بچے، چھوٹے بھائی اور بڑے بھائی کے درمیان ہوتی ہے۔ وہ کبھی کسی مزدور کو شاباش کہتے، کسی کا حال پوچھتے کسی کی بیٹھ پر پیار سے تکیہ دیتے آگے بڑھتے چلے جاتے تھے۔ یہ نظارہ دیکھ کر میری سمجھ میں نہیں آیا کہ دونوں بازوؤں کے درمیان دداری و اجنبیت کے قفسے کہاں سے گھڑ لئے جاتے ہیں کسی ایک دم

مثال کو سند یا ثبوت بنانا بات کا بنگلہ بنانا کہلاتا ہے اور مجھے دودان سفر آپس کے فرق کا ایسا کوئی واقعہ نظر نہیں آیا جس سے دم دشمنوں کی بات پر یقین کیا جاسکے۔ چند رنگونا کاغذ سازی کا کارخانہ بھی دیکھا۔ اس کے دروازے پر حسب میں موٹر رکشا سے اڑا تو سامنے مسلح باوردی پہرے دار کھڑا تھا۔ اس کے قریب سے یہ سمجھا کہ کوئی سرحدی بھائی ہے۔ میں نے پشتوں میں اسے مخاطب کیا تو قدرتی بات تھی کہ وہ بڑا خوش ہوا۔ فوراً دروازہ کھول دیا اور مجھے اندر میرے ساتھی احمد انوان صاحب کو استقبالیہ کرے لے جا کر بٹھا دیا۔ پھر چائے پینے کے لئے اصرار کیا۔ میں نے اسے کہا کہ بھائی مجھے بہت جلد واپس جانا ہے۔ مگر وہ مقررہ بجھے اس کی زبانی معلوم ہوا کہ ہماری طرف کے بہت سے لوگ اس کا رخاٹے کے مختلف شعبوں میں کام کرتے ہیں۔ یہاں آکر یہ بھی معلوم ہوا کہ انخان پوندروں کو لوگ یہاں حقارت کی نظر سے دیکھتے ہیں کیونکہ وہ سودی کاروبار کرتے ہیں اور کاجانہ کہلاتے ہیں۔ مگر اب رفتہ رفتہ سب کو معلوم ہو گیا ہے کہ یہ لوگ پاکستانی نہیں ہیں اور سرحد پار سے آتے ہیں اس لئے اب لوگ انہیں اچھی طرح سمجھ گئے ہیں۔

چانگنام سے کس بازار کا فاصلہ چورائے میل ہے سفر تو بڑا طویل ہے مگر راستہ اس قدر حسین ہے کہ ساڑھے چار گھنٹے کی یہ مسافت طبیعت پر گراں نہیں گزرتی۔ بڑک پختہ ہے اور بس بہت آرامدہ بھی اور سستی بھی۔ ایک طرف کا کرایہ و فسات روپے ہے۔ ہوائی جہاز سے کاروباری مسابقت چلتی ہوئی ہے اس لئے ہوائی سروس کے اتبار میں یہ بس والے دوپہر کا کھانا اور سہ پہر کی چائے بھی مسافروں کو پیش کرتے ہیں۔ اس شاہراہ پر کئی بس سروسیں چلتی ہیں۔ بسوں کے علاوہ ٹیکسیاں اور ٹورسٹ وینیں بھی ملتی ہیں۔ ٹورسٹ وینوں کا کرایہ بھی کچھ زیادہ نہیں۔ یعنی بس کے کرایہ سے دو تین روپے زیادہ ان میں سفر کرنے سے وقت بچ جاتا ہے۔ کیونکہ یہ ۱۴ میل کے سفر میں ایک بار ہی درانٹھرتی ہیں مگر بسیں جا بجا ٹھہرتی ہیں راستے میں ٹھہرنے والے لوگ بسوں سے ہی آتے جاتے ہیں۔ بسوں کے دونوں جانب خوبصورت پہاڑیاں ہیں۔ بانس

باقی صفحہ ۳۸

تہذیب دشمن

سلیم خان گچی

کردار

ڈاکٹر ہمت علی : عقیقات کا عالم
نفیسہ : ڈاکٹر ہمت علی کی سیکریٹری
صدر : عالمی کانفرنس کا چیرمین
جیسا : برفانی ہم کے دو کارکن
امات علی :
تین بابر درار
وقت : کشمیر میں ڈوگرہ عہد

آغاز کی موسیقی ڈاکٹر ہمت دوم

ڈاکٹر : جناب صدر اور میرے محقق دوستو! مجھے از حد مسرت ہے کہ میں عہد عقیقی کے ایک ایسے حیوان پر معلومات پیش کر رہا ہوں جو ساری دنیا میں صرف ایک ہے اور ایک ایسے تحقیقاتی ادارہ کے سامنے اپنی کاوشوں کو لا رہا ہوں جسے دنیا بھر کے ماہروں کا تعاون حاصل ہے۔ ایسے ماہروں کا جن میں حقیقات کے ماہر برہنہ سائنسوں کے ماہر، حشرات الارض کے ماہر، نباتات کے ماہر، نفسیات کے ماہر، نسبیات کے ماہر، نباتات کے ماہر، غرضیکہ جن میں زندگی کے قدرتی و غیر قدرتی سببوں کے ماہر شامل ہیں میرے محقق دوستو! میں جو معلومات آپ کے سامنے لائے دلا ہوں وہ بہت قیمتی ہیں اور جنہی بھی کیونکہ ان معلومات کو حاصل کرتے ہوئے ایک اندازے کے مطابق پانسو تیرہ آدمی ہلاک ہوئے۔

صدر : پانسو تیرہ آدمی!

ڈاکٹر : جی ہاں پانسو تیرہ آدمی اللہ کو پیارے ہوئے، تب کہیں

جا کر عہد عقیقی کے اس نادریکیت بلانت خیز برفانی حیوان کا پتہ چل سکا۔ پانسو تیرہ آدمیوں نے اسے خون سے آبیائی کی تب کہیں جا کر معلومات کا یہ نہال پروان چڑھا۔
صدر : مگر ہمارے اس عالمی تحقیقاتی ادارے نے تو برفانی انسان کو پکڑنے کے لئے مالی امداد دی تھی۔

ڈاکٹر : درست ہے جناب صدر مگر برفانی انسان نہ پکڑا جا سکا تاہم ہماری ہم کے بہادر اور دلاور محقق اپنی جانوں پر کھیل کر اس برفانی حیوان کے بارے میں معلومات فراہم کرنے میں کامیاب ہو سکے ہیں۔ یہ کارنامہ برفانی انسان کو پکڑنے کے مقابلہ میں کہیں زیادہ اہم، مفید اور دور رس نتائج کا حامل ہے اور نہایت ضروری بات یہ ہے کہ برفانی حیوان کو پکڑنے کا مرحلہ ابھی باقی ہے۔ پانسو تیرہ انسانوں کا خون کھینچنے کے باوجود وہ حیوان ابھی زندہ ہے۔

صدر : آپ اجلاس کے سامنے اپنی گراں قدر معلومات پیش فرمائیں۔

ڈاکٹر : جناب صدر اور میرے محقق دوستو! تھوڑے دن ہوئے میں اپنے کمرے میں بیٹھا تھا کہ عجیب اپنی برفانی ہم کے لیڈر مسٹر جبار کا خط ملا۔

(ڈاکٹر کا کمرہ)

ڈاکٹر : سیکریٹری - سیکریٹری - من نفیسہ -
نفیسہ : (دور سے) حاضر ہوئی ڈاکٹر صاحب رترب سے، جی ڈاکٹر صاحب!

ڈاکٹر : یہ خط ہماری برفانی ہم کے لیڈر مسٹر جبار کا ہے۔
ڈاکٹر : ہر گز نہ کہ سناؤ میری عینک کے شیشے زیادہ پائے ہوئے ہیں۔

کھلے رہتے ہیں اور کوئی تعرض نہیں کیا جاتا۔ مرسوقی پوجا کا جلوس نکلتا ہے، بیشتر ہندو مرد و زن مرسوقی (علم کی دیوی) کے جیکارے لگاتے ہوئے گزرتے ہیں، مگر کوئی ناخوشگوار واقعہ پیش نہیں آتا۔ مسلمانوں کی اس رواداری کو اسلام کی سچی روح سمجھا جاتا ہے اور مسلمانوں کے اس سلوک کو اسلام کے عالمگیر پیغام اخوت و سلامتی کا منظر سمجھا جاتا ہے۔

میں نے دیکھا کہ یہاں لوگوں میں مغربی پاکستان کے لوگوں سے گہری وابستگی ہے۔ اسلام دوستی، حب وطن اور ثقافتی یکجہتی کے مظاہر میں وہ ہر طرح ہم رنگ ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ مغربی پاکستان کے شمالی علاقوں سے گئے ہوئے سینکڑوں لوگ وہاں جا کر مستقل بس گئے ہیں اور سب بھائیوں کی طرح رہتے ہیں۔ وہ اب اچھا کاروبار کر رہے ہیں۔ اناس کے باغوں کے مالک ہیں یا چائے کے باغیچے خرید لئے ہیں۔ وہ کبھی کبھی ادھر مغربی پاکستان کی طرف بھی آتے ہیں اور کچھ دن رہ کر پھر ادھر ہی چلے جاتے ہیں اور ہر طرح مطمئن ہیں۔ ان کے بچے خوب بنگلہ سیکھ گئے ہیں، بنگلہ گانے گاتے ہیں اور رہن رہن سے بھی ایسے لگتے ہیں کہ جیسے سدا بہیں رہے ہوں۔

چانگام سے پچیس میل دور پہاڑیوں کے درمیان کرناٹلی دریا کے کنارے پاکستان کا سب سے بڑا کاغذ کاغذ سازی بنا ہوا ہے۔ یہاں مغربی پاکستان سے آئے ہوئے سینکڑوں نہیں ہزاروں مزدور کارگر، کلرک، ڈرائیور وغیرہ کام کرتے ہیں۔ اس کاخانہ کا افسر انتظامیہ سابق صوبہ سرحد کے ایک ریٹائرڈ لفٹنٹ کرنل ہیں۔ انہوں نے مجھے ڈیڑھ دو گھنٹے تک اپنے کارخانے کے مختلف شعبے دکھائے۔ وہ جس شعبے میں جاتے، مزدور اور کارگر بڑے ادب اور احترام کا مظاہرہ کرتے۔ میں نے یہ بات خاص طور پر محسوس کی کہ اس میں ذاتی تعلقات کو بڑا دخل تھا، خوف یا رعب کا کوئی بھی شائبہ نہ پایا جاتا تھا۔ ادب قاعدہ کے ساتھ ایک نوع کی بے تکلفی بھی تھی جو باپ بچے، چھوٹے بھائی اور بڑے بھائی کے درمیان ہوتی ہے۔ وہ کبھی کسی مزدور کو شاباش کہتے، کسی کا حال پوچھتے، کسی کی پیٹھ پر پیار سے ہتھکی دیتے آگے بڑھتے چلے جاتے تھے۔ یہ نظارہ دیکھ کر میری سمجھ میں نہیں آیا کہ دونوں بازوؤں کے درمیان دوری و اجنبیت کے قفسے کہاں سے گھڑ لئے جاتے ہیں کسی ایک دم

مثال کو سند یا ثبوت بنانا بات کا بٹنگڑ بنانا کہلاتا ہے اور مجھے دوران سفر آپس کے فرق کا ایسا کوئی واقعہ نظر نہیں آیا جس سے وطن دشمنوں کی بات پر یقین کیا جاسکے۔ چند گونا گواغذ سازی کا کاخانہ بھی دیکھا۔ اس کے دروازے پر جب میں موٹر رکشا سے اترا تو سامنے مسلح باوردی پہرے دار کھڑا تھا۔ اس کے قریب سے میں سمجھا کہ کوئی سرحدی بھائی ہے۔ میں نے پشتوں میں اسے مخاطب کیا تو قدرتی بات تھی کہ وہ بڑا خوش ہوا۔ فوراً دروازہ کھول دیا اور مجھے اور میرے ساتھی احمد انومان صاحب کو استقبالیہ کرے میں لے جا کر بٹھا دیا۔ پھر چائے پینے کے لئے اصرار کیا۔ میں نے اس سے کہا کہ بھائی مجھے بہت جلد واپس جانا ہے۔ مگر وہ مقرر رہا۔ مجھے اس کی زبانی معلوم ہوا کہ ہماری طرف کے بہت سے لوگ اس کارخانے کے مختلف شعبوں میں کام کرتے ہیں۔ یہاں آکر یہ بھی معلوم ہوا کہ افغان پوتندوں کو لوگ یہاں حقارت کی نظر سے دیکھتے ہیں کیونکہ وہ سودی کاروبار کرتے ہیں اور کاپی لٹا کہلاتے ہیں۔ مگر اب رفتہ رفتہ سب کو معلوم ہو گیا ہے کہ یہ لوگ پاکستانی نہیں ہیں اور سرحد پار سے آتے ہیں اس لئے اب لوگ انہیں اچھی طرح سمجھ گئے ہیں۔

چانگام سے کس بازار کا فاصلہ چورائے میل ہے۔ سفر تو بڑا طویل ہے مگر راستہ اس قدر حسین ہے کہ ساڑھے چار گھنٹے کی یہ مسافت طبیعت پر گراں نہیں گزرتی۔ سڑک پختہ ہے اور بس بہت آرامدہ بھی اور سستی بھی۔ ایک طرف کارگر یہ وہ سات روپے ہے۔ ہوائی جہاز سے کاروباری مسابقت چلتی ہوئی ہے اس لئے ہوائی سروس کے اتباع میں یہ بس والے دوپہر کا کھانا اور سہ پہر کی چائے بھی مسافروں کو پیش کرتے ہیں۔ اس شاہراہ پر کئی بس سروسین چلتی ہیں۔ بسوں کے علاوہ ٹیکسیاں اور ٹورسٹ وینیں بھی ہلتی ہیں۔ ٹورسٹ وینوں کا کرایہ بھی کچھ زیادہ نہیں۔ یعنی بس کے کرایہ سے دو تین روپے زائد۔ ان میں سفر کرنے سے وقت بچ جاتا ہے۔ کیونکہ یہ ۱۴ میل کے سفر میں ایک بار ہی ڈرائیور تھکتی ہیں مگر بسیں جا بجا ٹھہرتی ہیں۔ راستے میں ٹھہرنے والے لوگ بسوں سے ہی آتے جاتے ہیں۔ سڑک کے دونوں جانب خوبصورت پہاڑیاں ہیں۔ بانس

باقی صفحہ ۵ پر

تہذیب دشمن

سلیم خان گمی

کردار

ڈاکٹر ہمت علی : حقیقات کا عالم
نقیبہ : ڈاکٹر ہمت علی کی سیکریٹری
صدر : عالمی کانفرنس کا چیرمین
جبار : بر فانی ہم کے دو کارکن
امانت علی :
تین بارہ وار
وقت : کشمیر میں ڈوگرہ عہد

آغاز کی موسیقی

(کانفرنس دوم)

ڈاکٹر : جناب صدر اور میرے محقق دوستو! مجھے از حد مسرت ہے کہ میں عہد حقیقی کے ایک ایسے حیوان پر معلومات پیش کر رہا ہوں جو ساری دنیا میں صرف ایک ہے اور ایک ایسے تحقیقاتی ادارہ کے سامنے اپنی کوششوں کو لا رہا ہوں جسے دنیا بھر کے ماہروں کا تعاون حاصل ہے۔ ایسے ماہروں کا جن میں حقیقات کے ماہر بر فنانوں کے ماہر حشرات الارض کے ماہر حیاتیات کے ماہر انسانیات کے ماہر، نباتات کے ماہر، غرضیکہ جن میں زندگی کے قدرتی و غیر قدرتی سبھی شعبوں کے ماہر شامل ہیں میرے محقق دوستو میں جو معلومات آپ کے سامنے لائے والا ہوں وہ بہت قیمتی ہیں اور جنگی بھی کیونکہ ان معلومات کو حاصل کرتے ہوئے ایک اندازے کے مطابق پانسو تیرہ آدمی ہلاک ہوئے۔

صدر : پانسو تیرہ آدمی!

ڈاکٹر : جی ہاں پانسو تیرہ آدمی اللہ کو پیارے ہوئے، تب کہیں

جاکر عہد حقیقی کے اس نادار لیکن طاقت خیز بر فانی حیوان کا پتہ چل سکا۔ پانسو تیرہ آدمیوں نے اپنے خون سے آبائی کی تب کہیں جاکر معلومات کا یہ نہال پروان چڑھا۔
صدر : مگر ہمارے اس عالمی تحقیقاتی ادارے نے تو بر فانی انسان کو پکڑنے کے لئے مالی امداد دی تھی۔

ڈاکٹر : درست ہے جناب صدر مگر بر فانی انسان نہ پکڑا جاسکا تاہم ہماری ہم کے بہادر اور دلا در محقق اپنی جانوں پر کھینچ کر اس بر فانی حیوان کے بارے میں معلومات فراہم کرنے میں کامیاب ہو سکیں۔ یہ کارنامہ بر فانی انسان کو پکڑنے کے مقابلہ میں کہیں زیادہ اہم، مفید اور دور رس نتائج کا حامل ہے اور نہایت ضروری بات یہ ہے کہ بر فانی حیوان کو پکڑنے کا مرحلہ ابھی باقی ہے۔ پانسو تیرہ انسانوں کا خون کرنے کے باوجود وہ حیوان ابھی زندہ ہے۔

صدر : آپ اجلاس کے سامنے اپنی گراں قدر معلومات پیش فرمائیں۔

ڈاکٹر : جناب صدر اور میرے محقق دوستو۔ تھوڑے دن ہوئے ہیں اپنے کمرے میں بیٹھا تھا کہ مجھے اپنی بر فانی ہم کے لیڈر مسٹر جبار کا خط ملا۔

(ڈاکٹر کا کمرہ)

ڈاکٹر : سیکریٹری - سیکریٹری - من نقیبہ۔

نقیبہ : (دور سے) حاضر ہوئی ڈاکٹر صاحب رترب است، جی ڈاکٹر صاحب!

ڈاکٹر : یہ خط ہماری بر فانی ہم کے لیڈر مسٹر جبار کا ہے۔
ڈاکٹر : جی ہاں مسٹر جبار کے شیشے زیادہ پرانے ہو گئے ہیں۔

پیر مہو۔

نفسیہ : لکھا ہے (خط پڑھتی ہے)۔ قبلہ ڈاکٹر صاحب۔ تسلیم !
آپ یہ جان کر یقیناً افسردہ خاطر ہوں گے کہ ہم برفانی
انسان کو پکڑنے میں قطعاً ناکام ہو گئے ہیں اور آپ یہ جان
یقیناً بہت خوش ہوں گے کہ ہم برفانی حیوان کو پکڑنے میں
کامیاب ہوئے ہیں۔ میں اس برفانی حیوان کے چار فوٹو
ارسال کر رہا ہوں۔ آپ ان تصویریں کو دیکھ کر اندازہ
لگا سکتے ہیں کہ ہم نے کیسا جواب اور لاشائی حیوان قابو
کیا ہے۔ میں حیوانی حیاتیات کے شعبہ کی حیثیت سے بلاغ
نمود کہہ سکتا ہوں کہ ایسا حیوان دنیا کے کسی چڑیا گھر میں
نہیں ہے اور نہ کسی عجائب خانہ ہی میں ایسے حیوان کا کوئی
پنجرہ ہے۔ اس برفانی حیوان کی آٹھ شاخیں ہیں مگر وہ تصویر
میں نظر نہیں آئیں گی کیونکہ وہ اپنی ٹانگوں کو اپنے پیٹ کے
اندریوں چھپا چکا ہے جیسے کھجواٹی گردن اپنے نول کے
اندر چھپا لیتا ہے۔ اس کے تین دانت ہیں جو اس کے منہ کے
اندر گم ہو چکے ہیں۔ میرا اندازہ ہے کہ دانت کی لمبائی
ڈیڑھ گز سے زیادہ ہے۔ اس کی صرف ایک آنکھ ہے جس
پر شبہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ برفانی حیوان سائیکلوپس ایسے وحشی
انسانوں کا مورث اعلیٰ ہے۔

ڈاکٹر : ہو سکتا ہے کہ برفانی حیوان ایک آنکھ والے وحشی انسانوں
کا جدا ہجڑہ ہو۔ ہاں آگے پڑھو۔

نفسیہ : "برفانی حیوان ابھی تک مردہ حالت میں ہے۔ یہ کیفیت غالباً
سر دی کی وجہ سے ہے۔ میرے ساتھی شرماتانت کا خیال
ہے کہ برفانی حیوان مرجھاتے مگر میرا خیال ہے یہ ہوش ہے۔
تاہم یہ امر تحقیق طلب ہے۔ ممکن ہے مرجھا ہو۔ ممکن ہے
زندہ ہو مگر سر دی سے بے سرحہ ہوا گر مٹی کھا کر
زندہ ہو جائے۔ ہم نے کوشش کی تھی کہ اس کے اوپر لاؤ
جلائیں مگر ہمیں ایندھن نہ ملا۔

ہمارے پاس جو کھانے پینے کی چیزیں تھیں ڈ
خنہ ہو چکی ہیں اور نہ پاس کوئی پیسہ ہے۔ ہر بانی کر کے
ہیں کچھ رقم بچوائے۔ آپ کا بعد اہم جبار۔

کیمپ وادی ڈرائنگ

ڈاکٹر : اس خط کو فائن میں لگا دو اور برفانی حیوان کی تصویر لگا
کہاں ہیں۔ یہ دو کام کمرے کے چیک بک لائڈ میں دو خیر
روپے کے چیک پر دستخط کرتا ہوں۔ تم آج بینک میں سے
رقم بکھو اگر صبح کی گاڑی سے وادی ڈرائنگ روانہ ہو جاؤ۔
وادی ڈرائنگ تک پہنچنے کے لئے تمہارے پاس
نقشے موجود ہیں نا؟

نفسیہ : مگر ڈاکٹر صاحب میں جاؤں گی وادی ڈرائنگ؟
ڈاکٹر : جی ہاں۔ آپ ہائیں گی۔ میں خود جانا چاہتا تھا مگر انفلوئنزا
کے سبب میرا برا حال ہے۔ وادی ڈرائنگ جانے کے لئے
آپ کو پاس روپے دے جائیں گے۔

نفسیہ : شکریہ۔

ڈاکٹر : یہ خط اور تصویر ان کے ٹھکانوں پر رکھو اور چیک بک
لاؤ۔ ہاں، چہرہ اسی سے کہو دو کافی سیٹ لے، بالائی
والی۔

نفسیہ : جی بہت اچھا (دو روپے) فضلہ دو کافی سیٹ بالائی والی

(وادی)

نفسیہ : (خود کلامی) نقشے کے مطابق یہی وادی ڈرائنگ ہے۔
میں پہاڑ پر چڑھ کر ڈھلوان پر آئی ہوں۔ سامنے پہاڑ
ہے۔ میرے دائیں جانب پہاڑ ہے، پرے بائیں جانب
پہاڑ ہے۔

(ایک آدمی کے کراہنے اور ہائے مارنے کی

آواز)

نفسیہ : کراہنے کی آواز کہاں سے ہے؟ سنو

(تین آدمیوں کے کراہنے کی آوازیں)

نفسیہ : ایک نہیں۔ ایک سے زیادہ آدمیوں کے کراہنے کی آوازیں
آ رہی ہیں۔ کیوں، کہاں سے؟

(سات آدمیوں کے کراہنے کی آوازیں)

نفسیہ : پہاڑوں میں گھری ہوئی وادی ڈرائنگ۔ برف میں

لٹے ہوئے چاروں طرف پہاڑ بادلوں میں چھپے ہوئے

جبار : یہ برفانی پہاڑ اکثر بادلوں میں چھپے رہتے ہیں۔ اور پھر سرویلوں میں تو سورج شاذ و نادر ہی اپنا مکھڑا دکھاتا ہے۔

امانت : میں اس وادی کے لوگوں کی ہمت پر حیران ہوں۔ صرف گوشت پر ہی گزارہ کرتے ہوں گے۔

جبار : اور کیا پتھروں کے گھروندوں میں رہتے ہیں۔ برفانی جانوروں کا شکار کرتے ہیں اور کھاتے ہیں۔ سال دو چار نہیں آتی ہیں۔ ان کی مزدوری کتنے ہیں اور جو کچھ ملتا ہے اس میں سے کچھ تو غولاک پر اور کچھ کپڑے پر خرچ کرتے ہیں۔

امانت : بڑے صابر لوگ ہیں یہ۔

جبار : اور فاقہ کش بھی۔

امانت : مجبور ہے۔ بے چارے کیا کریں۔

جبار : ایک بات ہے اور وہ یہ کہ یہ وادی بجا طور پر سکون، خوشبودار و رنگوں کی وادی کہلا سکتی ہے۔ یہاں کی ہوا میں اتنی زندگی ہے کہ مردہ زندہ ہو جائے۔

امانت : گرمیوں میں۔ سرویلوں میں تو آدمی ٹھہر کر مر جاتا ہے۔ جبار : انسان گرمیوں کے چھ مہینوں میں اتنی زندگی حاصل کر لیتا ہے کہ موت اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتی۔

ایک آواز (گھڑائی ہوئی) صاحب۔ وہ سانس لے رہا ہے۔ برفانی حیوان۔

دوسری آواز، جناب دانت بھل رہا ہے۔ وہ.... وہ برفانی حیوان جناب۔

تیسری آواز، وہ زمین پر سے اٹھ رہا ہے۔

ایک آواز، یہ شاید اس کی آواز ہے۔

(عجیب و غریب دہشتناک آواز، جو اس سے پہلے

انسان کے کان نے نہ سنی ہو۔ آہستہ سے تیز اور

پھر تیز سے تیز تر)

امانت : جبار! اسے قابو کرو۔

جبار : کیسے قابو کروں؟ وہ سورج کی کرنوں سے جا چکا ہے۔

سورج کی کرنوں کو کون قابو کرے۔

برفانی پہاڑ۔

(برفانی ہواؤں کا شور اور سیٹیاں)

نفیسہ : وادی کو چیرتے ہوئے گزرتے والی تیز ہوائیں اور ان ہواؤں میں آہ و فغاں، ڈلا آگے بڑھ کر تو دیکھوں۔

(آدمیوں کے گراہنے اور ہواؤں کے چلنے کی آوازیں)

نفیسہ : جبار۔ مسٹر جبار۔

جبار : ہائے ہائے۔

نفیسہ : جبار۔ مسٹر جبار۔

جبار : ہائے مرگیا۔

نفیسہ : جبار صاحب تم! خون میں لت پت کیا ہوا، جبار مجھے بتاؤ کیا ہوا۔

جبار : کون ہوتا تم۔ تم۔ ہائے ہائے۔

نفیسہ : جبار صاحب میں ہوں نفیسہ۔ مجھے ڈاکٹر نے بھیجا ہے۔

جبار : نفیسہ! ہنس نفیسہ ہائے۔ تم کہاں، تم یہاں کیسے؟ ہائے مرگیا۔

نفیسہ : میں تمہارے لئے دو ہزار روپے لائی ہوں۔ تم نے خط جو لکھا تھا ڈاکٹر کو۔

جبار : چلی جاؤ یہاں سے۔ چلی جاؤ۔ ورنہ نہیں موت آئے گی۔

نفیسہ : کون سی موت آئے گی؟

جبار : وہی جو ہماری ہم کے آدمیوں پر اور اس وادی کے لوگوں پر آئی۔ مرگیا۔

نفیسہ : میں نہیں سمجھتی تمہاری بات۔ بتاؤ مجھے کیسی موت؟

جبار : جانتا چاہتی ہو؟ کونسی کیسی آئی ہم تک موت۔

امانت : جبار صاحب۔ اس وادی میں آئے ہوئے ہمیں آج

دس دن ہو گئے۔

جبار : ہاں امانت صاحب۔ آج پورے دس دن۔

امانت : آج موسم کچھ نکھر نکھر رہا ہے۔

جبار : اس لئے کہ سورج بھل رہا ہے۔

امانت : جی ہاں سورج بھل رہا ہے۔ ہم نے تو گذشتہ

سولہ دن سے سورج کی سند کرن نہیں دیکھی۔

ایک آواز: جناب اب کیا ہو گا؟
امانت: خدا ہی جانتا ہے اب کیا ہو گا۔

ایسا غار جس میں ہم محفوظ رہ سکیں؟
(جیوان کی آواز: انسانوں کی چیخ بکاؤ۔ بھگدڑ)

آواز نمبر ۱: صاحب۔ چہ تو نہیں مگر تلاش کرتے ہیں۔
جبار: امانت آؤ۔ ہدایت۔ عرفان چلو۔ تم بھی چلو اس طرف۔

جلدی کرو ورنہ طوفان ہمیں آگے گھٹاٹا کر لے جائے گا۔
دوسری آواز: اس نے پانچ آدمی مار دیے۔

جبار: دوستو! نیزے بھالے اور کلہاڑیاں لے کر اس موڈی،
لوٹ پڑو۔ گھبراؤ نہیں دوستو۔

آواز نمبر ۱: جناب یہ رہا غار۔ موج ہو گئی غار جلدی مل گیا۔ نہیں تو
معلوم نہیں کیا ہوتا۔

جبار: چلو اندر۔ چلو نا۔
امانت: جبار صاحب! انہی جان بچاؤ۔ جان بچاؤ۔

ایک آواز: وہ ہماری طرف آ رہا ہے۔ وہ ہماری طرف آ رہا ہے۔
دوڑو۔

جبار: لوگو! دوڑو! وہیں ہمت نہ ہارو۔ مقابلہ کرو۔ مقابلہ۔
(جیوان کی خوفناک آواز: جھنجھ۔ بھاگ دو! اور اٹھنا)

آواز نمبر ۱: یہ مصیبت آئی کہاں سے؟
آواز نمبر ۲: بس کچھ نہ پوچھو۔

آواز نمبر ۳: آخر کچھ تو بتاؤ۔ یہ بلا کہاں سے نازل ہوئی؟
آواز نمبر ۴: وادی سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ یہ پہاڑوں کے

اس پار سے نازل ہوئی۔
آواز نمبر ۵: پہاڑوں کے اس پار سے۔

آواز نمبر ۶: ہاں برفیلے پہاڑوں سے۔
(برفانی پہاڑوں پر بادل کی گرج۔ بجلی کی کرک)

امانت: (دور سے) جبار۔ جبار۔ جبار۔
جبار: (دور سے) گھبراؤ نہیں۔ ڈٹے رہو۔

آواز نمبر ۱: صاحب برف کا طوفان آ رہا ہے۔
امانت: اب کیا ہو گا؟

آواز نمبر ۲: ہمیں چاہیے کہ کسی غار میں چھپ جائیں ورنہ ہم برف میں
دب کر مر جائیں گے۔

جبار: امانت صاحب۔ ساتھیوں کو اکٹھا کر وہاں چھپ جائیں۔
امانت: یہ آس پاس برف پر اوندھے منہ پڑے ہیں۔

جبار: انہیں بتاؤ کہ ہم برف کے طوفان سے بچنے کے لئے ترائی میں
آواز نمبر ۱: آؤ۔ ہدایت۔ عرفان چلو۔ تم بھی چلو اس طرف۔
جلدی کرو ورنہ طوفان ہمیں آگے گھٹاٹا کر لے جائے گا۔

دوسری آواز: اس نے پانچ آدمی مار دیے۔
جبار: دوستو! نیزے بھالے اور کلہاڑیاں لے کر اس موڈی،
لوٹ پڑو۔ گھبراؤ نہیں دوستو۔

آواز نمبر ۱: جناب یہ رہا غار۔ موج ہو گئی غار جلدی مل گیا۔ نہیں تو
معلوم نہیں کیا ہوتا۔

جبار: چلو اندر۔ چلو نا۔
امانت: جبار صاحب! انہی جان بچاؤ۔ جان بچاؤ۔

ایک آواز: وہ ہماری طرف آ رہا ہے۔ وہ ہماری طرف آ رہا ہے۔
دوڑو۔

جبار: لوگو! دوڑو! وہیں ہمت نہ ہارو۔ مقابلہ کرو۔ مقابلہ۔
(جیوان کی خوفناک آواز: جھنجھ۔ بھاگ دو! اور اٹھنا)

آواز نمبر ۱: یہ مصیبت آئی کہاں سے؟
آواز نمبر ۲: بس کچھ نہ پوچھو۔

آواز نمبر ۳: آخر کچھ تو بتاؤ۔ یہ بلا کہاں سے نازل ہوئی؟
آواز نمبر ۴: وادی سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ یہ پہاڑوں کے

اس پار سے نازل ہوئی۔
آواز نمبر ۵: پہاڑوں کے اس پار سے۔

آواز نمبر ۶: ہاں برفیلے پہاڑوں سے۔
(برفانی پہاڑوں پر بادل کی گرج۔ بجلی کی کرک)

امانت: (دور سے) جبار۔ جبار۔ جبار۔
جبار: (دور سے) گھبراؤ نہیں۔ ڈٹے رہو۔

آواز نمبر ۱: صاحب برف کا طوفان آ رہا ہے۔
امانت: اب کیا ہو گا؟

غالباً خوراک کی گولیاں زیادہ کھاتی ہیں۔

امانت : درود سے گولیوں پر گزارہ ہے۔ اگر یہ نہ ہوتیں تو خدا جلنے کیا ہوتا۔

جبار : اللہ کو ہمارے ہو جاتے۔

آواز نمبر ۱ : (دور سے) صاحب۔ صاحب۔ یہ پتھر نہیں ہے۔ یہ تو کھال ہے۔

امانت : کھال ہے؟

جبار : کھال کیسی؟

آواز نمبر ۱ : جناب اگر دیکھو۔

جبار : آئے۔

آواز نمبر ۱ : یہ پتھر نہیں۔ یہ یہ موٹی کھال ہے۔ یہ دیکھیے۔

جبار : ہاں۔ یہ پتھر نہیں کھال ہے۔ ہٹاؤ برف۔ اور برف ہٹاؤ۔

امانت : میں ہٹاتا ہوں۔ یہ لیجئے۔ یہ دیکھیے۔

جبار : واللہ! یہ تو کوئی جالند ہے۔ برف سے بے سدھ۔ بیہوش۔

امانت : بیہوش نہیں۔ مردہ۔ دیکھو سانس نہیں لے رہا۔

جبار : ساتھیوں اور قلیوں کو بلاؤ کہ برف ہٹائیں۔ رستہ لاؤ۔ کدالیں لاؤ۔ کھوپے لاؤ۔ چاقو لاؤ۔

آواز نمبر ۱ : صاحب۔ برف کا طوفان زوروں پر آگیا ہے۔

جبار : پروا نہیں۔ یہ حیوان بہت بڑی یاقت ہے۔ بہت بڑی تاریخی یافت۔ میں نے ایسا حیوان آج تک نہیں دیکھا،

نہ روئے زمین پہاؤ نہ صفحہ قرطاس پر۔ نہ چرٹیا گھر میں اور نہ عجائب گھر میں۔

امانت : میرا کیمرو کہاں گیا۔ میں اس کی تصویریں لوں گا۔

جبار : اسے دھکیل کر وادی ڈراگم میں لے چلو۔ وادی ڈراگم میں اس کے ارد گرد رستے باندھو۔

امانت : زور لگاؤ

آواز نمبر ۱ : سب ہی زور لگاؤ۔

جبار : شاباش۔ اسے دھکیلو۔ دھکیل کر وادی میں لے جاؤ

(سبھی برفانی حیوان کو دھکیلنے ہیں اور زور لگاتے ہیں)

ڈاکٹر : (حقہ کی آواز سن کر) بہت خوش ہو جبار؟

جبار : ہاں بہت خوش۔ میں نے انسانی کلو پیڈیا دیکھا ہے

اور دوسری کتابیں بھی۔ ایسا جالوسا ہے چار لاکھ سال پہلے اس کو وارض پر ممکن تھا اب نہیں۔ ہمیں ہماری محنت کا پھل مل گیا۔

امانت : وادی کے لوگ بہت خوش ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ یہ حیوان ان کے بہادر جوتوں نے پکڑا ہے۔

جبار : وہ کسی حد تک درست سوچ رہے ہیں۔ اگر وادی سے ساٹھ ستر اور جوان نہ آتے تو ہم اسے کیسے دھکیل کر یہاں لاتے۔

امانت : اب وہ حیوان کے ارد گرد دائرہ بنا کر ناچ رہے ہیں۔ بے تحاشہ ناچ رہے ہیں۔

جبار : وہ بہت خوش ہیں۔ ہم بہت خوش ہیں میں بہت خوش ہوں۔

(جبار کا حقہ)

ڈاکٹر : (حقہ زن ہو کر) برفانی انسان کو تم کیسے پکڑ لو گے؟

جبار : میں نے صرف مذاق کے طور پر کہا تھا۔

ڈاکٹر : اور میں نے مذاق ہی سمجھا ہے۔ تو بات یہ ہے کہ برفانی

ہم کے لیڈر کی حیثیت سے ساری ہم کی ذمہ داری

تم پر آتی ہے۔ برفانی انسان کو پکڑنے کی ایک نہیں

بیسویں کوششیں ہو چکی ہیں مگر کامیابی کسی کو بھی نصیب

نہیں ہوئی۔ اگر برفانی انسان پکڑا جائے تو یقیناً جانے

دنیا نئے علم میں ہلکے چ جائے۔ بلکہ زلزلہ آ جائے۔

جبار : ہماری شہرت آسمان تک پرواز کرے۔

ڈاکٹر : یقیناً۔ کارنامے شہر میں ہمراہ لاتے ہیں۔ برفانی

انسان کی گرفتاری یا اسیری بہت بڑا کارنامہ ہے۔ اگر اس موسم سرما میں وہ پکڑا جائے تو مزہ آجائے، وائٹ مزہ آجائے۔

جبار : ہم یقیناً کامیاب ہوں گے۔

امانت : میرا تو دل گھبرا رہا ہے۔ ہم جن بر فانی پہاڑوں کی طرف جا رہے ہیں وہ کئی انسانوں کی جانیں لے چکے ہیں۔

ڈاکٹر : انسان مرتے رہتے ہیں۔ کوئی گھر میں کھاٹ پر۔ کوئی بازو میں کوئی راستے پر۔ کوئی کھیت میں۔ کوئی سولی پر۔

کوئی پہاڑ پر کئی سمندر میں۔ موت کہاں نہیں ہے۔

ہر کہیں ہے پھر موت سے گھبرا گیا، اگر آپ علم کی دنیا

کے لئے علم کی روشنی دینے کے دوران مر جائیں تو یقیناً

یہ ایک شاندار موت ہوگی۔

جبار : جی ہاں (اونچی آواز میں) امانت صاحب۔ نقشہ وغیرہ

احتیاط سے رکھ لئے نا۔

امانت : بالکل۔ آپ فکر نہ کریں۔

ڈاکٹر : تو کل صبح آپ کی ہم روانہ ہو رہی ہے۔

جبار : جی ہاں۔

ڈاکٹر : آج شام شہریوں کی دعوت کھنے بچے ہے؟

جبار : رات سات بجے۔ مگر ڈاکٹر صاحب اس تکلیف کی کیا

ضرورت تھی؟

ڈاکٹر : بھائی یہ سوال مجھ سے نہ پوچھو۔ اس شہر کے باسیوں

کے سلسلے پیش کرو۔ میرا خیال ہے شہر کے لوگ اس

ہم کے ارکان کو ملک و وطن کے سپوت سمجھتے ہیں۔

امانت : ہر بانی ہے ان کی ورنہ ہم نے ابھی تک کوئی کارنامہ

میں انجام نہیں دیا۔

ڈاکٹر : ان کی توقع تو یہی ہے تاکہ تم کارنامے میں انجام دینے

جا رہے ہو۔

جبار : ہم یقیناً اہل وطن کی توقع پر پورا اتریں گے۔ ہم ان کی

امیدوں کو حقیقتوں میں بدلنے کے لئے جان نثار کر دیں گے۔

ہماری عزت وطن کی عزت سے وابستہ ہے۔

ڈاکٹر : یقیناً۔ یقیناً۔

امانت : اب اجازت چاہتے ہیں۔ ذرا گھر جا کر شام کی دعوت کی

تیاری کریں۔

ڈاکٹر : ضرور۔ ضرور۔ اب شام کی دعوت پر ملاقات ہوگی۔

(دعوت میں آئے ہوئے لوگوں کا شور)

مقرر : جناب صدر اور میرے دوستو۔ بر فانی ہم پر جانے

والے جوان وطن کے سپوت ہیں۔ ہم ان کے سامنے اپنا

سر خم کرتے ہیں۔ جناب صدر —

ڈاکٹر : اور میرے محقق دوستو۔ پوری بر فانی تحقیقاتی ہم کی

کارگذاری سے تو آپ آگاہ ہو گئے۔ آپ کو معلوم ہو گیا کہ

پوری ہم کے بہادر ارکان اور وادئی گل دلالہ کے

باہمت انسانوں پر کیا گزری، لیکن وہ وحشت ناک اور

ہلاکت خیز حیوان اب بھی زندہ ہے۔ اسے پکڑنا ضروری ہے۔

صدر : ہاں۔ حیوان کو پکڑنا ضروری ہے۔ زندہ یا مردہ۔

اسے ضرور پکڑا جائے۔ اسے کیسے پکڑا جائے اس

غرض کے لئے ایک کمیٹی کی تشکیل ضروری ہے۔ کمیٹی

موزی حیوان کو پکڑنے کا طریق کار طے کرے اور اپنی

اپنی حکومتوں سے مالی مدد لے۔ اس مالی مدد سے ہم

ایک اور ہم وادئی ڈرامنگ میں بھیجیں گے جس کے پاس گولہ

بارود ہوگا اور یہی کوٹھڑی ہے۔

ڈاکٹر : جی ہاں گولہ بارود اور یہی کوٹھڑی کا ہونا از بس

ضروری ہے۔

صدر : آپ آپس میں بیٹھ کر طے کریں کہ کمیٹی میں کون کون حضور

ہوں گے۔ ہاں ایک بات طے ہے کہ تشکیل دی جانے والی

کمیٹی کے چیرمین ڈاکٹر بہت علی ہوں گے۔

(اختتامیہ پر موسیقی)

حق بہ حق دار۔۔۔

لطیف جلیلی

پیشانی سے ملتا۔ استاد کے پاس اخبارات کا ایک پلندہ بھی ہر وقت موجود رہتا وہ اکثر سننے والوں پر اپنی علمیت کا ہمک جانے کے لئے اخبارات کے اقتباسات سنا تا اور عینک اور پراٹھا کر داتا طلبہ لگا ہوں سے ہر کسی کی طرف دیکھتا۔ داد دینے میں شکر دینے پریشہ فراخ دل رہا۔

زرعی اصلاحات کی بدولت کریم بخش، جو کبھی گاؤں کا مزارع تھا، اب زمین کا مالک بن گیا تھا۔ وہ ان دنوں بے حد خوش تھا۔ وہ اب گاؤں کے زمیندار کے برابر بیٹھتا تھا۔ صرف کریم بخش ہی نہیں اس کے بیوی بچے بھی بہت خوش تھے۔ وہ سوچتے کہ وہ اب اپنی زمینوں پر محنت کرتے ہیں، تو محنت کا فائدہ بھی اب ان ہی کو ملتا ہے وہ اب کوڑا کٹاتے جاڑے اور چھپائی دھوپ میں کام کرتے ہوئے ایک مرتے سی محسوس کرتے۔ وہ اب کسی غیر کے محتاج نہیں تھے۔ معاشرے کے آزاد فرد ہر اعتبار سے آزاد اور اپنی قسمت کے خالق۔ زرعی انقلاب سے پہلے کریم بخش اپنی محنت سے جو کچھ پیدا کرتا اس کا نصف سے زیادہ حصہ زمیندار کے گھر چلا جاتا۔ کچھ مالکانہ حقوق کے بدلے اور کچھ دوسرے بہانوں سے۔ سچ تو یہ ہے کہ غریب کریم بخش کے پاس جو کچھ بچ رہتا وہ اسے اور اس کے بال بچوں کو زندہ رکھنے کے لئے ناکافی ہوتا۔ کریم بخش کے بیوی اور بچے مسلسل بیماریوں کا شکار رہتے۔ ان حالات میں کریم بخش کی زندگی کے ساتھ بیل بنی خوراک کہاں سے حاصل کرتے۔ کریم بخش کی پریشانی کے مولیشیوں کی بھوک سے اور زمین پر پوری طرح کاشت نہ کر سکنے سے فصل دن بدن کم ہوتی گئی اور زمیندار کے مظالم اور بہانے بڑھتے گئے۔

گھر نے تیز دھار بھر کو چادر کی گتوں میں چھپایا اور برید پور کی طرف چل پڑا۔ آج مرید پور میں اس کے بڑے بھائی کریم بخش نے ایک دعوت کا اہتمام کیا تھا۔ یہ دعوت وہ زمین کے مالکانہ حقوق ملنے کی خوشی میں دے رہا تھا۔ مگر گوہر علی اپنے بھائی کے پاس مرید پور دعوت کھانے کے بجائے کسی اور غرض کے لئے جا رہا تھا۔ وہ حلقہ پٹواری، نور دین، کو قتل کرنا چاہتا تھا کیونکہ اس نے کریم بخش کو استاد فضل دین کی سفارش پر زمین دے دی تھی مگر گوہر علی کو نظر انداز کر دیا تھا۔

زندگی دیے بھی بڑے کمشن طریقے سے بیت رہی ہے۔ پٹواری کو قتل کر کے پھانسی چڑھ جاؤں گا۔ بیوی بچوں کا خدا حافظ ہے۔ اس نے سوچا اور تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا مرید پور کی طرف چل دیا۔ جب گوہر مرید پور پہنچا تو اس نے دیکھا کہ آج استاد فضل دین کے مکتب میں طالب علموں سے زیادہ ان بہانوں کا ہجوم تھا جو اس کے بھائی، کریم بخش، کے گھر دعوت پڑائے ہوئے تھے۔ استاد فضل دین ناک پر عینک چڑھائے اپنی بان کی ٹوٹی ہوئی چارپائی پر بہانوں سے کچھ اس طرح باتیں کر رہا تھا جیسے کوئی فاضل استاد اپنے کند ذہن طالب علموں سے باتیں کر رہا ہو۔ حالانکہ استاد فضل دین کوئی زیادہ پڑھا لکھا آدمی نہ تھا۔ ہاں فارسی خوان ضرور تھا۔ اس کا مکتب گلوں کے باہر ایک پہل کے پرانے درخت تلے تھا۔ جہاں وہ طنز بھری باتیں کر دیتا اور شام کے بعد ایک میلے کھیلے چراغ کی روشنی میں ہر روز گپ شپ کی محفل آراستہ کرتا۔ ایسے جیسے بڑے شہر میں ادبی محفلیں ہوتی ہیں۔ ایسی محفلیں جو قلب و نظر کو گرماتی ہیں۔ استاد ہر آنے والے کو تندرہ

سننے والے بڑی عقیدت اور انہماک سے استاد کی گفتگو سن رہے تھے۔ مگر گوہر خاموش تھا۔ اس کی نگاہیں اپنے شکار کی تلاش میں لگی ہوئی تھیں۔

گوہر نے استاد فضل دین کو ٹوک کر پوچھا ”استاد جی یہ تو بتائیں کہ جس طرح بھائی کریم بخش کو زمین کے مالکانہ حقوق مل گئے ہیں اسی طرح باقی کاشتکاروں کو بھی زمینوں کے مالکانہ حقوق ملیں گے۔ یا باقی لوگ عمر بھر مزارع کے روپ میں زمینداروں کے غلام بنے رہیں گے؟“ استاد فضل دین پہلے تو چونکا، پھر نہایت اطمینان سے بولا: ”بھائی، حکومت بالکل غافل نہیں۔ بات اصل میں یہ ہے کہ حکومت کو پہلے تو ایسے مزارعوں کی صحیح تعداد کا پتہ نہ تھا جنہیں مالکانہ حقوق نہیں ملے، لیکن ۱۹۶۰ء کی زراعت شماری کے دوران حکومت نے کاشتکاروں اور زمینوں کے متعلق تمام معلومات حاصل کر لی ہیں۔ اب حکومت کو صحیح اندازہ ہو گیا ہے کہ کتنے مزارع باقی ہیں جنہیں مالکانہ حقوق دیئے جائیں اور مزید کتنی زمین زیر کاشت لائی جاسکتی ہے۔“

گوہر استاد فضل دین کی باتیں کچھ اس انداز سے سن رہا تھا جیسے کہ رہا ہو کیوں جھوٹ بچتے ہو؟ سرکار نے میرے بھائی کو اس لئے زمین دی ہے کہ میں غریب رہوں۔ سرکار میری زندگی کا مذاق اڑانا چاہتی ہے۔ مجھے سمجھو کون مارنا چاہتی ہے؟

استاد فضل دین اپنی تازہ تریں اطلاعات ایک طرح سے نشر کر رہا تھا کہ حلقے کا بیٹواری گھوڑی سرپنٹ دوڑاتا مکتب میں آیا۔ فضل دین اور کریم بخش اٹھے اور بیٹواری کی طرف بڑھے۔ گوہر نے چادر کی بکلی میں خنجر کو مضبوطی سے پکڑا اور اسٹاکہ کو فضل دین اور کریم بخش کے پیچھے بیٹواری کی طرف چل پڑا۔

نور دین، بیٹواری، گھوڑی سے اتر چکا تھا۔ چوکیدار گھوڑی کی دنگام تمام کر اسے کنوئیں کی طرف لے گیا۔ اور نور دین استاد فضل دین اور کریم بخش کے ساتھ مکتب کے کمرے کی طرف بڑھا۔ قریب تھا کہ گوہر ہاتھ اٹھا کر نور دین پر خنجر سے وار کرے کہ بیٹواری نے اپنی اچکن کی جیب سے ایک خاکی رنگ کا کاغذ نکالا اور گوہر کی طرف بڑھا کر کہا:

”گوہر علی! یہ لو زمین کے مالکانہ حقوق۔ میں تمہارے

ادھر کریم بخش زمین کا مالک بنا، ادھر سے گاؤں کی انجمن امداد باہمی سے بھی تعاونی قرضہ مل گیا۔ نہ صرف اسے بلکہ اس نے کئی دوسرے ساتھیوں کو بھی۔ اس نے جوان میل خریدے، تازہ بیج لئے اور خوب دل لگا کر زمین میں ہل چلایا، بیج بکیرا، اور جب فصل کافی تو پہلے سے دگنی تھی۔ کریم بخش بہت خوش تھا۔ اس کے بیوی بچے بھی بہت خوش تھے۔ امداد کریم بخش نے اس خوشی میں اپنے عزیز واقارب کی دعوت کی تھی۔ اپنے پریشان حال بھائیوں کو بلایا تھا۔ برادری کے کئی دوسرے افراد کو بھی مدعو کیا تھا۔ یوں تو پہلے بھی کئی بار کریم بخش کے گھر رشتہ داروں کا ٹھٹھ جمع ہوا کرتا تھا۔ پہلی بار کریم بخش کی لڑکی کی وفات پر جو غریب سات دن تک بخار میں مبتلا رہ کر چل بسی اور غریب باپ اپنی بچی کا خمار میں ڈپٹا دیکر کسی اس کے علاج کے لئے ایک بھوٹی کوڑی کا انتظام نہ کر سکا تھا اور برادری والے دوسری بار کچھ رمضان کی پیدائش پر آئے تھے، جب کریم بخش نے میل بیج کریم بخش کے لئے کھانے کا انتظام کیا تھا۔ میل بیج کرکھانے کا انتظام تو ہو گیا تھا مگر وہ ایک سال چھ ماہ تک دوسرا میل نہ خرید سکا، تب اس کے پاس بس ایک چارسی گلے رہ گئی تھی جس کے ساتھ وہ دوسرا جانور کسی سے مانگ کر جوت دیتا۔ اس طرح بہت سی زمین کاشت کئے بغیر رہ جاتی۔

لیکن آج کریم بخش کے گھر میں چہل پہل تھی۔ گاؤں کی لڑکیاں ڈھونک پر خوشی کے گیت گارہی تھیں۔ اس کے بیوی بچے صحت مند اور توانا تھے۔ گھر میں ہر چیز سلیقے سے رکھی تھی۔ جہاں خوش تھے مگر گوہر سخت پریشان نظر آتا تھا۔ وہ وہ کریم بخش کے بغاش چہرے پر نظر ڈالتا، اس کے بیوی بچوں کی طرف دیکھتا اسے اپنے گھر کا خیال آ رہا تھا... اپنے بیوی بچوں کا خیال جنہیں وہ بے مروت سامانی کی حالت میں جھوڑ کر چلا آیا تھا۔

کھانے سے فارغ ہو کر کریم بخش اور اس کے بہان بیہل کے درخت کی طرف گئے جہاں استاد فضل دین کا مکتب تھا۔ اسے حسب معمول باتیں کر رہے تھے۔ گھٹوں کی باتیں، افرط کا ذکر، فصل کی زراعتی، کبڈی کے مقابلے اور دوسری باتیں

شگفت گل

(طرح کار میں بچوں کی نمائش فن)

ارشاد سلمان

لاوٹ، بناوٹ اور شکلف سے ہمیز ہوتی ہے۔ اس میں بچہ جو اصل بچہ ہے پوری طرح جھلکتا ہے۔ ہمیں اسی صلاحیت کے شکلف کو سنبھالنا ہے۔ اگر ہم شگفت گل سے غفلت یا کوتاہی ہو تو بہت سے جوہر قابلِ اہم سے ہم جہلے ہیں۔ انسان کے ابتدائی عہد کو دیکھیں تو وہ بھی انسانیت کا بچپن نظر آتا ہے مگر یہی ہے کہ انسان اس وقت بھی بہت بچوں کی طرف قدم بڑھا رہا تھا۔ آج جب ہم غاروں میں بنائی ہوئی تصویریں دیکھیں تو نظر آئے گا کہ انھوں کی عکاسی اس وقت کے انسان کا مشغلہ تھا۔ نزدیک جتنے بچے جو بہا اور زندگی ملے تھے، وہ جانور جن سے اس کو سابقہ پڑا تھا اور اس کے آلات شکار کوئی نہ کوئی نقش بن کر ان غاروں کی دیواروں پر منتقل ہو جاتے تھے۔ ابتدائی انسان کے اس شغل صورت گری میں ہیں اور کچھ نظر آئے گا کہ انھوں نے گراہیک، بیاضنگی، سچائی، اچھ اور حرارت فکر ضرور نظر آئے گی۔ شاید یہی وہ صفات ہیں جن کی وجہ سے ہم ان پرانے نقوش کو بھی دیکھے بغیر نہیں رہ سکتے اور یہ جاننے کی کوشش کرتے ہیں کہ ان میں نئی نئی کیا ہے۔ سب سے بڑا احساس حیرت کا ہوتا ہے۔

اس عہد کا بچہ بھی اسی طرح اپنی فطری صلاحیت کے اظہار کا کوئی نہ کوئی بہانہ ڈھونڈتا ہے اور اگر اسے شکل بنانے کا موقع مل جائے بے ساختگی، خلوص فکر اور جرأت اظہار ضرور موجود ہوتی ہے۔

بچوں کے بنائے ہوئے نقوش بھی اپنی ہی ایک عجیب دنیا ہوتے ہیں۔ ایک پھول، ایک پھل، ایک پھلکاری، جو گلہائے رنگارنگ سے فرخن نظر آتی ہے اور بجائے خود ایک فنی، ڈڈی لینڈ ہوتی ہے۔ بچہ کسی چیز کو دیکھ کر کیا سمجھتا، کیا محسوس کرتا اور اسے کس طرح ہم تک منتقل کرتے ہیں بچائے خود ایک موضوع مطالعہ ہے۔ بچوں کے نقوش میں اگر آپ گھومیں تو اپنے آپ کو ایک ادھی دنیا میں پائیں گے۔ یہاں بچہ کئے لئے ہر شے حقیقی ہوتی ہے، بڑی ہی محسوس اور محسوس۔ یہ تو ہر گاہ کہ بچہ کی ڈرائنگ

بچے بچائے خود فطرت کا ایک ایسا عطیہ ہیں جو ہر وقت ہماری توجہ اپنی طرف کھینچتے رہتے ہیں۔ کبھی کبھل کو دلی حالت میں کبھی اپنی صورت بتاتے کہ میں، کبھی اپنی ذہنی افتاد کے کسی اور مظاہر سے غور سے دیکھیں تو اس پرانے مفکر کی سچائی محسوس ہوتی ہے کہ بچہ واقعی آدمی کا باپ ہوتا ہے اور وہ جو جن بڑھتا جاتا ہے اس کی ذہنی و جسمانی صلاحیتیں اور کردار ایک جتنے ہوئے درخت کے مانند طرح طرح کے برگ و بار حاصل کرتا چلا جاتا ہے۔ بڑوں کا کام یہ ہے کہ اس ننھے سے پودے کی اچھی طرح آبیاری کریں تاکہ جب وہ بڑا ہو تو جسم، ذہن اور نفسی و روحانی اعتبار سے دیگر انسانوں میں اپنے وجہ و موقع قدر و قیمت کے باعث الگ پہچانا جاسکتا ہو۔ یہ صحیح ہے کہ ہر فرد شاہ بخاطر نہیں بن جاتا اور ہر کچھ لازماً ایک عظیم شخصیت میں تبدیل نہیں ہوتا لیکن ہم کسی بھی شعبہ حیات کا ذکر کریں تو یہی نظر آئے گا کہ ہر فرد آدمی کبھی بچہ ہی تو تھا۔ صحیح تربیت اچھے ماحول اور مناسب پرداخت نے ہی اس کو کسی ممتاز مقام پہنچایا۔ یہ ضروری نہیں ہے کہ عظیم و مثالی ماحول ہی ہر کچھ کو تیار کرے۔ بلکہ زیادہ یہی دیکھا گیا ہے کہ گذری میں اصل چھپے ہوتے ہیں اور کچھ نہیں کہا جاسکتا کہ کوئی بچہ ایک عظیم انسان بن جائے گا۔ اس لئے قدرتی بات یہ ہوتی کہ ہم ہر کچھ کو اپنی امید گاہ سمجھیں اور اسے اس توقع کے ساتھ پرہیز چڑھائیں کہ اس میں بھی قدرت نے بڑی صلاحیتیں رکھی ہیں۔ توجہ دانی کہ درس گروں کے ساتھ ساتھ مناسب حالات پیدا کئے جائیں تو اکثر بچوں کی شخصیت و صلاحیت بار آور ہو سکتی ہے۔

بچوں کی صلاحیتیں پورے طرح کے روپ اختیار کرتی رہتی ہیں مگر دیکھا گیا ہے کہ بچہ جب اپنے اہل علموں سے کوئی چیز نہیں سیکھتا یا اپنے ذہن و تصور کو کسی گاندہ منتقل کریں تو اس وقت وہ صحیح معنوں میں اپنے وجود و راہی خودی کو ایک نمود بخشنے ہیں۔ ایسی نمود جو

دی جا رہی ہے، اور کئی فنکارانہ ملاکاری، صوریاتی اور ملکی سطح پر
منفرد کی جا چکی ہیں۔

اسی طرح کی ایک نمائش فن پچھلے دنوں ڈھاکہ میں منعقد ہوئی
تھی جس میں مشرقی و مغربی پاکستان کے بچوں نے حصہ لیا۔ یہ نمائش ڈھاکہ
کی مشہور فنی درسگاہ "آرٹ انسٹی ٹیوٹ" کے ایوان میں ترتیب دی گئی تھی
اور اکیس سو پچاس فنکار بچوں نے اس کے لئے اپنے نقوش بھیجے تھے۔ ان نقوش
کو دیکھ کر یہ احساس ہوتا تھا کہ رنگ، خط اور سوج کی نئی نئی راہیں کھلتی
چلی جا رہی ہیں۔

کسی پارہ فن کی قدر کا فیصلہ کرنا بڑا مشکل کام ہوتا ہے اور بچے
کے فن پر کوئی فیصلہ کر دینا اور بھی مشکل مسئلہ ہوتا ہے۔ اب بچوں کے لئے
سارے فنی نمونے ہمارے سامنے تھے اور کوئی بھی ایسا نہ تھا جس کی اپنی
انفرادی حیثیت یا قیمت نہ ہو جس تصویر کو بھی دیکھو اک جہان رنگ و خط
تھا، اور یوں اک جہان معنی بھی، مقصود یہ عرض کرنا ہے کہ ہمارے ہاں
بھی نئی تانقی میں فن نمود پانے کے لئے محمل رہا ہے۔ اس نمائش ہی میں جن
نئے فنکاروں کے نام لئے جاسکتے ہیں ان میں علاوہ اوروں کے ان بچوں کا
ذکر خصوصاً کیا جاسکتا ہے، انیس (۱۹ سال)، نسیم اختر (۱۰ سال)، میٹرو (۱۲ سال)،
(۱۶ سال)، عابد جس (۱۰ سال)، نورالاسلام (۹ سال)، امینہ خانم
(۹ سال)، فوزیہ دانی (۹ سال) اور رضا (۱۰ سال)۔

نمائش کے ان نقوش کو دیکھ کر یہ محسوس ہوتا تھا کہ ان بچوں
کے سامنے دنیا ایک نئے معنی لے کر جلوہ گر ہوئی ہے۔ انہوں نے جو کچھ
دیکھا اور محسوس کیا ہے اسے قلم و قریاس کی مدد سے ظاہر کر دیا ہے۔ دیکھئے
ان میں رنگ ہے، فاصلہ ہے، پھیلاؤ ہے، تناسب ہے، توازن ہے۔
انیس (۱۹ سال) نے برش سے جو کچھ بنایا ہے خاص طور پر بڑا توانا ہے۔
مشرق پاکستان کے جانے پہچانے ماحول کی بات۔ کشتیاں اور کشتی
بل گاڑی وغیرہ شاہیں کی تصویروں میں حیرت اور تازگی کا عنصر نظر آتا
ہے۔ یہ دو باتیں تو اکثر بچوں کے فن میں آپ ضرور پائیں گے۔ اس کی
"دو پہنیں" واقعی قابل داد تھی۔ عابد جس کے کام میں سادگی کی صفت تھی۔
تاصدقہ سنہری سنہری کھیت اور نزدیکی گاؤں کا نقشہ کھینچا تھا جس کی
جزئیات بہت صحیح تھیں۔ پس منظر میں گھلتا ہوا ماحول اس بچے نے
خوب دکھا یا تھا۔ رضا (۱۰ سال)، دونوں دس سالہ بچے اچھی تصویریں

میں کبھی صحت و تناسب ہوگا اور کبھی نہیں ہو سکتا ہے اس کا نقشہ، بہم یا
ممانہ آمیز ہوگا اس نے جو کچھ بنایا ہے وہ جاذب نظر ضرور ہوگا۔ لیکن ایک
اس کی سطح پر اس کا نقشہ کو دیکھنا ہوگا اور نہ آپ ایک بڑا تاشہ اور ایک
بڑا نیزنگ فکر و نظر کو دیں گے۔ بعض نقشہ جیب ہوں گے، بعض ہل بھی
اور بعض اوقات بعد سے۔ شاید آپ ایسی ضبط نہ کر سکیں۔ مگر یہ جانے آتا
ہے۔ یہی وہ نفسیاتی لمحہ ہے، جب آپ کی سفیدی کی آئینہ نش ہوتی ہے۔
بچے نے جو بھی نقش کھینچا ہے۔ آپ کے نزدیک ہل ہو سکتا ہے
مگر نگاہ آئینہ سازہ میں شکستہ شیشہ بھی عزیز تر ہوتا ہے، اس لئے ہر
کی نگاہ اور سمجھنے کی سچی روح کے ساتھ اسے دیکھئے۔ یہ صاحب ہیں صحت
ساتھ سے تین برس کے اور ایک نقش بنا کر لائے ہیں۔ کاغذ پر دو چار خط
ہیں دو چار فقط اداس بات پر ضرور ہی کہ یہ میدان میں کھیلے ہوئے بچے
ہیں۔ اگر آپ نے ان کی بات نہ مانی تو وہ آپ کو یقین دلا کر رہیں گے کہ
وہ جو کچھ کہہ رہے ہیں صحیح ہے۔ اگر آپ نے تقویہ کی روح کو نہیں پایا تو
اس میں بچے کا کیا قصور ہے؟ جیسے جیسے بچے کی عمر بڑھے گی اسے وہی
معلوم ہو جائے گا کہ حقیقت اشیا کیا ہے، تصویریں کیا ہونا چاہئے،
خط و خال کسے کہتے ہیں اور تناسب و توازن کس چیز کا نام ہے۔ مگر
ابھی اسے اپنی من مانی کرنے دیجئے۔ آج وہ مشکلہ خیر نقش بنا رہے توکل
وہ ایک عالم حیرت بھی بن سکے گا۔

نقشہ نگری بچوں کی ذہنی صلاحیتوں کو بڑی تیزی اور ترقی بخشتی
ہے۔ تعلیم کے، اہروں نے اس کی اہمیت کو بہت عرصہ قبل محسوس کر لیا تھا۔
آپ کو یاد ہوگا کہ اس بیسویں صدی کی ابتدا ہی سے اسکول کے بچوں کو تقویہ
اور جمبلی مٹی کے چڑچڑ پر بند بنانے کی مشق کرائی جاتی تھی۔ اس طرح بچوں
کو اپنی فنی صلاحیت کے اظہار کا موقع ملتا تھا اور تعلیمی رفتار کی ترقی بھی
اس میں مدد دیتی تھی۔

کسی دانا نے کہا ہے: بچہ اپنی جگہ و ایک قانون ہے اور اسے
اپنی تکنیک کو مرتب و مہذب بنانے کی پوری آزادی ملنی چاہئے۔ شاید
یہی بات ہے کہ اب ہم بچے کی آزاد فطرت کو پھیلنے چھوٹنے کا موقع دیتے ہیں
اور بچوں کی نقاشی میں بھی دلچسپی لینے لگے ہیں۔ یوں بچوں کی نقاشی اتنی
اہمیت اختیار کر گئی ہے کہ بین الاقوامی سطح پر ان کی نمائشیں بھی ترتیب
دی جا رہی ہیں اور ہر طرح کا سیلاب ثابت ہوئی ہیں۔

پاکستان میں بھی اب بچوں کی نقاشی کی طرف پوری طرح توجہ



دنوں ڈھا کہ انسٹیٹیوٹ میں مغربی و مشرقی پاکستان کے نونہال فنکاروں
، نمائش نقاشی ترتیب دی گئی تھی جس میں ملک کے ہر حصہ سے
نو عمر اور ہونہار نقاشوں نے حصہ لیا ۔

اس نمائش کی چند ممتاز تصاویر یہاں پیش کی جانی ہیں ۔

مشو (معین العابدین) : ساڑھے سات سال



نورالاسلام : ۹ سال



کے۔ ایم۔ جمال الدین : ۸ سا



غزالہ شاہین : ساڑھے چھ سال

’پک چمن گل‘



مرغزار

برفستان



بل کھاتے دریا

لمبوش وادی



اکستان کا شمال نہ صرف اپنی برکش اور بلند وبالا
ہاڑوں، اپنی برف پوش چوٹیوں، لمبوش وادیوں اور
درتی مناظر کی فراوانی کے باعث مشہور ہے، بلکہ وہ
اریخ و تہذیب کے کئی دھاروں کا سنگم بھی رہا ہے
ور عرصہ دراز سے اپنی دفاعی حیثیت کے باعث بھی
ہک اہم خطہ سمجھا جاتا ہے۔ اس خطے میں ریاست
مائے چترال، گلگت، ہنزہ، دیر، سوات اور باجوڑ کے
علاقے خصوصی امتیاز کے مالک ہیں۔ یہاں گلگت
ور نواحی علاقوں کے چند رنگین اور خوبصورت قدرتی
مناظر پیش کئے جاتے ہیں۔

جو ہم سب کے لئے موجب مسرت و فخر ہے نئی دہلی میں مشہور فنکار شکر نے حال ہی میں بچوں کی جو بین الاقوامی نمائش فی ترتیب دی تھی وہ مقام آرائی کی بنیاد پر تھی۔ ۷۷ ملکوں سے تقریباً ایک لاکھ نقوش اس مقابلہ میں شریک ہوئے تھے۔ ان نقوش میں ہمارے دو بچوں کو بھی بین الاقوامی انعام ملا۔ ایک صاحب کا نام ہے مبارک حسین (۱۰ سال) اور دوسرے صاحب "ایم" کہلاتے ہیں (۱۵ سال) یہ بچے مرکزی کالج کھارمیلہ (مشرقی پاکستان) کے فنی ادارے کے رکن بھی ہیں۔

مختصر یہ کہ ہم بچوں کی ان تصویروں کو دو وجوہ کی بنا پر پسند کرتے ہیں، ایک تو یہ بات کہ بچے ہم سے اتنے قریب ہیں، عزیز ہیں اور یہ کہ وہ بالغوں کے معیاروں کی طرف بڑی تیزی و دہشتندی سے بڑھ رہے ہیں اور دوسری بات یہ ہے کہ بچے اپنی تصویریں بنا کر کس قدر خوش اور مطمئن ہوتے ہیں اور اپنی اس مسرت و احساس کو کیسی کامیابی اور خوبصورتی کے ساتھ ہم تک منتقل کر دیتے ہیں۔ ہم تمہیں پران کا یہ احسان ناقابل فراموش ہے :

بناتے ہیں۔ نور اسلام کی گھاٹ پر لگی کشتیاں آپ کی توجہ پہنچنے نہیں دیتی تھیں۔ میٹرو میاں قی بھی صرف سات سال کے ہیں۔ اب رفا کی سرزمین کے نو نوال۔ مگر یہی بھی کس باپ کے بیٹے۔ پاکستان کے عالمی شہرت یافتہ نقاش، زین العابدین کے فرزند۔ اس بچے کو فن کی بڑی امید مانا جاسکتا ہے۔ اس نے اپنی ماں کو اونہٹے ہوئے دکھایا تھا۔ جاڑے کا سال ہے، شام ہو چکی ہے اور ماں بیٹھی (شاید بیٹے کے لئے ہی) کوئی اونی چیز بن رہی ہے! ذہنی اثران کی بڑی، اہمی مثال ہے۔

بسی قاضی، گیتی، ارونا، ششین، معصومہ خانم، فوزیہ دانی، جمال الدین اہد پرویز احمد وغیرہ ایسے بچے تھے جو "ممتاز" فہرست میں رکھا جاسکتا ہے۔ ان سب میں وہ بات ضرور تھی جس سے یہ انداز ہو سکتا ہے کہ پاکستان کے بچوں میں فنی انہار کی بڑی عمدہ صلاحیت ہے اور فنی نسل سے ہمیں بہت سے اچھے فنکار ملنے کی توقع ہو سکتی ہے۔ صرف اپنے ہی ملک میں نہیں، ہمارے بعض ذہین بچوں نے تو بچوں کے بین الاقوامی مقابلوں میں بھی امتیاز حاصل کر لیا ہے

نیا ادبی انعام

ترقی اردو بورڈ، کراچی، ادارہ مصنفین پاکستان، پاکستان رائٹرز گلڈ کے اشتراک اور مالی تعاون سے بچوں کے لئے دلچسپ اور مفید کتابوں کا ایک انعامی مقابلہ منعقد کر رہا ہے۔ اس سلسلے میں حسب ذیل موضوعات پر لکھی جانے والی بہترین کتابوں پر نقد انعامات کا اعلان کیا جاتا ہے:-

انعامات :

عنوانات :

(۱) کہانیوں کا مجموعہ دکل تقریباً ۵ ہزار الفاظ

(۲) ڈرامہ ۵۰۰ منٹ کا مکمل

(۳) طویل کہانی دکل تقریباً ۵ ہزار الفاظ

(۴) سیر پاکستان پاکستان کے دلچسپ تاریخی اور جغرافیائی مقامات کا بیان، مع تصاویر۔

(۵) مائٹس کے کرشمے یا دلچسپ تجربے

ہر عنوان پر مبلغ ۵۰ روپے کا ایک انعام پیش کیا جائے گا۔

کتاب صاحب کتاب کی ملکیت رہے گی۔

شرائط مقابلہ حسب ذیل ہیں:-

(۱) مسودات خیر مطبوعہ ہوں اور مقابلے میں شریک ہونے والے

مصنف کی تحریر اور ملکیت ہوں۔

(۲) مسودات مکمل اور قابل اشاعت ہوں۔

(۳) زبان سادہ اور پلید بیان دلچسپ ہو۔

(۴) انعام پانے والی کتاب مصنف کی ملکیت رہے گی لیکن اس کی

پہلی اشاعت کا حق ادارے کو حاصل ہوگا۔ اگر والدین نے

اس کی اشاعت منظور کی تو اس کی خاص شراائط مصنف کے

ساتھ علیحدہ طے کی جائیں گی۔

(۵) انعامات اور ان سے متعلق جملہ امور کی بابت ترقی اردو

بورڈ کا فیصلہ قطعی اور آخری ہوگا۔

(۶) کلاسیکی یا دوسری کتابوں کے علاوہ قبول نہیں کئے جائیں گے۔

(۷) مسودات ۳۰ جون ۱۹۶۳ء تک حسب ذیل پتے پر پہنچ جائے

چاہئیں۔ اس کے بعد وصول ہونے والے مسودات مقابلے

میں شریک نہ ہوں گے۔

شان الحق حقی۔ سکرٹری ترقی اردو بورڈ

۶۷۲۔ اردو منزل، جمشید روڈ، کراچی ۷

آئے گی رت ساون کی

زہراء ڈار

بیت بھارت آ۔ یہ ماہر حسین نے کہا تھا۔ لیکن کیا وہ رت۔ ہمارے رت۔ جس کا اس شاعر نے اس ذوق و شوق اور حسرت سے ذکر کیا ہے۔ واقعی بیت بھارت؟ یہ نظم اس کا جواب ہے۔ (ادارہ)

نگر نگر میں چہر چاکر دو
جگل میں پریت میں، تھلہل میں
ساون آنے والا ہے
ڈگر ڈگر پر چلنے والو
میتھے نئے نئے گونجیں گے
بادل چھلنے والا ہے
وادی وادی صحرا صحرا
آج خوشی میں جھومیں گے
نگر نگر میں جا کر کہہ دو
بھیل اور غمور گھٹ میں
پت چھڑکب کی جا بھی چکی
جھوم جھوم کے آئیں گی
نازک پات جلائے والی
ساون کی جگل پر یاں آکر
لو آخر شہر ما بھی چکی
گھوم گھوم کے گھا میں گی
اب خوشیاں ہی خوشیاں ہو گی
غمی نہ پر پھیلائے گی
گھر گھر میں دیوالی ہو گی
آشا جوت جگائے گی
رم جھم کی آواز رسیلی
کانوں میں رس گھولے گی
برساتوں کی رسیا، کالی
کوئی کو کو بولے گی
لاری پھندی گہنائی تاریں
گلی گلی میں گھومیں گی
جل پر یوں کے روپ میں آکر
لاکھوں تیریں جھومیں گی
اب کوئی نہیں کہہ دو ہو گا
اور نہ کہیں گے آئے گا
را بھیا کوئی نہ جو گی ہو گا
اور نہ کان چھدائے گا
جھیل، سمندر، ندی نالے
اب بھرنے ہی والے ہیں
فطرت جن کو رکھنا چاہے
وہ کب مرنے والے ہیں

پھر بھی نہ جانے کیوں دل میرا
مر جھایا سا رہتا ہے
سب کچھ ہوتے ساتھ چلا
کلا یا سا رہتا ہے

”ماہ قاشقار“

(چترال)

سید غلام حسن شاہ کاظمی

خود ریاست کے باشندے اس کا تلفظ چترار کرتے ہیں (قلمی تاریخ چترال از مرزا غلام مرتضیٰ خاں)۔ مولانا محمد سپر مرحوم کا شعر ہے:

مسافر گشت دیدم شہر بسیار

ندیدم هیچ جلسے مثل چترار

اس لفظ کا صحیح مفہوم متعین کرنا مشکل ہے تاہم اس کے مناسب رکھنے والی بعض ترکیب پر غور کرنے سے اعلازہ ہوتا ہے کہ ان کے اجتماعی مفہوم میں دائرہ، مرکزیت، آفتاب، ماہتاب اور ان کی روشنی شامل ہے۔ اس سے مراد دارالحکومت ہی متصور کیا جاسکتا ہے۔ اگر اس لفظ کی اصلیت فارسی ہے تو ہو سکتا ہے کہ ابتدائی اصطلاح ”چترآرا“ (سایہ فگن۔ سایہ آراستن) ہو۔ اس سے مراد بھی ”حکمران“ یا ”دارالحکومت“ ہی ہے۔ چترار کے آخری ”ر“ کا ”ل“ سے بدل جانا کوئی خاص بات نہیں کیونکہ فارسی میں اس کی متعدد مثالیں ملتی ہیں۔ لہذا چترار کا چترال ہو جانا محض تلفظ، لہجہ اور املا کے تصرفات ہیں۔ اصل لفظ چترار ہی ہے جیسا کہ مقامی باشندوں میں اب بھی مروج ہے۔ اس کے معنی ہیں ”چمن زار“۔ سید احمد شہید کے مصنف مولانا غلام بریل ہر رکھتے ہیں، ”چترال کی وجہ تسمیہ یہ بتاتے ہیں کہ اصل لفظ چتر تھا۔ چتر چترالی زبان میں چمن کو کہتے ہیں۔ چترار بمعنی چمن زار“ چونکہ وہ مغلوں، ترکوں، تاتاریوں، چغتائیوں وغیرہ کے اقتدار سے دوچار رہا لہذا اس کے تلفظ کے سلسلے میں ان کی زبان کی کمی و زیادتی سے بھی اضافہ نہیں کیا جاسکتا۔

کم و بیش سو برس سے اس کا نام چترال ہی مروج ہے اور اس کا یہ آخری نام ہے جو ہمارے ہاں چترال کے تلفظ و املا سے متعارف ہے (مکتوب مرزا غلام مرتضیٰ خاں)۔ تقریباً

وہ سرزمین جس کو آج ہم چترال کہتے ہیں صدیوں کی طویل مدت میں جانے کتنے منازل طے کرتی اور طرح طرح کے روپ بدلتی اس دور میں داخل ہوئی ہے لیکن ہنگامہ شکستہ شناس سے اس کی کوئی ادراک پوشیدہ نہیں رہی ہے:

بہر رنگی کہ خواہی جامہ می پوشش

من انداز قدت را می شناسم

چترال کے صد ہا پہلو ہیں جو دامن دل کو اپنی طرف کھینچتے ہیں مگر ان صد ہا پہلوؤں کو دو چار صفحات میں بیان کرنا بھی ممکن نہیں۔ بہر کیف ان چند سطروں میں چترال کا تعارف پیش کرتا ہوں اور بہت سی تفصیلی باتوں اور حقیقی حالات کو بخوف طوالت نظر انداز کرتا ہوں۔ سب سے پہلے اس کی جغرافیائی کیفیت کا بیان کرنا ضروری ہے۔ موجودہ ریاست چترال کے شمال میں علاقہ دھان اور ٹکٹا واقع ہے۔ مغرب میں افغانستان کے علاقے زیباک، کافرستان اور باشگل ہیں۔ جنوب میں علاقہ گبرونگ، ریاست دیر اور باجوڑ کی آبادیاں ہیں۔ مشرق میں گلگت اور کوہستان سوات کے خطے ہیں۔ چترال کی سب سے اہم وادی ۲۳۵ میل لمبی ہے۔ وہ پانچول کے درہ برودھیل سے شروع ہو کر جنوب میں ارندونگ افغانستان کی سرحد پہنچتی ہے۔

آج چترال کا لفظ پوری ریاست کے لئے استعمال کیا جاتا ہے مگر پہلے یہ صرف اسی مقام کا نام تھا جسے شاہ کثوراول (۱۶۶۱ء) نے اپنے دارالحکومت کے لئے منتخب کیا تھا۔ یہ کوئی تعجب کی بات نہیں کہ پہلے یہ ایک محدود مقام کا نام تھا اور اب اس کا پوری ریاست پر اطلاق ہوتا ہے۔ کتنی آبادیاں اور ویرانے اس حقیقت کے گواہ ہیں۔ ریاست سے باہر کے لوگ تو اس کو چترال ہی کہتے ہیں مگر

ایک صدی قبل اس کا نام قاشقار تھا۔ یہ منگولی زبان کا لفظ تھا جس کو فارسی میں کاشغر کہتے تھے۔ میرے خیال میں اس کا ماخذ منگولی زبان ہے کیونکہ ابتدائی سے یہ علاقہ منگولین نسل کا مرکز توجہ اور مسکن رہا ہے۔

قاشقار کی لغوی تحقیق سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس کا مفہوم کوہستانی ملک اور برفانی علاقہ ہے۔ محل وقوع کے اعتبار ہی سے نہیں بلکہ واقعیت کی بنا پر بھی اس کا یہ نام مروج ہوا۔ لوگ غلطی سے اس قاشقار کو کاشغر سمجھنے لگے "چکر اولیا" نے اس کا نام (چترال) کاشقار سنا تھا۔ اس لئے بیان کرتے وقت کبھی کبھی کاشغر بھی بولتے رہے۔ عام لوگوں نے اسے معروف کاشغر سمجھ لیا جو پارقند کے پاس ہے؟ (سید احمد شہید جلد ۱ ص ۲۱۹) اور پھر یہ غلط فہمی اس حد تک پہنچ گئی کہ سید احمد شہیدؒ کی چھوٹی بی بی کے اخلاف بھی اپنے مادری سلسلے کو معروف کاشغر ہی کی طرف منسوب کرتے رہے۔ (مولانا تہر) دراصل قاشقار اور کاشغر میں کوئی معنوی فرق نہیں۔ فرق صرف بعد و مسافت کا ہے اور جیسا کہ جناب مرزا غلام مرتضیٰ خاں نے مجھے ایک مکتوب میں لکھا ہے، ترکستان کے کاشغر اور اس ملک کے قاشقار میں صرف اتنا فرق ہے کہ اول الذکر کو کاشغریا قاشقار بزرگ کہتے ہیں اور موخر الذکر کو کاشغریا قاشقار خورد۔ دونوں کا املا اور تلفظ قاشقار بھی ہے اور کاشغر بھی لیکن دونوں کا محل وقوع مختلف ہے۔ باجور، سوات وغیرہ میں اب بھی لوگ اسے قاشقار ہی کہتے ہیں۔ بہر حال اس کا اطلاق قاشقار کاشغریا قاشقار یا کاشغر کاشغریا ہو لیکن یہ چترال ہی کا قدیم نام ہے اور اس کا اطلاق کسی ایک قریہ پر نہیں بلکہ پورے ملک پر ہوتا تھا۔ چنانچہ افغانی سرحدات کے مشہور عالم دین، اخوند داویدہ ننگر ہارسی (۱۲۸۶ھ) نے اپنی مشہور تصنیف "تذکرۃ الابراہیم والاشراہ" (ص ۲۸۱) میں قاشقار کا لفظ پورے ملک کے لئے استعمال کیا ہے۔ یہی نہیں بلکہ وہ اسے "ملکت قاشقار" لکھتے ہیں۔

مولانا تہر نے کاشقار یا قاشقار نام کسی بستی کے

متعلق لکھا ہے کہ اب تک اس کا ذکر نقشوں میں ملتا ہے لیکن مرزا غلام مرتضیٰ صاحب اس نام کی کسی بستی کا وجود تسلیم نہیں کرتے (البتہ وہ اپنے ایک مکتوب میں قاشقار کے حدود میں اوداس کے متصل ایک اور بستی کا نام قاشقار بتاتے ہیں۔ وہ مولانا مہر کی بتائی ہوئی بستی پر غور و فکر کے بعد اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ خاص چترال سے چند میل کے فاصلہ پر "یک قریہ واقع است کہ نام اس قاشقار ہی باشد" قاشقار، قاشقار اور قاشقار تینوں میں قاشقار اکثر لفظی دلچسپ ہے۔ ان الفاظ کی ساخت اور صوت سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ وضع قطع میں منگولین ہیں۔ شیکر نہیں جیسا کہ بعض لوگوں کا خیال ہے۔

بہر حال قاشقار میں کوئی بستی فی الواقع اس نام سے نہ پہلے آباد تھی اور نہ آج چترال یا اس کے آس پاس مضافات میں قاشقار نام کی کسی بستی کا سراغ ملتا ہے۔ البتہ قاشقار کے ہمزون اور قریب المخارج دو جگہ ہیں ہیں جن کا ذکر جناب غلام مرتضیٰ خاں نے اپنے مکتوب میں کیا ہے۔

یہاں کاشغریا قاشقار کے ایک خاص مفہوم کا ذکر غالباً خالی از دلچسپی نہ ہوگا۔ علامہ محسن فانی کشمیری (۱۸۸۲ء) نے اپنی کتاب "دبستان مذاہب" میں صفحہ "ماہ کاشغر" ایک جگہ استعمال کیا ہے۔ اس کی تشریح کے سلسلہ میں یہ حاشیہ (ص ۳۱۳) ایذا ہوا ہے: "ماہ کاشغر ماہ صیام است کہ کنایہ از خوابان و ماہ و شان ترک ہم است۔ اس سے دو امکانات کا پتہ چلتا ہے۔ ایک یہ کہ مخصوص جمالیاتی لٹریچر گوناگوں کی وجہ سے کاشغریا قاشقار نام پڑ گیا ہو۔ دوسرے اپنے مخصوص اوصاف ہی کی وجہ سے لوگوں کے ذہن پر یہ نام چھا گیا ہو۔ یہ ویسا ہی کنایہ ہے جیسا کہ ہلال عید کا کنایہ کلید میکدہ شہر تھا:

ہلال عید براوج افق ہو یداشد

کلید میکدہ گم گشتہ بود پیداشد

"ماہ کاشغر" کی تعبیر ایسی ہی ہے جیسے ماہ کنعان

ماہ مصر، مہینے، ماہ پارہ وغیرہ۔ شاید اسی مناسبت ہی سے ماہ سے "مہتر" کا لفظ حکمرانان قاشقار کے لئے وضع کیا گیا ہو۔ آج بھی وائی چترال کو مہتر چترال کہتے ہیں۔

مختصر یہ کہ قاشقار موجودہ ریاست چترال ہی کا قدیم نام ہے۔ یہ کسی ایک قریہ یا موضع کا نہیں بلکہ اس کا اطلاق پورے ملک پر ہوتا تھا جس کے حدود وہی تھے جو آج ریاست چترال کے ہیں۔ یاسین، مستونج، یونیال اور گلگت کی جانب رخ کریں تو قاشقار کے حدود کہاں پر ختم ہوتے ہیں اس کے جواب میں جناب مرزا غلام مرتضیٰ خاں لکھتے ہیں کہ عہد سابق میں ارندو سے لے کر مستونج اور تورچہ تک قاشقار کہا جاتا تھا۔ والی یاسین سلیمان شاہ (۱۶۴۴ء) کی حکومت مستونج سے گلگت تک تھی مگر گلگت کے علاقے قاشقار میں شمار نہیں کئے جاتے تھے۔ قاشقار صرف مستونج سے لے کر ارندو تک محدود تھا اور یہ آج بھی ریاست چترال میں شامل ہیں۔ بہر حال لادری سے مستونج تک کے علاقہ کو پہلے بھی قاشقار کہتے تھے اور آج بھی کہتے ہیں۔ قاشقار کا لفظ موجودہ چترال کے حدود پر پورا حاوی ہے چترال سے پہلے پوری ریاست کا نام قاشقار تھا۔ یہ ایک ہی ریاست کے دو نام ہیں، ایک مقدم دوسرا مؤخر۔

قاشقار سے پہلے اس خطہ زمین کا نام بلڈر تھا۔ زمانہ قدیم کے بعض مورخین اس کو اسی نام سے یاد کرتے ہیں۔ چنانچہ کرغز وغیرہ کے لوگ اب بھی اسے بلڈر ہی کہتے ہیں۔ مصنف تاریخ رشیدی (سال تصنیف ۱۹۵۱ء) مرزا حیدر دو غلات کا شعری گورگانی (سال وفات ۱۹۵۸ء) نے بلڈر کے حدود اربعہ، اس کے باشندوں کے مندرجہ ذیل عقائد، طرز جنگ اور بعض دوسرے حالات لکھے ہیں اور ان پر سیر حاصل بحث و تبصرہ کیا ہے۔ اس قلمی کتاب سے بعض ضروری باتوں کا خلاصہ یہ ہے۔

۱۔ بلورستان کی حد شرقی ولایت کاشغر و یار قند ہے۔ حد شمالی میں بدخشاں اور حد مغربی میں کابل، لغمان اور لغمان ہیں۔ حد جنوبی میں سواد کشمیر ہے۔ مابین اور اس کے گرد اگر چار ماہ کا راستہ ہے۔ تمام ملک میں پہاڑ اور درے ہیں۔ تنگی کی یہ کیفیت ہے کہ تمام ملک میں ایک

فرخ بھی زمین ہموار نہیں۔ آبادی بہت ہے۔

۲۔ بلڈر ایک کافرستان ہے۔ باشندوں کا نہ کوئی مذہب ہے اور نہ وہ کسی چیز سے پرہیز کرتے ہیں۔ وہ اپنی مرضی کے مطابق جو بھی چاہے کر گزرتے ہیں۔

۳۔ ہر گاؤں ایک دوسرے سے نبرد آزما رہتا ہے عورتیں گھر کے کاموں اور زراعت میں مصروف رہتی ہیں اور مرد جنگ میں۔ کھانے کے وقت عارضی طور پر صلہ ہوجاتی ہے اور کھانا ختم کرنے کے بعد پھر جنگ چھڑ جاتی ہے۔

۴۔ جس کا سلسلہ غروب آفتاب تک جاری رہتا ہے پھر عورتیں درمیان میں پڑ کر دوسرے دن صبح تک کیلئے صلہ کر دیتی ہیں کبھی کبھی تو رات بھر جنگ ہوتی رہتی ہے۔ چرواہا ہیں کم ہیں۔ اونٹ اور بھیڑ بکریاں بھی قلیل البتہ

۵۔ گائیں بکثرت ہیں جن سے دودھ ممکن بجفایت حاصل ہوتا ہے۔ ہر درہ کے لوگوں کی زبان جدا ہے جنگ و جدل کی وجہ سے وہ ایک دوسرے کی زبان سے واقف نہیں ہیں باغات اچھے ہیں جن میں ہر قسم کے میوے ہوتے ہیں۔ خاص طور پر انار کی ایک عمدہ قسم ایسی ہے جو بلور کے علاوہ کہیں نہیں دیکھی گئی ہے۔ اس کے دانے سفید و شفاف اور شیریں ہوتے ہیں۔

بلڈرستان کی اصطلاح سے بھی پہلے ریاست چترال کا قدیم تاریخی نام کہوستان تھا یعنی کہو قوم کی سرزمین۔ ابوریحان البیرونی نے محمود غزنوی (۴۲۱ھ) کے حملوں کے سلسلہ میں بیان کیا ہے کہ جلال آباد سے گلگت تک پہاڑوں میں ترکمان آباد ہیں (قلمی تاریخ چترال)۔ البیرونی نے کہو اقوام کو ترکمان لکھا ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ کہو قبائل جلال آباد سے گلگت تک پھیلے ہوئے تھے اور سارے علاقہ کو کہوستان کہا جاتا تھا۔ ۳۲۶ قبل مسیح میں اس ملک کا مروج نام کہوستان تھا۔ چنانچہ مصنف تاریخ چترال (قلمی) نے لکھا ہے کہ جب سکندر یونانی کی افواج نے آسار کے مقام پر دریا عبور کیا تو اس عہد کے مورخین نے اسے کہو آپس۔

(KAHADAPSUS) لکھا ہے۔ یعنی دریائے کہو۔
اس سے معلوم ہوتا ہے کہ کہو قوم اس وقت آسمان کے علاقوں پہلے
سے موجود تھی۔

رقص شرور برق

صادق مصطور

یہ خطہ گل رنگ و ضیا بار و طرب ریز
یہ مرکز انوار حسین، ملک بہاراں
یہ نہرہ جبینوں کی، یہ نہراؤں کی بستی
یہ چاند ساروں کی زین، شہر نگاراں

ہے پیش نظر خواب زینجا کا نظارہ
سنتا ہوں کسی چاہ سے یوسف کی صدائیں
کھلتے ہیں یہاں پھول گلستانِ ازل کے
اک جنتِ گمشدہ کی آئی ہیں ہوائیں

کھلتے ہوئے ہر سمت شعاعوں کے درپچہ
ڈھلتا ہوا انوار میں ناہید کا ڈیرا
پائل سی چھنکتی ہوئی پھر رقص صبا میں
پھر جاگ اٹھا شہر نگاراں میں سویرا

یہ شونخ ہواؤں سے اُبھرتی ہوئی زلفیں
یہ اودی گھٹاؤں میں ریخ ماہ مثالاں
رقص شرور برق کا عالم سیرستی
گھلتا رہوئے عارضِ خورشید جلالاں

سبزے پہ مچلتا ہوا سوسن کا سراپا
پھولوں میں نکھرتی ہوئی نرگس کی جوانی
یاد آیا محنت کو فسوں حسین جوان کا
دہرانے لگا ذہن کوئی بھولی کسانیاں

رومان و جنوں کا وہ بلاخیز زمانہ
شہزادگی مہکتی خواب کا عالم
وہ چاندنی راتیں، وہ سمندر کا کنارہ
وہ چھاؤں میں نادوں کی ہے تہاب کا عالم

اُس مرکزِ انوار سے پھر لوٹ رہا ہوں
منزلِ مری ہستی کی خدا جانے کہاں ہے
لیکن مے ٹوٹے ہوئے خوابوں کا سفینہ
اس سیلِ تجلی کے تلاطم میں دواں ہے

چترال کی پرانی ملکی تقسیم میں اس کے دو شمالی اضلاع۔
مولیکہو (زیریں کہو) اور توریکہو (بالائی کہو) ہیں اس
سے قبائل کہو کے لغزات و مقبوضات پر ہلکی سی روشنی
پڑتی ہے۔

کوہ اور کہو قریب المخارج الفاظ ہیں جن کے اطلا
میں بھی معمولی فرق ہے۔ اس لئے ان کے مراتب کو ملحوظ
نہ رکھا جاسکا۔ انگریزی (KAHOSTAN) جب اردو میں
لکھا گیا تو کہوستان کو بھی کوہستان یا کہستان لکھا۔ اور
بولیچانے لکھا۔ اس التباس و ادغام نے اصل صورت ہی منہ
کردی۔ اگر چترال کو کوہستان کہا جائے تو اس لئے غلط نہیں
سمجھا جائے گا کہ وہاں واقعی پہاڑ ہی پہاڑ ہیں۔ غیر چترالی
مشکل سے سمجھ سکتے ہیں کہ چترال کا قدیم تر نام کہوستان اور
اس کے معنی قبائل کہو کا مکس ہے۔ جہاں دونوں کے تلفظ
میں فرق ہے وہاں ان کے معنوں میں بھی فرق ہے۔ قبائل کہو
کی زبان کو آج بھی کہو وار کہا جاتا ہے۔ یہی زبان ہے جسے
ہم لوگ چترالسی کہتے ہیں۔ اہل ملک کے افہام و تفہیم کا
بڑا ذریعہ یہی زبان ہے جو اہل ملک کے لئے مادری زبان
کا درجہ رکھتی ہے؟

*

اے کرمی خواہی نظامِ عالمے
جستہ اور اساسِ نمکے
داستانِ کہنہ شمشہ، باب باب
نکر را، بخش کن از اتم الکتاب
(قبیلہ)

غزل

بشیر فاروق

محمد صدیقی

یاد ہیں ہم کو ابھی تک وہ زمانے اپنے
جب تری زلف کے سائے تھے ٹھکانے اپنے
ہم وہی ہیں کہ جنہیں پیار کیا تھا تو نے
تجھ کو بھی یاد ہیں کچھ اگلے زمانے اپنے
جانتے ہیں کہ تغافل ہے ترا شیوہ، مگر
پھر بھی آجاتے ہیں ہم جی کو جلانے اپنے
فکرِ تعبیر کی زحمت ہو گوارا کیونکر
خواب جب ہوتے ہیں اس درجہ سہانے اپنے
نگہِ شوق نے دم توڑ دیا گیسر اگر
کام آتے بھی کہاں تک یہ بہانے اپنے

جب بھی پیغام بہاروں کا صبا لائی ہے
بے جہان نہ مجھے آپ کی یاد آئی ہے
اب تو آگیا غورِ رشید صبحی لے کر
رات پہمانہ مہتاب چسلا لائی ہے
لالہ و گل کی جبینوں پر شکن آئے ہیں
جب بھی تیرے لب و رخسار کی بات آئی ہے
گلشنِ درد میں زخموں کے سوا کچھ نہ ملا
عشق کے شہر میں رسوائی ہی رسوائی ہے
مندِ خنجر و گل ہر نہ ملا حسن کو چین
عشق کو بتر تیرے خار پر نیند آئی ہے
کل بھی تھی مولس و غمخوار تری یاد وفا
آج بھی یاد تری ہم دم تنہائی ہے
صبح غم، نالہ شب، سوز و گدازِ محفل
لے کے سوغات یہ سلمائے حیات آئی ہے
آہ کرتا ہوں تو آتا ہے جنوں پر الزام
بات کرتا ہوں تو اندیشہ رسوائی ہے
زندگی نغمہ تیرے شوق و طرب ریز نہیں
زندگی درد سدا ہے شکبائی ہے
پھپھ گیا، مہر جہاں تاب، قمرِ دوب گیا
سمیع جاں سوز ہی اک محرم تنہائی ہے
پیکرِ گل میں کہیں جانِ منشا ہی نہ ہو
وہی شوخی، وہی مستی، وہی رعنائی ہے
کل بھی ہر ذراغ تھا ہر پھول کا سینہ فاروق
آج بھی زخمِ فشاں لالہ صحرائی ہے

مجلد مشرق : بقیدہ ۳۸

قریب وہی لباس و وضع جو دودھ بھکشوں یعنی فقرا کا ہوتا ہے۔ رنگامتی میں چکر قبیلہ کے لوگ بانس کی دو مندر بنائے ہیں۔ یہی ان کا مکان ہے اور یہی ان کا مویشی گھر۔ مکان کی بجلی منزل میں مویشی باندھ دیئے جاتے ہیں اور اوپر کی منزل میں خود رہتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ اس طرح رہنے سے وہ سانپ اور دیگر موزی جانوروں سے محفوظ رہتے ہیں۔ یہ لوگ زیادہ تر مچھلی، بھری اور چاول پر گزارہ کرتے ہیں۔ یہاں ایک خاص قسم کی کھجور اور طرح طرح کے کیلے بڑی کثرت سے ہوتے ہیں۔ مگر مین کنٹال نامی ایک بھری بھی ادھر پیدا ہوتی ہے۔ یہ لوگ دودھ پینے کے عادی نہیں اور دودھ سے طرح طرح کی مٹھائیاں بناتے ہیں خاص کر دس گلہ۔ ربرٹی کے بھی بڑے شوقین ہیں اور یہاں نوازی بھی خوب کرتے ہیں شعل مزاج بھی ہوتے ہیں مگر زیادہ تر ہمارے رہتے ہیں۔ اور اب پاکستان کا باشندہ ہونے کے بعد تو متمدن زندگی کی طرف براہِ قدم بڑھنا ہے یہاں اور ان کی تعلیم و تربیت کا انتظام ہو رہا ہے۔

اور عمارتی نگر کی کھجلی میں یا تالاب ہی تالاب جہاں دیکھو عورتیں اور بچے نہادھور ہے ہیں یا مچھلیاں پکڑ رہے ہیں۔ یہاں حکومت کی طرف سے مچھلی پالنے کے مثالی فارم بھی بنے ہوئے ہیں جہاں اعلیٰ قسم کی مچھلی کا شکاروں اور آبپاشی پروردوں کو مہیا کی جاتی ہے۔ چانگام کے جنگلوں میں بعض بعض درخت تو بڑے ہی پرانے ہیں۔ تین تین سو سال پرانے درخت یہاں عام ہیں۔ چانگام کی ایک نمائش میں مجھے ایک درخت کے کچھ حصے کو دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ اس کا گھیرا ہوا فٹ تھا اور یہ سوہو بھری کے اوخر میں پویا گیا تھا۔ اس درخت کا نام چپا فلی بتایا گیا یعنی چپا مھول کا درخت۔ اس کی نگر مٹی بڑی مضبوط ہوتی ہے اور گھر کا فریج بہت عمدہ بنتا ہے۔

چانگام کے پہاڑی علاقوں میں کئی قبائل آباد ہیں۔ جیسے چکر، مونگ، مورونگ وغیرہ۔ یہ لاندھرب ہیں۔ چکر اور مونگ قبیلہ کے کچھ لوگ دودھ مذہب کے ماننے والے بھی ہیں عورتیں ایک چھوٹا سا لہنگا پہنتی ہیں۔ مرد گروسے رنگ کا کفنی یا لباس استعمال کرتے ہیں۔ سر منڈاتے اور کھڑاویں پہنتے ہیں۔ قریب

نوائے پاک

ملک میں ایسے مجموعہ منظومات کی بڑی ضرورت محسوس کی جا رہی تھی، جو ہمارے وطنی احساسات کو بیدار کر سکے اور ہمیں اپنے وطن کی، پاک سرزمین کی عظمت اور محبت سے روشناس کر سکے۔

”نوائے پاک“ میں ملک کے نامور شعراء کی لکھی ہوئی وطنی جذبات سے لبریز نظمیں، گیت

اور ترانے درج ہیں۔ کتاب مجلد ہے اور خوبصورت گر دلو ش سے آراستہ گیٹ آپ

بہت نفیس اور دیدہ زیب — قیمت صرف ایک روپیہ

ادارہ مطبوعات پاکستان۔ پوسٹ نمبر ۸۳ کراچی

حق بہ حق دار... بقیہ ص ۴

اب تو یقین آگیا نا؟ نور الدین نے کہا: "دعوت ہوگئی جناب دعوت!" استاد فضل دین نے بھی پہنچتے ہوئے کہا: "جی ہوگئی! گوہر علی نے خوشی سے سرشار ہو کر کہا، اور خیر کنوئیں میں پھینکنے کے لئے گلی میں مڑ گیا۔"

گھر گیا تھا تمہاری گھر والی نے مجھے دودھ پلایا اور مالکانہ حقوق ملنے کی خوشی میں اڑوس پڑوس میں گڑ بھی بانٹا ہے۔ گوہر کو اپنے کانوں پر یقین نہ آ رہا تھا۔ "تم مجھے گالیاں دیا کرتے تھے۔ اور میری عمرنی پر غور نہ کرتے تھے۔"

قرآن السعدین : بقیہ ص ۱

شہروں میں موجود ہے :

دگر م روی سایہ و حرشمہ نہ جو نیم
بلا سخن از طوبی و کثر تنواں گفت

آن راز کہ در سینہ نہانت نہ خط است
بہار کواں گفت بہ مہر تنواں گفت

اور یہ "کافری اور لے شاعری" برہنہ و بیان کی جا سکتی ہے جو مرتبہ حلاج ہے۔ چنانچہ حلاج اگر کہتا ہے کہ جہاں کہیں بھی جہاں رنگ بو ہے وہ یا تو در مصطفیٰ سے ہے یا تلاش مصطفیٰ میں ہے۔ اقبال کے نزدیک اس مسئلہ کا یہی حل تھا جو انہوں نے پیش کیا۔ غالب اور حلاج کی شخصیتوں کا فرق بھی واضح کر دیا "جاوید نامہ" میں غالب کی شرکت جو خیالات کے تحت علامہ اقبال نے ضروری سمجھی، ان کا انہماک غالب کے ان

ماہ نو

میں مضامین کی اشاعت سے متعلق شرائط

- ۱۔ "ماہ نو" میں شائع شدہ مضامین کا معقول معاوضہ دیا جائے گا جس کے بعد وہ ادارہ کی ملکیت ہوں گے اور وہ انہیں حسب منشا ہر طور سے استعمال کرنے کا مجاز ہوگا۔
- ۲۔ مضامین بھیجتے وقت مضمون نگار حضرات "ماہ نو" کے معیار کا خیال رکھیں اور یہ بھی تحریر فرمائیں کہ مضمون غیر مطبوعہ ہے اور اشاعت کے لئے کسی اور رسالہ یا اخبار کو نہیں بھیجا گیا ہے۔
- ۳۔ ترجمہ یا تلخیص کی صورت میں اصل مصنف کا نام اور دیگر حوالہ جات دینا ضروری ہیں۔
- ۴۔ ضروری نہیں کہ مضمون موصول ہوتے ہی شائع ہو جائے۔
- ۵۔ مضمون کے ناقابل اشاعت ہونے کے بارے میں ایڈیٹر کا فیصلہ قطعی ہوگا۔
- ۶۔ ایڈیٹر کو مسودات میں ترمیم و تنسیخ کرنے کا مجاز ہوگا مگر اصل خیال میں کوئی تبدیلی نہ ہوگی۔
- ۷۔ مضامین صاف اور خوش خط کاغذ کے ایک طرف تحریر کئے جائیں۔
- ۸۔ ہتھ بہت صاف اور مکمل درج کیجئے۔
- ۹۔ انے مضامین نظر و شر کی نقول اپنے پاس بھی رکھئے۔ غیر طلبیدہ اور ناقابل اشاعت مضامین کی واپسی کیلئے ڈاک کے مناسب پیکٹ روانہ کیجئے۔

(ادارہ)

اقبال کی آفاقیت کا مسئلہ: بقیہ منہ

PURE AS THE NAKED HEAVENS,
MAJESTIC, FREE.

یہی بات اقبال پر صادق آتی ہے۔ کیا یہ واقعہ نہیں ہے کہ
ملن کا کلام باوجود ترغیبت ہونے کے عام طور پر نہیں پڑھا جاتا۔
انگریزی ادب کے چند عالموں کے زیر مطالعہ رہتا ہے۔ اسی طرح اقبال
کے کلام کا بیشتر حصہ صرف چند عالم فاضل حضرت کے لئے ہے، سب
کے لئے نہیں۔ کیونکہ متذکرہ وجوہ کی بنا پر اس کی اپنی محدود ہو گئی ہے،
عام نہیں رہی۔ کونسا حصہ آفاقی نوعیت رکھتا ہے، اس طرف میں پہلچا
اشارہ کر چکا ہوں ۛ

(دہشکر یہ ریڈیو پاکستان کراچی)

انسان کم ہیں۔ وہاں چرند، پرند، پھول، پتے، چاند، تارے، سورج،
دلہا، سمندر، ہوا، وقت، غرض مجرد وغیرہ مجردی روح وغیرہ کی رشتہ
سب انسان سے باتیں کرتے ہیں لیکن انسان آپس میں بات بہت کم کرتے
ہیں۔ روزمرہ زندگی سے، میرے نزدیک اقبال کی یہ بے نیازی بھی
ان کی آفاقیت میں ایک حد تک مانع ہے۔ آخر ہم ہر وقت فکر و خیال کی
دنیا میں ہیں پر وہاں کرتے نہیں رہ سکتے۔ ہاں کبھی کبھی اڑان لگا لینے میں
کوئی ہرج نہیں۔

ملن کو خطاب کر کے درود سوتا تھا کہ:

THY SOUL WAS LIKE A
STAR, AND DWELT APART
THOU HADST A VOICE WHOSE
SOUND WAS LIKE THE SEA

مسلم بنگالی ادب

بنگلہ سے ترجمہ

ڈاکٹر انعام الحق، ایم۔ اے۔ پی۔ ایچ۔ ڈی

اس کتاب میں بنگالی زبان و ادب کی مکمل تاریخ اور اس کے ثقافتی، ادبی و تہذیبی پس منظر کا جائزہ
لینے کے بعد بتایا گیا ہے کہ اس زبان کی نشوونما اور ترقی و تہذیب میں مسلمان حکمرانوں، صوفیاء،
اہل قلم، شعراء اور ادباء نے کس قدر حصہ لیا ہے۔ یہ جائزہ بہت مکمل اور تحقیقی و تفصیلی کا شاہکار

پوری کتاب نفیس اردو ٹائپ میں

چھاپی گئی ہے اور مجلد ہے، سرورق

دیدہ زیب اور رنگین ضخامت ۲۰۰ صفحہ

قیمت صرف چار روپے

ادارہ مطبوعات پاکستان۔ پوسٹ بکس ۳۷۷ کراچی

اک بار پھر

رفعت جاوید

تو لوگ خود ہی راستہ دیئے جاتے ہیں۔ ایسے ہی چھوٹوں کو بھی خود بخود راستہ دے دیا جاتا ہے۔ یا وہ خود راستہ بنا لیتے ہیں۔

چنانچہ جب ابا جان حسب معمول اپنے ساتھ بہت سے عورتی کارڈ لفافوں میں بند لائے تو ہم نے ان کا جائزہ لینا شروع کیا۔ ان میں سے ایک میرے من بجاتے قوی مرکز کتب کا دعوتی رقعہ بھی تھا جس کی ایک نمائش کا آنکھوں دیکھا حال پہلے بھی بیان کر چکا ہوں۔ اور ایسے کہ نہ ستائش کی تمنا نہ صلہ کی پروا۔ دل سینے میں اچھل پڑا کہ لو اب پھر کوئی مفت کا تماشا ہے۔ کلفٹن پر عید کا میلہ نہ دیکھا گیا، یہی ہے۔ چنانچہ ہم نے اس کا رڈ کو مل غنیمت شمار کرتے ہوئے ہتھیلیا جیسے بعض ناشر دوسرے ناشروں کی کتابوں پر اپنا لیبل لگا کر اپنی بنا لیتے ہیں۔ یہ سب ہنرمندی کے ٹکڑے ہیں اس لئے ہم کسی سے کیوں ویچھ رہیں۔ ارادہ تو یہی تھا کہ اسی کارڈ کو لے کر اس نئی تقریب میں جا دھکیں مگر ابا جان نے نوبت یہاں تک پہنچنے سے بچالیا۔ خود ہی کہنے لگے وہ تم لے کتابوں کی نمائش دیکھی تھی نا اب ایک ایسی ہی چیز ہونے والی ہے۔ انعام دیئے جائیں گے۔ ہم نے مکر کر کے دھوئے جیسے ہمیں کچھ پتہ ہی نہیں۔ کہا واقعی پھر تو ہمیں بھی ساتھ لے چلیئے۔ سچ کا ثواب نذر کر دیں گا حضور کی ابا جان کسی کے مصرعے کے اس برجستہ استعمال پر پھر کھ گئے۔ اور حامی بھری۔ ہم نے بھی دل میں سوچا کیا خبر ہمارا نام بھی بھول چک سے انعام یافتہوں میں شامل ہو جائے۔ اور کوئی نہیں تو ہمارے ابن الشاہ صاحب وہ آشک شوقی والا انعام ہی دے ڈالیں۔ گھر سے جھوٹ موٹ ایک کتابچہ مرتب کر کے لئے چلتے ہیں۔ گو ہمارے لئے اس تل میں شاید ہی تیل ہو۔ اب بھی وقت ہے۔۔۔

ترا لطف ہوتے نہیں لگتی دیر!

اب میں یہ گز خوب یاد کیا ہوں یہ کہ اگر کوئی تقریب ہوتی ہو تو اس میں کیسے جایا جائے۔ بس انسان کو مکتور اساجے جھمک اور بے دھڑک ہونا چاہئے۔ پھر سارے کام خود ہی ہو جاتے ہیں۔ جب کسی شادی میاہ میں ہوتا کبھی ہو تو کون پوچھتا ہے کہ بھتی کون ہو۔ اور پھر میرے جیسے بر خور داروں کو وہ تو ایسے موقعوں ہی کے لئے ہوتے ہیں اور ہر کوئی ان کی آؤ بھگت کرتا ہے۔ شادی میاہ نہ ہی کوئی اور ہی علمی ادبی فنی ثقافتی قسم کی تقریب ہی۔ وہاں تو لوگوں بالوں کے لئے اور بھی آسانی ہے۔ یعنی کھلے عام داخلہ۔ بڑے بڑے لوگ نکٹ یا کارڈ دکھا کر ہوں اور یار لوگ گیٹ کیپر کی آنکھ بچا کر بڑوں کی ٹانگوں میں سے ہوتے ہوئے کوھر کے کدھر نکل جاتے ہیں۔ سچ پوچھتے تو یہ کہ تب ہم نوہنوں نے بار کیا ہے۔ اور حق یہ ہے کہ ہمارا یہ کسی خطا نہیں گیا۔ سب کہتے ہیں بڑے ہونہار ہیں اور ان کے ابھی سے چکنے چکنے بات ہیں۔ خیر یہ تو یونہی بات بنانے کی خاطر بات ہوئی۔ ایک سیدھا سادہ عملی گریسے کہ ابا جان کو دعوتی رقعے اور کارڈ وغیرہ وغیرہ تو آتے ہی رہتے ہیں۔ اور بقول شخصے کبھی سو کو یعنی اکیلے، کبھی دو عورت یعنی مشراور مشراور کبھی سمفونی یعنی مع اہل و عیال، سنگت کی سنگت۔ اب ہم اس وغیرہ وغیرہ کا فائدہ نہ اٹھائیں تو ہمیں ہونہار کون لگے۔ اور وہ ہونہار جو مستقبل کی امید ہوں! اچھا رقعہ یا کارڈ ابا جان ہی کے نام ہی۔ پھر بھی کیا ہے۔ آج کے بچے کل کے باوا جان ہی تو ہوتے ہیں۔ اس لئے کیوں نہ یہ سوانگ آج ہی بھرا جائے۔ چنانچہ ہم بڑی بے تکلفی سے ان ہی کارڈ رقعہ یا کارڈ مع لفافہ جیب میں ٹھونس لیتے ہیں۔ اور جس شان سے مرزا غالب کان پر رکھ کر قلم مچھکتے تھے۔ اسی طرح ہم بڑی آن بان سے کارڈ کو نذر جیب کر لیتے ہیں یا بغل میں دبا کر روانہ ہو جاتے ہیں۔ بڑوں یا بالخصوص بڑے بڑوں کو

غرض ہوتے ہوئے وہ دن آہی گیا۔ ہم پہلے ہی سے جاق چوبند ہو کر بیٹھے تھے۔ آبا جانی آتے ہی بولے کیوں میاں تیار ہو ہم پہلے ہی کے بیٹھے تھے۔ دیکھ کر بولے شاہاش! سوہم نے بازار میں پہنچ کر ایک ٹیکسی لی۔ یہ تو میں نے محض رعب ڈالنے کے لئے کہا ہے کہ کسر شان نہ ہو۔ ورنہ سچ تو یہ ہے کہ ہم دونوں موٹر کشا ہی میں بیٹھے تھے اور وہ بھی ویسا ہی جیسا کہ وہ گھوڑا جس کی تعریف میں ہمارے نامی گرامی شاعر سودا لے ورق پر ورق سیاہ کر دیئے ہیں۔ یہ آبا جان سے چھپا کر لکھ رہا ہوں۔ ورنہ ڈر ہے کہ کہیں لینے کے دینے ہی نہ پڑ جائیں۔ لیجئے اب تو بقول شخصے سا جھبے کا بھانڈا چورا ہے میں پھوٹ ہی گیا اور بی ماؤ جھل کر کھیلے سے باہر آئی گئی ہیں خدا ہی خیر کرے! — ٹیکسی یعنی موٹر کشا ہیج دریچہ سڑکوں سے ہوتا ہوا جن کی نہ حد ہے نہ شمار۔ ایک راؤنڈ ایبوٹ کا چکر کاٹ کر پلو گراؤنڈ اور ایک ٹھیلے سے ادھر رک گیا جہاں کھجور کے بہت سے جھنڈ دکھائی دیتے ہیں چھوٹی سی چار دیواری میں داخل ہوئے۔ ایک ہوٹل کی دھت آفریں خوشبوؤں نے خیر مقدم کیا آپ انہیں ہوشیار یا مہر آزما جو بھی چاہے کہہ لیجئے۔ اس لئے کہ اس کا نام بھی صابرینہ ہی ہے۔ واہ! کیا شاندار عمارت بنائی ہے۔ سراپا آرٹ یہ پاکستان آرٹ کونسل کی عمارت بالکل ویسی ہی — آرٹ کی کوئی چیز ہونی چاہئے۔ نیچے ہی کشتی یا جہاز نما فرش پر کتا بوں کی جھنڈ کا انتہام تھا۔ رنگ برنگی کرسیاں لگی تھیں۔ اور ان پر گتے کی تختیاں چسپاں۔ کسی پر بہان کی کسی پر بریس اور کسی پر کچھ لکھا ہوا۔ ہم نے بہتر آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھا کہ کسی پر بر خوردار کی تختی بھی ہو۔ لیکن بندوبست کرنے والے شاید یہ بھول گئے تھے۔ اس لئے ہم بھی بڑوں کی صف میں جا بیٹھے۔ اور سب بڑوں سے ہاتھ ملاتے رہے۔ جیسے میزبان ہمیں ہیں دیکھنا تو تماشا یوں میں ”صاحب لوگ“ بھی تھے یعنی یورپین۔ سامنے دو لوہور ڈھکے۔ نظرا ہنی پر ہم کر رہ گئی۔ بھیلی نمائش کا نقشہ بٹکا ہوں میں پھر گیا۔ کتنے سلیقے سے اچھی اچھی کتابوں کے گرد پیش دونوں بڑوں پر چسپاں کر دیئے گئے تھے۔ یہ رنگا رنگی دیکھ کر جی بہت خوش ہوا۔ ہمارے یہاں کتابوں کی روز بروز خوب تر ہوتی ہوئی پیشکش کے یہ کتنے حمد اور کتنے فرواں منانے تھے۔ جی چاہا یہ دونوں بڑوں

ہی اٹھا کر چلتا بنی۔ لیکن انی موجودوں کا بھلا ہر جنہوں نے اتنی بھاری مہر کم چیز اٹھالے جانے کی ایسی آسان تدبیر کر دی ہے۔ ایک باکس کیرا میر سے پاس ہی تھا۔ جھٹ فوگس کیا۔ اور فوگس ڈالے۔ ایسے کہ ایک اچھا خاصا الیم تیار ہو گیا۔ اور تب سے میں ان کے پرنت نکلو کر اپنے ساتھ لئے پھرتا ہوں۔ اپنے بچوں اور دوستوں کو دکھا کر خوب دار حال کی ہے۔ بلکہ کچھ تجارت میں بھی تھرنگے ہیں۔ اس لئے کہ ہمارے صدر ہمیشہ سائنس پڑھنے اور مٹھالوٹی پر زور دیتے رہتے ہیں۔

جب سارے لوگ اپنی اپنی سیٹوں پر جم گئے تو انعامی کارڈ کی تہید اٹھائی گئی میر شاعرہ جناب انشاء تھے۔ شاید ایسے لوگوں کو برت کا دو لہا کہتے ہیں۔ انہوں نے اس پر لطف صحبت کی غرض عافیت پر روشنی ڈالی۔ اور سستی کتا ہیں۔ اچھی کتابیں۔ پیاری کتابیں۔ ”کا اچھا اور پیلا فقرہ دہرایا۔ اور کہا یونیسکو کے ساتھ مل کر تو ہی مرکز کتب کس طرح کتابوں کو اچھا اور اچھا بنانے کے درپے ہے۔ اور جو لوگ اس کام میں اس کا ساتھ دینا ان کو اچھے نیچے انعام بھی دیتا ہے تاکہ وہ اور بھی اچھی کتابیں نکالیں۔ اچھی مطلب دیکھنے میں پیش کر رہے ہیں۔ یعنی ناک سے مکہ تک درست ہوں۔ ان کی ٹیپ ٹاپ خوب ہو۔ تاکہ ان کو دیکھنے، لینے اور پڑھنے کو جی چاہے۔ کتابوں کی اشاعت کی الف ب ج تو صحیح ہے۔ ان کی بات سن کر کہتے کرتے کچھ بھی ہوئی چیز بننے لگی میں ڈر کہ کہیں یہ بھی امتحانی پرچہ نہ ہو۔ مگر پھر دل کو تسلی دی کہ یہ پڑچے کیسے ہو سکتے ہیں اور یہ جانتے بڑے بڑے بزرگ بیٹھے ہیں وہ طالب علم کیسے ہو سکتے ہیں۔ اگر ہوتے تو کتنے ہی سر (SIR) ہمارے اور دگر منڈلاتے دکھائی دیتے کہ کوئی نقل نہ کرے۔ مگر یہاں تو ہر طرف نقل ہی نقل ہو رہی تھی کیونکہ سب پاس ایک ہی مضمون کا پرچہ تھا۔

جناب ابن انشاء نے اپنی تقریر دہلیز سے منٹنے کے بعد پر مدعا کا اطلاق کیا۔ میں بڑا ہزب ہو کر ابن انشاء اور انگریزی میں بات چیت۔ خیر جو تھوڑی سی ٹوٹی پھوٹی انگریزی جانتا تھا اس سے بولنے والوں کی بات کو سمجھنے کی کوشش کی۔ پتہ تو کیا پڑنا — مگر چپ چاپ سننا نہ۔ اور ایک مرد عدل سے تو ہم بھی نہ گیا۔ میری طرح ابھی اسکول میں پڑھ ہی رہا ہوں یہ پتہ تھا فرحان بللہ صاحب ہمارا ایک قومی زبان اردو میں

شاندار تقریب ہوئی۔ سنا ہے پشاور اور ڈھاکہ میں بھی کچھ ایسی ہی کارروائیاں ہوئی ہیں جو کتابوں کی اچھائی کے حق میں بڑی ہی نیک فال ہے۔

میں اور غالباً دوسرے لوگ بھی یہ جاننے کے شائق تھے کہ جب یہ اس باب میں کیا فرماتے ہیں۔ وہ بھی مجھے اپنے ترجمان ہی کے ذریعے سے معلوم ہوا۔ انہوں نے پہلے ہی کیا مزے کی بات کہی۔ یہ کہ وہ تینوں میں ہیں نہ تیرھوں میں۔ یعنی وہ نہ ناشر ہیں نہ کتب فروش نہ لائبریرین یعنی حفاظ۔ جو بھانت بھانت کے لوگ یعنی گروہ یہاں موجود ہیں ان میں وہ صرف پڑھنے والوں ہی کے زمرے میں شامل ہو سکتے ہیں۔ اور جو کچھ ان کا روزانہ تعلیم سے ہے اس لئے وہ اس ہی کہیں گے جس کا دھن کھاتے ہیں۔ بیکر ملک کا ایک بہت بڑا مسئلہ کیا ہے؟ — خواندگی۔ سچ ہے ہمیں پہلے آقاؤں کو بڑھا لکھا تو جانا چاہئے تب کہیں جا کر ملک ترقی کر سکتا ہے۔ اور جب پڑھنے کو سامان ہی نہ ہو تو کیا کیا جائے۔ اس کے بغیر تو پڑھنا لکھنا وہی تالاسیہ بغیر چانی کے۔ اور چانی ہے بغیر تالے کے۔ دونوں باتیں برحق۔ لکھنے والوں کی دال روٹی کی فکر تو لازم ہے ہی جیسی وہ کام کی باتیں کر سکتے ہیں۔ یعنی کوئی سہری انداز دے سکتے ہیں۔ ایسے کام بھٹ پٹ یا مفت نہیں ہو سکتے۔ اور ہمارے زمانے کے تقاضے تو بڑے ہی شدید ہیں۔ پیٹ سیر ہو تو دماغ بھی کام کرتا ہے۔ خیر، جناب! نے لکھنے والوں، چھاپنے والوں، بیچنے والوں، اور سنبھالنے والوں کے بارے میں بڑی ہی سچے کی باتیں کہیں جو پلے میں باندھ رکھنے ہی کے لائق نہیں بلکہ ان پر عمل کرنا بھی ضروری ہے۔

یہ باتیں تو جو ہوتی تھیں سو ہوئیں۔ یہ نہ ہوتیں تو تہید کیسے بندھتی اور جلسہ کیسے ہوتا! دیکھنا یہ تھا کہ وہ کون سے بھاگو ان ہیں جنہیں پہلی بار انعام ملا اور اگر ام بھی۔ ان میں سے کچھ پرانے موجدوں یعنی جگادری تھے اور کچھ نئے۔ فیروز سنز، اردو اکیڈمی سندھ پرانے اور لائبریری کارپوریشن نے انعام کے لئے انعام کے طور پر پہلے ہی گروپوں کو دیکھ کر کہ اور ٹول لیا تھا کہ انعام کس کس کو مل سکتا ہے۔ سو لوہی کی رائے سے میری رائے بھی مل ہی گئی۔ ایک کتاب تو دیر سے میری آنکھوں میں گھب رہی تھی اور سچ پوچھتے تو کٹنگ بھی رہی تھی اٹل انداز۔ اندر تعلی کی یہ دلچسپ، نٹ کھٹ مخلوق ہو اور سچ ہی ہے فیصلہ جیڑوں پر ہو تو لال بندر انعام پائے گا اور ضرور پائے گا۔ اور اب تو بڑے بھی انہیں کے ساتھ ہوئے ہیں۔ انہی کی کہانیاں بھی خوب چھپی ہے۔

کا اردو فانی کیوں نہ ہوئی کہ ہمارے بھی کچھ پلے ٹپتا۔ اس لئے بالکل میرے دل ہی کی بات کہی۔ خبر ان کی تسلی یوں کی گئی کہ اس برس نہیں اگلے برس سہی۔ اتنا بھی کافی ہے۔ وگرنہ یار لوگ ہمارے لحد تک انگریزی ہی بولتے جائیں تو ان کو کون روک سکتا ہے۔

شیخ منظور الہی کا نام تو پہلے ہی سنا تھا۔ وہ ہمارے تعلیم کے سکتہ ہیں جیسی ان کا نام لینے میں اتنی بے تکلفی برتی ہے۔ وہ اس جلسے کے صدر ہوئے۔ ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری کا نام کون نہیں جانتا۔ مانے ہوئے ادیب اور ماہر تعلیم۔ اور اب علاقائی مرکز لونیسکو ہوائے جنوبی ایشیا کے کرتا دھرتا۔ پہلی بات اور پیشقدمی کا قعر ان کے نام ٹپتا اور انہوں نے اس کا حق بھی خوب ادا کیا۔ ان کا یہ کہنا سو فیصد ٹھیک ہے کہ اس دن کا اجلاس عجیب نہیں کتابوں کی دنیا میں شگ میل ثابت ہو۔ اس لئے کہ اس میں لکھنے والے چھاپنے والے، ناشر کتب فروش لائبریرین اور میرے جیسے پڑھنے والے بھی موجود ہیں۔ یہ ایک اچھی بنیاد ہے۔ اور اس پر جلد ہی بڑی شاندار عمارت بھی تعمیر کی جائے گی۔ جیسی کشتالہ طور پر خود آریٹ کوئٹل کی وہ عمارت تھی جس میں ہم لوگ بیٹھے تھے۔ یہ میری طرف سے جملہ معترضہ سمجھے۔ مدعا یہ ہے کہ پڑھنے والوں کے لئے اچھے سے اچھا مواد فراہم کیا جائے۔ اور اس کی ایسی داغ بیل ڈالی جائے کہ دلوں میں بات کہیں کی کہیں پہنچ جائے۔

اب اس بات چیت میں جسے انگریزی داں سمینا کہتے ہیں۔ میں تو اسے مینار ہی سمجھا اور وہ بھی کچھ ایسا غلط نہیں ہے۔ کیونکہ ایسی باتوں سے چاروں طرف فوری نور پھیلتی ہے۔ آغا ایم جعفری صاحب مکینیکل ڈائریکٹر بننے بات کچھ اور آگے بڑھائی۔ اور کتابیں چھاپنے کی پیشہ ورانہ جنموں کا ذکر کیا۔ اور غیب کیا۔ انہوں نے اس کام کی ساری تاریخ بتائی۔ اس قسم کا پہلا سمینا ۱۹۵۹ء میں ہوا۔ جس کا شون پاکستان کے شہر ممبئی کو حاصل ہے۔ جب وہ بولی چکے تو میں نے ابا جان سے پوچھا کہ انہوں نے کیا کہا ہے۔

انہوں نے کچھ وہاں سمجھا یا اور کچھ گھر پر جا کر۔ انگریزی سمجھ میں آئے نہ آئے مگر باتیں ساری بڑی کام کی تھیں۔ بہت اچھی بات ہے کہ اس کام کو ترقی دینے کے لئے ہمارے یہاں ایک انجمن موجود ہے جس نے پچھلے بار تسی شاندار فائش کتب کی تھی اور پچھلا دور میں بھی ایسی ہی

کتاب تیار کروں اور اگلے سال انعام پاؤں۔ چنانچہ میں نے خوبصورت چمکے کاغذ اور ادھر ادھر سے سمیٹ کر ایک بڑی خوبصورت کتاب بنائی ہے۔ اس پر خوش خط لکھے جارہا ہوں کیا؟ یہ خبر نہیں۔ اور اس کو طرح طرح کے نقش و نگار سے خوب آراستہ بھی کیا ہے۔ اگر لال بندہ انعام لے سکتا ہے تو ہم نہیں لے سکتے؟۔ انعام بھی، اکرام بھی اور۔۔۔ نام بھی۔ دیکھ لیجئے اگلے سال ضرور انعام بھی لے کر پہنچے گا اور سند بھی۔

ہاں تو کچھ باتوں ایک لطیفہ بھی ہے۔ اعلیٰ پنہی۔ جناب ابی انشاء۔ ناموں اور انعام کا اعلان تو کر ہی رہے تھے۔ سندیں الگ تھیں اور چیک الگ۔ وہ پہلے انعام پانے والوں کو سندیں تو دیتے گئے مگر چیک اور ان کے لغاتے شاید اپنی ہی جیب میں ڈالتے گئے! یعنی الگ رکھ چھوڑے۔ آخر حق حقدار کو یہ بچانا ہی پڑا۔ اور وہ لغاتے انعام پانے والوں یا ان کے کسی نمائندے کے سپرد کر دیئے گئے۔ جلسہ کو تو ختم ہونا ہی تھا۔ مگر میں گھر واپس آیا تو ایک بہت بڑی انگ لٹے ہوئے۔ یہ کہ میں بھی آج ہی سے ایک شاندار

صور اسرافیل

قاضی نذیر الاسلام کی منتخب شاعری کے اردو تراجم مع مقدمہ
قاضی نذیر الاسلام مسلم بنگال کی نشاۃ الثانیہ کا پہلا نقیب اور داعی ہے جس کے گرجدار آہنگ نے صور اسرافیل کی طرح قوم کے قن مردہ میں پھر حیات نو بھونک دی تھی۔ اب یہ لاوا ایک آتش خاموش کی مانند ہے مگر اس مغنی آتش نوائے، ہمارے دلوں میں حب وطن، حب ملت اور حب زندگی کی جو قندیل روشن کر دی ہے وہ سدا جلتی رہے گی۔

نذیر الاسلام کی زندگی بخش شاعری اور مدوح پروہ گیتوں کا یہ انتخاب پندرہ اہل فن کی کاوشوں کا نتیجہ ہے۔

کتاب خوبصورت اردو ٹائپ میں چھاپی گئی ہے۔ کتاب کا ہر حصہ دیدہ زیب، آرٹ کی جدو دلوں سے مرصع جسے مشرقی پاکستان کے نامور نقاش زین العابدین نے خاص اس مجموعہ کے لئے تیار کیا ہے۔ قیمت صرف ایک روپیہ ۵۰ پیسہ۔

ادارۃ مطبوعات پاکستان۔ پوسٹ بکس ۱۸۳۔ کراچی

و تصوف اور ادب و معاشرت کی تحقیق و مطالعہ کے کام میں مصروف ہیں اور ان کی کاوشیں منظر عام پر آ رہی ہیں۔

نئی مطبوعات:

تاریخ چترال

اصل تحریر (فارسی): مرزا محمد خفران (مرحوم)
تالیف و اضافہ: مرزا غلام مرتضیٰ خان
اردو ترجمہ: وزیر علی شاہ
صفحات: ۲۳۲
قیمت: دس روپے
ملنے کے پتے:

(۱) شیخ محمد امین فاروقی بازار دوش ریاست چترال۔

(۲) قریشی جنرل اسٹورز - بازار قصہ خوانی - پشاور

نقشہ پر نظر ڈالیں تو شمالی پاکستان میں آزاد ریاست چترال کشمیر، مقبوضہ ریاست جنوں و کشمیر اور ملحقہ علاقہ، بلتستان، گلگت، ہنزہ، دیر، سوات اور چترال نظر آتے ہیں۔ ایک جہد یہ خطے جغرافیہ نویسوں اور مؤرخوں کی تحریروں میں دروستان، اور کوہستان کی معنی خیز اصطلاحوں سے یاد کئے جاتے تھے اب بھی بعض مؤرخ اور محقق ان خطوں کو یہی نام دیتے ہیں۔ ان ریاستوں میں بلوچستان، کافرستان اور نورستان نام کے علاقے بھی شامل ہیں۔ حقیقیات، نسبیات اور تاریخ و ثقافت کے ہر پہلو ان خطوں کی علمی و اداری تحقیق کے کام میں مصروف ہیں مثلاً اٹالوی ماہر آثار قدیمہ، پروفیسر ٹوچی، جنہوں نے کچھلے ہی دلفن ریت سوات میں یونانی ہندیب کے آثار پر اپنی تحقیقات مرتب کی تھیں اور ایک رپورٹ صدر پاکستان، فیلڈ مارشل محمد ایوب خان کی خدمت میں پیش کی تھی۔ ان اٹالوی پروفیسر کے علاوہ دو جرمن محقق، ڈاکٹر کارل جٹما اور جیمز ہیرے بھی اس سلسلے میں کام کر رہے ہیں۔ محمد پاکستان کے تاریخ داں اور علم دوست حضرات ہیں ڈاکٹر دانی، جناب اللہ بخش راجپوت، جناب عبدالحلیم آفر افغانی اور سید غلام حسن شاہ صاحب کاظمی آزاد جہول و کشمیر وغیرہم بھی شمالی پاکستان کے ان خطوں کی تاریخ و ثقافت، خوب

ریاست چترال کے مشرق میں گلگت اور ریاست سوات کے کوہستانی علاقے، مغرب میں کافرستان (نورستان) شمال میں دھان و شکاشم (افغانستان) اور جنوب میں گبرونگ اور ریاست دیر و ہاجوند کے خطے ہیں۔ ریاست نہ صرف اپنے قدرتی ہر فنکوہ مناظر کے باعث مشہور ہے بلکہ دفاعی اعتبار سے بھی اس کی اہمیت واضح ہے۔ ان چیزوں کے باوصف یہ دیکھ کر تعجب نہ ہوتا ہے کہ ہمارے ملک کے ان خطوں کی بہت مرتب حالت میں معلومات بہت کم دستیاب ہیں۔ بیرونی سیاحوں نے یہاں کے خطوں کے تذکرے کئے ہیں اور چترال کا بھی ذکر کیا ہے مگر یہ معلومات زیادہ تر سرسری سطحی اور اضافی سی ہیں، تحقیقی و تاریخ ان کا موضوع نہیں، اس لئے ان کی معلومات پر زیادہ انحصار نہیں کیا جاسکتا۔ چترال کے دانشوروں اور ادیبوں نے بھی تاریخ و ثقافت کے ضمن میں کچھ زیادہ کاوش نہیں کی، ان کا ذوق قلم زیادہ تر رومانی اور صوفیانہ شاعری پر صرف ہوا۔ مولانا محمد سید نے چند تاریخی واقعات کو نظم بھی کیا ہے مگر یہ کوشش بھی رزمیہ شاعری کے ایک اچھے نمونے کے طور پر ہی قابلِ داد ہے مگر تاریخ، ریاست اور آثار و ہندیب کے پہلو پر بھی تشنہ رہتے ہیں۔

اس اعتبار سے تاریخ چترال ایک اہم دستاویز ہے جس کے مطالعے ہم چترال کے طبعی حالات و کوائف، تہذیب و ثقافت کے علاوہ اس خطے کے مختلف قبائل، گروہوں اور مشاہیر سے بھی روشناس ہوتے ہیں۔ تذکرہ اقوام چترال کے عنوان سے کتاب میں جو معلومات ہیا کی گئی ہیں وہ نسبیات کے ماہرین کے لئے بھی کچھ کامیاب موضوع ہیں اور عام قارئین کے لئے بھی بہت سی نئی باتوں کی کاشف ہیں۔ کتاب میں مناظر اور معاشا کی سطح سے زیادہ قصا و دیبگی شامل ہیں جن سے کتاب کے مشمولات کو سمجھنے میں کافی مدد ملتی ہے۔ (دس - خ - گ) :



ہماری موسیقی

فن نغمہ کی تاریخ - اور اس کے فن و فلسفہ پر سیر حاصل نظر مرتبہ: رفیق خاوند

- نئے موضوعات کا اضافہ
- پاکستانی موسیقی کے موجودہ مسائل
- ساز و آہنگ کی دنیا میں مسلمانوں کا عظیم حصہ
- مسلم فنکاروں کے اعزازات موسیقی، تمدن و تاریخ انسانی میں نغمہ و آہنگ نے کیا کردار ادا کیا۔

چند موضوعات:

مشاہیر موسیقی: امیر خسرو، سلطان حسین شرقی، میاں تان سین، شاہ عبداللطیف بھٹائی، تان و س خاں، سمیت خاں، فیروز خاں، تاریخ موسیقی، موسیقی اور تمدن عالم، موسیقی میں مسلمانوں کا حصہ، پاکستانی موسیقی، ہماری موسیقی کے ساز، پاکستانی موسیقی، مشرقی پاکستان کے لوک گیت، مغربی پاکستان کے لوک گیت، راگ درپن، ڈانٹ شاہ، مسائل موسیقی، تجدید موسیقی، قومی ترانے کی موسیقی اور سرگم، ہماری موسیقی کے مسائل، سُر تولیسی۔

چند ممتاز اصحابِ قلم

سید عابد علی حابد، جناب شاہد احمد دہلوی، جناب خادم محمد الدین، قاضی احمد میاں اختر جوگڑھی، ڈاکٹر نبی بخش خاں بلوچ، فیروز نظامی، سید برہہ آغا، سجاد سرور نیازی، احمد علی، چھاگلا۔ سیلا محمد علی، عاصمہ حسین، امین الرحمن، رفیق غزنوی و سادام آذوری

کتاب میں مختلف سازوں کی آڈیو پیسری بھی ہے
آڈیو صفحہ کی نفیس نقاشی بھی شامل ہیں۔

کتاب: نفیس اور دلکش ہے

نہایت دیدہ زیب اور خوبصورت

سرورق کے ساتھ شائع کی گئی ہے

قیمت صرف پانچ روپے

ادارہ مطبوعات پاکستان، پوسٹ بکس ۸۳، کراچی

صحت اور دانت



صحت کا دار و مدار دانتوں پر ہے۔ دانتوں کو مضبوط اور مسوڑھوں کو صحت مند رکھنے کے لئے ضروری ہے کہ انھیں کیڑا لگنے سے محفوظ رکھا جائے کیونکہ اس سے بڑی بڑی بیماریاں پیدا ہو سکتی ہیں۔ ہمدرد منجن' جسے بے شمار تجربوں اور تحقیقات کے بعد متل کیا گیا ہے دانتوں کے لئے بے حد فائدہ مند ہے۔ مندرجہ ذیل اسباب کی بنا پر آپ کو کسی کا انتخاب کرنا چاہئے۔

صفائی اور مالش :- ہمدرد منجن اندر تک پہنچ کر دانتوں کو اچھی طرح صاف کرتا ہے۔ انگلی کی مدد سے مسوڑھوں کی بھی مالش اور ورزش ہو جاتی ہے جو دانتوں کے لئے بے حد ضروری ہے۔

ہمدرد منجن کے باقاعدہ استعمال سے محوین وغیرہ کے دہیے دور ہو جاتے ہیں اور دانتوں میں تدریجی چمک پیدا ہو جاتی ہے۔

خوش ذائقہ :- ہمدرد منجن خوش ذائقہ ہے اور اس کے ٹھنڈے اثرات بچے اور بڑے سب پسند کرتے ہیں۔

خوش گوار :- ہمدرد منجن کی دیر پا خوشبو منہ کی بدبو کو دور کر دیتی ہے۔



ہمدرد منجن

مسکراہٹ میں شش اور دانتوں میں بچے موتیوں کی چمک پیدا کرتا ہے



ہمدرد دواخانہ (وقف) پاکستان
کراچی ڈھاکہ لاہور

فاصلہ کوئی اہمیت نہیں رکھتا اگر آپ کے پاس بہترین کوالٹی کی یہ :

موجود ہے !



مستم سائیکل

آپ کہ غیر ملکی سائیکلوں کا انتظار نہیں کرنا چاہئے - مشہور و معروف پائیدار اور تیز رفتار
"مستم سائیکل" ہر چھوٹے بڑے شہر میں کفایتی دامنوں پر دستیاب ہے



چین سے دو خط

انٹرنیشنل بزنس
چنگ کنگ چین
۲۰ اگست ۱۹۶۲ء
..... گزشتہ ہفتہ کی ڈاک میں آپ کی ارسال کردہ
ڈول روڈ کی شیشی لیٹریچر ایجے وی سال کے عرصہ سے
پیشکش تھی۔ ہر قسم کی دیسی و انگریزی ادبیات استعمال
کیں مگر کچھ ہی آف آف نہ ہوا۔ ڈول روڈ کو صرف
چھ دن لگانے کے بعد تمام شکایت باقی رہی۔
کاش! ایجے پیٹل ایسے تیر ہدف طبع کا علم ہوتا.....

انٹرنیشنل بزنس
چنگ کنگ چین
۲۰ جولائی ۱۹۶۲ء
..... بچے کو مرسے گون پکڑنے کی کھینچ ہے
والف سے ہیں جن کی وجہ سے غارت گری ہوئی ہے
نشانات تو رنگ و بوم سے لگتے ہیں مگر باوجود
انگریزی علاج کے آفاقی نہیں ہوا! افضل میں آپ
کی ڈولی ڈول دھڑکا شہزادہ کی خیال ہو کر ایسے ہی
استعمال کر کے کھولیں مگر یہ کارآمد شیشی شیشی کی آپ
بہرانی فرما کر ایک شیشی ڈول روز تیز پلا پلا پلا
بند ہو پلاس دانہ کر سکتے ہیں.....
ن۔ ا۔ رخ میر

دل روز تمام علاج جلدی امراض

ہر قسم کے پھوٹے پھنسی لایویری پھوٹے
مغلائی پھوٹے ناسور ٹیکٹ در بال آؤر ڈاؤنٹیل غارت
مخج خست زیر کچھالی۔ گھٹی۔ رولی۔ ماسور چند می مہارہ
دور۔ ملین یوجن چوٹ۔ نئے اور پالنے زخم اور زہریلے جانوروں
کے کاٹے اور ڈسے کا بیضر اور تیر ہدف طبع ہے۔

چیر ہار اور مریم پی سے نجات دلاتی ہے

قیمت فی شیشی

دو روپیہ - ایک روپیہ

سندھ سے استعمال میں ہے

حکیم طاہر الدین اینڈ سنز ڈول روڈ لاہور - خوب

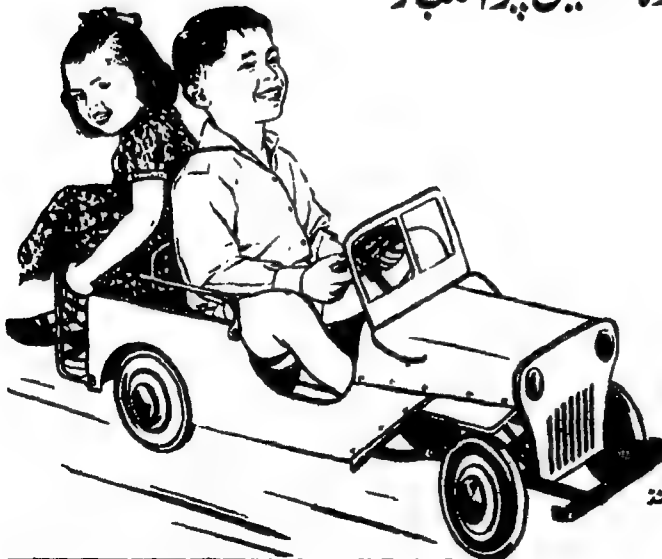
ہر شہر و قصبہ طلب کریں

اگر غور کیجئے تو یہی چھوٹی چھوٹی چیزیں...

بڑی خدمات انجام دی ہیں، مثلاً برما شیل سروس انڈنٹ کا خندہ پیشانی کے ساتھ آپ کی ضروریات کا پورا کرنا، تہذیب کے ساتھ بزرگاری کا داپس کرنا وغیرہ۔

ہمارے لئے بھی یہ سب بہت اہم امور ہیں اور یہی وجہ ہے کہ برما شیل کے سروس انڈنٹ کو ڈرائیو سروس کی مکمل تربیت دی جاتی ہے تاکہ وہ آپ کی ضروریات کو اپنا اولین فرض سمجھے۔ لیکن یہ تو برما شیل کی خدمات کا محض ایک حصہ ہے۔ اس کے علاوہ برما شیل کی اور خدمات بھی ہیں، جن میں تیل کی ان تمام اعلیٰ اشیاء کی فراہمی بھی شامل ہے جو صنعت و زراعت، صحت و ادویہ اور وسائل عمل و نقل کے لئے ضروری ہیں۔

خدمت اپنا افتخار
بر ماشیل پر اعتبار



”ماہ نو“

کے لئے غیر طلبیدہ مضامین

- ۱۔ غیر طلبیدہ مضامین نظم و نثر صرف اس حالت میں واپس کئے جائیں گے جب کہ ان کے ساتھ ڈاک کے مناسب ٹکٹ روانہ کئے گئے ہوں۔
- ۲۔ مسترد مضامین کے سلسلے میں غیر ضروری خط و کتابت کرنے سے ادارہ کو معذور سمجھا جائے۔
- ۳۔ ایک ہفتہ تک اطلاع موصول نہ ہونے پر، رسلہ مضامین کو ناقابل اشاعت تصور کیا جائے۔
- ۴۔ ادارہ ڈاک میں کسی مسودہ کے گم ہو جانے کا ذمہ دار نہیں۔

(ادارہ)



زندگی میں صرف دو

سائنٹیفک طریقہ پر بنے ہوئے
چشموں سے ان کی حفاظت کیجئے

مشرعہ: حاجی ایس۔ امیر الدین اینڈ سنز

سورہ گران چیمبر، مقابل سہیل کالونی، پورٹ ٹرسٹ، مندرجہ ذیل کراچی ڈاک نمبر ۳۵۰۵۸

لاہور - ملتان - کراچی

ہندوستان کے خریداروں کی سہولت کے لئے

ہندوستان میں جن حضرات کو ”ماہ نو“ اور ”مطبوعات پاکستان“ کراچی کی کتابیں، رسائل اور دیگر مطبوعات مطلوب ہوں وہ براہ راست حسب ذیل پتہ سے منگا سکتے ہیں۔ استفسارات بھی اسی پتہ پر کئے جا سکتے ہیں۔ یہ انتظام ہندوستان کے خریداروں کی سہولت کے لئے کیا گیا ہے۔

پتہ:

ادارہ مطبوعات پاکستان

معرفت پاکستان ہائی کمیشن - شیر شاہ میس - نئی دہلی (ہندوستان)

منجانب: ادارہ مطبوعات پاکستان، پوسٹ بکس نمبر ۱۸۳ - کراچی

شماره ۵

ماہنامہ

جلد ۱۶

مئی ۱۹۶۳ء

مدیر: طہر قریبی

۶	سید شیر علی کاظمی	نذر اور درد و فانی	صور اسرافیل :
۹	عابد شاہ پوری	ڈرامہ بھکار نذیل	رقاضی نذر الاسلام :
۱۱	قاضی نذر الاسلام	شب کی تنہائی کے ہمدم! (طویل نظم)	
	مترجمہ: یونس آختر		
	قاضی نذر الاسلام	جھلسلی دیکھائی تیشلی	
۳۳	مترجمہ: افسرہ پوری		
۱۵	ابن الرحمن	اظہاریت	مقالات :
۲۱	ضمیر علی بدایونی	تخلیق کی آگ	
۲۵	•	پاکستان، (دوش، امروز، فردا) :	مسائل ملت :
۳۰	الوزحین	الغلاب سے آئین یک	
۴۴	عبدالرشید خان	(اترا ترے کنارے)	ثقافت :
		(دادی سندھ میں عربوں کی آمد) :	
۲۹	طاہر آختر	سوات میں اجنبی	نظم :
۲۰	صہبا اختر	سزا	
	خواجہ غلام فرید بہاولپوری	(ملاحائی ادبیات) : سافول	سبکدھل :
۴۴	مترجمہ: حشمت فضلی		
۴۴	سلطان باہو - مترجمہ سرور مجاز	"حق کے سونے شہر میں باہو...!" (ابیات)	
۲۸، ۵۰	• شیدائگواتی	تائش دہلوی	غزلیں :
۵۰، ۲۴	• رضی اختر شوقی	مارت حمادی	
		"ہوتا ہے شب و روز"	فن :
۵۳	اشرف ذکائی	(پاکستان میں شوقیہ تعمیر)	
۵۱	منظف احمد ظفر	دیباچہ (منظف آباد، آزاد کشمیر)	تعارف :
۵۸	•	آشوب دہر رتلت خوراک کے خلاف مالی جنگ	لیل و نہار :
		قاضی نذر الاسلام	سرورق :

فی کاپی
۵۰ پیسہ

سلائے چنڈہ
پانچ روپے ۵۰ پیسہ
ادارہ مطبعہ اے آر کے
شائع کردہ
۱۰، لوسٹ بکس، نمبر ۸۳، کراچی

نذرل اور اردو فارسی

مسید شبیر علی کاظمی

در اصل اس ہی کی بیشتر نظموں کا اثر ہے اور نئے اسالیب اظہار کی پیروی کا ایک ہمہ گیر سلسلہ ہے۔

اس بحث کے لئے میں نے نذرل کی صرف دس نظموں سے ایک انتخاب الفاظ کیا ہے اور ایک یا دو نظمیں یہاں بطریق مثال پیش کی ہیں ان سے نذرل کے ادبی سفر اور اس کے تدریجی و انقلابی رجحان کی نشان دہی کی جاسکتی ہے۔ اگر اس کی پیروی کی جائے تو اردو اور ہنگامہ کی اساسی اقدار اور زیادہ قریب آسکتی ہیں۔ نذرل نے دونوں زبانوں کی غلیبوں کو پالش کی بڑی کامیاب کوشش کی ہے اور یہ کوشش ہمارے لئے مشعل راہ ثابت ہو سکتی ہے اس کی بعض نظموں میں تو مصرعے کے مصرعے ایسے ملتے ہیں جن پر عام فہم اردو کا گمان کرنا بیجا نہ ہو گا۔ ایک نظم ہے۔ "کمال پاشا" اس کے الفاظ اس کی روشن مثال ہیں:-

کمال تو نے کمال کیا بھائی

ہو، ہو، کمال، تو نے کمال کیا بھائی

شاہ پاش بھائی۔ شاہ پاش دسی۔ شاہ پاش تو شیر ہے

پٹھا دی۔ دشمن سب جمع گھر ایک دم شیرے

بل و بیکھی بھائی۔ بل ہارے۔ دیناے کہ دکرے نا

(دو بھائی لڑو تو)

خوب کیا بھائی۔ خوب کیا

بزدل اوئی دشمن سب بالکل صاف ہو گیا

خوب کیا بھائی۔ خوب کیا بھائی

مار دیا بھائی۔ مار دیا

دشمن سب مار گیا۔

قلعہ فتح ہو گیا

پردہ اٹھیں

نذرل نے جہاں ہنگامہ شاعری کو اردو چیزوں سے ملا لیا کیا وہاں اس کو ایک مخصوص فکری و لسانی رجحان بھی دیا جو ہنگامہ کے مسلک و مروجہ اسلوب سے ایک بغاوت تھی یہ بغاوت اسلامی موضوعات، تقویات اور معتقدات کے ساتھ ساتھ عربی، فارسی اور اردو کے عام فہم الفاظ کی تبلیغ و بے ساختہ آمیزش کا استعمال تھا۔ یہ بات اس قدر چونکا دینے والی تھی کہ ہنگامہ ادب کی دنیا میں ایک ہچکچاہٹ مچ گئی۔ جو لوگ سنجیدہ طبیعت تھے وہ ادب میں اس اضافہ کا خور سے مطالعہ کرنے لگے اور کلام کی معنویت اور اسلوب بیان کی ندرت کا لطف اٹھانے لگے۔ نذرل چونکہ فطرتاً حریت پسند اور تقلید دشمن باغی ہے اس لئے در ماندہ انسانیت کو سہارا دینے کے لئے اس نے جو بھی صور پھونکا وہ اپنے آہنگ میں گر جارا اور ہر طرح نیا تھا۔ اس مقصد کے لئے اس نے جو زبان بھی اختیار کی وہ اس کے مافی الغمیر کا ساتھ دینے والی تھی۔ پیرایہ بیان میں نت نئی راہیں پیدا کرنے کے حلاق اس نے زبان میں سنسکرت کے غلبہ کو رد کیا اور اردو فارسی کے الفاظ کے لطیف امتزاج اور اسلامی موضوعات کی درآمد سے اسے وہ حرارت و برجستگی اور آنا بخشی جو اس کے کلام کو موزوں تر اور قلب و نظر کو اور زیادہ گرم کرنے والی ثابت ہوئی۔ یہ اس کی وسیع المشرقی اور اسلامی اقدار کے ساتھ فطری وابستگی کی بھی ایک دلیل سمجھی گئی۔ نذرل نے ہنگامہ ادب میں جوئے برگ و بار پیدا کئے وہ بعد میں ایک تحریک کی شکل اختیار کر گئے بلکہ نذرل جی (نغمہ نذرل) ایک عام ادبی رجحان بن گیا جو دراصل اس جوہر قابل کے تمام ادبی تجربوں کا ادبی بنا و تولد اور اسلوب و اظہار کی قدیم پابندیوں سے گریز ہی کا ایک دوسرا نام تھا۔ ہنگامہ کے نوجوان نغمہ والوں کو اس سے ایک ہمیز ملی اور اس وقت پاکستان کے ممتاز ہنگامہ ادبوں میں اس رجحان کا پایا جاتا

جانے دو بھائی جو گیا

قلعہ فتح ہو گیا

کمال، تو نے کمال کیا بھائی :-

اُن کی ایک اور نظم ”اند پاشا ہے۔ اس میں بھی
یہی لے ہے :-

”اے خدا۔ اے علی۔ لاؤ میری تلوار۔ فریاد“

اُن کی نظم ”مترم“ میں یہ سلسلہ دراز تر ہوتا نظر آتا ہے :-

علی زادہ حسینیر دیکھا ہوتا جدی پائے

ماں فاطمہ آسمان کا ندے کو لے نکلیں پاش

رن جانے قاسم وہ دو گھر پیر نوز شاہ

اماں گوبانی داؤ پھینکے گلو بھاتی ماں

ہانکے بیز سر دے گا۔ نہیں دے گا عامر

پی لوند تو پانی شیر خور ہے۔ پیسے کا کا پنا خون

دادا۔ تیری گھر کیا برباد پائمال

حلقوم ہانے تیغ اوکے بوٹے چھاتی تے

آفتاب چھینے نلو آندھیاریا راتی نے

آسمان بھرے گلو گنو دھلی تے دوپہرے

لال نیل خون جھڑے کفر پیر اوپرے

بیٹا دیر ہو رہا پیر بن ہاتھ آہ

عرشیر پائیہ دھرے کا ندے ماما فاطمہ

اے خدا! بدلتے بیٹا دیر رکھتے

پر جتنا کرو گناہ پانی کم بخیر

گنو محرم ایلو۔ مگیلو چلے ہو کال

بھولی گوا جو۔ شیخی شہر پیر لہو لال

مسلم! قتل آج زمین العابدین

واحسینا۔ وحسینا۔ کیدے تائی جاوے دن

پھر ایلو آج طینی محرم ہینہ

تیاگ چائی۔ مرثیہ کرندن چائی نا

اوشیش قرآنیر ہاتے تیغ عربیر

دنیا تے نا تو نائے۔ مسلم کا رو بشیر

تر بے شنو۔ روئی شنو۔ باجے کتھا دام

شمیر ہاتے نو باندہ شمشیر عامر

نیجے چھے نقارہ۔ ہانکے نقیبہ تریج

ہوشیار اسلام ڈوبے تہو شور جو

جاگو اشو مسلم ہانکو حیثہ دیری ہانک

شہیدیر دن سب لال لال ہوتے جاگ

نوشاہ سا جنو خون کچھا آستین

میدان لٹاتے رے لاش ایسی خاص دن

حسینر متو پی بو پیالہ سے زہرے

حسینر متو نیمو کچھے چھری قبرے

اصغر شمو دیبو بچہ رے قربان

ظالمیر داد دیبو آج گور جان

سکیتہ آر شفیت پاش دیبو ماما کفیا

قاسمیر متو دیبو جان رو دھی انیائے

محترم۔ کربلا۔ کاندے ہانے حسینا

دیکھو مورو سورجے اے خون جنو شو شے نا

(درختان کا سورج) (نہیں نکھاتا)

اس نظم کے مطالعہ سے یہ بات بخوبی واضح ہو جاتی ہے کہ

نذول نے وقت کی آواز کا ساتھ دیا اور اپنی اس نظم کی تخلیق سے

ادبیات عالیہ میں ایک بیش بہا اضافہ کیا تھا۔ روایت ہے کہ یہ

نظم علامہ اقبال کو بھی سننے کا اتفاق ہوا تھا اور انہوں نے

فرمایا تھا کہ نندا اسلام کی اس نظم نے لوگوں کے دلوں میں غرور

ایک آگ لگادی ہوگی۔ میرا خیال ہے کہ یہ رسمی داوند تھی بلکہ ایک

حقیقت کا اظہار تھا۔

آنادی سے قبل اردو داں طبقہ نذول کے کلام سے بہت

زیادہ آشنا نہ تھا۔ گاہے گاہے ان کی نظموں کے ترجمے اردو

رسائل و اخبارات میں شائع ہوتے رہتے تھے مگر سب سے زیادہ

ہوش - جوش - شہرت - گھر - دیب - حساب - دل -
داغ - دس ہزار - بھائی - برادر - آب زمزم - سپہ سالار -
سلام - کلام - زخمی - دلاور - جانور - افسوس - تخت -
سنان - زنجیر - خنزیر - زورور - شیر - گیدڑ
کنجوس دل - مدینہ - مشکل - ہتھیار - کاندھا - شیطان
بیابان (کمال)

۶۔ سارا میدان - نشانی - افسوس - شیرز - خون خونی -
دلیر - شیرمیر - قربان - بندوق توپ - خون خوش کھنڈ -
حامد - نقیب - حیدر - خون خوشی - عشق - (دن بھری)
۷۔ شہید - ابو - دلیر - یونانی - مصری - کھانی - دجلہ
عراق اعظم - زندہ - خنجر (شط العرب)

۸۔ رحمان - خاموش - گردن - ذو الفقار - شیر خدا -
دودھاری - آستانہ - چٹا میدان - جلاور - قیامت - (قربانی)

۹۔ ذات - آنسو - ماتم - دنیا - علی زادہ - دلدل - یزید -
شمر - دھم - شیرز - اللہ دربار - کم ذات - قطرہ -
دربار - قبر - نقارہ - ہوشیار - آستین - خاص دن -
پیالہ - زہر - ظالم - داد - (محرم)

اس فہرست کو اور بھی طویل دیا جاسکتا ہے۔ لیکن نذرل
کے کلام کے مجموعے اور دیگر تحریروں میں اب کیا ہوتے چارے ہیں
بلکہ بعض تو نایاب ہو چکے ہیں۔ اس لئے میں نے ان کے منتخب
کلام سے ہی جو ڈھاکہ سے حال ہی میں شائع ہوا تھا استفادہ کیا ہے

مقبولیت ان کی نظم "باغی" (ترجمہ) کی اشاعت سے ہوئی۔ ہر معیار
کے اکثر علمی و تعلیمی حلقوں میں نذرل کا ذکر سننے میں آتا تھا اور
جونہی جو ان اس وقت کے انقلابی رجحانات سے متاثر تھے نذرل
کی شاعری پر جان دیتے تھے اور پھر اردو میں بھی اس کے آہنگ
کی گونج سنائی دینے لگی۔

میں نے نذرل کی چند جدید نظموں سے ایسے الفاظ کا
انتخاب کیا ہے جو اردو اور ہنگامہ میں مشترک سرمایہ کی حیثیت رکھتے
ہیں اور ہمیں ذہنی طور پر یکساں محسوس کرنے اور قیاسی بکجی کے شعور
کو ہر وقت نظر کے سامنے رکھنے کی دعوت دیتے رہتے ہیں

۱۔ عرش - چنگیز - بدو - اسرافیل - خون - ہمت - براق -
تازی - ہادیہ - دوزخ - مشعل (باغی)

۲۔ تلوار - لال - قیمتہ - طوفان - گل ہار - بھانسی -
جوالا (خون آلود زمین)

۳۔ جگت ماتا - ہمالیہ - جل - شانتی - (اگنی)

۴۔ ہتھوڑی - تاؤ دینا - کچا کلیجہ - شیطان - ریشمی -
ہنسی - کالا ناگ (دھوم کیتڑ) (دودھارتارہ)

۵۔ نونی رنگین - سنگین - نیست و نابود - زیر - ڈکیت -
بد نصیب - خراب - اللہ - کلا - کلا - کل ملک - آزاد

مردغازی - ملا - شور - شہید - قصائی - غصہ - چار -
خون خرابی - خوبصورت - کر بلا میدان - ظالم -

سیاہ - مردہ - گرم تازہ - بہشت - جمال - آج -

خدمت ہے کہ ہم اپنا زندگی جہد حاضر کے سامنے تقاضوں کے
مطابق بنائیں۔ یہ اسی طرح ممکن ہے کہ ہم اپنی اخلاقی قدروں کی
حفاظت کرتے ہوئے ان چیزوں سے بھی آزادانہ استفادہ کریں
جو دوسروں سے ہمیں مل سکتی ہیں۔

فیلم ڈائل محمد ایوب خان

ڈرامہ نگار نذر ل

عابد دانا پوری

نذر ل کی ادبی و سیاسی تحریروں میں دونوں ہی عنصر کارفرما نظر آتے ہیں، رومانی بھی اور باغیانہ بھی۔

جہاں تک ڈراموں کا تعلق ہے اس نے تین مکمل اور چار ایک انکی ڈرامے ہمیں حطاکے ہیں۔ جتنے جتنے ڈرامائی پارے بھی ہیں ملتے ہیں مگر وہ اس قدر مختصر ہیں کہ مکمل یا باقاعدہ ٹائٹل کا نام نہیں نہیں دیا جاسکتا۔ دراصل یہ نذر ل کے لئے وقتاً فوقتاً مرتب کئے گئے تھے اور انہیں منظوم ڈرامائی بولی ہی کہا جاسکتا ہے۔

نذر ل کے ڈراموں میں رسائی بہت بلند اور اظہارِ اثرِ بھاری ہے۔ نیگور کی تختیلی پر دواز اور قصوری موضوعات سے ایک ایسا گریز جس نے بنگال کی ادبی دنیا میں ایک پھل مچھلی کی طرح نمودار ہوا تھا۔ نذر ل کے ڈراموں میں اس لئے گیتوں میں شریعت کے ساتھ فتوحی کا اس نے خاص خیال رکھا ہے۔ لیکن نشر کے مکالموں کو بھی اس نے جدید تکنیک سے آشنا کیا اور بعد میں یہ چیز ادبی ڈراموں کی ایک عام روش ہو گئی۔ مثلاً ”مدھو بالا“ میں کی تکنیکی تجربے نظر آتے ہیں۔

یہ طویل ترین منظوم ڈرامہ ہے جو اس نے چالیس سال کی عمر سے متجاوز ہونے کے بعد قلمبند کیا تھا۔ اس کا ابتدائی ڈرامہ تیس سال کی عمر کے لگ بھگ لکھا گیا تھا اور غیر منظوم تھا۔ اس کے ایک پہلے ڈرامے ”پتلی پر بیٹے“ (گرگیا کا بیاہ) میں بھی گیت اور نظمیں ہیں اور وہ ہی نے کراچی بھی آتی رہتی ہے۔ ویسے یہ ڈرامہ نثری تخلیق ہے۔ اس کے ایک ایک ایکٹ والے ڈراموں میں جھلملی، سینو بند، بھوت بھیا۔ (بھوت کا ڈر) اور عید مشہور ہیں۔ سینو بند اور بھوت بھیا کو چھوڑ کر نذر ل کے تمام ڈراموں میں موضوع محبت اور اخوت کا جذبہ ہے جو ابھر آئے تو دنیا کی تمام بلائیوں اور بے اعتدالوں کو گل بن سکتا ہے۔ سینو بند میں نذر ل نے خفیہ ایجادات کو فطرت کی نشوونما

یوں تو نذر ل کی شہرت ایک باغی شاعر کی حیثیت سے ہوئی مگر اس کے ڈراموں کی دھوم بھی کچھ کم نہیں ہے۔ وہ چھوٹے خود راگ، ٹنگ اور صد ادا کا دلدادہ و فنکار تھا اس لئے تمثیل نگاری اور ٹائٹل منڈی بیمار یعنی پیشکش کے میدانوں میں بھی ایک جوشِ قابلِ ثبات ہوا اور جب تک یہ شیع ایک شیع فرداں رہی برابر اپنی جوت جگاتی رہی۔ اس کے گیت ہوں یا ٹائٹل، انی سب میں اس کی شعلہ لوائی، اس کا گرجا آہنگ اور عالمگیر پیغامِ حریت و امن رچا بسا ملے گا۔ جس وقت تک یہ آتش جواں رہی لوگوں کے دلوں میں جب وطن اور حریت آدم کا شعلہ بھی روشن رہا۔ اس وقت قومی جذبات پھوٹے ہوئے تھے۔ جنگِ عظیم اول کے بعد کا زمانہ تھا اور سامراجی طاقت کے خلاف لوگوں کے احساسات چڑھی ہوئی ندی کی مانند تھے۔

یوں روایتی مضامین بھی شعروں میں بندھ رہے تھے اور حسن و عشق کی داستانیں شائے والے بھی اپنے گیت لکھ رہے تھے مگر یہ نذر ل ہی تھا جس نے اس حصہ برصغیر میں پہلی بار تیغ و سناں اُٹھائی تھی۔ اور لوگ ایک نئے آہنگ و مضون سے واقف ہوئے۔ بنگلہ شامی میں اس طرح ایک انقلاب لانے کے ساتھ ساتھ اس نے اپنی پر بھی کچھ تجربے کئے۔ مختلف و متضاد موضوعات کو گلے ملنے دکھایا۔ مگر رومان و انقلاب کا یہ آمیزہ کچھ زیادہ دیر تک نہ بچا جاسکا اور اس کی بعد کی تحریروں میں اپنا الگ ہی جادہ تراشی نظر آتی ہیں۔ بہر کیف اس میں کوئی شک نہیں کہ اس کا انداز بیان، آہنگ، موضوع اور اسلوب کی — بہت سے نئے مسافروں ادب کے لئے رہ نما ثابت ہوئے۔ نیگور جیسے لوگوں نے بھی اسے خراجِ عقیدت پیش کیا اور نذر ل گیتی ”نذر ل کے نغمے“ بنگلہ شامی کی ایک مانی ہوئی تحریک بن گئی جو آہستہ آہستہ لوگوں کو اس منزل کی طرف لے گئی جس نے بالآخر ایک آزاد پاکستان کی شکل اختیار کی۔

اور خاتونوں پر ایک خاصہ عملہ قرار دیا ہے۔ مگر بعد میں نڈل کا تصور بدل گیا تھا اور وہ ان طاقتوں کو ناگزیر ماننے لگا۔ اس ڈرامے میں نڈل کے دل کی آواز گونجتی ہے اور حسن و الفت کے کرشمے اپنا رنگ جھلکتے ہیں۔

بھوت پرستوں میں نڈل نے اپنا تصور محبت اور باہمی میل جول کی خوبیاں اجاگر کی ہیں۔ اس میں سامراجی طاقتوں کا ہوا دل سے نکال دیئے کی تلقین بھی جا بجا ملتی ہے، جو اس وقت کے پس منظر میں بڑا زبردست اور کاری عملہ تھا۔

الایا (سراب) میں اس نے حب الوطنی، باہمی محبت اور عشق کے اصلاحی پہلو کو لیا ہے۔ اس ڈرامہ میں جو مردانہ کردار ہے اس نے تین متفرق قسم کی محبتوں میں اپنے آپ کو گھرا ہوا پایا ہے۔ حسن کی کشش، قربانی کا جذبہ اور ذوقِ طلب۔ یہ ڈرامہ بھی نہایت کامیاب اور مؤثر ہے۔ اس ڈرامہ میں جو نژاد کردار ہے وہ کجی کش کا شکار ہے۔ ایک طرف محبت کی خش ہے مآرزوئیں ہیں، مگر ناکام — ایک ذہن ہے جو پورے عرصہ پر ہے مگر محبت کی زہر ناک سے نا آشنا ہے۔ اس ناک میں جذباتِ منظر کی تبدیلی کے ساتھ ساتھ نئے نئے روپ دکھاتے ہیں۔ کبھی غم و اندھ کے طوفان بھٹ پڑتے ہیں۔ کبھی طائیت و آسودگی کی لہر آجاتی ہے کیونکہ محبت کرنے والے کا دنیا دوسری تمام طاقتوں پر غالب آجاتا ہے۔

جھلملی میں نڈل نے محبت کے مارے ہوئے دو کرداروں کو لیا ہے۔ ایک مرد اور ایک خاتون۔ ان کی آرزوئیں اور تمنائیں قدامت پسند عناصر کے ہاتھوں مجروح ہوتی ہیں، مگر نڈل نے اپنی ہمدردیاں زندگی کے نئے تقاضوں کے ساتھ رکھی ہیں اور وہ یہ کہہ کر پردہ گردا دیتا ہے کہ بھتی محبت خود ایک ناقابلِ تسخیر قوت ہے اور جس محبت میں خلوص اور پاکیزگی موجود ہو وہ تمام رکاوٹوں کو منہدم کر دیتی ہے۔

دھرمالا اصل میں لوک کہانیوں کی گونج ہے۔ اس ڈرامے کے ہیرو اور ہیروئن کسی دور دہیں کے رہنے والے ہیں۔ اور شہزادہ، شہزادی کے روپ میں آتے ہیں۔ دونوں میں پہلی ملاقات

ہوتی ہے اور پہلی ہی نظر کار گر ہوتی ہے۔ خواب و خیال کی پرپیاں اپنا جادو چلا دیتی ہیں اور دونوں ایک دوسرے کے گرد بیٹھ جاتے ہیں۔ مگر چند ہی لمحوں بعد پرپیاں ان دونوں کو الگ الگ کر دیتی ہیں۔

لیکن یہ فراق ہی ان کی دائمی الفت میں تبدیل ہو جاتا ہے اور وہ محبت کی راہ میں آنے والی تمام رکاوٹوں کو دور کر دیتے ہیں۔ اس ڈرامہ میں بھی دونوں کردار خاص کر شہزادہ، سچائی اور خلوص کی قوتوں سے فخر کی تمام دشواریوں کو دور کر دیتے ہیں۔ راہ کی ناہمواریاں، زمانہ کی نیرنگیاں اور حالات ایک ایک کر کے سلنے سے ہٹ جاتے ہیں۔

”پیتلر ہے“ (گرلیگی شادی) میں انسانی اخوت اور عالمگیر برادری کا پرچار ہے۔ ذات، فرقہ، مقام اور رنگ و نسل کا امتیاز مٹانے کی تلقین ہے۔ یہاں وہ کہتا ہے کہ نفرت کے جذبہ کو مٹاؤ اور انسانیت کو ذخائر نہ کرو۔ مگر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ رسم و رواج کے بندھنوں میں جکڑا ہوا انسان ان آلود گلوں سے کس طرح بچ سکتا ہے

نڈل نے اپنے ناکم، سبیلی میں اس کا بھی جواب دیا ہے۔ اس میں وہ بتاتا ہے کہ صرف محبت اور احساسِ محبت سے کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ محبت کی کامیابی کے لئے عملی صداقت بھی موجود ہونی چاہئے ورنہ محبت بے مقصد اور ناکام رہتی ہے۔ اس مقصد کے حاصل کرنے کے لئے وہ کہتا ہے کہ انسانوں کے تفکرات، ان کے دکھ سکھ خوشی

و بد حالی کا اصلی سبب معلوم کرو۔ محبت کرنے والوں سے وہ کہتا ہے کہ اگر دوسروں کے رنج و ملال کا تمہیں علم یا احساس نہیں ہے تو محبت بھرا یہ نازک، انمول دل ایک ادنیٰ اسی چیز بن کر رہ جائے گا۔ لہذا حقیقت کی طرف آؤ اور زندگی کے سانچے کو عمل کی آغی سے بچتے کرو۔ حقیقت یہ ہے کہ نڈل نے یہ باتیں کہہ کر صرف لغائی نہیں

کی ہے بلکہ خود اس نے اپنی زندگی سے محبت و خلوص اور اخوت و احسان کی عملی تعبیر بھی پیش کی ہے۔ بلکہ اگر یہ کہا جائے تو شاید بجا نہ ہوگا کہ اس کی نگارشات میں اس کی اپنی آپ بیتی بھی ہلکی ہلکی بھلکتی رہتی ہے اس لئے خلوص و واقعیت نے انہیں ایک ایسا صفحہ عطا کر دیا ہے جو اس عظیم شاعر اور ناکم نویس کو دنیا کے ادب میں ہمیشہ ایک منفرد مقام پر فائز رکھے گا۔

”شب کی تنہائی کے ہمدم“

از نندہ السلام
ترجمہ: یونس احمد

جاگتے رہنا دریچے کے قریب، صبح دم میرے لئے
الوداع اے میرے ہمدم الوداع !
لے شبِ دیو میں پھیلی اُجالے کی کرن
یہ دریچہ اب نہ ہو گا دریا بھی
اب نہ تنہائی میں ہو گی گفتگو
(اب نہ چپکے کا محل صدر رنگ سے میرا چین)

آساں کی گود میں با چشمِ تر
کہہ رہا ہے چاند، لو آئی سحر
رات کی آنکھوں میں دم باقی نہیں
(جام میں خالی پڑے، ساقی نہیں)
اے مسافر اٹھ کہ اب آہا چلی دن کی برات !
وہل چکا ہے خواب کا سحر حسین
اب نہیں یاں رات کی رانی نہیں
دیکھتی ہے مر کے تاریکی کی چشمِ دل نشین !

چونک کر اٹھا مجھے محسوس کچھ ایسا ہوا
گرم پیشانی پہ کس کی سانس کا لمس ہیں
اک سکونِ مستقل دینے لگا ؟
آج کی شب ہے سر بالیں پر کون ؟
میند جب ٹوٹی تو کیا دیکھا دریچے کے قریب
شب کی تنہائی کے ہمدم چھالیہ کے پیروں
اور کچھ نہیں !

آنکھوں آنکھوں میں ہوئی تھی رات بھر جو مجھ سے بات
میرے ہمدرد آگئی گم گشتہ یادوں کی برات!
سوزِ شمع چشمِ دروں سے شب کی خاموشی میں جب
قطرہ ہائے اشک گر پڑتے تو یہ تھے ترے
یوں مجھے محسوس ہوتے جیسے ہو یتیم کا میرے سرد ہات!
جب بھی سن لیتا تیری شاخوں کی دھیمی سی صدا
دل تڑپ اٹھتا کہیں اُس کی صدائے غم نہ ہو!
میں نے ان پتوں میں تحسینِ بنگاہِ نیم باز
اُس کی دیکھی ہے بہ صد شوقِ تمام
اُس کے جسمِ مرمر میں ہیں ہے ترے ہی جسم کا دکھش تناؤ!
سرِ سراہٹِ دہم تیری کہ جیسے ہوں اُسی کی سسکیاں
یہ جھکی شاخیں تری ہیں اصل میں آنچل مری محبوب کا
اور یہ ٹھنڈی ہوا تیری
کہ جیسے اس کی انگشتِ حنائی کا ہولس جا نغزا!

ان خیالاتِ حسیں کی گو د میں پھر آگیا خوابِ حسیں
میں نے پھر دیکھا سرِ بالیں تجھے
چپکے چپکے گرم پیشانی کو بوسہ دے گیا!

غالباً انجان پن میں پا کے تیرے ہاتھ کا لمسِ حسیں
ہاتھ میرے بھی بڑھے تھے
ہائے لیکن لاج کے مارے دریچے سے نہ آگے بڑھ سکے!
یہ دریچہ اب نہ شاید کھل سکے
رہگذر آوازِ دہی ہے کہ -
”اب وقتِ وداع آ ہی گیا!“

اس سے پہلے کہ خدا حافظ کہوں
دل یہ کہتا ہے تری باتیں سنوں
کچھ سناؤں تجھ کو اپنے من کی بات!

آہ لیکن جانتا ہوں تیرے من کا درو پاسکتا نہیں
تیرے من کی بات سن سکتا نہیں
جانتا ہوں ہم نہ ہوں گے آشنا
درد کے گیتوں سے دل دونوں کے تڑپیں گے سدا!

قلب کو تسکین گر ملتی ہے تیری دید سے
کیوں گراں گزرے دلِ محبوب پر؟
چشمِ گوہر بارے میری اگر تیرا جمال
مثلِ آئینا چ زرفشاں "چمکے تو کب میری خطا؟
تجھ کو پا کر گھس رہا ڈھنگا نہیں
میں بنا ڈھنگا نیا امیر، حسین!

تیری شاخوں پر کبھی شاید نہ بیٹھا ہے کوئی
تیرے پتوں کے جھبہ دکوں سے
نہ چہکا ہے کوئی طائر کبھی
تو اکیلا ہی رہا چپ چاپ آنکھیں وا کئے
سب دریکے بند تھے!
ہائے لیکن میں تری خاطر رہا ہوں رات بھر
مثلِ بسمل منتظر!
میں فدا تجھ پر مرے قلب و نظر!
میں نے ہی لکھی ہے تجویرِ محبت تیرے برگِ سبز پر
بس یہی ہے باعثِ تسکین و وجہِ زندگی
تجھ کو بھر دیکھوں نہ دیکھوں غم نہیں.....!

اے مرے محبوب تجھ کو دیکھ کر
پھر نہ جاگوں گا کبھی
روقتِ محفل کی خاطر پھر نہ آؤں گا کبھی
خاموشی کی اک نئی دنیا مری ہوگی
اکیلا! دھوپ تاپوں گا خیالِ یار میں کھویا ہوا!

اس سے پہلے کہ خدا حافظ کہوں
چاہتا ہوں تجھ سے پوچھوں اک سوال
چشمِ بلوریں سے کیا تو نے بھی دیکھا ہے مجھے
جس طرح دیکھا تھا میں نے یہ دریچہ کھول کر؟
شدتِ جذبات سے تپتے کبھی لہرائے کیا؟
چاندنی چھٹکتے گی جب رنگین آنچل سے ترے
اور دوڑے گا رگوں میں تیری جب خونِ نشاط
تیرے دل میں عارضی جہاں کی باتیں اُس گھڑی
آئیں گی یاد؟

کیا تری سانسوں سے اس گھر میں بھی اٹھے گا دھواں
چاندنی سے کیا تری آنکھوں میں آئے گا خسار؟
کیا خیالِ یار میں تو بھی رہے گا گم سدا؟

تیرے پاؤں دفن ہیں مٹی میں اور اڑتی ہے خاک
سر پہ تیرے اک فضاٹے پیکراں
دھوپ میں تپتا ہے دن کو
شب کو شبنم میں ٹھہرتا ہے یہ جسمِ نازنین
آہ لیکن تاب اگر یہ بھی نہیں
تاب اتنی بھی کہ چلائے کبھی
موت کی اقیون کھ کر کھو چکا ہے زندگی!
دل تیرا روتا نہیں جب اپنے دکھ کی ضرب سے
درد کیوں اٹھے گا تیرے دل میں میرے کرب سے

بھول جانا اگر کبھی آ جاؤں بھولے پن سے یاد
کھل اگر جائے دریچہ بند کر دینا ندیم
پاس کا جس کو نہ مٹی میں بھلا
آسمان پر کس طرح آئے گا ہات؟
(ڈھونڈنا اس کو عبت ہے، یہ ہے انہونی سی بات)

اظہارِ ریت

(مغربی ادب کی ایک اہم تحریک)

امین الرحمن

اسی دور میں ایک ادا شہر جرمن فلسفی، ایڈمنڈ ہسٹلر منظرِ اظہار کے تصور کو ایک نئی مابعد الطبیعیاتی شکل مستعار دے کر منظرِ اظہار کو فلسفے کا ایک ہمگیر شعبہ بنانے میں مصروف تھا۔ اسی طرح جرمن مفکر تھیوڈور لیس نے بھی غریب نظریے کے موضوع پر غور و فکر کرتے ہوئے جمالیات میں ایک نیا ہی نظریہ پیش کیا تھا جس کی رو سے بے جان اشیاء میں بھی جذبات کا عمل دخل ہو سکتا ہے۔ یہی وہ زمانہ تھا جبکہ ماہر نفسیات، فروید اپنے نودریافت نفسیاتی تجزیے کی مدد سے لاشعوبہ اور خوابوں کا سراغ لگانے کی کوشش کر رہا تھا۔ ان تمام فلسفیانہ سرگرمیوں کا یوں ادب کے ہمعصر ادب اور فن پر اثر پڑنا ناگزیر تھا۔ چنانچہ اظہارِ ریت کی تحریک کے پیدا ہونے سے کچھ ہی عرصہ پہلے یوں ادب میں ادب اور فن کی دنیا میں فکر و خیال کی ایک نئی حقیقت کے اظہار کا راستہ ہموار ہو چکا تھا۔

اس نئی حقیقت کے اظہار میں صرف فلسفیانہ سرگرمیاں ہی کارفرما نہیں بلکہ اس کے پس پردہ کچھ عوامی و اقتصادی وجوہ بھی کارفرما تھے۔ انیسویں صدی کے وسط سے انجمنستان اور یوں میں صنعتی انقلاب رونما ہو رہا تھا، اور اس کی وجہ سے مغربی زندگی بعض نئی اقتصادی اور تہذیبی قدروں سے متعارف ہو رہی تھی۔ اس سے مذہب، سیاست ادب اور فن کے اداسے بھی ان کے دلدل اثر سے محفوظ نہیں رہ سکتے تھے۔ چنانچہ انہی قدروں کی وجہ سے مغرب کے لوگ زندگی اور اس کے تعلقات پر مادی نقطہ نگاہ سے غور و فکر کرنے پر مجبور ہو گئے تھے۔ روح اور جسم کا جو تعلق ایک ثنویت کی صورت میں آفریقہ سے چلا آ رہا تھا، اب اس تعلق کے ایک جزو پر تو زیادہ زور دیا جانے لگا مگر دوسرے کی

ناشریت کے بعد مغربی ادب و فن کی غالباً سب سے ہمگیر تحریک وہ ہے جو "اظہارِ ریت" کے عنوان سے معروف ہے۔ اس تحریک کو ہمگیر اس لئے کہا جاتا ہے کہ اس تحریک نے نہ صرف مغربی مصوری کے جدید رجحانات کا رخ موضوع اور ہیئت کے اعتبار سے بدل دیا بلکہ اس تحریک سے جدید مغربی ادب کی ہیئت اور ملبوس پر بھی ایک بہت گہرا اثر پڑا۔ یوں تو اظہارِ ریت کی تحریک کے آغاز سے پہلے مغربی ادب انیسویں صدی کے اواخر اور بیسویں صدی کے اوائل میں ناشریت، نوکلاسیکیت، اوندو مائیت جیسی جدید ترین تحریکوں سے متاثر ہو چکا تھا اور اس عرصے میں نہ صرف مغربی ادیبوں کا انداز فکر اور اندازِ اظہار اپنے پیشرووں سے بہت حد تک بدل چکا تھا بلکہ مغربی مصوری کے انداز اور اسلوب پر بھی ان جدید تحریکوں کا نمایاں اثر پڑ چکا تھا۔ دراصل واقعہ یہ ہے کہ فکر و خیال کی وہ بڑی رجحانیں جو سولہویں صدی کی رومانیت اور فطرت پسندی سے پھوٹا تھا، انیسویں صدی کے آخری سالوں میں کئی اوجھوٹی چھوٹی شاخوں میں بٹ چکی تھی۔ اگرچہ فکر و خیال کی ان چھوٹی چھوٹی شاخوں کا ایک مرکز پریسٹ آفٹن تھا تاہم ان کی وجہ سے ادب یا فن میں کسی بڑی تحریک کے سرچشمے کا پھوٹ پڑنا کچھ ناممکن بھی نہ تھا۔ کیونکہ ہمعصر فلسفے کی بدولت مغربی ادب اور فن میں نئی نئی تحریکیں پیدا ہو رہی تھیں۔ انیسویں صدی کے اواخر میں اگر ایک طرف جرمنی میں نیٹشے کے فلسفے کا بہت زور تھا تو دوسری طرف فرانسیسی (بیسویں صدی کے اوائل) برجس کا فلسفہ وجدان بھی کچھ کم مقبول نہ سمجھا جاتا تھا۔ اگر اسی زمانے میں جرمن مفکر، ہارٹ مین لاشعور کی مدد سے تعلقات اور لاتعلقی کے باہمی تعلق کی عنایت درپا کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

حامیوں نے تو اشتراکیت ہی کو انسانی زندگی کی خیر علی سمجھا اور ایک ایسے عمرانی نظام کو دنیا میں رائج کرنے کی کوشش کی جس کا منشا دامن تھا محض انسان کی مادی فلاح و بہبود تھا۔

کچھ اس قسم کے فلسفیانہ اور عمرانی پس منظر میں اظہارِ ارادہ کی تحریک کے پینے کے موقع پیدا ہو رہے تھے جو اپنی تمام ہمہ گیری کے باوجود یورپ کے ایک محدود حصے میں شروع ہوئی۔ اب قریب قریب تمام نفاذ اس بات پر متفق ہیں کہ اظہارِ ارادہ اپنی ابتداء اور انتہا میں ایک خالص جرمن تحریک تھی۔ جو وسطی یورپ کے ان حصوں میں شروع ہوئی جہاں جرمن زبان بولی جاتی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ تحریک اظہارِ ارادہ کی ابتدا کا سرخ لگانے کے لئے اس تحریک کے نفاذ عام طور پر پہلی جنگ عظیم سے پہلے کے جرمنی کی اس عام روحانی بے چینی کا جائزہ لیتے ہیں جو ۱۸۷۰ء کی جنگ جرمنی و فرانس سے پیدا ہوئی تھی۔ ۱۸۷۰ء کی اس جنگ میں اگرچہ فتح جرمنی ہی کو نصیب ہوئی تھی لیکن اس جنگ کے بعد جرمنی کے اندرونی حالات کچھ اس قسم کے ہو گئے تھے جس سے وہاں نہ تو معاشرتی قدیں برقرار رہیں اور نہ روحانی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب جرمنی بڑی تیزی سے جدید مشینی صنعت کے میدان میں ترقی کر رہا تھا۔ ملک میں سرمائے کا پھیلاؤ زیادہ سے زیادہ ہوتا جا رہا تھا۔ اور وہ بڑی تیزی سے سیاسی طاقت حاصل کر رہا تھا۔ لیکن اس اقتصادِ دی اور سیاسی طاقت کے ساتھ ساتھ جرمنی میں سیاسی بحران بھی پیدا ہونے لگے تھے۔ جن سے جرمنی کی سیاسی بنیادیں غیر مستحکم اور غیر محفوظ ہو گئیں تھیں۔ معاشرے پر ان سیاسی بحرانوں کا اثر پڑنا ناگزیر تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جرمن معاشرے میں عام فرد کی حیثیت بالکل ڈالو ڈول ہوئے گی۔ عام فرد کی شخصیت کو نہ تو جرمن زمیندار "ٹینک" جیسی جاگیر دارانہ فراغت ہی ارازی ہوئی تھی اور نہ اسے جدید صنعتی سرمایہ دار جیسا مالی استحکام ہی حاصل تھا۔ عام فرد کی اس ڈالو ڈول معاشرتی حیثیت سے ہم عصر جرمن ادیب اور فنکار بے خبر نہ تھے۔ چنانچہ اس زمانے میں ادیبوں کی ایک ایسی لہر کا پیدا ہونا ضروری ہو گیا جو عام فرد کی اس معاشرتی حیثیت سے انتہائی غیر مطمئن تھے۔ یہ جرمن ادیب اپنے ملک کے

اہمیت کو بالکل ہی نظر انداز کر دیا گیا تھا۔ روح کی اہمیت ختم ہونے کا مطلب یہ تھا کہ مغرب کا انسان اپنی اس نئی میکائی تہذیب میں خود ایک مشین بن کر رہ گیا تھا۔ اس نئی میکائی تہذیب میں مذہب کی حیثیت بڑی سطحی اور ثانوی سی رہ گئی تھی۔ ایسویہ صدی میں ڈائمنڈ اور پتھر وغیرہ نے حیاتیات میں جو تبدیلیاں تحقیقی کام کیا تھا اس سے انگشتان اور یورپ کے مذہب بنیادوں کو بڑی تقویت پہنچی۔ اور انگلستان جیسے نسبتاً قدامت پسند ملک میں بھی تقلید کی ایک اچھی خاصی تحریک چل نکلی۔ اس کے علمبرداروں نے جدید سائنس کے اکتشافات کی رو سے جن میں نظریہ ارتقا کو خصوصیت سے بہت بڑا دخل تھا انجیل اور انبیاء کے معجزوں کو اپنی عالمانہ اور منطقیانہ تنقید کا ہدف بنایا۔ اس سے عیسوی کلیسا کی رہی سہی اہمیت بھی ختم ہو گئی۔ جن باتوں کو لوگ پہلے مذہبی اعتبار سے روحانیت اور نصوٹ پر محمول کرتے تھے اب انہیں مکمل کھلا جہالت اور توہم قرار دیا جانے لگا۔ ماہرین نفسیات نے اعصاب کے افعال کا بغور مشاہدہ کر کے یہ ثابت کیا کہ جن ذہنی وارداتوں کو ہم روحانی تجربہ کہتے ہیں وہ دراصل اعصاب کے بعض خاص قسم کے افعال کا ہی نتیجہ ہوتا ہے۔ اور اس کی حقیقت علت و معلول کے اصول میں مضمر ہے نہ کہ کسی روحانی عمل میں۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ روحانی تجربے کی بنا پر مذہب اور نصوٹ نے جن واجباتِ تعظیم روحانی قدروں کی ترویج کی ہے وہ دراصل ایسے نفسیاتی اصولوں پر مبنی ہیں جن کی صلی توجہ یہ ممکن ہے۔ اسی طرح طبیعت میں ذرے کی حقیقت معلوم کرنے کی جو کوششیں ہو رہی تھیں ان کی وجہ سے مادہ اور توانائی میں ایک قابلِ تشریح تعلق درپا ہونے کی امید بھی بندھ گئی تھی جس کا قدیم مادہ یا حدوث مادہ جیسے مذہبی اور بعداً طبیعتی مشلوں پر اثر پڑنا ناگزیر تھا۔ اس دور میں سیاسیات میں بھی بہت سے نظریے دریافت ہوئے۔ ہیکل کے فلسفہ جدیدیات کو مارکس نے ایک خاص عمرانی مفہوم عطا کیا۔ اور اس کے ذریعے سے تاریخ اور اقتصادیات کی ایک نئی توجہ بھی پیش کی گئی اشتراکیت نے بہت سے لوگوں کی جن میں خواص اور عوام سبھی شامل تھے، بہت متاثر کیا۔ مارکس کے

کیونکہ یہ تحریک جواں سال جرمن پود کی خواہشوں، حسرتوں اور بے اطمینانیوں کا ایک دالہ نہ اور پرورش اظہار تھی اور اسی لئے اس تحریک نے جرمنی کے ان جواں سال ادیبوں کے لئے اپنے ملک کے معاشرتی اور سیاسی حالات پر غور کرنے کا موقع بہم پہنچایا تھا۔ جو بیسویں صدی کی پہلی دہائی میں جرمن ادب میں اپنا نام پیدا کر چکے تھے۔ چنانچہ تحریک اظہارِ ریت کے تمام نقاد اب اس بات پر متفق ہیں کہ ۱۹۱۰ء کے لگ بھگ جواں سال جرمن ادیبوں نے شعوری طور پر جرمن ادب میں ایسے عناصر شامل کرنے شروع کر دیے تھے جنہیں بعد میں اظہارِ ریت کا نام دیا گیا۔ اور جو ۱۹۲۰ء کے قریب باقاعدہ طور پر جرمن ادب کا جزو لاینفک بن چکے تھے۔

اظہارِ ریت کی ادبی تحریک کے مقاصد کیا تھے اور انہیں پورا کرنے کے لئے کیا انداز اختیار کیا گیا تھا۔ ایک بہت ہی پیچیدہ مسئلہ ہے۔ کیونکہ اظہارِ ریت ادب اور فن کی کئی اور مغربی تحریکوں کے مانند کوئی ترسٹی ترشائی واضح اور باقاعدہ تحریک نہیں ہے۔ بلکہ اسے ۱۹۱۰ء سے لے کر ۱۹۲۴ء تک کے بہت سے جرمن ادیبوں کے فکر و خیال کا ایک ہیونی کہنا چاہیے۔ اظہارِ ریت کی تحریک کے آغاز کا مطالعہ کرنے کے لئے یہ دیکھنا ضروری ہے کہ اظہارِ ریت کی اصطلاح پہلے پہل کب وضع ہوئی۔ چونکہ اظہارِ ریت کی تحریک کا پہلے پہل مصوری میں آغاز ہوا اس لئے بہت سے نقادوں کا خیال ہے کہ سب سے پہلے اظہارِ ریت کی اصطلاح کا مصوری ہی پر اطلاق کیا گیا ہوگا۔ ایک جرمن نقاد کوہن کے کہنا ہے کہ تحریک اظہارِ ریت نے واضح طور پر ۱۹۱۰ء میں جنم لیا تھا۔ چنانچہ ہمیں اظہارِ ریت کے آغاز سے متعلق معلومات حاصل کرنے کے لئے اس سال سے آگے نہیں جانا چاہیے۔ اور نہ ہمیں اس اصطلاح کے ادبی یا اصطلاحی استعمال کو اس سے پہلے تلاش ہی کرنا چاہیے۔ کوہن نے پکاسو اور کاندینسکی کے فن پر اظہارِ ریت کی اصطلاح کا اطلاق کیا ہے جو ۱۹۱۰ء کے قریب جدید طرز کی تصویریں بنا رہے تھے۔ کچھ نقاد یہ بھی کہتے ہیں کہ خود کاندینسکی نے ۱۹۱۰ء کے قریب اظہارِ ریت کی اصطلاح مصوری کے جدید رجحانات کو موسوم کرنے کے لئے وضع کی تھی۔ لیکن ایک اور جرمن نقاد بیڈنگ کی رائے میں اظہارِ ریت

سیاسی سطح نظر سے بھی کچھ مطمئن نہ تھے جو اس زمانے میں دراصل ایک سیاسی جمہوری دور سے گزر رہا تھا۔ جرمنی کا یہ جمہوری دور بھی عجیب دور تھا۔ اس دور میں جرمنی کا دانشور طبقہ تین گروہوں پر مشتمل تھا۔ ایک گروہ فائلڈنگ آچکا تھا۔ دوسرا گروہ حال سے مطمئن نہ تھا اور تیسرا گروہ جو ابھی پیدا ہوندا تھا بے دست و پا تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جرمنی کی عام فضا بددی، بے چینی اور بے اطمینانی کا ایک کھلا ہوا اظہار تھی جو پہلی جنگ عظیم کے شروع ہونے تک موجود رہی۔

پہلی جنگ عظیم کے شروع ہونے سے چار سال قبل یعنی ۱۹۱۰ء میں جرمن عوام کی زندگی، فن اور ادب کو تیزی سے بدلتی ہوئی قدروں میں گھرا ہوا پاتے ہیں۔ جرمنی کے نئے صنعتی معاشرے میں جرمن تہذیب کی پرانی قدروں اور ہلنے معیادوں کو جو زمانے کے جدید تقاضوں کی نفی کرتے تھے، مٹایا جا رہا تھا۔ اور اس معاملے میں کسی قسم کا شخصی احترام ملحوظ نہ رکھا جاتا تھا۔ یہ حال ایک نئے قسم کے جرمن ادب کو جنم دینے کے لئے بہت سازگار تھے۔ جرمن ادب ابھی تک گذشتہ صدی کی دو تحریکوں یعنی تاثریت اور نقد و مابینت سے متاثر تھا اور جواں سال جرمن ادیب ان تحریکوں کو جدید تقاضوں کی کسوٹی پر پرکھ رہے تھے۔ نورمانٹ کے پیر و ابھی تک یہ کوشش کر رہے تھے کہ ادب میں زندگی کے اس حسن اور شخص کو برقرار رکھا جائے جو ہر زمانے کے انسان کو اپنے لمحات حسرت و غم میں درکار ہوتا ہے اور جس کے بغیر زندگی انہی تمام خارجی حقیقتوں کے باوجود نامکمل رہتی ہے لیکن اس قسم کی نقد و مابینت کا عہد اپنے تمام خوبصورت اور دلآویز مقاصد اور عزائم کے باوجود ختم ہو چکا تھا۔ بیسویں صدی کے پہلے دس برسوں کی زندگی مشینی دور کی کڑی حقیقتوں اور شدید آلائشوں سے دوچار تھی۔ اور ہر جنگ اور جنگ کی انوائیوں نے اس نورمانی ادب کی لمبا نیت آمیز فضا کو مضطرب کر رکھا تھا۔ چنانچہ جب ۱۹۱۴ء میں پہلی جنگ عظیم کا آغاز ہوا تو جرمن ادیبوں کے ہاتھ میں اظہارِ ریت کی صورت میں پہلے ہی سے ایک بہت مؤثر ہتھیار موجود تھا۔

اظہارِ ریت کو دراصل نورمانوں کی تحریک کہنا چاہیے

کی اصطلاح ۱۹۱۵ء سے پہلے تحریر و تقریر میں استعمال ہی نہیں ہوئی۔ اس کا کہنا ہے کہ کتابوں، رسالوں، اخباروں اور پمفلٹوں وغیرہ کے مطالعے سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ ۱۹۱۳ء سے پہلے اظہارِ ریت کی اصطلاح شاید کسی ایسے مضمون کے عنوان کے طور پر استعمال کی گئی ہوگی جس میں مصوری یا ادب کے ان رجحانات کا ذکر ہو جو ۱۹۱۶ء سے پہلے شروع ہو چکے تھے۔ لیکن ایک اردو جرمن نقاد فرانس کتاب نے لکھا ہے کہ اظہارِ ریت کی اصطلاح فرانس میں مائیس کی تصویروں کی ایک نمائش کے موقع پر ۱۹۰۱ء میں وضع کی گئی تھی۔ چنانچہ اب بہت سے نقادوں کا خیال ہے کہ مصوری میں اظہارِ ریت کی اصطلاح کم از کم ۱۹۰۱ء سے تو ضرور استعمال ہو رہی ہے۔ جہاں تک اظہارِ ریت کی اصطلاح کو ادبی مفہوم مستعار دینے کا تعلق ہے۔ ایک جرمن نقاد اولڈز لینڈ کا نام لیا جاتا ہے۔ اس نقاد نے ۱۹۱۱ء میں ایک اور جرمن نقاد ہولٹس کے ایک نظریے سے جو شاعری میں لٹریچر اور مجسمے تعلق تھا اختلاف کرتے ہوئے لفظ ایک مضمون میں اظہارِ ریت کا لفظ پہلے پہل ایک ادبی اصطلاح کے طور پر استعمال کیا جرمن نقاد سوئیگرل کی رائے ہے کہ جرمن ادیبوں میں ۱۹۱۰ء سے پہلے (اور اس نے اس مدت کا تعین تقریباً بیس سال کیا ہے) ایسے میلانات کا سراغ ملتے ہیں جنہیں ثریا آسانی سے اظہارِ ریت کے دائرے میں لایا جاسکتا ہے۔ لیکن سب سے پہلے اظہارِ ریت کی اصطلاح کو ایک نہایت ڈھیلے ڈھالے مفہوم میں ان لوگوں کا جرمن ادیبوں کی تحریروں پر چسپلا کیا گیا جو ۱۹۱۰ء سے لے کر ۱۹۲۰ء تک جرمنی کے معاشرتی مسائل پر نظم، ناول یا ڈرامے کی صورت میں کچھ نہ کچھ کہتے رہے تھے۔

بعض نقادوں کی رائے ہے کہ اظہارِ ریت کی اصطلاح فرانس میں جرمنی کے مقابلے میں بہت پہلے رائج ہو چکی تھی۔ وہاں کے نقاد دو کسال نے فرانسیسی زبان میں اس اصطلاح کے رائج کرنے میں نمایاں کام کیا ہے۔ لیکن یہ بات دلچسپ ہے کہ جرمنی میں یہ اصطلاح ۱۹۱۱ء کے بعد یعنی ۱۹۱۶ء اور ۱۹۱۷ء میں مکمل طور پر رائج ہو چکی تھی یعنی ایک ایسی بے نام تحریک کو جو پہلے اپنے عنوان میں ملتی اظہارِ ریت کے نام سے موسوم کیا گیا۔

اور یہ کسی بہت ہی لطیف نقاد کا کام دکھائی دیتا ہے۔ اظہارِ ریت کی اصطلاح سے کیا مراد لی جاتی ہے؟ یہ سوال خاصا ٹیڑھا ہے کیونکہ بعض نقادوں کی رائے میں اظہارِ ریت کی اصطلاح بھی "رومانیت کے مانند بڑے ڈھیلے ڈھالے مفہوم میں استعمال کی جاتی ہے۔ اور جو ابہام رومانیت کی اصطلاح سے وابستہ ہے کچھ اسی قسم کا ابہام اظہارِ ریت کی اصطلاح میں بھی نظر آتا ہے کیونکہ ان نقادوں کی رائے میں فنون لطیفہ کے مختلف اصناف پر جن میں ڈرامہ، شاعری، مصوری اور موسیقی وغیرہ کے پیشوا نمونے شامل ہیں بغیر سوچے سمجھے اظہارِ ریت کی اصطلاح اطلاق کیا گیا ہے۔ اس سے ایک طرف تو اظہارِ ریت کی اصطلاح میں خواجواہ غیر ضروری معنوی گنجائش پیدا کی گئی اور دوسری طرف اظہارِ ریت نمونوں کی کثرت سے فائدہ اٹھا کر اس تحریک کو فنی اور ادبی لحاظ سے ہم گیر ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے چنانچہ نقادوں کا ایک ایسا گروہ پیدا ہو گیا جس نے اظہارِ ریت کے دائرے میں ہر شے کو شامل کرنا شروع کیا تاکہ اس تحریک کو ہم گیر ثابت کیا جاسکے۔ مثلاً اس تحریک کا معنوی تعلق قدیم یونان اور روم کے کلاسیکی فکر سے جوڑنے کی کوشش کی گئی۔ قرون وسطیٰ کے یورپ کے طور طریقوں اور فکر و خیال کے بارے میں جو تحریک جماعتیت کے نام سے بعد کے زمانوں میں چلی اسے بھی اظہارِ ریت کے ساتھ وابستہ کرنے کی کوشش کی گئی۔ اٹھارہویں صدی میں جرمن ادب میں جو تحریک "طوفان و فساد" کے نام سے شروع ہوئی تھی اسے بھی اس تحریک کے منوازی سمجھا گیا اور رومانیت کی تحریک کا تو خیر اظہارِ ریت کے ساتھ کئی باتوں میں اکثر مقابلہ کیا جاتا ہے۔

اظہارِ ریت پسندوں کے ایک طبقے کی رائے ہے کہ یونان کی ان تمام ماضی کی تحریکوں اور اظہارِ ریت کے درمیان کئی باتوں میں مشابہت موجود ہے، لیکن اظہارِ ریت کو ایک ہم گیر تحریک ثابت کرنے کی کوششوں نے اس تحریک کو نہ صرف ڈھیلے ڈھالے کر دیا۔ بلکہ اس میں ایک ایسا تضاد بھی پیدا کر دیا جس سے اس تحریک کے منشاء و عمل میں بہت حد تک تفاوت پیدا ہو گیا۔ چنانچہ جرمن نقاد ڈیوٹر نے بالکل صحیح کہا ہے کہ

اخوتِ انسانی قدموں کی از سرِ نو تشکیل۔

ظاہر ہے یہ کسی بہت ہی جامع تحریک کا علامہ عملی ہی ہو سکتا ہے جو ویسے تو صرف دس برس تک جاری رہی مگر اس کی نمود و نمودیں کم از کم ترقی صدی تو ضرور صرف ہوئی ہوگی جب ۱۹۲۲ء کے قریب تحریکِ انہادیت ختم ہوئی تو اس زمانے کے نقادوں نے اس تحریک کی ہیئتِ ادبی کا سراغ ماضی کے جرمن ادب اور زندگی میں لگانے کی کوشش کی۔ خود اس تحریک کی زندگی میں جو تنقیدی ادب شائع ہوا اس میں اس تحریک کا دشتہ ماضی سے خاص طور پر ثابت کرنے کی کوششیں کی گئیں۔ جو من ادیب ہرمان ماہر نے جب ۱۹۱۶ء میں انہادیت پر اپنی کتاب شائع کی تو اس میں اس نے اس تحریک کے ضمن میں جو کچھ لکھا اس کا بار بار اس انداز میں ذکر کیا گویا وہ اس تحریک کا رد و

جدا علی ہو۔ لیکن بعد کے زمانے کے کثر نقادوں نے گوئے کے نام کو اس تحریک سے بالواسطہ یا بلاواسطہ وابستہ کرنے کی مخالفت کی۔ بہر کیف، اس میں کوئی شک نہیں کہ گوئے کے علاوہ جرمن فکر کے جدید دور میں چند ایسی شخصیتیں ضرور موجود ہیں جنہوں نے فی الواقع انہادیت کی تحریک کے فروغ کے لئے ایک نہایت کامیاب بیڑا علمی پس منظر تخلیق کیا انہادیت کے اس علمی پس منظر کو سمجھنے کے لئے میکس ویبر، ول فٹن میکس شیلر، سٹیل، وورنگر اور ہزل جیسے جرمن مفکروں کی تحریروں کا مطالعہ ناگزیر ہے کیونکہ یہی لوگ جدید ترین ادب اور فکر کے بانیوں میں سے ہیں۔ اور انہادیت کی تحریک جدید جرمن ادب اور فکر کی ایک اہم شاخ ہے۔

★

سزا

صہبا اختر

کس تقدیر نے

غم کی دوہری زنجیروں سے

مجھ کو مجبوری کی چٹان سے باندھ رکھا ہے

روزِ عقاب اندھیروں کے میر بھی کلیجہ کھاتے ہیں

میں بھی پروٹھیس کا سینہ رکھتا ہوں

لیکن مجھ پر آگ چرا لانے کا بھی الزام نہیں

پھر یہ کیا ہے

کون سی نیکی کی یہ سزا ہے

فلاح وطن، قومی یکجہتی اور تعم
ترقی کی راہیں :

مغربی اور مشرقی پاکستان کے عوا
سے براہ راست خطاب اور حل مسائل
کی تدبیریں

(لائل پور میں ایک مہتمم بالشان
عوامی جلسہ سے خطاب)



خورک اور خوراک : گنگا کوہاڈک (مشرقی پاکستان
کا منصوبہ ترقی - گندم کی ترقی یافتہ فصل کا معا

دہیا" ساتھ لائے : الحاج سید امین الحسینی، مفتی اعظم فلسطین
کی طرف سے ایک نادر نسخہ قرآن پاک کی پیشکش

ی پاکستان کی متوازن ترقی : ڈھاکہ میں نئے جنرل پوسٹ آفس کی نو تعمیر عمارت کا افتتاح





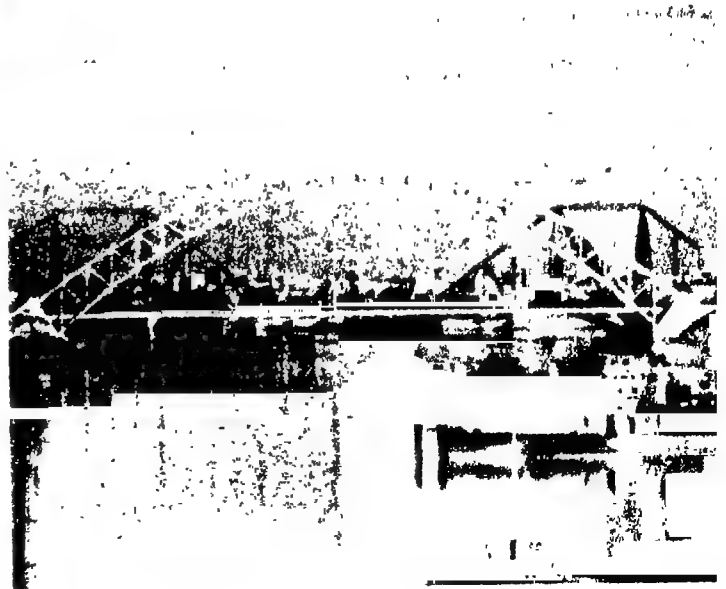
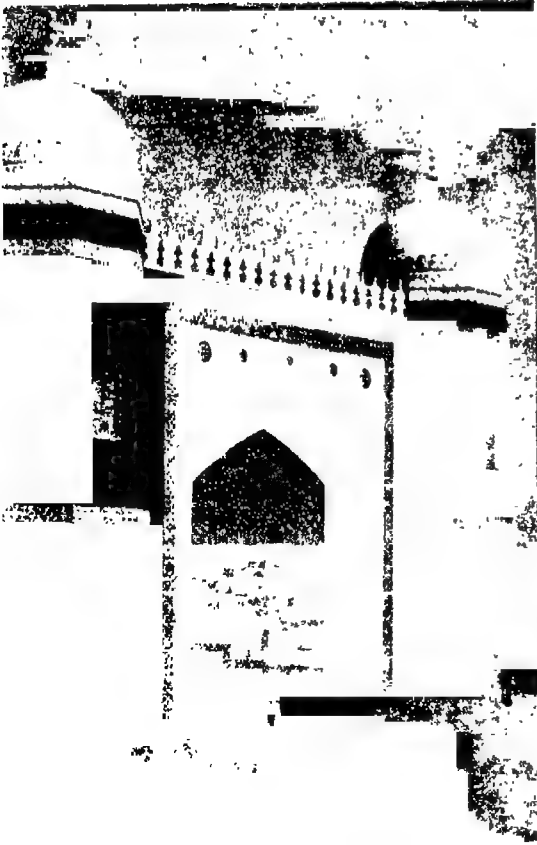
دنیا کے سب سے کم عمر جرنل، محمد بن قاسم کی سرکردگی میں عربوں کی فوجی سپہ نے سب سے پہلے دہلی، موجودہ بہنور، (نزد دراجی) سرزمین پر قدم رکھے۔ یہاں ایک مسجد اور اسلامی بستی کے آثار برآمد ہو چکے ہیں۔

اُترا ترے گنارے جب کارواں ہمارا

ہر صفر میں سب سے پہلا دروان مات سرزمین سندھ پر ہی اترتا تھا۔ دراجی کے بالکل نزدیک دہلی کے مقام پر، حو اب بہنور کہلاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قریب سے دراجی کو "باب الاسلام" بھی کہا جاتا ہے۔

مسلمانوں نے ہی دریائے سندھ کو "سمران" کے کنارے اور با معنی نام سے یاد کیا۔ اسلام نے ہی یہاں لوگوں کو وحدت الہی کی صحیح تعلیم دی اور اس کے مطابق نئے آداب حیات سکھائے۔

ماضی میں وادی سندھ کی تہذیب زبردست علاقوں تک محیط تھی اس لئے ہماری ثقافت کے آثار جا بجا ملتے ہیں۔ اس دور میں بھی سندھ کی قریبی و عثمت میں اضافہ کرنے کے لئے ہر طرح کے وسائل سے نام لیا جا رہا ہے۔



حدید : دروائے سندھ ہر ایک جہیز آہنی پل - (روہڑی)

قدیم • عظمت، شان و شوکت، ایک • اسلام - (قرآن مجید کا ترجمہ)

”تخلیق کی آگ“

ضمیر علی بدایونی

آہ پایندہ نہیں

لذت دیکھ کا یہ ہنگام جلیل

وہ فطرت کے اس گریز یا حسن کا زیادہ دیر تعاقب نہ کر سکا۔ اور فطرت کو ایک نئے اصول یا پیدائش سے آشنا کرنے کا خواب دیکھنے لگا۔ فن کی پیدائش اس خواب کی مثبت تعبیر تھی۔ یہ تعبیر فطرت کے لئے بہت ہولناک تھی۔ اس کا چہرہ صبح داغدار نظر آنے لگا۔ اور اس کا انتشار انسان پر آشوب ہو گیا۔ اس کا مطلق و تنہا وجود انسانی حیثیت میں نمودار ہوا۔ وہ محض ایک ذریعہ ثابت ہوئی، ایک طاق جس میں انسان نے اپنی عظمت کا چراغ روشن کیا۔ اسی لئے فراتر کا نکالنے فن کو ایک ایسی آگ کے نام سے پکارا جس میں اشیاء جل کر دوبارہ پیدا ہو جاتی ہیں۔ یعنی اس دنیا کو جس میں خدا کی زمین اور اس کا نیلا آسمانی موجود ہے۔ اسے جلا کر ایک نئی دنیا پیدا کی جائے جس پر اس کی اپنی تخلیق کی ہر شے ہو۔ فن کی ماہیت کے متعلق کا نکال کا یہ بیان کافی غور و خوض کی دعوت دیتا ہے۔ اور گری کتابوں پر بھاری ہے۔ تحقیقی عمل کی اندرونی ماہیت ان مختصر غظوں میں موجود ہے۔ کا نکال کی عظمت کے ثبوت کے لئے اس کا یہ قول کافی ہے۔ سیزان نے کہا تھا فطرت خطوط سے جاری ہے اور سیزان کے اس قول کو فن کی ماہیت کے متعلق اس کے بعض مداحوں نے جامع ترین بیان قرار دیا لیکن کا نکال کا یہ بیان سیزان کے قول پر یقیناً ایک اضافہ ہے۔ کیونکہ فطرت گو خطوط سے جاری ہے لیکن اشیاء سے جاری نہیں۔ سیزان اپنی تعریف میں قلب ماہیت کے اسرار زائل کو دسمتھ سکا۔ ”خط“ بیشک فطرت میں اجنبی اضافہ کی علامت کے طور پر استعمال ہوا ہے۔ لیکن فطرت کے بغیر فطرت میں اجنبی اضافہ اسی طرح ممکن نہیں جس طرح عدم کے بغیر عین کا وجود محال ہے۔ فنی تخلیق اس طرح نہیں

زمین کے گرد و پیش میں روشن اجسام کا رقص و خرام کیا دیکش نہیں۔ یا آسمان کی روئے نیلگوں میں شفق کا کھلابی حاشیہ دلپذیر نہیں۔ یا وہ روشن دائرہ دیکش نہیں جس کی فیاض اور گرم شعاعوں نے زمین کو زندگی کا تحفہ دیا۔ یا زمین کی آغوش میں بسنے والے قطار اندر قطار لالہ گل اور سرسبز انسانی آنکھ سے محبت کا کوئی مطالبہ نہیں کرتے۔ یا سمندر کی بے گل روح کا وہ نغمہ لازوال ہوش رہا نہیں جو موج کے مضرب سے پیدا ہوتا ہے۔ ان میں کوئی چیز غیر دیکش، غیر دلپذیر اور بد صورت نہیں۔ انسان نے فطرت کے حسن کو ہمیشہ شدت سے محسوس کیا ہے۔ جہاں ایک طرف وہ فطرت کے بے رحم اور ہولناک قوانین سے خائف اور شاک کی رہا وہاں دوسری طرف اس کے نظر ان فرد حسن و جمال کا بھی تفتیل رہا لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ فطرت کو حسین اور دیکش تسلیم کرنے کے باوجود وہ اس کے ان نغمہ ہائے بوقلموں سے اس قدر جلد کیوں اکتا گیا کہ اسے زیادہ دیکش اور زیادہ ہوش رہا نظاروں کی ضرورت پیش آئی۔ اور فن کی تخلیق کرنی پڑی۔ وہ فطرت کے حاکم کردہ حسن اور سیرت پر کیوں نہ قانع رہ سکا۔ اور اس سر کو جو قرنہا قرن سے فطرت کے آستانہ جمالی پر سجدہ ریز تھا اسے اٹھانا پڑا اور اپنے ہی آستانہ پر سر بسجود ہو گیا۔

جیل تر میں گل و لالہ فین سے جس کے

نگاہ شاعر رنگیں نوا میں ہے جادو

اس کی وجہ شاید یہ ہو کہ فطرت کا حسن اس کا اپنا حسن نہ تھا۔ وہ اس سے اپنی تخلیق کی مانند پیار نہیں کر سکتا تھا۔ فطرت کا حسن اس کے تابع نہ تھا۔ وہ اس کی پذیرائی کے برگ و ساز سے فارغ بھی نہیں ہونے کا تاغما کہ وہ اپنا رخت سفر باندھ لیتا۔ اور سر و ہر کے سوا نہ ہر جاتا اور وہ زیر لب نالہ کش ہو جاتا۔

کی حیثیت رکھتی ہے جو بحر بیگناہ کے بطن سے نمودار ہوتی ہے گواس کا وجود منفرد ہے لیکن قائم بالذات نہیں سمندر کی سطح سے اس کی وابستگی ناگزیر ہے کیونکہ :

موج ہے دریا میں اور بیرون دریا کچھ نہیں
میر تقی میر نے گلچیں کو خبردار کرتے ہوئے کہا تھا :

گلچیں سمجھ کے چنیو کہ گلشن میں میر کے
نخستہ جگہ پڑے ہیں نہیں برگہائے گل

اس شعر میں میر نے گلشن اور گلشنِ فن کا فرق ظاہر کیا ہے۔ گلستانِ فطرت بھی حسن و خوبی کا ایک منظر ہے۔ لیکن انسانی سے اس کا رشتہ خارجی ہے۔ برخلاف اس کے فن کا باغ ایک داخلی رشتہ کا حامل ہے۔ اس میں فنکار کی اپنی روح کا عکس موجود ہے۔ اس شعر سے یہ بھی ظاہر ہے کہ فنکار ایک حد تک فطرت کے نقش قدم پر چلنے سے مجبور ہے۔ لیکن حقیقت کی سرحد بھلانگ لینے کے بعد وہ تخلیق کی پراسرار فضا میں گم ہو جاتا ہے۔ اور فطرت کی یکسانیت اس کے سراغ میں ناکام رہتی ہے۔ گلچیں کو سمجھ کر چنے کا مشورہ اسی لئے دیا گیا ہے کہ یہ باغ جو فنکار نے اپنے خون سے سنبھل کر تیار کیا ہے، فطرت کے حقیقی باغ سے کسی قدر شاہد ہے۔ اسی لئے بودیہ نے فطرت کو لغت کے نام سے پکارا۔ فطرت فن کی لغت ہے جس طرح زبان محض لغت نہیں ہوتی لیکن لغت کے بغیر بھی اس کا وجود ناممکن ہے۔ کافکا کے قول میں فنی تخلیق کے متعلق دو بنیادی نکات موجود ہیں۔ ایک یہ کہ فن فطرت کی عکاسی نہیں ہے اشیاء کو بحسب پیش نہیں کرتا بلکہ فنکار پہلے اشیاء کو تباہ کر دیتا ہے اور دوسری بات یہ کہ اشیاء کو تباہ کر دینے کے بعد وہ انہیں کی خاک سے ایک نیا جہل پیدا کر دیتا ہے اس لئے یہ تباہ کاری اور باز آفرینی کا مشترک عمل ہے۔ اسی لئے کافکا نے اس کو آگ سے تشبیہ دی۔ آگ جہاں ایک طرف تباہی و بربادی کا نشان ہے وہاں دوسری طرف فرینش اور حیات کی بھی مظہر ہے۔ یہ آگ بخشش کا آزاد عمل ہے۔ اشیاء کی ساری بد صورتی بے آہنگی اور ان کا انتشار موزونیت و نظم کی بد اوڑھ لیتا ہے۔ اس طرح ان کا وجود دوبارہ رہتا ہے لیکن ایک انقلاب سے دوچار ہوتا ہے۔ یہ انقلاب اسی آتش سوزی کا اجماع ہے جسے کافکا نے فن کہہ کر پکارا ہے۔ فطرت کی ساری بد صورتی اسی آگ میں حل جاتی ہے آگ کے اس پہلے عمل کو مارٹن ہیڈیگر فطرت کی تباہی و زوال کے نام

سے پکارتا ہے۔ یہ عمل فطرت کو تباہ کرتا ہے۔ جلاتا ہے اور زوال کی طرف لے جاتا ہے۔ اور دوسرا عمل جو تعمیری اثرات کا حامل ہے وہ فطرت کو پیدائش، افزائش اور زیبائش سے روشناس کرتا ہے۔ اسی لئے ایک صاحب نے آرت کو فطرت کی تخلیق کے نام سے پکارا۔ فطرت کی تخلیق کے معنی ہرگز یہ نہیں ہوتے کہ فطرت موجود کے پہلو پہ پہلو ایک نئی فطرت کی تخلیق کی جائے۔ بلکہ اس سے مراد فطرت کا علامتی اظہار ہے۔ جس میں انسان کی اپنی فکر اور اپنے معنی شامل ہوتے ہیں۔ یہ معنی اور فکر فطرت سے آزاد ہوتے ہیں انسان چونکہ فطرت سے بے نیاز ہو کر اپنی آزادی کا اظہار کر سکتا ہے، اس لئے آرت وجود میں آیا۔ اس سلسلہ میں مارٹن ہیڈیگر نے انسانی عظمت کے اس تاجناک پہلو پر وافر روشنی ڈالی ہے۔ اس کے نزدیک کائنات میں انسان ہی ایک ہستی ہے جو آگ کی کوش ہے۔ وہ کائنات اور اس کے بے معنی انتشار میں موجود ہے۔ یہ انتشار اس کی ذات میں بھی کارفرما ہے۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ اس میں نظم و ترتیب کی بھی روح موجود ہے۔ جو چیزوں کو انتشار کا شکار ہونے سے بچا لیتی ہے۔ اسے ہیڈیگر "قربت" کے نام سے پکارتا ہے۔ انسان کو چیزوں کی قربت کا اقرار کرنا پڑتا ہے۔ اور اس قربت سے وابستگی کا اقرار۔ ایک دنیا کی تخلیق اور اس کے عروج سے اور اسی طرح ایک دنیا کو تباہ کرنے اور اس کے زوال سے ہوتا ہے۔ قربت کا لفظ یقیناً وحشت طلب ہے، دراصل یہ لفظ جرمن شاعر فریڈرک ہولڈر لین نے استعمال کیا۔ اس سے غالباً اس کی مراد یہ ہے کہ حقیقت اور اس کے لوازمات متعلقات کو تسلیم کیا جائے۔ حقیقی دنیا میں ہر وہ چیز موجود ہے جو مرتفع ہو کر فضا میں نمودار ہوتی ہے۔

اگر فنکار اشیاء اور شمولات فطرت کی پذیرائی کیلئے آمادہ نہیں تو وہ لذتِ تخلیق سے بھی بے بہرہ ہے۔ کیونکہ فن موجودات میں اضافہ کا نام ہے۔ لیکن اگر یہاں کچھ موجود ہی نہ ہو تو پھر اضافہ کا لفظ بے معنی ہو جاتا ہے۔ اور فنی تخلیقات خود کو مٹا کر مٹنے میں کام لیں گی۔ اس لئے چیزوں کی موجودگی کا اقرار کرنا ضروری ہو جاتا ہے اور فنی موجودات، حقیقی موجودات کے دوش بدوش چلتی ہیں۔ اور ان سے قربت و بیگانگی کا اقرار کرتی ہیں اور اس قربت کا اقرار کرنے کے بعد فنکار کی آزادی کا سرچشمہ بھوٹ پڑتا ہے۔

اور فطرت کا طویل و بے معنی سکوت غلط پذیر ہونے لگتا ہے۔ سارتر نے کیا خوب کہا ہے کہ فطرت بخوش اور فن غمگنگو ہے۔ فنی تخلیق کا لہجہ آزادی کا طویل ترین لہجہ ہے۔ یہاں انسان آزاد خلاق اور نغمہ دار ہوتا ہے۔ اس طرح اس کا وجود اساس پاتا ہو کر زندگی میں اس اساس کو غمگنگوئے محض کے نام سے پکارتا ہے۔ اور ادب و شاعری کے بغیر زبان کا وجود ناممکن ہے۔ زبان انسانی آزادی کا مکمل ترین اظہار ہے۔ اس آزادی کا جس کی بیکراں آغوش میں انسان فطرت کی دوسری موجودات سے الگ پرواز کر رہا ہے۔ حقیقی زندگی میں حقیقت اور فطرت کے اصولوں کو تسلیم کرنے کے سوا اور کوئی چارہ نہیں لیکن فنی تخلیق کے لمحہ میں انسان فطرت سے کھیل سکتا ہے۔ اس کی قلب ماہیت کر سکتا ہے۔ اور اپنی دنیا کو فطرت کے اٹل اور ناقابل تغیر قوانین سے آزاد کر سکتا ہے غالب کہتا ہے:

ہیں زوال آمادہ اجزاء آفرینش کے تمام

ہر گرد و لب سے چہرہ رخ و گہزار بادیاں

ہر گرد و لب کو چہرہ رخ و گہزار بادکنے سے فطرت کے حقیقی تعینات بکھر جاتے ہیں حقیقی زندگی چراغ بھی رکھتی ہے چراغ و گہزار بھی۔ لیکن یہ چیزیں تخیل کی آنکھ سے جل اٹھتی ہیں۔ دھواں صاف ہونے کے بعد اب ہمیں کچھ اور ہی نظر آتا ہے۔ اب نہ وہ سورج وہ سورج نہ چراغ و چہرہ رخ ہے۔ بلکہ وہ کائنات کے زوال پذیر میلان کی علامتیں ہیں۔ اسی لئے پال کسٹلے فطرت کو فنکار کا

POINT OF DEPARTURE کہا ہے۔ سادہ و سادہ بلا قولہ اس کو اس طرح کہا ہے کہ ادب کچھ نہ کہنے کی کوشش ہے۔

اس کی مثال دیتے ہوئے سارتر نے لکھا ہے۔ حقیقی دنیا میں دو چیزیں موجود ہیں۔ ممکن اور گھوٹا لیکن ادب کہتا ہے۔ ممکن کا گھوٹا سنا ہوا ہنر ممکن کا گھوٹا حقیقت میں موجود نہیں ہے۔ ممکن اور گھوٹا دو لفظ موجود ہیں جب یہ دو لفظ ملے تو ممکن کا گھوٹا پیدا ہوا اس لئے ادب کو لفظوں کے جلنے کا عمل کہا جا سکتا ہے۔ لفظ چونکہ شے کی منقلب شکل ہے۔ اس لئے اسے بالواسطہ اشیاء کے جلنے کا عمل کہا جا سکتا ہے۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو سادہ و سادہ بلا شولی بھی کافی کا جلنے ہوئے تھے چارہ ہے۔ کافی کی تعریف اس قدر جامع

اور پراثر معنی ہے کہ اس سے بہتر طور پر فن اور فطرت کے باہمی رشتہ کو سمجھا نہیں جا سکتا اور فن کی اس سے بہتر تفہیم بھی نہیں ہو سکتی۔ یہ تعریف فنی تخلیق کے تمام مراحل اور اعمال کا احاطہ کرتی ہے۔ ممکن کا گھوٹا فطرت میں کوئی خارجی اور حقیقی اضافہ نہیں ہے۔ اس لئے فنی حقیقت تو کوئی چیز معرض وجود میں نہیں آتی۔ لیکن کافی نہیں کہنا کہ فنی تخلیق فطرت کو کسی حقیقی اضافہ سے دو چار کرتی ہے۔ دنیا کی عظیم ترین فنی تخلیقات بھی ایک حقیقی پھول اور پتھر کو پیدا نہیں کر سکتیں اور نہ ہی ان کی حقیقی موجودگی میں کسی قسم کا غلط پیدا کر سکتی ہیں یہاں ازلی وابدی مادہ ہے جس میں کسی قسم کا کوئی اضافہ ممکن نہیں۔ کافی کا تو حقیقی کائنات کے اس غیر اضافہ پذیر رویہ کو تسلیم کرتا ہے۔ بلکہ اس کا مراد یہ ہے کہ فن میں محض خارجی کائنات کی عکاسی نہیں ہوتی۔ یہ حقیقی اشیاء کی کوئی مربوط اور دلچسپ فہرست نہیں بلکہ یہ اشیاء کو فطرت کے ابدی ہواؤں سے نکال کر شعور کے دھارے میں گھنچ لاتا ہے۔ یہ سچ ہے کہ اگر یہاں فطرت نہ ہوتی تو فن بھی موجود نہ ہوتا۔ اس لحاظ سے یہاں کوئی چیز فطرت سے زیادہ اہم نہیں لیکن فطرت کے اعمال ہمیشہ یکساں اور مہوار ہوتے ہیں۔ یہاں جو کچھ بھی موجود ہے وہ فطرت اسی میلان کا مظہر ہے۔ اگر انسان سمندر کی شوریدہ سرموجوں میں کوئی معنی ڈھونڈتا ہے تو اس سے فطرت کی بے حس اور سنگینی میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ وہ اسی شان بے نیازی سے سرگرم عمل رہتی ہے۔ وہ فنکار جس نے سمندر کی موجوں کے بے معنی شور کو حسن و معنی کا حامل بنایا کیا وہ سمندر میں ڈوبنے سے اپنے آپ کو بچا سکتا ہے۔ کیا وہ سرکش موج کے اس بے رحم عزم کو مخاطب ہو کر کہہ سکتا ہے کہ:

”میں نے تجھے حسن کی تابندگی اور حیات ابدی کا

تھمہ دیا کیا تو مجھے سرد اور بدصورت ہونے سے

نہیں بچا سکتی؟“

ظاہر ہے موج کا بے رحم خرام اسے کیا جواب دے سکتا ہے۔ یہی کہ اس کا جواب اپنے فن میں ڈھونڈنا۔ جو فن مجھے زندہ رکھے گا وہ تجھے بھی زندہ رکھے گا۔ میری پشت پر فطرت کے ماضی اور اس کے گلوں قوانین کا زبردست دباؤ ہے اور میرے لئے ممکن نہیں کہ تجھے ڈوبنے سے بچا سکوں۔ اس سے ہمیں اس بات کا اندازہ ہوتا ہے کہ ہمارے

کھنچ جاتا ہے۔ اسی شعور نے اسے فن، سائنس اور جملہ ذہنی فکری
خبرات سے مالا مال کیا۔ زبان کی پیدائش بھی اسی شعور کا نتیجہ ہے۔
شعور کے تقاضوں سے مجبور ہو کر اس نے مظاہر فطرت کو نام و نشان
اور اسی شعور ہی کے مطالبات نے اسے فطرت کی فنی تخلیق پر مجبور کیا۔
کا فکا کی تعریف میں شعور کی صلاحیت بھی موجود ہے۔ جب فن ایک ایسی
آگ ہے جس میں اشتیاق جل کر دوبارہ پیدل ہو جاتی ہیں۔ تو ظاہر ہے کہ آگ
فطرت سے زیادہ طاقتور اور آ زاد ہے۔ کسی چیز کو تباہ کرنے کیلئے
یہ ضروری ہے کہ اس چیز سے زیادہ طاقتور ہوں۔ یہ تخلیق ہی کی آگ
ہے جو فطرت کو جلاتی ہے اور پھر پیدل کرتی ہے۔ اس لئے یہاں فن سے
زیادہ طاقتور و آزاد کوئی چیز نہیں جو تخلیق کی آگ روشن کرتا ہے۔
اور فطرت کو ایک نئے اصول پیدائش سے روشناس کرتا ہے ۛ

فنی کا دشمن سے حقیقت اور اس کے قوانین کسی قسم کا کوئی اثر
قبول نہیں کرتے۔ اگر ہم یہ کہتے ہیں کہ آسان دکھن اور شفق جبین
ہے تو کیا آسان کی دکھن یا شفق کا چہرہ گلگوں ہمارے اس نفع سے
کسی قسم کا کوئی اثر لیتا ہے اگر ہم یہ نہ بھی کہتے تو بھی اس کی موجودگی
ہیں کوئی فرق نہ پڑتا۔ فطرت کی تشریں و آرائش انسان کے لئے نہیں
وہ خود کفنی ہے وہ بے نیاز اور سنگدل ہے۔ وہ انسان سے کتنی تم
کے تاشی یا نفعی کھات نہیں مانگی وہ تو بس موجود ہے اور اس کے
سوا کچھ نہیں جانتی۔ وہ یہ بھی نہیں جانتی کہ وہ موجود ہے۔ ایک پہلے
ہے جو مسلسل گھوم رہا ہے ایک گولہ ہے جو مسلسل لڑھک رہا ہے۔
انسان کی بدقسمتی یا خوش قسمتی یہ ہے کہ اسے یہ معلوم ہے کہ وہ موجود
ہے اور ہمیں سے اس کے اور فطرت کے درمیان ایک خط امتیاز

ایسا روٹھا ہوا بھی کیا ہوگا کچھ اُسے بھی خیال سا ہوگا
خون دل ہو کر شیوہ تسلیم ہم پر جو قرض ہے ادا ہوگا
رات کے اس سکوت کے پیچھے کوئی تو دل دھڑک رہا ہوگا
دن ڈھلا اس کا کچھ حساب کرو آج کس کس کا دل دکھا ہوگا

شوق سو جاؤ رات بھیک چلی

کون ایسے میں جاگتا ہوگا

رضی اختر شوق

پاکستان:

(دوش، امروز، فردا)

مرکزی و صوبائی کاہنہ تھے، سیاسی جماعتیں بھی موجود تھیں۔ یہ تھا کہ براہ راست عام انتخابات عمل میں نہ آسکے تھے اور وہ کن عنامر کی بدولت نہ آسکے تھے یہ بھی ہمیں معلوم ہے۔ اور یہ بھی صحیح ہے کہ قومی اسمبلی کو ایک گورنر جنرل کے فغان نے ہی توڑ دیا تھا، مگر ان باتوں کے باوجود ملک میں سیاسی آزادی — بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ ضرورت سے زیادہ ہی آزادی — موجود تھی۔ ملک میں بے شمار سیاسی پارٹیاں تھیں، لیڈر تھے اور ہر جگہ جلسے، جلوس، نعرے، تھے۔ مگر ملک کا کاروان ترقی جہاں تھا وہیں رکا کھڑا تھا۔ کیونکہ یہ سب ظاہری باتیں تھیں قومی استحکام کا جسم اندر سے کھوکھلا ہو چکا تھا۔ اس پورے ڈرامے میں شے شے صاحبان اقتدار — صاحبان حیثیت اور نام نہاد بڑے بڑے سیاستدان اپنا اپنا کارواں کر رہے تھے۔ مگر عام آدمی بالکل بے دست و پا بالکل بے بس، تماشا بنی بنا ہوا تھا۔ بلکہ اس ساری جنگ اقتدار اور اس ساری جنگ زرگری کا پیچھے بنا ہوا تھا۔ کیونکہ صرف سیاسی زندگی ہی نہیں ملک کی ساری سرگرمیاں، تجارت، کاروبار، صنعت، تعلیم، زراعت، و معیشت ہر چیز ہی بری طرح متاثر ہو چکی تھی۔

جیسا کہ ابھی عرض کیا گیا، جسم سیاست کے ان مفاسد کو دودھ کرنے کے لئے ۱۹۵۸ء کا انقلاب کارگر حربہ ثابت ہوا اور آخر قری کے اس ڈرامہ پر پردہ گرا دیا گیا۔

چند سال تک ایک فعال اور آشفانے حال حکومت ملک کا نظم و نسق چلاتی رہی۔ اُدھر عوام نے بھی اطمینان کا سانس لیا۔ مختلف اصلاحات نے ہمیں بتایا کہ جمہوریت اگر صحیح طریقے پر چلائی جاتی تو اسے کیا کرنا اور کیا نہیں کرنا چاہئے۔ ”جمہوریت“ کا یہ نم البدل لوگوں کو بہت بھایا۔ مگر مفکر انقلاب خود اس بات کے حق میں نہ تھا کہ مارشل لا کو مستقل علاج سمجھا جائے۔ ملک میں احساس ذمہ داری

قیام پاکستان کے بعد سے ہی ہم جمہوریت کا نام بھی سن رہے ہیں اور اس کے نمونے بھی علم و تجربے میں آتے رہے ہیں۔ ہمارے سابق حکمران ہمیں جس طرز جمہوریت سے آشنا کر گئے تھے وہ اپنی جگہ کوئی بڑی چیز تو نہ تھی مگر اس میں ایک عیب یہ تھا کہ وہ ہمارے ملک کی ذہنی افتاد، ہمارے حالات و ظروف اور ہماری مخصوص ضرورتوں کا ساتھ نہیں دے سکتا تھا۔ مغربی طرز جمہوریت ان ملکوں کو ہی زیادہ راسخاتی ہے جہاں معاشرہ بالخصوص متوسط طبقہ، مستحکم و بانجبر ہو۔ مراڈیوں سمجھئے کہ پارلیمانی طرز حکومت اور صدری نظام مملکت کے درمیان انتخاب کا سوال تھا۔ پارلیمانی طرز حکومت کو ہم کافی آزما چکے تھے اور یہ بھی دیکھ چکے تھے کہ نا اہل سیاستدانوں اور معاشرہ دشمن عناصر کے ہاتھوں جمہوریت کس طرح باز پچھا لطفال بن چکی تھی اور حالات نے ایسی منزل کو چھو لیا تھا کہ اس وقت صرف فشر فضا ہی کام دے سکتا تھا تاکہ جسم سیاست سے فاسد مادہ خارج کر کے نیا خون پہنچایا جاسکے۔ یہ ضرورت اکتوبر کے انقلاب نے پوری کی اور اصلاح احوال کے جوہر وسیلے ہم اپنے حالات کے مطابق اختیار کر سکتے تھے، انہیں بروئے کار لایا گیا۔ مگر ظاہر تھا کہ مارشل لا کی موجودگی یا جمہوریت کی عدم موجودگی کوئی مستقل حل نہ تھا اور نہ اس انقلاب کے ہوشمند مفکر کو ہی یہ بات پسند تھی کہ ملک کو ہمیشہ ہنگامی حالات سے دوچار رکھا جائے۔ اس لئے اُس نے شام انقلاب کو ملک سے جو وعدہ کیا تھا کہ جمہوریت جلد بحال کر دی جائے گی، اس کا لفظاً اور معناً ایفاء کیا۔

۱۹۶۰ء کے بعد کے حالات پر نظر ڈالئے تو ہمیں جمہوریت کے تمام لوازم موجود نظر آتے ہیں اور یہ الزام نہیں رکھا جاسکتا کہ پہلا جمہوریت کے فروغ و نشوونما کو کوئی موقع ہی نہیں دیا گیا۔ ملک میں کیا نہ تھا؟ قومی پارلیمنٹ تھی، صوبائی اسمبلیاں تھیں،

پیدا کرنے اور کاروان ترقی کو آگے بڑھانے کے لئے اس نے اپنے وعدہ کا ایفاء کیا بلکہ رضا کارانہ طریق پر اپنے تمام اختیارات حکمرانی عوام کی طرف بھر منتقل کر دیئے۔ جو شاید انقلابات عالم کی تاریخ میں پہلی بار ہوا ہے!

مگر ساتھ ہی صدر ایوب کا اپنا ایک تصورِ مملکت بھی تھا، اور وہ یہ کہ جو بھی طرز حکومت طے کیا جائے عوام کے مزاج و افتاد کے مطابق ہو اور جو جمہوری نظام بھی رائج کیا جائے اسے لوگ سمجھ بھی سکیں۔ نیز سمجھ کر چلا سکیں۔ یہ طرز ایسا ہو کہ ہمارے وطن کی جو خصوصیات ہیں ان کے تقاضے بھی پورے ہو سکیں۔ وہ محض مغربی طرزِ حکمرانی کی نقالی نہ ہو۔ بہر نوع اس کا فیصلہ بھی جمہوری طریق پر کیا گیا اور ایک کمیشن نے یکم جنوری ۱۹۶۲ء کو اپنی رپورٹ پیش کر کے ملک میں نئے آئین کے لئے راہ ہموار کر دی۔ لوگوں سے کہا گیا کہ اس آئین کو کچھ عرصے اس کی پشت پر رہا ہی مملکت کا جو عملی تصور کارفرما ہے اسے جانچیں اور اس کو تسلیم کر کے اپنا سیاسی سفر پھر شروع کر دیں۔

آئین کو ہر طرح جمہوری اور حقیقی طور پر قابل عمل بنانے کی سعی کی گئی ہے۔

ملک کے دونوں صوبوں میں اسمبلیاں قائم کی گئیں اور پورے ملک میں ایک مرکزی مقننہ کام کر رہا ہے۔ مقامی کونسلوں نے اپنے ووٹ سے اسمبلیوں کے لئے نمائندے چنے جانے پہچانے آدمی منتخب کئے۔ مقامی کونسلوں کے نمائندے خود عوام نے بنیادی جمہوریت کے نظام سے چنے تھے اور ان کا انتخاب عام حق رائے دہندگی بالغان کے اصول پر ہوا تھا۔ بنیادی جمہوریتوں کا نظام بھی اس دور کی ایک ایسی دیہی تھی جسے جمہوریت کے اصل اساس کے طور پر بہترین طریق کار تسلیم کر لیا گیا ہے، نہ صرف اپنے ملک بلکہ بعض دوسرے ملکوں میں بھی، جہاں اس طرز حکمرانی کو اچھا سمجھ کر اپنایا جا رہا ہے۔ نئے آئین نے صدر کو اپنے کابینہ کے اراکین کا انتخاب کرنے کا مجاز قرار دیا ہے اور اس طرح جو کابینہ بنی ہے وہ آئے دن کی سیاسی تبدیلیوں اور وزارتی شکست و ریخت کا مکمل سدباب بھی کر دیتی ہے۔

اس صدارتی طرز حکومت کے دو فوائد تو بالکل واضح ہیں۔ ایک تو یہ کہ ملک کو آئینی اور جمہوری نظام مملکت بھی مل گیا اور سابقہ حالات کے غور کرنے کا بھی دروازہ بند کر دیا گیا کیونکہ جب تک

معاشرہ اچھی طرح اور کافی وسیع پیمانہ پر تعلیم یافتہ اور ترقی آشنا نہ ہو اور اس کے سیاسی رہنما زیادہ بالغ نظر نہ ہوں اس وقت تک ادنیٰ سطحوں پر لامحدود سیاسی آزادیاں دینا مفادِ وطن کے لئے مضرت ثابت ہونے کے سوا اور کچھ نہیں ہو سکتی۔ مگر لوگوں کو سیاسی کاموں سے عملاً وابستہ ہونے کی ضرورت ہے اس لئے نظم و نسق مملکت چلانے کی آرزو کو پورا کرنے کے لئے عوام کے نمائندوں کو اپنی بنیادی مجلس کے ذریعہ پوری طرح آزادی عمل دی گئی ہے۔ چنانچہ ان بنیادی جمہوریتوں نے ہی ملک کے لئے ایک متحکم سیاسی اساس بنایا ہے۔

یہ تو مرض کا ایک علاج ہوا، اور بفضلِ تعالیٰ بہت شافی بھی رہا۔ مگر علاج کے ساتھ پرہیز کی بھی ضرورت ہوتی ہے تاکہ اناٹا مرض میں مدد ملے۔ اس غرض سے ملک میں نااہل سیاستدانوں کو کچھ سال کے لئے سیاسی زندگی سے علحدہ رکھنے کا آرڈیننس بنادیا گیا۔ اور سیاسی پارٹیاں بھی ممنوع قرار دے دی گئی تھیں۔ غرض اسی پس منظر میں ۲ جون ۱۹۶۲ء کو ملک کے نئے آئین کے تحت مرکزی مقننہ کا اجلاس راولپنڈی میں منعقد ہوا۔ اراکین نے سرد و گرم ہر طرح کا رویہ اختیار کیا اور وہ شے جسے آزادی اظہار کہتے ہیں اور جسے جمہوریت کا بنیادی اصول مانا گیا ہے، اس موقع پر بھی موجود رہا۔ حکومت خود اس بات کی خواہاں ہے کہ تعمیری نکتہ چینی کر دوا رکھے تاکہ رائے عامہ سے قریب تر رہے اور اصلاح و تکمیل کے مراحل میں نمائندگانِ ملک کی آرا سے واقفیت حاصل کی جائے۔ سیاسی جماعتوں کی بحالی بھی اسی وجہ سے کی گئی ہے کہ ملک میں سیاسی خلا موجود نہ رہے، کیونکہ سیاسی خلا عوام میں افواہوں کے پھیلنے، زبانِ طعن دراز کرنے، اور کانا پھوسی کی ہمیں چلانے کا موجب بن جاتا ہے جو کسی بھی ترقی پسند ملک کی ہیئتِ اجتماعیہ کے لئے مفید ثابت نہیں ہو سکتا۔

مرکزی اور صوبائی مجالس قانون ساز میں جو کچھ لیل و نہار ہیں وہ اخبار میں طبقوں سے پوشیدہ نہیں۔ مگر ان مجالس کے باہر سیاسی مطلع بھی گہرا براؤڈ ہے اور کچھ نہیں کہا جاسکتا کہ یہ غبار کب تک چھٹے گا۔ سیاسی جماعتوں کی بحالی کے بعد ملک میں کئی جماعتیں جو حاضی میں اپنا اپنا کردار ادا کر رہی تھیں، پھر برسرِ عمل آگئی ہیں۔ مگر حالات کی رفتار ابھی تک سیال حالت میں ہے۔ خود حکومت

جماعتیں اپنی رکن سازی کی ہم چلا رہی ہیں۔

مغربی پاکستان میں دوسری سیاسی پارٹیاں بھی موجود ہیں مگر ان کے مؤیدین کی تعداد کچھ زیادہ بڑی، یا مؤثر نہیں۔ مثلاً نیشنل عوامی پارٹی، ریپبلکن پارٹی، عوامی لیگ وغیرہ۔ ملک میں ایک متحدہ قومی محاذ بنانے کی بھی سعی کی گئی ہے جس میں ہر پارٹی کے نمائندے موجود ہوں گے۔ مگر ہر گروپ نے اس محاذ میں شریک ہونے کے لئے اپنی جدا جدا شرائط پیش کی ہیں کوئی پورے آئین کو ہی بدلنا چاہتا ہے، کوئی اس کی اصلاح و ترمیم چاہتا ہے، کوئی کچھ، کوئی کچھ! لیکن ان جماعتوں کے رہنما وقتاً فوقتاً جو بیانات دیتے رہتے ہیں ان سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس محاذ کو بھی پوری سمجھتی حاصل نہیں ہے۔ غرض اس وقت ملک کا سیاسی خواب تعمیروں کی کثرت سے پریشان ہے اور کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ مطلع سیاست پر کون کون سے ستارے طلوع ہوں گے، اور کیا کاروشیناں بکھیر کر افق کے کس پار پہنچ جائیں گے۔

البتہ یہ سوال ضرور سامنے آتا ہے کہ ملک کی اس سیاسی بے یقینی کے ضمن میں حکومت کس طرح سوچتی اور عمل کرتی ہے۔ اس سوال کا جواب تلاش کرنا کچھ ایسا مشکل نہیں۔ کیونکہ صفا دکھائی دے رہا ہے کہ بلند آہنگ تقاضوں کے پیش نظر حکومت ملک کے آئین کو اور زیادہ جمہوری بنانے کے سلسلے میں قدم اٹھا چکی ہے۔ بنیادی حقوق کا بل ڈھاکہ کے موجود اجلاس میں پیش کیا گیا ہے اور اس کی منظوری کے لئے جملہ ماسعی بروئے کار لائی جا رہی ہیں۔ عام مطالبہ یہ تھا کہ ملک کا نام آئینی طور پر "اسلامی جمہوریہ پاکستان" رکھا جائے۔ اسے بھی تسلیم کر لیا گیا ہے۔ رائے دہی کمیشن مقرر کیا گیا تھا، جس نے اپنی رپورٹ صدر پاکستان کی خدمت میں پیش کر دی ہے اور بالمراسم انتخابات کا اصول منظور ہونے کی توقع کی جا رہی ہے۔ بحث کو بھی مقننہ کے کنٹرول میں دینے کا امکان ہے۔ اسی طرح ماہرین قانون کی آراء کے مطابق ہائی کورٹوں کو اپیل سننے اور نظر ثانی کے اختیارات بھی مل جائیں گے اور اب ایبٹ وڑو لوگوں

کو بھی اس بات کا احساس تھا کہ عوام سے قریب تر آنے اور اصلاح ترقی کے منصوبوں کو پوری طرح مکمل و کامیاب بنانے کے لئے جہاں اور باتوں کی ضرورت ہے وہاں عوام کا اعتماد و تعاون جیتنا بھی ضروری ہے۔ اس لئے حکمران کا بینہ کو بھی کسی فعال اور با اثر جماعت کی تائید حاصل ہونی چاہئے تاکہ ملکی فلاح کے پروگراموں کو آگے بڑھایا جاسکے۔ صاحب رائے حضرات نے خلوص نیت سے یہ چاہا تھا کہ ملک میں صدر پاکستان، فیڈل مارشل محمد ایوب خان ہی کی ایک ایسی وقیع و قد آور ہستی ہیں جنہیں سارے ملک کا اعتماد حاصل ہے اس لئے اگر وہ اپنی ایک سیاسی جماعت کی تشکیل پر رضامند ہو جائیں تو بہت سی سیاسی پیچیدگیوں کا از خود ازالہ ہو جائے گا مگر اس تجربہ کو صدر پاکستان نے خود ہی پسند نہیں فرمایا۔ اس لئے کافی خور و فکر کے بعد یہ طے کیا گیا کہ ملک کی سب سے بڑی جماعت مسلم لیگ کو بحال کیا اور فعال بنایا جائے کیونکہ یہی وہ جماعت تھی جس نے پاکستان بنانے میں مدد دی تھی اور لوگوں میں بھی اس کو وقعت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ خود بہت سے وزراء نے کا بینہ کی شخصی تائید بھی اسی جماعت کے حق میں تھی کیوں کہ ان میں سے بیشتر ایسے حضرات ہیں جو سیاست کے میدان میں جانی پہچانی ہستیاں ہیں اور یہ جماعت بھی وہ جماعت ہے جس کے ساتھ خود باقی پاکستان قائد اعظم اور عمار پاکستان قائد ملت مرحوم کی یادیں وابستہ ہیں۔

مگر ہوا یہ کہ مسلم لیگ کی تشکیل تو بھی گونا گوں مشکلات کا شکار ہو گئی کیونکہ بہت سے پرانے لیڈر ایبٹ وڑو کی زد میں تھے اور جو باقی رہے تھے وہ شاید اتنے با اثر نہ تھے کہ ایک نئی اور عظیم طبعی تحریک کو چلا سکیں۔ ان میں بعض لیڈر تو حکومت کے کھلم کھلا مخالف تھے۔ اس لئے مشکلات اور بھی بڑھ گئیں مگر وہ زور داران شوق کو منزل پر پہنچنے کی جستجو ہو تو راہ کی دشواریاں ہمت کو اور ہمیز دیتی ہیں۔ چنانچہ فیصلہ ہوا کہ مسلم لیگوں کا ایک کنونشن منعقد کر کے آئندہ لائحہ عمل طے کیا جائے۔ یہ کنونشن بھی اختلاف کا مور د بن گیا اور بعض لیگی لیڈروں نے اپنی ایک کونسل مرتب کرنے کا اہتمام کیا۔ یہ کونسل وہی تھی جو اکتوبر ۱۹۵۸ء کا انقلاب آنے سے قبل بنی ہوئی تھی۔ اس وقت مسلم لیگ کی یہ دونوں ہی

غزل

تالش دہلوی

خاک اڑاتے ترے وحشی کو سرد دیکھتے ہیں
کوئی صحرا ہو گولا سا اٹھا دیکھتے ہیں
ہم سے پہلے سر منزل کوئی پہنچا ہے ضرور
دُھندلے دُھندلے سے نشانِ کف پا دیکھتے ہیں
رُخ ہی ہو جائیگا موسم کی ہوا کا معلوم
ہمیں خاکستری دل اپنی اڑا دیکھتے ہیں
اُس میں ہے نگہ شوق کی تو لو پوشیدہ
آج یہ پردہ حائل بھی اٹھا دیکھتے ہیں
تیری نگیں بدنی کا انہیں اندازہ ہے
جو ہمیشہ تجھے رنگین قبا دیکھتے ہیں
نکمت و رنگ کی یہ موج کہاں سے آئی
پھول کھلتا ہے تو ہم سوئے صبا دیکھتے ہیں
مردہ گوش ہوا جلوہ چشم مشتاق
ہم اسکرے ہم آتا ہوا دیکھتے ہیں
پے پے پڑتی ہیں ساقی کی نگاں تالش
حاصل میکدہ ہر غرض پا دیکھتے ہیں

کو درخواست دینے پر بعض حالات میں صدر پاکستان معافی بھی دے سکتے ہیں۔ فرض اس قسم کے بہت سے مطالبات تسلیم کئے جا چکے ہیں جو خود اس بات کی دلیل ہے کہ حکومت حزب اختلاف کے ساتھ زیادہ سے زیادہ تعاون پر آمادہ ہے۔ رائے عامہ کی بعض پر اس کا ماتھ ہے اور جب تک کوئی بات مراحتاً وطن دشمن یا عقائد اسلام و پاکستان کے خلاف معلوم نہ ہو اس کے قبول کرنے میں فراخ دلی کا ثبوت دیا جاتا رہے گا۔

مگر حزب اختلاف سے عارضی بھوتر کر لینا نہ کوئی بڑا کارنامہ ہے اور مسائل کا مستقل حل۔ لیکن یہ بھی نکتہ ارباب اختیار کی نظر سے اوجھل نہیں کہ آزاد اظہار رائے اور بعض نکتہ چینی و مخالفت، دو الگ الگ چیزیں ہیں۔ اس لئے بعض ناگزیر پابندیوں کا باقی رکھنا بھی لازمی ہو جاتا ہے۔

زبانِ وطن کے لئے آمریت کا الزام لگا دینا یوں تو بہت آسان ہے مگر آئینی آداب و روایات کا خیال کیا جائے تو حقیقت کچھ اور ہی معلوم ہوتی ہے۔ اب مثلاً صدارتی طرز حکومت میں یہ ضروری نہیں جتنا کہ حزب اختلاف کی مخالفت رائے پر وزیر مستعفی ہو جائیں۔ وہ اپنی مقررہ مدت سے قبل نہیں ہٹائے جاسکتے خواہ فرسٹ ایوان پر انہیں شکست ہی کیوں نہ ہو جائے۔ لیکن ایک ہونڈی محب وطن کا بیٹہ کا پھر بھی یہ روایتی فرض رہتا ہے کہ قوم کی بعض پر ماتھ رہے اور سیاسی موسم کے تغیر کو نگاہ سے اوجھل نہ رہے۔ اس لئے حزب اختلاف کو حتی الامکان جیتنے کی ہی کوشش کی جاتی ہے۔ ویسے ہمارے قومی مقصد میں حکومت کو اکثریت حاصل بھی ہے۔

۱۵۶ نشستوں میں سے دو اس وقت خالی ہیں۔ ۱۴۰ ممبر کسی پارٹی سے منسلک نہیں، ۶۰ اراکین حزب اختلاف کی نشستوں پر بیٹھے ہیں پھر بھی ۸۰ اراکین مقصد حکومت کے موید ہیں مغربی پاکستان کی اسمبلی میں ۱۰۰ اور مشرقی پاکستان کی اسمبلی میں ۱۲۰ اراکین حکومت کی تائید میں ہیں۔

مگر کیفیت یہ ہے کہ لوگوں کے گروپ یا جماعت کی تشکیل کسی اصول و سیاسی عقیدہ و پروگرام پر مبنی یا منظم نہیں ہوتی۔ بلکہ اس میں فرد پرستی کو زیادہ دخل ہوتا ہے۔ اور سیاسی لوگوں کی بصیرت ابھی اُس وسعت و ہمدگیری کی محتاج نظر آتی ہے جو ملک کو صحیح (باقی صفحہ پر)

سوات میں حبشی

طاہر احمر

(دل کے اس پار)

کتنا رنگین ہے خاموش ہے یہ شہر خزاں
نزد پتوں پہ سلگتے ہوئے پھولوں کا دھواں
گرد کی گود میں سوئے ہوئے گاؤں کا سرخ
راہ کے پھول پہ ٹہرا ہوا کوئی ارماں
برت زاروں کے حسین بن میں اُٹتے بادل
اور وادی میں گر جتے ہوئے دریا کا سماں
مرغزاروں میں چاروں کے دھکتے پتے
دیو داروں کے گھنے سائے میں سبزہ لریزاں
کتے گلپوش کتاروں سے گزرتی ندی
موج در موج ہے رنگینی گل سے تاباں
گنگناتی ہے حسین شام شفق کی لو پر
جیسے خورشید کی کرنیں ہوں کہ زلفاں قضا
اپنی تنہائی میں افسردہ و گنہگار
انچے کپڑے پہ ٹہرا ہوا حیراں حیراں
اک حسینہ ہے سرِ راہ کسی یاد میں گم
اور وادی میں وہ سوئے ہوئے خاموش گام

ایک مدت ہوئی چھوڑے ہوئے وادی سوات
دل کے دیوانے میں ہیں گیت ابھی تک لریزاں
(دل کے اس پار)

دم بدم سرد خزاں پھول اُڑاتی گزرے
گیت کی آگ سرشام بھجاتی گزرے
سردیختہ ہواؤں میں بھرتا ہوا جوش
نیچے وادی میں گزرتے ہوئے دریا کا خروش
دیو داروں کے گھنے گھوڑا ند میرے جنگل
دیوتاؤں کی سی ننھت سے اُٹتے بادل
برف کے گاؤں کو جاتی ہوئی اک راہ گندہ
جس کے جنگل میں جواں برف اُڑانے شہپر
نرم چہروں پر سرشام شفق کی کلیاں
اور مرے گاؤں کی پرکھیاں سہانی کلیاں
برف کی دھند میں پٹے ہوئے بلور پہاڑ
کتے تاریک بیا بالوں میں آندھی کی فغاں
آج تنہائی میں اے غم دل بے تاب بھی ہے
ڈھلتے سائے بولر زتے ہیں تو مہتاب بھی ہے

انقلاب سے آئین تک

انور حسین

عام طور پر جو شکایت کی جاتی ہے اور بالعموم سوجے سمجھے بغیر کی جاتی ہے وہ یہ ہے کہ پاکستان آئینی نشوونما یا حقیقی جمہوریت کے قیام میں دوسرے ملکوں سے بہت پیچھے ہے۔ ایسی تنقید کرنے والے اس بناء پر کہ انقلاب بہر حال انقلاب ہے خواہ وہ بے کشت و خون ہی کیوں نہ ہو۔ اس کے ذریعہ اہل پاکستان کے مزاج و افتاد کے مطابق جمہوری حکومت کے نشوونما کے تصور کو مضحکہ خیز خیال کرتے ہیں۔ وہ مغربی جمہوریت یا اس امر کا تذکرہ کرتے ہوئے کہ کس طرح دنیا کے اکثر آزاد ممالک اس کی پیروی کر رہے ہیں افسوس کرتے ہیں کہ پاکستان ایسا کیوں نہیں کرتا۔ اور اس سے قاصر کیوں ہے۔

بنابراین یہ بیان کرنے کی ضرورت نہیں کہ مغربی وضع کی جمہوریت کے دیگر ممالک میں نشوونما، ارتقا اور کامیابی یا ناکامی سے متعلق کوائف اور پاکستان کی مخصوص افتاد اور مسائل کی صحیح غماضی سے تمام مغالطوں اور ذاتی اغراض پر مبنی غلط بیانیوں کی کھوج کر چھٹ جائے گی۔

جہاں تک باقاعدہ تاریخ کا تعلق ہے یہ سوال کیا جاسکتا ہے کہ ہیرودوش کے زمانہ قدیم سے لے کر اب تک کئی قوموں نے کئی ممالک میں جمہوریت کا تجربہ کیا ہے۔ لیکن اس کا نتیجہ کیا رہا؟ اس کا جواب دینے وقت یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ قیصر عظم اور جلیل القدر نپولین سے لے کر الیاتیہ جیسے چھوٹے ملک کے احمد زورنگ اب سب باجیروت افراد نے خود کو اپنے ملک کے دستور سے زیادہ طاقتور بنا کر آخر کار اس کا خد کے پرزے کو ہڑپ کر لیا تھا۔ اور یوں جمہوریت کو بالآخر اپنی عزت یا شکست کے ساتھ ہی دفن کر کے اپنی قوم کو تنہا ہی ویرا دی میں مستغرق کر دیا تھا۔

انگلستان ہی کو لے لیجئے۔ اسے موجودہ غیر مرقوم تصور

اگر یہ کہا جائے کہ پاکستان میں انقلاب درحقیقت محض انقلاب نہ تھا بلکہ تغیر وترتی کا پیش خیمہ تھا اور اس کی بدولت اس کی رفتار ترقی اور بھی تیز ہو گئی تو شاید اس میں تضاد کا شائبہ نظر آئے۔ بادی النظر میں ممکن ہے ایسا ہی معلوم ہو لیکن غور سے دیکھا جائے تو یہ حین حقیقت ہے۔ اور سچ پوچھئے تو بانیان انقلاب کا حقیقی منشا بھی یہی تھا۔ وہ اس کو ارتقاء مسلسل کا ذریعہ بنانا چاہتے تھے اور یہی وہ چیز ہے جو اس کی بدولت بروئے کار بھی آ رہی ہے۔

جہاں تک تضاد کا تعلق ہے یہ بھی فی نفسہ کچھ ایسی چیز نہیں جس کی طرف بڑھتی نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا جائے کہ اس پر بھی است؟ کیونکہ یہ سب مشاہدہ کی بات ہے کہ بعض اوقات متضاداتوں میں بھی ہم آہنگی پائی جاتی ہے اور انتہاؤں کے سرے بھی آپس میں مل جاتے ہیں۔ اسی طرح یہ بھی صحیح ہے کہ جو چیزیں بظاہر آپس میں ملتی جلتی ہیں وہ بسا اوقات اٹل بے جھڑ ہوتی ہیں۔ یہ ساری باتیں اظہار من الشمس ہیں اور وہی لوگ ان کو محسوس نہیں کرتے جو مغربی کبریٰ پر غور و خوض کئے بغیر محض کوئی نتیجہ اخذ کر لیتے ہیں۔ یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ بعض لوگ صحیح صورت حال کو بھانپ تو لیتے ہیں لیکن چونکہ انہیں محض ذاتی اغراض سے سروکار ہوتا ہے اس لئے وہ اس سے اغماض کرتے ہوئے محتاج کو اس طرح توڑتے مروڑتے ہیں کہ دوسرے لوگ گمراہ ہول اور لان کا مطلب پورا ہو جائے۔

اس سلسلہ میں زیادہ اندیشہ اس بات کا ہے کہ حقائق کو کسی بری نیت سے مسخ نہ کیا جائے بلکہ اس کا سبب پرمبر کہ کاوش نیز اس سیاسی بیدار مغزی اور فہم رسا کا فقدان ہو جو انسان کو کسی چھپی معاملہ کے خلاف یا حق میں رائے قائم کرنے کے لئے اس کے موافق مخالفین پہلوؤں پر غور کرنے کی صلاحیت عطا کرتے ہیں۔

لیکن تاریخ نے بار بار اس امر کا ثبوت بہم پہنچایا ہے کہ انہوں نے اپنے لئے جو لقب العین مقرر کیا تھا اس کو حاصل کر کے اپنی فہم و فراست اور فطری صلاحیت کا ثبوت دیا ہے۔

مثال کے طور پر یہی دیکھ لیجئے کہ دور آزادی سے پہلے ہندی کیفیت کیا تھی۔ ہماری ہمسایہ قوم کی ہٹ دھرمی اور حکمران قوم کی چالبازی کے باعث ہندوستان کے مسلمانوں کا کوئی مستقبل بھی نہیں دکھائی دیتا تھا کہ وہ آزاد ہوں گے بھی یا نہیں۔ اور آزاد ہو کر بھی ان کی کیا حالت ہوگی۔ اس وقت ہمارے فلسفی، شاعر، علامہ اقبالؒ کے ذہن رسا نے پاکستان کا تصور کیا۔ اور قائد اعظمؒ نے اس کو حائل کرنے کا مصمم ارادہ، فرزندِ ان ملت اپنے قائد کے گرد جمع ہو گئے اور قرارداد لاہور منظور ہوئی۔ مخالفین پاکستان نے اس کا تسخیر کیا۔ نتیجہ لگائے۔ اور دنیا نے اسے محض ایک ڈھونگ یا زیادہ سے زیادہ مذاقِ لٹو سمجھا۔

لیکن عوام کے بے پناہ ارادہ، اُن کی مناسب تنظیم، اس کی صحیح پنج پر کار فرمائی اور پُر اتحاد استعمال پاکستان کو "دھوم دھام کے ساتھ" معرضِ وجود میں لا کر ہی رہا۔ اب ہم پر خندہ زن ہونے کی بجائے دنیا پر خندہ زن ہونے کی باری ہے جس میں تقسیم کا وہ اصول جس کی بنیاد تقسیمِ پاکستان سے پڑی، ایسے تمام عوارض کا مجرب علاج بن گیا ہے۔ چنانچہ کدو یا اور دیت نام کے پیچیدہ معاملے اس کی نمایاں مثالیں ہیں۔ اور تو اور ہندوستان نے جس جو پاکستان کا بدترین نقاد ہے، اس سلسلہ میں حد کر دی ہے۔ ملکی وحدت پیدا کرنے کی کوشش میں ناکام رہ کر (جس میں پاکستان کو کامیاب ہونے کی مدت گزر چکی ہے) حکمرانانِ دہلی ان ریاستوں (صوبجات) کو جو ویسے تو چھوٹی ہیں لیکن ہیں بلکی تکلیف دہ، چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں تقسیم کر دیا ہے۔

اور ہندو آزادی ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء سے لے کر دستور ۱۹۵۴ء تک کے زمانے میں پاکستان بے درپے کئی حادثوں سے دوچار ہوا۔ یعنی حملہ کشمیر، جونا گڑھ اور ماٹوہ پر ہندوستان کا زبردستی قبضہ، مسلمانوں کے خون کی جابجا افزائی، لاکھوں پناہ گزینوں کی دھڑا دھڑا آمد، بابائے ملتؒ کی مرگ ناگہان، ۱۹۵۰ء میں فرقہ وارانہ ظلم و ستم کی از سر نو فتنہ آرائی، ۱۹۵۱ء میں قائد ملت کی شہادت، خوفناک آفاتِ سادی وغیرہ وغیرہ قوم اور اس کے قائدین کو ایک طویل

بروئے کار لانے کے لئے آشوبِ حوادث سے معمور کتنی ہی صدیوں سے گزرتا پڑا، ایسی صدیاں جن کا دامن بادشاہوں کے ساتھ زامیوں کی جنگوں، بادشاہوں کے سر قلم کرنے، محافظِ قوم کے ایک سالہ پیر کو برسرِ عام دار پر لٹکانے وغیرہ سے بھر رہا ہے۔ جب انگلستان کی نوآبادیوں نے جارج سوم کی حکومت سے برائی کر کے موجودہ ریاست ہائے متحدہ امریکہ کی بنیاد رکھی تو کیا انہوں نے اپنے سابقہ وطن کی حکومت یا آئین کو نمونہ بنایا؟ قدرتی طور پر وہ ایسا کرنے سے معذور ہے۔ انہیں اپنا آئین خود وضع کرنا پڑا تاکہ وہ اسے اپنے لوگوں کے مزاج و افتاد کے مطابق بنائیں۔ اور اسے بھی اپنی موجودہ وضع اختیار کرنے کے لئے کتنی ہی کدو کاوش اور محنت و مشقت سے کام لینا پڑا۔ اور کتنی ہی کشمکش اور خون خرابے سے گزرنا پڑا۔

پھر وہ مغربی ملک جس نے دنیا کو آزادی، مساوات اور اخوت کا غیر فانی نعرہ دیا ہے، جمہوریت کے ساتھ ۱۷۸۹ء سے برابر کھینٹا ہی رہا ہے، جیسا کہ اس کے تاریخی حالات سے صاف پتہ چلتا ہے۔ چنانچہ وہ ہنوز اپنی منزل کی تلاش میں سرگرداں ہے۔ ایسی ناکامیوں کی اور مثالیں پیش کرنے کی ضرورت نہیں کیونکہ جو لوگ واقعات سے ناواقف ہیں وہ بخوبی جانتے ہیں کہ مغربی وضع کی جمہوریت ناکام ثابت ہوئی ہے۔ اور جن ملکوں نے بعینہ اس کی نقل اتارنے کی کوشش کی ہے، وہاں اس کا بہت برا اثر ہوا ہے۔

اس لئے اگر پاکستان ان تجربوں سے سبق لینا چاہتا ہے تو وہ بے جا نہیں۔ اس کے لئے نہ تو یہ مناسب ہے کہ وہ بے پناہ راستے پر گامزن ہو اور نہ یہ کہ دوسرے ملکوں کی اندھا دھند پیروی کرے۔ ایک طرف قائدین کے خضر راہ بن کر صحیح راہ دکھائے اور دوسری طرف ان کی ہدایات پر عمل کرنے والے مقتدیوں کی سعی و کوشش اور جدوجہد نے ہمیشہ قوموں کو اپنا راستہ آپ تلاش کرنے اور اپنے ہی طور پر منزلِ مقصود تک پہنچنے کی توفیق عطا کی ہے۔ جب کبھی انہوں نے اپنی راہ پیدا کرنے کی کوشش کی ہے ان کے دشمن ان کا مضحکہ اڑاتے رہے ہیں اور دوسرے ان کی سعی کے ناکام ہونے کے بارے میں پیشگوئیاں کرتے رہے ہیں۔

مختص میں مبتلا رکھا۔

جو لوگ ایسے پُر آشوب حالات سے فائدہ اٹھانے کی فکر میں رہتے ہیں۔ انہوں نے اس نازک زمانے کو اپنی نامبارک کارستانی کے لئے بہت ہی موزوں خیال کیا۔ چنانچہ انہوں نے جو ہر لیے بیج بوئے تھے وہ کسی بڑے کے دانتوں کی طرح موثر ثابت ہوئے۔ اور یہ تمام انہی کا نتیجہ تھا کہ پاکستان تقریباً تباہی کے کنارے آگیا اور اہل پاکستان کو قیامت کی گھڑی بالکل سامنے دکھائی دینے لگی۔ دنیا چپ چاپ یہ تمام منظور کیجی۔ رہی تھی اور منتظر تھی کہ یہ گھڑی کب آتی ہے۔

لیکن اگر ایک شاعر کے ذہن رسالے پاکستان کا تصور کیا، اس کا خواب دیکھا، اگر ایک قائد نے اس کے لئے جدوجہد کی اور اس جنگ میں کامیاب ثابت ہوا تو خدا کے فضل سے صدر پاکستان محمد ایوب خان کی شکل میں ایک نجات دہندہ بھی نمودار ہو گیا جس نے ۱۹۵۸ء میں عین وقت پر میدان میں قدم رکھا اور اس اتری کے بڑھتے ہوئے سیلاب کو روک لیا۔ تب سے ہمارا کارواں برابر آگے ہی گئے بڑھتا چلا جا رہا ہے۔ اُس منزل کی طرف جو اس جو مسئلہ قائد نے اس کا منتہا قرار دیا ہے۔ یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ اس منزل مقصود، اس مقام عافیت کی طرف بڑھنے کی کوشش میں ہمارا کارواں جو بالکل نئے راستے پر چل رہا ہے، اور بھی زیادہ شدید صعوبتوں اور آزمائشوں، مشکلات و خطرات میں مبتلا رہا ہے۔ اور یہ ایسے صائب ہیں جن میں کوئی کارواں بھی جواں جانے جنگلوں اور صحراؤں میں گرم سفر ہو۔ مبتلا ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا مگر ان میں کوئی راستہ نظر آتا ہے نہ نشان راہ۔

۲۷ اکتوبر ۱۹۵۸ء کے تاریخی دن کے بعد جو واقعات رونما ہوئے اور کل چار سال کے بہت ہی مختصر عرصے میں جو شاندار

کارناموں کا ہجوم نظر آتا ہے، وہ اس قدر معروف ہیں کہ ان کا تذکرہ تحصیل حاصل ہے۔ لیکن جہاں تک آئینی ارتقا کا تعلق ہے اس کے بارے میں چند سطور بے محل نہ ہوں گی۔

ملکی حالات کا بڑا ہی حقیقت پسندانہ جائزہ لیتے ہوئے شعور کوائف کو ملحوظ رکھتے ہوئے اور جذباتی و شوریدہ سرانہ شعور کی ذرا بھی پروا نہ کرتے ہوئے صدر پاکستان، محمد ایوب خان، بیاباد آگے بڑھے چلے جا رہے ہیں۔ انہوں نے بنیادی جمہوریتوں کی شکل میں ایک غیر معمولی انتظامی ایجاد کی ہے۔ اس درجہ کامیاب کہ دوسرے ہمسایہ ملکوں نے بھی جو جمہوریت کے تجربے کر رہے ہیں اس سلسلہ میں پاکستان ہی کی پیروی کی ہے اور اس کے نقش قدم پر چل رہے ہیں۔ صدر ایوب ہی کے زیر ہدایت ان کے ماہرین دستور نے ایک ایسا جمہوری آئین وضع کیا ہے جو جمہور کے مزاج کے مطابق ہے۔ اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ صدر ایوب خان ایک بڑی قوم کے سچے قائد۔ ایک بے باک، کھرے اور روشن دماغ صاحب فہم انسان کی حیثیت سے جو کچھ کرتے ہیں لوگوں کا اعتماد حاصل کر کے ہی کرتے ہیں اور جو چیز انہوں نے بنائی ہے اس میں ترمیم و تصرف کے خلاف نہیں ہیں۔ اگر لوگ واقعی یہ چاہتے ہیں کہ اس میں تغیر و تبدل کیا جائے، حالات ان کا اتفاقاً کریں اور کوائف و مصالح ان کو جائز قرار دیں۔ ترقی کے جو مدارج اب تک طے ہو چکے ہیں، ان سے ایک دیانت دار مبعہ کے دل میں کوئی شک باقی نہیں رہتا کہ وہ دن دور نہیں جب پاکستان دنیا کے تمام جمہوریت پسندوں کے لئے ایک مثالی مقام بن جائے گا اور جب ہمارے صدر دنیا کے نامور دستور سازوں اور مفقنوں میں شمار ہوں گے۔

جھلسلی

قاضی نذر اللہ اسلام
ترجمہ: افسر راہ پوری

حلیہ بیگم: وہ تو گیلی، لاڈلو، ڈھنڈی سانس لیتی ہے، اچھا میں کاغذ
آنکے دیتی ہوں، کیوں، ٹھیک ہے نا؟
فیروزہ: نہیں امی، بچا ہی دود بچف آواز سے بچا لگتی ہے، بچا
فورا!

حلیہ بیگم: خدا کے لئے روؤ نہیں۔ لے ابھی بچلے دیتی ہوں دیتی
بچلے جاتی ہے کہ بہت سے برساتی پٹنگے آکر تھکے گرد
ناچنے لگتے ہیں۔ فیروزہ انہیں گھوم گھور کر دیکھنے لگتی ہے
فیروزہ: نہ بچاؤ امی، پروانے کتنے اچھے لگتے ہیں ذرا مجھے دیکھو۔
حلیہ بیگم: (مسکراتی ہوئی دیتی ہے) اچھی ہوئی ہے نا، اچھا نہیں بچاؤ
لیکن بیٹی، پٹنگے بدن پر، چہرے پر گر گئے۔ ذرا تہی ہنا کر
رکھ دوں۔

فیروزہ: (چہچہاتی ہے) میں کہہ چکی ہوں کہ پٹنگوں کو دیکھوں گی!
حلیہ بیگم: (بچی کو چوم لیتی ہے میری بیٹی، اس قدر چہچہاتی کہ نہ بولوا
اس سے مرض اور بڑھ جائے گا۔ میں تہی نہیں ہٹاتی۔
فیروزہ: (ٹپٹکی باندھے پٹنگوں کو دیکھتی رہتی ہے) امی، ایک پٹنگا
پکڑ کر مجھے دو تو۔!

حلیہ بیگم: چھی! بیٹی، پٹنگے نہیں چھوتے۔ تجھے آج کیا ہو گیا ہے
فیروزہ؟

فیروزہ: (روہاںسی ہو کر لاڈ، نہیں تو میں چیخ چیخ کر آسمان سرسبز
اٹھا لوں گی۔

حلیہ بیگم: نہیں بیٹی، نہیں، چہچہاتی کی ضرورت نہیں (ایک تپک پکڑ کر
فیروزہ کے ہاتھ میں دے دیتی ہے۔ وہ پٹنگے کو الٹ پٹنگ
غور سے دیکھتی ہے)

فیروزہ: یہ لو، اس کا تو ایک پر ٹوٹ ہی گیا..... ہا.....

کردار:
مرزا: گاؤں کا رئیس
حلیہ بیگم: مرزا صاحب کی بیوی
فیروزہ: مرزا صاحب کی سولہ سالہ لڑکی
جیب: ایک حسین و شکیل نوجوان
مرزا صاحب کا پڑوسی
ڈاکٹر

پہلا منظر
(مرزا صاحب کی دو منزلہ کوٹھی۔ بالائی منزل پر ایک
کمرہ۔ مرزا صاحب کی سولہ سالہ لڑکی بستر حالات پر
بے سوجھ بوجھ ہے۔ تمام کھڑکیاں بند ہیں، البتہ
بچہ کی طرف کا دروازہ کھلا ہے۔ باہر بارش
ہو رہی ہے۔ مرزا صاحب کی بیوی حلیہ بیگم پٹنگے سے
لگی بیٹھی ہے اور فیروزہ پٹنگا بھیل رہی ہے۔ دن ختم
ہو چلا ہے۔ مطلقاً کوئی آواز نہ ہے۔ حلیہ بیگم اٹھتی ہے
اندھیرا لمحہ بر لمحہ کمر آہوتا جاتا ہے۔ حلیہ بیگم اٹھتی ہے
اور لائین جلا دیتی ہے)

فیروزہ: امی!
حلیہ بیگم: (دوڑ کر پٹتی ہے اور پیار سے اپنے چہرہ کو فیروزہ کے
چہرے سے ملا کر بولتی ہے) میری بیٹی، میری زندگی!
فیروزہ: (بچی بچاؤ۔
حلیہ بیگم: کیوں بیٹی؟ کتنا اندھیرا ہو گیا ہے، ڈر نہیں لگے گا تجھے،
فیروزہ: اوں، ہوں، نہیں۔ تم مجھے گود میں لے کر بیٹھو ذرا انا کا
پٹ جاتی ہے جتنی بہت بری لگتی ہے، امی!

اچھا امی، تنگے کو تو بہت دکھ ہوا ہوگا؟
حلیہ سگیم: کیوں نہیں۔

فیروزہ: تب تو امی سے چھوڑے دتی ہوں۔ امی، تمہارے نیچے کھڑے
حلیہ سگیم: تنگے کو نیچے رکھ دیتی ہے، امی، باہر بہت پانی
برس رہا ہے نا؟

حلیہ سگیم: ہاں بیٹی بہت نلے برس ہمارے جھجھم سناٹی نہیں دیتی؟
فیروزہ: مجھے تو جھجھم کی آواز بڑی بھلی لگتی ہے، امی،
انہاں ہیں؟

حلیہ سگیم: دلہیز میں ہیں شاید

فیروزہ: اچھا، اگر خوب چنچ چنچ کر روؤں تو وہ سن پائیں گے؟
حلیہ سگیم: اچھی بیٹی، پھر رونے کی رٹ، انہیں بلا دوں!
فیروزہ: نہیں، نہیں، امی، میری اکیلتنی اچھی ہیں۔ اچھا امی، اگر تم
ابھی گاؤ تو اب اس میں گے؟

حلیہ سگیم: بڑی پاچی ہے تو۔ تیرا مطلب میں سمجھ گئی۔ یہ گانے کا
وقت ہے، اتنے اب اس میں گے تو ضرور خفا ہونگے۔
فیروزہ: اتنی باتیں میں وہ سن پائیں گے، امی، میری اچھی اچھی ذرا
آہستہ آہستہ گادو، وہی برسات کا نغمہ۔

حلیہ سگیم: اچھا کا دیتی ہوں دھیرے دھیرے، اب کیا گانا آتا؟
پھپھن میں وہ گیت گاتی تھی۔ پھر یہاں آئی تو اسے
بھلائے ہی کی کو شش کرنی پڑی۔ جانتی ہو، گلے سے
تمہارے ابا کتنا چڑتے ہیں۔

فیروزہ: سنا سنا کر کوئی چڑ بھی سکتا ہے؟ ابا بھی عجب آدمی
ہیں.....

حلیہ سگیم: پہلے تو ناراض نہ ہوتے تھے، خیر اب تو میں گانا بھول گئی
چکی ہوں۔ ایک آدھ گیت تیری وجہ سے یاد رہ گیا۔

فیروزہ: پہلے ابا گلے سے ناراض نہ ہوتے تھے؟
حلیہ سگیم: نہیں، لو، اب گلے دیتی ہوں۔

گھبرا، غریب سا دل جھجھم برسا رہا ہے
آنکھ میں ہوں اکیلی، دل کیوں اٹھ رہا ہے
یہ تیرگی سی کیسی پیروں پہ چھا رہی ہے
موج ہوا یہ کیسی شانوں میں گار رہی ہے

اس تیرگی میں آخر بھرتی ہوں کیوں پریشاں

ہوں کس کی جستجو میں کس چیز کی ہوں خواہاں

بیدروں کی جھاڑیوں میں تنک کر وہ موڑ مٹیا

یہ کون بھولا رہا ہی نیچے قدم کے ہٹسرا

یہ باتیں سے گیموس کے چھٹک گئے ہیں

یہ کس کی آنکھوں کے آہو بھٹک گئے ہیں

فیروزہ: امی کھڑکی کھول دو ذرا بادل دیکھوں گی۔

حلیہ سگیم: نہیں بیٹی کھڑکی نہ کھلیگی۔ سردی لگ جائے گی۔ ایک
گیت اور گاتی ہوں، سنو!

فیروزہ: نہیں امی اور گیت نہ سنوں گی۔ کھول دو کھڑکی امی،

(حلیہ سگیم جنوبی رخ کی کھڑکی کھولنے کے لئے جاتی ہے)

وہ کھڑکی نہیں امی، پورب والی کھڑکی۔ پورب کی ہوا

سے قدم کے پھول کھلتے ہیں نا امی؟

حلیہ سگیم: وہ کھڑکی کھلی تو تمہارے ابا مجھے جیتا نہ چھوڑیں گے۔

جنوب کی کھڑکی کھول دیتی ہوں۔ جنوب کی کھڑکی

کھول دیتی ہے۔ دور تک جھل پھیلا ہوا ہے، مگر

منہ کی وجہ سے دھندلا جا رہا ہے)

فیروزہ: (ایک لمبی سانس کھینچ کر دوسری کروٹ لے لیتی ہے۔

پھر کچھ دیر کے بعد اسی کروٹ ہی لیٹ جاتی ہے

اور پونہ لیٹ لیٹی کھڑکی طرف ہلکتی، اور شاید

روتی بھی جاتی ہے۔ امی!

حلیہ سگیم: روتی ہے بیٹی!

فیروزہ: اچھی امی، ابا تم کو بہت مانتے ہیں؟

حلیہ سگیم: معلوم نہیں (آنکھیں پونچھتی ہیں)

فیروزہ: پہلے بہت مانتے تھے؟

حلیہ سگیم: تہی ہٹا کر رکھ دوں، تمہاری آنکھیں نہیں دکھیں؟

فیروزہ: شاید وہ امی مگر بتاؤ مجھے!

حلیہ سگیم: (جتنی ہٹا دیتی ہے) خدا کے لئے ذرا چپ ہو کر سو جاؤ

بک بک کرنے سے بیمار امی اور بڑھے گی۔

فیروزہ: اچھا ہٹاؤ نا امی، میں سب سہکتی ہوں۔ ابا نے کبھی

کسی کو چاہا ہی نہیں، ورنہ کوئی آدمی بھی اتنا شمس

دکھڑکی میں سے گیت کی مدھر لہریں داخل
ہونے لگتی ہیں)

دل کے سمجھاتے سے آنکھیں اور بھی ہوتی ہیں تر
دور جاؤں کس طرح، رکھتے ہیں مجھ کو یاد ہو کر
خواب برہم ہو گیا، شام جلد آئی آگئی
پاؤں میں کس کی لٹوں کی دفعۂ بیڑی پڑی
کس کا چہرہ دیکھ کر ہنسی کا آیا خیال
اشک سے بھیگی زمیں پر، پاؤں رکھنے والے
موت کی جانب اگر جاؤں تو بل جاتا ہے وہ
طلعت شب میں مجھے وہ کہے تڑپا ہے وہ

دل کے سمجھانے سے
رگیت کے ختم ہونے پر سامنے والی کھڑکی میں
روشنی چمک اٹھی ہے اور اس روشنی میں ایک
خوبصورت نوجوان نظر آتا ہے۔ وہ ہنسنے
باندھے فیروزہ کی کھڑکی کی طرف دیکھ رہا ہے)

فیروزہ: اسی فراہی اور تیز کردو تاکہ اس کھڑکی سے میں بھی طرح
دیکھی جا سکوں! باہر کسی کے پاؤں کی آہٹ سنائی
دیتی ہے)

علیہ سگیم: اے فیروزہ بند کرو یہ پردہ کی کھڑکی کو، بند کر
.... بڑے بابا آپ ہیں! (مرزا صاحب کے کمرے میں
داخل ہوتے ہی ہوا کے ایک تیز جھونکے سے تہی مغل
ہو جاتی ہے اور علیہ سگیم اسے دوبارہ جلاتی ہے)
مرزا: کھڑکی بند کرنے کی آپ کوئی ضرورت نہیں۔ میں

بہت دیر سے تم لوگوں کی کارستانیاں دیکھ رہا ہوں۔
صاف صاف سن لو، تمہارا جو جی چاہے کرو، مگر میری
آنکھوں میں دھول جھونکنے کی کوشش ہرگز نہ کرنا
(علیہ سگیم پر سکتہ طاری ہے) اور اس مردود لڑکے
— میں کیا کہوں — جی چاہتا ہے کہ کچھ بید کی
تھپوں سے پاؤں سے لیکر سر تک (غصہ سے
دانت میٹا ہے) دن رات گانا، دن رات گیت،
دن رات ہانسی، دن رات سروں شور و

اور خشک ہوتا ہے!

علیہ سگیم: تو چپ نہ رہے گی فیروزہ، میری لادھیلاں جان
بلکان کیوں کرتی ہے؟ ڈاکٹر نے خاموش رہنے کے لئے
کہا ہے نا۔

فیروزہ: اچھا امی، کل وہ پردہ والی کھڑکی کھولیں گی نا؟ تب تو
ابا خانہ ہوں گے؟

علیہ سگیم: دکھانپ جاتی ہے! کیا کہتی ہے فیروزہ! آنسوؤں کے
انڈرنے سے آواز بھیج جاتی ہے)

فیروزہ: کل وہ کھڑکی کھولنے کے لئے نہ کہوں گی امی! (نگہیں میں
اپنا چہرہ پھیپتی ہے)

علیہ سگیم: (دست سی بن جاتی ہے۔ پھر وہ ہانسی ہو جاتی ہے) سمجھی
ابھان، تیری بات سمجھی۔ تو ہمیں جلا بھنا کر جائے گی۔

لو میں ابھی پردہ کی کھڑکی کھول دیتی ہوں! پردہ کی
کھڑکی کھلتی ہے تو سامنے والے گھر کی کھڑکی دھندلے
میں جھٹکتی ہے اندر کھڑکی کے سامنے کوئی بے تابی سے

ٹہٹہتا نظر آتا ہے۔ دور کی وجہ سے وہ سا سا دکھائی
دیتا ہے۔ پھر وہ سایہ کھڑکی میں خاموشی سے کھڑا
ہو جاتا ہے۔ ایسا لگتا ہے جیسے فیروزہ کی کھڑکی کی
طرف گھور رہا ہے علیہ سگیم آڑ کر کے ساری کے
پلو سے اپنی آنکھیں صاف کرنے لگتی ہے)

فیروزہ: اے بابا! اس کھڑکی کی طرف دیکھتی ہے امی! —
ہانسی نہیں کرتی؟ کوئی رو رہا ہے شاید،
تڑپ کر باہر کوئی رو رہا ہے امی امی، سنو امی!

علیہ سگیم: کوئی نہیں روتا بیٹی، کوئی نہیں منہ کا شوہر ہے
..... اول ہوں، نہیں شاید حبیب گاؤں؟
سروں بجا کر

فیروزہ: آہ بارش تمہم جاتی تو کچھ سن ہی لیتی۔ بارش تمہم کی
ہے، نا، امی!

علیہ سگیم: ہاں بیٹی، اب تم چلی ہے۔
فیروزہ: امی، امی، گیت سنو گیت؟ آہ ذرا بھی
شوہر نہ ہو۔ امی چپ چاپ سنو!

قرآن تلاوت کرنا اور نماز پڑھنا تک وہ بھر گیا ہے۔
..... بد معاش، باجی نہیں کا..... ہوں! یہ نکتہ
بی۔ اے پاس کرنے کا خواب دیکھتا ہے۔ وہ تو فیل
ہے ہی۔ پھر میں اس طہریم خاں سے اپنی بیٹی کی شادی
کر دوں،..... یہ مینہ اور مسور کی دال!

حلیہ سگیم، دیکھو، میں تمہارے ہاتھ جوڑتی ہوں، خدا! بہتہ بولو
آج نہ جانے وہ کیا کیا باتیں کہتے جا رہا ہے۔

مرزا: دپور کی کھڑکی بند کرتے ہوئے ہوں! یوں کھڑکی
کھول کر کوئی بھی لڑکی گھورتی رہے گی تو وہ بیباک
نہ ہوگی تو کیا اچھی رہے گی؟ دیکھو، فیروزہ کی ماں
تہیں نے اس کا دماغ خراب کر رکھا ہے.....

اس بڑھاپے میں بھی تمہارے گانے کی لت نہ گئی
..... خدا جانے وہ کونسی خوش گھڑی تھی کہ دینے

ایک اسکول کی پڑھی لکھی لڑکی سے بیاہ کیا اور اس
عذاب میں مبتلا ہو گیا۔... کتنی بڑی بھول ہوئی ہوگی!
حلیہ سگیم،... یہ بھول نہ ہوتی تو ہم دونوں اچھے ہی رہتے۔
مجھے بھی یقین نہیں آتا کہ ایک گریجویٹ کٹرپن سے
ارمنا سکتا ہے۔

مرزا: جو چیزیں منع ہیں، ان سے پرہیز کرنا تمہارے نزدیک
کٹرپن ہے۔ یہ طعنہ تو میں بہت دفعہ سن چکا ہوں
حلیہ سگیم، کوئی نئی بات ہے تو کہو۔

حلیہ سگیم، ہے تو ضرور، مگر چپکے گھرے پر کہیں بوند پھرتی
ہے۔ تم برابر گیت گانے کا طعنہ دیتے ہو، مگر شاید
تم کو یاد نہ رہا کہ میرے گانے ہی کی وجہ سے تم
مجھ سے بیاہ کرنے پر اصرار کھائے بیٹھے تھے۔

مرزا: بھولا نہیں ہوں، لیکن اس وقت مجھے معلوم
نہ تھا کہ تمہارا گانا صرف آنکھوں کا آنسو اور
دل کا درد ہی بن سکتا ہے۔ گانا برا ہے، اس کی
حقیقت مجھ سے زیادہ شاید ہی کوئی ادا سمجھ۔
گانا بونہی منع نہیں ہے۔

حلیہ سگیم، خیر، بحث، مباحثہ کا یہ موقع نہیں۔ خدا کے لئے

اسے تو سکون سے مرنے دوا
مرزا: خیر یہ تو ٹھیک ہے کہ میری ذات سے تمہیں سکون
نصیب نہ ہوا۔ میری خشک دہلے کیف زندگی تم
لوگوں کے لئے ہنس خوشی کے پھول نہ کھلا سکی
صرف کانٹے لگاتی رہی ہے، لیکن مرنے پر بھی میری
وجہ سے سکون نہ ہوگا۔ اتنی بڑی گالی دینے کی
چندال ضرورت بھی نہ تھی! حلیہ سگیم حیرت زدہ سو
ہو جاتی ہے۔ فیروزہ کروٹ بدلتی کمر آٹو پونچھتی،
ہے اور پھر باپ کی طرف غور سے دیکھنے لگتی ہے
مرزا بے چینی سے اور صراحت دھڑکتے ہیں)

فیروزہ: ابا! ذرا میرے پاس آکر بیٹھو...
مرزا: (چوڑک اٹھتا ہے) حلیہ! ذرا فیروزہ کو سنبھالو! میں ڈاکٹر کو
بلا لاتا ہوں۔

فیروزہ: آہ... با... دیکھتے نہیں، کیسی طوفانی بارش ہو رہی ہے
آپ نہ جانیے۔ میں دوا نہیں کھاؤں گی... میرا
پاس آکر بیٹھو... اپنی بیٹی کے پاس۔
مرزا: (جنم بڑھو کر) مگر میرے رہنے سے تو تمہارا مرض اور
بڑھ جائے گا۔

فیروزہ: آج اور نہ بڑھے گا۔ آئیے ابا آئیے۔ (مرزا سر ہلنے
بند کر فیروزہ کی پیشانی پر آہستہ آہستہ ہاتھ پھیرنے
لگتا ہے) ابا۔ میں خوب چلا چلا کرتا تھا کوئی
آپ ناراض تو نہ ہوں گے؟

مرزا: بولو، بیٹی بولو، ضرور بولو!
فیروزہ: آپ پورب کی کھڑکی کھولنے کیوں نہیں دیتے؟
مرزا: (دفعۃً بھڑک اٹھتا ہے) وہ مردود۔ باجی بد معاش
بند!۔ لیکن بیٹی، تو اچھی تو ہو۔ اگر وہ اس بار
بی۔ اے۔ پاس کرے تو موتیوں کا یہ ہار اس کے
گلے میں ضرور ڈال دوں گا، یہ میں پہلے بھی کہہ چکا
ہوں۔

فیروزہ: لیکن ابا، میں اچھی ہونے سے رہی۔
مرزا: (کانپ جاتا ہے) نہیں بیٹی، میری بوند اور باجی

گدروں کی — پادرب کی کھڑکی کی طرف سے — تم
اپنی کھڑکی کی جھلملی کھلی رکھنا!
حبیب: لیکن تمہارے گھر کی کھڑکی تو بند ہے
فیروزہ: میں جاؤں گی تو وہ خود بخود کھل جائے گی۔
حبیب: تو پھر میں چلا...
فیروزہ: جاؤ — مگر میرے گھر کی کھڑکی پر جو جھلملی ہے
اس کے نیچے وہی الوداعی گیت ایک بار پھر
سناتے جاؤ...
حبیب: (گاتلے) — آہستہ آہستہ اس کی آواز فضا میں
ٹوب جاتی ہے)

ہوتی میری الفت کی مالا فوروہ
جلی جا رہی ہوں کہاں ابدیدہ
کسے ڈھونڈتی ندی کے کنارے
بتاؤ کہاں نقش پا ہیں تمہارے
خدا جانے، مجھ کو یہ کیا ہو گیا ہے
میرا درد ملا میں گوندھا ہوا ہے
دھڑکن سے جو بتیاں ٹوٹتی ہیں
”نہیں ہے یہاں اب کئی بولی ہیں
جو برصا کی آگنی ہے تار پٹ ہیں ڈول
اسی آگ سے میں بھی ہو جاؤں کنگن
پکاروں میں اس پار تم کو مجھ
صدا دہم اُس پار سے آگئے ہوں

فیروزہ: اتنی، اتنی، میرا دل بیٹھا جاتا ہے۔ ذرا مجھے سنبھال کر
بٹھائیے — آبا آپ جالیے، خدا کے لئے جالیے...
اتنی اتنی ساری بتیاں کہاں سے جل اٹھیں! —
(خوش آجاتا ہے)

حبیب: کچھ سنتے ہیں آپ! — جلدی کیجئے ذرا ڈاکٹر کو بلا لائیے۔
میں آپ کے قدم چھوتی ہوں — میری بیٹی، میری گڑیا،
میری فیروزہ!

مرزا: فیروزہ بیٹی لوٹ آ بیٹی، ہوش میں آجا — میں حبیب کو
بلانے جاتا ہوں۔ (جلدی سے باہر نکل جاتا ہے)

ہو جائے گی۔ ابھی ڈاکٹر کو لے آتا ہوں۔
فیروزہ: اوں ہوں، — کبھی ابھی نہ ہو سکوں گی۔ اچھا ابنا
اسے اس گھر میں آنے کیوں نہیں دیتے؟
(دھنستہ مرزا بستر سے اٹھ بیٹھتا ہے اور چلاتا ہے) میں
اس کا خون کر ڈالوں گا — شیطان نے میری بیٹی کو
مار ڈالا ہے۔

[اسی اثناء میں باہر دروازہ پر دستک ہوتی ہے]
حبیب: میں آگیا — میرا خون کر ڈالئے — اتنی، دروازہ
کھولو، دروازہ... ..

مرزا: خبردار جو کسی نے دروازہ کھولا — بھاگ یہاں سے
مردود، پا جی!
حبیب: امتحان کے نتیجے شائع ہو گئے ہیں!
مرزا: تو نے پاس کیا ہے؟

حبیب: معلوم نہیں — تار بھیجا ہے۔ خبر آئی رہی ہوگی۔
مرزا: جھوٹا مکتوب! پہلے خبر آجائے تو پھر آتا۔ ابھی دور رہو
یہاں سے۔ فیروزہ کی بیماری اور خطرناک ہو جائے گی۔
حبیب: جج، آپ میرا خون کر بس گئے نا — مجھے قتل کر دیجئے،
مگر دروازہ کھولئے۔

حبیب: آنے بھی دو — تم پر تو ہر وقت جلال چڑھا رہتا ہے۔
مرزا: تم چپ رہو — اس کی شرارت تم کیا سمجھو۔
ہو نہ ہو پولیس ساتھ لے کر آیا ہو گا۔ مجھ سے کہلاتا
چاہتا ہے کہ میں اس کا خون کرنا چاہتا ہوں — سنئے
کان کھول کر! میں نے تیرے خون کرنے کی دھمکی کبھی
نہیں دی۔ تو بھلا مانس ہے تو چپ چاپ اپنے گھر
لوٹ جا... ..

فیروزہ: اپنی رسوائی کے کیل درپے ہو! تم جاؤ — جاؤ خدا
کے لئے — مجھے تم مل گئے ہو۔

حبیب: میں تمہیں مل گیا ہوں!
فیروزہ: ہاں میں نے تمہیں پایا ہے۔
حبیب: لیکن میں نے تو کچھ نہیں پایا۔
فیروزہ: کل پا جاؤ گے — میں آج تمہاری ہی راہ سے ہو کر

(دوسرا منظر)

[عالم خواب - ساتویں تاریخ کی کشتی ہلال پر حبیب اور فیروزہ آس پاس بیٹھے نظر آتے ہیں۔ کشتی ہلال سے ایدر سفید کا پردہ بندھا ہوا ہے۔ ایک سرخاب کشتی ہلال کو قضاے ملکوتی میں ہولے ہولے کھینچ رہا ہے۔ چکور اور چکوریوں کے پرے منزلار ہے ہیں۔ سارے آسمان پر جنیبل کے سفید سفید بھول کھل اٹھے ہیں۔ درد سے حبیب کے چہرے پر مورے بکھی روشنی ناچ رہی ہے]

فیروزہ : ہم کہاں ہیں حبیب؟

حبیب : رہتے ہوئے (لا حول ولا اید) یہاں کسی کو نام لے کر نہیں پکارتے۔ یہاں جو آتا ہے، وہ اپنا نام نشان چھوڑ کر آتا ہے۔ سمت و جہت سے بے نیاز ہو کر آتا ہے۔ یہاں نہ تو کوئی حبیب آ سکتا ہے نہ کوئی فیروزہ۔

فیروزہ : یہاں ہم جو آئے ہیں۔

حبیب : ذرا اس چاندنی کی آرسی میں اپنا چہرہ غور سے دیکھو!

فیروزہ : (ہٹکا بٹکا ہو کر) یہ کیا ہوا؟ میرا چہرہ تو پہچانا نہیں جاتا میں کون ہوں؟

حبیب : (ہنستا ہے) تم کیا نظر آتی ہو؟

فیروزہ : میرے چہرے میں بہت ساری صورتیں دکھائی دیتی ہیں، جیسے شکنتلا، مالو بیکار کی صورت، مہاشنا، جیسے تیلی کی صورت — جیسے شیریں کی صورت۔

حبیب : بالکل ٹھیک ہے، تمہارے چہرے میں آج دنیا کی تمام برائی کی ماری عورتیں جمع ہو گئی ہیں — یہاں جو آتا ہے، وہ حبیب ہو کر آتا ہے یا "محبوب"۔

بن کر۔ اس دنیا میں مرد یا عورت نام کی کوئی چیز نہیں ہوتی، کوئی پہچان نہیں۔ یہاں کی پہچان "حبیب" ہے یا "محبوب"۔ یہاں ہر شخص یوں ہی پکارا جاتا ہے۔

(فیروزہ شرم سے ہبک اٹھتی ہے۔ چاند کے چاروں طرف دھنک کے ساتوں آسمان پر دفعہ پھیل جاتے

(ہیں)

فیروزہ : چپ، چکور، چکوریاں نہ سن لیں۔

حبیب : سننے دو۔ اس دنیا میں ہم نے محبت کی جو باتیں سیکھیں ہیں کی تمہیں، وہ یہاں پہنچ کر تھمک بن گئی ہیں۔ دیکھی نہیں ہو، اس بساط نیلگوں پر یہ جو آن گنت تارے نمودار ہیں، یہ جو چکور چکوریاں تارے کاٹ رہی ہیں، اپنی سرگوشیوں کو سننے کے لئے تو بے تاب ہیں۔

فیروزہ : یہ کون سا دلیں ہے، محبوب، (چاند ڈولنے لگتا ہے) حبیب : دیکھا، چاند کیسے جھکولے کھا رہا ہے۔ تمہارے محبوب کہنے سے۔ اس لفظ سے اس پر نشہ سا طاری ہو گیا ہے۔ یہ عالم خواب ہے۔

فیروزہ : یہ عالم خواب ہے! خواب تو ٹوٹ جائے گا۔ پھر میں تم سے بچھڑ جاؤں گی؟

حبیب : بچھڑا بھی سکتی ہو اور نہیں بھی۔ میں ٹھیک ٹھیک کچھ نہیں بتا سکتا۔ البتہ یہ عالم خواب عارضی ہے۔ اسی لئے یہ اس قدر دلکش ہے، نہیں نہیں یہ عالم خواب لازوال ہے، یہ اراٹوں کی حسین و جمیل دنیا ہے، اسے موت کا سایہ چھو بھی نہیں سکتا۔ اس کی کوئی انتہا نہیں۔ نہ حد اس کے پیچھے نہ حد سامنے۔

فیروزہ : تو دل میں دوسرے سا کیوں پیدا ہوتا ہے؟ یہ خواب ابھی پریشان ہو جائے گا، اسی لئے تو؟

حبیب : یہ ختم ہو جانے کا ڈر، یہ گم ہو جانے کا اندیشہ اسی لئے یہ دنیا اتنی من موہنی اور مدھر ہے اسی لئے تو ہم ایک دوسرے کو مضبوطی سے پکڑے ہوئے ہیں۔ پلک جھپکتے ہی یہ خواب درہم برہم ہو جائے گا، اسی لئے تو ہم پلک جھپکاتے بغیر ایک دوسرے کو تھمتے ہیں۔ گم ہونے کے خوف ہی سے تو یہ ستارے، سیارے، چاند اور سورج باہم مربوط ہو کر رقص کرتے ہیں۔ وہ اپنی آنکھیں بند نہیں کرتے۔

فیروزہ: تو کیا یہ بہشت ہے؟

حبیب: ہاں، یہی بہشت ہے

فیروزہ: تو پھر دوسرے بہشتی لوگ کہاں ہیں؟

حبیب: شیریں، لیلیٰ، زلیخا۔۔۔ فریاد، مجنوں۔۔۔

حبیب: ذرا میرے چہرے کی طرف غور سے دیکھو۔

فیروزہ: (ڈر کر حبیب سے لپٹ جاتی ہے) ارے کیا؟

تہارا چہرہ تو پہچانا بھی نہیں جاتا۔ اس میں وہ

تمام مرد نظر آ رہے ہیں جو ازل سے گریہ کناں

ہیں۔

حبیب: رہنس کر اور فیروزہ کی پیشانی کو اٹھکی سے چھونے لگے

ڈرنے کی کوئی بات نہیں جانم! ایک مرتبہ پھر

میرے چہرے کو دیکھو۔ تم جس کو دیکھنا چاہو گی

وہی نظر آئے گا۔

فیروزہ: (غور سے دیکھتی اور اطمینان کا سانس لیتی ہے)

اچھا، مگر بہشت کے حور و غلمان کہاں ہیں؟

حبیب: وہ بھی سب یہیں ہیں۔ تم دل میں خیال کر دو گی تو

فوراً سامنے آجائیں گے۔ یہاں ہر کام نیت سے

ہوتا ہے۔

فیروزہ: وہ سب ہمارے ہی اندر ہیں؟

حبیب: ہاں نہیں۔ اسی بہشت میں۔۔۔ مرنے والے

مرد، اور عورت۔ ہم اور تم۔ ازل سے

آسمان سے سامنے بیٹھے ہیں۔ بغیر ایک دوسرے کے

ہوئے۔۔۔ پلک چمکنے ہی سے یہ دنیا اوجھل

ہو جاتی ہے۔ اگر آنکھ جھپکی تو حسن و سحر کا

یہ عالم تباہ ہو جائے گا، گم ہو جائے گا۔

اور ہم تم۔

فیروزہ: (حبیب سے لپٹ جاتی ہے) میرے محبوب!

[چاند ڈولنے لگتا ہے۔ چکوری چکوریاں تیزی

سے محو پرواز ہیں۔ حبیب اور فیروزہ دھیرے

دھیرے چاند کے ساتھ ہچکولے کھاتے ہوئے

فضائے بیسٹ میں محروم ہوتے چلے جاتے ہیں۔]

تیسرا منظر

[مرزا کی کوٹھی۔ فیروزہ پلنگ پر بے ہوش پڑی

ہے۔ کمرے میں ڈاکٹر، حلیمہ بیگم اور مرزا نظر آتے

ہیں۔ صبح کے آثار نمودار ہو چکے ہیں۔ آسمان اب

تک ابر آلود ہے۔ کسی پرندے کی آواز فضا کا

سینہ چاک کرتی، موتی دور تک چلی جاتی ہے۔

لائٹن کی روشنی کچلا چلی ہے۔ حلیمہ بیگم بار بار پتو

سے اپنی آنکھیں پونچھتی ہے اور فیروزہ کے چہرے

کی طرف غمگین نظروں سے دیکھتی ہے۔ مرزا بے قرار

میں کبھی ٹہلتا اور کبھی ٹانگتا ہے۔ دفتہ پورب کی

کھڑکی پورے طور پر کھول دیتا ہے۔ حبیب کا گھر

قبر کی خاموشی میں لپٹا ہوا نظر آتا ہے۔ حبیب کے کمرے

کی کھڑکی بند ہے۔ البتہ اس کی جھلملی کھلی ہوئی ہے

جھلملی میں سے بچھتے ہوئے چراغ کی زرد، اداس روشنی

خشک آنسوؤں کی طرح چمکتی ہے۔ اندر اور کچھ نظر نہیں

آتا۔ ڈاکٹر بار بار فیروزہ کی نبض ٹٹولتا ہے۔ آخر میں ڈاکٹر

اس کے ہاتھ میں ایک سوئی لگا لے کر اور خاموشی سے

آنکھیں پونچھتا باہر چلا جاتا ہے]

(حلیمہ دفتہ پورب کا کھڑکی پر گرتی ہے)

حلیمہ بیگم: بیٹی، میری فیروزہ، واپس آجا، تو واپس آگئی۔ میری

جان، میری روح۔

مرزا: فیروزہ بیٹی، میں اسے ڈھونڈنے جا رہا ہوں۔ خدا یا،

اس بار تو مجھے معاف کر دے! میں تیرا فضا سمجھ گیا ہوں۔

حلیمہ، میری بیٹی کو سنبھالے رکھنا۔ میں حبیب کو تلاش

کر کے لاتا ہوں۔ (طوفان کی تیزی سے باہر چلا جاتا ہے)

فیروزہ: اُمی، بہت روتی ہوتا؟ وہ کیا! پورب کی کھڑکی کس

نے کھولی؟

(حلیمہ بیگم بیٹی کی پیشانی چومتی ہے)

حلیمہ بیگم: تمہارے ابا نے کھولی ہے۔

فیروزہ: ابا کو ذرا بلا دو۔

حلیہ بیگم: وہ تو حبیب کو لانے گئے ہیں۔ آج تم دونوں کی شادی ہے نا (اداس ہنسی ہنستی ہے)

فیروزہ: (چٹکیلی مسکراہٹ کے ساتھ) امی، تم آبا کو بہت چاہتی ہو نا؟

حلیہ بیگم: (منہ ہنستی ہوئی) آج پہلی بار (منہ پھیر لیتی ہے)

(فیروزہ مال کا ہاتھ چومتی ہے)

فیروزہ: بد معاش کہیں کی۔ تب تو سمجھو آپ کی شادی بھی آج ہی ہوئی ہے! تو میں تمہاری کیا ہوئی؟

حلیہ بیگم: تو ہماری بیٹی ہے، لاڈ ہے، اور کیا؟

فیروزہ: (اچانک اٹھ بیٹھتی ہے اور حبیب کی جھلکی کی طرف گھورنے لگتی ہے) امی، امی، وہ کھڑکی کیوں بند ہے؟

حلیہ بیگم: روٹھا ہوا تھا۔ نہ جانے رات کو کہاں چلا گیا ہے۔ جلے گا کہاں؟ آتا ہی ہوگا۔ تمہارے آبا اس کے بغیر واپس نہیں آئیں گے۔

فیروزہ: (مرغ بسل کی طرح بستر پر لوٹنے لگتی ہے) امی، اب

وہ نہ لوٹے گا۔ میرا خواب سچا ہے۔ اس کے آنسو

ڈوبتے ہوئے چاند کی آنکھوں میں تیر رہے ہیں۔

امی، امی۔ یہ کیا ہے.... یہ کون کا رہا ہے....

[دور فضا میں حبیب کے گانے کی خم انگیز آواز آتی ہے]

اے میرے محبوب! تو میرے حافظ کی دوسری طرف جلوہ گر ہے۔

میں تجھے شاید پہچانتی ہوں۔

میں تیرے چاند سے آشنا ہوں، تو میرے ستارے کو جانتا ہے۔

اس جلن پہچان کی وجہ سے میں تارہ بن کر جاگتی ہوں اور بار بار

چمک کر فضا میں کھوجاتی ہوں۔ میں پکولہ بوسے چراغ جلائے

تیری راہ دیکھ رہی ہوں۔

اے میرے محبوب، اپنی کھڑکی کی جھلکی بٹھا دے۔ چراغ بجھتا ہے

اسے بھجھا دینا ہی اچھا ہے۔

نئے تاروں کے ساتھی پکارتے ہیں! اے میرے محبوب، میرے دن،

میری راتیں وہی گیت سن کر کیوں روتی ہیں؟

فیروزہ: امی، امی۔ چاند کے اس پار یہ گیت سنائی دیتا

ہے۔ یہ گیت عالم خواب کا گیت ہے۔

وہ عالم خواب کا گیت ہے۔ امی، امی، امی!

حلیہ بیگم: حبیب، حبیب۔ میرے بیٹے، دوڑ کر آ جا۔

تیری فیروزہ کی رخصتی کی گھڑی آچکی ہے۔ بیٹی،

میری بیٹی (تڑپتی اور لوٹتی ہے)

(زوروں سے دروازہ پر دستک ہوتی ہے)

حبیب: مرزا صاحب، دروازہ کھولئے۔ تار آ گیا ہے میں

پاس ہو گیا ہوں!۔ دروازہ کھولئے۔ (دروازہ

پر اتنے زور سے ٹکراتا ہے کہ وہ ٹوٹ جاتا ہے)

امی، امی، فیروزہ کہاں ہے میں پاس ہو گیا ہوں

دیکھو یہ تارا امتیاز کے ساتھ پاس ہوا ہوں۔

حلیہ بیگم: حبیب، حبیب، دیر ہو گئی بیٹے، فیروزہ کی رخصتی

تو ہو بھی چکی!

حبیب: (گلوگہ آواز میں) رخصتی!۔ ہو چکی!

حلیہ بیگم: ہو چکی بیٹے، اس پورب کی کھڑکی کی طرف سے۔ تو

اب میں کھڑکی کی جھلکی کھولنے دیتی ہوں۔

حبیب: امی، امی۔ میں اسے ڈھونڈنے جاتا ہوں۔

اس ڈوبتے ہوئے چاند کی آنکھوں میں اس کا اشارہ

صاف لہر رہا ہے۔ فیروزہ!۔ فیروزہ!

(جھک کر کھڑکی کی تیزی سے دوڑ کر نکل جاتا ہے)

ہماری موسیقی

فنِ نغمہ کی تاریخ - اور اس کے فلسفہ پر سیر حاصل نظر

مرتبہ: رفیق خاورد

نئے موضوعات کا اضافہ

پاکستانی موسیقی کے موجودہ مسائل

ساز و آہنگ کی دنیا میں مسلمانوں کا عظیم حصہ

مسلمان فنکاروں کے اعجازاتِ موسیقی، تمدن و تاریخ انسانی میں نغمہ و آہنگ نے کیا کردار ادا کیا

چند موضوعات

مشاہیرِ موسیقی: امیر خسرو سلطان حسین شرقی، میاں تان سین، شاہ عبداللطیف بھٹائی، تان بس خاں، سیت خاں، فیروز خان

تاریخِ موسیقی: موسیقی اور تمدن، عالمِ موسیقی میں مسلمانوں کا حصہ، پاکستانی موسیقی، ہماری موسیقی کے ساز

پاکستانی موسیقی: مشرقی پاکستان کے لوگ گیت، راگ درپن (وارث شاہ)

مسائلِ موسیقی: تجدیدِ موسیقی، قومی ترانے کی موسیقی اور سرگم، ہماری موسیقی کے مسائل، سرنولسی۔

چند ممتاز اصحابِ قلم

سید عابد علی عابد، جناب شاہد احمد دہلوی، جناب خادم محمد الدین، ناظمی

احمد میاں اختر، خواجہ کریم، ڈاکٹر بی بخش خاں بلوچ، فیروز نظامی، سید طیبہ آغا،

سجاد سرتود نیازی، احمد جی، چھاگلا - سید امجد علی، عاصمہ حسین، امین الرحمن،

رفیق غزنوی اور ماہم آذوری۔

کتاب میں مختلف سازوں کی آرٹ پیس پر بھی ہوئی آٹھ

صفحے کی نفیس تصاویر بھی شامل ہیں - کتاب

نفیس اردو ٹائپ میں نہایت دیدہ زیب اور خوبصورت

سرورق کے ساتھ شائع کی گئی ہے۔

قیمت صرف پانچ روپے

ادارہ مطبوعات پاکستان پوسٹ بکس ۸۳ کراچی

”تن کے سونے شہر میں باہو...“

سلمان باہو رح
ترجمہ: سرور مجاز

علم ہدایت سے خالی ہوں ایسے ہادی چھوٹے ہو
مردیکہ حق حاصل ہو تو پھر کیا موت کے کٹکے ہو
پیر ملے پیر پیر نہ جائے ایسے پیر نہکتے ہو
وہ مرشد بھی کیسا باہو جو ارشاد نہ بخشے ہو

بات پڑھنے والا باہو فاضل ہو گا کیسے ہو
جس نے لفظ حقیقت پایا بخت اسی کے اپنے ہو
نیت افلاک کریں جگ روشن پھر بھی ظلمت ناپے ہو
ہو حق کی تبدیل نہیں تو سانسے علم میں قیصے ہو
تن کے سونے شہر میں باہو دل ہے ایک محلہ ہو
ہونے دل میں بس کر میری کی ہے خوب تسلی ہو
سب کچھ میں سنتا ہوں باہو ایک سوائے اللہ ہو
بے دردوں کی دنیا باہو پھیروں کا ہے گلہ ہو

جیتے جی مر رہنا ہو تو سنگ فقیراں رہے ہو
گر کوئی کالی طعنہ دے تو اس کو جی جی کہے ہو
کوڑا کرکٹ پھینکے کوئی کوڑا بن کر رہے ہو
یا ر کی خاطر اس دنیا میں سب کچھ باہو رہے ہو

کیا بغداد کی باتیں باہو کتنے جس کے کلیاں ہو
میرے تن پر کپڑے جیسے درزی کٹے لیراں ہو
ان ییروں کی کفنی پہنوں جاؤں سنگ فقیراں ہو
پھر بغداد کے شہر میں مانگوں بولوں میراں ہو

پڑھ پڑھ علم دکھائے سب کو کیا تیری دانائی ہو
دودھ اگر پھٹ جائے باہو کیا آئے بالائی ہو
سونا ہاتھ میں لیکر باہو ہاتھ نہ بدلے راٹی ہو
ٹوٹے دل جو راضی کرے اس نے منزل پائی ہو
ملاحفظ کریں تکبر لوگ بچارے سیدھے ہو
بغلوں میں یہ داب کتابیں چھانیں گلیاں کوچے ہو
دعوت دکھیں جہاں مرغن وہیں لگائیں ڈیمے ہو
بیچ کائی کھائیں باہو دو جگ کے ٹھکرائے ہو

پڑھ پڑھ علم کتابوں والا عالم ہو گئے سارے ہو
عشق کا لفظ نہ جانیں باہو لوگ بڑے بے چارے ہو
ایک نگاہ سے عاشق دیکھے لاکھ کر ڈستارے ہو
لاکھ نگاہ سے دنیا دیکھے دنیا پھر بھی مارے ہو

سانول

خواجہ غلام فرید بہاولپوری
مترجمہ، حشمت فضل

اوسانوریا جلدی آجا منوا تجھے بلائے
چاروناک چاندنی جو بن یونہی بیت نہ جانے
مکھڑا ایسا سند جس کو دیکھ کے من لپٹائے
اوسانوریا جلدی آجا منوا تجھے بلائے
او کو لکھا کوک نہ اتنی ترپے مورا منوا
میں جل جل کر اکھ بھی ہوں یاد آئے سا جوا
ہے پردیس میں مورا پر تیم کیوں مجھ کو ترپائے
اوسانوریا جلدی آجا منوا تجھے بلائے
تجھ سے پریت لگا کر پائی اشکوں کی سوغا
پریم بہت مشکل تھا لیکن پھر بھی نبھایا سات
پریم کی غنمی ہم سے نہ سلجی ہم نے کشت اٹھائے
اوسانوریا جلدی آجا منوا تجھے بلائے
چلتے چلتے ہار گئی ہوں ٹوٹے ہاتھ اور پاؤں
راہ دشمن ہے، درد ہے منزل کیسے تجھ تک آؤں
تیرا پریم ہی سب کچھ میرا، کپڑے، زیور، پھلے
اوسانوریا جلدی آجا منوا تجھے بلائے
تیری کارن پلک پلک پر میں نے دیپ چلائے
چنچل چال کے دکھڑن کو میں تیرے ہی ہوں ٹائے
ساجن تیری راہ میں ٹٹھی ہوں میں نین بچائے
اوسانوریا جلدی آجا منوا تجھے بلائے
جادو گر ہیں تیرے چنچل مشغ، کیٹیلے نین
گھنکر والے بال میں ظالم من کو کس بے چین

اترا ترے کنارے...

(وادئی سندھ میں عربوں کی آمد)

عبداللہ شہید خان

اد پر کھول دیئے مسلمان سیاحوں کو لوازمات سفر کی بھی چندل ضرورت نہ پیش آتی تھی۔ ان کے ٹھہرنے کے لئے مساجد موجود تھیں اور کھانا نے جابجا سرائیں بھی بنا دی تھیں۔

مسلمانوں کی حکومت کا پرچم اگر ایک طرف اطلالنگ کے ساحلوں سے الگ تھلگ چین تک ہزار ہا تھا تو دوسری طرف بحیرہ کیپسین سے سندھ تک مسلمان پہنچ چکے تھے۔ ساتویں صدی سے چودھویں صدی تک مسلمان تجارت، حکومت اور سیاحت کے میدانوں میں آگے ہی بڑھتے چلے گئے۔ علم و حکمت اور تحقیق و ثقافت کی حدود بھی ان کی جولا لگا ہیں تھیں۔ تاریخ و جغرافیہ، ہیئت و نقشہ ساز، مصنوعات و نوادیر — غرض علم اشیا کی جہان بینی میں مسلمان اُس وقت کی تمام اقوام عالم سے بڑھ چکے تھے کیونکہ علم و دانش کے پرانے سونے اس وقت ہر جگہ سوکھ چکے تھے۔ "سلسلۃ النوار" ابو زید کے حاشی، "کتاب المسالک"، "کتاب البلدان"، "تاریخ البلدان" اور یعقوبی، قزوینی، ابوالفدا کی تالیفات کی اہمیت سے آج کون علم دوست منکر ہو سکتا ہے۔

اگر ہم اس بزرگوار تاریخ پر ہی غور کریں تو کئی اہم باتیں معلومات میں اضافہ کرتی ہیں۔ اہل بطوطہ کا احاطہ، الغری کی "مسالک الابصار" اور قلقشنڈی کی تحریریں جس قدر مکمل واضح اور محکم حالات و کوائف کی پردہ کشائی کرتی ہیں ان کا ذکر کئے بغیر نہیں رہا جاسکتا۔

بہر کیف، میں یہاں سندھ پر عرب تسلط کی کہانی مختصر بیان کرتا ہوں۔ یہاں حرب کوئی دو سو سال تک جھک رہا ہے اور اپنی تہذیب کے امنٹ نشان چھوڑ گئے۔ اس کے بعد ایک وقت ایسا آیا کہ یہاں ہندو حکمرانوں کا پھر تسلط ہو گیا۔

اسلام کی فتوحات کے ساتھ مسلمانوں میں ذوق سفر کو بھی ترقی ہوئی اور ان کی فہم و طلبیت نے بھی ان کا بڑا ساتھ دیا۔ ماضی میں بہت سی قومیں پانی سے ڈرتی تھیں، بہتوں کے نزدیک سمندر پار جانا پاپ تھا، مگر مسلمانوں نے سیر و طلمات تک میں اپنے گھوڑے دوڑا دیئے تھے اور جس سرزمین پر پہنچ جاتے تھے اپنے پیچے کشتیاں جلا ڈالتے تھے۔ اس کی وجہ ان کی ہمت عالی تو تھی ہی مگر ایک فرمان خدا وندی بھی تھا — سیر و فی الارض۔ مسلمانوں نے لفظاً و معنیاً اس پر عمل کیا اور دنیا کو دیکھنے، جاننے اور دریافت نو کے مرحلے سر کرنے میں وہ حیرت انگیز طرہ پر تک پہنچ گئے حالانکہ سفر کی صعوبتیں اور دشواریاں، جوان کو پیش آتی تھیں وہ اس قدر ہمت شکن تھیں کہ دنیا میں قدم اس طرح کی جرأت کرنے میں ناکام رہی تھی۔ مسلمانوں نے تجارت و سیاست، حکومت و سروری کے ڈانڈے علم و حکمت سے طار کھے تھے اور ان دونوں میدانوں میں ان کا ترقی پسند قدم آگے ہی بڑھتا جاتا تھا۔ آج ان کے سفری کارناموں کی داستان سنو اور تاریخ و جغرافیہ کے میدانوں میں ان کی علمی و تحقیقی کاموں کی کہانی کو دہراؤ تو عقل و دنگ نہ جاتی ہے جوں جوں حکومت کی حدیں آگے بڑھیں، دھند نزدیک کے ہمایوں سے پہچان بھی بڑھی۔ پٹنہ، ملنگ کے حالات، جاننے کے لئے لوگ پھیلنے ہی چلے گئے۔ کس کو علمی جستجو تھی، کس کو زور کا شوق، کسی کو عقائد و لباس و اطوار ریت جاننے کی دھن تھی تو کسی کو نہایت جمع کرنے کا ذوق۔ سچ نے مسلمانوں کو ہوسل ایک مرکزی مقام پر جمع ہونے کا حکم دیا تھا، اس کی عملی حکمت اب روشن ہو رہی تھی۔ فرمان نبویؐ یہ تھا کہ علم کی تلاش میں جاؤ اگر وہ دور چین ہی میں کیوں نہ ہو۔ مسلمانوں نے ان باتوں کو گروہا بانڈھا اور عمل کے ذریعے دین و دنیا کی دولتوں کے دروازے کھلے

مسلمانوں کے شہر اور قلعے ان کے ہاتھ سے نکل گئے اور قلعہ سندھ میں بہت سی خود مختار ریاستیں قائم ہو گئیں۔ اسی دور میں فاطمی داعیوں کے گروہ ادھر آنے شروع ہوئے اور مسلمانوں کے عروج کی داستان پھر سنائی دی۔ ۹۷۷ء میں انہوں نے ملتان پر قبضہ کر لیا اور عربوں کا شہر منصورہ جو ہمارے ہاتھ سے نکل گیا تھا ۹۸۵ء میں اسما حیلیوں کے قبضہ میں آ گیا۔

اس تمام دور میں سندھ کا تعلق باہر کی اسلامی دنیا سے بھی برقرار رہا۔ ایک طرف ہندوستان سے باہر کے اسلامی ممالک کے ساتھ اور دوسری طرف خود اس برصغیر کے ساتھ۔ یہ دور علمی و ثقافتی روشنی کا بھی دور تھا اور سندھ کے علماء، شعراء اور صوفیا کا شہر دمشق و بغداد تک پہنچا تھا۔ عرب مؤرخوں اور جغرافیہ نویسوں نے آج سے ۸۰۰ سال پہلے کے سندھ کا جو حال اپنی تحریروں میں بیان کیا ہے وہ داستان ایک سہری داستان دینے پر حیرت کہ عربوں کی بہت سی مادی نشانیاں مرور آیام اور حادثہ فطرت بالخصوص دریائے سندھ کی طوفانی خیز لہروں نے ختم کر دی ہیں مگر جدید عالم پر عربوں کی تہذیب و تمدن کے جو نشان ہیں وہ انمٹ اور جاودانی ہیں۔

جس وقت عربوں نے سندھ کی سر زمین پر قدم رکھا یہاں کا سب سے بڑا شہر برہمن آباد (البیرونی کے مطابق برہمن) تھا، مگر سیاسی و فوجی مصالحوں کی بنا پر عربوں نے اپنے بھی کئی شہر بسائے جیسے منصورہ اور محفوظہ۔ محفوظہ دریائے سندھ کے اُس پار تھا اور منصورہ ساحل سمندر کے قریب برہمن آباد سے کوئی ۲۰ فرسخ کے فاصلہ پر عربوں نے ہی دریائے سندھ کو مہراں کا نام دیا۔ اسی کی ایک شاخ منصورہ کے گردا گرد بہتی تھی۔ ابن حوقل کے بیان کے مطابق یہاں دریا بجیرہ عرب میں آ کر گرتا ہے منصورہ اس کے پاس تھا۔ ابوالفضل اسے پرانے بکھرے تعمیر کرتا ہے۔ بعد میں یہ منصورہ ہی عربوں کے قبائلی حکمرانوں کا صدر مقام بنا اور دارالامین کے نام سے موسوم ہوا۔ یہ شہر تقریباً ایک مربع میل کو محیط تھا۔ آب و ہوا اُن کی طرح اُس وقت بھی گرم تھی۔ حالات لکھنے والوں نے بتایا ہے کہ یہاں کھجور اور نیشکر بڑی کثرت سے موجود ہیں۔ عرب

سیاح کہتے ہیں کہ ہم نے یہاں صرف ایک ہی پھل پیدا ہوتے دیکھا جسے لوگ لیموں کہتے ہیں۔ یہ سیب کی برابر ہوتا ہے، بڑا کھٹا اور ایک پھل ہوتا ہے خوش ذائقہ، جسے امواج (آنبہ) کہتے ہیں۔ یہ پھل کثیر اور سستے تھے۔ بعض عرب سیاح کہتے ہیں منصورہ خلفائے عباسیہ کے چشم و چراغ المنصور کے زمانہ میں بناتھا۔ مگر تاریخی حقیقت یہ ہے کہ یہ شہر عباسیوں سے بہت پہلے امویوں کے عہد میں تعمیر ہو چکا تھا۔ ابن حوقل نے بھی اس کی پائش ایک میل لمبی اور ایک میل چوڑی بتائی ہے۔ بشری کے نزدیک منصورہ مرکزی شہر ہے، سندھ کا دار الحکومت ہے اور دمشق کی مثال ہے۔ مکانات لکڑی اور مٹی کے بنے ہوئے ہیں۔ جامع مسجد اینٹوں اور پتھروں کی ہے۔ اور کافی وسیع ہے۔ شہر کے چار بڑے دروازے ہیں۔ عمارات ٹانگوں، پتھر اور مٹی کی ہیں۔ ان پر پلستر بھی ہے۔ بہت بارونی شہر ہے۔ نرجت و سیر کی جگہ ہے۔ کوچہ و بازار لوگوں سے بھرے رہتے ہیں۔ اور ہر طرح کا مال سامان فروخت کے لئے موجود رہتا ہے۔ کم رتبہ لوگ ایرانی لباس پہنتے ہیں مگر امرا بھاری مرصع حجابیں استعمال کرتے ہیں۔ نیرشلواریں اور کرتے بھی۔ بال بے رکھتے ہیں۔ سونے اور تانبے کے کتے چلتے ہیں۔ تاناری سکتے بھی رواں ہے۔ درہم (دینار) کا وزن عام درہم سے پانچ گنا زیادہ ہے پھل بہتات سے ہے۔ گوشت زرا ہے، بیرونی اور مقامی پھلوں کی کثرت ہے۔ منصورہ کا بیان ہے کہ منصورہ کی حکمرانی میں تین ہزار دیہات اور گاؤں ہیں۔ حاکم کے پاس ۴۰ ہزار فوج اور آٹھ ہاتھی بھی ہیں۔ بشری نے لکھا ہے کہ یہاں کے لوگ عام طور پر خوش خلق ہیں۔ علم کا بازار گرم ہے اور بہت سے جید عالم یہاں موجود ہیں لوگ خوش باش چاق و چہرند اور ہنرور ہیں۔ اوصاف حمیدہ سے متصف۔

ایک اور شہر جو آج بھی ہمارا بڑا شہر ہے ملتان تھا۔ خرداد بہ کا کہنا ہے کہ یہ شہر سجستان کے صدر مقام زہد سے کوئی دواہ کی مسافت پر واقع ہے۔ یہ بھی منصورہ کی برابر بڑا ہے اور اسے "مدینۃ الذہب" (سونے کا گھر) بھی کہا جاتا ہے۔ یہ نام بھی عربوں نے دیا تھا کیونکہ جب عربوں نے ملتان فتح کیا تو یہاں انہیں چالیس "بجر" کی برابر

مالک تھا۔ لوگوں کے دستِ خوان پر انواع و اقسام کے کھانے چنے جاتے تھے، یہ ہند کا حقہ مانجا جاتا تھا اور ایک دریا کے کنارے بنا ہوا تھا جو سمندر کے مقام پر مہراں سے آکر مل جاتا تھا۔ ملتان سے منقرہ ملک کے علاقے میں ایک قوم آباد تھی جو نادرہ کہلاتی تھی۔ اس میں بھی کئی قبیلے تھے جو تباران سے مکران اور منقرہ سے ملتان تک پھیلے ہوئے تھے۔ یہ لوگ برہمنی خانہ بدوشوں کی مانند تھے اور عجیب طرح کے گھر بناتے تھے۔ اکثر مہراں کے ارد گرد دلدلوں میں پناہ لیتے تھے۔ ان کے اونٹ بڑے عمدہ ہوتے تھے۔ اس میں ایک قسم "کرہ" کہلاتی تھی جس کے دو کوبان ہوتے تھے اور خراسان کے علاقے میں ان کی بڑی ملک تھی۔ یہ اونٹ خوش خوش ہوتے تھے۔ ان کے علاقے میں اناج بکھش، بھل، اونٹ، میل اور بھیڑ بکثرت موجود تھے۔ اس علاقے کو "علی" کہا جاتا تھا اور وجہ اس کی یہ تھی کہ ایک شخص علی نامی نے اسے فتح کیا تھا اور اسے اپنی ملکیت بنا لیا تھا۔

اب عربوں کے مشہور شہر دیبل کا ذکر کرنا مناسب ہوگا۔ یہ "ہفت اقلیم" کے دوسرے قطع میں واقع تھا۔ "تقریم البلدان" کا مصنف کہتا ہے کہ یہ سندھ کے ساحل پر واقع تھا مگر بڑا گرم شہر تھا۔ اس لئے اس کی آبادی کبھی نہ تھی۔ مہراں کے جانب شرق بنا ہوا تھا اور سامنے سندھ کی کھاری تھی۔ یہ سندھ کی سب سے بڑی اور مشہور بندرگاہ بھی تھی۔ اس لئے کاروبار بہت ترقی پر تھا۔ یہاں سرسوں بہت تھی، کھجور، بقرہ سے منگائی جاتی تھی۔ منقرہ اور دیبل کے درمیان چھوڑ کا سفر تھا۔ "تقریم البلدان" کا مصنف ہی ہمیں یہ بھی بتاتا ہے ہے کہ ایک اور بڑا شہر سدوسان یا سپہوان ہے۔ یہ مہراں کے مغرب میں ہے۔ یہ اس مقام پر بنے جہاں ہفت اقلیم میں سے تیسری اقلیم کا خط گزرتا ہے۔ ابن حوقل لکھتا ہے کہ "یہ بڑی زرخیز جگہ ہے۔ دولت کی افراط ہے۔ بازار بڑے بڑے ہیں اور چاروں طرف بہت سی بڑی بستیاں اور منڈیاں بنی ہوئی ہیں۔"

سودا دستیاب ہوا تھا۔ ایک "بحرہ" کا وزن ۲۲۲ پونڈ (انگریزی) ہوتا تھا۔ ملتان میں سودے کا ایک بہت بڑا بت بھی رکھا ہوا تھا جس کے استخوان پر بڑا قیمتی چڑھاوا چڑھتا رہتا تھا۔ اس بت کو ایک قسم کی سرخ کھال سے ڈھک رکھا تھا اور صرف آنکھیں چھتی رہتی تھیں۔ یہ آنکھیں قیمتی پتھروں کی تھیں۔ سر پر سنہری مکٹ دھرا رہتا تھا۔ یہ بت مربع شکل کا تھا، اس کے چار ہاتھ تھے جو کبھی سے نیچے ہینے ہوئے تھے۔ مندر پر سنہری کلس تھا اور بڑے بڑے مضبوط دروازے تھے۔ ستون بلند اور دیواریں بگیر تھیں۔ پوجنے والوں کے نزدیک ہندو سند میں اس کے مقابلہ کا کوئی قابلِ تکویم صنم نہ تھا۔ اس پاس کے رجاؤں نے جب آپس میں جنگ جہاں کرتے تو اس مندر کے پجاری مل کر عارین کو دھمکاتے کہ اگر انہوں نے ملتان کے اس پاس میں خونریزی کی تو مندر کے بت کو جلال آجائے گا اور تمہیں توڑ پھوڑ کر برباد کر دے گا۔ اکثر یہ دھمکی کارگر ثابت ہوتی تھی اور لڑنے والے باز آجاتے تھے۔ اس وجہ سے لوگوں کے دلوں میں بت کی ہیبت بھی تھی اور عزت بھی کیونکہ وہ اس طرح عوام کو تباہیوں سے بچالیا کرتا تھا۔ ابن خرداد بہ کا کہنا ہے کہ ملتان ایک بہت بڑا شہر ہے۔ چاروں طرف ایک فاصلہ ہے جس کے چار بڑے بھاٹک ہیں۔ کھانے پینے کی چیزیں افراط سے ملتی ہیں اور لوگ مطمئن زندگی بسر کرتے ہیں۔ منقرہ کی طرح یہاں بھی لوگ شہوار پہنتے اور فارسی و سندھی لولتے ہیں۔ اطراف شہر میں ایک نہر بہتی ہے جو آخر کار مہراں میں گرتی ہے۔ شہر سے نصف فرسنگ کے فاصلہ پر ایک قلعہ ہے جہاں حاکم رہتا ہے۔ وہ کبھی ملتان نہیں آتا سوائے نماز جمعہ کے لئے۔ اس وقت وہ ہاتھی پر سوار ہوتا ہے اور اس سے اکثر نمازیوں میں آن ملتا ہے۔ یہاں کا حامل (گورنر) قریش ہے مگر منقرہ کے حاکم کا باجگزار نہیں ہے بلکہ خلیفہ کے نام کا خطبہ پڑھتا ہے۔

عرب مؤرخین نے ایک اور سندھی شہر کا نام لیا ہے۔ اس کا نام سندھور تھا جو ملتان کے جنوب میں تین دن کی فاصلہ پر واقع تھا۔ یہ تجارت کا مرکز تھا اور بڑی دولت و حشمت کا

ابن بطوطہ اپنا سفر کرتا ہوا یکم محرم ۷۴۴ھ (۱۳۴۲ء) کو ہادی سندھ میں پہنچا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ یہ دنیا کا وسیع ترین دامن دریا ہے۔ گرمیوں میں دریا کناروں سے بہہ نکلتا ہے طغیانی فرو ہونے کے بعد لوگ اپنی فصل بوٹے ہیں، یہی حال ہر کہے۔ جس وقت وہ ملتان پہنچا تو مخبروں نے اس کے آنے کی اطلاع امیر شہر کو دی۔ یہاں اس نے گھوڑے، اونٹ، غلام اور دوسری چیزیں خریدیں تاکہ وہی تک لے جا سکے اور دربار سلطان میں پیش کر سکے۔ یہاں دوران سفر سے ایک گینڈے کے دیکھے کا بھی اتفاق ہوا جو درندوں کے نرکوں میں سے نکل آیا تھا، سیاہ، عظیم و عجیب۔ یہاں سے گذر کر ابن بطوطہ جنائی کے مقام پر پہنچا ہے جو آج اورنگ کر کے مابین واقع تھا، گلاب معدوم ہے۔ یہ شہر بھی کافی بڑا اور خوشحال تھا۔ بازار کشادہ اور بارونق تھے۔ یہاں ایک قبیلہ آباد تھا جسے سمر کہتے تھے۔ یہ لوگ یہاں حجاج بن یوسف کے زمانے میں آکر آباد ہوئے تھے۔ یہ لوگ کسی کے ساتھ بیٹھ کر کھانا نہیں کھاتے۔ نہ کسی نے انہیں کھاتے دیکھا ہے۔ یہاں سے ابن بطوطہ سوستان اور سیہوان کی جانب بڑھتا ہے۔ سیہوان کے گرد کوئی نباتات نہیں تھی اور بڑا ویران تھا۔ مگر شہر کافی بڑا تھا۔ یہاں سے صرف ایک ہی پیر نظر آیا کیس کر۔۔۔ دریا کے نزدیک صرف تر بوڑھیا جاتا ہے۔ لوگ جو اور ایک دانہ "موٹنک" کھاتے ہیں۔ اسی کی روٹی بنتی ہے پھلی اور بھینس کا دودھ یہاں بڑی کثرت سے مل جاتا ہے یہاں لوگ ریت میں سے ایک جانور (سقندور) نکالتے ہیں، جو گرگٹ سے مشابہ ہوتا ہے، اور اسے کھا جاتے ہیں۔ گرگٹ کی طرح اس کی دم نہیں ہوتی۔ ابن بطوطہ نے ان کو بول کر زمین کھود کر اسے نکالتے دیکھا تھا۔ یہ اس کا پیٹ چاک کر دینے اور آنتیں نکال کر پھینک دیتے ہیں۔ پھر ایک قسم کی لکڑی جسے "زر دچوب" کہتے ہیں اس کے پیٹ میں بھر دیتے ہیں بجائے زعفران کے....."

سوستان میں ابن بطوطہ کی ملاقات اس شہر کے خطیب سے بھی ہوئی۔ معلوم ہوا کہ حضرت عمر بن عبدالعزیز ۱۷۱ھ سے ۱۹۱ھ کے زمانے سے یہ منصب انہی کے خاندان میں چلا آتا ہے۔ یہاں بغداد کے ایک بزرگ شیخ محمد سے بھی ملاقات ہوئی جن کی عمر اس وقت ۴۰ سال تھی مگر صحت بالکل ٹھیک تھی۔ اس زمانہ

دریائی سفر کس طرح ہوتا تھا اس کا حال ابن بطوطہ کی زبانی سنئے اور اس وقت کے چاروں کا حال بھی معلوم کیجئے۔ لکھتا ہے "فقیر، ملا الملک کے پاس ایک جہاز ہے جسے الاحور کہتے ہیں۔ یہ ایک قسم کی طریدہ کشتی ہے مگر زیادہ بڑا اور چڑا۔ نصف حصہ چوبی کین پر مشتمل ہے جس تک زینہ کے ذریعے پہنچتے ہیں۔ اوپر ایک خاص بلند نشست خود امیر کے بیٹھنے کے لئے بنائی گئی ہے۔ اس نشست کے سامنے اس کے مصاحبین اور خدام بگاہ بیٹھتے ہیں۔ دائیں اور بائیں غلاموں کی صف ہوتی ہے۔ کوئی چالیس ملاح اس جہاز کو کھینچتے ہیں۔ اس جہاز کے دونوں جانب چار چھوٹی چھوٹی کشتیاں لگے ہیں۔ دو کشتیوں میں امیر کا نشان "مراتب" ہوتا ہے یعنی ڈھول، نفیریں۔ بگل اور طرح طرح کی مزے سے بھالنے والی توپیں اور دوسری کشتیوں میں موسیقاروں کا مجمع ہوتا تھا باری باری توپیاں بھونکتی جاتی تھیں، نفیریاں بجتی تھیں اور گانے کی آواز سے فضا گونجنے لگتی تھی۔ یہ نویت نقاد و پھر تک بجا رہتا تھا۔ اس کے بعد دونوں کشتیوں کو آپس میں ملا دیا جاتا تھا۔ ان کے بیچ زینہ لگا دیتے ہیں اور گلے والے پھر امیر کے جہاز پر آ جاتے ہیں۔ وہ اس وقت تک نغمہ سراں کی کہتے رہے جب تک امیر نے اپنا کھانا ختم نہیں کر لیا۔ اس کے بعد انہوں نے اپنا کھانا کھایا۔ اس کے بعد وہ پھر اپنی کشتیوں میں واپس چلے گئے اور مقررہ طریق پر ان کا سفر شام ہونے تک جاری رہا۔ سفر ختم ہونے کے بعد امیر ساحل پر اتر آیا اور وہاں ڈیرے لگا دئے گئے۔ یہاں ایک کھانا ہوا جسے "نیت" کہتے ہیں۔ ہر امیروں میں سے اکثر اس طعام میں شریک تھے۔ عشاء کی مانند بعد پھر داروں نے باری باری پھر دینا شروع کیا جو ساری رات جاری رہا۔ جب پھر بدلتا تو پھر داروں میں سے کوئی بار بلند اعلان کرتا "خوند ملک، رات کا اتنا بچا ہے" ابن بطوطہ نے ملا الملک کی اس دلچسپ صحبت میں کوئی پانچ دن گزارے۔ اس کے بعد وہ لہاری کے مقام پر پہنچا جو اس کی نظر میں بڑا خوشنا شہر تھا اور لب بحر واقع تھا۔ یہ مقام وہ تھا جہاں سندھ مند رہیں آکر اپنا سارا آبی خزانہ اگل دیتا، کہتے ہیں کہ یہاں دو سمندر آکر ملتے ہیں اور لہاری ایک بڑا ہنگامہ بن چکا ہے۔ چین، فارس، اور دوسرے ممالک سے لوگ آتے جاتے

ہیں اور حاکم کو بڑی آمدنی ہے۔

علاء الملک کی ہمرای میں وہ ایک میدانی جگہ پہنچا ہے جو تہہ کہلاتی ہے اور شہر سے سات میل کے فاصلہ پر ہے۔ یہاں اسے پتھر کی بیٹھاریوں تیاں اور جافہ نظر آئے۔ کہتے ہیں کہ یہ جون بدل گئے ہیں۔ کسی کا صرف سرسپاس کا صرف پاؤں۔ وقس علی ہذا۔ بعض پتھروں کی شکل دانوں کی سی تھی۔ گہروں سے بھی معلوم ہوتے تھے اور والی چیز بھی نظر آئی۔ مکانوں کی نمود اور شہر بناہ بھی دکھائی دیتی تھی۔ پھر میں ایک مکان کے آثار دکھائی دئے جس میں تراشیدہ چٹان کی ایک کوٹھڑ بھی تھی۔ بس ایسا لگتا تھا کہ ایک پورے چٹان انار سے کھدی ہوئی لگی ہے۔ اس پر ایک مجسمہ دھل تھا جو انسان جیسا معلوم ہوتا تھا۔ فرق صرف یہ تھا کہ سر پہنٹ بڑا تھا، اور اس کا دہن چہرہ کے ایک رخ پر پھل ہوا تھا اور دونوں ہاتھ جانب پشت تھے جیسے وہ کوئی قیدی ہو۔ اور آدھ ٹری بدبو دار جھیلیں سی تھیں۔ بعض دیواروں پر ہندی حروف کندہ نظر آئے۔ علاء الملک نے ابن بطوطہ کو بتایا کہ بعض مورخین کے نزدیک یہ ایک بہت بڑا مگر تھا مگر یہاں کے لوگوں کو پتھر کا بنا دیا گیا اور یہ مجسمہ ان کے سردار کا تھا جس پر عتاب نازل ہوا تھا۔ اس مکان پر اب بھی راجہ کا گھر کے الفاظ نظر آتے ہیں۔ والہ تعالیٰ بالصواب!

ابن بطوطہ کی معلومات کے مطابق پتھر بھی ایک شہر تھا، عالم میں انتخاب۔ اس کے وسط میں سے دریائے سندھ کی ایک نہر بہتی تھی۔ نہر کے بیچ میں ایک جگہ تھی جہاں مسافروں کو کھانا کھلایا جاتا تھا۔ اسے کٹلو خال نے بنایا تھا جس وقت وہ سندھ کا گورنر تھا۔ یہاں ابن بطوطہ کی ملاقات شہر کے قیدی سے بھی ہوئی جن کا نام تھا صدر الدین الخنقی۔ شہر کے قاضی ابو حنیفہ سے بھی ملاقات ہوئی۔ شیخ شمس الدین محمد الشیرازی، ایک خدا رسیدہ نیک سیرت بزرگ سے بھی ابن بطوطہ ملا اور انہیں ۱۲۰ سال کی عمر کا پایا۔ ان کی صحت بھی بہت اچھی تھی۔ پتھر کے شہر سے وہ ”اجہ“ کی طرف گیا۔ یہ بھی دریائے سندھ کے کنارے پر بسا ہوا تھا اور ٹہارا رولق شہر تھا۔ اب وہ سندھ کے دار الحکومت ملتان تک پہنچا ہے۔ یہیں امیر الامرا کا قیام ہے۔ یہاں سے کوئی دس میل کے فاصلہ پر ٹرک کے کنارے عسروا آباد ایک تہی اسے ملی جہاں دریا بھی بہتا تھا اور

اچھا شہر تھا۔ اس دیا کو وہ ایسا دریا بتاتا ہے جسے بغیر کشتیوں کے عبور نہیں کیا جاسکتا۔ ملتان کی سڑک یہیں سے گزرتی ہے۔ یہاں مسافر کو ٹہرنا پڑتا ہے اور بڑی سخت تلاشی لی جاتی ہے۔ ابن بطوطہ کا تجربہ یہ ہے کہ جب ہم یہاں پہنچے تو رواج یہ تھا کہ سوداگر جو بھی سامان لائیں اس کا پوچھائی حصہ حاکم ملتان کے حوالہ کر دیا جاتا تھا یعنی سرکاری مال خانہ میں جمع ہو جاتا تھا ہر گھوڑے پر سات دینا ٹیکس ادا کرنا پڑتا تھا۔ جب ابن بطوطہ دو سال بعد ہندوستان سے لوٹا تو سلطان کے حکم سے یہ ٹیکس معاف کر دیا گیا تھا۔ اس کا حکم تھا کہ سوداگر لوٹے سے سوائے زکوٰۃ اور عشر (دسواں حصہ کے کچھ وصول نہ کیا جائے اور اسے عباسی خلیفہ، ابوالعباس کے نام کی قسم کھانی پڑتی تھی۔ ”میرے سامان کی تلاشی شروع ہوئی تو سخت پریشانی ہوئی۔ کوئی مال دولت تو نہ تھا مگر بچے بڑے بڑے دکھائی دیتے تھے! مگر خدا کا کرم کہ قطب الملک، گورنر ملتان، کا ایک بڑا فوجی افسر ادھر سے گزرا اور اس نے حکم دیا کہ میرے سامان کی تلاشی نہ لی جائے اور ایسا ہی ہوا۔“

”ہم نے خدا کا شکر ادا کیا اور رات لب دریا بسر کی۔ دوسرے روز صبح ملک البرید (سپرٹنڈنٹ ڈاک) ہمارے پاس آیا۔ یہ اصل میں سمرقند کا رہنے والا تھا۔ یہی وہ شخص تھا جو شہر اور محلہ کا روزانہ چکر لگھتا اور خبر نامہ تیار کر کے بادشاہ کو پرچہ بھیجتا۔ اس خبر نامہ سے ہر آنے جانے والے کی مابین اطلاع اور دوسرے احوال و حادثات کی خبر بادشاہ کو ملتی دیتی تھی۔ میں اس کی ہمرای میں عامل ملتان کے پاس پہنچا۔ اس سرکاری افسر نے ہی عامل سے اس کا تعارف کرایا جو بہت خندہ پیشانی سے ملا اور مصافحہ کر کے اسے اپنے پہلو میں بٹھالیا۔ یہاں ابن بطوطہ نے عامل کی خدمت میں ایک غلام، ایک گھوڑا، کچھ کمکش اور بادام بطریق نذر گزارنے۔ ہند کے امراء کی خدمت میں یہ چیزیں بطور تحفہ یوں پیش کی جاتی تھیں کہ یہاں کیا بات تھیں اور زیادہ تر خراسان سے منگائی جاتی تھیں۔ اس امیر کا احوال ابن بطوطہ سے ہی سنئے

”یہ امیر ایک بڑے تخت پر بیٹھا تھا جو کالیٹوں سے مزین تھا۔ نزدیک قاضی صاحب تشریف فرمائے جن کا نام سالار تھا۔ نزدیک خلیفہ تھے، جن کا نام میں نہیں جانتا۔ دائیں اور بائیں جانب فوجی

گھی میں پکا ہوا سالن حاضر کیا جاتے ہیں۔ اس میں پیاز دھینڈا اور ک
وغیرہ بھی ہوتا ہے یہ سالن چین کی بنی ہوئی نفیس رکابیوں میں
پیش ہوتا ہے۔ اس کے بعد ایک شے سامنے رکھی جاتی ہے جسے
یہ لوگ سموسہ کہتے ہیں۔ اس میں قیمہ ہوتا ہے جس میں بادام،
اخروٹ، پیتہ، پیاز اور مسالے لے ہوئے جھٹے ہیں وپر ہارک
ورق جیسی، گھی میں پکی ہوئی روٹی کا خول ہوتا ہے۔ ہر آدمی کے
سامنے ایسے چار ساٹھ سموسے رکھے جاتے ہیں۔ اس کے بعد گھی میں
پکے ہوئے چاولوں کی ایک ایک تاب آتی ہے جس پر ایک بھنا ہوا
مرغ ہوتا ہے۔ پھر ایک غذا آتی ہے جسے "نعمتہ القاضی" کا نام
دیا گیا ہے۔ اس کے بعد آغا ہریہ کی ہاری آتی ہے۔ جب
کھانا شروع ہوتا ہے اور وہ تقریبات لب فرش اگر سلطان کی طرف
منہ کر کے جھک کر خدات بجالاتا ہے۔ پھر باقی حاضرین کے
سامنے مرتبہ ختم کرتا ہے۔ یہ جھکنا اس قدر ہوتا ہے جیسے نمازیں
رکھتا ہو۔ اس تقریب کے بعد کھانا شروع ہوتا ہے مگر اس سے
قبل سوئے چاندی کے پیالوں میں عرق گلاب میں بنا ہوا شربت
پیش ہوتا ہے۔ شربت کے بعد داروغہ تقریبات با واز بلند ہوتا
کہتا ہے جس کا مطلب ہے کہ کھانا شروع کر دیا جائے۔ کھانے
کے بعد جو کا عرق پیش ہوتا ہے۔ جسے فقہ کہتے ہیں اور جب یہ بھی
ختم ہو جائے تو باق سپاری پیش ہوتے ہیں، جن کا پہلے ذکر کر چکے ہیں
پان سپاری منہ میں رکھنے کے بعد حاضرین ضیافت پھر ایک بار
بسم اللہ کے منتظر رہتے ہیں اس موقع پر ہر شخص انڈر کر
جھک کر آداب بجالاتا اور رخصت ہوتا جاتا ہے ۛ

حکام سرقد کو کھڑے تھے۔ جنگی سپاہی امیر کے پیچھے الیتا وہ تھے۔ بہت
کمانیں بھی رکھی رکھیں جب کوئی تیر انداز فوجی ملازمت کے لئے پیش ہوتا
تو اس سے ان میں کی ایک کمان نہ کرنے کے لئے کہا جاتا۔ ہر کمان کی
سختی جدا جلاتی اور جوتیر انداز جتنی قوت بازو دکھا سکتا تھا اس کے
مطابق ہی تنخواہ مقرر ہوتی تھی ساگر سپاہی اس سپ سواروں میں بھرتی
ہونا چاہتا تو اس کے سامنے ایک بڑا ڈھول رکھ دیا جاتا تھا۔ اس کا
کام یہ تھا کہ نیزہ کی مدد سے اس نقارہ کو ضرب لگائے۔ دیوار کے
ساتھ ایک حلقہ بھی لٹکا ہوا تھا۔ سوار گھوڑے کو اتنا سرپٹ دوڑاتا
کہ وہ اس حلقے سے پیوست ہو جاتا۔ اگر اس نے جا بکرتی تو اس
حلقہ کو اپنے نیزہ میں پر دیا تو اسے اعلیٰ شہسوار مانا جاتا تھا۔ اگر
کوئی سپ سوار نیزہ باز بھرتی ہونا چاہتا تو اس کے لئے زمین پر
ایک گنبد رکھ دیا جاتی۔ امیدوار سرپٹ گھوڑا دوڑاتا ادھر
آتا اور گنبد پر تیر چلاتا۔ اس کی تنخواہ کا تناسب گنبد پر ڈار کر لگی
جہازت پر منحصر ہوتا تھا۔

شاہی ضیافت کا حال بھی کچھ کم دلچسپ نہیں ہے:

سب سے پہلے چائیاں لائی جاتی ہیں بڑی تیلی۔ پھر
بھیر آتی ہے جسے چارچھ نمکڑوں میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ ہر نمکڑا
ایک کھانے والے کے سامنے رکھ دیا جاتا ہے۔ پھر گھی میں ڈوبی
ہوئی گول گول روٹیاں آتی ہیں ان روٹیوں کے بیچ میں ایک شیرینی
بھری جاتی ہے جسے مہا بونیز کہتے ہیں۔ ہر بارہ نان پر ایک
چھوٹی سی میٹھی نگلیہ رکھی ہوتی ہے جسے انہی شکل کے باعث "خیشق"
کہتے ہیں۔ یہ میدے، شکر اور گھی کا آمیزہ ہوتا ہے۔ اس کے بعد



ماہ نو کی ترقی اشاعت میں حصہ لیکر پاکستانی ادب ثقافت سے اپنی علمی دلچسپی کا ثبوت دیجئے

غزل

عارف سجازی

شید، الجھڑائی

دیکھ کر آئینہ دل میں ترا عکسِ جمال
جاگ اٹھے ہیں نگاہوں میں غزالِ خیال
اُن وہ مہتاب سی صورت وہ خمیدہ ابرو
کسی فنکار کا موضوع ہیں نازکِ خدِ خال
وادیِ زلف میں بھٹکی ہوئی بے تابِ نظر
سنبلستاں میں ہو جیسے کوئی آوارہ غزال
وہی وحشت، وہی دہن، وہی شوریدہ مری
رنگ لایا ہے تری شمعِ بکا ہی کا سوال
کوئی تصویر نہیں، کوئی تمنا بھی نہیں
کتنی افسردہ و بے نور ہے دنیا کے خیال
وضعِ غم بنے لگا تھامے کردار کا رنگ
ترمی رفتار نے بدلی مرے افکار کی چال
دل پہ چھایا ہے وہی غم کا اندھیرا عارف
اب نہ امید بہاراں، نہ ارمانِ وصال

رلائے خوں کے آنسو زندگی نے
نہ آئے پھر بھی جینے کے قرینے
ٹاسے چشمِ حسرت نے خزینے
تراٹے ہیں محبت نے گکینے
ہوئے شوقِ جاناں لے اُڑی ہے
خدا جانے کہاں ٹھہریں سفینے
متاعِ بادہ سے خالی ہیں شیشے
خلوصِ درد سے عاری ہیں سینے
کسی کا نام آتے ہی زباں پر
چھلک جاتے ہیں دل کے آگینے
ستارے ڈوب کر ابھرے فلک پر
نہ ابھرے ڈوب کر دل کے سفینے
بہ عنوانِ سال یک تبسم
کہاں تک چاک ہوں پھولوں کے سینے
مگر وہ ایک لمحہ مختصر سا
گزرے کو گزرے ہیں جینے
حکمتاں تا بہ صحرا تیرے لقمے
منائے ہیں مری آشفنگی نے
ہے کسی یوسفِ نفس کی آمد آمد
رداں ہیں نکھرت گل کے سفینے
شریکِ دردِ پنہاں کون ہوتا
بہ مجبوری پڑے ہیں اٹک پیٹنے
یہ کس شیریں دہن نے تجھ کو شیدا
غزل کہنے کے بجٹے ہیں قرینے

دیارِ گل

(منظر آباد - آزاد کشمیر)

منظر احمد ظفر

بالکل برباد ہو گیا۔

منظر آباد کی تاریخ پر نظر ڈالیں تو حکمران خاندان، جبکہ کاڈر آنا ضروری ہے۔ یہ خاندان باضی میں ادھر آیا اور کشمیر پر مکران ہو گیا تاریخی اطلاعات یہ ہیں کہ ہلاکو خان کا ایک جرنیل تھا، ذوالقدر خان، اس نے ۶۳۲۳ میں کشمیر کے نواح پر زبردست حملہ کیا۔ اس حملہ کے

باعث کشمیر پر ہر طرح کی تباہی آئی اور نظام معیشت تو بالکل ہی تباہ ہو گیا مگر اس حملہ کا ایک نتیجہ یہ ضرور نکلا کہ فدائیان اسلام کو ادھر آنے اور دینی تبلیغ کی ضرورت محسوس ہوئی تاکہ دماندہ انسانیت کو سہارا مل سکے۔ اس سے قبل پچھلی، (ضلع ہزارہ) میں اسلام کی روشنی پھیل چکی تھی اور اس کا پیغام دودھ در رنگ پہنچنے کے لئے دروازے کھلے جا رہے تھے۔ ہلاکو خان کے اس گماندہ کے پاس مختلف صلاحیتوں کے لوگ تھے، جو کچھ تو واپس چلے گئے اور کچھ وہیں رہ پڑے۔ اس کی مثال ایسی ہی ہے جیسے بنی امیہ کے بہت سے عربی النسل لوگ جب فتوحات کے جلو میں بدخشاں تک پہنچے تو پھر وہیں بس گئے۔ خاندان اموی کی ہم میں ایک نامور شخص کا شرف خان بھی متعاجس نے دھتور (نزد ایبٹ آباد) میں مستقل قیام اختیار کیا۔ اسی کا پوتا صفدر خان تھا جو سلطان محمد خان والی پکھلی کا سپہ سالار بنے۔ یہ لوگ کافی عرصہ تک یہاں حکمران رہے اور اسی تاریخی خانوادہ کے لوگوں نے اپنی موروثی جاگیر اور متحدہ علاقوں پر ایک خود مختار حکومت کی بنیاد رکھ دی تھی۔ آٹھ چل کر یہی خاندان بہتہ کے نام سے مشہور ہوا اور اس نے منظر آباد کو ہی اپنا دار الحکومت بنایا۔ اس طرح پوری وادی نیلم پر ان سرداران وقت کا قبضہ ہو گیا۔ منظر آباد جنگوں کا میدان بھی بنا رہا ہے کبھی یوسف شاہ چگ کی فوجیں ادھر آئیں۔ کبھی اکبر اعظم نے ادھر فوجیں بھیجیں۔

منظر آباد۔ آزاد کشمیر کا صدر مقام۔ سطح سمندر سے تقریباً

ڈھائی ہزار فٹ کی بلندی پر واقع ہے۔ یہ کافی قدیم اور تاریخی اہمیت کا شہر ہے اور دریائے کشن گنگا پر بسا ہوا ہے۔ اب اس دریا کا نام نیلم ہے جو اس کے قدرتی ماحول اور موجودہ فضا کے اعتبار سے موزوں ترین نام ہے۔ منظر آباد خاندان جبکہ کے ایک نامور سردار، منظر خان نے آباد کیا تھا لیکن اس کی تاریخ چنانچہ کا صحیح علم نہیں ہو سکا۔ بعض پرانے کاغذات میں اسے چکڑی کے نام سے بھی موسوم کیا گیا ہے۔ جو یہاں کی مقامی بولی میں 'دلہل' کے معنی رکھتا ہے۔ ہر چند کہ شہنشاہ جہانگیر کشمیر جاتے ہوئے اس مقام سے دو مرتبہ گذرا مگر اس نے بھی اپنی ترک میں اس جگہ کا کوئی ذکر نہیں کیا۔ صرف اتنا حال ضرور ملتا ہے کہ "کم ترنگ" (موجودہ گوجرہ) کے سامنے ایک اونچی سی جگہ ہے، بڑی عمار اور نہایت پر نفعا۔ یہاں شہنشاہ جہانگیر نے نماز ظہر کے بعد کا وقت سیر و تفریح میں گزارا تھا اور فضا کی دلچسپی نے شہنشاہ کو بہت محفوظ کیا تھا۔ گوجرہ کے مقام پر اس عظیم بادشاہ کا بنایا ہوا قلعہ اب بھی موجود ہے اور خاصی اچھی حالت میں ہے۔ جہانگیر نے اس جگہ کو سرائے لکھا ہے، جو جلال آباد کے قلعہ کے سامنے واقع ہے۔ یہ جگہ منظر خان کے چھوٹے بھائی، جلال خان نے بسائی تھی۔ آج کل آزاد حکومت جموں و کشمیر کے مرکزی دفاتر اسی جگہ ہیں۔

منظر آباد کے شمال مغرب میں اکبر اعظم کا بنایا ہوا ایک قلعہ بھی موجود ہے، مگر اب خستہ حالت میں ہے۔ یہ قلعہ چونکہ ڈوب گئی یعنی ایک درہ کے سامنے ہے اس لئے ڈو گروں کے دور میں یہاں ایک حفاظتی چمکی بھی بنی ہوئی تھی۔ مگر جیسے جیسے زمانہ گزرتا گیا ٹوٹ پھوٹ بھی ہوئی رہی، خاص کر دریائے نیلم کی شوریدہ سر بہوں نے اسے کافی نقصان پہنچایا اور کوئی دیکھ بھال بھی نہیں ہوئی اس لئے قلعہ

کبھی یہ جگہ سکھوں کی رزم گاہ رہی اور حضرت سید احمد شہیدؒ کی تحریک جہاد کا مرکز و محور بھی رہی مقامات رہے۔ حضرت سید احمد شہیدؒ کے زمانہ میں یہاں جو سردار حکمران تھے ان میں آپس کی نا اتفاقی بہت تھی۔ اس لئے سازشیں بھی ہوتی تھیں اور اسلام کے دشمن اس سے فائدہ اٹھاتے تھے۔ چنانچہ فروری ۱۸۳۱ء میں مظفر آباد اور اس کے ملحقہ دیہات میں جب مجاہدین پہنچے قرآن کی جمعیت بکھر چکی تھی اور وہ دشمنوں سے لڑنے بھڑکنے شہید ہو گئے۔

حضرت سید احمد شہیدؒ کی تحریک ختم ہو گئی تو اس کے ہندو سال بعد ۱۸۷۲ء میں انگریزوں نے وہ مشہور معاہدہ (امرتسر) کیا جس کی رو سے جوں و کشمیر کا خطہ گلاب نگہ کے حوالہ کر دیا۔ اس معاہدہ کو دنیا کی تاریخ میں بدترین معاہدہ کہا جاتا ہے کیونکہ چھڑاسی ہزار مربع میل کا علاقہ بھرتھ لاکھ "ناک شاہی" سکوں کے عوض بیچ ڈالا گیا۔ "ناک شاہی" روپیہ صرف دس آن کا تھا۔ "پہ ارزاں فروختند" ! جمع ہی کہا گیا ہے۔

اس رسوائے عالم معاہدہ کے بعد جو رد عمل عوام میں ہوا وہ قدرتی تھا۔ ریاست کے گوند میں نفرت کا زہر پھیل گیا۔ عوام نے احتجاج کیا جسے نا قابض اندیش حکمرانوں نے بغاوت کا خطاب دیا۔ مسلمان آبادیوں پر بے پناہ ظلم توڑے گئے ہزاروں مسلمان شہید کئے گئے۔ مظفر آباد بونچھ، میرپور اور واجد کی علاقے خاص طور پر ظلم و تعدی کا نشانہ بنائے گئے۔ مگر غیور مسلمانوں

نے ظلم کے آگے گردنیں نہیں جھکائیں۔ جب حوصلہ جات تنگ ہو گیا تو سینکڑوں مسلمان خاندانوں نے اس نواح سے ہجرت کر، اور پڑے بڑے بڑے پھیل گئے اور اپنی خدا داد صلاحیتوں سے انہوں نے ہر شعبہ زندگی میں اپنے لئے ایک ممتاز مقام پیدا کیا۔ ہر چند کہ ابتدائی احتجاج کو ظلم کی قوتوں نے وقتی طور پر بادیا تھا مگر ظلم و نا انصافی کے خلاف لوگوں کے دلوں میں جو لاداسلگ رہا تھا وہ ایک دن پھوٹ پھینکے لئے بلقرا تھا۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ ۱۳ جولائی، ۱۹۳۱ء کو مسلمانوں نے کشمیر نے پوری قوت کے ساتھ للکارا۔ یہ تحریک آزادی تھی جو براہ برستی رہی اور وہ دباؤ نہ جاسکی۔ گرفتار یاں اور گولی مارنے کا سلسلہ دراز سے دراز تر ہوتا چلا گیا۔ خود مظفر آباد میں سو سے زیادہ مقتدر اصحاب کو گرفتار کیا گیا۔ اس کے بعد تحریک میں مزید جوش پیدا ہوا اور ۱۹۴۰ء میں مظفر آباد ہی جنگ آزادی کا مرکز بنا۔ یہی جہاد آزادی کا مرکز ہے اور آج بھی آزاد جموں و کشمیر کی حکومت کا صدر مقام ہے جو آزاد کشمیر کے نظم و نسق، تعلیم و ترقی اور فلاح و بہبود کا سیاسی محور ہے اور امید ہے کہ جس طرح ماضی میں مظفر آباد اپنا تاریخی کردار ادا کرتا رہا ہے، مستقبل میں بھی یہ اپنا ممتاز حیثیت برقرار رکھے گا۔

پاکستان، روش، امروز فردا: بقیہ مشا

نویزائیدہ ہے اور ہم نے بدلنے طرز حکومت کی جگہ ایک نیا اسلوب سیاست اختیار کیا ہے۔ اس لئے ابتداء مشکلات کا پیدا ہونا کچھ حیرت انگیز نہیں۔ اصل میں جس چیز کی ضرورت ہے، وسیع النظری اور وسیع القلی ہے جس کی بنیاد صرف وطن، اور حب وطن ہوا یعنی تعمیر و فلاح مملکت کا جذبہ۔ جس کی موجودگی طرف سے ہمیں مایوس ہونے کی کوئی ضرورت نہیں۔

رہنمائی کی دولت سے بالابل کر کے۔ ویسے حزب اختلاف کے خلاف بھی اکثر شکوک رہتی ہیں کیونکہ دیکھا گیا ہے کہ ہر سیشن کے ساتھ راکیں کی نشستیں بدلتی رہتی ہیں اور یہ کیفیت اسی وقت ہی استحکام پاتی ہے جب معاشی و سیاسی اصولوں پر مبنی پروگرام کھنے والی جماعتیں ہمارے ملک میں ابھریں۔ لیکن اگر اس وقت یہ مطلع اتنا صاف نہیں ہے تو یہ کوئی حیرت کی بات ہے۔ دہراوی واپسی کی۔ آخر ہماری مملکت

دربائے جہلم اور دریائے نیلم (آزاد کشمیر) کے سنگم پر
شہنشاہ جہانگیر کا قلعہ

دیار گل (مظفر آباد)

اس وقت کشمیر پر ساری دنیا کی نظریں لگی ہوئی
ہے۔ کشمیر کے ساتھ ہمارا تاریخی، قومی اور ثقافتی رشتہ
قدر، محکم اور ناقابل شکست ہے کہ اسے کوئی بھی
کوشش ہم سے جدا نہیں کر سکتی۔

آزاد جموں و کشمیر کی حکومت کا صدر مقام،
مظفر آباد، ایک قدیم تاریخی شہر ہے جس کے اطراف کی
مزرعین سے ہماری تاریخ کے نئی روشن ابواب کی یادیں
ستہ ہیں۔

آثار قلعہ ۱





دور نو میں ہرجمہتی ترقی کے ساتھ ساتھ قومی ادب و فن کی سرپرستی کا مسئلہ بھی جاری ہے اور اس وقت علمی، ادبی اور فنی سرگرمیوں کے لئے جو سازگار فضا بنائی جاتی ہے، وہ اس سے قبل نہ تھی۔

دیگر فنون جملہ کے ساتھ فنکاروں کی توجہ نسوقہ نمائندگی کی طرف بھی ہوئی ہے اور حال ہی میں ملک کے دونوں نازوؤں میں کئی باب ادبی خدمات انجام دی گئیں۔



ہنگو ڈرامہ ”کالا پیلا“ کا ایک منظر

کامیاب ڈرامے سادہ و پرکار لباس اور سازوسامان کے ساتھ بھی پیش کئے جاسکتے ہیں۔



”کنچن مالا“ (ایک منظر)

”ہوتا ہے شب و روز...“ (پاکستان میں شوقیہ تھیر)۔

اشرف ذکائی

میں شوقیہ ہنرمندان تیار کی سرگرمیوں کو اگر ہم دیکھیں تو بہت سی باتوں کا جواب از خود مل جاتا ہے۔

پہلی بات تو یہی ہے کہ ڈرامہ کو لوگ شوق سے دیکھنے آتے ہیں اور ہمارے ہاں اچھے کھیل لکھنے والوں کی ایسی کمی بھی نہیں ہے، پیشکش اور ہدایت کاری کے جوہر بھی دستیاب ہیں۔ بیشک منڈیوں کی کسر ہے مگر اکثر بڑے شہروں میں کافی ہال مل سکتے ہیں جنہیں تھیر کی پیشکش کے لئے ٹھیک ٹھاک کیا جاسکتا ہے۔ بلکہ بعض یونیورسٹیوں کے پاس تو باقاعدہ انتظامات بھی ہیں جہاں ہمارا نوجوان تعلیم یافتہ طبقہ اسٹیج پر آکر دوا تحسین حاصل کرتا رہتا ہے۔ البتہ ہلے ہوئے ذوق کی پذیرائی میں ہمیں کئی باتوں کا اہتمام ضرور کرنا پڑتا ہے۔ ایک تو یہ کہ پیشکش وقت طلب نہ ہو اور وقت طلب بھی نہ ہو، یعنی کم سے کم وقت میں، کم سے کم مالی و انتظامی سربراہی کے ساتھ، کھیل پیش کیا جاسکے۔ ساز و سامان سادہ ہو، سیٹ اور لباس لازماً ”زرق برق“ نہ ہوں اور وہ انداز کا رونا ظہر سے پرہیز کیا جائے تاکہ معمولی بساط پر بھی اداکاری اور صداکاری کے جوہر دکھائے جاسکیں۔ نقشہ کی خوبی، مکالموں کی جستی اور پیشکش کی دوسری ٹوک پلک سے ہم کسی بھی شام تیار کو ایسا دلچسپ، متنوع اور پُر لطف بنا سکتے ہیں کہ دیکھنے والے جب گھر واپس جائیں تو ایک بار دیکھ لیں، ہزار بار دیکھنے کی ہوس ہے، کا احساس نئے ہوئے جائیں۔ اور ایسا کرنا چنداں دشوار نہیں۔ کیونکہ میں نے دیکھا ہے کہ لوگ بے جا انصاف و برے بے روح حکوس اور فلم کی مہمل نغمہ سرائی سے گھبرا چکے ہیں اور اگر خوش ذوقی کا مظاہرہ کیا جائے تو وہ لوگ بھی جنہیں ہم درجہ چہارم کے تماشائی کہتے ہیں، ایسی چیزوں کو پسند کرنے لگتے ہیں بلکہ

یہ سمجھتے ہیں کہ متحرک و گویا تصاویر کے رواج نے ہمارے ہاں بالخصوص، تھیر کا چراغ گل کر دیا ہے اور عام طور پر یہ محسوس کیا جاتا ہے کہ تہ صغیر میں تھیر کی جو بھی بڑی باڈی روایت قائم ہو چکی تھی وہ بھی کسی بن کھلے پھول کی طرح مرجھا گئی۔ گزشتہ صدی کی ابتدا سے ۲۲-۱۹ تک تھیر کچھ نہ کچھ سانس لینا رہا مگر متحرک تصاویر نے اس کو ختم کر دیا۔ بعض شہروں میں پیشہ وارانہ طور پر کچھ کام ہوتا رہا اور کچھ سات سال تک یہ سلسلہ چلتا رہا مگر گویا تصاویر کی آمد نے تو اس کا بازار بالکل ہی سر دکر دیا۔ لگے سرسبز، اس دنیا میں کام کرنے والے جتھوں، پرانے اداکاروں اور تھیر سے ذوق رکھنے والے ہدایت کاروں، ہلکے ٹھکانوں اور دوسرے کارکنوں کو کسپری کھاگئی یا عوامی شوق کی ادنیٰ بلقی رتوں نے ہضم کر لیا۔ ریڈیو کی ترویج نے اداکاروں کو پیشکش کے اس نئے آلہ سے روشناس کرایا مگر اس میں بھی صرف وہی پنپ سکے جو اداکار سے زیادہ صدا کرتے۔ تھیر کی ادبی روایات پہلے بھی کچھ زیادہ بلندیوں کو نہ چھو سکی تھیں مگر پھر بھی ناک کھینے والے کچھ نہ کچھ لکھتے ہی رہے اور جن لوگوں کو فن تیار سے دل لگاؤ تھا بہت اچھے ڈرامے اسٹیج پر لے جاتے بھی رہے اور لکھتے بھی رہے۔

یوں آزادی کے بعد سے تھیر کی روایات کو حیات نو بخشنے کی برابر کوشش ہو رہی ہیں اور اگر ملک کے سب سے بڑے ادارہ قومی ٹیلی ویژن کو نسل آف پاکستان کی کوششوں، نیز یونیورسٹیوں اور عوامی اسٹیج تھیروں کی مساعی کی طرف ایک نظر ڈالی جائے تو یہ مایوسی نہیں ہوتی کہ تھیر کے لئے ہمارے ہاں اب کوئی امکانات باقی نہیں ہیں۔ ریڈیو پاکستان کے جسٹن ٹھیل، اور کراچی ۱۱۱ اور ڈھاکہ اور لاہور

آہستہ آہستہ مذاق سدھرتے چلے جاتے ہیں۔ چنانچہ ابتدائی فصول کی بد ذوقی کے مقابلہ پر اب کی فلسازی کو دیکھیں تو اصلاح بزحمان معدوم نظر نہیں آئے گا۔ دو جبار کی لہری اور بلند ہی کے درمیان بھی بہت سی خلیجوں کو ہمیں پائسل ہے، مگر مایوسی کی بھی کوئی وجہ نہیں ہے۔

اب اگر میں حال کی شوقیہ پٹکیشوں کا ہی ذکر کر دوں تو آپ میرے پھیل ہوں گے کہ تھیر کی طرف سے مایوسی کا واقعی کوئی جواز نہیں ہے۔ سب سے پہلے میں کراچی کا ہی ذکر چھڑتا ہوں۔ یہاں "آرٹس کونسل آف پاکستان" کسی نہ کسی عنوان پر ثقافتی ورثہ کی تردید اور تحفظ کا ایک نہ ایک اہتمام کرتی ہی رہتی ہے۔ فنونِ جمیل میں نقاشی کی پرورش و ترقی کے ساتھ ساتھ فنِ دکا کا کی طرف بھی اس کی توجہ ہے اور بخوش ذوق تھیر کے پرانے رسیاں مل بیٹھ کر یہ سوچتے رہتے ہیں کہ کوئی شام تیار تر کس طرح منائی جائے جو دلدادگان فن اور عام تماشاخیوں سب کو ہی رچ جائے۔ چنانچہ ایسے ہی چند فن پرور حضرات نے پچھلے دنوں بین طریہ پھیل کر ایک وقت ایسے پریشکے اور ایک ایسی سہانی شام کا انتظام کر دیا جو ہمیں ہل من مزید کا نعرہ بلند کرنے کی دعوت دیتی ہے۔

یہ تینوں ایجاگنی ڈرامے تھے۔ ایک ہی شام میں تینوں کھیل لانے کی تجویز یوں رکھی گئی تھی کہ تینوں کھیلوں میں بین ہی ادا کا تھے اور تینوں میں وہی کام کرتے تھے۔ یعنی ہر ادا کا کو تین مختلف روپ دھارنے تھے۔ ان تینوں کھیلوں کی ہدایت کا بھی ایک ہی صاحب نے کی۔ ابراہیم نفیس صاحب۔ جن کی ادا دھار کے جوہر دیکھنے اور سننے کا لوگوں کو پہلے ہی اتفاق ہو چکا ہے۔ ان کے ساتھ طلعت صدیقی تھیں اور محمود علی تھے۔

پہلا کھیل "مکرم" تھا جسے مورٹن کے کھیل "کاکس اینڈ باکس" سے اردو اسٹیج کے لئے مختار کیا گیا تھا۔ کھیل میں ایک زلیخا بائی ہیں اور رواقی لینڈ لیڈری کی تمام صفات سے لیس۔ وہ اپنے فکر کا ایک کمرہ ایک وقت دو کمرہ داروں کو کرایہ پر اٹھا دیتی ہیں۔ پہلا کمرہ دار کسی پریش میں کام کرتا ہے اور ہمیشہ رات کی شفٹ میں کام کرتا ہے۔ دوسرا کمرہ دار کسی ٹوپی بنانے والے کے ہاں کام کرتا ہے، صبح سویرے اٹھ کر چلا جاتا ہے اور رات گئے آتا ہے۔

دو لوں کو ایک ہی کمرہ ملا ہوا ہے مگر دونوں یہ سمجھتے ہیں کہ دوسرے صاحب کسی اور کمرہ میں رہتے ہیں مگر ایک دفعہ زلیخا بائی کی شامت آ جاتی ہے کیونکہ دونوں کمرہ دار کسی گڑ بڑ کی وجہ سے بیک وقت اپنے کمرہ میں اپنے آپ کو ایک دوسرے کے منہا بل پاتے ہیں۔

کافی طوفان اٹھتے ہیں۔ بڑی گڑ بڑ مچتی ہے مگر آخر کار معاملہ صلح صفائی کے ساتھ طے پا جاتا ہے۔ حاضرین کے حظ و لطف کا احساس ان کے چہرہ دل سے نمایاں تھا، مگر دوسرا کھیل گزارش ہے جب پیش ہوا تو لوگوں کو اور بھی زیادہ مطاف آیا۔ یہ پنجاب کے کسی گھرانے میں چودھری صاحب کی بیٹھک کا قصہ تھا۔ ایک تو اناجہر دل کا مریض دیہاتی چودھری صاحب کے پاس آنا دوران کی اکلوتی لڑکی نے اپنے پیغام شادی دیتا ہے۔ پہلے سین کے بعد کوئی سین بڑی افراتفری بکھڑا دھاڑے لہرتا آتے جاتے ہیں مگر آخر کار چودھری صاحب خود اس قضیہ کا فیصلہ کر کے رکھ دیتے ہیں کہ ساتھ کر دیتے ہیں اور نوک صغریٰ کے کھٹے ہوئے تیسرے ڈرامہ کو دیکھنے کے لئے اپنی بڑھتی ہوئی مہنسی کو روک کر بیٹھ جاتے ہیں۔ اس کھیل میں نتھو دھوبی آتے ہیں، اس کی بیوی خیراتی ہے جو کسی نوکر کی بیٹی ہے۔ ان کی بھی شادی ہوئی ہے۔ عین شادی کی رات کو ڈاکو آ جاتے ہیں جو ان دونوں کو پکڑ کر کوٹھڑی میں قفل کر دیتے ہیں اور خود شراب پینے چلے جاتے ہیں۔ دھوبی بٹا ہاتھوں سے مگر دھان پالا ہے اور بڑا سہا ہوا ہے لیکن خیراتی بلا کا چلتا پرزہ ہے اور بڑی ہوشیاری اندہ حاضر دماغی سے کام لے کر اپنے آپ کو اور اپنے مہیاں کو اس قید سے آزاد کر لیتی ہے۔

تینوں کھیلوں میں مجھے ہوئے ادا کار محمود علی کا کام بڑا عمدہ رہا۔ اسٹیج کی اداکاری، اظہار جذبات، چہرہ کا انا رچھاؤ اور مکالموں پر قدرت واقعی قابلِ داد تھی۔ "مکرم" میں ابراہیم نفیس کا کام بھی معیاری تھا۔ نتھو خیراتی میں طلعت صدیقی نے شروع سے آخر تک اپنا دل خوب نبھایا۔

سامان کے لئے کچھ زیادہ لگ و دو نہیں کرنی پڑی تھی۔ معمولی سیاہ پس منظر پر دم نے ہر موقع پر غاص کام دیا۔ اسٹیج کی روشنیاں اور میک اپ بھی ٹھیک رہے اور کچھ گڑ بڑ نہیں ہوئی، جو بجائے خدایک کا نام ہے ورنہ شوقیہ تھیروں میں

داد حاصل کی۔ ان ڈراموں کے علاوہ اور بھی ڈرامے یہاں پیش ہوئے رہے ہیں۔

راولپنڈی میں کچھ تعمیراتی کاموں کا آغاز ہوا ہے۔ اور گھوٹا گلی کے لائسنس کالچ میں بھی تعمیراتی کاموں کا آغاز ہوا ہے۔

اب میں چاہتا ہوں کہ مشرقی پاکستان کی طرف بھی آپ کچھ نظر ڈالیں کیونکہ یہ رنگ رنگ کا دیس ہے۔ رقص و نغمہ کی سرزمین ہے اور فن تیار کی یہاں جگہ جگہ پرورش ہوتی رہتی ہے۔

”جاگو آرٹ میٹرز کا تعارف اب ضروری نہیں رہا ہے۔

اس نے کئی شوقیہ ڈرامے پیش کر کے یہاں دھوم مچا رکھی ہے۔

”دعا کہ انٹیٹیوٹ آف انجینئرز“ میں اس نے ”کچن والا“ چاروں کی

مسلل پیش کیا۔ یہ ایک روایتی ”بیہ“ تھا۔ جس میں ابوالکلام نے

اس پر مبنی ایک ناول بھی سنا ہی لکھا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ جاگو

نے جو پیش کشیں کی تھیں وہ ناول اور بیچے دونوں ہی کامیاب ہوئے تھے۔

”کچن والا“ ایک خوبصورت لڑکی ہے جو سپردوں کے گھر میں

پیدا ہوئی ہے۔ یہ لوگ کشتیوں میں رہتے ہیں۔ مغربی پاکستان کے

بڑی خانہ بدوشوں کی طرح ان بحری خانہ بدوشوں کا بھی کوئی گھروں

نہیں ہوتا اور جہاں نہاں انہما کشتی میں سفر کرتے رہتے ہیں۔ آلا

دستار کریم ان ”بیدلوں“ یعنی سپردوں کی لڑکی ہے۔ وہ آدموں

کے ایک جھنڈ میں اپنا راستہ بھول جاتی ہے اور یہ نہیں جانتی کہ

اپنے قید میں کس طرح واپس جائے۔ یہاں اس کی ملاقات کچن

(گوہر تیل) سے ہو جاتی ہے۔ محبت ہو جاتی ہے۔ سپردوں کا ایک لوجہ

لڑکا ہے مدین، دیو کسا، اسے ان کی محبت کا علم ہو جاتا ہے

اور وہ چونکہ خود آلا کشتی میں ہے اس لئے جہن کی وجہ سے دیکھے

آزار ہو جاتا ہے۔ آلا کچن کو قید میں لے آتی ہے اور اسے سپردوں

میں شامل کرنے کے لئے کہتی ہے مگر اس کی بات نہیں مانی جاتی۔

اور مدین مالا سے اپنی شادی چلنے کا انتظام کر لیتا ہے۔ اس کی باتیں

ایک اور لڑکی چمپا سن لیتی ہے۔ چمپا مدین پر غصہ اور مدین اس

فائدہ اٹھا کر اسے زہر ملا چھل کھانے کو دیتا ہے تاکہ وہ مر جائے

اور اس کی ٹوہ نہ لے۔ مالا اور کچن سپردوں کے چنگل سے نکل

جھانکنے میں مگر مدین ان کے پیچھے پڑا ہوا ہے اور وہ ان دونوں

زہر ملا سانپ چھوڑ دیتا ہے لیکن قسمت انہیں بچا لیتی ہے اور

مصنوعی چہرہ سازی کے سلسلے میں عجیب عجیب بدحواسیاں ہرزاد ہو کر آتی ہیں۔

اب میں آپ کو ذرا سی دیر کے لئے پشاور یونیورسٹی

کی طرف لے چلتا ہوں۔ یہاں بھی شوقیہ تیار تیار ڈراموں کا اچھا

مجموعہ ڈراموں کی پذیرائی کے لئے بیناب رہتا ہے۔ بلکہ ایک ڈراما

یونٹ بنا ہوا ہے جو یونیورسٹی میں ایک مستقل تھیٹر کی تعمیر کا

خواب ہی نہیں دیکھ رہا ہے بلکہ اس کی تکمیل کے لئے پوری طرح

کوشاں بھی ہے۔ اگر یہ تھیٹر بن گیا تو اس جامعہ کے مختلف

شعبوں کے شیدائیان تیار تیار اپنی صلاحیتوں کا بڑا اچھا

نما ہر کر سکیں گے۔ ماضی میں ”رومیو جولیت“ اور ”سپیلٹ“

جیسے ڈرامے پیش ہو چکے ہیں۔ ہم سب جانتے ہیں کہ ڈرامہ ایک

مشکل اور پیچیدہ فن ہے اور خصوصی صلاحیت کے ساتھ خصوصی

مشق و مزا دلت بھی چاہتا ہے۔ اب یہ جگہ طلبہ کی درسگاہ تھی

اس لئے قدرتی بات تھی کہ ان کی توجہ اپنی اعلیٰ ضروریات اور

پڑھنے پڑھانے کے دیرانیہ پر زیادہ مرکوز تھی اس لئے

شیکسپیر کے ساتھ ان کا فکری لگاؤ انہیں اس پر بھی لے آیا

تاکہ ڈرامہ کی نظری باتوں کے سمجھنے کے ساتھ ساتھ عملی باتوں

سے بھی آگاہی ہوئی رہے۔ شخص انگاری انسانی احتیاجات

و تجربات کا بہترین وسیلہ اظہار ہے۔ یہ ایک طرح خود انسان کے

اپنی خودی کی نمائندگی کرنے اور دوسروں کی خودی کو اپنے اوپر

طاری کر کے پیش کرنے کا نام ہے۔ جیسے ہوئے صفحے پر جو کچھ

لکھا ہے اسے بھری وسعتی ڈھانچے میں لانا ایک واقعہ احساس،

ایک کیفیت، ایم اور جاگو دو باور مندہ کرنے کے مترادف ہے۔ اور

ظاہر ہے کہ یہ بڑا مشکل کام ہے، مگر جب مکمل ہو جائے تو ذہنی طاقت

رہائی کشائش اور تسکین احساس کا بڑا نادر نمونہ بن جاتا ہے۔ پھر

ادبی قسم کی موسیقی اور نفسیاتی شاخ کا رقص و نقاشی اس کا مقابلہ

کر سکتی ہے ورنہ کوئی چیز نہیں۔

پشاور کے طلبہ جامعہ نے بہت سی باتوں کو سوچ کر

ایڈورڈ کالج کے، ہال کو ہی پسند کیا۔ ”سپیلٹ“ کو پیش کرنا ویسے بھی

مشکل تھا اور کام کرنے والے نا تجربہ کار بھی تھے۔ مگر اداکاروں

کا فی محنت سے، مکیا اور مہموں ساز و سامان سے اچھی پیشکش کی

سپیرول کا سردار میں اس موقع پر آ جاتا ہے۔ سانپ پلٹ کر
مدن ہی کو کاٹ لیتا ہے اور حبیب و محبوب ہمیشہ کے لئے سپرو
کا ساتھ چھوڑ کر اس وسیع دنیا میں بھل جاتے ہیں۔

یہ نفس واداکاری کا ڈرامہ ہے جو اظہار کی شاید سب سے
پیچیدہ شکل ہے، بالخصوص اس وجہ سے کہ یہ "چپ سوانگ" بھی
ہوتا ہے، یعنی الفاظ بولے نہیں جاتے بلکہ صرف حرکات و سکنات
سے پولڈ ڈرامہ پیش کیا جاتا ہے۔ سخن مالا کے دیکھنے سے یہ بات
واضح ہو جاتی تھی کہ بغیر مکالموں کے بھی ڈرامہ پوری قوت و توانائی
اور صفات اداکاری کے ساتھ پیش کیا جاسکتا ہے۔ ٹیکسٹ کے اعتبار
سے بھی یہ کھیل ٹہرا کامیاب رہا۔

★

بہر فضا ان چند جزوی باتوں کے تعارف سے اس بات کا
مہیں ضرور علم ہو جاتا ہے کہ ملک میں تھیر کی روایات کو زندہ
رکھنے کے لئے جملہ لوازمات موجود ہیں، اور اس بات کی بڑی
ضرورت ہے کہ اس فن کی آبیاری کے لئے ہر صلاحیت کے
لوگ اپنی اپنی جگہ کچھ نہ کچھ کام کرتے رہیں اور اپنے علاقوں کی
روایاتی کہانیوں کی جھلکیاں اور جدید تجربات انسانی کو گام
لیے کھیلوں کی صورت میں نہیں تو ایک نئی نئی شکل میں ہی پیش
کرتے رہیں۔ اسی طرح فن تیار کو زندہ رکھا جاسکتا ہے جس کے ذریعے
ہم اپنی تاریخ، ثقافت اور زندگی کے ماضی، حال اور مستقبل کی
داستان کو محفوظ کر سکتے ہیں :

تبصرہ ۱

ہنگارہ رامپور

ہنگارہ کا سفر جیات بھی خاصا طویل رہا ہے اور یہ اردو
کے ادبی رسائل میں شاید سب سے طویل العمر مجلہ ہے۔ مجموعی طور پر
جنم لینے کے بعد یہ لکھنؤ آ گیا۔ شباب سے شیب تک کئی منزلیں
یہاں طے کیں۔ مگر یکایک اس کی ایک کرن کراچی کے مطلع سے بھی
نمودار ہونے لگی اور لکھنؤ سے بھی جلوہ دکھاتی رہی۔ مگر آٹارسی بے
کباب تک جو ثابت تھا سب سے ہوا چاہتا ہے اور اب تو ہنگارہ ہنگارہ
کی مستقل شکل اختیار کر چکا ہے۔ فطرت میں چونکہ غلامی ہے
اس لئے یہ کیسے ممکن تھا کہ ہند میں محفل ادب سے یہ ہنگارہ کشیں رخ
یوں ہچک پر در کر جائے، اس لئے رامپور والوں نے اس طائر کے
پر باندھ کر اپنے شہر سے بھی تارے دینے شروع کر دیے ہیں۔

اس وقت تک اس کے تین شمارے موصول ہو چکے ہیں
اور یہ دیکھ کر طمانیت ہوتی ہے کہ گو اس طائر خوش پرواز کی شاخ
آشیانہ بدلی ہوئی ہے مگر طرز نگاری میں کوئی خاص فرق نہیں آیا۔
ہمیں معاصر کی اس رائے سے بھی اتفاق ہے کہ غالب پر

لکھنے والے حضرات اپنی قلمی کاوشوں کو ادھر ادھر چھپوانے کی
 بجائے ہر صنف کے صرف تین محلوں سے مختص کر لیں یعنی ہندوستان میں
"ہنگارہ" (رامپور) اور "آجکل" (دہلی) اور پاکستان میں "ماونو"
 (کراچی) اس میں شک نہیں کہ اس طرح غالب پر جو کام ہر صنف میں
 ہو رہا ہے وہ پرانگی، گمنامی اور گشتی کے سانحے سے نکلا جائے گا۔ اس
 سلسلہ میں لکھنے والوں کا ایک مہینہ "فورم" بننے سے تقریباً بھی محفوظ رہتا
 اور قارئین بھی غالب پر پڑھنے کے لئے ادھر ادھر ٹاماک ٹوٹے مارے
 نہیں پھوس گئے جہاں تک ادارہ ماونو کا تعلق ہے اس نے اس روایت کو
 جو وہ آزادی سے قبل "آجکل" میں قائم کر چکا تھا، پاکستان میں بھی برقرار رکھا
 اور ان پندرہ سولہ سال میں غالب پر اتنا کچھ تحریری و تصویری مواد شائع
 کر دیا ہے جو بجائے خود غالبیات پر ایک اہم کام تصور ہو گا۔

ہنگارہ رامپور میں غالبیہ کے تحت جو دستاویزی مندرجات قلم
 لکھے جا رہے ہیں ایک اچھی تجویز ہے اور اس پرمل بھی خوش ذوقی کے ساتھ
 کیا جا رہا ہے۔

امید ہے کہ ان فرد و غالب پاروں کو اور اقیانوس کی طبع
 منتظر نہیں ہوتے دیا جائے گا بلکہ کتابی صورت میں لا آئیں ایک دستبند
 کی شکل دے دی جائے گی : (لط - ق)

صور اسرافیل

قاضی نذرا لاسلام کی منتخب شاعری کے اردو تراجم مع مقدمہ

قاضی نذرا لاسلام مسلم بنگال کی نشاۃ الثانیہ کا پہلا نقیب اور داعی ہے جس کے گرجا
آہنگ نے صور اسرافیل کی طرح قوم کے تین مردہ میں پھر حیات نو بھونک دی تھی۔ اب
یہ لاوا ایک آتش خاموش کی مانند ہے مگر اس مغنی آتش نولے ہمارے دلوں میں حب وطن،
حب ملت اور حب زندگی کی جو قندیل روشن کر دی ہے وہ سدا جلتی رہے گی۔

نذرا لاسلام کی زندگی بخش شاعری اور روح پرور گیتوں کا

یہ چیدہ انتخاب پندرہ اہل فن کی کاوشوں کا نتیجہ ہے۔

کتاب خوبصورت اردو ٹائپ میں چھاپی گئی ہے۔ کتاب کا ہر حصہ دیدہ زیب آرٹ کی جدولوں سے

مرصع جسے مشرقی پاکستان کے نامور نقاش

زین العابدین نے خاص اس مجموعہ کیلئے تیار کیا ہے

قیمت ایک روپیہ ۵۰ پیسہ

ادارۃ مطبوعات پاکستان۔ پوسٹ بکس نمبر ۸۳۳ کراچی

آشوب دہر

(قلّت خیراک کے خلاف عالمی جنگ)

ہم دیکھتے ہیں کہ جدید مواصلات اور تیز رفتار ذرائع نے انسان کو قدرت دی ہے کہ وہ غذاؤں کی حمل و نقل جلد کر سکتا ہے۔ یہ عذر کچھ معقول نہیں رہتا۔ اور پھر یہ امر سامنے ہے کہ لازمی طور پر وہ ملک یا سماج بھوکے نہیں جن کی آبادی زیادہ سے زیادہ ہے۔ آج اقوام متحدہ کا عالمی ادارہ ہی جنگ کا ہر اولیہ دستہ ہے۔ اور اس کے تعاون سے سائنس دان اور ماہرین محاشیات مل کر نوعِ انسانی کی بھرپور لائی بھوک کو مٹانے کے لئے میدان میں آتے ہیں۔

گزشتہ دنوں ساری دنیا اور پاکستان میں ۲۱ مئی سے ۲۸ مئی تک اقوام متحدہ کے زیر اہتمام بھوک سے آزادی کا ہفتہ منایا گیا تھا۔ ہمارے ملک میں بھی بڑے بڑے فکرو اور خلوص سے بھوک کے حلقوم پر زندگی نے ہاتھ رکھ دیا ہے۔ اس سلسلہ میں پورے ملک میں مذاکرے ہوئے، مجالس ہوئیں۔ سائنس دانوں اور دانشوروں نے یکسر دیکھ کر بھوک کے خلاف عمل کیا گیا کیونکہ یہ ایک حقیقت ہے کہ آئندہ کی دنیا کے لئے سب سے بڑا مسئلہ بڑھتی ہوئی نسل کو صحیح اور مناسب غذا دینا ہے۔ آبادی تیزی سے بڑھ چکی ہے اور بڑھ رہی ہے لیکن ذرائع پیداوار میں یہ اضافہ جلد ممکن نہیں۔ اقوام متحدہ کے پاکستانی صدر چودھری محمد ظفر اللہ خان کے خیالات اس اہم اور تشویش ناک مسئلہ کی طرف صحیح رہنمائی کرتے ہیں۔ انہوں نے کہا: ”آج نوعِ انسانی کو کئی مسائل درپیش ہیں۔ ان میں سب سے زیادہ اہم اور سنگین مسئلہ بھوک اور افلاس کا ہے کئی مسائل مثلاً ایٹمی تجربات پر پابندی، تخفیفِ اسلحہ اور ایٹم کا پُر امن استعمال اور خلائی سفر کے معاملات ایسے ہیں جن پر مذاکرات اور قوموں کے باہمی معاہدوں سے عمل ممکن ہے لیکن ایک مسئلہ اس سے بھی زیادہ نازک ہے اور اس پر

بھوک کی آگ صرف جسم ہی نہیں روح اور تخیل کی کونپلوں تک کو جھلسا دیتی ہے بلکہ اس کا پہلا حملہ تو احساسات لطیف اور احساسِ مروت پر ہوتا ہے۔ اور پھر بھوک آداب کے سانچوں میں نہیں دھل سکتی۔ آج بنی نوعِ انسان کے سامنے جو بڑے بڑے معاشرتی اور سماجی مسائل ہیں ان میں بھوک سب سے اہم ہے۔ بھوک کا سیاہ اور مخوسِ عفریت اب بھی انسانی تہذیب اور خوشیوں پر اپنا پنج پھیلائے ہوئے ہے۔ آج بھی اس کا سایہ بھری بری انسانی بستیوں کو جاڑ دیتا ہے اور ان میں مائتا، پیار، تہذیب اور محبت کی جوت بجھ جاتی ہے۔ آج کی مہذب دنیا میں جب کہ انسان علم و ادب سے عظیم لائبریری بھر چکا ہے۔ اس کی آرٹ گیلریوں میں بہترین فن کے مجسمے ہیں۔ اس کے تخیل میں عظیم منصوبے جنم لے رہے ہیں۔ اس کی انجلیاں برق و باد پہنچ رہی ہیں اور آدم خاکی زمین سے بلند ہو کر خلا کی پہنائیوں کو چیرتا ہوا چاند پر گندیں پھینک رہا ہے آدم کے بیٹے اور بیٹیاں بھوک سے بار بار تمللاتی ہیں۔ آج بھوک صرف ایک جبرانیاتی یا قدرتی المیہ نہیں ہے۔ اس لئے کہ سائنس کی عظیم قوتوں نے انسان کو وہ اختیار دے دیا ہے کہ وہ ہر قسم کی غذا صرف زمین سے زیادہ سے زیادہ مقدار میں اٹکائے بلکہ اب تو وہ مصنوعی غذائیں بنا رہا ہے۔ یہی نہیں بلکہ اب سائنس کی ترقی سے غذائیں مدتوں تک محفوظ رکھی جاسکتی ہیں۔ آج بھوک قدرتی المیہ سے زیادہ ایک معاشرتی اور سماجی مسئلہ بن گیا ہے۔ پہلے زمانے میں قحط قدرت یا موسموں کا خطاب تھا لیکن آج بھوک عموماً انسان کی غلطیوں کا نتیجہ ہے۔ نوعِ انسانی اس قسم کی بھوک کے خلاف جنگ کرنا چاہتی ہے۔ اگرچہ اس میں ایک حد تک دخل کثرتِ آبادی، زمین کی فصلوں پر زیادہ انسانی کامیٹ پالنے کا بوجھ اور شرحِ آبادی میں اضافہ بھی ہے۔ لیکن

برسی طرح اس بھوک سے متاثر ہیں۔ اور اس کی مختلف شکلیں گھٹا گھٹا انداز میں سلسلے آگرماسج کو ڈراؤنا بناتی ہیں۔ اندازہ ہے کہ صرف ایشیا اور افریقہ میں ہر روز ۳۰ ہزار آدمی صرف بھوک سے ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مر جاتے ہیں۔ اس کے برعکس دنیا کی آبادی کا کافی حصہ زیادہ خوراک اور غذا کی زیادتی سے مرتا ہے۔ معاملہ دراصل متناسب غذائیت کا ہے۔ اور باقی تعلیم، پروگنڈا اور نشر و اشاعت سے لوگوں کو سمجھائی جاسکتی ہے۔ بھوک بعض اوقات سماجی حالات کا نتیجہ ہوتی ہے۔ مثلاً خداؤں کا منافع کی غرض سے اندوخت کرنا یا نفع کی خاطر بیچ دینا۔ منڈیوں کی تلاش — تجارتی اتار چڑھاؤ۔ مصنوعی قحط اور جنگیں۔ ان حالات کو روکنا اور بھوک کو ختم کرنا لازماً ضروری ہے۔ اس سلسلہ میں یہ امر واضح ہے کہ حکومت ملک میں غذائی پیداوار کے لئے کئی اہم منصوبوں پر عمل کر رہی ہے۔ پہلے پانچ سالہ منصوبے کے بعد اب دوسرے پانچ سالہ منصوبے میں غذائی پیداوار میں اضافے کے لئے اہم کام ہو رہا ہے۔ قیام پاکستان کے بعد سے دریاؤں پر نئے نئے بند باندھے گئے ہیں۔ حالیہ انقلابی حکومت ملک سے بھوک اور افلاس کو مٹانے کے لئے غذائی اضافہ پر خاص زور دیا ہے۔ اس سلسلہ میں حکومت نے زمینی پیداوار میں اضافہ کے لئے زیادہ سے زیادہ زمینوں کو سرسبز اور لہلہاتے کھیتوں میں بدلنے کی کوشش کی ہے۔ جامع منصوبوں سے مشرقی اور مغربی پاکستان میں فصلوں کو بہتر بنانے اور کھیتوں سے بچانے کے لئے ملکی اور غیر ملکی ماہرین کے ساتھ تعاون سے کیا جا رہا ہے۔ نیز:

۱۔ جنگل لگانے پر زور دیا جا رہا ہے۔
۲۔ سیم اور کھجور کے خلاف مہم جاری ہے جو بڑا خطرہ ہے اور جس سے ہر سال لاکھوں ایکڑ زمین ناقابل کاشت ہو رہی ہے۔

۳۔ نہروں کے کنارے بند باندھ کر سیلابوں کی روک تھام
۴۔ نئے پٹلوں اور بندوں کی تعمیر۔
۵۔ بہتر بیجوں کی تقسیم۔

حال میں ہمارے ہاں زراعت اور آبپاشی کے کئی بڑے منصوبے تکمیل کو پہنچے ہیں۔ کوٹری بیراج - دریائے سندھ پر گدو بیراج کی تکمیل۔ دارمک بند - راول بند اور مالکنڈ منصوبے کی تکمیل

(باقی صفحہ ۵۹ پر)

فوری طور سے کوئی معاہدہ نہیں ہو سکتا۔ عالمی بھوک کا مسئلہ صرف دستخط کر کے توہیں نہیں حل کر سکتیں۔ اس کو مٹانے کے لئے لگاتار ایک عرصہ تک انسانی ذہانت اور باوقار ذرائع کا صحیح استعمال کرنا ہوگا۔ اس سلسلہ میں اقوام متحدہ کے شعبہ خوراک و زراعت کی بھوک کے خلاف مہم بڑی مقدس اور اہم جنگ ہے۔ اس سے معلوم ہوا ہے اس مسئلہ کو حل کیا جا سکتا ہے۔ بھوک ایک ایسا دلخیز ہے جس کو انسان کی پیشانی سے مٹانا ہوگا۔ آج اس کا مٹانا مشکل نہیں۔ اس سلسلہ میں اقوام متحدہ کے غذا اور زراعت کے شعبے نے بتایا ہے کہ آج ہر ۳ ہزار انسانوں میں سے کم از کم آدھے یا تو بھوک کے ہیں یا ان کو مناسب غذا نہیں ملتی۔ دنیا کے غذائی ذرائع کو نہ صرف اتنا بڑھنا چاہیے کہ وہ ان سب کو تغل اور پوری غذا بہم پہنچائے بلکہ اس بڑھتی ہوئی آبادی کو بھی جہر سال ۵ کروڑ کی رفتار سے پھیل رہی ہے پیٹ بھرے کے لئے سامان دے۔

انسانی بھوک کی ہمیشہ سے کئی قسمیں رہی ہیں:-

۱۔ قدرتی اور جغرافیائی بھوک۔ موسموں اور بارشوں کی کمی سے ہوتی ہے۔

۲۔ معاشرتی اور سماجی حالات کے تحت پیدا شدہ قحط۔

۳۔ غذا کا نہ ملنا یا کم ملنا۔

۴۔ غلط اور حیاتین سے خالی غذا یا مناسب غذائیت کا نہ ہونا۔

دنیا کو آنسو لڑکھو کوں سے بھی لڑنا ہے۔ بتایا گیا ہے

کہ غذائیت میں صحیح توازن نہ ہونے سے بھی انسان بھوکا رہتا ہے۔

اندازہ ہے کہ دنیا کے تقریباً سو کروڑ باشندے نامناسب غذا میں

کھاتے ہیں۔

اب اپنے ملک کی طرف آئیے۔ ہمارے وزیر خوراک نے

اقوام متحدہ کے زیر اہتمام "بھوک سے آزادی" کی مہم پر ایک پیغام میں

کہا ہے کہ دنیا سے اور پاکستان سے بھوک مٹانے کے لئے حکومت

اور نجی اداروں کا تعاون بڑا ضروری ہے۔ اس کے علاوہ سائنسدان

دانثور اور ماہرین تعلیم مل کر باہمی ایچے سے بھوک کے خلاف مقدس جنگ

لڑیں تاکہ نوب انسانی کی اس وسیع بیماری کو مٹایا جاسکے۔ آپ نے

کہا کہ بھوک ایک بیماری ہے جس کا علاج ضروری ہے۔

واقعی یہ حقیقت بھی ہے کہ افریقہ اور ایشیا کی عظیم آبادیاں

مسلم شعراء بنگال

پچھلے چھ سو سال میں مسلمانوں نے بنگالہ شعروادب میں بیش بہا اضافے کئے ہیں۔ یہ ان کا ایک مختصر، مگر سیر حاصل انتخاب ہے جو عہد قدیم سے معاصر شعراء تک پیش کیا گیا ہے۔

یہ ترجمہ آئن احمد آٹھک اور جناب یونس آفر
نے براہ راست بنگالی سے اردو میں کئے ہیں۔
صفحات ۲۵۰ صفحات۔ کتاب مجلد ہے، پارچہ کی
نغیں جلد۔ طلائی لوح سے مزین۔ قیمت صرف
چار روپے ۵۰ پیسہ یہی کتاب سادہ جلد میں چار روپے

ادارہ مطبوعات پاکستان پوسٹ بکس نمبر ۱۸۳۔ کراچی

نوائے پاک

ملک میں ایسے مجموعہ منظومات کی بڑی ضرورت محسوس کی جا رہی تھی، جو ہمارے وطنی احساسات کو بیدار
کر سکے اور ہمیں اپنے وطن کی پاک سرزمین کی عظمت اور محبت سے روشناس کر سکے۔

”نوائے پاک میں ملک کے نامور شعراء کی
لکھی ہوئی وطن جذبات سے برنہ نظمیں گیت
اور ترانے درج ہیں۔

کتاب مجلد ہے اور خوبصورت گرد و پوش سے
آراستہ بگٹ آپ بہت نفیس اور دیدہ زیب
قیمت صرف ایک روپیہ

ادارہ مطبوعات پاکستان۔ پوسٹ بکس نمبر ۱۸۳۔ کراچی

چناب سے پدما تک (عوامی کہانیاں)

ہمارا ملک اس لحاظ سے کافی ممتاز و منفرد ہے کہ اس کا دامن طرح طرح کی اچھوتی، دلچسپ، عوامی کہانیوں کے گہرائیوں میں ڈھکیا ہوا ہے۔ مغربی پاکستان کی دنیا دل آویزیوں کا ایک بوقلمون مرتفع ہے تو مشرقی پاکستان کی بھی ایک اپنی ہی دنیا ہے اپنی ہی فضیلت ہے، انیس ہری بھری، مسکراتی۔ مگر فرزندِ ان کو وہ دونوں اور ایک و محرابوں با نرم کوشِ دُوب میں جھلکتی چھلکتی کہنیاں ندیوں اور اندنی گھٹاؤں کے دیس والے ہوں، ان سب کے ذہنوں، تجزیوں اور احساس نے جن حن کہانیوں کو بے پناہ طور پر جنم دیا ہے وہ ایک ہی چیز کی غماز اور عکاس ہیں۔ عوام کے اپنے دل کی دھڑکنیں۔ ان کی حیات کی جھلکیاں اور ساتھ درگمیں جذبات و احساسات کی بے لوث تصویریں۔ ہر کہانی پر تجزیہ کی کار فرمائی ہے یا بیانِ واقعہ کی تفسیرِ جمیل۔ مشرقی پاکستان یا مغربی پاکستان، ان کی رو میں ایک ہی ہیں۔ اس لئے ان عوامی کہانیوں کا مطالعہ ہمیں ایک دوسرے کے قریب تر لانے اور باہمی تعارف و یکجہالت کا احساس پیدا کرنے میں مدد دیتا ہے۔

چند جھلکیاں:

تعارف: رفیق غاوری: ابتدا میں ایک بسیط مقدمہ جس میں عوامی کہانیوں کے مخصوص تیوروں پر مرتبہ ایک بھرچرہ روشنی ڈالی ہے۔
ایک کے اس پار: موسیٰ خاں گل مکئی، آدم درخان، محبوبہ جلات، یوسف کڑھما، شہی نور دلی، نرسا نگہ، بہرام گل اندام۔
بیچِ ندر: ہیرا پنجا، ہیرا سیال، مرزا صاحب، سوہنی مینوال، یوسف زلیخا، میندھرا مول۔ سہی۔
وادیِ ہیرا: سسی پنوں، سرستی، مول رانو، عمرار دلی، سوار دلی، بیلا چنیس، لوزی جام تاجی۔ وادیِ یولان: بیلا تود۔
کشمیر: گلزار شہر مار۔
مشرقی پاکستان: جوا، گونائی بی بی، دیوانی مدینہ، جلال ریکیما، آئینہ بی بی، کنول کنڈ۔ اس مجموعہ کا ایک اہم و دلچسپ پہلو یہ ہے کہ ہر کہانی کے ساتھ اس کی ایک مختصر منظوم جھلک بھی پیش کی گئی ہے۔
قیمت صرف دو روپے

ادارہ مطبوعات پاکستان۔ پوسٹ بکس ۸۳۳۔ کراچی

آشوب دہر : بقیہ صفحہ ۵۹

مشرقی پاکستان میں کرناغلی پروجیکٹ اور کپتانی بند کی تکمیل وہ عظیم کارنامے ہیں۔ جو حکومت نے، پنجرہ زمینوں سے غذا حاصل کرنے کے لئے انجام دیئے ہیں۔ اب مسئلہ صحیح اور متوازن غذا، اس کی صحیح تقسیم اور معاشرتی احساس کا ہے۔ تو اس سلسلہ میں سائنس دان۔ ماہرین معاشیات اور غذا و زراعت کے ماہرین کو چاہئے کہ وہ عام آبادی کے مسائل کو جلد سے جلد حل کرنے میں مدد دیں۔ تعلیم اور ہدایت سے لوگوں میں ایک دوسرے کی مدد کا جذبہ اگر بیدار ہو جائے تو بھوک کے خلاف جنگ میں فتح ہوگی اور اہل وطن بھوک کی غلامی سے چھٹکارا پائیں گے، کیونکہ تہذیب اور شناسائی کے تمام دعوے اس وقت تک باطل ہیں جب تک آبادی کے افراد بھوک سے تمللارہے ہیں۔ شاید اسی لئے تمام پیغمبروں اور بادلوں نے سب سے پہلے بھوک کے خلاف جنگ کی ہے۔ اور اسے تمام مصیبتوں اور برائیوں کی جڑ بتایا ہے۔

شہری و دیہاتی متروکہ زمینوں کے

یونٹ

کا اگر آپ نقد معاوضہ حاصل کرنا چاہتے ہیں تو

پتہ ذیل پر تشریف لائیں۔

دفتر: سٹار پرائیٹ ڈیلرز

نمبر ۲۳۔ انارکلی۔ لاہور فون (۶۷۲۶)

نوٹ:- قسطوں پر حکم اور یونٹ فروخت کر کے معقول معاوضہ حاصل کر سکتے ہیں

مسلم ہنگالی ادب

ہنگال سے ترجمہ

ڈاکٹر انعام الحق، ایم۔ اے۔ پی۔ ایچ۔ ڈی

اس کتاب میں ہنگالی زبان و ادب کی مکمل تاریخ، اور اس کے ثقافتی، ادبی و تہذیبی پس منظر کا جائزہ لینے کے بعد بتایا گیا ہے کہ اس زبان کی نشوونما اور ترقی و تہذیب میں مسلمان حکمرانوں، صوفیاء، اہل قلم، شعراء اور ادباء نے کس قدر حصہ لیا ہے۔ یہ جائزہ بہت مکمل اور تحقیق و تفصیل کا شاہکار ہے۔

پوری کتاب نفیس اردو ٹائپ میں چھاپی

گئی ہے اور جلد ہے، سرورق دیدہ زیب

اور رنگین فحاشات ۲۰ صفحات۔

قیمت صرف چار روپے

ادارہ مطبوعات پاکستان۔ پوسٹ بکس ۸۳ کراچی

ماہنامہ ناکراچی، مئی ۱۹۷۳ء

ڈبلوپٹی-آئی-ڈی-سی-سینٹ



مپل لیف

ZEALPAK

زیر پاک

مقبول کا نام

یہ اعلیٰ معیار کے سینٹ ہماری قومی اُمّتوں کو
حقیقت کا روپ دے رہے ہیں

تین لاکھ سینٹ ہریکسی
موسم کا حاصل سے سیکھا وہ سیک
فول ٹیمر کے باجروں اور اچھے پلانے
پشاور کو پھیل سکی
پونہ کو سنی پھول کا ہور
اور سنے دار گلزار اسلام آباد
کی تعمیر نیز واپس گئے
دوسرے تعمیر کے منصوبوں
کے لئے
مپل لیف
سینٹ کا انتخاب
کیا ہے۔

زیر پاک سینٹ ہمارے ہاتھوں میں حاصل ہے کہ
کاڈر اعلیٰ کے منظر کی تعمیر میں استعمال کے لئے
موزوں ہے کیا۔
چوٹال خرمیوں اور مٹی میں ہر کی وجہ سے ہی
ہوئی مشرک کا ٹیٹنیل اور پھیل چیک
آہٹ پاکستان کی عظیم تعمیرات
کے لئے زیر پاک سینٹ استعمال
کیا جا رہا ہے۔
یہی نہیں بلکہ گئے، ڈکھا۔ اسے کی
اسکی مودی کے تحت فخر والی
عمارتوں میں بھی یہی سینٹ
استعمال ہو رہا ہے۔

ممبران پاکستانی صنعتی ترقیاتی کارپوریشن



”ماہ نو“ میں مضامین کی اشاعت سے متعلق شرائط

- ۱۔ ”ماہ نو“ میں شائع شدہ مضامین کا مقبول معاوضہ دیا جائے گا جس کے بعد وہ ادارہ کی ملکیت ہوں گے اور وہ انہیں حسب منشا ہر طور سے استعمال کرنے کا مجاز ہوگا۔
- ۲۔ مضامین بھیجنے وقت مضمون نگار حضرات ”ماہ نو“ کے معیار کا خیال رکھیں اور یہ بھی تحریر فرمائیں کہ مضمون غیر مطبوعہ ہے اور اشاعت کے لئے کسی اور رسالہ یا اخبار کو نہیں بھیجا گیا ہے۔
- ۳۔ ترجمہ یا تلخیص کی صورت میں اصل مصنف کا نام اور دیگر حوالہ جات دینا ضروری ہیں۔
- ۴۔ ضروری نہیں کہ مضمون موصول ہوتے ہی شائع ہو جائے۔
- ۵۔ مضمون کے ناقابل اشاعت ہونے کے بارے میں ایڈیٹر کا فیصلہ قطعی ہوگا۔
- ۶۔ ایڈیٹر کو مسودات میں ترمیم و تنسیخ کرنے کا مجاز ہوگا مگر اصل خیال میں کوئی تبدیلی نہ ہوگی۔
- ۷۔ مضامین صاف اور خوش خط کاغذ کے ایک طرف تحریر کئے جائیں۔
- ۸۔ پتہ بہت صاف اور مکمل درج کیجئے۔
- ۹۔ اپنے مضامین نظم و نشر کی نقول اپنے پاس بھی رکھئے۔ غیر طلبیدہ اور ناقابل اشاعت مضامین کی واپسی کے لئے داک کے مناسب ٹکٹ روانہ کیجئے۔

(ادارہ)

خیابان پاک

پاکستان کی علاقائی شاعری کے منظوم تراجم کا انتخاب

علاقائی شاعری کی روایات - سہائے گیت اور میٹھے بول پاکستان کی نغمہ ریز سرزمین کی خام پیداوار ہیں۔ ان کے منظوم اردو تراجم کا یہ انتخاب چھ زبانوں کے اصل نغمات کی صدائے بازگشت ہے۔ ساتھ سے زیادہ مقبول شعراء کا کلام۔

کتاب نفیس اردو ٹائپ میں بڑے سائز پر

وضع داری کے ساتھ طبع کی گئی ہے۔

گرد پوش مصور ضخامت:

تین سو صفحات (۳۰۰)

قیمت چار روپے

ادارہ مطبوعات پاکستان - پوسٹ بکس ۸۳۳ کراچی

صحت اور دانت



صحت کا دار و مدار دانتوں پر ہے۔ دانتوں کو مضبوط اور مسوڑھوں کو صحت مند رکھنے کے لئے ضروری ہے کہ انھیں کیڑا لگنے سے محفوظ رکھا جائے کیونکہ اس سے بڑی بڑی بیماریاں پیدا ہو سکتی ہیں۔ ہمدرد منجن 'جسے بے شمار تجربوں اور تحقیقات کے بعد مکمل کیا گیا ہے' دانتوں کے لئے بے حد فائدہ مند ہے۔ مندرجہ ذیل اسباب کی بنا پر آپ کو کسی کا انتخاب کرنا چاہئے۔

صفائی اور مالش :- ہمدرد منجن اندر تک پہنچ کر دانتوں کو اچھی طرح صاف کرتا ہے۔ انگلی کی مدد سے مسوڑھوں کی بھی مالش اور ورزش ہو جاتی ہے جو دانتوں کے لئے بے حد ضروری ہے۔

ہمدرد منجن کے باقاعدہ استعمال سے نگوٹیں وغیرہ کے دھبے دور ہو جاتے ہیں اور دانتوں میں قدرتی چمک پیدا ہو جاتی ہے۔

خوش ذائقہ :- ہمدرد منجن خوش ذائقہ ہے اور اس کے ٹھنڈے اثرات بچے اور بڑے سب پسند کرتے ہیں۔

خوش گوار :- ہمدرد منجن کی دیر پا خوشبو منہ کی بدبو کو دور کر دیتی ہے۔



ہمدرد منجن

مسکراہٹ میں کشش اور دانتوں میں چمکتیوں کی چمک پیدا کرتا ہے



ہمدرد دواخانہ (وقف) پاکستان
کراچی ڈھاکہ لاہور



آسٹریلک کا زمانہ
مسترتوں سے بھرپور ہوتا ہے !

جی ہاں! آسٹر ملک بچے کی صحت اور مناسب نشوونما کے لئے مفید و بنیادی دین قائم کر دیتا ہے۔

اسٹریٹلینڈ ملک اعلیٰ اور خاص قسم کے درخت سے تیار کیا جاتا ہے۔ اس میں فولاد لایا گیا ہے۔ تاکہ تجھ میں خون کی کمی نہ ہونے پائے اور ٹیبلوں اور دانتوں کی مضبوطی کے لئے دھاتوں میں کسی بھی شام کی گالی ہے۔ اسی لئے اچانک دھچک جاتے پر یا (اس کی کسی پوری کرنے کے لئے دانتوں میں پورے اعتماد کے ساتھ تجھ کو اسٹریٹلینڈ ملکہ دیتی ہیں۔



آسٹریلیا
ماں کے دودھ کا بہترین نعم البدل

بچوں کی پرورش پر ایک مفید کتاب
آئرشلک کی کتاب اردو میں دستیاب ہوگئی ہے۔ بچپن ہونے پر
۵۰ روپوں کے ٹکٹ۔ یہی اردو ایک کتاب مفت حاصل کیجئے۔
بی۔ او۔ بکس نمبر ۴۶۷۷۔ کراچی ۷۔

مسلم بنگالی ادب

(بنگلہ سے ترجمہ)

ڈاکٹر انعام الحق ایم۔ اے۔ پی۔ ایچ۔ ڈی

اس کتاب میں بنگالی زبان و ادب کی مکمل تاریخ اور اس کے ثقافتی، ملی و تہذیبی پس منظر کا جائزہ اپنے کے بعد بتایا گیا ہے کہ اس زبان کی نشو و نما اور ترقی و تہذیب میں مسلمان حکمرانوں، صوفیاء، اہل قلم، شعرا اور ادباء نے کس قدر حصہ لیا ہے۔ یہ جائزہ بہت مکمل اور تحقیق و تفصیل کا شاہکار ہے۔

پوری کتابت نفیس اردو ٹائپ میں چھاپی گئی ہے اور جلد ہے۔

سرورق دیدہ زیب اور رنگین - ضخامت ۴۰۰ صفحات

قیمت چار روپے (علاوہ محصول ڈاک)



چین سے دو خط

انڈین ٹیلی ہیرل
چنگ کنگ چین
۲۵ اگست ۱۹۶۲ء

..... گزشتہ ہفتہ کی ڈاک میں آپ کی اسل کردہ
دل روڑ کی پیشی ٹی بشکرے! مجھے دس سال کے عرصہ سے
یہ تکلف تھی ہر قسم کی دسی و اگریری ادویات استعمال
کیں مگر کچھ بھی آفت نہ ہوا۔ دل روڑ کو صرف
چودھ دن لگانے کے بعد تمام شکایت جاتی رہی۔
کاش! مجھے پہلے ایسے تیرہ ہدف علاج کا علم ہوتا.....

ن۔ ا۔ غ
میگر

انڈین ٹیلی ہیرل
چنگ کنگ چین
۲۲ جولائی ۱۹۶۲ء
..... مجھے کچھ عرصے گزرنے پر ایک قسم کی عینیت ہے
دل سے ہیں جن کی وجہ سے عارض بہت ہوتی ہے
نشانات تو رنگ و دم سے ملتے ہیں مگر باوجود
انگریزی علاج کے آفت نہ ہوئی ہو! افضل میں آپ
کی دانی دل و زکا اشتہار دیکھ کر خیال ہوا کہ اسے بھی
استعمال کر کے کھول دیکھیں کہ انڈین تھائی شائے کیا آپ
مہربانی فرما کر ایک ٹی شیٹ دل و زکا زنجیر لایا ہے
بند لیا پسل واد کر سکتے ہیں.....

ن۔ ا۔ غ میگر

دل روز تمام لاء علاج جلدی امراض

ہر قسم کے پوٹے پھنسی لاپوری پوٹے
مثلاً پیوٹے یا سورہ گیگت۔ بال توڑ داو منجیل عارض
گچ خست زیر کچھالی۔ گچی۔ رسولی۔ ساخوڑ پینڈی۔ رتہ مہار
دو۔ جیلن یوجن چوٹ۔ نئے اور پرانے زخم اور زہریلے جانوروں
کے کاٹے اور ڈسے کا بغیر اور تیرہ ہدف علاج ہے۔

حیر مجاڑ اور مریم ٹی سے نجات دلاتی ہے

قیمت فی شیٹ

دو روپے - ایک پیسہ

۱۹۶۲ء استعمال میں ہے

حکیم طاہر الدین اینڈ سنز ڈالہ فیروز پور روڈ لاہور - خیاب

ہر شہر وادوں میں طلب کریں

لاہور

» ماہ نو «

کے لئے غیر طلبیدہ مضامین

- ۱۔ غیر طلبیدہ مضامین نظم و نثر صرف اس حالت میں واپس آئے جائیں گے جب کہ ان کے ساتھ ڈاک کے مناسب ٹکٹ روانہ کئے گئے ہوں۔
- ۲۔ مسترد مضامین کے سلسلے میں غیر ضروری خط و کتابت کرنے سے ادارہ کو معذور سمجھا جائے۔
- ۳۔ ایک ہفتہ تک اطلاع موصول نہ ہونے پر مرسلہ مضامین کو ناقابل اشاعت تصور کیا جائے۔
- ۴۔ ادارہ ڈاک میں کسی مسودہ کے گم ہو جانے کا ذمہ دار نہیں۔

(ادارہ)

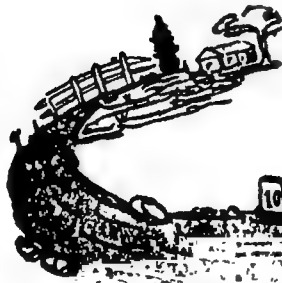


زندگی میں صرف دو
 سائنٹفک طریقہ پر بنے ہوئے
 چشموں سے ان کی حفاظت کیجئے

ایڈیٹر: حاجی الین۔ ایمیرالڈین اینڈ سنز
 سہرا ایلان چیمبر، مغربی میونسپل کارپوریشن، مندر۔ پور، کراچی۔ ڈاک نمبر: ۳۵۰۷۸
 لاہور - ملتان - کراچی

فاصلہ کوئی اہمیت نہیں رکھتا اگر آپ کے پاس

بہترین کوالٹی کی بہ :



موجود ہے !

رستم سائیکل



آپ کو غیر ملکی سائیکلوں کا انتظار نہیں کرنا چاہئے۔ مشہور و معروف ہائیدار اور تیز رفتار
 » رستم سائیکل « ہر چھوٹے بڑے شہر میں کفایتی داسوں پر دستیاب ہے

شمارہ ۶

ماہِ نو

جلد ۱۶

جون ۱۹۶۳ء

مدیر: ظفر قریشی

۶	آمنہ صدیقی	نوائے دوش (ڈپٹی نذیر احمد کی شاعری)	مفسانہ حسین لوگٹا
۱۱	جمیل نقوی	ابر دریا بار	
۱۳	انور سعید گیلانی	مشعل پرچہ و تاب (مولانا محمد علی جوہر رحمہ)	
۱۷	محمود صدیقی	اک طرفہ شاعری... (مولانا حسرت عثمانی رحمہ)	
۱۹	رئیس بیسٹاؤ	ہمنفسان رفتہ (نقیس بھگوری مرحوم کے نام سائنہ کے خطوط)	
۶۲		مرگ شوکت	
۲۴	سید قدرت نقوی	عالم یک شہر جستجو	مقالہ:
۳۲	صہبہ لکھنوی	بزرگ بچوں کے دس ہیں (دیپوتناؤ)	کہانیاں، دیپوتناؤ، ڈرامہ:
۳۷	ظفر حسین	نمر علی کہانیاں	
۴۱	سید احمد رفعت	نظارے (کھیل)	
۵۴	سحر انصاری	کھری ہوئی شبیریں	منظمیں:
۵۴	عرفانہ عزیز	ابر رواں	
۳۱		شان الحق حقی	غزلیں:
۵۵	تمہید الاسلام سید	رضی ترمذی	
۵۰	سید غلام حسن شاہ کاظمی	سید گل (ہزارہ)	مغربی پاکستان:
۴۸	سید جگر کاظمی	گل ہے گل ہے باز خواں... (پشاور میں عید)	
		★	
۵۶	رشید نیاز	چین اور اسلام	تاریخ:
۶۰		(ہماری ڈاک)	ماوشما،
	(عید)	یوم بہاراں	سرورق:

فکاپٹ

۵۰ پیسہ

شائع کردہ:
ادارۃ مطبوعات پاکستان، پوسٹ بکس ۱۸۳، کراچی

سکالانہ چندہ

پانچ روپے ۵۰ پیسہ

رعب دیتا تھا انہیں لشکر جہاز کا کام
کہ زمانے میں بندھی ابھی ہوا رکھتے تھے
فتح اک خادمہ تھی ان کی اور اقبال غلام
مختصر یہ ہے کہ پہلے یہ خدا رکھتے تھے

نذیر احمد کے نزدیک مسلمانوں کی پستی کا سبب ہے
تھاماس نے انہوں نے جا بجا جہالت کو ختم کرنے پر زور دیا ہے۔
اور تعلیم کی افادیت و اہمیت کو واضح کیا ہے۔ علم ان کے نزدیک
سب سے بڑی دولت ہے، مگر وہ علم نہیں جو ذہنی حیاشی کی حیثیت
رکھتا ہے، بلکہ وہ علم جس سے زندگی کو بنایا اور سنوارا جاسکے۔ نذیر احمد
اس علم کو "علم نافع" کہتے ہیں اور اسی کو عام کرنے کی تمنا انہیں بے تاب
رکھتی ہے۔ وہ اس حقیقت پر پورا پورا یقین رکھتے ہیں کہ سلطنت کے بچے بچا
کے غم کی تلافی علم ہی سے کی جاسکتی ہے۔ وہ قلم کی حکومت کو دوا می سمجھتے ہیں،
یوں کہ اس کے مقابلے میں باقی سب حکومتیں بیچ ہیں:

حکومت ہے بیچی حکومت قلم کی
نہ بدوقت و سیف و سنان و علم کی
خدائی خزانوں کی کبھی قلم ہے
کہ جو حرف لکھتا ہے وہ اک رقم ہے
قلم کا قلم ہے قدامت سے جاری
اسی کی حکومت کو ہے پاداری
اگر اس حکومت سے ہم کام لیتے
تو شاہنشاہی مفت بے دام لیتے
گئی سلطنت اس کے جانے کا غم کیا
نہیں پاس کاغذ و دوات اور قلم کیا
مگر علم کہ ہم نے طاقت نہ جانی
نہ جانی نیافت، یا قوت نہ جانی
گو استاد منشور و منظوم ہیں ہم
و لے علم نافع سے محروم ہیں ہم

اہل یورپ کی تقلید بھی وہ صرف اسی حد تک چاہتے ہیں
کہ ان سے علم — "علم نافع" حاصل کیا جائے۔ ان کے نزدیک
اس کی دو وجوہ ہیں۔ اول تو یہ علم اہل یورپ نے خود مسلمانوں

سے حاصل کیا تھا، لہذا مسلمانوں کو حق حاصل ہے کہ وہ اہل یورپ سے اپنی اس
امانت کو واپس لیں۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ اہل یورپ کی ساری ترقی
علم ہی کی بدولت ہیں، انہوں نے ہر دور کا سینہ چیر کر جا بجا اپنی فتوحات
کے جو جھنڈے گاڑے وہ علم ہی کی بدولت ہیں، اس لئے مسلمانوں
کو اگر اپنی فلاح مقصود ہے اور انہیں اہل یورپ کی طرح اقوام عالم
کی نگاہوں میں ممتاز ہونا ہے تو انہیں علم حاصل کرنا چاہئے۔ نذیر احمد
انگریزوں سے شیر و شکر ہونے کے لئے بے تاب نظر آتے ہیں، مگر محض
اس لئے کہ ان سے علم و ہنر حاصل کر سکیں۔ انہیں یہ کسی طرح پسند نہیں
ہے کہ مسلمان انگریزوں کو "خیر" سمجھیں اور ان سے گریزاں رہیں:

مگر کیا ظلم ہے ہم بدگماں ہیں اس قدر ان سے
کہ ہر اک بات میں رکھتے ہیں پرہیز و حذر ان سے
اہلی کب وہ دن ہوگا کہ ہوں شیرو شکر ان سے
تو پھر جی کھول کر حاصل کریں علم و ہنر ان سے

بطور دغوش دلی ایک ایک کی عادت کو مہ جلتے
یورپی کچھ تفرقہ مذہب کا رہ جائے تو وہ چاہئے
لیکن اس سلسلے میں وہ خلصے محتاط نظر آتے ہیں۔ انگریزوں
کی تقلید میں وہ "ابن الوقت" کا سا انداز پیدا کرنے کے خلاف ہیں۔
وہ یہ نہیں چاہتے کہ مسلمان اپنی معاشرت کو بھی اہل یورپ کی نقلی
کا آئینہ بنا کر رکھ دیں، اور اپنی وطنی و قومی خصوصیات کو بھول جائیں،
انگریزوں سے "شیر و شکر" ہونے کا مطلب صرف ایک ہے کہ اس طرح
"علم نافع" حاصل کیا جائے۔ وہ صرف یورپ کے علم کے مداح ہیں، وہ ان
کے تمدن کے نہیں۔ یورپ کے تمدن کو تو وہ "سکھ ملتیں" (کھوٹا سکھ)
تک کہہ جاتے ہیں اور اس امر پر اظہارِ انوس کرتے ہیں کہ وضع یورپ
کو پسند کیا جا رہا ہے:

تمدن میں داخل ہوئی وضع یورپ چلن ہو چلا سکھ ملتیں کا
وہ تقلید وضع یورپ کو ہر اعتقاد سے اپنی قوم کے لئے نقصان
سمجھتے ہیں، اور انہیں یہ خطرہ لاحق ہوتا ہے کہ کہیں "کو اچلا ہنس کی
چال..." والا حال نہ ہو:

کیا پیش لئے دیکھیں تفسد وضع یورپ
کو ہے ہیں چال ساری ہم ہنس کی چلے ہیں
گویا اس طرح وہ سریند تحریک کے ایک بہت بڑا... میلنگ

نذیر احمد کہتے ہیں وہ کافر سی، لیکن دنیوی فائدے کے لئے ان کی باتیں ماننی ہی چاہیں:

پڑھ سکيا ہوسید کے نزدیک پیچھے سونجی یہ کافر۔ سہی بلا کفر
وے گر کہ دنیوی فائدے کی تو کیا مند سے کر لو! بغضال ہرگز

ایک دوسری نظم میں کہتے ہیں:-

خدا نے کیا ہم میں اک شخص پیدا
مسلمانوں کی قوم کا دل سے شیدا
ہو اسلام کا بول بالا کسی ڈھب،
یہی، اس کا دیں ہے یہی اس کا مذہب
جو ہو خُبت قومی میں ہر وقت شاعلی
وہ بے چارہ کیا جانے قرض و ذائل
یہ بے دیں ہے یا کہ دیں دار ہے یہ
تمہارے ہی کارن دل انگار ہے یہ
مرد ہر پوجے ہیں، پتھر کسی نے
مگر کی ہے قومی پرستش اسی نے
سخن قوم کا قوم ہی سے سخن ہے
اسے جانتے سوتے بس ایک دھن ہے

ایجوکیشنل کانفرنس کے اجلاس منعقدہ لاہور (۱۹۸۹ء)

میں نذیر احمد نے سرسید کا جو مرثیہ پڑھا تھا، وہ نذیر احمد ہی کی شاعری میں نہیں بلکہ اردو کے شخصی مرثیوں میں بھی خاص اہمیت رکھتا ہے۔ حالی کے مرثیہ غالب کے بعد شاید ہی کوئی شخصی مرثیہ اتنا بلند پایہ ہو۔ اس میں نذیر احمد نے ایک فرد کو پوری قوم کی علامت قرار دے کر ایک فرد کا نہیں پوری قوم کا ماتم کیا ہے۔

اگر کوئی یہ پوچھے کہ نذیر احمد کی بہترین نظم کون سی ہے تو بلا خوف تردید اس مسئلہ کی طرف اشارہ کیا جاسکتا ہے جو ”فسانہ مبتلا“ کے آخر میں بطور منیمہ درج ہے۔ یہ نظم جیسا کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے، کثرت ازواج کے رد میں ہے۔ لیکن نذیر احمد نے اس نظم میں مسلمانوں کے تمام مسائل کا تجزیہ کیا ہے۔ یہ نذیر احمد کی پہلی نظم ہے، لیکن اس میں وہ سب کچھ موجود ہے جو ان کی بعد کی نظموں میں ملتا ہے، ایسا محسوس ہوتا ہے کہ

ہونے کے باوجود اکبر آبادی کے ہم نوا ہیں جیسے ہیں۔

۱۸۵۷ء کے بعد مسلمانوں کی پس ماندگی کو ختم کر سکتے کا جو

سب سے بڑا علاج تجویز کیا گیا تھا وہ یہ تھا کہ مسلمان زیادہ سے زیادہ سرکاری ملازمتیں حاصل کریں سرکاری ملازمتوں میں ہندو پیش پیش تھے، اس طرح مسلمان انگریزوں کے ساتھ ساتھ ہندوؤں کے غلام بھی بن گئے۔ اس دور میں غلامی کو تمام قومی رہنماؤں نے محسوس کیا اور اس کو ختم کرنے کی طلب قیام کی۔ نذیر احمد بھی اس سلسلے میں خارش نہ رہے اور وہ مسلمانوں کو مشورہ دیتے ہیں کہ وہ سرکاری ملازمتیں حاصل کرنے میں دوسروں سے پیچھے نہ رہیں، ایک نظم میں سرسید کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں:

ہم ہیں بہت عاشقوں کے فسانے جو عاشق ہو وہ عشق کی قدر جانے
کچھ ہے ہر شے احمد کو دیکھا تو سمجھے کہ ہاں عشق ہوتا ہے ایسا
خُبتِ جلال کے شیعہ ہیں بد جہل نہ سب طبیعت کے ہوتے ہیں غفلت
قد رطلب گر خدا اس کو زردے گور منٹ کو یہ مسلمان کر دے
سلمان کلکٹر، مسلمان کشنر مسلمان ہر ایک صیفے میں افسر
ہی جیت جیتیں یہی مولیٰ جی ہوں ٹکس دھوم سے چل کے کچھ میں جی ہوں
سرسید کا ذکر آگیا ہے تو یہ کہنا نامناسب نہ ہو گا کہ سرسید

نذیر احمد سے بڑا احمد کوئی نہیں مل سکا۔ حالی اردو دوسرے شاہیر کی رفاقت تسلیم۔ لیکن نذیر احمد نے جس طرح سرسید کو ان کے مقاصد میں کامیاب دیکھنے کے لئے کوششیں کی ہیں، ان کی کوئی دوسری مثال موجود نہیں۔ نذیر احمد اسے درے سخن ہر طرح سے مدرستہ العلوم ملی گڑھ کی مدد کرتے رہے۔ وہ اپنی جیب خاص سے ہی نہیں مدد کرتے تھے بلکہ دوسروں کی جیبیں بھی خالی کر دالیتے تھے۔ سرسید کی ذات اور ان کے مقاصد سے انہیں پوری پوری ہمدردی تھی، انہیں بعض نہ بھی معاملات میں سرسید سے اختلاف تھا اور اس کا انہوں نے بڑا اظہار بھی کیا، لیکن اس اختلاف کی وجہ سے وہ سرسید کی خواہش کے منکر نہ ہو سکے۔ انہوں نے اپنی تحریروں میں جا بجا سرسید کی تعریف کی ہے اور منظومات میں تو شاید ہی کوئی نظم سرسید کے ذکر سے خالی ہو۔ نذیر احمد نے ہر موقع پر سرسید کی قومی ہمدردی کو سراہا ہے اور انہیں بہت بڑا ہر قوم قرار دیا ہے۔ سرسید پر کفر کا فتویٰ لگا۔

خزینوں ہم ان کو چپکے چپکے سمجھایا کئے
اب جو کچھ کہنے کو ہیں سو بر ملا کہنے کو ہیں
کوئی لے بھی جائے ہم سے دل کہ قعدہ پاک ہو
یہ حسینان جہاں بھی دل رہا کہنے کو ہیں

آدل سے ہوتے آئے ہیں دنیا میں انقلاب
اک طرح پر کسی کا زمانہ رہا نہیں
جو واقعہ ہے اس کا سبب ہے کوئی فرد
ٹوٹا کسی مقام سے یہ سلسلہ نہیں
کیا رویے کہ غور سے دیکھا تو واقعی
اپنا ہی ہے قصور کسی کی خطا نہیں
ہم آپ جھنے دیتے نہیں نقش مدعا
وردہ ہمارے ہاتھ میں سب کچھ ہے کیا نہیں

صبر رخصت ہوا سنتے ہی ترازم سفر
تم تو کل جاؤ گے یہ ہم سے ابھی چھوٹ گیا
نہ سہی پڑے۔ تجھے دکھلاؤں گا اپنی پرواز
گر قفس سے ترے صیاد کبھی چھوٹ گیا

ہمیں جو امید زبوں سب نے دیکھ پایا ہے
ہر ایک بے سبب آمادہ ہے جفا کے لئے

رحمت اے دست جنوں زحمت سے فارغ کو یا
جیب و داماں دونوں غائب ہیں سلواؤں گے کیا

نذیر احمد کی شاعری ان کی قادر الکلامی کی آئینہ دار ہے
انہوں نے مشکل زمینوں میں طویل نظمیں لکھی ہیں اور کہیں
آدھ کا احساس نہیں ہوتا، سپاٹ اور "بغیر شاعرانہ" شام
ان کے ہاں ہے مزور، لیکن بہت کم۔ اکثر جگہ شاعری کے
خوبصورت نمونے ملتے ہیں، اس کی ایک مثال ملاحظہ ہو، ایک
نظم میں اسلام کو باغ سے تشبیہ دی ہے اور پھر اس باغ کا نقشہ

(باقی صفحہ ۳۳ پر)

جیسے نذیر احمد کی تمام نظمیں اسی مسدس کی وضاحت میں لکھی گئی
ہوں۔ ہماری قومی شاعری کا ذکر کرتے ہوئے شاید ہی کسی
نقاد نے اس مسدس کے بارے میں کچھ کہا ہو۔ میرے نزدیک ہماری
جدید شاعری کی بنیاد جن دو چار نظموں پر ہے۔ ان میں یہ مسدس بھی
شامل ہے۔ یہ نظم اسی سے زائد بندوں پر مشتمل ہے بے ثباتی
دنیا کے ذکر سے اس کی ابتدا ہوئی ہے۔ اور اس میں مسلمانوں کے
عروج و زوال اور ان کے ماضی و حال کی تصویر کشی دلچسپ پیرائے
میں کی گئی ہے۔ اس کے بعض بندوں پر تو ایسا گمان گزرتا ہے
جیسے اقبال کو اسی مسدس نے "شکوہ" لکھنے پر آمادہ کیا ہو۔

ہم نے بنایا اہل جہاں کو خدا پرست
ہم نے دلایا یاد انہیں وعدہ الست
ہم نے کیا بتوں کے تئیں سرنگون بیت
ہم نے اتارہ نشہ صہبائیانی مست

شائعگی کی بیل ترقی کے ساتھ تھی
پود اس کی ہے لگائی ہوئی اپنے ہاتھ کی
نذیر احمد نے غزل کی طرف کبھی توجہ نہیں کی اور اسی
وجہ سے ان کے زمانہ میں انہیں "شاعر کی بجائے" ناظم
کہا جاتا تھا۔ نذیر احمد کے علاوہ اردو میں شاید ہی کوئی اور
شاعر ہو جس نے غزل کا ایک آدھ شعر نہ کہا ہو، وردہ یہاں تو
یہ عالم ہے کہ زندگی بھر غزل کی مخالفت کرنے والے بھی غزلیں
کہتے بغیر نہ رہ سکے۔ نذیر احمد کی شاعری ایک خاص مقصد کی
حامل تھی، اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے غزل مفید مطلب
نہ تھی۔ اسی لئے انہوں نے غزل کی طرف توجہ نہ کی۔ اس کے باوجود
ہن کی نظموں کے بعض اشعار غزل کے حامل ہیں۔ ایسے چند
شعر سنئے، جن پر غزل کے شعروں کا گمان ہوتا ہے:-

تو چاہتا ہے سیر مجھے در و جام سے
اور یاں سبو بھی قطرہ ہے گر تا گل نہ ہو
مجھ کو دیا گیا ہے وہ مایوس دل جسے
احساس شاد ماتی لا تقنط نہ ہو
جو آرزو ہے اس کا نتیجہ ہے افعال
اب آرزو یہ ہے کہ کوئی آرزو نہ ہو

ابر دریا بار

جمیل منقوی

نمود و در دل شب روئے، ابر دریا بار۔ اور ڈپٹی نذیر احمد "ابر دریا بار" ہی تو تھے۔ "سید والا گہر" کی بزم کے ایک رکن رکن جن کی ساگرہ اسٹیل انجن مصنفین پاکستان (کراچی) نے بڑے اہتمام سے منائی۔ یہ بہاریں نظم ہی تقریب کی یادگار اور اسی چشم و چراغ محفل کی آب و تاب کا لطیف پرتو ہے۔

(ادارہ)

ہر ایک صنف سخن تھی فسانہ و افسوں	بقدر ظرف تصور تھی کائنات ادب
سمجھتے تھے ادب و فن کو باد و گلگول	ہر ایک کہنے حکایت تھی نثر میں واسوخت
ہر ایک لفظ کے ساغر میں نشہ افیوں	ہر ایک بات میں ایہام و صنعت تعلیل
ادب کی جان تھے شرح و بیان سوز و دل	"زہے کرشمہ کریوں دے رکھا تھا دل کو فریب"
جنوں کا نام خرد تھا خرد کا نام جنوں	ادب تھا عشق کی غارت گری سے شرمندہ
یہی طلسم تھا مرغوب خاطر محضوں	وصال و ہجر تھیں دو کرو میں فانیوں کی
بس اک بہشت شامل تھا اور دل مفتوں	جیسے شرم سے تحت الشعور ری تھا
جناب شیخ کی سادہ ولی تھی وجہ سکوں	خیال جلوہ گل سے خراب تھے میکش
رقیب و حسرت دیدار و دیدہ میگوں	شراب خانہ و خمار و شیشہ مئے تاب
جفا و جور و ستم کی حکایت پُر خوں	جگر کا درد، جگا ہوں کے تیر، خنجر ناز
ادب کی جان تھے ایسے ہی بیشتر مضمون	"وفا مقابل و دعوائے عشق بے بنیاد"

مزاج نکتہ و لہجہ خود پرست و عرش نشین
جھکی ہوئی در محبوب پر ادب کی جبیں

ازہرم سید والا گھر چرائے غاسٹ
کہ بر فروخت چو خورشید روئے اردو را
نور و در دل شب روئے ابر دریا بار
نیز، باقی اسلوب کو نذیر احمد
نزد اک و گہرا بجوئے اردو را
فشانہ در ہمہ اطراف بوئے اردو را

جنوں کی عقل کی کوتاہیوں کا محرم ہے
وہ علم و فضل کی دولت بھی کوئی دولت ہے
فقیہ شہر خرد کو یہ راز سمجھائے
نہ دوسروں کو نوازے نہ اپنے کام آئے

عروس فکر کے زانو پہ رکھ کے آئینہ
نئے نشاط سے بدست اہل غفلت کے
الٹ کے تلخ حقائق کے رخ سے تیرہ نقا
کبھی حکایت صبر گریز پا کہہ کر
مشام عقل کو خوشبو سے روشناس کیا
بنا کے شکوہ "راحت جواحت پیکال"
کبھی حقوق و فرائض کا تجزیہ کر کے
کبھی نصوح کے پردہ میں چند پند دئے
کبھی تراش کے رویے صادقہ کا ظلم
سنائے مردہ دلوں کو کبھی فسانہ غدر
صلے میں راست بیانی کے کافر ی پائی
رخ حیات کے نقش و نگار چمکائے
عیوب انہیں کی زباں سے کچھ ایسے گنوائے
ضمیر عصر کے چہرہ کے داغ دکھلائے
دل و نظریہ مطعن کے تیرہ برسائے
اگر کبھی چین و دل میں پھول برسائے
بناتِ نقش کو آدابِ مہر م سکھلائے
مقلدوں کو شریعت کے راز سمجھائے
کبھی روایت زہر سے قلب گہرائے
نئے مبادی حکمت کے تار سلجھائے
بڑھادے نگہ سو گوار کے سنائے
رہ سلوک میں ایسے مقام بھی آئے

ہمیشہ دست بکا رگرہ کشائی زد
چوں با خدا بتواند دم از حدائی زد

رئس الاحرار مولانا محمد علی "جوہر"

۱۸۷۸ء - ۱۹۳۱ء



"مر کے "جوہر" آپ کے جوہر لہلے"

حاکم حاکم ہے اتر موت سے ڈر۔ ہے یہی
 ہوس زینب ہو اس درجہ تو رہنا ہے یہی
 فلزم عینی میں ہیں نفع و سلامت دونوں
 اس میں ڈوبے بھی تو دا پار اترنا ہے یہی
 اور کس وضع کی حویا ہں عروسان بہشت
 ہیں کفن سرخ ، تسمیہوں کا سنورنا ہے یہی
 حد ہے بستی کی کہ بستی کو بندی حانا
 اب بھی احساس ہو اس کا تو بھرنا ہے یہی
 ہو نہ مایوس کہ ہے فتح کی تقریب شکست
 قہر مومن کا مری جان نکھرنا ہے یہی
 نقد جان نذر کرو سوچتے کیا ہو "جوہر"
 کام لرنے کا یہی ہے ، تمہیں لرنے ہے یہی



لوہ کی نقاب کشائی

دنیا کے ترقی یافتہ ممالک کی صف میں ممتاز مقام حاصل
کرنے کے لئے ہمیں جدید فنون کی تحصیل پر اور زیادہ
زور دینے کی ضرورت ہے۔ پچھلے دنوں ملک میں ایک
اور فنی درسہ کا قیام عمل میں آیا۔

(گورنمنٹ پولی ٹیکنک انسٹی ٹیوٹ) : (افتتاح : صدر پاکستان



اس درسہ میں برقی قوت کا شعبہ

ملک کی
یونیورسٹی
وائس چانسلر
ایوان
(راولپنڈی)
میں
ملک کے
اہم تہذیبی
مسائل پر
غور و



شعلہ پرتیچ و تاب

(رئیس الاحرار مولانا محمد علی جوہر)

انور سعید گیلانی

ہے فرق جینے اور مرنے کا، کوئی شاعر نہ بات نہ تھی بلکہ تامل حقیقت تھی۔
چنانچہ انہوں نے صاف صاف کہہ دیا تھا کہ،
لاکھ جینا ہے اگر موت سے ڈرنا ہے یہی
ہوس زلیت ہو اس درجہ تو مرنا ہے یہی
اور انہوں نے اپنے شاندار منصب العین کو ہمیشہ ہوس زلیت سے
بلند تر رکھا اور اس مقصد جمیل کو اس پر ترجیح دی۔

ابوالاثر حفیظ کے اس خراج تحسین کو یاد کیجئے
جو انہوں نے اس بطل حریت کو یاد کیا ہے۔ ان کا الہام
سرفروشا نہ ذوقی جہاد ایسے ہی خراج تحسین کا مستحق ہے۔
وہ اس کا بہ شدت تمام متقاضی ہے۔

آزادی کے اس بے پاک پرستار نے دیکھا
کہ ایک قوم کی قوم باہر بخیل ہے۔ وہ بے بس
ہے، بے دست و پا ہے۔ مورد تعزیر ہے۔ وہ ایک
ایسے دامن سخت میں گرفتار ہو چکی ہے جس سے ناپائی کی
امید مہوہم نظر آتی ہے۔ اور اس کو نہات دلانے کے
لئے طوفان حوادث کے خلاف انتہائی بے باکی سے
سینہ سپر ہونے کی ضرورت ہے۔ ان حالات میں مخالف
عناصر سے محترمانہ لینے کا ارادہ ہی قابل تصور تھا۔ چہ جائیکہ کوئی شخص حقیقت
پیکار حیات میں کوئی پرکربستہ موجد اور اہل من مہارذ کا نعرہ
بلند کرتے ہوئے داد شہادت دیتا۔

مولانا محمد علی ان حوصلہ مند انسانوں میں سے تھے جنہوں نے
اس زبردست چیلنج کو بے محابا قبول کیا اور شدید سے شدید شہادت
مصائب کے سامنے سینہ تان کر کھڑے ہو گئے۔ ان کی لٹکا لٹکی آواز
آج بھی وقت کے پردوں کو چیر کر آتی ہوئی سنائی دیتی ہے۔ اعلان کی

ایک ایسی ہستی بن گیا کہ زمانہ بھی ہے اور افسانہ بھی۔ وہ خود
زندہ تھی۔ اس لئے اس نے ایک ایسی روایت کو جنم دیا ہے جو آج بھی
زندہ ہے۔ اور جب بھی ہم اپنے اس ماضی کی طرف رجوع ہوتے ہیں۔
جو کچھ ایسا دور بھی نہیں ہے۔ کیونکہ ہم میں اور اس میں
کل ۳۲ سال ہی کا تو فرق ہے۔ میں الاحرار مولانا محمد علی جوہر کی وفات
۵ جنوری ۱۹۳۱ء کو تریپن ہسپتال کی عمر میں واقع ہوئی تھی۔ تو ہم

اس مجاہدوں کے مجاہد اور جنگ آزادی کے شہرے
دوچار ہوتے ہیں جس نے زندگی کی، فسرہ رگوں میں
تازہ خون دوڑا دیا تھا اور سینوں کے اندر دل کی
دھڑکنیں تیز کر دی تھیں۔

مولانا محمد علی نے ایک نہایت نازک اور
بڑے پراسشوب زمانے میں جب آزادی کا نام تک لینا
جرم تھا اور جس کی سزا اور رسن سے ادھر کچھ نہ تھی، انتہائی
بے باکی کے ساتھ میدان جہاد میں قدم رکھا اور اپنی تمام
زندگی اس کے لئے وقف کر دی۔ وہ حقیقی معنوں میں
شیخ آزادی کے پروانے تھے اور اس پروانے کا انجام بھی
وہی ہوا جس کا تصور کیا جاسکتا ہے۔

پھر نہ دیکھا ہم نے جزیک شعلہ پرتیچ و تاب
شیخ تک ہم نے بھی دیکھا تھا کہ پروانہ گیس

یعنی انہوں نے اپنی ساری حیات آزادی ہی کی جدوجہد میں ختم کر دی۔
قوم نے آزادی کے اس مجاہد کو یونہی رئیس الاحرار کے خطاب
سے یاد نہیں کیا۔ یہ اس یگانہ روزگار شخصیت کی قدرو منزلت کا اقل
تقاضا تھا۔ اگر اس سے بھی بڑھ کر کوئی جلیل القدر خطاب ممکن ہوتا تو وہ
اس کے بھی پوری طرح مستحق تھے کیونکہ ان کے نزدیک محنت میں نہیں

”دیوان جوہر“
(جلد دوم گزشتہ)

مرتبہ

خور الرحمن

ناشر

شیخ غلام علی ایڈیشنر

لاہور و کراچی

صفحات : ۱۷۰

قیمت ۱۰ روپے

ہانگ جزا سی شدت سے گوش زد ہوتی ہوئی رعوں کو تڑپاتی امدادوں کو گراتی ہے۔

دورِ فلانی بیشک تھا وہ لوگ جنہوں نے دورِ آزادی میں آنکھیں کھولی ہیں وہ اُن دنوں کا تصور بھی نہیں کر سکتے جب افکار پہ قید اور جذبات پر زنجیریں تھیں اور ساتھ ہی انسان کی بات چیت اور عمل پر بھی زنجیریں چڑھا دی گئی تھیں۔ کس کی مجال تھی کہ اپنا سر بھی اٹھا کر چل سکے یا حکمِ حاکم کے سامنے ہونے بھی کر سکے اور مسلمانوں کے لئے تو تلف و کرم اور بھی سوا تھا۔ اجنبی طاقتوں کے بے نام گرائل ستم ہی نہیں بلکہ ابنائے وطن کی رقابت، ریشہ دوانی اور جادو خانہ طرز و روش کا جو روستم بھی، جو کچھ کم سنگین اور گراں بار نہ تھا۔

یہ نفاض تھی جس میں محمد علی، شوکت علی سلسلے آئے امدادوں کی بے باک آوازیں بلند ہوئیں۔ تحریکِ خلافت کا غلغلہ بلند ہوا۔ دلوں بھائی اس تحریک کی روح و رواں اور محرکِ آما علامت تھے۔ جیسی تحریک جہتم بالشان تھی اسی طرح ان کی شخصیتیں بھی جہتم بالشان تھیں۔ جہادِ آزادی کے نعروں سے بھرپور نفا میں جینا حقیقی ملنوں

میں جینا تھا۔ اس میں ایک بے پناہ دلولہ آفرینی تھی۔ ایک بے پناہ جوش و خروش۔ طول و عرض ملک میں تحریکِ خلافت گونج رہی تھی اور اس کے ساتھ دونوں مجاہد بھائیوں کی للکار بھی۔ آج یہ آواز اس شہر میں بلند ہوتی تو کل دوسرے شہر میں۔ لمبے لمبے شہر اور جلوس ہر ہریل میں دلولہ ہی دلولہ پیدا کرتے ہوئے، اور میلوں لمبے جلوسوں کے سامنے یہ دونوں کوہِ پیکر بستیاں۔ رعب انگیز و جاہت اور شجاعت کی تصویر۔ اُن کی مخصوص ٹوپیاں، چاند ستاروں سے مزین، دوری سے اپنے پر عظمت پر شکوہ اور باوقار پہننے والوں کے دبدبہ میں اضافہ کرتی ہوئی اور پھر اُن کی برسرِ عام شعلہ فشاںی۔ یہ وہ منظر ہے جسے کبھی فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ ایک وقت تھا جب ہندوستان کے گوشے گوشے سے افغانستان تک خلافت، خلافت ہی کے نعروں کو نچتے تھے۔ اور پچھلے بچے کی زبان پر یہ ناقابلِ فراموش بول تھے،

”بولی آماں محمد علی کی

جان بیٹا خلافت پہ دے دے

ہجرت کی تحریک کا یہ سماں دیکھنے کے لائق تھا کہ کس طرح کنبے کے

کنبے اپنا گھربا چھوڑ کر، قلیل ترین زاد راہ سے کمرِ آزادی کے گیت بجاتے ہوئے انتہائی دالہا نہ پن کے ساتھ افغانستان کی طرف ہجرت کے لئے چلے جاتے تھے۔ یہ سب علی بردارن کے بے اندازہ اثر اور مقبولیت کا ہی کرشمہ تھا۔

مولانا محمد علی جوہر جو ”کامریڈ“ اور ”ہمدرد“ جیسے بلند پایہ اخبارات کے مدیر کی حیثیت سے بھی جدید صحافت کے بانی مبنائی اور انگریزی امدادوں میں سے فکر و افکار کے پہلے انقلابی داعی اور معاصر تھے حقیقتہً ہماری ملی نشاۃ الثانیہ کے بھی اولین نقیب تھے۔ ان کے نزدیک صحافت تمام تر زندگی کے انقلاب اور آزادی کی آئینہ دار تھی۔ جہاں وہ بذاتِ خود سر ناپا پیکر حریت تھے وہیں ان کی صحافت بھی آزادی و انصاف کا نعرہ مستانہ تھی۔ چنانچہ وہ آخری دم تک انہی کے حلیف رہے یہاں تک کہ انہوں نے غلام آہاد ہند میں مرنا بھی گواہ نہ کیا۔ ان کو زندگی ہی نہیں موت میں بھی ایک غلام سر زمین سے وابستہ ہونا گوارا نہ تھا۔ یہ ان کے لئے باعثِ ننگ تھا۔

یہی وجہ ہے کہ مولانا محمد علی آج بھی زندہ ہیں۔ وہ ہماری نظروں میں آج بھی ”رئیس الاحرار“ ہیں اور کشمکشِ حیات میں ہمارے لئے ایک بے نظیر مثال، ایک دلیلِ راہ، اور ایک زبردست محرک ہیں۔ ان کی شخصیت ایک ایسا شعلہِ جوالہ ہے جس کے قریب آتے ہی ہم خود بھی پیکرِ التهاب بن جاتے ہیں اور خواہ ہمارے حالات کچھ بھی ہوں، ہم بعینہً وہی روش اختیار کرتے ہیں جو انہوں نے اپنے عہد کے مطالبات کے رد و حدود اختیار کی تھی۔ بیشک خلائی کے تقاضے اور مسئلے نہایت دشوار ہوتے ہیں لیکن آزادی کے تقاضے اور مسئلے بھی کچھ کم دشوار نہیں ہوتے بلکہ وہ ان سے بھی زیادہ دشوار ہوتے ہیں۔ اور ان سے جھپٹنے کے لئے اور بھی زیادہ بے باکانہ جذبہ و جوش کی ضرورت ہوتی ہے۔ رئیس الاحرار کی انقلاب آفرین شخصیت ہمیں برابر ہمہ گیر ہے، ہمارے سینوں میں آزادی کی برقی حرارت بھرنے، ذوقِ جہاد کو اشتعال دینے، کٹھن سے کٹھن حالات کا پامردی سے مقابلہ کرنے، مردہ دلوں میں اپنے آتشِ نفس سے روحِ حیات پھونکنے اور مردہ کے تقاضوں پر لبیک کہنے کی تحریک دلائے کے لئے ہر دم موجود ہے۔

آج رئیس الاحرار ہم میں اپنے اس پیکرِ آزادی کے ساتھ موجود

۱۷

اپنی قلم ہے تو سرورق پر اپنے قلم - چند جملے بھی ملاحظہ ہوں:

۱: فکر گزار اور ممنون ہیں کہ کہ ہم متذکرہ بالا۔

۲: ایسے بر محل شعر پڑھتے تھے کہ معلوم ہوتا تھا کہ

۳: ایسے وقت اختیار کیا کہ ان کی علالت کہ۔

۴: دونوں کی شاعری کا جواں گما بھی جدا ہے۔

۵: ملا، اور دوسری فروگذاشتوں پر بھی ایک نظر:-

۱۱) اٹھ کرٹے ہوئے، مسجد و قبر، روزانہ زنداں،

گھنٹھنٹھا - ایسا خراباٹ معان است دریا

زندان اندر است! اور دریا کے درمیان "و"

غائب!

۱۲) شب فرقت کی جو گھڑیاں کا گزرنا ہے یہی،

خطوط اوپس کے عکس یکم وضع چونا تو خیر ناگزیر تھا لیکن

ان دونوں اور تعلق میں عکس و عکس کا التزام کھینچنی

خصوصاً جب لقل میں 'خار چشم ساقی' بھی شامل

ہو جائے۔ مثلاً:

— اس آستان پاک پہ گہنا ہے چل کے سر

— مگر قریب ہے یوم الحساب دیکھو تو

— اگلی سی اب نہ زخم کی طعنا نیاں کہاں۔

جب ہماری ادبی تحریک کا آغاز ہوا تھا، اس وقت جدید شاعری کا سلسلہ بالکل نیا تھا۔ اور جو طرز و روش بھی اختیار کی گئی تھی اس کی حیثیت ابتدائی نمونوں کی تھی۔ یوں بھی شعرو فن کا تصور کچھ اتنا آگے نہیں بڑھا تھا اور مذاق شعری بھی ابتدائی کا آئینہ دار تھا۔ اس لئے اگر آج، اور اس دور کے انداز تصور میں فرق پیدا ہو چکا ہو تو کچھ عجب نہیں۔ ممکن ہے آج کے نقاد جو کلاسیکی شاعری اور قدیم اصول انتقاد سے بہت پرے ہٹ چکے ہیں اور مغرب کے تنقیدی نظریوں اور مسلکوں سے بخوبی آشنا ہیں، وہ اس ابتدائی دور کے شعری ادبی مظاہر کو کچھ اور نظر سے دیکھیں۔ لہذا جو ہماری نہیں ان سے پہلے اور بعد کے اکثر شعرا کا اس تبدیلی نظر سے متاثر ہونا لازم ہے اور زندگی کی طرح ادب و فن میں بھی ارتقا کا تقاضا یہی ہے کہ تازہ بہ تازہ نو بہ نو کو ملحوظ رکھتے ہوئے سابقہ فن پاروں کو از سر نو پرکھا جائے اور ان کی قدر و قیمت متعین کی جائے۔

نہیں ہیں جس کو دیکھتے ہی وجاہت اور حریت کی زندہ علامت ہماری نظروں میں پھر جاتی تھی، لیکن ان کا کلام، جوان کی آتش شخصیت کا عکاس ہے آج بھی ہمارے پاس ایک عزیز و ورثہ کی طرح موجود و محفوظ

زندہ دار و درو آئنا بر مرد

ادبیم اس خاکستریہ اس آتش گرم کا سراغ لگا سکتے ہیں جس نے

انہیں اودان کے ماحول کو تھما تر شعلہ و شرار بنا دیا تھا اور وقتنا جو

ہم سب کے دل میں ہے کہ ہم ان آتش پاروں کو ان کی شایان شان

خوش آئند شکل میں بھی دیکھیں، "دیوان جوہر" میں پوری کردی گئی

"دیوان جوہر" کو جناب نور الرحمن نے بڑے اہتمام سے

مرتب کیا ہے۔ یہ اہتمام یوں ہے کہ دوران اسیری میں مولانا نے

اپنے ہاتھ سے جو کلام قلمبند کیا تھا اور جسے اب ہماری قومی میوزیم

میں محفوظ کر دیا گیا ہے اس کا عکس ماحصل کر کے اس کے بالمقابل

تسلطیق خط میں بھی اسے پیش کر دیا گیا ہے۔ اس وجہ سے دیوان جوہر

کی تاریخی حیثیت اور شیکش کی محسوس بہت بڑھ گئی ہے۔ ابتدا میں

مرتب نے "پیش لفظ" میں اس عہد کی ایک زندہ و گویا تصویر بھی

پیش کی ہے جو ہماری نظروں سے اوجھل ہونے لگے باوجود

غیر معمولی دلچسپی کا حامل ہے اور جس سے ان کی ملی و سیاسی

سرگرمیوں کے ساتھ صحافت اور شاعری کی چنگاریاں بھی

ابھر رہی۔ مرتب نے جو کچھ خود دیکھا ہے اسے دوسروں کو بھی دکھانے

کی کوشش کی ہے۔ اس لئے اس کے بیان میں وہ تمام باتیں ہیں

جو ذاتی مشاہدہ و تجربہ کے رچاؤ سے پیدا ہوتی ہیں اس سے

رہیں الاحرار کی شخصیت بڑی خوبی سے اجاگر ہوتی ہے اور ہم

یا تو ان کے سوانح سے لطف اندوز ہوتے معلوم ہوتے ہیں یا

کسی معاصر کی ڈائری کے اوراق کا مطالعہ کرتے ہوئے محسوس

کرتے ہیں۔ سیرت اور شاعری کے تدریف کا حق بھی ایک اور ناظر

جناب ڈاکٹر محمد طاہر فاروقی: صدر شعبہ اردو، پشاور یونیورسٹی

نے ادا کیا ہے جس سے تصویر اور بھی واضح، بلکہ شوخ و رنگ ہو جاتی

ہے۔ ادبیم رئیس الاحرار میں دولت ہندو ادب پاکستان ہی کے طاہر

پیش رس کا عکس پاتے ہیں۔ سلسلہ کی آخری کڑی جوہر کے حالات

زندگی کی سن وار ترتیب ہے۔

تعارف میں بعض فروگذاشتیں بھی ہیں۔ مثلاً گمراہ پوش:

ظاہر ہے کہ جہاں تک شاعر کا کلام اپنے دور کی حقیقتوں کی فوجیت ہوتا ہے اور اس کی دامانگیوں میں شریک، اس تک وہ دور رفتہ کی یادگار ہو کر رہ جاتا ہے اور جو حصہ نیرنگی زمانہ سے متاثر نہیں ہوتا، وہ بدستور قابل اعتبار ہوتا ہے۔ بنا بریں ناقد یا مرتب کا یہ فرض بھی قسراً پاتا ہے کہ وہ اس لفظ 'نگاہ' سے زیر نظر کلام کا جائزہ لے۔

"دیوان جوہر" کی موجودہ ترتیب اس "بارامنت" کے احساس سے بیگانہ ہے۔ اس لئے جدید قاری اس میں ہدف رفتہ ہی کی مدائے بازگشت سنتا ہے۔ جیسے ناقدین بھی تمام تر شاعری کے ہم آواز ہوں۔ جوہر ہوں یا ان کا ہم وضع دوسرا شعاع مثلاً حضرت ان کے بارے میں بنیادی سوال انقلاب اور تغزل کی بنیادی غیرت ہے۔ انقلاب کی روح بغاوت کی روح ہے۔ روایت سے بھر کریز اور تجدید کی طرف پیش از پیش اقدام۔ تغزل عاشقانہ لب و لہجہ اور عادی میلان کا آئینہ دار ہے جس میں کاوش کسی فکری یا جذباتی انگیخت کے تحت ابھر کر افق کے دسبجے تک نہیں پہنچ سکتی۔ لہذا یہ انقلاب کی بے چین، غیر مطمئن، آتش زیر پاہ روح کسی طرح غزل کی ہم مزاج نہیں۔ یہ دونوں دست و گریباں ہیں اور جو شعاع انقلاب کا حق غزل کے ذریعہ سے ادا کرنا چاہتا ہے وہ انقلاب کی حقیقی روح تک رسائی نہیں پیدا کر سکتا۔ جوہر کے سلسلے میں یہ طالع دلچسپی کا باعث ہے کہ کہاں غزل کی۔ پھر ہی میں ہے کہ وہ کسی کے پڑے رہیں۔ سے پڑے ہٹ کر ہم ایسے ہو جاتے ہیں کہ کسی در پر پڑے نہ رہیں، یعنی ایک ہی جگہ پر جم کر نہ رہ جائیں۔

ظاہر ہے کہ جوہر کے کلام کا کامیاب حصہ وہی ہے جس میں انقلاب فی الحقیقت انقلاب ہی کے رنگ میں ہے وہ تمام تر انقلاب ہے اور اس میں اسی کی روح رچی بسی ہوئی ہے۔ ان کے کلام کا یہ حصہ زندہ جاوید ہے۔ ضرورت یہ ہے کہ اس حصہ کو خصوصیت سے الگ کر کے اس پر نظر ڈالی جائے۔

شعروادب میں یہ امر بھی قابل ملاحظہ ہے کہ صاحب فن کی آواز اس کی لہنی آواز ہو۔ دوسروں کی آواز کا محشر تاں نہیں کیونکہ

انسان کی اپنی آواز میں ایک خاص انفرادیت، ایک خاص اٹھلاؤ ہوتی ہے۔ وہ شہیدہ آوازوں کا ہنگامہ زار نہیں ہوتی۔ مولانا محمد علی طبعاً جلوت کے آدمی تھے۔ ایسے انسان جن کو جماعت کے ساتھ انس ہو۔ اسی نے انہیں ایک ہر دلعزیز سربراہ بنایا تھا دوسروں سے گھل مل جانے والا انسان۔ اسی لئے وہ اپنے آپ کو دوسروں میں کوئی بریگانگی محسوس نہیں کرتے ہم ان کے ہیں ہمارا پوچھنا کیا۔ اور یہ منتشر ہے۔ یہ ہم آمیزی اس حد تک پہنچ گئی ہے کہ وہ ان کے ساتھ ان کی بات چیت، ان کے الفاظ، ان کے خیالات ان کے احساسات کو بھی اپنا ہی سمجھتے ہیں اور انہیں ایسی بے تکلفی سے کام میں لاتے ہیں گویا وہ انہی کے ہوں۔ شعر و سخن کا سارا ذوق سارا مال و منال شعر کہ ہے اور وہ شعری ہمہ اوست کے قائل ہیں۔ وہ دوسروں کے ساتھ مل کر چلتے ہیں۔ اور ظاہر ہے کہ دوسروں کے قدموں کے ساتھ ان کا اپنا قدم بھی ہے۔ یہ ہم قدمی ان کے یہاں جا بجا نمایاں ہے۔ چنانچہ جس طرح لوگ نشر کے حوالے دیتے ہیں اسی طرح وہ شاعری میں دوسروں کے حوالے دیتے ہیں۔ اس طرح "دیوان جوہر" میں کتنے ہی دیوان جمع ہو گئے ہیں، بالخصوص دیوان غالب، جس کی آوازاں کے ہاں ہر کہیں گوشتی نظر آتی ہے۔

سب سے بڑی خصوصیت جو قاری کو متاثر کئے بغیر نہیں رہ سکتی مولانا کا بے اندازہ خلوص ہے۔ وہ فطرتاً ہی اور سربراہ تھے۔ شاعری ان کے لئے محض مشغلہ تھی۔ اس لئے ان کو شعر و سخن کے سخت گیر معیار سے جانچنا بھی بجا نہیں تھا۔ یہ کہہ دینا ضروری ہے کہ احساسات کی شدت نے ایک ذہین صاحب فوق شخص کو، جو بنیادی طور پر مدبر و سیاست دان تھا، شاعر بنا دیا۔ اس لئے اس کی شاعری کی روح دیوان شعریات کا ایک دلچسپ امتزاج ہے۔ اور جہاں وہ ایسے انقلابی شاعر نہیں ہیں، وہ غزل کی پرانی روایت سے نباہ کرتے ہیں اور یہ بھی ان کی طبع و فاسرشت ہی کا خاصہ ہے۔ وہ اپنی فطرت کے اخلاص سے بے نیاز نہیں رہ سکتے؛

لوگوں کو یاد آئیں گی باتیں ہمساریاں!

”اک طرفہ تماشائی“

محمد صدیقی

برابر شائع ہوتی رہیں، جنہیں لوگ بڑے شوق سے پڑھتے، اور ان پر اظہار خیال کرتے رہتے تھے۔ سودیشی کی تحریک چلی تو مولانا کو اس سے دلی لگاؤ پیدا ہو گیا کیونکہ وہ سامراج کے خلاف اس ہتھیار کو بڑا ہی مؤثر سمجھتے تھے۔ کچھ پہننے کے ساتھ ساتھ انہوں نے کھتر فروخت کرنے کا کاروبار خود بھی کیا۔ انہوں نے بدیشی مال کا بائیکاٹ صرف زبانی طور پر نہیں کیا بلکہ خود عمل سے اس کا طریقہ بھی بتایا۔ سیاست میں وہ موتی لال، گوکھلے اور کانگریس کے دیگر رہنماؤں کے خیالات سے متفق نہ تھے بلکہ ملک کی حکمت عملی کو زیادہ پسند کرتے تھے اور نرم رو لینڈول پر بہت بڑی طرح برستے تھے۔

سامراج کے خلاف عمل اور قلم کا یہ جہاد بڑھتا ہی چلا گیا اور ۱۹۰۸ء میں ان کی بعض تحریروں حکومت وقت کے عتاب میں آ گئیں جس کی وجہ سے ان پر مقدمہ چلایا گیا۔ ”پاداش“ میں قید با مشقت بخیر ہوئی۔ اس وقت کے جیل خانوں میں اخلاقی قیدیوں کے ساتھ سیاسی قیدی بھی رکھے جاتے تھے اور ان کے ساتھ بدترین اخلاقی مجرموں کا سلسلو کیا جاتا تھا۔ اسی قید فرنگ جھگڑنے میں شاید حسرت نے ہی پہل کی تھی۔ اس وقت ”اے“ ”کلاس“ اور ”بی“ ”کلاس“ کی پُر تکلف جمیلیں نہ ہوتی تھیں اس لئے حسرت کو بھی اخلاقی قیدیوں کے لباس میں ان ہی کے ساتھ رکھا گیا اور وہاں انہیں غریب کلیفین، مشقیں اور بے عرقی کے سوا ہنسی خوشی برداشت کئے گا۔ اگست ۱۹۰۸ء کے شمارہ (اردوئے معلیٰ) سے معلوم ہوتا ہے کہ جب مولانا جیل میں داخل ہوئے تو ان کو ایک لنگوٹ۔ جاتنگیر، کرتہ، ٹوپی پہننے کو ملا اور اڑھنے بچانے کے لئے ایک کسبل اور ٹاٹ کا ٹکڑا عنایت کیا گیا تھا۔ جرمانہ الگ ہوا تھا۔ مگر سامراج نے اپنا پونڈ بھر گوشت اس طرح وصول کیا کہ ان کتب خانہ ہی بیچ ڈالا اس کتب خانہ میں بہت سی نادر کتابیں

برصغیر کی تاریخ آزادی کا تذکرہ ہوا ادب کی بات چلے، حسرت کا یاد آنا ننگز پر ہے۔ ادب اور سیاست کو آمیز کرنے میں ان کا بڑا ہتھوڑا، بلکہ اگر یہ کہا جائے تو مبالغہ نہ ہو گا کہ ان کے سیاسی معتقدات شعری پیکر میں بھی ڈھلے رہے اور انہوں نے اپنی آتشیں طبیعت کے اظہار کے لئے شعر کو بڑی خوبی کے ساتھ وسیلہ بنایا۔ ان کا یہ کہنا کہ چٹائی کی مشقت کھانا مشق سخن بھی جاری رہتی تھی، کوئی شاعرانہ بات نہیں ہے بلکہ بیان واقعہ ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ حسرت کی زندگی کا ہر لمحہ برصغیر کی کامل آزادی کے لئے جدوجہد کرتے گزرا اور انہوں نے بیباکی اور حق گوئی کا جو معیار و نمونہ پیش کیا اس پر اس عہد کے بہت کم سیاسی آدمی ہونے اترتے ہیں۔ ادب سے ان کا لگاؤ زمانہ طالب علمی سے ہی شروع ہو چکا تھا۔ ۱۹۰۴ء میں ”اردوئے معلیٰ“ کا اجراء نہ صرف ان کے ادبی ذوق کی تکمیل کا وسیلہ بنا بلکہ سیاسی معتقدات کے ابلاغ اور سامراج کے خلاف جنگ کا ایک ہتھیار بھی ثابت ہوا۔ برصغیر میں ان کے ادبی مضامین اور سیاسی و مذہبی مقالات شائع ہونے شروع ہوئے تو سارے ملک میں ایک آگ سی لگ گئی۔ ہر چند کہ مولانا کے مالی وسائل بہت ہی محدود تھے مگر وہ ”اردوئے معلیٰ“ شائع کرتے رہے اور مولیٰ طباعت و پیشکش کے باوجود وہ شوق سے پڑھا جاتا تھا۔

سیاسی میدان میں بھی ان کی انفرادیت اور شدت مزاج کا عنصر برابر موجود رہا۔ ۱۹۰۴ء کا ذکر ہے کہ انڈین نیشنل کانگریس کا جمعی میں اجلاس ہوا اور مولانا بھی بطور مندوب اس میں شریک ہوئے۔ یہاں انہوں نے بڑی دھواں دھار تقریر کی اور نرم رو سیاست دونوں کو بتایا کہ سامراج سے جنگ کرنے کے لئے کس دل گردے کی ضرورت درکار ہے۔ ۱۹۰۵ء میں کل ہند صنعتی کانفرنس ہوئی تو وہاں بھی ان کی شعلہ بولی لوگوں کی توجہ کا مرکز بن گئی۔ ان کانفرنسوں کی رودادیں ”اردوئے معلیٰ“ میں

قلبی نے اسے اور دیگر نواد جمع تھے اور مولانا کا بیان ہے کہ وہ چار ہزار سے کم کے نہ ہوں گے مگر حکومت وقت نے انہیں صرف ساٹھ روپے میں فروخت کر دیا۔

غرض یہ تھے وہ لیل و نہار جس میں حسرت زندگی بسر کر رہے تھے مگر ان کے لئے استقامت میں کبھی لغزش نہیں آئی اور وہ سرکش سامراج سے برابر لڑتے رہے۔

انڈین نیشنل کانگریس کے سیاسی موقف کبھی ایک جیسے نہیں رہے بلکہ نرم و فادارانہ پالیسی کا ہی روحان رہا۔ ۱۹۲۱ء میں کانگریس کا اجلاس احمد آباد میں ہوا تو مولانا نے کامل آزادی کی قرارداد پیش کر دی اور اپنی تقریر سے ایسی آگ لگائی کہ سیاست کا سنگ ہی بلی گیا مگر یہ بوجھ بھی خوب تھی کہ اس تحریک کی پہلی مخالفت خود گاندھی جی نے کی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ کانگریس حکومت کے ساتھ وفاداری کا رینڈیشن پاس کر چکی تھی اور مولانا کامل آزادی سے کٹر کسی چیز پر اپنی ہونے کو تیار نہ تھے۔ کانگریس کے حالات سے بیزار ہو کر مولانا نے مسلم لیگ کے پلیٹ فارم کو اپنے سیاسی کاموں کے لئے استعمال کرنا شروع کیا۔ ۱۹۲۴ء میں وہ کل ہند مسلم لیگ کے صدر بھی منتخب ہوئے، مگر اسی سال انہیں نظر بند بھی کر دیا گیا مولانا ۱۹۳۶ء سے قیام پاکستان تک مسلم لیگ سے وابستہ رہے اور اپنے خیالات پیش کرتے رہے۔

عقیدہ کی پختگی اور عمل بہیم کے وصف نے انہیں بے خوف، مستقل مزاج اور میابک و حق گو بنا دیا تھا اور وہ جس چیز کو اپنے نزدیک صحیح سمجھتے تھے اس کو پوری قوت و جوش کے ساتھ پیش کرتے تھے۔ سلامتی ایک علمیدہ وصف تھا جو ان کی زندگی میں ہمیشہ برقرار رہا اور یہ بھی ایک اصول پر مبنی تھی۔ اصول یہ تھا کہ قومی رد پے کو ذاتی عروج و قار اور آرام کے لئے صرف نہ کیا جائے بلکہ جو گھر یلو اہد عام طریقہ زیست ہے اسے برقرار رکھا جائے اور قومی دولت اس پر ہرگز خرچ نہ کی جائے کیونکہ قوم کا پینہ قوم کی امانت ہے۔ اس سلسلہ میں ان کے کردار پر روشنی ڈالنے والا ایک واقعہ سنئے۔ دلی میں اسمبلی کا اجلاس ہونے والا تھا۔ مولانا رکن تھے اور اس میں شریک ہونے کے لئے آ رہے تھے۔ دلی پہنچنے کی تفصیل اطلاع وہ پہلے ہی دے چکے تھے۔ لوگوں کا ایک ہجوم اسٹیشن پر جمع ہو گیا مگر کوشش کے باوجود مولانا کہیں نظر نہ آئے اور لوگ یا اس ہوزر لوٹ گئے۔ عام خیال یہ تھا کہ مولانا نے اسمبلی

کے اجلاس میں شرکت منسوخ کر دی ہے۔ مگر دوسرے دن صبح کو جب اسمبلی کا اجلاس شروع ہوا تو اراکین اسمبلی یہ دیکھ کر بڑے متعجب ہوئے کہ مولانا تو بنفس نفیس ایوان میں موجود ہیں۔ اراکین اسمبلی نے مولانا سے پوچھا کہ یہ کیا جراسے تو فرماتے تھے کہ میں نے جس گارنٹی سے آنے کی اطلاع دی تھی اسی سے آیا تھا مگر لوگ مجھے جہاں تلاش کر رہے تھے میں وہاں مل ہی نہیں سکتا تھا۔ لوگ مجھے فرسٹ کلاس یا سیکنڈ کلاس کے ڈبوں میں ڈھونڈ رہے ہوں گے اور میں تھوڑی سی ہفر کرتا ہوں۔ پھر لوگوں نے پوچھا کہ قیام کہاں رہا؟ تو انہوں نے بتایا کہ ایک مچھی میرا واقف ہے، اسی کے پاس ٹہرا ہوں۔ اراکین اسمبلی نے کہا کہ آپ کے لئے تو فلاں ہوٹل میں قیام کا بندوبست کیا جا چکا تھا۔ اس پر مولانا مسکرائے اور کہنے لگے کہ میں یہاں ایک فرض ادا کرنے آتا ہوں فرسٹ، سیکنڈ کا کرایہ وصول کرنے یا پریسکلف ہوٹلوں میں ٹھہرنے کے لئے نہیں آتا۔ قومی دولت کو اس طرح خرچ کرنا اسراف ہے اور وہ میں برداشت نہیں کر سکتا۔ قلعے سے مبرا اور بے لوث خدمت وطن ان کی زندگی کا جوہر تھا اور انہوں نے اسے ساری عمر نبھایا۔ مولانا کا یہ عالم کہ انہیں دیکھا کہ ایک معمولی سا کھدڑ کا پاجامہ، پیوند لگی شروانی پہنے، سر پر بغیر پھندے کی ترکی ٹوپی اوڑھے چلے آ رہے ہیں۔ بعض اوقات تو دو دو پاؤں میں دو وضع کی جوتیاں نظر آتی تھیں!

ان کی حبشیات — یعنی جیل کی شاعری — میں ان کا اصل جوش و جذبہ نمایاں ہوا ہے۔ جیل میں کاغذ قلم دوات ملنے کا تو کوئی سوال ہی نہ تھا۔ مگر حافظہ بلا کا پایا تھا۔ جو کچھ کہتے ایک دیوان کی برابر ہوتا مگر ہر بار جب جیل سے طلوع ہوتے تو کلام کا ایک ٹپا ذخیرہ ارد وادب کے لئے بطور ارمغان لے کر آتے۔ ذہن کی بڑاتی، اور آمد سخن ایک چڑھتا دریا ہوتا اور قید فرنگ کی معوقین ان کی لہجہ کے لئے ایک نعمت ہی ثابت ہوتی۔

عشق میں خوف جاں سے درگزرے
ہم نے ٹھانی جودل میں، گرگزرے
شامِ فرقت کٹے نہ ہجر کی رات
صبح گزرے نہ دوپہر گزرے
روح کو محو جمالِ ربخ جاناں کو لیں
ہم اگر چاہیں تو زنداں کو ملکستاں کر لیں
باقی مسئلہ پر

ہمنفسانِ رفتہ

رہنمائی

جلدی رہی۔ جناب نفیس (مرحوم) کے نام جو خطوط آتے رہتے تھے ان میں سے اکثر ایسے ہیں جنہیں شائع ہونا چاہیے۔ چنانچہ میں مرحوم کے چند چندہ خطوط کچھ دلنوشی شائع بھی کر چکا ہوں۔ اب اس تحریر کے ساتھ بعض اور غیر مطبوعہ خطوط پیش کرتا ہوں۔ یہ خطوط جہاں اور باتوں پر روشنی ڈالتے ہیں وہاں بعض ادبی مسائل بھی مس کرتے ہیں۔ مثلاً ایک موقع پر عروض کی کوئی بات ملی اور جناب نفیس (مرحوم) اور حضرت آخر کھنوی کے درمیان رائے کا اختلاف ہوا۔ استاد جلیل مانک پوری (مرحوم) کو دونوں صاحبی نے اپنا حکم مقرر کیا ان کا فیصلہ نفیس (مرحوم) کے حق میں ہوا۔ چنانچہ ۲۹ اپریل ۱۹۴۰ء کے ایک خط میں حضرت آخر نے لکھا: میں آپ کا بے حد شکر گزار ہوں کہ آپ نے باوجود اس مصرع کو خارج از بحر قرار دینے کے، میری مزید استدعا پر خود اس کے جواز کی سند ڈھونڈ لی۔ (کوچہ زلف کے ایرے پھرے)۔ مناسب ہو تو حضرت جلیل کو اطلاع دے دیجئے کہ مجھے اپنی تقطیع کے غلط ہونے کا اعتراف ہے۔

جناب صفدر مرزا پوری (تلمیذ حضرت جلیل مانک پوری) نے اس تذکرہ کی اصلاح میں شائع کی تھیں، لیکن دورِ دوم میں سودا کی کوئی اصلاح انہیں دستیاب نہ ہو سکی مگر وہ ان کی تلاش میں تھے، جناب نفیس (مرحوم) نے "مرقع" مکتفو (نوروری ۶۲) میں سودا کی ان اصلاحات کا ایک سلسلہ شروع کیا۔ سب سے پہلے سودا کی وہ اصلاح شائع کی جو قائم چاند پوری کی مثنوی "دروش و عروس" پر انہوں نے دی تھی۔ جناب صفدر مرزا پوری نے اپنی تالیف، "مشاطہ سخن" کا جب دوسرا ایڈیشن شائع کیا تو یہ اصلاح بھی برائے شکر درج کی۔

پھر کیف، موصوف کی زندگی کا برا حصہ اردو شعروادب

ادبیات میں مشاہیر کے خطوط کا مطالعہ بچائے خود ایک اہم موضوع ہے اور یہ کوشش مستحسن ہے کہ اردو میں بھی مکتبہ کی ذمہ داری ادا شاعت کا سلسلہ اب دیر ازیر ہوتا جا رہا ہے۔ ان خطوط کے مطالعہ سے ہمیں مکتوب نگار کے ذاتی حالات و کوائف سے ہی آگاہ نہیں ہوتی بلکہ اس کے ادبی کام کا پس منظر بھی معلوم ہوتا ہے اور لکھنے والا جن نفسی کیفیتوں سے دوچار ہوا، اس کے تجربات حیات کیا تھے اور کسی خاص تحریر کی نزول کیا تھی، یہ باتیں بھی اکثر ہمیں ان نجی خطوط ہی میں ملتی ہیں، کبھی خفی بھی ملی۔ ایک مغربی ادیب تو اس باب میں کافی مبالغہ سے کام لیتا ہے اور کہتا ہے کہ اب شاعری کی بجائے ادب کی نشر کی حکومت ہوگی۔ اس قلمرو میں جہاں انشائیہ، نقد اور تاریخ کا دور دورہ ہوگا وہاں خطوط کی بھی اہمیت بڑھتی چلی جائے گی، خیر۔ شعر کی تاجوری کو گزند پہنچے یا نہ پہنچے، اتنا ضرور ہے کہ مکتبہ کی اپنی ایک اہمیت ضرور ہے اور ہمیں اس سرمایہ سے اپنی تاریخ ادب کے لئے بہت سے جواہر پارے مل سکتے ہیں۔ یہ خیال بجا ہے کہ خطوط کے بنیادی مباحث یا احساسات اگر ایک ہوں بھی تو ان کا اپنا جدال ہے اور لکھنے والے کی شخصیت کا فرق موجود ہوتا ہے۔ چنانچہ اس قسم کے خطوط اب منظرِ عام پر آ رہے ہیں جو بجائے خود تبرکات میں شامل کئے جاسکتے ہیں۔ ان میں سے اکثر ایسے ہیں جو تاریخ ادب کے مطالعہ میں بھی بڑی مدد دے سکتے ہیں۔ جناب نفیس (مرحوم) کو بھی اردو ادب سے گہری دلچسپی تھی اور بنگلور جیسے دور افتادہ مقام پر رہتے ہوئے بھی ان کا اردو شعروادب سے لگاؤ تمام عمر قائم رہا اور اس سلسلہ اپنے عہد کے مشاہیر شعراء و ادباء سے بھی ان کی مراسلت و مکتوبات

۱: جناب نفیس مینائی صاحب کے والد (دادا)

یہی وجہ ہے کہ میرا کوئی شاگرد نہیں جس واقعی اس قابل نہیں ہو۔
خود اپنے لئے کبھی کبھار کہہ لیتا تھا اب ضعف پیری و لامر و حادثہ سے
یہ سلسلہ بھی نہیں مقلد ضعیفی پیری میں ماشاء اللہ کثرت اولاد و طیف
صف چاہیں روپے جسے میں ہزار کے برابر سمجھتا تھا مگر جب میاں
بنی صرف دو روپیہ کھانے والے تھے بچپن سال کی عمر میں چوتھا عقد بچہ
کیا، خدا نے اولاد دی، اس کا لاکھ لاکھ شکر، دماغ کا یہ حال ہے
بجائے خط کے میں نے اپنی سوانح عمری کا سلسلہ شروع کر دیا۔ ابھی اب
اخلاص میں ماہ مبارک کی آمد غنیمت معلوم ہوئی تھی لیکن بیک کر کچھ
اور کہنے لگا آپ کی محبت اور دیانت پر بھر و سلسلے میرے خط کا ایک
حرف بھی کسی کی آنکھ کاں تک نہ پہنچے (ماہ مبارک کے آغاز ہی میں
مجھے یہ مطلع کہنا پڑا۔

جن کے ہاں ایک رند روزہ دار آئے کوہے
خام ہوئے کوہے میرے گھر دھار آئے کوہے
ماہ مبارک گذر گیا تو عید کے دن یہ مقطع کہنا پڑا۔
میکدے میں عید مجھ مفلس کی ہو جائے ریاض
دے کے اک چلو کوئی تیس روزوں کا ثواب

اس ماحول کو دیکھئے اور آنے والے وقت کو میں باہر بیٹھا ۲۰
شوال کو کچھ لکھ رہا تھا اندر سے پیام آیا ہسپتال سے دانی کو بلواؤ
آدمی گیا دانی کے عوض لیڈی ڈاکٹر آئی چارہ کار کیا تھا اندر گئی۔
ایک گھنٹے کے بعد یہی کبھی مبارک ہوئیں کے بچپن اور بچپن کے دل
پچاس اس لئے کہ ایک نہ شد و شخص جمعہ کے دسے کے ساتھ تگا
کا کر یہ دے کر زحمت کیا معلوم ہو کہ توام بھائی بہن دو بچے پیدا
ہوئے بی بی کی مشکل تو آسان ہوئی میاں کی مشکل کیوں کر آسان ہو
اب ہم ہیں اور میر کا یہ مصرع:

گرمی سبزہ رنگوں سے اور گھر میں بھونک بھاگ رہی ہیں

گھر کا یہ حال نہ دو دو پلائی نہ کھائی نہ کھانا پکانے والا ایک زچہ دو
بچے میاں بقول خود اس عمر میں۔

اس شیخ کہن سال کی اللہ سے بزرگی
جنت میں بھی یہ جا کے جواں ہو نہیں سکتا!

چٹی کے چوتھے روز زچہ کی بغلیں سا قطنہ اداوارہ کام دیتا ہے
ن زبان امید زیت و دوا ز حال منقطع حکیم صاحب ہیں اور قوت ٹبھا
کے نئے حب جواہر مہرہ مجبور مردار پر اور قیمتی جواہر شمس اللہ نے فضل کیا

کی تحقیق اور اس کی خدمت میں گذرا۔ اس سلسلہ میں مشاہیر
ادب سے خط و کتابت بھی ہوتی رہتی تھی اور ایسے بہت سے خطوط
کا ایک ذخیرہ ان کے پاس جمع ہو گیا تھا جو ہمارے ادباء و شعرا کی
زندگی کا ہی عکس نہ تھے بلکہ علمی، ادبی اور شعری نکات و مسائل پر
بھی ان میں بہت کچھ اشارے تھے۔

میں یہاں نفیس بشکوری مرحوم کے نام چند مشاہیر کے لکھے
ہوئے خطوط پیش کرتا ہوں، جو غیر مطبوعہ ہیں۔ سب سے پہلے
جو خط درج کیا ہے وہ حضرت ریاض خیر آبادی کا ہے اور ان کی
زندگی کے ایک ایسے دور سے تعلق رکھتا ہے جب وہ انتہائی غربت
اور خانگی پریشانیوں کی آماجگاہ بنے ہوئے تھے اور اپنی ہی زندگی
کا یہ دافعہ انہوں نے نفیس مرحوم کو بے کم و کاست پوری صداقت
کے ساتھ لکھ دیا تھا۔ مگر پاس خود داری کے باعث اس بات کی
تائید لکھی تھی کہ اس خط کے مشمولات کی کسی کو بینک بھی نہ پڑے۔
مگر اب جبکہ کاتب اور مکتوب الیہ دونوں ہی اللہ کو بیا رہے ہو گئے
اس اخفا کی چندال ضرورت نہیں اور ریاض کے خط کو یہاں
اس نیت سے پیش کیا جاتا ہے کہ ہمیں علم ہو سکے کہ ہمارے مشاہیر
ادب کیسی کیسی ذہنی دوزخوں میں سے گزرنا کہتے تھے اور اہل علم کی اتدکا
کا عالم کیا ہوتا تھا۔ ان کے اس خط سے نکلن سپیر کا یہ قول یاد آتا ہے
کہ خطوط کو اہم بنانے میں لکھنے والے کے خلوس، براہ راست اظہار
مطلب اور صداقت واقعہ کو بڑا دخل ہوتا ہے۔ یہ باتیں ریاض
کے خط میں از بس موجود ہیں۔ دیگر خطوط میں بھی بعض ادبی معانی
کی طرف اشارہ ہے یا لکھنے والے مشاہیر کے ادبی مشاغل اور نجی
کیفیات کا پرتوجہ سے کئی اہم باتیں فاری کے علم میں آتی ہیں۔ اس
امید ہے کہ یہ خطوط کسی کی نظر سے دیکھے جائیں گے:

ریاض خیر آبادی:

خیر آباد: (یو۔ پی) ۴ مئی ۱۹۳۷ء:

عزیزی! محبت نامہ ملا۔ آپ کی جگہ میرے دل میں پہلے
سے۔ میں دو تین جینے سے از بس پریشان تھا۔ اب بھی ہوں۔ مگر کم میں
کیا کسی کا کلام دکھوں میں استاد کے بعد تمام دنیا کو گھر دین گیا،

طہ ریاض نے ابتدا میں اسیر سے فیض حاصل کیا
اس کے بعد اسیر مینائی کے شاگرد ہوئے۔

(نواب سراج الدین احمد خان) سائل دہلوی:

۱۹ جولائی ۱۹۶۰ء:

عزیز من! سلامت: آپ کا خط ملا قطعاً تالیف
آپ نے مثنوی کے فرمائے ہیں بہت خوب ہیں۔ شکریہ مثنوی
کی اشاعت ملتوی کر دی گئی ہے کیونکہ میری صحت اب پہلے سے
بہت زیادہ خراب ہو گئی ہے۔ دس منٹ کے لئے بھی اٹھ کر
نہیں بیٹھ سکتا۔ آنکھوں کی بینائی جاتی رہی۔ اختلاج کے دھڑے
پڑتے ہیں۔ ایسی حالت میں آپ کے استفسارات کا جواب دہنہ
سے معذور ہوں۔ دعا ہے کہ زور ڈالنے سے دیر سے ٹر جائے
احتمال ہے۔

خدا رکھے فصاحت جنگ بہادر راجیل کا اور ہمارا
معاملہ خیر نہیں ہے۔ آپ ان سے دریت کر لیجئے۔
والسلام (سائل دہلوی)

زاد سہارنپوری:

سہارنپور، محلہ شاد ولایت: ۱۹ مئی ۱۹۶۰ء:

عزیز مصراحتاً دیوسف کنخان دادا!

سکرم اللہ العباد-

کل آپ کا نام دادا ملا۔ آج جواب لکھ رہا ہوں۔ میری
حالت گرمی کے موسم میں اس قدر برتر ہو جاتی ہے کہ مرمر کر لیں گے
پڑھنے لکھنے کی اُھواروں کو بہت نہیں آتی احباب کا کلام پڑا ہے۔
کون دیکھے۔ آپ کی خاطر ہر حال عزیز ہے اس لئے جس طرح
بھی بن پڑا کچھ جان بچا کر لکھتا ہوں۔

آپ نے یہ نہ لکھا کہ جنگو میرا مشہور مصنوعات اور عمدہ
پہل کیا کیا ہوتے ہیں۔ میں پھلوں کا دلدادہ اور حریص ہوں مرحوم

شاہ شہنشاہ نور الدین جہانگیر اور ملکہ نور جہاں کے حالات زندگی
اور اسی کے واقعہ عشق پر سائل مرحوم ایک بڑی خوب طویل مثنوی
لکھ رہے تھے عنوان تھا کوثر علی نور۔

(ادارہ)

کہ روئے سہارنپور میں شائع تھا۔ امیر مینائی کے شاگرد تھے اور ہند
کر لکھے تھے خوش گوشا عرصہ لگ گئی اور بے اعتنائی کا شکار ہوئے۔

دس دن گزے تھے بشدیر تنگھے نے دورا زعل پھرنا امید کر دیا پھر
اللہ نے فضل کیا بیچارے بچوں پر کیا گزری اور بچوں سے زیادہ مجھ
بوڑھے پر کیا گزری کچھ نہ پوچھئے ایک ہفتے سے میں آشوب چشم میں مبتلا
تھا اب اتنا بہتر ہوں کہ آپ کی غزلیں دیکھیں اور یہ خط لکھا۔ قدیم
اور جدید غزل کے سب شعر اچھے نظر ثانی کی ضرورت ہے نہ
اصلاح کی میں نے کبھی بھی چھپا ہوا کلام بھی دیکھا آپ استاد سے
مسلل فیض اٹھا رہے ہیں، محروم ہوں تو ان کے فیض سے ہیں۔
مطبوعہ تالیفات میں تین ناول تھے، دو کا پتہ نہیں چلتا ایک کی
کچھ جلدیں بدقت فراہم ہوئیں اس کا نام حرم سرا ہے۔ ریتا لڑکے
ناول "لور آف دی حرم" کا ترجمہ ہے مگر میری زبان میں بغایت
دلچسپ ہونے سے مکمل حرم سرا یعنی حصہ اول و دوم قیتی تین آڈ
پاک آئے دی، پی، آپ کے نام مع حصول ڈاک وغیرہ روانہ
کرتا ہوں کہ غزل لکھانی چھپائی خراب ہے بایں ہمہ بہ اعتبار دلچسپی
یہ کہنے میں تکلف نہیں: کثرت بالاکن کہ از رانی ہنوز۔
دیکھنے کے بعد ناپسند ہو یا گراں گزے تو احباب کو دکھا دیجئے گا۔
اس ذریعہ سے کچھ درخواستیں اور آجائیں گی، ناپسند ہو تو واپس
کر دیجئے گا میں قیمت واپس بھیج دوں گا۔ خیر مطبوعہ تالیف دیوان
ہے کوشش کر رہا ہوں خدا کے جلد چپ جائے۔

الغافقہ جلیل صاحب یاد آگئے ہیں اس لئے انہیں بھی اس
خط کے لطیف حصوں کی نقل بھیجتا ہوں یہ لکھنے کی ضرورت نہیں کہ
آپ نے غزلیں بھیجیں اور میں نے کیا جواب دیا۔ خط کو کتنا کہ
مسلل جاری ہے تو اچھا۔

راقم:

رات آخر وقت نازک ہے راض

لو لگی ہے شمع کی اللہ سے!

*

۱۔ راض کا کلام ان کی وفات کے بعد راض رضوان کے نام

سے چھپا اور بڑی آب و تاب کے ساتھ۔

۲۔ جلیل مالک پوری دفعات جنگ بہادر جلیل مالک پوری

استاد میر عثمان علی خان، دکن)

غزلیں نکھیں اور ترمیم کے ساتھ ضروری لوٹ بھی شامل کر دئے ہیں۔

• درودانہ " بھی کتابت کے اخلاط سے مملو ہے۔ کل ہی ایک شعر پر نظر پڑی اور عقل حیران رہ گئی۔ بڑی دیر کے بعد اصل صورت یاد آئی :

بوجھ آدھا نسا دیا میں نے

ایک موتی تو لادیا میں نے

پھیلاؤ ہے!

یہ بھی بوجھ آدھا کر دیا میں نے

پہلے ہی شعر میں قصیدہ "دگنڈیر" کی جگہ "قصۃ دلپذیر" چھپا

ہوا ہے۔

آپ اپنے شہادت بے تکلف لکھئے۔ میں بھی انسان ہوں۔

ممکن ہے کوئی فرد گذشتہ بھی کھلے اسے جس سے مجھے آپ کو دونوں کو فائدہ

— ۱۲ —

اس طرف لڑکی کی شادی کی وجہ سے بہت کم فرصت رہی۔ علاوہ

اس کے ہاتھ میں ریشہ آگیا ہے جس کی وجہ سے نیکھنے میں بہت دقت

ہوتی ہے۔ فقط۔ (خیر طلب: آرزو)

اکھرا اثبات دونوں پہلو میں شاعر کا مقصد دوسرے مصرعے سے واضح ہو گا۔

(۲) ”کون گنلا ہے مری قبر یہ گریاں ہو کر نہ گریاں صبح، ہو کر غلط گریاں ہو کر مری قبر یہ گنلا یہ ترکیب صبح نہیں ہے۔ مصرع جمل ہے۔“

(۳) ”خون کی چادر جو پھیلے گی کفن ہو جائے گا۔ اس مصرع میں ہو جائے گا“ صبح ہے۔

(۴) ”آج بوسہ تجھے دیتے ہی بنے گا اے جاں کچھ ترا وعدہ نہیں ہوں کہ میں مل جاؤں گا“ دیتے ہی بنے گی ”صبح مگر اے جاں“ نہایت جمل، دوسرے مصرع میں ”کچھ“ بول چال کے خلاف ہے۔

(۵) ”چمک دندان میں افروز جہر و مہ سے یہ ثابت ہے جناب عائشہؓ سے“ قافیہ تو ہو سکتا ہے عائشہؓ میں ”وہ“ نہیں ہے بلکہ ”ت“ ہے مگر میں احتیاط کرتا ہوں ”مہ“ ”وہ“ قافیہ ہو سکتا ہے۔

(۶) ”نذر کرنے کو جگر پارے لئے جاتا تو ہوں“ ”ناوک“ ”نازنگا“ یا ”دیکھیں کیا کرے“

”فترتگر یہ نہیں ہے شاید آپ کو جانا تو ہوں“ اور ”دیکھیں“ کی وجہ سے شبہ پیدا ہوا مگر بول چال کے لحاظ سے دونوں مصرعے درست ہیں ”دیکھوں“ بھی یک لفظ ”دیکھیں“ ہو سکتا ہے۔

(۷) ”یہ فسانہ تو مرے لڑک تر باں رہتا ہے“ یہ مصرع جمل ہے ”لوک تر باں“ کے معنی اور مفہوم کو سمجھنے کے لئے حضرت داغ کے اس مصرع پر غور کیجئے، ”یہ یا زکی لڑک تر باں ہو نہیں سکتا“ امید کہ مزاج گرامی بخیر ہو گا۔ زیادہ والسلام:

(عزیز یا جنگ)

حضرت جلیل ماکپوری:

دنوا! سلام مسنون۔

آپ کا لوازش نامہ پہنچا۔ مافیہ سے آگاہی ہوئی، آپ

اردو کے عروض پر شبہات جو کئے ہیں وہ قابل لحاظ ہیں عنقریب نظر ثانی کروں گا اور آپ کی تحریر کو پیش نظر رکھوں گا، فرصت کا انتظار کروں گا ہوں، میرے ہاتھ کی تحریر آپ کے کر کیا کریں گے اول تو میرا خط ایسا نہیں کہ اس کا شمار اچھے خطوں میں ہو، دوسرے آج کل ہاتھ میں کسی قدر وعشہ بھی ہے جس سے خط ادھی خراب ہو گیا لہذا معافی چاہتا ہوں، آپ کا تخلص نفیس بہت مناسب اور مشہور بھی ہو چکا ہے اس کو ہرگز بدنام نہ چاہیے۔ رشک نہ بچا لفظ ہے نہ اچھی چیز ہے یہنذا تاریخ کے ایک بڑے مشہور شاعر اور صاحب تصانیف و صاحب تلامذہ کا تخلص ہے۔ لہذا آپ تخلص بدلنے کا خیال ترک کر دیجئے، نفیس بہت عمدہ لفظ ہے اور مدح بھی بہت پاکیزہ ہے۔ وہ شخص جس کا تخلص نفیس ہے وہ خود قابل رشک ہے۔

والسلام: مساحت جنگ جلیل کان النذر

حضرت لوح ناروی:

از تاریخ ضلع الہ آباد: ۳۰ اگست ۱۹۳۵ء

ہفتہ عشرے سے میری طبیعت اچھی نہیں طوفانِ لوح کے کاتب، حافظ محمد علیم صاحب، ناروی جلال صاحب لکھنؤ کے شاعر ہیں مکنات کے جس مصرع میں کچھ اختلاف انہیں ہوا انہوں نے بغیر میری اطلاع کے تصرف کر دیا۔ بعد چھپنے کے مجھے خبر ہوئی میں بہت ان پر ناخوش ہوا۔ لیکن جب دیوان شائع ہو چکا تو کیا کرتا بہت سے مقامات پر ان کا تصرف تم پاؤ گے۔ وہ مصرع یوں ہے:

غور کی زندوں نے لیکن حل نہ عقد ہو سکا

کہنے لگے کہ غور نہ کرے۔ میں نے کہا آپ کے لکھنؤ میں ہو گا۔ دلی میں تو ثابت ہے۔ اور کیا لکھوں دلی جانے کے لئے آمادہ ہوں!

(لوح)

حضرت جلیل کے ”رسالہ عروض“ پر جناب نفیس جٹپوری نے اپنے کچھ شبہات ظاہر کر کے حواشی لکھے تھے خط میں اسی کی جانب اشارہ ہے۔

*

عالم یک شہر جستجو

سید اقدس حقانی

تحقیق کی منزل آخر تک پہنچنے کے راستے تیر و تار، کہیں کہیں کچھ روشنی نظر آتی ہے مگر ساتھ ہی گہرے تاریکی ہیں، ذرا سی لغزش کا نتیجہ کوشش بے سود ثابت ہوتا ہے۔ اس لئے ہر شیبہ و فراز پر نظر رکھتے ہوئے آگے بڑھ جائے۔ مگر منزل تک رسائی "ہر قدم دداری منزل ہے نمایاں مجھ سے" کی سی کیفیت ہے۔

ہم ماضی سے بہت کچھ حاصل کرتے ہیں۔ حال سے بھی ہمیں کچھ نہ کچھ مل ہی جا سکتا ہے۔ ان کے طفیل ہم مستقبل کی طرف قدم بڑھاتے ہیں۔ ماضی اور حال سے حاصل شدہ سرمایہ میں سے کھوٹے کھوٹے کوپے بھی بغیر اپنا نا اور تصرف میں لانا دانشمندی کی دلیل نہیں بلکہ شعور و انتقاد سے کام لے کر برتن بنانا ہے۔ کیونکہ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ ماضی و حال کی لغزش ہی مستقبل کے لئے راستہ دہی کی راہ بٹھاتی ہے۔ کچھ ایسی ہی کیفیت کی حال چند نفلوں کی داستانیں حقائق کی نقاب کشائی کرتی نظر آتی ہیں کسی مفہوم کو ادا کرنے کی غرض سے الفاظ بنائے جاتے ہیں۔ یہ الفاظ صدیوں سے پیش آنے والی ضروریات، حالات و واقعات، بزرگوں کے تجربات و مشاہدات کی بدولت وجود میں آئے جب کوئی لفظ جو وہیں آتا ہے تو اس کا حقیقی مفہوم وہی تسلیم کیا جائے گا جو وقت و تخیل مقصود ہو گا۔ الفاظ تغیر لسانی کا شکار ہوتے رہتے ہیں۔ اس تغیر کی دو نوعیتیں ہیں۔ ایک حرفی (املائی و لسانی)، دوسری معنوی۔ مثلاً "افراقی" اصل میں افراط و تفریط یا افراط و تفریط تھا جس کے معنی جدا امتدال بڑھنا یا گھٹنا، غیر معتدل، غیر متوازن تھے۔ اردو میں آیا تو تغیر لسانی کا شکار ہوا "ط" کو "ج" ہوا نہ کر سکا اور یہ ساقط ہو کر "افراقی" بن گیا۔ املا اور لہجہ کے علاوہ معنی میں بھی تصرف ہوا، اور بل چل، گڑ بڑ، جھگڑا، گھبراہٹ، پریشانی کے معنی لئے جانے لگے۔ تغیر کی مثالیں بکثرت ہیں بالخصوص

یہ کائنات اور اس کے جلوہ ہائے رنگارنگ، مظاہر فطرت کی بولچھونی، مخلوقات اور ان کی کشمکش حیات، بحروں کی آویزش، اجتناب نسیم ورفشاں شبنم، آتشیام و غنیم، انتشار و تنم، بوسے گل، نوائے بلبل، قصہ شرر، تلاطم امواج، طوفان باد و باران، ہر شے اور ہر کیفیت کو تجلی اظہار، اظہار انداز و اسلوب بیان سے پرتائیر تاثیر انتخاب الفاظ پر موقوف، الفاظ قبولیت عامہ کی سند کے محتاج، جن میں صدیوں کے انقلابات کی داستانیں مضمران و استانوں کا سرسراہ لگانا لانا ہے جسے شیر کا۔

کائنات میں ہر شے تغیر کی دستبرد کا شکار ہوتی ہے۔ اشیاء کی بقا، تغیرات کا مقابلہ کرنے میں پوشیدہ، انسان اس کائنات پر تصرف کے حق سے مشرف، اس لئے نوا میں فطرت میں حسب منشاء تغیر و تبدل کرنے کا اسے مجاز، مگر انسان کے اس عمل میں زیادہ تر بہتری و بہبود کی روحان کا فروما، بہتری و بہبود کے دو روپ، ایک منفعت، دوسرے زینت۔ بالطبع حسن پسند انسان منفعت میں بھی زینت کو نظر انداز نہیں کرتا۔ اس تصرف کی نمایاں مثالیں باخباتی میں نظر آتی ہیں۔ رنگارنگ پھول، انواع و اقسام کے پھل، پیوند کاری اور عمل تعلیم کے نتائج ہیں۔ فطرت میں تصرف، منفعت و زینت، جلوہ آشکار ہے، مگر اس جلوہ ظاہر میں کتنی طویل داستان پنہاں، سفینہ چاہئے اس بحر بیکراں کے لئے؟ ابتدائی روپ، آباد و اجداد کے تجربات، ان کے اثرات، راہ ارتقا میں موانع، مشکلات، تدریجی پیشرفت، اب کون تہ ہے؟ یہی حال اس کائنات میں آباد نوع بشر کے ذریعہ اظہار زبان اہل اس ذخیرہ الفاظ کا ہے۔ مفرد، مرکب، بظاہر مفرد و بباطن مرکب، مفرد و ابتدائی روپ، اس میں عمل ترمیم و تنسیخ، مرکب کی پہلی شکل، تجربات کی خزاں پر چڑھ کر سدول ہونے کے مراحل، سب صحت و تحقیق

(۱) اِکَل، اِکَل بمعنی تنہا، اکیلا۔ ایک سے ماخوذ یعنی ایک + ل = ایل، ایل جیسے بوجھل تو نڈل وغیرہ۔ عموماً بچے زمین پر کھیریں کھینچ کر خلع بناتے اور ایک ٹانگ اور پراٹھا کر دوسری سے اچھلتے اور ان خلعوں میں سے گول ٹھیکرا یا گٹا (گٹا) ٹھوکر یا کر یا ہر شکل لیتے ہیں، شمالی ہند میں اس کھیل کو اِکَل دُکَل اور اِکَل دُکَل کہتے ہیں پنجاب میں پہلے دُوج کہتے ہیں۔ یہ اِکَل پر اِکرت (اکرت) اور اِکَل سنسکرت (अकल) سے اردو میں آیا۔ کھیل کا نام اس کے دُوج اور استعمال کی قرین مثال ہے۔ بعض اس کو بالف مفتوح (اِکَل) کہتے ہیں مگر اکثریت کا تجان بالف کمسور (اِکَل) ہی ہے۔

(۲) کھرا = اس لفظ کی پانچ صورتیں ہو سکتی ہیں،
(۱) کھرا = آخر (جانور ول کے چارہ کھانے کی جگہ) +
(فاعل) = آخرا، کسان جو عموماً ٹھکانے ہوتے ہیں خ کا تلفظ
اور انہیں کر سکتے ان کے لیے میں خ اپنے قریب انحر ج کھڑے
بدل گئی۔ آخرا تغیر لسانی سے کھرا بن گیا۔ اِکَل کھرا = اکیلا
آخر والا۔

(ب) کھرا = خرا (امرا زخرون) + (فاعل) = خرا، پیچی
مندرجہ بالا تغیر لسانی سے کھرا بنا۔ اِکَل کھرا = تنہا کھانے والا۔
(ج) کھرا بمعنی بد مزاج، سخت، کھرا در = تغیر لسانی سے مرکی
تشدید دو ہو گئی۔ اِکَل کھرا = اکیلا بد مزاج، الگ تھلک۔
(د) کھرا بمعنی چارہ کھانے کی جگہ، یہ بھی آخر کی بڑی ہوئی شکل
ہے جو "لی" لاحقہ کے ساتھ کھری بن کر مستعمل ہے + (فاعل)
اِکَل کھرا = تنہا جگہ پر کھانے والا۔

(و) کھرا = کھرا بمعنی سم + (فاعل) اِکَل کھرا = ایک یا اکیلے
سم والا۔

اس مرکب لفظ کی یہ پانچ قرین قیاس صورتیں ہو سکتی ہیں مگر
میرے نزدیک آخر سے ماخوذ ہونا زیادہ بہتر ہے۔ یعنی "اِکَل آخر" =
تغیر کے بعد "اِکَل کھرا" بنا، کیونکہ یہ لفظ خاص کسانوں کے طبقہ کی پیدائش
ہے۔ کسانوں کے ہاں بیلوں کی جھڑیاں ہوتی ہیں یا آتھ اور گاڑی وغیرہ میں
دو پہلے جوتے جاتے ہیں۔ جب ان کو تھان پر لا کر باندھا جاتا ہے تو ہر جڑی
کی آخر مشترک ہوتی ہے جو عموماً مستطیل شکل کی بنائی جاتی ہے۔ یہ دونوں پہل
جول وغیرہ میں ساتھ جیسے ہیں چارہ بھی ساتھ ہی کھاتے ہیں۔ ان میں اگر

غیر زبانوں سے درآمدہ الفاظ میں یہ عمل زیادہ ہوتا ہے۔ نیز مرکبات میں بھی
اس کے کافی آثار ملتے ہیں مثلاً "الف ننگا" جس کے معنی ہیں بالکل ننگا،
جس کے بدن پر کوئی کپڑا نہ ہو۔ محاورے میں بے شرم اور زیدہ دلیکے
معنی لئے گئے۔ یہ لفظ "الف ننگا" تغیر لسانی کا شکار ہوا اور "ننگا"
بن گیا۔ الف اور لون سے جو ثقالت پیدا ہوتی تھی ختم ہو گئی۔ آوارہ،
لچا، شہدا، بد قماش اور بد معاش معنی لئے گئے۔ اسی طرح "دھڑنگ" دھڑنگ
ہے جو "ننگ" "ننگا" کے ساتھ بطور تابع آتا ہے یعنی "ننگ دھڑنگ" اور
"ننگا دھڑنگ" اصل میں دھڑ + ننگ اور دھڑ + ننگ تھا۔ دھڑ کے ہم معنی
"انگ" سے بھی اس کارشتہ قائم کیا جاسکتا ہے۔ دھڑ + انگ اور
دھڑ + انگا لیکن یہ ترکیب اس لئے قرین قیاس نہیں کہ "انگ" کے معنی
عضو، جسم کا کوئی حصہ بھی ہیں اور "انگا" لباس کی ایک قسم کو یا انگر کھا
بھی ہے۔ ننگ اور ننگا کے ساتھ اس مرکب کا استعمال معنوی طور پر
قباحت پیدا کرے گا۔ اس لئے صحیح اور مناسب اجزائے ترکیبی دھڑ +
ننگ اور دھڑ + انگا ہی ہیں۔ ایک لون تلفظ میں کر گیا اور رواں لفظ
دھڑ + ننگ اور دھڑ + انگا بن گیا۔

تغیر معنوی کی مثالیں بہت ہیں "اردو" ہی کو لیجئے، لشکر
لشکر گاہ، لشکر کی بازار کے لئے استعمال ہوا، لیکن اب یہ تینوں معنی
ختم ہو چکے ہیں اور صرف زبان کے لئے استعمال ہو رہا ہے مگر ان مجاز
معنی میں بھی ابتدائی معنی کا تصور موجود ہے کہ اس زبان کی تخلیق میں
لشکریوں کا بہت زیادہ ہاتھ ہے اور انہی کی نسبت سے اس زبان کو
اردو کہا جانے لگا۔

اگرچہ ہر لفظ کا مرکب یا تغیر لسانی بے شمار ہونا ضروری نہیں
لیکن اکثر الفاظ تغیر کی زد میں آکر تبدیل بنے ہیں بعض کی داستان
کافی طویل اور دلچسپ ہے۔ "اِکَل کھرا" ہمارے زبان میں خود غرض
انگ تھلک رہنے والا بے مروت، اپنے ہی فائدہ کی فکر میں رہنے والا،
دوسروں سے مل جل کر نہ رہنے والا، بد مزاج آدمی کو اِکَل کھرا کہتے ہیں۔
یعنی مجازی ہیں جو اس لفظ کی تخلیق کے بعد نتائج سے اخذ کئے گئے ہیں یہ
لفظ مفرد نہیں بلکہ مرکب ہے، اس کے اجزائے ترکیبی: وجہ تخلیق، مقام
تخلیق اور ابتدائی معنی مطروذ ہیں ملاحظہ فرمائیے،

مرآۃ اِکَل کھرا: یہ لفظ درحقیقت کسانوں کے ذریعہ رائج
ہوا۔ اس کے اجزائے ترکیبی کی حسب ذیل صورتیں ہو سکتی ہیں،

کھانے نہیں دیتا تھا، اس سے لڑتا تھا پس اس کو الگ آخو پر باندھا گیا تو اکل آخو کہا۔ یہ اکل آخو تغیر لسانی سے اکل کھرا بنا۔ اکل اس اکل کھرے بیل کی فطرت کو ملحوظ رکھتے ہوئے اکل کھرا مجازی معنی میں استعمال کیا جائے گا۔

قبہا سما: ہر سال موسم بہا پاتا ہے مگر اس حقیقت کے علم کہ یہ بہا داور نو بہا قدیم ایرانیوں میں بتکدوں کے نام تھے۔ غالباً یہ بتوں کے نام ہوں گے انہی کے نام سے یہ بتکدے موسم کے گئے ہوں گے۔ بہا رخاں آج بھی بت خانہ کے ہم معنی ہے۔ موسم کے معنی میں بھی مجازاً اس بت ہی کی نسبت سے رائج ہوا۔ اس بت کے حیضہ اقتدار میں بہتری بہبودی، رونق، سرسبزی و شادابی وغیرہ کو خیال کرتے ہوں گے۔ اور کوئی تعجب نہیں کہ انہی کے پیش نظر اس کے اجزائے ترکیبی یہ ہوں، یہ (بہتری و بہبودی) + آرا (امرا زادوں) = بہ آرا بہتری لانے والا لائق بہا رہتا ہے بہتری، بہبودی اور منفعت بخش موسم، پورے پھولوں سے اور درخت پھلوں سے لدا جاتے ہیں۔ ہر طرف مسرت و شادابی ہوتی ہے گویا موسم بہار، بہ آرا پاتا ہے۔

تخلد! میں نے لفظ خدا کے متعلق اپنے مضمون "خدا۔ مفرد یا مرکب مطبوعہ ماہ نو، اکتوبر ۱۹۶۱ء میں مفصل بحث کی تھی اور اس کو مفرد ثابت کیا تھا۔ عام لغات میں مندرج ترکیب، خود + آرا (امرا زادوں) خود آنے والا اور مولف فرہنگ نظام کے خیال یعنی خدا کا مادہ ختم بمعنی واجب الوجود کو غلط ثابت کیا تھا۔ لیکن اب ایک اور خیال ترکیب ظاہر ہوئی ہے یعنی خدا دو لفظی مرکب نہیں بلکہ سہ لفظی ہے جس کے اجزائے ترکیبی قدیم فارسی اور انہی کے متبادل سنسکرت میں اس طرح ہیں:

سنسکرت: سو + آپ، روح) + تس یا تہ (لاحقہ) سو تہ (اپنے آپ سے، بخودی خود) + دھات (باقی، پائندہ) = سو تہ دھات = اپنے آپ سے باقی، خود بخود پائندہ۔

فارسی: خود (فطرت، عادت) + ت (لاحقہ) = خوت یا خود (اپنے آپ، خود بخود) + دات (لاحقہ) = خوت دات = اپنے آپ سے باقی خود بخود پائندہ (واجب الوجود)

ان اجزائے ترکیبی کی تشریح اس طرح ہے کہ خود + ت = خوت خود اور خدا میں خود مشترک ہے قدیم تہا فارسی میں خدا، خود ہی ہے،

کوئی بیل مرکبنا ہوتا ہے تو اس کو الگ آخو پر باندھتے اور چارہ دیتے ہیں، ایسے بیل کو "اکل آخو" وغیرہ صورت اکل کھرا کہتے ہیں، پس یہ مرکب آخو سے زیادہ قرین قیاس ہے۔ جس کی تائید کھر (کھری) سے بھی ہوتی ہے۔ جتنی میں بھی دو گھوڑے ساتھ جرتے جاتے ہیں لیکن اول تو ان کا استکا ہی بہت کم ہے، دوسرے یہ گھوڑے صرف بھی میں جیتے وقت ساتھ ساتھ ہوتے ہیں ورنہ الگ الگ رہتے ہیں۔ نیز گھوڑوں کو دانہ تو پیسے یا بانٹی میں کھلایا جاتا ہے، جہاں شرکت کا تصور ہی نہیں ہو سکتا اور گھاس بھی الگ الگ ہی ڈالی جاتی ہے اس لئے اصطبل سے اس کا تعلق نہیں۔

اس مرکب کا دوسرا جز "کھرا" بمعنی بد مزاج بھی ہو سکتا ہے لیکن مرکب معنوی اعتبار سے ہل ہو جاتا ہے کیونکہ اکل اور کھرا میں تسلسل معنوی کے لئے عطف ضروری ہے کھرا کو تابع بھی قرار نہیں دے سکتے۔ اسی طرح مرکب کا دوسرا جز "کھر" بمعنی سم بھی ہو سکتا ہے لیکن یہ بھی معنوی اعتبار سے غلط ہے کیونکہ کسی جانور کا کیلا سم نہیں ہوتا۔ اکیلے لالہ خلاف حقیقت ہو گا۔ اگر سم سے لڑنے کا تصور دیا جائے تو بھی یہ خلاف واقعہ ہے کیونکہ اس قسم کے جانور سم سے نہیں بلکہ سینگوں سے لڑا کرتے ہیں۔ پس یہ دونوں اجزائے ترکیبی خلاف حقیقت اور غلطی سے دو ہیں۔

"خوڑے سے مرکب قرار دینے میں معنوی قرینہ ضرور موجود ہے لیکن حقیقت واقعہ سے مناسبت نہیں، کیونکہ اکل + خورا (کھرا) = اکیلا کھانے والا۔ تنہا چارہ کھانے والے تو اکثر جانور ہوتے ہیں جیسے گائے بھیینس وغیرہ، ان کی آخو بھی الگ ہوتی ہے اور بلا اپنے چارہ میں غیر کی شرکت کو گوارا بھی نہیں کرتے، مگر ان میں سے کسی کو بھی "اکل کھرا" نہیں کہا جاتا کیونکہ ان کے ساتھ کسی کی شرکت کا تصور ہی نہیں ہے البتہ بیلوں کی جوڑی میں شرکت و اتحاد کا تصور موجود، عدم شرکت و اتحاد، خلاف رسم و عادت، اور اسی خلاف رسم و عادت عمل سے یہ مرکب وجود میں آیا۔ کیونکہ جب تک یہ دونوں بیل ایک ہی آخو پر لڑ رہے ہوں گے کہتے رہتے ہیں تب تک ان میں سے لڑنے والے بیل کو اکل کھرا نہیں کہتے، بلکہ جب ان میں سے مرکب بیل کو الگ آخو پر باندھتے ہیں تو کہتے ہیں کہ "اکل کھرا" ہے، اپنے ساتھی کو وار تہ ہے۔ اسی لئے میں نے آخو سے ترکیب پانے کو ترجیح دی ہے۔ اکل آخو (اکل کھرا) ابتدا میں ایسے بیل کے لئے استعمال کیا گیا جو اپنے ساتھی کو ایک آخو پر چارہ

کے لئے اختراع ہوتا تو ابتدا میں اسی معنی میں استعمال کیا جاتا اور دوسرے معنی میں تغیرسانی کے مراحل طے کرنے کے بعد رائج ہوتا لیکن ظاہر ہے کہ ابتدا میں معنی اللہ مستعمل نہیں ہوا بلکہ بعد میں استعمال کیا گیا ہے۔ لہذا جب ابتدائی استعمال میں یہ معنی موجود نہیں تو اجزائے ترکیبی کی تطبیق کیونکر ممکن ہو سکتی ہے اور ان کو کیسے ثابت کیا جاسکتا ہے؟ اب ملاحظہ فرمائیے کہ قدیم فارسی میں ذات الہی کے لئے کون کون سے الفاظ مستعمل تھے۔ لفظ خدا قدیم فارسی میں کب سے مستعمل ہے اور کن کن معنی میں، اس کی املائی اشکال کیا کیا تھیں؟

قدیم فارسی میں ذات الہی کے لئے، بَنَ، مَرْدَ، اَہورامزدا، یَزْتان، یزدان اور یَزْدَ مستعمل تھے۔ بَنَ عہد پانچواں منشی اور اس کے بعد بھی اللہ تعالیٰ کے لئے استعمال ہوتا رہا ہے۔ یہ لفظ سب سے پہلے پادشاہ آئور (۴۰۵-۴۲۱ ق م) کے کتبہ سارگون میں ”بَنَ داتی“ کی شکل میں ملتا ہے۔ اس کے بعد ”بَنَ یڈیش“ ایک مہینہ کا نام یعنی ماہ ستائش خدا، کتبہ دار یوش میں ہے، دوسرے کتبوں اور دستاویزوں میں بَنَ بمعنی خدائے عالم آیا ہے۔ ”بَنَ دات“ یعنی خدا داد اور ”بَنَ کرت“ یعنی خدا کرد، دو بادشاہوں کے نام ہیں۔ ایک آتش کدہ کا نام بھی ”آئورمزد“ بَنَ، یعنی آتش جلالت یزدان ہے شہنشاہان ساسانی کی سکوں میں بھی ”بَنَ“ بمعنی خدا پایا جاتا ہے۔ اس کے بعد اس لفظ کے معنی میں فرق آیا ہے اور کچھ بجز چند مرکبات زبان فارسی سے بالکل ناہور ہو گیا ہے۔ ساسانی سکوں پر یہ عبارت کدہ ہے جس میں ”بَنَ، یزدو، یزدان، اور یزتان“ بمعنی اللہ استعمال ہوئے ہیں:

”مَرْدَ کَیْسَی نَی اَر تَشْتَر مَلکان اِیرانِ مَنو شتر مَین یَزْدان“
یعنی خدا پرست و خدا نکان اور شیر شہنشاہ ایران جس کا خاندان خدا سے تعلق رکھتا ہے۔ اسی طرح ”مَرْدَ کَیْسَی نَی شَر پُہری مَلکان مَلکا اِیرانِ مَنو شتر مَین یزدان“ سکے شاہ پور پر کندہ ہے۔ نیز کتبہ شاہ پور مَلکان شاہ میں ”مَرْدَ کَیْسَی نَی شَر پُہری شہان شیری اِیرانِ و اَبَران کی چتر تَر یزدان ہے معنی، خدا پرست و خدا نکان شاہ پور شہنشاہ ایران و غیر ایران جس کا خاندان خدا سے پرستہ ہے۔ خطا بھی مادی میں بھی اہرمزدا (خدا) اور بغا (خدا۔ بزرگ) موجود ہے۔ ”بَنَ“ کے متعلق کتبہ اشور بہار نے لکھا ہے ”در عہد پانچواں منشی و تا چند قرن بعد بَنَ نام پروردگار عالم بودہ است“ اہورامزدا کے متعلق لکھتے ہیں اور مزد و دہا مصل اہور

در میانی عہد میں خوتامی، ات کا تبادلہ سے مسلم، اس لئے خوتامی سے خدا ہو سکتا ہے، مگر وہ کا تبادلہ ت سے نہیں اس لئے سہل بات یہ ہے کہ خدا کو خدہا می سے ماخوذ مانا جائے، اور وہ میں تخفیف ہو کر دینا قبول کیا جائے۔ یا خدا = خوت دات اولاً خوتاد بمعنی دو تہل ت باد) ہوا، اس کے بعد خوتامی (مخزف د) ہوا، یا خوت دات = خوتامی (مخزف ت) ہوا پھر خوتامی = خدا ہو گیا خوتامی بمعنی مالک، حاکم، قادر (بادشاہ) مستعمل تھا، ساسانی عہد میں خالق و مالک کل اور ہرمزدا کے لئے استعمال ہوا، قدیم فارسی میں بمعنی اللہ بھی استعمال ہو رہے تھے جیسے اہرمزدا خدا۔ مذکورہ اجزائے ترکیبی اور تشکیک پر غور رکھئے ”خو“ بمعنی فطرت عادت قدیم فارسی میں خو نہیں تھا بلکہ ”خیم“ تھا۔ خیم میں سے م ساقط ہو گئی اور ی داؤ معروف سے بدل گئی، خیمنا خیم کی مثالیں یچین اچیم و خرد فرخ مرت، و دخی و خرد مزد فرخ) اور اہور پچ خیم ہوسرواں (پچ خوی خسرواں)۔ نیز ”دژخیم“ بمعنی بد فطرت تا حال باقی ہے۔ پس خود اور خدا میں مشترک ”خو“ معنوی اور املائی حیثیت سے نہیں ہو سکتا۔ نیز خو میں داؤ معروف ہے اور خور، خدا کی ابتدائی شکل خوتامی میں داؤ معدول ہے۔ ”خو“ مخ معد و اؤ معدولہ اوستا اور پہلوی میں ایک مفرد حرف (ے) ہے اس کی بجائی مطابقت بھی نہیں ہو سکتی۔ فارسی میں خود خدای کی دھکا سراغ نہیں ملتا۔ البتہ دات ہے جس کے معنی عطیہ ہیں اس مفروضہ، خو دات کے معنی عطیہ فطرت ہو سکتے ہیں، نہ کہ خود خور۔ فارسی قدیم میں خوتامی بمعنی اللہ نہیں ہے، بلکہ بمعنی بادشاہ یا مالک ہے یا زیادہ سے زیادہ فرشتہ مراجعے ہو سکتے ہیں۔ لیکن اس مراد معنی کے ساتھ ساتھ، مالک، صاحب، اور بادشاہ کے معنی بھی لئے جاسکتے ہیں۔ مثلاً ”اہرمزدا خوتامی“ میں آقا یا بادشاہ بھی ہو سکتے ہیں کیونکہ اہرمزدا کے معنی ہو گئے ہیں اگر خوتامی کے معنی بھی اللہ کے لیں تو دونوں کے اجمال کا جواب کیسے ہو گا؟ دراصل خوتامی = صفت اور ہرمزدا بمعنی اہرمزدا بادشاہ۔

اسانیات کا ایک عام اصول ہے کہ لفظ وقت تخلیق و اختراع اپنے اصل مفہوم پر دلالت کرتا ہے۔ یہ مفہوم منزل و ارتقا کا شکار بعد میں ہوتا ہے۔ پس یہ کہنا کہ خوتامی بمعنی مالک، آقا اور قادر (بادشاہ) مستعمل تھا۔ ساسانی عہد میں خالق و مالک کل اور ہرمزدا کے لئے استعمال ہوا، اجزائے ترکیبی کی خود تغلیط کر رہے ہیں کیونکہ یہ لفظ جیسا کہ اجزائے ترکیبی کے معنی سے ظاہر کیا گیا ہے اگر واجب الوجود کے معنی

میں قدیم معنی (مالک، فرمانروا وغیرہ) موجود ہیں پس اجزائے ترکیبی سے جو معنی (واجب الوجود) معین کئے گئے ہیں جبکہ ان معنی میں استعمال ہی نہیں ملتا تو اجزائے ترکیبی کی جستجو قیاسی ہوسکتی ہے زیادہ حیثیت نہیں رکھتی کیونکہ اصول لسانیات کے ذریعہ امر کلیتہً غلط ہے کلفظ کے اجزائے ترکیبی سے جو معنی مرتب ہوں وہ معنی ابتداء میں نہ لئے جائیں بلکہ صدیاں گزر جانے کے بعد ان معنی کی طرف رجوع کیا جائے عقل سلیم اس کو قبول نہیں کر سکتی۔ پس معنی کی عدم موجودگی سے اجزائے ترکیبی غلط اور مرکب کہنا بھی نا درست ہے۔

”مکنو اسرا“ یہ لفظ پاک و ہند کی قدیم تہذیب کا نمائندہ ہے۔ کیونکہ سرزمین پاک و ہند میں زراعت کو اولیت حاصل ہے۔ بالخصوص قدیم زمانہ میں کاشتکاروں کی کثرت تھی اور قریب قریب بیشتر آبادی کا یہی پیشہ تھا۔ موجودہ زمانہ کی طرح ذرائع آبپاشی میں آسانیاں نہیں۔ آج کی طرح نہروں کا حال بھی پھیلا ہوا نہ تھا، بلکہ بارش کے علاوہ آبپاشی کا دار و مدار زیادہ تر کنوؤں پر تھا۔ چرس یا چرس (چمڑے کا بڑا ڈول) کو بیل کھینچتے تھے۔ اس کام کے لئے کم از کم تین آدمی درکار ہوتے تھے۔ ایک چرس کو سہارنے والا۔ ایک بیلوں کو ہانکنے والا۔ ایک کھیت کی کاریوں میں پانی پھیرنے والا۔ پہلے مشکل کام کو انجام دینے کے لئے بھرپور طاقت کی ضرورت ہوتی تھی اس لئے چرس سہارنے والے اور بھینچنے کی خدمت نوجوانوں بالخصوص خیر شادی شدہ جوانوں کے سپرد ہوتی تھی اسی خدمت کی مناسبت سے خیر شادی شدہ نوجوان کو کنوارا نوجوانوں (علامت اضافت) یعنی کنویں سے نسبت رکھنے والا، کنویں کے کام کو انجام دینے سے تعلق رکھنے والا، کہا گیا اور آج تک اپنی نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ اسی طرح گھریلو ضروریات کے لئے نوجوان لڑکیاں کنوؤں سے پانی بھر کر لیا کرتی تھیں یہ خدمت بھی عموماً خیر شادی شدہ لڑکیوں کے سپرد ہوتی تھی انہیں کنواری کہا گیا، پنکٹھ کی رنگینی اور رونق انہی کے دم سے تھی، کنواں + ری (علامت اضافت) = کنواری اسی کی نشاندہی کرتی ہے۔

”میزبان“ وہ شخص جس کے گھر کوئی بہان آیا ہو جس نے کسی کی دعوت کی ہو۔ صاحب خانہ، میزبان کہلا آئے۔ میزبان مرکب ہے، میز + بان سے۔ بان فارسی لاحقہ فعلیت ہے۔ اس کے جز اول ”میز“ کے متعلق غور کرنا ہے کہ یہ کس زبان کا لفظ ہے؟

اردو میں ”میز“ عام لفظ ہے یعنی ایک خاص انداز کا تخت یا چوکی جو مسلمان رکھنے کے لئے مخصوص ہے۔ جیسے لکھنے پڑھنے کی میز رکھنے کی میز، سنگھار میز وغیرہ انگریزی میں اس کو ٹیبل (Table) کہتے ہیں ظاہر ہے کہ اس میز کا میزبان سے تعلق نہیں ہو سکتا کیونکہ میز پر کھانا کھانا اور کھانا پاک و ہند میں عام نہیں، چند گھرانوں کا میز پر کھانا کھانے کی بات ہے، میزبان نہ صرف اردو میں بلکہ پاک و ہند کی بیشتر زبانوں اور بولیوں میں رائج ہے۔ ان اقوام اور علاقوں میں بھی جہاں میز کو کسی حیثیت سے بھی استعمال نہیں کیے، صاحب خانہ، مہماندار کو میزبان ہی کہتے ہیں۔ بجا پور کے مشہور شاعر شوقی نے سلطان عادل شاہ والی بجا پور کی تقریب شادی کے متعلق ایک شہنوی میزبان نامہ لکھی ہے۔ اس تہیک شہادت سے ثابت ہے کہ میزبان کا لفظ اردو اور دوسری زبانوں میں فارسی سے آیا۔ فارسی میں یہ لفظ قدیم زمانہ سے متصل ہے۔ اس لئے اس کو فارسی میں تلاش کرتے ہیں۔

”میزبان“ ہم کو قدیم فارسی میں مشکل ”میزوپان“ ملتا ہے۔ قدیم ایرانیوں میں مذہبی دعوت کو ”میزور“ کہتے تھے جیسے مسلمانوں میں دعوت نذر نیاز، حقیقہ، خندہ، ولیمہ وغیرہ ہیں چنانچہ اوستا سے ہوتا ہے پہلوی میں ترجمہ ہوئی ہیں ان میں ایک کتاب ”افریس میزور“ ہے جس میں اس قسم کی مذہبی دعوتوں کی تعریف بیان کی گئی ہے۔ محفل غشی یا جشن کی تعریف میں بھی ایک کتاب اورستانی تاریہ سورآفرس“ ہے اس میں ”میزوپان“ اور ”میزور“ کے الفاظ مذکور ہیں۔

”گوش داریت شاخ و رہان (کہ) ایذرتستید، تاک اورستانی تاریہ اس سورآفرس ازیزتان و سپاستاریہ اس میزوپان طری سخن گوئیم“ یعنی توجہ فرمائیے آپ نیک حضرات جو یہاں تشریف لائے ہیں تاکہ اس جشن مسرت بجا نب خدا کی مستانیش اور اس صاحب ولیمہ و حق کے شکر کے لئے ہم کچھ کہیں۔ ”ہماک زوہر مس دویدہ کیزتان پڑا اس میزوارثا نیک کرت“ (تمام طاقت و قوت اس بزرگ کے لئے جسے خدا نے اس بزم ولیمہ و مسرت کی توفیق ارزانی فرمائی)۔ ”سپاس ایڑمیزبان کی آپ روچکار انداخت و ساخت کرت“ (اس صاحب ولیمہ (دعوت) کا شکریہ جس نے اس دن کو قایم کیا اور انتظام کیا،) ساسانی عہد میں میزوارثا میزبان کی خدمت کرنے والے ایرانی طبقہ کی تقسیم کے لحاظ سے طبقہ چارہم میں داخل تھے جس سے قیاس کیا جاسکتا ہے کہ اس قسم کی دعوتوں

خزان کہا گیا۔ میرے نزدیک اس کی ایک اور صورت ہے یعنی خیزنہ (امرا از خاستن بمعنی اٹھنا) + ان (لاحقہ حالیہ)۔ خیزان یعنی اٹھتا ہوا تغیر لسانی سے سی حذف ہو گئی خزاں رہ گیا یعنی وہ موسم میں چڑھ اٹھی ہوئی نظر آئے، سرسبز کی دشا دانی، رونق ختم ہو جائے یہ قیاس ہمارے پیش نظر ہے، بہار میں یہ باتیں موجود ہوتی ہیں خزاں میں اٹھ جاتی ہیں۔

کنیز، کنیا: یہ دونوں فارسی و ہندی لفظ ہم معنی ہیں اگرچہ اب کنیز لوزڈی کے معنی میں مستعمل ہے مگر قدیم فارسی میں مطلق لڑکی، عورت کے معنی میں مستعمل تھا کنیکان بمعنی دختران، درستائش درخت نور (طوفان انار، نالیان) میں آیا ہے اور "کنیز کار" بمعنی دوشیزگان رسالہ رینک دھسر کو تان (پہلوئی) میں موجود ہے۔ قدیم فارسی میں نیک بعدہ نرہ علامت تانیث تھی کنیز بمعنی لڑکی تغیرات زمانہ کی بدولت بمعنی لوزڈی استعمال ہو کنیزک، کنیزہ، کنیز تغیراتی اشکال ہیں۔ ہندی میں کنیا بمعنی لڑکی مستعمل ہے، اس کے معنی میں تبدیلی واقع نہیں ہوئی مگر دیلا علامت تانیث (کنیا ہے۔ کنیز و کنیا دونوں کا مادہ کن ہے جو قدیم فارسی و سنسکرت کی یکانگت دیکسانیت کی دلیل ہے۔

"دختر، دوہتر، ڈاٹر (DAUGHTER)، دوشیزہ" پہلے تین لفظ فارسی، ہندی اور انگریزی میں لڑکی اور بیٹی کے استعمال کئے جاتے ہیں۔ یہ تینوں ہم معنی الفاظ ہندی یورپی لسانی سنجہ کی بنیاد وحدت کاشوت ہیں۔ قدیم انسانی تمدن میں، زراعت اور نگہ بانی کو بڑی اہمیت حاصل تھی۔ چنانچہ قبائل کے ایک علاقے سے دوسرے علاقہ کی طرف ہجرت کے اسباب میں زرخیز زمین اور عمدہ چراگاہوں کی جستجو کو اولیت قرار دیا گیا ہے۔ وسط ایشیائے آریائی قبائل کا نظریہ جوانب میں انتشار کا سبب چراگاہوں کی تلاش ہی بتایا جاتا ہے۔ اس نگہ بانی کے دور میں بھی تقسیم کار کا طریقہ رائج تھا، چنانچہ مویشیوں کا دودھ دوہنے کی خدمت لڑکیوں کے سپرد ہوا کرتی تھی۔ فارسی دختر ہندی میں دوہنا سے دختر اور دوہتر بنا ہے۔ دختر + آدہ دختر ہے خ اور دہ کا تباہ دل ہوتا ہے جیسے ہمد شید، خورشید، دختر اور دوہتر ایک ہی ہیں، جن کی اصل دوخ ہے اور خ اچھ میں بدل جاتی ہے (باقی صفحہ ۳۰ پر)

انتظام کے لئے ایک خاص گروہ تھا جس کے ذمہ کھانا پکانا اور کھانا تھا یہ ایک طرح کا پیشہ بن گیا تھا مینرو کے متعلق ملک الشعرا تہاہار نے لکھا ہے کہ مینرو ایک طرح کا دینی ویمہ تھا، جس نے اب مطلقاً خوشی اور مہمانی کے معنی حاصل کر لئے ہیں مگر لکھا ہے مینرو، نذریا مذہبی جشن کی دعوت کو کہتے تھے جو اہل دار لوگ دیتے اور اہل قریہ کو کھانا کھلاتے تھے یہ لفظ بھی تبدیلی مذہب کی وجہ سے زبان میں باقی نہیں رہا اور اس کی جگہ ویمہ نے لی۔ فارسی دمی میں بھی بہت کم استعمال ہوا ہے اور اس کے معنی بھی بدل گئے ہیں۔ مہمانی کے معنی میں استعمال ہوتا ہے، آخری ص اے بہ نبرد اندرون تہمت

دی بہ مینرو اندرون ہزار فریوں

فرخی کے شعر میں مینرو کا لفظ مینرو پر وزیر و استعمال ہوا ہے اس شعر میں مینرو کے معنی بزم سرور و دعوت کے ہیں۔ اور مذکورہ سے واضح ہوتا ہے کہ مینرو اصل میں مینروہان تھا درمیان سے د تعالک کے باعث گرجائی مینروہان باقی رہ گیا، صاحب خانہ و مہانداز کے معنی میں استعمال ہونے لگا۔ مگر ابتدائی معنی کا تصور اب بھی موجود ہے یعنی دعوت کرنے والا، اپنے گھر آئے ہوئے کو کھانا کھلانے والا، قدیم صرف دینی دعوتوں کے مخصوص تھا اور اب عام ہے۔ اسی طرح کسی کے گھر جانے والے کو مہمان کہتے ہیں جو مرکب ہے مہ (بزرگ) + مان (لاحقہ تشبیہ) = مہمان بزرگ کی مانند گھر آنے والے کی عزت کی جاتی ہے۔ بزرگ خیال کیا جاتا ہے اس لئے یہ لفظ مہمان و جود میں آیا۔

اردو میں مستعمل "مین" یعنی ٹیل، پرنگالی لفظ ہے اس کا مینرو سے کوئی تعلق نہیں۔ اردو میں پرنگالیوں کے زمانہ سے آیا۔ فارسی میں بھی رومی و انشی سے داخل ہوا ہے فارسی سے اردو میں آنا اس لئے قرین قیاس نہیں کہ غیر ملکی زبانوں کے اثر و نفوذ کے زمانہ میں پاک و ہند ایران میں لسانی روابط باقی نہ تھے۔

"خزان" (پت جہڑ کا موسم) اس لفظ کے متعلق لکھا گیا ہے کہ خزر (گرم کپڑے کا نام) + ان (لاحقہ نسبتی) یعنی وہ موسم جس کا تعلق خزر (گرم کپڑا) سے ہو۔ ایران میں جاڑوں کا موسم خزان کا زمانہ ہوتا ہے۔ اس لئے یہ نام ہوا۔ دوسرا قیاس یہ ہے کہ خزر (امرا زرخیدن بمعنی گھسنا) ان (لاحقہ حالیہ) خزان یعنی گھستا ہوا کیونکہ ایران میں جاڑوں کے موسم میں ہفت ہاری ہوتی ہے لوگ گھروں میں گھس جاتے ہیں اس لئے اس کو

غزل

شان الحق حقی

دنیا ہی کی راہ پہ آخر رفتہ رفتہ آنا ہوگا
درد بھی دے گا ساتھ کہاں تک بے دل ہی بن جانا ہوگا
حیرت کیا ہے ہم سے بڑھ کر کون بھلا بیگانہ ہوگا
خود اپنے کو بھول چکے ہیں تم نے کیا پہچانا ہوگا
دل کا ٹھکانا ڈھونڈ لیا ہے اور کہاں اب جانا ہوگا
ہم ہوں گے اور وحشت ہوگی اور یہی ویرانہ ہوگا
بیت گیا جو یاد میں تیری اک اک لمحہ دھیان میں ہے
الفت میں جی ہارنا کیسا جو کھویا سب پانا ہوگا
اور تو سب دکھ بٹ جاتے ہیں دل کے درد کو کون بتائے
دنیا کے غم برحق لیکن اپنا بھی غم کھانا ہوگا
دل میں ہجومِ درد ہے لیکن آم کے بھی اوسان نہیں
اس بدلی کو یونہی آخر بر سے بن چھٹ جانا ہوگا
اس بستی کا کون میسا اس بستی کا کون خدا
خود ہی حشر اٹھانے ہوں گے مرنا اور جی جانا ہوگا

”کرن پھول“ کے دیس نیں

صہبال کھنوی

ملک کے دونوں بازوؤں کے درمیان رشتہ اخوت و یکجہتی کا مضبوط مضبوط تر کرنے کے لئے جہاں اور طبقات کا باہمی میل جول اور اہم و اہم ضروری ہے وہاں ملک کے دانشوروں، فنکاروں، ادیبوں، افسانہ نگاروں، صحافیوں، راجہ کوہنوار، کراچی، ایک بڑا موثر وسیع ہے۔ کچھ حصہ ہوا مغربی پاکستان کے پانچ ممتاز ادیب و صحافی — (مولانا راقی الخیری، مدیر صحت، جناب حبیب کھنوی، مدیر افکار، جناب شریو لہجہ، صدر شیعہ صحافت کراچی یونیورسٹی، جناب قیوم ملک، مدیر ایئر ہارٹز اور جناب ذاکر علی غانندہ، قویہ راولپنڈی — آپ دونوں کی سرزمین اگر کرن پھول کے اس دیس کی سیاحت کے لئے گئے تھے۔ اس وفد کے ایک رکن، جناب صہبال کھنوی نے وہاں اپنا اور مائیکروں کی اس ہنری ہماری فردوس بربادان سرزمین، انھوں نے دیکھا حال ایک رپورٹ میں منسلک کیا ہے جس کا کچھ حصہ یہاں پیش کیا جاتا ہے۔

(ادارہ)

سنہ ۱۹۶۳ء، ۲۶، ۲۵، ۲۴ جون (۱۹۶۱ء) :

ریلوے اسٹیشن پر کافی بھیڑ تھی۔ چٹا کا رنگ کے افسر تعلقات حامد اسٹیشن پر موجود تھے۔ اور ٹیکسیاں بھی تیار تھیں۔ سامانی لے کر ۵ منٹ میں ریسٹ ہاؤس پہنچ گئے۔ ریسٹ ہاؤس اسٹیشن سے نزدیک ہی اسٹیشن روڈ پر واقع تھا۔ ہمارے قیام کے لئے چونکہ کمرے محفوظ تھے اس لئے کوئی دقت نہ ہوئی۔ مولانا خیر، قیوم ملک اور شریو لہجہ اپنے احباب سے ملنے چلے گئے۔ ذاکر صاحب اور میں، بہادر کو کر بازار کی سیر کر نکلے۔ اسٹیشن روڈ پر ہر قسم کی دکانیں تھیں، کتابوں کی بھی کپڑے کی بھی، پھلوں اور فرنیچر کی بھی۔ پھلوں کی ایک دکان پر کھل اور اناس دیکھ کر ذاکر صاحب رک گئے اور بھاؤ پوچھا۔ پھل والے نے ایک روپیہ کھل کا اور تین روپیہ اناس کے بتائے۔ ذاکر صاحب نے ساوگی سے پوچھا۔ تین روپیہ کے چار اناس! دکاندار نے کہا۔ نہیں صاحب، تین روپیہ کا ایک۔

ذاکر صاحب حیران رہ گئے۔ دکاندار سے کہنے لگے۔ بھائی ہم نے جہت سے بھنگا اناس بھی سات آئے کا خریدا ہے۔ یہ تو بہت جھگڑا۔

کرن پھول (ادارہ) :

پھل والے نے معصومیت سے جواب دیا : صاحب، یہ چاہتا ہوں کہ سستا اناس صرف سہت میں ملتا ہے۔ اس سول جوا کے دوران میں شہر شہر کے فرق اور مشرقی پاکستان میں پھلوں کی قلت، کثرت کا تجزیہ کرتا رہا۔ بالآخر ذاکر صاحب نے آم خریدا ہی لئے۔ آم سٹلے کر ہم نے کچھ دیر بازاروں کے چکر لگائے۔ اجالا بڈ پو اور ریت میں چیمبرس کی دکانوں پر گئے۔ وہاں سے ریسٹ ہاؤس لوٹ آئے۔ ریسٹ ہاؤس کے سامنے ہی چاہنگام کا مشہور مسکا ہوٹل ہے۔ ہم جب ریسٹ ہاؤس پہنچے تو مولانا خیر، شریف المجاہد اور قیوم ملک واپس آچکے تھے۔ افضل صاحب ہمیں مسکا ہوٹل میں کھانے کے لئے لے گئے۔ کھانا بہت اچھا تھا۔ چنانچہ اس اعلیٰ انتظام کے لئے افضل صاحب کو آج مولانا نے ”آٹھ“ نمبر دے کر دریا دلی کا ثبوت دیا۔ ۱۰ بجے کے قریب ہم ریسٹ ہاؤس لوٹ آئے۔

کراچی کے بعد چاہنگام ہی پاکستان کا سب سے بڑا بندرگاہ ہے اور دنیا کا پاکستان کے بعد اس شہر کی آبادی چار لاکھ سے بھی زائد ہے۔ تانچے کے ورق لٹے تو پتہ چلتا ہے کہ اس شہر کی ابتدا قدیم ریاست تریپورہ کے مجیروں کے ایک گاؤں کی حیثیت سے ہوئی تھی۔

لے کر ڈاکٹر کٹرس بنگلہ پہنچے۔ یہ بنگلہ ایک اونچی پہاڑی پر واقع ہے اور راستہ کافی پُر پیچ۔ پہاڑی پر چڑھتے ہوئے ہمیں دور دور تک شاداب پہاڑی سلسلے نظر آئے۔ راستے کے دونوں طرف گھنی جھاڑیوں، خود رو پودوں اور رنگارنگ پھولوں کا نہایت دلغریب نظارہ تھا۔ چٹاگانگ کے پہاڑی علاقوں کے حق اور ان کی دلکشی کے چرچے ہم نے مزدور سے تھے لیکن آج اپنی آنکھوں سے اس حسین علاقے کو دیکھ کر لیا۔ ہمارے پہنچنے کے فوراً بعد کرنل صاحب بھی دوسری جیب میں آگئے۔ بنگلے کے کمرے کھلوائے اور ہمارا سامان رکھوایا۔ جب ہم کمرے میں گئے تو معلوم ہوا کہ ایئر کنڈیشنڈ ہیں!۔ منہ ہاتھ دھو کر بنگلے کے وسیع ہال میں آن بیٹھے۔ افضل صاحب نے اس دورانی میں کپتانی فون کیا تو کسی صاحب نے کہا، آجائے، کھانا تیار ہے۔ کرنل صاحب نے اسٹیشن ویگن ہمارے لئے روک رکھی تھی چٹانچہ ہم اس میں کپتانی کے لئے روانہ ہو گئے۔ چلتے وقت کرنل صاحب نے کہا کہ بائیں بے تک کپتانی سے واپس آجائیں تاکہ کرنال فلی پیئر مل بھی دیکھ لیں۔

اس وقت ڈیڑھ بج رہا تھا اور اب ہم اسٹیشن ویگن میں بلند پہاڑی کے پیچ در پیچ راستوں سے نیچے اتر رہے تھے۔ دھوپ نکلی ہوئی تھی اور دھوپ میں پہاڑیوں کا سبزہ یوں لگ رہا تھا جیسے قدرت نے سبز مٹل کا فرش بچھا دیا ہے۔ پہاڑیوں کے درمیان دریلے کرنال فلی ایک بل کھاتی ہوئی پگنڈ ٹی کی طرح بہہ رہا تھا۔ بلندی سے اتر کر جب میدان علاقوں میں آئے تو مناظر کا حسن کچھ اور بھی نکھر گیا۔ اب اونچے نیچے پہاڑ اور خوبصورت جنگل حد نظر تک پھیلے ہوئے تھے۔ سڑک اچھی تھی اور اسٹیشن ویگن نہایت آرام دہ ۸-۹ میل کا راستہ معلوم بھی نہ ہوا۔

کپتانی میں: یہاں پہنچ کر کئی جگہ معلومات حاصل کرنے کی کوشش کی لیکن صبح رہبری نہ ہو سکی کہ کھانا کہاں ہے۔ ہر ایک نے یہی بتایا کہ فلاں جگہ، چلے جائیے۔ دو چار مقامات کے چکر لگانے کے بعد ہم ایک صاحب کے بنگلہ پر پہنچے۔ انہوں نے دروازہ کھول کر افضل صاحب کو گیسٹ ہاؤس کا پتہ بتا دیا اور اندر چلے گئے! خیر! گیسٹ ہاؤس پہنچے۔ کھانا کھایا اور کچھ دیر آرام کیا۔ اس تمام عرصے میں ہم اس بات کے منتظر رہے کہ کوئی ذمہ دار شخص آئے گا اور ہمیں کپتانی

پر واقع ہے۔ اسٹیمر دریائے وسط میں کھڑا تھا۔ ہم لوگ چھوٹی کشتیوں میں سوار ہو کر اسٹیمر پر پہنچے۔ اسٹیمر کی دوسری منزل پر ہماری نشستیں مخصوص تھیں۔ اب دریائے کرنال فلی تھا اور اسٹیمر کا ایک اور سفر۔ ہماری منزل چندر گونا تھی، جہاں کرنال فلی پیئر مل ہے، وہاں سے کپتانی جانا تھا۔ ٹھیک ساڑھے آٹھ بجے اسٹیمر روانہ ہوا۔ چارے اسٹیمر کے علاوہ دریائے چوڑے سینے پر ان گنت چھوٹی بڑی کشتیاں اور اسٹیمروں کی آمد و رفت بھی جاری تھی۔ کرنال فلی، چٹاگانگ ہی نہیں بلکہ پورے مشرقی پاکستان کا مشہور ترین اور اہم ترین دریا ہے۔ پہاڑ علاقے میں اس کے دونوں طرف نرم پائس کے گھنے جنگل ہیں بلکہ ناریل، پھالیہ، اور گجور وغیرہ کے درختوں کا بھی ایک وسیع سلسلہ ہے۔ اسی دریا میں ہم نے خوب جہاز انوں کے طرز کی کشتیاں بھی پہلی بار دیکھیں۔ ان کشتیوں کو شپیان کہتے ہیں۔ پتہ چلا کہ شپیان کے چلانے والے طرہ بڑے جیلے اور اپنے فن کے ماہر ہوتے ہیں اور ان جہاز نما کشتیوں کو لے کر کسی کبھی وہ برا تک پہنچ جاتے ہیں۔

چندر گونا میں جہاں کرنال فلی کاغذ کا کارخانہ ہے چٹاگانگ سے تقریباً ۲۰ میل دور ہے اور کپتانی، جہاں آج بجلی کا نہایت اہم منصوبہ زیر تکمیل ہے، تقریباً ۳۵ میل کے فاصلہ پر۔ افضل صاحب نے بتایا کہ ہمارے قیام و طعام کا انتظام کپتانی میں ہے لیکن جب ہم لوگ تقریباً ساڑھے بارہ بجے چندر گونا پہنچے تو وہاں ہمیں رہبری کے لئے کوئی صاحب موجود نہ تھے۔ افضل صاحب نے پہلے کی طرح اس موقع پر بھی بڑی مستعدی سے کام لیا۔ لپک کر تھانہ گھاٹ پر پہنچے اور کرنال فلی مل کے ایڈمنسٹریٹو آفیسر، کرنل سکندر غلام جانا کو صورت حال سے آگاہ کیا۔ تھوڑی ہی دیر بعد ہم نے دیکھا کہ وہ افضل صاحب کے ہمراہ گھاٹ پر تشریف لے آئے اور ہمیں کپتانی کے بجائے وہیں اتار لیا۔ گھاٹ پر خاصی بھڑکتی تھی۔ مکر کر پانی میں نو عمر لڑکے لکڑی کے ڈبوں میں بسکٹ، مٹھائی کی گولیاں اور مڑ مڑے آواز لگا کر بیچ رہے تھے۔ بعض لڑکے تختوں کو کشتی بنا کر تیر رہے تھے۔ ہم لوگ اسٹیمر سے اتر کر گھاٹ پر آ گئے۔ کرنل صاحب بڑے تپاک سے ملے اور فرمایا کہ ابھی سب انتظام ہو جائے گا۔ آپ حضرات میرے ساتھ آئیں۔

تھوڑی دیر میں ایک اسٹیشن ویگن آگئی اور ہم سامان

خوبصورت مکانات اور بیگے یا تو تعمیر ہو چکے تھے یا تکمیل کے مرحلے میں تھے۔ پہاڑیوں سے نیچے میدانوں میں اس منصوبے کے دفاتر دوزنک پھیلے ہوئے تھے۔ دیکھتے ہی دیکھتے کپتانی ایک نیا اور خوبصورت شہر بن چکا ہے۔ کپتانی بننا دہشہر کی تعمیر میں ہزاروں پاکستانیوں کا خون پسینہ شامل ہے جنہوں نے آرام و راحت کا تصور کئے بغیر اپنے ملک اور قوم کی خوشحالی کے لئے شبانہ روز محنت سے کام کیا۔ اس نئے شہر میں اسکول، اسپتال، کھیل کے میدان، وسیع شاہراہیں، بازار اور دور دور تک پھیلی ہوئی آبادی اس بات کی غارتھی کہ یہاں کے رہنے والوں کو تمام سہولتیں مہیا کی گئی ہیں۔ چمکا قبیلہ: کپتانی اور چندر گونڈ کے راستے میں ایک مقام آیا جہاں سے راجگامانی مکوراستہ جاتا تھا۔ راستے کے دوسری طرف دریائے گرنال فلی تھا۔ راجگامانی، چمکا (جسے "چاکما" بھی کہتے ہیں)، قبیلہ کا صدر مقام ہے۔ یہیں سے چانگام کے وہ پہاڑی سلسلے بھی شروع ہوتے ہیں جن کا رقبہ پانچ ہزار مربع میل ہے اور جہاں گھنے جنگلوں میں باگھی، شیر، چیتے، جیسے خوفناک جانوروں کے درمیان بارہ قبیلے بے ہیں جن میں چمکا، مونگ، موگ، چکھوس، اور ماگہ زیادہ مشہور ہیں۔ ان قبیلوں میں چمکا اور ماگہ دوسب سے بڑے قبیلے ہیں۔ پہاڑی چانگام کے ۲۹۶ گاؤں میں سے ۹۴ میں چمکا ہی بے ہوئے ہیں۔ تمام قبیلوں میں یہ قبیلہ زیادہ مشہور اور نسبتاً زیادہ مہذب بھی ہے اور اپنے سردار کا، جسے "راجا" کہتے ہیں بے حد وفادار ہے۔ موجودہ راجہ کافی روشن خیال اور اعلیٰ تعلیم یافتہ ہے۔ یہی سبب ہے کہ قبیلے کے بچے علم تعلیم بھی حاصل کر رہے ہیں یہ قبیلہ منگول اور آریائی نسل سے تعلق رکھتا ہے اور صدیوں سے ان پہاڑیوں پر آباد ہے۔ اس قبیلے کے لوگ بدھ مذہب کے پیرو ہیں۔ یہ چمکا زبان بولتے ہیں جسے بنگالی کی ایک بولی کہا جاسکتا ہے۔ کھیتی باڑی ان کا خاص پیشہ ہے۔ جسے "بھوم" کہتے ہیں۔ پہاڑی دھلاؤں پر یہ لوگ دھان، روٹی، میز، وغیرہ کی کاشت کرتے ہیں۔ درانتی اور کلہاڑی کے طرز کا ایک خاص اوزار جسے "داؤ" کہا جاتا ہے، فصل اور لکڑی کاٹنے کے لئے استعمال کیا جاتا ہے۔ یہ لوگ نئی اور ترقی یافتہ دنیا کی تقریباً تمام ضرورتوں سے بے نیاز ہیں۔ روٹی پیدا کر کے قبیلے کی عورتیں اپنے لئے خود ہی کپڑا بن لیتی ہیں۔ مرد جنگل سے بانس کاٹ کر اپنا گھر اور فرنیچر تیار کر لیتے ہیں۔

جیسے اہم مقام کے بارے میں ضروری معلومات فراہم کرے گا لیکن ایسا نہ ہوا۔ اس تمام دورے میں یہ پہلا مقام تھا جہاں کسی شخص نے ہماری آمد سے دلچسپی نہیں لی۔

تین بجے کے قریب ہم واپس ہوئے اور واپسی میں ہم نے کپتانی کا وہ عظیم منصوبہ بھی دیکھا جو کرنا فلی کثیر المقاصد منصوبہ ترقی کے نام سے موسوم ہے۔ یہ منصوبہ واقعی بڑے اہم مقاصد کا حامل ہے۔ سب سے بڑا مقصد تو یہ ہے کہ کرنا فلی میں جو آئے دن سیلاب آتا ہے اس کا سد باب کیا جائے دوسرے اس دریا پر بند باندھنے سے جو پانی محفوظ ہوگا وہ کھیتی باڑی کے کام میں لایا جائے تیسرا اور سب سے اہم مقصد یہ ہے کہ اس بند سے بجلی پیدا کی جائے۔ یہ منصوبہ ۱۹۵۲ء میں شروع کیا گیا تھا اور جس رخسار سے ہم نے کام ہونے دیکھا اس سے اندازہ ہوا کہ سالانہ پچھیلے میں منصوبہ مکمل ہو جائے گا۔ اور تکمیل کے بعد پین بجلی سے ایک لاکھ بیس ہزار کلو واٹ بجلی پیدا ہو سکے گی، جس سے اضلاع دھاکا، میمن سنگھ، سلہٹ، ترپورہ، نواکھالی اور چانگام کے ہر گاؤں میں بجلی کی روشنی پہنچ جائے گی اور توقعات کے مطابق خیراتی پاکستان کے ذریعہ کروڑوں سے زائد افراد اس سے فیضیاب ہو سکیں گے۔

یہ منصوبہ ۱۹۶۱ء کے آخر میں مکمل ہو چکا ہے۔ انسانی فکر اور مشینی طاقت نے یہاں بڑے بڑے پہاڑوں کو جس طرح کاٹا ہے اور دریائوں کا رخ پھیر کر کپتانی کا عظیم ڈپشکرو بند جس طرح تعمیر کیا ہے اسے دیکھ کر آدمی دنگ رہ جاتا ہے۔ کپتانی کا بند دیکھ کر ہم اس نوزائیدہ شہر سے گزرے، جہاں ہر طرف تعمیری کام ہو رہا تھا۔ اونچی نیچی پہاڑیوں پر ان گنت

۱۔ یہ بند انجینئری کے کمالات اور انسانی عزم و تعاون کا بڑا عظیم کارنامہ ہے۔ اس پر نصف کروڑ سے زائد خرچ آیا ہے۔ ۸۰۰ فٹ کی مضبوط بنیادوں پر یہ بند مندر سے ۱۲۴ فٹ اونچا ہے اور دریائے کرنا فلی پر ۳۴ سو فٹ تک پھیلا ہوا ہے۔ پانی کے بہاؤ کو روکنے اور نکلنے کے لئے ۱۶ آہنی دروازے بنائے گئے ہیں جو خود کار مشینوں سے کنٹرول اور بند کئے جاسکتے ہیں۔ خشکی کے زمانے میں جن جگہ پانی کو بہوں کے ذریعہ کھیتوں تک پہنچایا جاسکتا ہے۔ ایک انزانہ کے مطابق اس پانی سے ایک لاکھ ایکڑ سے زائد زمین سیراب ہو سکے گی۔ اس بند کی تعمیر جو افراد متاثر ہوئے ہیں انہیں نئی جگہوں پر آباد کر دیا گیا ہے۔

رزم و بزم کے عیت گاتے پھرتے ہیں۔ عورتوں کو بھولوں سے بھی عشق ہے اور گھنے پاتوں سے بھی، جو عموماً چاندی کے ہوتے ہیں۔ مرد اور عورتیں کافی صحت مند اور جفاکش ہیں۔ چٹکے کشی تیراکی اور رس کشی کے کھیلوں سے خاص دلچسپی لیتے ہیں۔

پہاڑی علاقے کے گھنے جنگلوں میں بانس اور قیمتی لکڑی کے علاوہ ہاتھی، شیر، چیتے وغیرہ بھی کثرت سے پائے جاتے ہیں۔ یہ جنگل کاکس بازار تک پھیلے ہوئے ہیں۔ انہی جنگلوں سے انہی خاص طریقوں سے پکڑے جاتے ہیں جسے "کھیدا" کہتے ہیں۔

ہمارے آنے سے چند روز قبل چانگنام کے پہاڑی علاقوں میں کثرت سے بارش ہو چکی تھی جس کے سبب رانگامانی جانے کا راستہ بند ہو گیا تھا۔ دریائی سفر سے تقریباً ۱۲ گھنٹے صرف ہوتے مگر ہمارے دورے کا پروگرام بڑا محدود تھا اس لئے خواہش کے باوجود ہم رانگامانی تک نہ جاسکے۔ راستہ میں ایک خوبصورت مقام پر دریائے کرناٹکی اور سرسبز پہاڑوں کے پس منظر میں سفید صاحب نے گرہ پڑنے کے سفر کے ان لمحوں کو یادگار بنا دیا۔ یادوں کے نقش تو کبھی کبھی دھندلا بھی جاتے ہیں لیکن تصویروں کے نقش یادوں کے چراغ کی مانند ہمیشہ جلتے ہی رہتے ہیں۔ وقت اور زمانے کی گرفت سے آزاد۔

پہاڑی راستوں سے گزر کر ہم ایک اور دورا ہے پر آئے جہاں سے کاکس بازار کو راستہ جاتا تھا اور جو اس وقت بارش کے سبب ناقابل گزر تھا۔

کاکس بازار: چانگنام کی پہاڑیوں کا سلسلہ براہ کی سرحد کے ساتھ ساتھ میلوں جنوب تک چلا گیا ہے، جہاں ساحل پر مشہور تفریحی مقام کاکس بازار واقع ہے۔ کاکس بازار کا ساحل ۶ میل لمبا ہے۔ اور یہ دنیا کا سب سے لمبا ساحل مانا گیا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اٹھارویں صدی میں ایک انگریز مہم جو، مشر کاکس نے یہاں آنے کے بعد ایک موگھ گاؤں کے چار طرف لکڑی کے جنگلے کھڑے کر دیے تھے۔ دوسری جنگ عظیم کے دوران یہ ایک اہم چھاؤنی بھی بن گیا تھا۔ اور جاپانیوں نے اس پر ۶۶ مرتبہ بم برسائے۔ چانگنام سے یہاں اسٹیمر کے ذریعہ بھی آسکتے ہیں اور ہوائی جہاز سے بھی۔ کھٹائی اور چند رگونا کے درمیان ہمیں (بانی ص ۳۵ پر)

چٹکاکا عورتیں بڑی ہنرمند ہوتی ہیں۔ جُٹنا، کاتنا، رنگنا، گھول کو سنبھالنا کھیتیں پر مردوں کا ہاتھ پٹانا ان کے محبوبہ شغلے ہیں۔ جاڑوں میں یہ لوگ کھیتی باڑی کرتے ہیں اور گرمیوں میں جنگل کی قیمتی لکڑی اور بانس کاٹتے ہیں۔ سادہ لباس، سادہ زندگی اور سادہ غذا اس قبیلے کی خصوصیات ہیں۔ مرد ٹخنوں تک لنگوٹ ہی باندھتے ہیں۔ عورتیں اسکرٹ اور بلاؤز کی طرز کا ایک لباس پہنتی ہیں۔ تنہا ساری کارواج بھی عام ہو رہا ہے۔ یہ تمام کپڑے گھروں میں ہی تیار ہوتے ہیں۔ چاول ان کی خاص غذا ہے۔ جانوروں کا گوشت بھی استعمال کرتے ہیں اور تبا کو بہت زیادہ پیتے ہیں۔ سال کے سال چیت کے موسم میں چودھویں رات کو یہ لوگ ایک بڑا جشن مناتے ہیں جسے "مٹن مانا" کہتے ہیں۔ ہتھوار کے موہوں پر چاول کی شراب پی جاتی ہے۔ اچھے اچھے کھانے پکاتے ہیں۔ بدھ مذہب پر عقیدہ رکھنے کے باوجود ان کی عبادت کے طریقے ہندوؤں کی پوجا پاٹ سے کافی مماثلت رکھتے ہیں۔

قبیلے میں شادی بیاہ کی عجیب و غریب رسمیں رائج ہیں۔ اسی طرح پیدائش اور موت پر بھی یہ اپنی دیرینہ روایات پر ہی عمل پیرا ہیں۔ شادی کے موقع پر دولہا کے بائیں جانب دلہن بیٹھتی ہے۔ رشتہ داروں میں سے ایک مرد ایک عورت دولہا دلہن کو کمرے باندھ دیتے ہیں۔ گرہ لگانے سے پہلے شادی میں شرکت کرنے والے حاضرین سے اجازت حاصل کی جاتی ہے۔ گرہ کے بعد دونوں اپنے خاندان کے بزرگوں کے پاس جاتے ہیں اور وہ چاول، روٹی، گھاس، وغیرہ ان کی بھولی میں ڈال دیتے ہیں اور دعا دیتے ہیں۔ گاؤں کا بجا باری شادی کی یہ تمام رسمیں انجام دیتا ہے۔ لڑکے کی پیدائش کے وقت دومرتبہ ہندو ق چلائی جاتی ہے اور لڑکی کی پیدائش پر ایک بار۔ قدرتی موت پر چٹکا عام طور پر لاش کو جلاتے ہیں لیکن وبائی امراض میں مرنے والوں کو دفن کر دیا جاتا ہے اور سات دن تک مرنے والے کا سوگ رہتا ہے۔ اس دوران میں گوشت، انڈے، اور پھل کے استعمال سے پرہیز کرتے ہیں۔ لڑکے سر کے بال منڈوا دیتے ہیں۔ اور کئی مذہبی رسومات ادا کی جاتی ہیں تاکہ مرنے والے کی روح کو اطمینان نصیب ہو۔

قبیلے کے مرد اور عورتیں ذوق لطیف سے بھی عاری نہیں۔ بانسری ان کی مقبول عام موسیقی ہے اور بانسری بجانے میں مرد اور عورتیں یکساں مہارت رکھتے ہیں۔ گویے گاؤں گاؤں گھومتے اور

سُرِیلی کہانیاں

خلفہ حسین

راگ راگیاں کا نون میں رس گھولتی ہیں۔ اسی طرح وہ سُرِیلی کہانیاں بھی جو ہر نال کے رسیا گانے والوں سے خلق رکھتی ہیں۔ اور پھر بڑوں سب کے لئے لچک کا باعث ہیں۔ اس لئے مضمون نگار نے انہیں لکھا بھی ایسے ہے کہ پھر بڑے سب اس سے لطف اندوز ہو سکیں۔ (ادارہ)

گزرتی ہے تو آواز پیدا ہوتی ہے۔ جب پرندے کی چوچ سے اسی طرح سات پر پیدا ہوتے ہیں تو ان سروں کے پیدا ہونے ہی اُس پرندے کے گھونسلے میں آگ لگ جاتی ہے جس میں وہ پرندہ جل کر خاک ہو جاتا ہے۔ پرندے کی اس خاک سے کچھ عرصے بعد ذرہ ذرہ ایک اندھا پیدا ہوتا ہے جس میں سے پھر ایک موسیقار پیدا ہوتا ہے۔ یہ پرندہ ہمارا ہر کسی طرح گھاس بھوس کا گھونسلہ بنا تا ہے اور پھر جل کر خاک ہو جاتا ہے غرض اس طرح یہ سلسلہ ہمیشہ جاری رہتا ہے۔

انسان نے اس پرندے کی چوچ سے نکل ہوئی آوازوں ہی سے سنا سروں کا خیال لیا اور انہیں سروں کے بھرے سے دنیا بھر کی موسیقی بنی ہے۔ موسیقی کو لفظ، ذرا ذرا سی تبدیلی کے ساتھ دنیا کی اکثر زبانوں میں بھلا اور یہ لفظ اسی پرندے کے نام سے بنایا گیا ہے۔ ہمارا اپنی زبان میں بھی گانے بجانے کے علم کو علم موسیقی ہی کہتے ہیں۔

موسیقی نے کس طرح جنم لیا اور کس طرح یہ نام پایا یہ تو آپ کو معلوم ہو گیا۔ اب میں دور پرے کی باتیں چھوڑ کر اپنی ہی کہانیاں سناتا ہوں۔ ہمارے ہاں بڑے بڑے موسیقار پیدا ہوئے ہیں اور انہوں نے اس فن میں جو نام پیدا کیا اس کی داستان بھی سننے والی ہے۔ سب سے پہلے میں خلیفہ ماریون رشید کے درباری گویا کا قصہ آپ کو سناتا ہوں! ابراہیم موصلی،

تم نے خلیفہ ماریون رشید کا نام تو سنایا ہی ہو گا۔ خلیفہ اپنے زمانے میں بہت سے علوم اور فنون کی سرچھی کرتا تھا۔ چنانچہ اس کے دربار میں جہاں بڑے بڑے ادیب اور شاعر جمع ہوتے تھے وہاں موسیقی کی محفلیں بھی بڑی شان شوکت کے ساتھ ہوا کرتی تھیں۔ اس زمانے کا سب سے

یہ تو سب ہی جانتے ہیں کہ گانے کی آواز عام بول چال کی آواز سے مختلف ہوتی ہے۔ اسی لئے گانے کی آوازوں کو سُرِیلی آوازیں کہتے ہیں۔ یہ آوازیں تعداد میں کل سات ہوتی ہیں، جنہیں ہم سُرِی کہتے ہیں ہر سُرِی دن بے شمار آوازیں سننے رہتے ہیں۔ مثلاً اجن کی سیدی کی آواز۔ موٹ کے ہارن کی آواز۔ ہوائی جہاز کے اڑنے کی آواز۔ بندوق کی آواز۔ جانوروں اور پرندوں کی آوازیں، اور ہماری آپس کی بول چال کی آوازیں وغیرہ۔ لیکن یہ سب آوازیں سُرِیلی آوازیں نہیں۔ سُرِیلی آوازیں وہی ہیں جو ہم گانا گاتے وقت اپنے گلے سے نکالتے ہیں یا وہ آوازیں جو کسی موسیقی کے ساز سے نکلتی ہیں۔ موسیقی کی آوازیں انسان نے کس طرح دریافت کیں، اس کے بارے میں ہر ملک اور ہر قوم میں مختلف کہانیاں سننے میں آتی ہیں۔ مثلاً ہندوؤں کا عقیدہ ہے کہ ہوا و پو، جو ان کے سب سے بڑے دیوتا تھے، کے دربار میں کچھ دیوتے اور کچھ پریاں۔ پرلوں کی آواز باریک تھیں اور دیوؤں کی آوازیں بھاری تھیں۔ جنہاں دیوتے انہیں آوازوں سے مختلف سروں کو چن لیا اور بعد میں یہ سرائیوں کو سکھا دیتے۔ لیکن ان سروں کے بارے میں سب سے مزید احکامیت یونانیوں میں پائی جاتی

موسیقار:

وہ حکایت یہ ہے کہ موسیقار نامی ایک پرندہ ہوتا ہے۔ اس پرندے کی چوچ میں سات سوراخ ہوتے ہیں۔ یہ پرندہ ایک خاص موسم میں گھاس بھوس کا گھونسلہ بنا کر اس میں بیٹھ جاتا ہے۔ اس وقت ہند کی چوچ کے سوراخوں میں سے ہوا ہو کر گزرتی ہے تو سات سُرِیلی پیدا ہوتے ہیں۔ ہم جانتے ہیں کہ جب ہوا کسی سوراخ میں سے ہو کر گزرتی ہے تو اس سے آواز ضرور پیدا ہوتی ہے۔ مثلاً بانسری کے سوراخوں سے جب ہوا

رزم و بزم کے گیت گاتے پھرتے ہیں۔ عورتوں کو پھولوں سے بھی عشق ہے اور گھنے پاتوں سے بھی، جو عموماً چاندی کے ہوتے ہیں۔ مرد اور عورتیں کافی صحت مند اور جفاکش ہیں۔ چمکے کشنی تیراکی اور رس کشی کے کھیلوں سے خاص دلچسپی لیتے ہیں۔

پہاڑی علاقے کے گھنے جنگلوں میں بانس اور قیمتی لکڑی کے علاوہ ہاتھی، شیر، چیتے وغیرہ بھی کثرت سے پائے جاتے ہیں۔ یہ جنگل کاکس بازار تک پھیلے ہوئے ہیں۔ انہی جنگلوں سے انگو خاص طریقوں سے پکڑے جاتے ہیں جسے "کھیدا" کہتے ہیں۔

ہمارے آنے سے چند روز قبل چانگنام کے پہاڑی علاقوں میں کثرت سے بارش ہو چکی تھی جس کے سبب رانگھا مانی جانے کا راستہ بند ہو گیا تھا۔ دریائی سفر سے تقریباً ۱۲ گھنٹے صرف ہوتے مگر ہمارے دورے کا پروگرام براہِ محدود تھا اس لئے خواہش کے باوجود ہم رانگھا مانی تک نہ جاسکے۔ راستہ میں ایک خوبصورت مقام پر دریائے کرناٹلی اور سرسبز پہاڑوں کے پس منظر میں سفید صاحب نے گرہ پ فوٹو لے کر سفر کے ان لمحوں کو یادگار بنا دیا۔ یادوں کے نقش تو کبھی کبھی دھندلا بھی جاتے ہیں لیکن تصویروں کے نقش یادوں کے چراغ کی مانند ہمیشہ جلتے ہی رہتے ہیں۔ وقت اور زمانے کی گرفت سے آزاد۔

پہاڑی راستوں سے گزر کر ہم ایک اور دروازے پر آئے جہاں سے کاکس بازار کو راستہ جاتا تھا اور جو اس وقت بارش کے سبب ناقابلِ گزر تھا۔

کاکس بازار: چانگنام کی پہاڑیوں کا سلسلہ براہِ یکا مرحلہ کے ساتھ ساتھ میلوں جنوب تک چلا گیا ہے، جہاں ساحل پر مشہور تفریحی مقام کاکس بازار واقع ہے۔ کاکس بازار کا ساحل ۷ میل لمبا ہے۔ اور یہ دنیا کا سب سے لمبا ساحل مانا گیا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اٹھارویں صدی میں ایک انگریز مہم جو، مشرکاکس نے یہاں آنے کے بعد ایک موگہ گاؤں کے چار طرف لکڑی کے جنگلے کھڑے کر دیے تھے۔ دوسری جنگ عظیم کے دوران یہ ایک اہم جہاؤنی بھی بن گیا تھا۔ اور جاپانیوں نے اس پر ۶ مرتبہ بم برسائے۔ چانگنام سے یہاں اسٹیمر کے ذریعہ بھی آسکتے ہیں اور ہوائی جہاز سے بھی۔ کھٹائی اور چند رگونا کے درمیان ہمیں (باقی صفحہ پر)

چانگنام عورتیں بڑی ہنرمند ہوتی ہیں۔ مینا، کاتنا، رانگھا، گھروں کو سنبھان کھیتیں پر مردوں کا ہاتھ بیانا ان کے محبوب مشغلے ہیں۔ جاڑوں میں یہ لوگ کھیتی باڑی کرتے ہیں اور گرمیوں میں جنگل کی قیمتی لکڑی اور بانس کاٹتے ہیں۔ سادہ لباس، سادہ زندگی اور سادہ غذا اس قبیلے کی خصوصیات ہیں۔ مرد سٹخوں تک لنگوٹی ہی باندھتے ہیں۔ عورتیں اسکرٹ اور بلاؤڈ کی طرز کا ایک لباس پہنتی ہیں۔ تن کان ساڑی کا رواج بھی عام ہو رہا ہے۔ یہ تمام کپڑے گھروں میں ہی تیار ہوتے ہیں۔ چاول ان کی خاص غذا ہے۔ جانوروں کا گوشت بھی استعمال کرتے ہیں اور تبا کو بہت زیادہ پیتے ہیں۔ سال کے سال چیت کے موسم میں چودھویں رات کو یہ لوگ ایک بڑا جشن مناتے ہیں جسے "مغن مانا" کہتے ہیں۔ ہتوار کے موقعوں پر چاول کی شراب پی جاتی ہے۔ اپنے اپنے کھانے پکھتے ہیں۔ بدھ مذہب پر عقیدہ رکھنے کے باوجود ان کی عبادت کے طریقے ہندوؤں کی پوجا پاٹ سے کافی مماثلت رکھتے ہیں۔

قبیلے میں شادی بیاہ کی عجیب و غریب رسمیں رائج ہیں۔ اسی طرح پیدائش اور موت پر بھی یہ اپنی دیرینہ روایات پر ہی عمل پیرا ہیں۔ شادی کے موقع پر دولہا کے بائیں جانب دلہن بیٹھتی ہے۔ رشتہ داروں میں سے ایک مرد ایک عورت دولہا دلہن کو کمرے باندھ دیتے ہیں۔ گرہ لگانے سے پہلے شادی میں شرکت کرنے والے حاضرین کے اجازت حاصل کی جاتی ہے۔ گرہ کے بعد دونوں اپنے خاندان کے بزرگوں کے پاس جاتے ہیں اور وہ چاول، مدنی، تمھاس، وغیرہ ان کی جھولی میں ڈال دیتے ہیں اور دعا دیتے ہیں۔ سکاؤں کا بجا رہی شاد کا کی یہ تمام رسمیں انجام دیتا ہے۔ لڑکے کی پیدائش کے وقت دو مرتبہ بندوٹ چلائی جاتی ہے اور لڑکی کی پیدائش پر ایک بار۔ قدرتی موت پر چٹکا عام طور پر لاش کو جلاتے ہیں لیکن وبائی امراض میں مرنے والوں کو دفن کر دیا جاتا ہے اور سات دن تک مرنے والے کا سوگ رہتا ہے۔ اس دوران میں گورنمنٹ، انڈس، اور جمہلی کے استعمال سے پرہیز کرتے ہیں۔ لڑکے مر کے بال منڈوا دیتے ہیں۔ اور کئی مذہبی رسومات ادا کی جاتی ہیں تاکہ مرنے والے کی روح کو اطمینان نصیب ہو۔

قبیلے کے مرد اور عورتیں ذوقِ بطیف سے بھی عاری نہیں۔ بانسری ان کی مقبول عام موسیقی ہے اور بانسری بجانے میں مرد اور عورتیں یکساں مہارت رکھتے ہیں۔ گویے گاؤں گاؤں گھومتے اور

سُرِ ملی کہانیاں

طفف حسین

راگ و گیتوں کا فن میں اس گھولتی ہیں۔ اسی طرح وہ سُرِ ملی کہانیاں بھی ہر سُرِ ملی کے رسیٹھانے والوں سے تعلق رکھتی ہیں۔ اور چھوٹے بڑوں سب کے لئے دلچسپی کا باعث ہیں۔ اس لئے مضمون نگار نے انہیں لکھا بھی ایسے ہے کہ چھوٹے بڑے سب اس سے لطف اُدر رہے ہوں گے۔ (ادارہ)

گزرتی ہے تو آواز پیدا ہوتی ہے۔ جب پرندے کی چوچ سے اسی طرح سات سر پیدا ہوتے ہیں تو ان سروں کے پیدا ہونے ہی اُس پرندے کے گھونسلے میں آگ لگ جاتی ہے جس میں وہ پرندہ جل جھک ہو جاتا ہے۔ پرندے کی اس خاک کے کچھ عرصے بعد درخشاں ایک اندھا پیدا ہو جاتا ہے جس میں سے پھر ایک موسیقار پیدا ہوتا ہے۔ یہ پرندہ تھا مگر اسی طرح گھاس پھوس کا گھونسلہ بناتا ہے اور پھر جل کر خاک ہو جاتا ہے غرض اس طرح یہ سلسلہ ہمیشہ جاری رہتا ہے۔

انسان نے اس پرندے کی چوچ سے نکلی ہوئی آوازوں ہی سے سنا سروں کا خیال لیا اور انہیں سروں کے بڑے سے دنیا بھر کی موسیقی بنی ہے۔ موسیقی کا لفظ، ذرا ذرا سی تبدیلی کے ساتھ دنیا کی اکثر زبانوں میں نکلا اور یہ لفظ اتنا پرندے کے نام سے بنایا گیا ہے۔ ہمارے اپنی زبان میں بھی گانے جلنے کے علم کو علم موسیقی ہی کہتے ہیں۔

موسیقی کے کس طرح جنم لیا، در کس طرح یہ نام پایا یہ تو آپ کو معلوم ہو گیا۔ اب میں دو پرے کی باتیں چھوڑ کر انہوں کی ہی کہانیاں سناتا ہوں۔ ہمارے ہاں بڑے بڑے موسیقار پیدا ہوئے ہیں اور انہوں نے اس فن میں جو نام پیدا کیا اس کی داستان بھی سننے والی ہے۔ سب سے پہلے میں خلیفہ داروں رشید کے درباری گوتے کا قصہ آپ کو سناتا ہوں، ابراہیم موصلی،

تم نے خلیفہ داروں رشید کا نام تو سنا ہی ہوگا۔ یہ خلیفہ اپنے زمانے میں بہت سے علوم اور فنون کی سرپرستی کرتا تھا۔ چنانچہ اس کے دربار میں جہاں بڑے بڑے ادیب اور شاعر جمع ہوتے تھے وہاں موسیقی کی محفلیں بھی ٹہری شان شوکت کے ساتھ ہوا کرتی تھیں۔ اس زمانے کا سب سے

یہ تو سب ہی جانتے ہیں کہ گانے کی آواز عام بول چال کی آواز سے مختلف ہوتی ہے، اسی لئے گانے کی آوازوں کو سُرِ ملی آواز ہی کہتے ہیں۔ یہ آواز پر تعداد میں کل سات ہوتی ہیں، جنہیں ہم سُرِ ترکیبے میں ہم آئے دن جے شام آواز ہی سنتے رہتے ہیں۔ مثلاً انجن کی سیٹی کی آواز۔ موٹر کے ہارن کی آواز۔ ہوائی جہاز کے اڑنے کی آواز۔ بندوبست کی آواز۔ جانوروں اور پرندوں کی آوازیں، اور ہماری آپس کی بول چال کی آوازیں وغیرہ۔ لیکن یہ سب آوازیں سُرِ ملی آوازیں نہیں۔ سُرِ ملی آوازیں وہی ہیں جن کو گانا گانے وقت اپنے گانے سے نکالتے ہیں یا وہ آوازیں جو کسی موسیقی کے ساز سے نکلتی ہیں۔ موسیقی کی آوازیں انسان نے کس طرح دریافت کیں، اس کے بارے میں ہر ملک اور ہر قوم میں مختلف کہانیاں سننے میں آتی ہیں۔ مثلاً ہندوؤں کا عقیدہ ہے کہ جہادو، جو ان کے سب سے بڑے دیوتا تھے، کے دربار میں کچھ دیوتے تھے اور کچھ پریاں۔ پرلوہ کی آواز باریک تھیں اور دیوؤں کی آوازیں بھاری تھیں۔ تہا دیو نے انہیں آوازوں سے مختلف سروں کو جن لیا اور بعد میں یہ سُرِ انسانوں کو سکھا دیئے۔ لیکن ان سروں کے بارے میں سب سے مزید احکامیت یونانیوں میں پائی جاتی ہے۔

موسیقار:

وہ حکایت یہ ہے کہ موسیقار نامی ایک پرندہ ہوتا ہے۔ اس پرندے کی چوچ میں سات سوراخ ہوتے ہیں۔ یہ پرندہ ایک خاص موسم میں گھاس پھوس کا گھونسلہ بنا کر اس میں بیٹھ جاتا ہے۔ اس وقت پرندے کی چوچ کے سوراخوں میں سے ہوا مگر گزرتی ہے تو سات سُر پیدا ہوتے ہیں۔ ہم جانتے ہیں کہ جب ہوا کسی سوراخ میں سے ہو کر گزرتی ہے تو اس سے آواز ضرور پیدا ہوتی ہے۔ مثلاً ہانسری کے سوراخوں سے جب ہوا

اب آپ بھی ایسی ہی کوئی دھن مت ٹھانیں۔ مگر وہ مقابلہ نہیں کر سکتا تھا اس لئے بہت شرمندہ ہوا۔ باروں رشید کو یہ بات نامنی پڑی کہ اس وقت ابراہیم موصلی سے بڑھ کر کوئی دوسرا فنکار موجود نہیں ہے۔ اس کے بعد خلیفہ نے اس کا رتبہ بھی بڑھا دیا اور ہر طرح ابراہیم موصلی کے فن کی قدر دانی کی!

شاہی قالین،

خلیفہ باروں رشید کا دور حکومت بہت اچھا تھا اور اسی وجہ سے لوگ عام طور پر بہت خوش حال اور دولت مند بھی تھے۔ میوں اور رسیوں کے عالی شان مکان تھے اور ہر طرف شعر و شاعری اور موسیقی کے چرچے تھے۔ خود خلیفہ باروں رشید کے دربار میں بہت سے اچھے اچھے گویے ملازم تھے۔ ان گویوں میں ابراہیم موصلی اور ابن جابر کی چنگ کاوا قدم بچھلی کہانی میں پڑھ چکے ہوا یہ کہانی سنو،

باروں رشید نے اپنے درباریوں کو تین گروہوں میں تقسیم کر رکھا تھا پہلے گروہ میں وزیر، شہزاد، عا در بڑے بڑے فوجی حاکم ہوتے تھے جو بادشاہ کے قریب بیٹھتے تھے دوسرے گروہ میں وہ لوگ ہوتے ہوتے تھے جو شاہی ندیم ہوتے تھے یعنی بادشاہ کے خاص دوست، ان کے علاوہ ادیب، شاعر، گانے والے اور دوسرے فن کار ہوتے تھے تیسرے

گروہ میں ساز بجانے والے، بڈلہ گو یعنی لطیفے سنانے والے اور داستان سرا یعنی قصے سنانے والے اور اسی طرح کے فنکار ہوتے تھے۔ ایک مرتبہ ایک ساز بجانے والے نے جس کا نام برصوم تھا ساز بجانے والوں رشید کو بہت خوش کیا۔ باروں رشید نے اس سے پوچھا کہ وہ کیا افغان تھا ہے۔ برصوم نے فوراً درخواست کی اسے دوسرے درجے کے گروہ میں شامل کیا جائے۔ باروں رشید نے کہا کہ اگر وہ ابن جابر کی طرح فخریہ کار سنا دے تو اسے یہ اعزاز بخشا جاسکتا ہے۔ برصوم نے فوراً ساز اٹھایا اور ابن جابر کی مخصوص دھنوں کو اس انداز سے بجا کہ خواب میں جاتے بھی وہ وہ کہہ اٹھا۔ باروں رشید نے خوش ہو کر اسے اسی گروہ کے ساتھ بیٹھنے کا حکم دیا جس میں ابن جابر شامل تھا اور ساتھ ہی اسے ایک بڑا قیمتی قالین بھی انعام میں دیا۔ برصوم یہ قالین لے کر خوش خوش اپنے گھر گیا۔ ساتھ ہی ساتھ یہ خبر بھی سارے شہر میں پھیل گئی کہ اس کا رتبہ بلند کر دیا گیا ہے۔

بڑا گویا ابراہیم موصلی تھا۔ شروع شروع میں ابراہیم موصلی ایک بہت بڑا ادیب بھی تھا۔ لیکن ایک روز اس نے خواب میں ایک بزرگ کو دیکھا کہ اس بزرگ نے موصلی سے کہا: ابراہیم، اگر تم شعر کی جگہ موسیقی کو اپنانے کی کوشش کرو تو تم دنیا کے بہت بڑے آدمی بن سکتے ہو اور تمہارا نام ہمیشہ کے لئے زندہ رہ سکتا ہے۔ اس بات کو سنتے ہی ابراہیم موصلی نے موسیقی سیکھنا شروع کر دی۔ کچھ عرصہ بعد اس فن میں اس نے اتنی مہارت حاصل کر لی کہ واقعی اس زمانے کے گانے والوں میں وہ سب سے بڑا استاد مان لیا گیا۔ ابراہیم کی کیفیت یہ ہو گئی کہ وہ ہر وقت موسیقی کی تاثیر میں ڈوبا رہتا تھا اور جب کبھی گاتا تو لوگوں پر بھی گہری کیفیت طاری ہو جاتی تھی۔ کچھ مدت بعد ابراہیم کو اپنے فن پر اس قدر مان ہو گیا کہ اس نے اپنے زمانے کے دوسرے فنکاروں سے ملنا جلتا تک بند کر دیا بلکہ بعض اوقات وہ خلیفہ کا حکم بھی ٹال جاتا۔ باروں رشید کو یہ بات ناگوار ہوئی اور اس نے ابراہیم کو نیچا دکھانے کی ایک ترکیب سوچی۔ اس نے اپنے ایک اہل دستار کو اپنے کو جس کا نام ابن جابر تھا، حکم دیا کہ وہ ابراہیم سے مقابلے کی کوشش کرے۔ ابن جابر جانتا تھا کہ ابراہیم کے مقابلے کی اس میں تاب نہیں ہے۔ لیکن خلیفہ کے حکم کو نہیں ٹال سکتا تھا۔ اس نے اس نے اپنے ایک دوست کے ذریعے سے جواہر ابراہیم کی محفلوں میں لایا جاکر اکرنا تھا چند ایسے راگ یاد کر لئے جن پر ابراہیم کو بڑا ناز تھا اور جو ابراہیم ہی کے بندے ہوئے تھے۔ اس کے بعد اس نے باروں رشید کی خدمت میں عرض کی کہ مقابلے کی محفل منعقد کر دی جائے۔ چنانچہ ایک جلسہ ہوا جس میں سب دیوانی جمع ہوئے۔ اور باروں رشید نے ابن جابر سے کہا کہ کچھ نئے نئے پیش کرو۔ ابن جابر نے ابراہیم کے بنائے ہوئے نئے نئے راگ یاد کر کے اور کہا کہ میں نے یہ حال ہی میں اختراع کئے ہیں۔ اس کے بعد باروں رشید نے ابراہیم سے کہا کہ ان کے مقابلے پر آپ بھی کچھ نئے نئے سنا دیے۔ ابن جابر سے ان فنون کو سن کر ابراہیم خود بڑا حیران تھا مگر اس نے باروں رشید سے انتہائی کراہی کی بجائے کل اسے اپنا ہنر پیش کرنے کی اجازت دی جائے۔ باروں رشید نے یہ بات مان لی۔ ابراہیم نے گھر جا کر اپنی ایک نئی دھن ایجاد کی اور جب دوسرے دن ابراہیم نے یہ دھن دوبار میں پیش کی تو اہل محفل اور خود خلیفہ باروں رشید پر اس قدر گہرا اثر ہوا کہ صبح کی آنکھوں سے آنسو نکل پڑے۔ نغمہ ختم کرنے کے بعد ابراہیم نے ابن جابر کی طرف دیکھ کر کہا کہ

ایک گویا مرگیا اور ہاروں رشید نے یہ خواہش ظاہر کی کہ اس کی جگہ کوئی دوسرا گویا مقرر کیا جائے۔ اسحاق نے موقع دیکھ کر بادشاہ سے ندواب کی سفارش کی جس پر بادشاہ نے حکم دیا کہ ندیاب کو دربار میں حاضر کیا جائے۔ اسحاق خوش خوش ندیاب کو لینے کے لئے آیا لیکن ندیاب نے دربار میں جانے سے انکار کر دیا اور کہا کہ میں اس قابل نہیں ہوں کہ اس دربار میں اپنے استاد کے ساتھ بیٹھ سکوں۔ بہت بھلنے بھلانے پر ندیاب نے کہا کہ وہ اس شرط پر جانے کے لئے تیار ہے کہ اس کے کسی خاص نفع کی فرمائش نہ کی جائے بلکہ اپنی پسند کا نفعہ گلے کی اجازت دی جائے۔ دوسری شرط یہ تھی کہ وہ اپنا ہی عود بھائے گا۔ دوسرے کسی عود کو بھالنے کی شرط نہ لگائی جائے۔ کیونکہ دوسرا عود خود اس کے استاد کا تھا۔ اسحاق نے اس پر کہا کہ یہ کوئی بڑی بات نہیں ہے اور میں بادشاہ سے تجھے اپنا ہی نفعہ گلے اور اپنا ہی عود بھانے کی اجازت دلوا دوں گا۔ ندیاب ہاروں رشید کے دربار میں حاضر ہوا اور بادشاہ کی اجازت کے بعد اس نے نفعہ الاپنا شروع کیا۔ اس کے گلے کا ایسا سماں بندھا کہ اسے درباری تو ایک طرف خود اسحاق بھی مبہوت ہو کر رہ گیا۔ کیونکہ اسے اندازہ نہ تھا کہ اس کا شاگرد اس قدر ترقی کر گیا ہے کہ اس کے سامنے اب اس کا چراغ بھی جلنا مشکل ہے۔

خلیفہ ہاروں رشید نے ندیاب کے گلے سے خوش ہو کر اسے بہت کچھ انعام دیا اور اسی وقت اسے درباری گویوں کی صف میں شامل کر لیا۔ ساتھ ہی ساتھ اسحاق کو ہدایت کی کہ وہ ندیاب کو تعلیم دینے میں اور زیادہ محنت کرے۔ اسحاق بظاہر تو دربار سے خوش ہو کر آیا لیکن اس کے دل میں حسد کی آگ بھڑک رہی تھی۔ اسی وجہ سے وہ ندیاب سے اکھڑی اکھڑی باتیں کرنے لگا۔

ندیاب استاد کے دل کی بات سمجھ گیا اور ایک روز موقع پا کر نفاذ سے نکل کھڑا ہوا اور قرطبہ میں جا کر آباد ہو گیا۔

قرطبہ کے خلیفہ نے ندیاب کی بڑی عزت کی اور اس کا وظیفہ مقرر کر دیا۔ کہتے ہیں آج کل اسپین کی موسیقی پر جو عربی موسیقی کا اثر نظر آتا ہے وہ سب ندیاب ہی کے فنون کا اثر ہے۔

حکیم بوعلی سینا،

حکیم بوعلی سینا کا نام کس نے نہیں سنا ہے۔ ان کا اصل نام

اس خبر کو سن کر بہت سی عورتیں برصوم کی ماں کو مبارکباد دینے کے لئے آئیں۔ ماں نے خوشی میں اس قالین کو کٹے کٹے کر ڈالا اور ہارنے والی کو ایک ٹکڑا دے دیا جب برصوم گھر آیا تو یہ دیکھ کر بڑا پریشان ہوا کہ بادشاہ کے عطا کئے ہوئے قالین کے ٹکڑے کٹے کر دے گئے ہیں۔ اس کے پاؤں تلے کی زمین نکل گئی۔ کیونکہ بادشاہ کے دئے ہوئے انعام کو اس طرح چیز بچھاڑنا ایک طرح بادشاہ کی توہین کرنا تھی۔ برصوم اسی فکر میں رہنے لگا کہ بادشاہ کی ناراضی سے کس طرح بچھا ایک روز اس نے ایک خاص نفعہ تیار کیا اور دربار میں بجایا۔ بادشاہ نے خوش ہو کر ایک بار پھر اس سے پوچھا کہ اسے کیا انعام دیا جائے اس پر برصوم نے کہا کہ "جان کی امان"۔ بادشاہ اس کا مطلب نہ سمجھ سکا اور حکم دیا کہ وہ اپنا مطلب صاف صاف بیان کرے۔ اس پر برصوم نے قالین کے ٹکڑے کٹے کر دینے کا سارا ماجرا بیان کر دیا۔ بادشاہ نے یہ واقعہ سن کر بہت مہنسا۔ اور برصوم کو ایک اور قالین عطا کر دیا اور اس کی ماں کی خطا بھی معاف کر دی۔

ندیاب :

ہاروں رشید کے دربار کا ایک نامی گویا اسحاق بھی تھا۔ دراصل یہ ابراہیم موسیقی کا بیٹا تھا اور اس نے فن موسیقی اپنے باپ سے سیکھا تھا۔ ابراہیم موسیقی کے بعد ہاروں رشید نے اسحاق کو اپنا دربار گویا مقرر کر دیا تھا۔ اسحاق کا ایک شاگرد تھا جس کا نام ندیاب تھا اسحاق اپنے اس شاگرد کو بہت محنت سے تعلیم دیتا تھا اور بہت خوش ہوتا تھا کہ ندیاب رفتہ رفتہ فن موسیقی میں بڑی ترقی کر رہا ہے۔ ندیاب کو اس فن سے اس قدر لگاؤ تھا کہ استاد کی بتائی ہوئی چیزوں پہلے حد محنت کرتا تھا یہاں تک کہ وہ بعض نغموں کے گانے میں تو استاد سے بھی بازی لے گیا تھا۔ لیکن اس نے اپنے کمال کو کبھی استاد پر ظاہر نہیں ہونے دیا اس لئے کہ وہ جانتا تھا کہ جہاں اس کا استاد اس پر بے حد مہربان ہے وہاں وہ حدود و جہر سالادی بھی ہے یعنی دوسرے فنکاروں سے جلتا بھی ہے اور یہ کبھی برداشت نہیں کر سکتا کہ اس کا شاگرد اس سے بڑھ جائے یا اس کے مقابلے کا ہو جائے۔ ایک زمانے تک ندیاب اپنے استاد، اسحاق سے تعلیم لیتا اور مشق کرتا رہا۔ اتفاق سے ہاروں رشید کے دربار کا

آہستہ لیا چوڑا ہے۔ مگر عام بول چال میں حکیم بوعلی سینا کے نام سے ہی مشہور ہیں۔ ان کا لیا نام بھونے کی وجہ سے ہے کہ اس زمانے میں ایسے ہی بڑے بڑے نام رکھے جاتے تھے تاکہ لوگوں کے حسب نسب کا پتہ چل جائے۔ ان کا نام تھا ابوعلی الحسین ابن عبداللہ ابن حسن ابن علی ابن سینا۔ مغربی ملکوں کے لوگوں نے اپنی بولی میں انہیں "اوی سینا" کہنا شروع کر دیا۔ ان کی طبی کتابوں سے یورپ والے عرصہ دراز سے فائدہ اٹھا رہے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ حکیم بوعلی سینا اپنے زمانے کے سب سے بڑے عالم، فاضل اور بڑے سائنس دان تھے۔ اس زمانے کے علموں میں کوئی ایسا علم نہیں تھا جس پر انہیں پوری پوری قدرت حاصل نہ ہو۔ چنانچہ وہ فلسفہ، منطق، تاریخ، مختلف زبانیں، طب، علم نجوم، نہایت اور علم موسیقی سب ہی کے زبردست عالم تھے۔ ان کی زندگی بھی عجیب غریب تھی۔ کبھی کبھی انہیں غریبی اور افلاس کا منہ دیکھنا پڑا، تو کبھی بھی وہ وزارت کے عہدے تک پہنچ گئے۔ علم طب پر تحقیق حکیم بوعلی سینا نے کی ہے وہ آج بھی بڑی وقعت کی نگاہ سے دیکھی جاتی ہے۔ حکیم بوعلی سینا وہ پہلے شخص ہیں جنہوں نے انسانی جسم کو چیر بھاڑ کر اس کے اندرونی اعضا کا معائنہ کیا۔ اس طرح وہ علم جراحی کے بھی باوا آدم مانے جاتے ہیں۔ ان کی طب اور جراحی کی قابلیت کے بارے میں بے شمار داستانیں مشہور ہیں۔ سنتے ہیں کہ ایک مرتبہ کوئی عورت چلتے چلتے گر کر مر گئی۔ لوگوں نے حکیم بوعلی سینا کو اس بات کی اطلاع دی تو وہ فوراً دوڑے ہوئے اس جگہ پہنچے جہاں وہ عورت پڑی ہوئی تھی۔ وہاں پہنچ کر انہوں نے ایک سوئی منگائی اور اسے اس عورت کے جسم میں گھونپ دیا اور وہ عورت پھر سے زندہ ہو گئی! ممکن ہے کہ یہ بات افسانہ ہی ہو۔ کم از کم اس بات کی وجہ جو حکیم بوعلی کی زبانی نقل کی گئی ہے وہ یقیناً ایک افسانہ ہے مگر سنا ہے کہ آج کل کے سرچین بھی بعض اوقات دل کی حرکت بیکار یک بندہ بوجھنے پر ویں میں سوئی چبھوتے ہیں جس سے اکثر مرے ہوئے انسانوں میں جان آجاتی ہے۔

بہر حال قصہ یہ ہے کہ حکیم بوعلی سینا نے مختلف علموں پر قدرت حاصل کر لی تھی لیکن انہیں "حکیم" کا خطاب عطا نہ ہوا تھا۔ اس لئے کہ وہ لوگ جو ان کے مخالف تھے وہ ہر موقع پر ان میں کسی نہ کسی علم کی کمی بتا دیا کرتے تھے اور بے جا اسے بوعلی سینا کو وہ عہدہ حاصل

کرنا پڑتا تھا۔ ایک موقع پر ان کے ایک دشمن نے بادشاہ وقت سے کہا کہ بوعلی سینا زبان عربی سے واقف نہیں۔ ان کی طبیعت اس زبان میں ایسی نہیں کہ انہیں حکیم کا لقب دیا جاسکے۔ حکیم بوعلی سینا اس حوالہ سے اتنے شرمندہ ہوئے کہ انہوں نے تین سال کی محنت میں اس زبان پر ایسی قدرت حاصل کر لی کہ ایک کتاب لکھی جس کا نام "لسان العربیہ" یعنی عربیوں کی زبان۔ حکیم بوعلی سینا نے چند ایک ایسی ہی اور کتابیں بھی عربی زبان میں تصنیف کیں اور ان کتابوں کی جلدیں بنوا کر ان پر خاک مٹی لگا دی تاکہ وہ بہت پرانی معلوم ہوں۔ اس کے بعد یکتا ہی بادشاہ کو دیں کہ وہ انہیں ان صاحب کو دکھائیں جنہوں نے ان کی زبان پر اعتراض کیا تھا، اور کہیں کہ یہ کتابیں کہیں جنگل میں سے ملی ہیں اور کسی پرانے عالم کی تصنیف معلوم ہوتی ہیں۔ ان صاحب نے ان کتابوں کو کئی وقت تک غور سے پڑھا اور اس کے بعد بادشاہ سے کہا کہ یہ کسی ایسے آدمی کی تصنیف ہیں جو عربی زبان کا مستند عالم ہے۔ اس کے بعد یہ بات ظاہر کر دی گئی کہ یہ کتابیں حکیم بوعلی سینا کی تصنیف کی ہوئی ہیں۔ اسی طرح ایک بار ان پر اعتراض کیا گیا کہ وہ علم موسیقی کے ماہر نہیں ہیں اور ایسے شخص کو جو اس علم کا ماہر نہ ہو اور اس کا مظاہر نہ کر سکے۔ حکیم کا خطاب نہیں دیا جاسکتا۔ حکیم بوعلی کو علم موسیقی سے بڑا لگاؤ تھا لیکن وہ بدگلو ہونے کی وجہ سے گناہیں سکتے تھے۔ چنانچہ اس اعتراض سے بچنے کے لئے حکیم بوعلی نے ایک ساز ایجاد کیا اور اس کے بجائے کی مشق شروع کی۔ کچھ عرصہ بعد اس ساز کے بجانے میں انہوں نے خوب کمال حاصل کر لیا ایک روز وہ بار میں موسیقی کی محفل ہوئی تو اس وقت کے باکمال لوگوں نے اپنا اپنا ہنر پیش کیا۔ رئیس وقت حکیم بوعلی سے ہر ایک کے بارے میں دریافت کرتے تھے اور بوعلی ہر ایک کے حق میں کوئی نہ کوئی عیب بکال دیا کرتے تھے۔ اس پر ایک صاحب نے چڑ کر کہا کہ باکمال لوگوں کی عیب جوئی وہ کرے جو خود صاحب کمال ہو بوعلی سینا کو یہ بات زیب نہیں آتی۔ حکیم بوعلی اس موقع کے منتظر ہی تھے۔ چنانچہ انہوں نے اپنا کمال پیش کرنے کی

اجازت چاہی۔ اجازت ملنے پر بوعلی نے "سینائی" پر وہ نغمے بجانے شروع کئے جو اس سے پہلے دوسرے لوگ نہیں سنا سکتے تھے۔ اور ان نغموں کو کچھ اس طرح بھایا کہ سننے والے بہت ہوت ہو کر رہ گئے۔ حکیم بوعلی کی اس ایجاد کا نام "سینائی" رکھا گیا جواب "شہنائی" کے نام سے مشہور ہے۔

نظارے

ستیل احمد رفعت

مارنے والا چھوڑے۔

ظفر: سیدھی طرح مونگ پھلیاں دے دو۔
 شاکرہ: نہیں دوں گی۔ نہیں دوں گی۔ دیکھوں میرا کیا کرتا ہے۔
 ظفر: نہیں دوں گی۔ یہی جا کر اماں سے کہتا ہوں اماں
 شاکرہ: جا... کہہ دے۔ ایک دفعہ نہیں ہزار دفعہ کہہ دے۔
 بدترین سبب خود بیٹھا ہوا ٹھونس رہا تھا۔ ہم نے مانگیں،
 بیٹا دو ہار سپر بھی دیکھ تو منہ بنا لیا۔ اب نذیرہ بن کر گیا،
 ... (منہ ہٹا کر) آ پامونگ پھلیاں ہیں بھی دو.....
 جا نہیں دیتی۔

ظفر: (زبردستی کہتے ہوئے) اچھی نہیں دوں گی..... دیکھو
 دے دو..... (زور سے کہتا ہے) یہ تم.....
 شاکرہ: اف اللہ۔ ظفر کے بچے، دیکھ میری کلائی ٹوٹ جائے گی۔
 اف اللہ۔ دیکھ میں تیرے ہاتھ پر کاٹ کھاؤں گی۔
 (اس عرصے میں ظفر شاکرہ سے زبردستی کچھ مونگ پھلیاں
 پھین لیتا ہے)

ظفر: ہوں!!... دیکھا آ پاجان صاحبہ کیسے مزے سے
 یہ مونگ پھلیاں لے لیں تم سے۔
 شاکرہ: اف۔ ظفر۔ دیکھ میں روئے لگوں گی..... میری ساری
 کلائی..... بدترین کہیں کا.....
 ظفر: (مونگ پھلیاں پھیل کر کھاتے ہوئے) کیسی مزے دار ہیں
 آ پاجا..... واہ! یہ دیکھو آ پاجا کیسی بخنی ہوئی
 ہیں۔

شاکرہ: دیکھ ظفر مجھے واپس کر ساری مونگ پھلیاں ورنہ.....
 (ظفر کی طرف جھپٹنا چاہتی ہے)

کردار:

نذیرہ: بڑی ہیں۔ عمر تقریباً ۱۸ سال
 لکھنوی: چھوٹی ہیں۔ عمر تقریباً ۱۶ سال
 حامد: ان کا بھائی۔ عمر تقریباً ۲۲ سال
 شاکرہ: ایک لڑکی۔ عمر تقریباً ۱۲ سال
 ظفر: اس کا چھوٹا بھائی۔ عمر تقریباً ۱۵ سال
 خالہ: شاکرہ اور ظفر کی ماں: نوکرانی۔

★

(جس وقت پردہ اٹھتا ہے تو ایک کونٹھی کا ڈراما
 روم نظر آتا ہے جو واجبی سامان سے آراستہ ہے۔ اس کے
 عقب میں اور دائیں جانب لمبے کمر کے دروازے
 نظر آتے ہیں۔ بائیں جانب باہر سے آنے کا راستہ
 ہے.....)

شاکرہ معمولی لباس پہنے جس سے اس کی فریٹ
 نمایاں ہے۔ ایک المیہ منظر معمولی شکل صورت کی لڑکی
 باہر کے دروازے پر بھاگی ہوئی نظر آتی ہے اور اس کے
 پیچھے اس کا بھائی ظفر کیلے کچھ پڑے ہیں۔ شاکرہ کے
 پیچھے دوڑ کر آتا ہے۔ اور شاکرہ کا ہاتھ پکڑ لیتا ہے
 اور کہتا ہے۔)

ظفر: دیکھ آ پاجا بچی۔ تیری ناک پر ایسا گھونسلہ مارا ہے
 یہ لمبی لمبی سی ناک سب چمک کر رہ جائے گی۔
 شاکرہ: (خود کو کچھڑتے ہوئے) اولاد نے دوسرے ہاتھ کی ٹھنی کو
 الگ کرتے ہوئے میں تیرا منہ توڑ دوں گی۔ بٹا آیا گھونسلہ

ظفر: دیکھو آپ! میری طرف مت آنا۔ ورنہ بھی تو تمہاری ایک ہی چوڑی ٹوٹی ہے۔ کہیں یہ سب ہی شہید نہ ہو جائیں۔

شاگرد: اوہ! خون بھی تو نکلا آیا۔ یہ دیکھو!

ظفر: اب دیکھ لیا تم نے کتنا بہادر ہے تمہارا بھائی!! ہا ہا ہا
... بڑی مزے دار ہیں آپا۔۔۔ (مونگ پھلیاں کھلتے ہوئے) یہ مونگ پھلیاں.....

شاگرد: (بھپٹ کر ظفر کی طرف بڑھتی ہے) دیکھ دے دے

..... ظفر.....

ظفر صوفے کے پیچھے بھاگ جاتا ہے۔ شاگرد اسے

پکڑنے کے لئے دوڑتی ہے۔ اور اس طرح ظفر اور

شاگرد ڈوٹنگ روم میں ایک دوسرے کو پکڑنے کی

کوشش کر رہے ہیں۔ کہ اندر کے دروازہ سے

ان کی ماں داخل ہوتی ہے۔

خالہ: ارے..... ارے یہ کیا ہو رہا ہے۔

شاگرد: دیکھو اماں۔ اس ظفر کے پیچھے نے میری مونگ پھلیاں

چھین لیں۔

خالہ: مونگ پھلیاں۔ تو مونگ پھلیاں کھا رہی ہے میں تو تجھ

سے تنگ آ چکی ہوں۔ اب مونگ پھلیاں کھا رہی ہے۔

اور بات ہوگی۔ تو رات بھر بھوں ٹھوں کر کے کھانا۔

شاگرد: اماں۔ تو ذہن بھی تو نہیں کھائیں۔ (ظفر آہستہ آہستہ

باہر کے دروازے کی طرف بڑھ رہا ہے)

خالہ: ظفر..... ادھر آ..... ارے یہاں آنا.....

میں تجھے بتاؤں۔

(اس عرصے میں ظفر وہاں سے اچھلتا ہوا)

کمرے سے باہر چلا جاتا ہے خالہ شاگرد کے

قریب آتی ہے۔ اور اس کے کان پکڑ کر

بال کھینچتی ہے)

شاگرد: تنگ آ گئی ہوں تجھ سے۔ بارہ سال کی لوٹھا.....

تجھے موت آ جائے تو اچھا ہے.....

(اتنے میں اندر کے کمرے سے زریں

ایک دم آ جاتی ہے۔)

زریں: ارے خالہ۔ خالہ..... اف خالہ تو نہیں ہے۔

(شاگرد کو اس کی ماں سے چھڑاتی ہے.....

خالہ: (دوانت میں کہ اس سے تو بہتر ہے کہ یہ نہ جاتا ہے۔

زریں: ارے خالہ..... خدا کے لئے اس طرف تو نہ کوسو۔

آخر کیا کیا اس نے؟

خالہ: بس بیٹی۔ میں تو اس لڑکی سے تنگ آ گئی ہوں نکلا نکلا

ہو رہا ہے۔ ڈاکٹر کہتا ہے کہ آپریشن ہو گا۔ اور یہ مونگ پھلی

کھاتی پھر رہی ہے۔ اب میں یہاں تمہارے ہاں ٹو کر

کروں یا اس موٹی کو ہسپتال لے کر پھروں۔

زریں: ہسپتال لے کر میں چلی جاؤں گی۔ یہ کوئی بات

ہے۔ (ایک دم موڈ بدل کر) کیوں شاگرد۔ میرے

کما تھا۔ کہ تم میرے کمرے سے باہر نہ کھلنا۔ پھر تم کیوں

آئیں یہاں بچہ چلو جا کر پڑھو۔

خالہ: اے بیٹی! بس پڑھ لیا اس لئے اب... یہ کیا پڑے گی۔

اماں کی لڑکی تو ماما ہی بنے گی۔

زریں: اوہ خالہ! تم دیکھو تو کچھ دن۔ آخر میں لے تم سے وعدہ

کیا ہے شاگرد کو وہ لڑکی بنا دوں گی کہ شخص اس کی مثالیں

دیا کرے گا شاگرد سے) جاؤ۔ چلو۔ جا کر پڑھو۔

(شاگرد بے چارے پاؤں اندر کے کمرے کی طرف چلتا نکلتا ہے)

خالہ: بارہ سال کی لوٹھا۔ اور اماں کو نہ دھنا نہیں آتا۔

۔ جب کسی کام کو کہو، فوراً ٹوڑاٹ سے جواب دے

دے گی۔

زریں: (شاگرد سے) سنو شاگرد! شاگرد دروازے کے

قریب تک جاتی ہے) اب میں تمہاری اماں سے تمہاری

کوئی شکایت نہ سنوں۔ کیا سمجھیں! بس جاؤ جا کر فوراً

سبق پڑھو!

(شاگرد کسی قدر اٹھٹائی مسکراتی ہوئی کمرے کے

اندر چلی جاتی ہے)

خالہ: بیٹی! تم میرے بچوں کا جتنا خیال کرتی ہو۔ میں

کس زبان سے تمہارا شکریہ ادا کروں۔

زریں: واہ خالہ! تم بھی تو ہمارے گھر میں اتنا کام کرتی ہو۔

حامد: خالد، یہ حامد پڑا کس پر ہے۔ بڑا سٹھرا داغ پایا ہے اس نے۔
خالد: ظفر کے ابا تو بڑے ہی سیدھے سادے تھے۔ اچھے بے وقوفی
بھائی کی وجہ سے تو وہ اللہ کو پیارے ہوئے۔

حامد: مگر صاحب ظفر کیا بات ہے اس کی۔ اب تمہیں سناؤں
ایک دفعہ کیا ہوا۔ نسرن کی کاپی پر اس کی لکچر اور خط
کرتی ہے۔ بڑے بڑے میزے سے۔ تو ظفر صاحب نے
ان کے دستخطوں میں گول دائرہ ملا دیا اور دوپٹہ منٹ
ڈال کر بالکل اتو کی سی صورت بنا دی۔ نسرن سے
پوچھنا اس کی لکچر اسٹریسی ہے۔

خالد: میاں، ظفر کا ہے کون دیکھ بھال کرنے والا۔ اب تو
خاصا بڑا ہو گیا ہے اسے کسی سکول میں داخل
کرادو نا۔

حامد: ظفر تو بہترین آرٹسٹ بن سکتا ہے۔ بس یہ جو کبھی کبھی
شرارت کرتا ہے، اور ایسی شرارت جس سے نقصان
ہو جائے اس سے غصہ بہت آتا ہے۔ خیر تم فکر نہ کرو۔
ذرا میرے امتحان ختم ہو جائے دو۔ اسے کسی انگریزی
اسکول میں داخل کراؤں گا..... ارے زری...
زری... مجھے اپنا پن دے دینا۔

(یہ کہہ کر وہ زری کے کمرہ کی طرف چل دیتا ہے)
خالد جس کی آنکھوں میں ایک مسرت اور خوشی
ہے، آہستہ آہستہ باہر کے دروازے کی طرف
بڑھتی ہے۔ اور جب وہ دروازہ کے پاس
پہنچتی ہے تو حامد زری کے کمرہ سے بھاگتا ہوا
نکلتا ہے۔ اور زری اس کے پیچھے پیچھے

بھاگتی جان..... حامد — بھائی جان
بھائی جان کہتی ہوئی، آتی ہے اور حامد کو کپٹنے
کی کوشش کرتی ہے۔ مگر حامد جلدی سے دفتر
کمرہ میں چلا جاتا ہے۔ اور فوراً دروازہ بند
کر لیتا ہے۔ زری دانت پیستی ہوئی آکر صوفے
پر بیٹھ جاتی ہے۔ اس صوفے میں خالد باہر جا چکی
ہے۔ تھوڑی دیر بعد اس کی چھوٹی بہن نسرن

ہیں پکا کر کھلاتی ہو اور دوسرے کام کاج کرتی ہو
آخر ہمارا بھی کوئی فرض ہے یا نہیں۔

خالد: بیٹی میں تو نوکر ہوں۔ جو کچھ کرتی ہوں اس کی تنخواہ
مجھے مل جاتی ہے۔ پھر میرا تم پر کیا احسان۔

زری: خالد! شاکرہ تو مجھے نسرن سے بھی زیادہ عزیز ہے۔
کچھ کہتی ہوں کہ میرا جی چاہتا ہے کہ شاکرہ اور کچھ نہیں
تو بی۔ ارے تو کر ہی لے..... مگر ذرا اس کا ذہن خراب
ہے۔ ورنہ اب تک تو میں میٹرک کا امتحان دلا دیتی۔

(کمرہ کے دوسرے دروازہ سے حامد اپنے ہاتھ

میں ایک پن لئے داخل ہوتا ہے)

حامد: خالد! یہ دیکھئے (پن خالد کے ہاتھ میں دے دیتا ہے)
خالد اسے دیکھتی ہے۔)

خالد: یہ کس نے توڑا؟ یہ ظفر کے بچے کا ہی کام ہو گا۔

حامد: جی ہاں! خالد مجھے تو تمہارے بڑے چلے پر ترس آ جاتا ہے۔
ورنہ ظفر کی تو وہ مرمت کروں کہ اسے آدمی بنا کر رکھ دوں۔

خالد: تو حامد میاں، تمہیں شے کس نے کیا ہے۔

زری: حامد بھائی کیا ہوا۔ دوسری نب ڈال لیتا۔ خالد کو یکسا
دکھا ہے ہو۔

حامد: ارے خالد! تم غواغواہ اداس ہو رہی ہو۔ زری میں تو
خالد کو یہ بتانے آیا تھا کہ یہ حضرت ظفر میری چیز دل سے
کیا کیا منشی فرمایا کرتے ہیں۔

خالد: حامد میاں تم نے اس بد بخت کو اپنے سر پر بھی تو اتنا چڑھا
دکھا ہے۔

حامد: تو ظفر سے بھی تو ایسا ہی۔ واللہ مجھے تو اس کی ذہانت اور
ہوشیاری دیکھ کر رشک ہونے لگتا ہے کس بلا کا داغ
پایا ہے۔

(زری اپنے کمرہ کی طرف چلے گئی ہے۔)

حامد: زری! ذرا مجھے اپنا پن دے دینا... بڑا ضروری وہ...
وہ لوٹس لکھنے ہیں....

زری بڑی عجیب نگاہوں سے دیکھتی، منہ جاتی
اپنے کمرہ میں چلی جاتی ہے

باہر کے دروازے سے ڈرائنگ روم میں
داخل ہوتی ہے۔ اور زربین کو حیرت سے
دیکھتی ہے۔

نسرین: کیا بات ہے باجی۔ منہ لٹکائے کیسے بیٹھی ہو۔ (زربین
کوئی جواب نہیں دیتی) بتاؤ نا۔

زربین: جاؤ۔ نسرین اپنا کام کرو۔

نسرین: آخر کوئی بات بھی ہے بتاؤ نا۔

زربین: مجھے یہ بتاؤ آخر میں تجھے کب تک شیلڈ کرتی رہی۔
نسرین: ہوا کیا؟

زربین: یہ دیکھ!..... (اسے پن دکھاتی ہے).... معلوم ہے
حامد بھائی کس قدر بگڑ رہے تھے۔ اس کا ٹوڈا سا
مذاق ہو گیا۔ اور اتنا بیوقوف بن گیا....

نسرین: بھائی جان بہت بگڑ رہے تھے! تو کہہ دیا ہوتا کہ ظفر
نے توڑا ہے۔

زربین: ظفر بے گناہ کو خواہ مخواہ مجرم ٹھہراؤں۔ بھائی جان
کہتے ہیں کہ قاسم کے علاوہ یہ کسی اور کا کام نہیں ہے
نہ تو قاسم کو اتنی لفٹ دے اور نہ ایسی باتیں سننی پڑیں

نسرین: تو میں کوئی لفٹ دیتی ہوں اسے۔

زربین: اس دن وہ تیری کاپی پر وہ تیری کچرا، کیا نام ہے
اس کا۔ اس کے دستخطوں کو اتو کی شکل میں نہیں
تبدیل کر گیا تھا۔

نسرین: تو اس میں کیا ہو گیا۔

زربین: تو تو خود آؤ ہو گئی ہے۔ نہ وہ مجھ کو اچھا لگتا ہے؛
نہ ڈیڈی کو۔ اور بھائی جان تو اب اس سے بہت ہی
بھٹانے لگے ہیں نسو! اب تو جانے اور تیرا کام۔

میں آخر کب کب تجھے شیلڈ کرتی رہوں گی۔

نسرین: تو کوئی بات بھی ہو۔ قاسم خود ہر بہانے سے چلے
آتے ہیں۔ میں تو بات بھی نہیں کرتی۔

زربین: تو غالب کے شعروں کا مطلب کیوں پوچھا تھا تو نے۔

نسرین: باجی تم ہی نے تو کہا تھا کہ قاسم سے پوچھ لو۔ یہ بھی
شاعری میں غالب سے کم نہیں ہیں۔

زربین: اوہ نسو! تو بالکل ہی بے وقوف ہے۔ میں نے تو
ٹانٹ کیا تھا۔ آپ سنجیدگی سے غالب کے اشعار اس کے
سامنے کر بیٹھ گئیں۔ اسے وہ تو اکنو ٹکس کا اسٹوڈنٹ
ہے وہ شاعری کیا جانتے۔

نسرین: تو مجھے اس سے کیا دیکھی ہے۔ غالب کے شعر تو میں
کسی سے بھی پڑھ سکتی ہوں۔

زربین: تو پھر منع کیوں نہیں کر دیتی۔ صاف منع کر دو۔ کہ مجھے
بات کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ آپ کو ایسا ہی
پڑہانے کا شوق ہے تو باجی کو اکنو ٹکس پڑھائیے جا کر
نسرین: تو بھائی جان کو اس پر کوئی اعتراض نہیں ہو گا۔

زربین: اوہ کتنی بھولی ہے تو بھی نسو۔ تو سمجھتی ہے جیسے میں
قاسم کو گھاس ہی تو ڈالوں گی۔ اسے ایسے بد تمیز قسم کے
آدی کو تو روہ تو بناؤں کہ وہ بھی یاد رکھے۔ مگر تو
تو بے وقوف ہے نا۔ تجھے وہ اور بھی بے وقوف بنا کر
رکھ دے گا۔

نسرین: قاسم اتنے برے تو میں نہیں باجی۔ خواہ مخواہ تم انہیں
ایسا سمجھتی ہو۔

زربین: (نسرین کا ہاتھ پکڑ کر اندر کے کمرے کی طرف جاتے ہوئے
کہتی ہے) تیرے بھولپن پر مجھے پیار بھی آتا ہے۔ لیکن
نسو! آخر میں تیری بہن ہوں دشمن تو نہیں ہوں۔ اب
قاسم تجھ سے بات کرے تو صاف پھٹکار دیکھو۔

(یہ باتیں کرتی دونوں لڑکیاں کمرے کے اندر

چلی جاتی ہیں۔ اور باہر سے ظفر مونگ پھلیاں

کھانا ہوا ڈرائنگ روم میں داخل ہوتا ہے۔

اور پھر بڑے انداز سے پھیل کر صوفے پر بیٹھ

جاتا ہے۔ اور گردن ہلا ہلا کر مزے لے لے کر

مونگ پھلیاں کھانے لگتا ہے۔ حامد کمرے کا دروازہ

کھولتا ہے۔ اور جب ظفر کو بیٹھا ہوا دیکھتا ہے

تو دے پاؤں آکر پیچھے سے ظفر کی گردی پکڑ

لیٹے ہے۔)

حامد: کیوں بیٹا، کیسے پکڑے گئے! بولو۔ اب اپنے پن کے

حامد: ارے پاگل صغیہ کی کوٹھی بکے پاس بھی ایک دکان ہے۔ کیا سمجھ۔ وہ بڑی اچھی موٹنگ پھلیاں بیچتا ہے۔ وہاں سے لادو، اور سنو۔ صغیہ کو یہ لغافہ اور یہ ڈبہ دیتے آنا۔۔۔۔۔

حامد اپنی تپلون کی جیب سے لفافہ اور ایک چھوٹا سا مخملی ڈبہ نکال کر ظفر کو دیتا، جو ظفر لینے میں پس و پیش کرتا ہے۔

حامد: کیا بات ہے۔

ظفر: بھائی جان، یہاں کہتی ہیں صغیہ باجی کے ہاں نہ جایا کر۔

حامد: کیوں؟ اور تم دہائی شراکت کرتے ہو گے نا۔ صغیہ کہہ گئی تھی۔ تم نے اس نے باغ میں سے بکلاپ کے پھولی توڑے تھے۔

ظفر: بھائی جان! میں نے تو۔۔۔۔۔ وہ۔۔۔۔۔ اماں نے وہ خط۔۔۔۔۔ جو تم نے بھیجا تھا نا۔۔۔۔۔ وہ دیکھ کر کہا تھا۔۔۔۔۔

حامد: وہ خط تم نے اپنی اماں کو دکھایا تھا۔ اس بار یہ خط بالکل جیب میں چھپا کر لے جانا۔ کسی کو معلوم نہ ہو۔ جاؤ۔ اور لوریہ دو آئے۔ لو۔۔۔۔۔ پکڑو۔

ظفر: ظفر دو آئے لے لیتا ہے اور حامد خط اور ڈبیا اس کی نیکری جیب میں بھونسن دیتا ہے۔

ظفر: بھائی جان۔ یہ دیتے ہی بھاگ آؤں گا۔

حامد: نہیں اس کا جواب لے کر آنا۔ کیا سمجھ۔ جاؤ۔ اور دیکھو ظفر، کسی کو پتہ نہ لگے، جاؤ۔۔۔۔۔ بڑا اچھا۔۔۔۔۔

..... ہاں۔۔۔۔۔ آج

(ظفر مسکراتا ہوا کمرہ سے باہر کے دروازے پر سے نکل جاتا ہے۔ حامد اپنے کمرہ کی طرف رخ کرتا ہے۔ اور پھر اپنے کمرہ کا دروازہ بند کر لیتا ہے۔ اس کے بعد درزی بنی سنوری اپنے کمرے سے باہر آتی ہے اور ڈرائنگ روم کے قدم قدم آئینہ میں کھڑے ہو کر اپنا جائزہ لیتی ہے۔)

توڑنے کی کیا سزا دوں؟

ظفر: بھائی جان!۔۔۔۔۔ اف۔۔۔۔۔ میری گردن تو چھوڑیے۔

(حامد اس کی گردن چھوڑ دیتا ہے)

ظفر: بھائی جان۔ قسم خدا کی وہ پن قاسم صاحب نے توڑا ہے۔

حامد: چپ رہو۔ یہ سب تمہاری کارستانی تھی۔ میرا پن تم نے توڑا ہے۔

ظفر: بھائی جان، میں سچ کہتا ہوں۔ وہ قاسم بھائی، نسری باجی سے پن پھینک رہے تھے اور۔۔۔۔۔

حامد: چپ رہو۔ اگر ایسی کوئی بات منہ سے نکال تو منہ توڑ دوں گا۔

ظفر: (دروکھا سا ہو کر) بھائی جان میری کوئی خطا بھی ہوئی

حامد: اچھا یہاں بیٹھ۔ اور مجھے یہ بتا کر میں تجھے آخر کتنا چاہتا، اور تو ہر وقت شراکت کر کر کے میری ساری چیزیں خراب کرتا ہے۔

ظفر: بھائی جان میں ایمان سے کہتا ہوں۔ میں تو آپ کے کمرہ میں جاؤ بھی نہیں۔ جیب سے اماں نے منع کیا ہے۔

حامد: ارے تیری اماں نے میرے کمرے میں آنے سے منع کر دیا، تجھے۔ (ظفر اثبات میں سر ہلاتا ہے) پگلا کہیں کا اے! تو تو واقعی پاگل ہی ہے۔ کیا ہے جیب میں تیرے دکھا اس کی جیب میں سے موٹنگ پھلیاں نکالتا ہے، اور تو لاٹ صاحب بہ موٹنگ پھلیاں کھا رہے ہیں۔ لاؤ مجھے بھی دو۔ (حامد ایک موٹنگ پھلی چھیل کر کھاتے گھٹا ہے) اے! یہ لوریہ تو بڑے مزے کی ہیں۔ (انہی جیب سے دو آنے نکال کر چلو دو آنے کی موٹنگ پھلیاں مجھے بھی لا کر دو۔ (ظفر دو آنے لے کر چلنے لگتا ہے) سنو، ظفر! جی بھائی جان۔

ظفر: کدھر ہے موٹنگ پھلی والے کی دکان

ظفر: وہ سامنے جو ہڑتل ہے نا، بھائی جان۔

حامد: ارے ہاں ہاں! صغیہ کی کوٹھی کے پاس۔

ظفر: نہیں نہیں بھائی جان۔ وہ تو ادھر ہے اور دکان ادھر۔

اندھنے والوں کو ٹھیک کرتی ہے کہ اس عرصے میں شاکرہ وہاں آجاتی ہے۔ اس کے ہاتھ میں اردو کا قاعدہ ہے۔

شاکرہ: باجی آپ تو جا رہی ہیں؟ (ندیں اثبات میں سر ہلاتی ہے) مجھے سبق نہیں دیں گی، میں نے سب یاد کر لیا۔ سناؤں۔ الف سے آم.... بیسے بی۔ پ سے پنکھا....

شاکرہ: اچھا آپ باجی۔

ندیں: اور دیکھو! وہ جو میرے پڑھنے کی کڑی ہے اس پر تم خوب بیٹھ کر پڑھو۔

شاکرہ: باجی، جہاں رہی کرسی پر

ندیں: ہاں۔ وہ بڑے کمال کی کرسی ہے۔ اس کرسی پر بیٹھ کر بہت پڑھا جاتا ہے۔

شاکرہ: مگر باجی تم جا کہاں رہی ہو؟

ندیں: ارے بھئی۔ صفیہ کے ہاں۔ کل میرا ٹسٹ ہے۔ (کھڑکی کے پاس جا کر دیکھتی ہے)

شاکرہ: وہ کیا باجی۔

ندیں: ارے کل میرا امتحان ہے نا۔ اور مجھے صفیہ کے ساتھ بیٹھ کر پڑھنا ہے۔

شاکرہ: باجی، وہ کرسی جو اتنے کمال کی ہے۔ اس پر ہی بیٹھ کر کیوں نہیں پڑھتیں۔ صفیہ باجی تو باتیں زیادہ کریں گی۔

ندیں: بھئی کہیں کی۔ اور دیکھو اول تو میرے کمرہ میں کوئی آئے گا ہی نہیں۔ جب تم میری کرسی پر بیٹھی رہو گی تو

سب ہی تمہیں گتے کریں اپنے کمرہ میں ہوں۔ ٹھیک ہے نا۔۔۔

ندیں پھر آئینہ میں اپنا جائزہ لیتی ہے۔ اور پھلانا پرس کھول کر دو آنے نکالتی ہے کھڑکی کے پاس جاتی ہے۔

اندھیا ہر اپنے آنے کا کسی کو اشارہ کرتی ہے
ندیں: (شاکرہ کو) لو یہ دو آنے ان کی مونگ پھلیاں منگا کر کھا لینا۔ جاؤ۔ جلدی کرو۔ ظفر سے منگا لینا۔ میں لے بیٹھتی ہوں۔

(یہ کہہ کر ندیں... باہر کے دروازے سے چلی جاتی ہے۔)

(شاکرہ قد آدم آئینہ کے سامنے کھڑے ہو کر اس انداز سے ندیں کی طرح اپنا جائزہ لیتی ہے اور پھر

ندیں کی نقل کر کے اپنے اچھے ہوئے بالوں کو ٹھیک کرتی ہے۔ اور دھڑکی کو اپنے بالوں میں

گو یا پھول کی طرح لگاتے گھتی ہے کہ اس عرصے میں ظفر باہر سے اچھلتا ہوا آتا ہے)

ظفر: آپا.... آپا، لو۔ مری جا رہی تھیں دو چار مونگ پھلیاں کے لئے۔ (انہی جیب سے ٹھیکیاں بھر کر مونگ پھلیاں نکالتا

شاکرہ: ارے یہ اتنی ساری مونگ پھلیاں کہاں سے لے آیا۔ ظفر: چار آنے حامد بھائی جان نے دئے تھے۔

شاکرہ: کیوں۔

ظفر: اوہ۔ آپا۔ کھاؤ نا، بھائی جان نے ایک لفافہ اور ایک ڈبیا صفیہ باجی کو بھیجی تھی۔

شاکرہ: کیسی ڈبیا؟

ظفر: ارے آپا۔ بڑے خوبصورت ٹاپس تھے اس ڈبیا میں۔ تم دیکھتیں تو تمہاری وال ٹپک پڑتی تھاؤ نا۔ یہ مونگ پھلیاں!

شاکرہ: حامد بھائی جان نے صفیہ باجی کو ٹاپس بھیجے تھے!

ظفر: ہاں اور صفیہ ٹاپس پہن کر آئینہ کے سامنے کھڑے ہو کر خوب منہ بنا بنا کر کھاتے تھیں۔

(آئینہ کے سامنے گویا صفیہ کی نقل اتارتا جا رہا ہے) لو کھاؤ مونگ پھلیاں!....

شاکرہ: اور جب ندیں باجی وہاں پہنچی ہوں گی تب تو.... ظفر: ندیں باجی کہاں پہنچی ہوں گی؟

شاکرہ: صفیہ کے ہاں گئی ہیں نا۔

ظفر: (ہنستے) ارے آپا۔ ندیں باجی تو قاسم صاحب کے

ظفر: یہ دیکھو (ایک لفافہ نکال کر دکھاتا ہے)۔ یہ ہے صنیہ باجی کا خط جب حامد بھائی جان اسے دیکھیں گے تو کیا پتہ آٹھ گئے دے دیں۔ نہ جانے کتنا ہے)

شاگرد: ظفر، سن تو..... ارے.... یہ لفافہ مجھے تو دکھا۔
ظفر: تم اسے دیکھ کر کیا کرو گی۔ لو دیکھو۔

(شاگرد لفافے کو لے کر اس میں سے خط نکالتی ہے۔ اور الٹ پلٹ کر دیکھتی ہے۔ ظفر ٹہرے طنز سے کہتا ہے۔)

ظفر: ہونہ! جیسے پڑھ ہی تولیں گی اس میں کیا لکھا ہے۔ لاؤ۔

شاگرد: ارے تحریر تو سہی۔ یہ ہے الف.... الف سے آم۔ ارے یہ ہے، ب.... ہاں.... یہ عجیب ہے... ب سے بی.... اور یہ ہے.... پ.... پ سے پنکھا....

ظفر: (شاگرد سے خط چھین کر) لاؤ.... پڑھنا تو آتینیں۔ آپا پڑھنا تو سیکھ لو پہلے۔

(ظفر یہ کہتا ہوا، حامد کے کمرہ کی طرف جاتا ہے۔ شاگرد معاً.... تو آدم آئینہ کے سامنے آتی ہے۔ اور بالوں کو زریں کی نقل کر کے، درست کرتے لگتی ہے۔ اور اس میں پھول کی جگہ دوانی لگانے لگتی ہے۔ وہ دوانی پھسل کر زمین پر گر پڑتی ہے۔ شاگرد خواہ مخواہ ہنسنے لگتی ہے۔ اور پردہ آہستہ آہستہ گر رہا ہے)۔

”ماہ نو“

کا اگلا شمارہ

جملہ اور امت کی مشترک اشاعت ہوگی۔ اور سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ پر ایک سیر حاصل نمازہ المعارف ثابت ہوگی۔ مفصل اطلاق اس شمارہ میں ملاحظہ کیجیے۔

(ادارہ)

سامنے وہاں لان پر بیٹھی ہوئی ہیں۔ چلو میں دکھاؤں! شاگرد کا ہاتھ پکڑ کر کھڑکی کی طرف جاتا ہے۔ وہ دیکھو اس نگاہ کے پودے کے پاس، ہیں نا۔ مجھے قاسم صاحب نے دیکھا تو جناب مجھے یہ چلنوزے دئے۔ یہ اتنے سائے۔

شاگرد: ہوں جب ہی تو مجھے مونگ پھلیاں دے رہا ہے (مندباکر) لو آپا۔ مونگ پھلیاں کھاؤ۔ چلنوزے خود رکھ لئے، بلال۔

ظفر: نہیں آپا۔ چلنوزے بہت مزے کے ہوتے ہیں۔ اور جھنگے بھی ہوتے ہیں!

شاگرد: ہونہ! چھلے بھی تو کتنی مصیبت سے ہیں۔ مونگ پھلی تو یوں دہایا اور لو.... کھالیا۔ چلنوزے چھینے میں تو ناخن دکھ جاتے ہیں۔

ظفر: جب چلنوزے کھا کر دیکھو گی تب پتہ چلے گا۔

شاگرد: اچھا، دو چار دے تو سہی۔

ظفر: ادلی ہونہ! — شاگرد گہرے خیالات میں گم ہے) کیا سوچے لگیں آپا؟

شاگرد: سوچ رہی ہوں۔ آپا سرین کو جا کر یہ بتاؤں کہ قاسم صاحب اور ندیم باجی وہاں لان پر بیٹھے ہیں۔ اور چلنوزے کھا رہے ہیں۔

ظفر: تو مجھے کیا، چلنوزے مل جائیں گے۔

شاگرد: سرین باجی مجھے چار آنے دیں گی جناب۔ انہوں نے مجھ سے وعدہ کیا تھا، اگر میں قاسم صاحب اور زریں باجی کو لان پر بیٹھا دیکھوں اور انہیں بتا دوں تو وہ مجھے چار آنے دیں گی۔ ظفر چار آنے کے کتنے چلنوزے آئیں گے؟

ظفر: ایک چھینک تو آ ہی جائیں گے۔

شاگرد: چلو چار آنے نہیں۔ دو آنے تو دے ہی دیں گی۔ دو آنے آ پادیں نے دے ہی دئے ہیں۔

ظفر: یہ بات ہے۔ تو میں بھی ابھی حامد بھائی جان سے چار آنے لاتا ہوں۔

شاگرد: ہونہ! جیسے وہ تجھے چار آنے تو دے ہی دیں گے۔

گلے گاہے باز خواں...

(عید است و نشاط و طرب و زمر عام بہت)

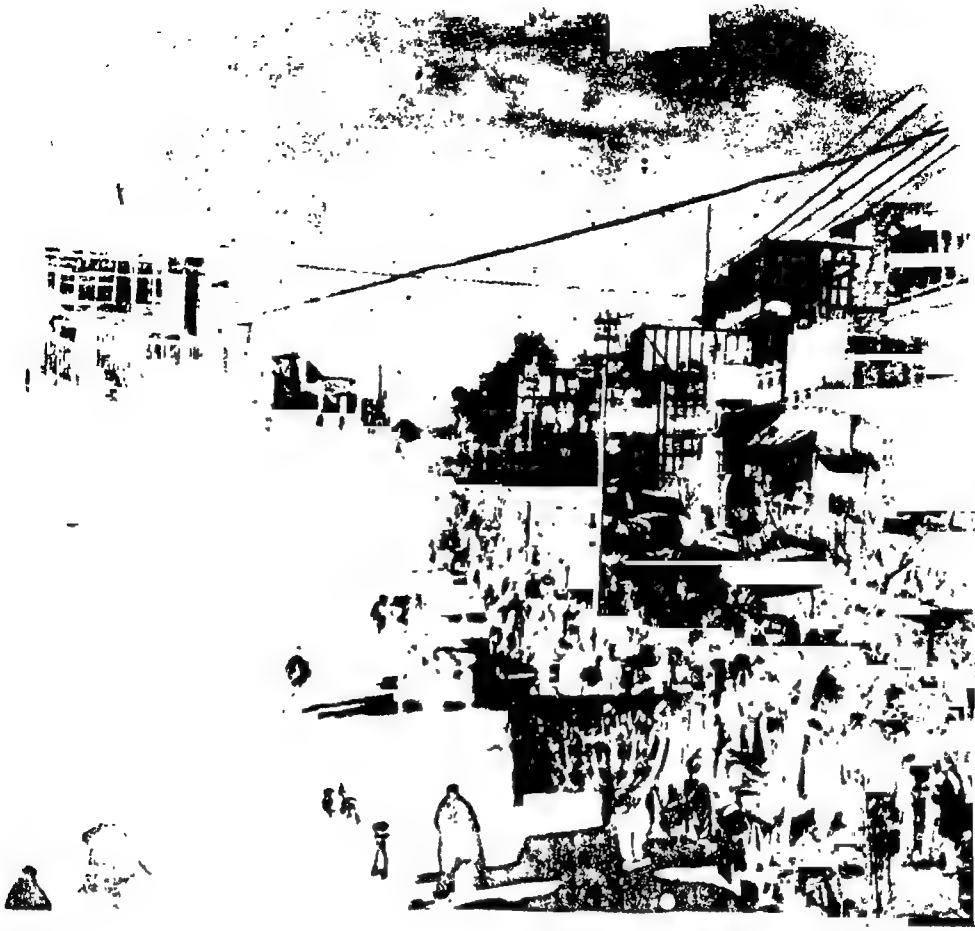
سید جعفر کاظمی

عید بہر حال عید ہے خواہ وہ عید انظر ہو یا عید الضی۔ لہذا ارباب ذوق عید کو عیدین تصور کرتے ہوئے
دو دنوں سے نشاط اندوز ہوں کہ ہم خرما بھی ہے اور ہم ثواب بھی۔ (ادارہ)

پشاور شہر۔ قدیم سے خوش پوش، خوش خرداک اور مشہور خطہ
ہے۔ نیز اسلامی روایات اور رسومات میں پیش پیش نظر آتا ہے۔
یہاں عیدین کا بڑا اہتمام کیا جاتا۔ چاند نظر نہ آتا تو سینٹر صاحبان
روپیہ خرچ کر کے دور دور سے چاند کی مصدقہ خبریں منگواتے،
اس کے علاوہ یہ شہر پیشہ وہ اور دستکار شہر ہے۔ لوگ رات رات
بھر بیدار رہ گئے جان توڑ محنت کرتے، تاکہ ضروریات پوری
ہوں۔ مائیں بچوں کے کپڑے سینٹیں مشینیں توختیں نہیں، لہذا
ہاتھ سے سلائی کی جاتی۔ ہاونگتے جارہے ہیں اور کام ہوتا جا رہا ہے۔
کوئی عورت مٹی کا گھڑا اوندھا کئے سوتیاں تیار کر رہی ہے،
بال برابر باریک۔ خوش واقارب کے ہاں بھیجنا سب سے مقم
ٹھہرا۔ اس خوشی میں محنت دو بھر نہیں معلوم ہوتی۔ کوئی بچہ روکا
کوئی ددڑی کے سر پر سوار کوئی مچی کے پاس بیٹھا ہے۔ کوئی اپنے
کپڑے سر ہانے رکھ کر سو گیا۔ آنکھ کھلی تو کپڑے اٹھ کر دیکھ لے۔
دستکار کہتے ہیں اللہ کرے کل چاند نہ نکلتے۔ کام بہت رہ گیا ہے۔
الغرض امیر و غریب عید کا تہیہ کئے ہوئے ہیں۔ اللہ اللہ کر کے صبح
ہوئی۔ بند و قیں، قراہینیں دغیں۔ دھاکوں نے عید کا اعلان
کیا۔ دھولکئی، نفیر لیں اور سُر ناؤں کی آوازیں آنے لگیں گھر
کی مستورات انھیں، نماز سے فارغ ہو کر پانی گرم کرنے کے لئے چولہے
پہر رکھا۔ بچوں اور مردوں نے نئے کپڑے پہنے نماز عید کی تیاری ہے۔
سبحان اللہ بچہ کی زرق برق لباس کناری گڑبٹے کا کایا کہ آنکھیں بندھا گیا۔
ادھر شہر کے بڑے بازار۔ بہانہ لڑی، راملاس بازار

ڈبجری بازار، ملک منڈی کا چوک، قصبہ خوانی بازار،
بازار بنار، جہانگیر پورہ، کوتوالی، کٹرہ رشیم گراں، بازار
چڑوے کو باں، بازار کلاں، کریم پورہ بازار وغیرہ وغیرہ کی دکانیں
سجیں۔ کھانے پینے کی چیزیں نیز طرح طرح کے کھلونے بک رہے
ہیں۔ لوگ سوتیاں کھا کر نماز عید پڑھنے بچوں کے لئے عید گاہ، روانہ
ہوئے۔ نماز سے فارغ ہو کر لوگ دوستوں عزیزوں سے مصافحہ
معانقہ، علیک سلیک کرتے، چھوٹوں کا بزرگوں سے تعارف
کراتے، رومال میں انڈے، مٹھائی، بڑے پکڑے لئے بچوں
کے واسطے طرح طرح کے کھلونے خریدتے گھر واپس آئے۔
ادھر گھروں میں، پیٹنگیں پڑ گئیں۔ بہن بیٹیاں جمیل روی
ہیں۔ آپس میں ہنسی مذاق اور چہلیں ہو رہی ہیں۔ ہر چند روپیہ
پیسہ اثنا دافر نہیں۔ مگر صبر و قناعت بے حد ہے۔ ارزانی نے
حقیقی خوشی سے دو چار کیا ہوا ہے۔ اور اشیا خورد و نوش کے
خالص و بے آمیز ہونے نے قوت حیات وافر بخشی ہوئی تھی۔ بڑی
بالحفاظ اور مودب دنیا تھی۔ کیا مجال بہو بیٹی کے سر سے دوپٹہ
سرک جلے۔ ہاں سچی ہنسی، کھیل میں ایک دوسرے کو چھیڑا
جا رہا ہے۔ مگر مہذب طریقہ سے۔

خیر، پہلا دن عید کا شہر ہی میں گزرا۔ دوسرا دن چڑھا۔
یہ میلہ جہاں اب نئی آبادی ہے یعنی مکہ دی بازار، وہاں لگتا تھا۔
شتنگری دروازہ سے ہنر تک رشک کے دھڑلے بازار لگتا اور
خورد و نوش کی دکانیں سجائی جاتیں۔ ایک روپے چار آنے میر مٹھائی



بازار قصہ خوانی

پشاور

ہمارے عظیم اور قدیم شہر، کے
کوچہ و بازار سنگ و خشت کے تودے
نہیں ہیں بلکہ وہ مقامات ہیں جہاں زندگی
ہر وقت تیز تیز سانس لیتی ہے۔ وہ ہمارے
قدیم فنون کے اساتذہ دار بھی ہیں اور حیات و
ثقافت کے آئینہ دار بھی۔ جن میں ماضی کی
جھلکیاں اور روشن مستقبل کی دمک قدم قدم
پر نظر آتی ہے۔

چوک یدگار



مکرن پہول، کے دیس



چانگام



’غان کی فردوس بداماں وادی ہو یا ہرے بیرے
اڈام کے سدا بہار گھنے جنگل، تندرو دریا اور
مذی کی ہماہمی سے گونجنے والے صنعتی علاقے،
سب ہمیں دعوت نظارہ دہنے اور اس مشترکہ
رشد کی یاد دلاتے ہیں جو ہماری قومی یکجہنی
سب سے بڑی اساس ہے۔

سندرن اور چانگام کے پہاڑی علاقوں میں
الحصوص فطرت اپنے پورے حلال و جمال کے
ساتھ نظر آتی ہے۔

سندرن (کوهستانی علاقہ چانگام) میں دریائے سنگو کا طلسمی نظارہ



چانگام کا پہاڑی قبیلہ، چکما

گوشتِ دنبہ ۲ آنے میر، پیسے کے ایک اور دو انڈے، چھ پیسہ سیر دودھ، دو پیسے یا آٹھ سیر گندہ ریاں، ایک پیسہ کے چار کباب پیسے ایک روٹی جو کچ ۲ آنے کی ہے، ۲ آنے سیر گوشت موٹا۔ ایک پیسہ میں کچوری یا کچھی۔

گافوں کے لوگ شہر میں آتے۔ اپنے عزیز اقارب کے لئے مرغیاں۔ گتے۔ گڑ کا شیرہ۔ آٹا۔ اور گڑ بنا ہوا لاتے۔ کیونکہ ان کو رات گزارنی پڑتی تھی۔ کتنے فراخ دل لوگ تھے۔ عید پر خاص کر آٹھ آٹھ دس دس روز ہمانداریاں جو کرتیں۔ شرفا کا لباس تھا لٹھے کا کرتہ اور شرعی پاجامہ واسکٹ اور گتے میں رومی چند یا موسم کے لحاظ سے لٹھے کا، بنجیہ کیا ہوا غل سر پر شمال یا ملل کا صاف یا پشاور کی لنگی، شانہ پر سرخ بھاری رومال، بعض کے پاس ہاتھ میں نسوار کی ڈبیا ہاتھ میں عصا، کسی کے شانہ پر کابلی بٹو، پیر میں پشاور کی نازک جوتا۔ شرک کے کنارے گائیں، بھینسین ذبح ہوتیں اور دیہات کے لوگ دودو چار چار سیر گوشت خرید کر لے جاتے۔ ایک طرف گشکا بازی ہو رہی ہے، تو دوسری طرف پہلوانوں کی کشتیاں لڑی جا رہی ہیں، کہیں خانہ زادے نیزہ بازی کر رہے ہیں، کسی جگہ چار بیتہ بازی ہو رہی ہے، مکرئی بازار کے ٹھانہ کے دوسری طرف ٹیلوں پر مستورات، بچے طبقہ کی بفع اوڑھے بیٹھی سیر کر رہی ہیں۔ عزیز واقارب کھانے پینے کی اشیاء لالا کر دے رہے ہیں حتیٰ تو یہ ہے کہ شرارت کا کسی کو خیال نہ تھا۔ آج کل کا زمیندار تو پاکستان کی برکت سے دولت سے کھیل رہا ہے۔ پہلے کا دیہاتی اگر لنگی نئی ہے تو جوتا پڑانا۔ کرت لٹھے کا ہے تو پاجامہ پڑانا ہے۔ بچے کے سر پر صرف زری کی ٹوپی ہے تو عید ہو گئی، جوتا نیا ہے تو باقی کپڑے دھلے ہوئے۔ اور یہ پشاور کی عید صرف پشاور کی عید تھوڑی ہے۔ اب تو پشاور سے لے کر لاہور، اود لاہور سے لے کر ڈھاکہ، چانچھام، سہٹ بنک ایک ہی مضمون ہے۔ کیونکہ اب تو جہاں دیکھئے پاکستان ہی پاکستان نظر آتا ہے۔ نہ کوئی جدا جدا، الگ الگ ملک حلائے رہے نہ سرحدیں۔ بلکہ ساری حدیں ٹوٹ کر ایک ہی ملک بن گیا، اس لئے جو رنگ ایک جگہ ہے وہی ہر جگہ ہے۔ پشاور میں عید کے میلہ کی جو چہل پہل ہے۔ بعینہ ویسی ہی لاہور، کراچی

کوئٹہ، حیدر آباد اور ڈھاکہ وغیرہ کے میلوں میں ہے، عید ہی قربانی کا جذبہ ہی، اس کا فلسفہ وہی، بنیاد وہی — یعنی مذہب جو سب کا مذہب ہے اور معاشرہ، تہذیب سب ایک ہی ہیں۔ سب کے سب ایک ہی رنگ میں رنگے ہوئے۔ یہی بات ہی تو سب کو ایک بنا دیتی ہے۔ نہ کوئی پنجتون نہ پنجانی نہ بلوچ نہ سندھی نہ بنگالی۔ بلکہ سب کے سب پاکستانی ہی پاکستانی — اپنی قومی وحدت پر فخر کتنا۔ سامے کے سامے اسلام ہی کے عظیم روحانی رشتہ میں منسلک ہیں۔ اگر ہمیں اتحاد و یکجہت کا روح پرور منظر دیکھنا ہو تو اس کے لئے غالباً حیدر میں سے بہتر کوئی موقع نہیں۔ ایک طرف طرح طرح کی دلچسپیاں ہمارے بہت سے بھائیوں کو مشرقی پاکستان سے یہاں لے آئی ہیں اور دوسری طرف آب رواں کی بان و بہار سرزمین، مشرقی پاکستان کی کشر بھی مغربی پاکستان کے لوگوں کو وہاں لے گئی ہے۔ اور مذہب نے نہیں ایک ہی مقام پر یکجا کر دیا ہے جو ہر کہیں عید گاہ کی شکل میں نظر آتا ہے۔ عید کے بعد ایک دوسرے سے گلے ملنا، محبت، خلوص، یکجہتی، کاکتار روح پرور منظر ہے۔ خدا کرے یہ آٹھویں یکجہت روز افزوں ہو اور ہمارے وطن عزیز کو بیش از بیش مغبوطی و استحکام عطا کرے ۛ (ریجنر ریڈیو پاکستان۔ پشاور)

غیر طلبیدہ مضامین کی

واپسی کے لئے

مناسب ٹکٹ روانہ کیجئے،

اور اپنا پتہ

صاف اور خوشخط لکھئے۔

(ادارہ)

”سبدگل“

(ہزارہ، پچھلاں دا گھارا!)

سید غلام حسن شاہ کاظمی

علامہ البیرونی نے ”کتاب الہند“ میں دریائے سندھ کا ذکر کرتے ہوئے اسے دریائے ”ویہند“ کا نام دیا ہے اور بتایا ہے کہ یہ انگ کے پھاڑوں سے نکلتا ہے جو ترکوں کی حدود میں واقع ہیں۔ اس دریا کو اندس۔ انگ اور اباسین کے ناموں سے بھی یاد کیا جاتا ہے۔ البیرونی کے سفر میں جو قنوج سے کثیر تک کے حالات ملتے ہیں اس میں شرشارا، تھانیس، جالندھر اور ہریان کے نام آتے ہیں جن کے بعد دشتان (سری نگر) پہنچ جاتے ہیں۔ قیاس چاہتا ہے کہ شرشارا یا ہزارہ ہی ہے۔ البیرونی کے عہد میں مسافر ہزارہ کے قدیم راستے سے صود گزرتے تھے۔ یہ ایک اہم پٹا تھا اور کثیر جانے کے لئے ادھر سے گزرنا پڑتا تھا۔ جب اکبر اعظم نے ادھر تک پرشہور قلعہ بنوایا اور آبادی بڑھی تو اس ساری سرزمین کی اہمیت بڑھ گئی۔ آج کل یہ مقام معمولی جگہ ہے۔

اس تمام تفصیل سے مراد یہ ہے کہ ہزارہ کا علمی اور ادبی حوالہ سے بھی تعارف کرا دیا جائے۔ لغوی تحقیق سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ اس کو زند کے ابتدائی تلفظ — سہاؤرا — (ہزارہ) سے جڑا نہیں کیا جاسکتا۔ تغیر لوجہ کے باعث یہ ہزار آ مشہور ہوا۔ بالائی ہزارہ کے بعض علاقوں میں دھڑب الامثال بولی جاتی ہیں ”ہزارا پچھلاں دا گھارا“ (ہزارہ بھولوں کا گڑا ہے)، دوسری مثل ہے ”خدا دے گھاسے پکھلی چھوڑ ہزارے آئے“ (خدا سے پھر جانے والے پکھلی چھوڑ کر ہزارہ آجاتے ہیں!)۔ اس بات سے یہ ظاہر ہے کہ ہزارہ سرسبز و شاداب اور معاشی خوشحالی کا مقام ہے اور لوگ ادھر آتے ہیں۔

تاریخ یہ بھی بتاتی ہے کہ ٹیکسیلا سے آگے جو حکومت قائم تھی اس کا نام آرشا ضرور تھا جن میں ماگھی اور کچھلی شامل تھے۔

ابھی تک کوئی فیصلہ کن رائے قائم نہیں کی جاسکی ہے کہ ہزارہ کا نام کیونکر پڑا۔ اسی طرح سرزمین ہزارہ کی حدود کا تعین بھی مشکل رہا۔ یہاں انگریزی تسلط ۱۸۴۹ء میں قائم ہوا تھا۔ جو آزادی ملے تک جاری رہا۔ انگریزی عہد میں ہزارہ کی جو حدود مقرر ہوئیں، اس سے قبل کچھ مختلف تھیں۔ صرف لفظ ”ہزارہ“ کی بابت کئی رائیں ظاہر کی گئی ہیں۔ اسے ہزار آ اور ہزارہ دونوں طرح لکھا جاتا ہے۔ کوئی اس کو ایک ہزار — پرند — سے نسبت دیتا ہے جو ایک ہزار آوازیں مختلف نغموں میں نکال سکتا تھا۔ گو اس کا وجود محض قیاسی ہے۔ ہزارہ کو ”ہزار داستان“ (دجل) سے بھی نسبت دی گئی ہے۔ سنسکرت میں اسے سہسرا بتایا گیا ہے اور ”سہاسرا“ (ایک ہزار — سنسکرت) کے عنوان سے بھی یاد کیا گیا ہے۔ زند میں یہی لفظ سہاؤرا *usawra* یعنی ایک ہزار آیا ہے۔ ضیا بخشی بدایونی نے ۷۵۱ء میں اس لفظ کو بطور قافیہ بتایا ہے:

عطارد را بود اوراق پارہ

دھڑ زہرہ مانند از ہزارہ

ضلع کے ”گزٹیر“ میں بھی اس نام کی تحقیق پر روشنی ڈالی گئی ہے: ”پہلے ہزارہ ایک خاص علاقہ کا نام تھا مگر اب سارے ضلع کے لئے مستعمل ہے۔ اسے ارشا (ارتھ، ارشا) URASHA سے مشتق سمجھا جاتا ہے۔ اس کا نام اوراش (ORASH) وارش (RASH) بھی معلوم ہوا ہے یہ اس نام سے ملتا جلتا ہے جسے ہاتھارت میں آرا کا کہا گیا ہے۔ پٹولی (۷۰۰-۳۲۶ ق م) نے اپنے جغرافیہ میں اس ضلع کے لئے *oupa* یا *apda* لکھا ہے (ص ۱) اور اسے دریائے سندھ و جہلم کے مابین قرار دیا ہے۔“

(گزٹیر ضلع ہزارہ، مطبوعہ ۱۸۸۳ء)

ہے جو وسعت میں کہیں بڑھ چکا ہے، مغرض یہ پورا علاقہ تاریخ و تہذیب کا گہوارہ رہا ہے اور اس جہد میں بھی اس سرزمین سے بہت سے اہل الطال تاریخ گر پیدا ہو چکے ہیں جن کے وطن پرور کارنامے آج بھی ہمارے سامنے موجود ہیں۔

تاریخی وثقافتی پس منظر پیش کرنے کے بعد ہزارہ اور ادبیات کے موضوع کو بھی چھیڑنا دلچسپی کا باعث ہو گا اس لئے جہت جہت اس پر بھی چند سطور یہاں پیش ہیں۔ ہزارہ کا ذکر فارسی، پنجابی اور اردو میں ہوا کرتا ہے۔

ہیرودا تھا کا قصبہ فارسی میں لکھا گیا تو اسے افسانہ دلیزیہ کا عنوان دیا گیا۔ یہ سعید سعیدی کا لکھا ہوا ہے (جہد شاہجہاں ۱۰۳۶ تا ۱۰۶۸ء - ۱۹۶۸ء)۔ راجھا کا تعارف کراتے ہوئے ہزارہ کا ذکر اس طرح زمانہ پر آیا ہے:

مشہور زمانہ راجھ نام است
در دہر خانہ راجھ نام است
دیدم پیدش مقدم دہر
مشہور جہاں معلّم دہر
نامش موجو میانِ مردم
منظور قبیلہ جانِ مردم
اصل و نسبش بدین ہزارا
کردم من خست آشکارا

پنجابی قبیلہ فارسی زبان میں "کے مصنف کی رائے ہے کہ موجو کو اچھی بھی کہتے ہیں اور یہ کہ تخت ہزارہ ضلع سرگودھا میں واقع ہے۔ ہیرودا تھا کا قصبہ بطور مثنوی محمد رادلانی نے بھی لکھا ہے (۱۰۹۶ھ)۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ہیرودا تھا کی سیال کی رہنے والی تھی اور اس کے باپ کا نام چچ سیال تھا۔ یہ لڑکی جب جوان ہوئی تو عشق کا قصبہ شروع ہوا۔ اس زمانہ ہی میں تخت ہزارہ میں ایک رئیس حکمران تھا جس کے آٹھ بیٹے تھے، مگر وہ سب سے چھوٹے بیٹے کو زیادہ چاہتا تھا۔ قبیلہ کے نام پر اس کا نام بھی راجھا مشہور ہو گیا۔ اسے ماہی اور دھیدو کے ناموں سے بھی پکارا جانے لگا۔

حکیم چٹاپی نے ۱۱۱۰ھ میں قصبہ "ہیرودا ہی" تالیف کیا۔

اسی طرح اگر وہ کا مقام ہے جہاں آثار قدیمہ کی موجودگی آج بھی ظاہر ہے۔ ادھر ایبٹ آباد کے جنوب مشرق میں سرین نامی پہاڑ اور راجہ رستو کے زمانہ کے غار بھی پائے جاتے ہیں۔ گڑھی حبیب اللہ کے اوپر کٹ بھلہ اور بانہ پور کے مقامات میں جو دریائے گنہار کے دونوں کناروں پر واقع ہیں، اودھ کی وقت میں قلعہ بند شہر تھے اور ان کے آثار آج بھی دیکھے جاسکتے ہیں۔ مجھے ایک سفر کے دوران کوٹ بھلہ کے مقام پر ایک پتھر بھی دستیاب ہوا تھا جس پر چینی یا سنسکرت رسم الخط نظر آتا تھا، مگر میں اس تحریر کو محل نہ کر سکا عرض ان تمام اطراف میں ہمارے علاقہ کی قدیم تہذیب کے آثار اور مناظر کی موجودگی ایک دلچسپ واقعہ ہے جو محققین کی نظر سے پوشیدہ نہیں ہوں گی۔

حبیب اکرم عرض کر چکا ہوں ہزارہ کے کئی نام مشہور ہیں جن میں یہ زیادہ مشہور ہیں: ہجھہ ہزارہ، گرجہ ہزارہ، سخت ہزارہ، پنج کٹھ ہزارہ، میدان ہزارہ، ہری پور ہزارہ۔ عام طور پر خیال کیا جاتا ہے کہ ہجھہ دراصل تھی، ہی ہے۔ اس کا چینی تلفظ یوچی ہے سابق پنجاب کے اضلاع، گجرات، شاہپور اور جہلم میں آج قبیلہ کے افراد بکثرت آباد ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ لوگ کسی وقت میں یہاں حکمران رہے تھے۔ اس کے بعد ہجرت کر کے دور در دور پہنچ گئے۔ سخت ہزارہ اور میدان ہزارہ ناموں سے اس کے ارتفاع کی صفت کا اظہار ہے۔ ہری پور ہزارہ کا نام گورنر سردار ہری سنگھ کوٹہ کے نام پر پڑا۔

لفظ ہزارہ کی تحقیق کے سلسلہ میں یہاں یہ بات بھی ظاہر کر دینی مناسب ہے کہ یہ نام بہت جگہ ملتا ہے مثلاً افغانستان میں اس نام کی ایک قوم آباد ہے اور جہاں یہ لوگ رہتے ہیں اسے "ہزارہ جات" کہتے ہیں۔ ہجرت کی تحصیل میں ایک گاؤں بھی ہزارہ نام کا موجود ہے۔ سخت ہزارہ نام کا بھی ایک اور گاؤں سکوتہ کے ضلع میں واقع ہے۔ رولایہ تھاکہ ہزارہ نام کے قبائل جہاں بستے تھے اپنی بستی کو ملتا جلتا نام دیتے تھے۔ اگر تفصیل میں جانوں تو سابق پنجاب کے اکثر اضلاع میں یہ قبیلہ آباد ملے گا۔

اس سرزمین کی قدیم سلطنت ارشا کے نام سے معروف ہے اور یہ بالائی ہزارہ (وغیرہ) کے علاقوں کو محیط تھی یہیں ایبٹ آباد

انہوں نے بھی ماہی راہنجا کو اپنے وطن ہزارہ میں دکھایا ہے جہاں وہ ہمیر سے رخصت ہونے کے بعد پہنچا، اور بخار میں مبتلا ہو کر مر گیا۔ ان کے قہقہے میں جب راہنجا سے دریافت حال کیا جاتا ہے تو وہاں بھی ہزارہ کا تعارف موجود ہے :

گفتا کہ مرا وطن ہزارا صحت

ایں ببل درجن ہزارا است

راہنجا نسب است و ماہم نام

نزدیک چناب جائے آرام

فیقر اللہ آفوق نے بھی قعدہ ہیر و راہنجا لکھا ہے (۱۱۵۴ء)۔

اور اس میں بھی ہزارہ کا ذکر موجود ہے :

کنوں گل زمین ہزارہ لقب

کہ آنجا کند شبنم فیض رب

زما بختی بود مرقدے یادگار

زیارتگ خاص و عام دیار

چنین ہیر راقعہ جھنگ نام

گرامی مزار لیست بااحترام

منشی سدر داس آرام نے بھی قعدہ ہیر و راہنجا بڑی غریب تحریر کیا (۱۱۶۱ء)۔ یہ سید وارث شاہ کے معصرتے۔ انہوں نے بھی بتایا ہے کہ راہنجا تخت ہزارہ کے ایک بارونی شہر ہزارہ میں پیدا ہوا۔ اس کے باپ کا نام معز الدین تھا جو ہزارہ کا رئیس تھا۔ اس لڑکے کے علاوہ اس کے تین اور بھی بیٹے تھے۔ ہیر جھنگ سال کے مسلم نامی ایک سردار کے ہاں متولد ہوئی۔

ان ادبی حوالوں سے یہ تو معلوم ہوتا ہے کہ ہزارہ اور تخت ہزارہ مشہور مقامات تھے مگر خاص ضلع ہزارہ کی توضیح حق ہو کر نہیں ہوئی گو بعض مقامات پر ضلع تخت ہزارہ اور شہر ہزارہ کا نام گنے سے کچھ رہنمائی ضرور ملتی ہے۔

بعض تدریسی حوالوں میں بھی اس مقام کی راحت ملتی ہے۔ مرزا اعظم بیگ اکثر اسسٹنٹ کمشنر، بندوبست، ہزارہ نے جو تاریخ ہزارہ ۱۸۷۷ء میں لکھی تھی اس کا ایک جلد یہاں موصفاً پیش کیا جاتا ہے ۵ "ہزارہ لاہور سے ۲۳۲ میل دور، بجانب شمال دو آبہ سندھ ساگر (راہین دریائے سندھ و جہلم) میں ملتی ہے۔

اس ضلع کا بڑا شہر ہری پور ہے۔ اسے سردار ہری سنگھ تلوار نے میدان ہزارہ میں آباد کرایا تھا۔ یہی ضلع کا دار الحکومت تھا۔ اگر نئی عہد کے ابتدائی دور میں بھی یہی صدر مقام تھا۔ اس لئے یہی یہ مقام ہزارہ معروف ہوا۔ ۱۸۵۷ء (۱۳۷۳ھ) میں دھمکوت کو بھاؤنی کے لئے انتخاب کیا گیا کیونکہ یہ ضلع کے وسط میں واقع ہے۔ اس جگہ کو میجر جیمز ایبٹ نے یونی بھی پسند کیا تھا کہ یہاں کی آب و ہوا سرد اور معتدل ہے۔ انہی کے نام پر ایبٹ آباد کی بنیاد رکھی گئی۔ ضلع کی حدالتین ہیں ہری پور شمال مشرق میں ۳۳ میل کے فاصلہ پر ہے، مگر ضلع کا نام پر دستور ہزارہ ہی رہا۔

معتبر روایات سے اس ضلع کی وجہ تسمیہ یہ بھی معلوم ہوئی کہ ۱۳۹۸ء (۸۰۱ھ) میں امیر تیمور یہاں پہنچا اور قتل کوں کا ایک قبیلہ قاتل ہری پور کے گرد و نواح میں بس گیا اور ہزارہ پتا بعض ہو گیا۔ ان کے نام پر یہ مقام "میدان ہزارہ قاتل" بھی مشہور ہے۔ بلکہ ۱۸۶۸ء تک کے کاغذات بندوبست میں یہی نام درج ہوتا رہا۔ ملاحظہ میدان جہاں ترکوں کا یہ قبیلہ آباد تھا۔ ترکوں کے بقید قبیلہ پکھلی میں آباد تھے شہنشاہ جہانگیر کے وقت تک یہ قبائل یہاں پائے جاتے تھے۔ اب بھی ان کی اولاد موضع گھیر وال (گیروال) میں آباد ہے۔ ایک دفعہ جہانگیر کشمیر جاتے ہوئے یہاں سے گزرا تو اس قبیلہ کے سردار بھی پیش ہوئے تھے اور انہوں نے اپنے قبیلہ کا نام قاتل بتایا تھا۔ یہ علاقہ ۲۰ میل لمبا اور ۲۰ میل چوڑا ہے۔ شمال و مشرق میں کشمیر جنوب میں راولپنڈی اور کسی قدر شمال و مغرب میں پشاور ہے۔ بقیہ حصہ علاقہ غیر میں بجانب غرب و شمال واقع ہے۔ اس کی تین تحصیلیں ہیں حاتھر، ایبٹ آباد اور ہری پور۔

ضلع ہزارہ کی تاریخ اور جغرافیہ پر نظر ڈالتے ہوئے مولانا سید عبدالجبار شاہ صاحب سٹھانوی (مروم) اپنی تصنیف بنی ہری میں ایک جگہ لکھتے ہیں "پھر افغانستان سے یکے بعد دیگرے قوتیں دوسری افغان قوموں پر حملہ آور ہو کر، ان کو ملک بدر کر کے، قابض ہوتی رہیں۔ اکثر قوموں کا بقیہ ضلع ہزارہ میں اب تک پایا جاتا ہے کہ وہاں توہین ہیں۔ دلازاک ہیں، سلماقی ہیں، یوسف زئی ہیں، کاکڑ ہیں۔ جردن ہیں۔ صواتی ہیں۔ ترک ہیں۔ حبیب خیل، چچا آئی، قویں آکر ملک پہلوں سے لے کر ان کو ہندوستان میں نوکھیلی رہیں۔

ثقافتی دھاروں کا سنگم ہونے کے اعتبار سے بھی یہ جگہ ایک ممتاز اہمیت کی مالک رہی ہے اور اب جبکہ اس نواح میں ہمارا نیار دار الحکومت — اسلام آباد — بن رہا ہے اس کی تاریخی اہمیت میں مزید اضافہ ہو گیا ہے۔ تاریخ اپنا تسلسل منقطع نہیں ہونے دیتی — اگر کچھ کڑیاں کسی وقت محو معدوم بھی ہو جائیں تو آنے والا دور انہیں پھر مربوط و منسلک کر دیتا ہے اور اس طرح انسان کی تاریخ کا مطالعہ مرتب و مکمل ہوتا چلا جاتا ہے۔ اس لئے ہمیں یقین کامل ہے کہ اب جبکہ ہمارے نئے دار الحکومت — اسلام آباد — کی تعمیر یہاں شروع ہو چکی ہے مستقبل میں بھی یہ سر زمین اپنی قدیم عظمت سر بلندی کی روایات کو برقرار رکھے گی۔

اُنی سب کا بقیہ نمونہ ضلع ہزارہ میں رہ گیا ہے۔ وجہ تسمیہ ضلع ہزارہ کی ہزار ہا اقوام کا مجموعہ ہونا بتلایا جاتا ہے۔

مولانا نے لفظ ہزارہ کی بابت جس عوامی شہرت کا ذکر کیا ہے وہ درست نہیں معلوم ہوتی کیونکہ صرف ۲۳ قبائل کو "ہزارہ اقوام" تعبیر نہیں کیا جاسکتا اور یہ قبائل بھی جدا جدا اقوام نہیں بلکہ چار بڑی قوموں کے ہی برگ و بار ہیں۔

غرض تاریخ اور ادب میں ہزارہ کی طرف اشارہ جگہ جگہ ملتا ہے اور ہم اس بات کا بخوبی اندازہ لگا سکتے ہیں کہ یہ مقام نہ صرف اپنے قدرتی مناظر کی دلکشی، آب و ہوا کی طرنگی اور صحت افزا ماحول کے اعتبار سے نہایت نفیس جگہ ہے بلکہ تاریخ کا گہوارہ ہونے اور

دہ کریں پھول کے دیں میں۔ بقیہ ص ۳۱

ذاکر صاحب کہہ رہے تھے، کتنی حسین جگہ ہے یہ! — یہاں فوٹو ہو جائے۔ "واہ وا! سبحان اللہ!" — یہ آواز مولانا خیری کی تھی۔ اور پھر ہم سب ایک ایک کر کے دیگن سے نیچے اتر آئے۔ پُرکون ماحول، ہر سمت ہریالی۔ ایک طرف دریا، دوسری طرف اونچی پہلی پہاڑیاں اور پہاڑیوں پر بلند قامت درختوں کا پھیلاؤ۔ ساری دنیا سحر زدہ سی لگ رہی تھی۔ سید صاحب نے تصویر سی نقطہ نظر سے ایک موزوں جگہ ہمیں کھڑا کیا اور ایک "ہلک" کے ساتھ پہلے کی طرح اس مقام کو بھی جا وداں بنا دیا۔

کچھ ہی دیر بعد ہم چند رگوتا کے ڈائریکٹرس پچھلے پڑ پڑ گئے جہاں کرنل صاحب ہمارے منتظر ہی تھے۔ کرنل صاحب نے چلنے سے ہماری تواضع کی۔ چائے پی کر ہم ان کے ہمراہ کرتافلی پیرل دیکھنے کے لئے روانہ ہو گئے۔ وہاں ہم نے اپنے ملک کی تیسرے رفتار رتنی کا پہنچ جس طرح چلتے ہوئے دیکھا، اس کا حال میں اگلی صحبت میں بیان کروں گا۔

★

کاکس بازار جانے والی ٹرک بھی ملی جو بارش کے سبب ناقابل گزرتھی۔ کاکس بازار ساحل سمندر پر ایک خوبصورت سا شہر ہے۔ لکڑی کے مکانات، ناریل کے درختوں کے جھرمٹ پتھر ڈا، مندر، پہاڑیوں پر استوپ — ترقی یافتہ شہروں سے الگ تھلگ — ایک خاموش اور پُر سکون بستی جہاں نہ شہروں کی گہما گہمی ہے اور نہ تھنخ اور بناوٹ سے ملو زندگی۔ شہروں اور ہنگاموں سے بیزار انسان اکثر راحت اور آسودگی حاصل کرنے یہاں آتے ہیں اور رات کے سناٹے میں سمندر آسمان اور ساحل میں امتیاز مشکل ہو جاتا ہے۔ طوفانی لہروں کے دھڑواگ سن کر دنیا و مافیہا کے غموں سے لاتعلقی ہو کر اس کے سارے دکھوں اور غموں کو بھول جاتے ہیں۔ اس خوابناک بستی میں آفاقی سناٹا بھی ہے اور متلاطم اور پُرتشور سمندر کا قدرتی حصار بھی۔ سمندر کی بیکراں وسعتوں کو دیکھ کر انسان اکثر یوں محسوس کرتا ہے جیسے خود وہ معدوم ہو کر رہ گیا ہو۔

میں ابھی کاکس بازار کی پہنائیوں میں گم تھا کہ ایک خوبصورت پہاڑی کے دامن میں پہنچ کر ہماری رہنمائی دیکھ کر رک گئی۔

★

بکھری ہوئی شبیہیں

تجرا نصاریٰ

ابر رواں

عرفانہ عزیز

یہ گلِ فشاں بہا رہیں
یہ سرو کے دھنوں کی دلِ ربا قطاریں
یہ جوئے آبِ رنگیں
یہ احمریں دریچہ، یہ آفتابِ رنگیں
رنگوں کی آبشاریں
مخملِ حریر و دیباہ جن کے بدن نکھاریں
گوہرِ فشاں ستارے
مستی میں قفس کرتے مدہوش ماہِ پارے
یہ رم گزیدہ آہو
یہ دشتِ آرزو کے بے اعتبار دلجو
یہ فکر و فن کے پیکر
یہ ذہن و روح و دل کے سطوتِ پناہ زیور
ناہنش میں کفر و دیں کی
بکھری ہوئی شبیہیں اکُ حسنِ دل نشیں کی
اس دورِ ناسی میں
اے دل! یہ چاہتا ہوں اکِ باز زندگی میں
اک بُتِ نیابانوں
اس حُسنِ منتشر کو وجدان میں سجالوں

وہ سراپائے جمال پر وقار
صانعِ فطرت کا یکتا شاہکار
آج بھی جس کلبے تجھ کو انتظار
حاصلِ نقش و نگار کائنات
آبروئے جلوہ ہائے شش جہات
مُطربِ سازِ نازلِ سوزِ حیات
ایک جلوہ شاہِ مستور کا
اک شگوفہ شاخِ بطور کا
ایک ساغرِ بادۂ پُر نور کا
عقبتِ قلب و نظر کا پاسباں
بخش کر مجھ کو شعورِ دو جہاں
چل دیا جیسے کوئی ابرِ رواں
زندگی میری ابھی معصوم ہے
غنیچہ خاموش کا مفہوم ہے
آرزو جس کی ترا مقصوم ہے
چھڑ کر میری اُمنگوں کے رباب
چھپ گیا جانے کہاں وہ ماہتاب
دل ہوا جس سے سہا یا اضطراب
اک طلسمِ شوخیِ تحسیر ہے
میرے خوابِ شوق کی تعبیر ہے
اک مصور کی سچل تصویر ہے
مادرائے حُسنِ صبح و شام ہے
یاد جس کی ساغرِ الہام ہے
میرے افسانے میں جس کا نام ہے
اے حریمِ دل بتا وہ کون ہے؟

غزل

رضی ترمذی

تمہید الاسلام ستید

کیا ہوا فائدہ شوقِ ناکام
کوئی آغاز، نہ کوئی انجام
ایک لمحہ سا کہیں چمکا تھا
جس کا حاصل ہے یہ اندوہِ دوام
خاک ہے دل مگر اس پر اب تک
تیرا نقشِ کفِ پا ہے الزام
آرزو روزِ ازل سے رسوا
دل ہمیشہ سے بچا رہا، بدنام
تم ہمیشہ سے چمن کے مالک
ہم ازل سے وہی مرغِ تیر دام
گل ہوئے جاتے ہیں آنکھوں کے چراغ
اب سجاتے رہو اپنے دردِ بام
برگِ آوارہ سے پھرتے رہئے
مثلِ شبنم کہیں کیجئے نہ قیام
اس سے زنجیرِ دسلاسل اچھے
اک قدم اور ہزاروں احکام
رفتگاں یاد بہت آتے ہیں
اب ٹھہر جا کہیں دورِ ایام
غمِ دوراں ہی غنیمتِ جانو
دلِ مرحوم چلو غم تو ہے نام
دل نے کیا راز چھپا رکھا ہے
سارے عالم میں بچا ہے کبرام

منزلِ شام و سحر دیکھتے ہیں
ہم تری راہ گزر دیکھتے ہیں

یہ کڑی دھوپ یہ تپتے صحرا

آگ تا حدِ نظر دیکھتے ہیں

صحنِ زنداں کے در پہ کے قریب

چند بکھرے ہوئے پر دیکھتے ہیں

بھیگتی رات یہ تاروں کا غبار

چاند کا رختِ سفر دیکھتے ہیں

زرد مٹی میں کھل اٹھے میں گلاب

شاخ در شاخ نثر دیکھتے ہیں

زخم کھلتے ہیں تو شیدائے بہار

اک نیا باب ہنر دیکھتے ہیں

ٹوٹتے پتے سلگتے ہوئے پٹر

شعلے اڑتے ہیں جاذبِ دیکھتے ہیں

چین اور اسلام

رشتہ کی بنیاد

مستحق۔ مگر اس باب میں قورات کو نظر انداز کرنا، ہی مشکوک ہے جس میں واضح طور پر حضرت یافث کو حضرت نوحؑ کا بیٹا قرار دیا گیا ہے۔ ملاحظہ ہو:-
”نوح ۵۰۰ برس کا تھا جب اس سے حم، سام اور یافث تھے، یہی بیٹوں نوح کے بیٹے تھے اور انہیں سے نسل انسانی زمین پر پھیلی۔“ (تورات آیت ۱۸، باب ۹ ص ۱۱۱)۔

ان حوالوں کے بعد یہ ملنے میں تامل نہیں ہونا چاہئے کہ جن کا نام حضرت نوح کے پوتے کی وجہ سے ہی پڑا اور یہ کہ وہاں نسل آدم کے بنے اور بڑھنے کا سلسلہ ان ہی کی وجہ سے شروع ہوا۔ پھر یہ سلسلہ ہمارے وقت تک پہنچتا ہے تو ہم دیکھتے ہیں کہ حضرت ابو وقاص، صحابی رسولؐ حضرت عثمانؓ کے زمانہ میں اپنے قافلے کے ساتھ یہاں پہنچے۔ یہ قافلہ ایک وفد کی شکل میں تھا جو اس وقت کے فخرور چین کے دربار میں اسلام کا پیغام لے کر گیا۔ اس بات کی تصدیق کے لئے مشہور چینی تاریخ نویس ہوئی ہوئی ان والہ کا حوالہ کافی ہے۔ اہل چین حضرت ابو وقاصؓ کو ہمارے عرب مسلمان تسلیم کرتے ہیں۔ اس زمانہ میں شہنشاہ ”یون ہوئی“ حکمران تھا (۶۵۱ء)۔ حضرت ابو وقاصؓ کا انتقال بھی اسی سرزمین پر ہوا اور ان کا مزار مبارک شہر کنکین میں موجود ہے اور اس وقت مرجع خلافت ہے۔

پچھلے دنوں جب پاکستان اور چین کا سرحدی معاہدہ ہوا اور اس کی توثیق کے لئے ہمارے وزیر خارجہ جناب ذوالفقار علی بھٹو چین گئے تو ان صحابی رسولؐ کے مزار مبارک پر بھی پہنچے اور فاتحہ خوانی کا شرف حاصل کیا۔ اس پر ایک کتبہ نصب ہے جو ۱۹۵۲ء کی تاریخ ظاہر کرتا ہے جو بادشاہ یون ہوئی کا تیسرا سال جلوس تھا۔

(بحوالہ ترجمہ تلخ ”ہوئی ہوئی ان والہ“ ص ۱۱۱)۔

چین ایشیا کی ایک عظیم اور نہایت قدیم سلطنت ہے جو اہل باقوں کے علاوہ اپنی تاریخی ایجادات — کاغذ اور بارود — کے لئے بھی مشہور ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اہل چین اپنی دستکاری و صنعتی اور ایجاد پسندی کے باعث ہمیشہ سے ہی مشہور رہے ہیں۔ خود ہماری زبان میں ”نگارخانہ چین“ اور ”نگارنگ چین“ کے الفاظ ان کی نقش گری اور نفاست کاری کی طرف ہمارا ذہن متقل کرتے ہیں۔ چین یوں بھی ہمارے ذہن میں رہتا ہے کہ خود حضورؐ کی زبان مبارک پر اس کا نام آیا تھا جب انہوں نے امت کو یہ ہدایت کی تھی کہ علم طلب کرو اگرچہ وہ چین ہی میں کیوں نہ ہو۔ چنانچہ ارشاد نبویؐ کی تعمیل میں مسلمان یہاں آنے شروع ہوئے اور سب سے پہلے حضرت ابو وقاصؓ اپنے قافلہ کے ساتھ یہاں پہنچے تھے۔ اس واقعہ کی تفصیل آگے پیش کی جائے گی۔

قدیم مخطوطات اور دستاویزوں سے یہ ظہور ہوتا ہے کہ یہاں نسل انسانی کا آغاز حضرت نوحؑ اور ان کے صاحبزادے حضرت یافث سے ہوا، جن کی اولاد یہاں کثرت سے پھیلی۔ حضرت نوح کے ایک پوتے کا نام ہی چین تھا اور اس وجہ سے یہ سرزمین ان کے نام پر مشہور ہو گئی۔ مشہور مورخ محمد قاسم آفریادی کا بیان ہے:
”فرزندان یافث بموجب حکم پدری مجد و مشرق شمال سے آباد ہوئے و رآن ملک اور ایران و فرزدان یہ۔ یہ آئندہ ارشد اولاد“ ترک نام داشت و جمع ترکان روزگار از ”مغل“ و ”اوزبک“ و چغتائی و ترکمانان“ ایرانی از نسل او مستند۔ و سپردوم یافث چین نام داشت کہ ملک چین بدو موسوم است۔“ (تاریخ فرشتہ، جلد ۱، ص ۵۸)۔ اسی بات کی تائید حافظ ابن خلدونؒ نے بھی فرمائی ہے۔ حضرت محمود خلفشہ کی بھی یہی خیال ظاہر کرتے ہیں۔ مگر بعض لوگوں نے اس بات کو صحیح تسلیم نہیں کیا۔ اور حضرت چین تو کیا حضرت یافث کو بھی نسل نوح سے نہیں

بڑے کہ اندھونی بغاوتیں دہانے کے لئے مسلمان حکمرانوں سے مدد لی جاتی تھی۔ چنانچہ خاندان ٹانگ کے بادشاہ، جنگ یونگ کے دوسرے سال جلوس میں دربار کے ایک مسلمان سپہ سالار، مسیحی، کو باہر کے مسلم حکمرانوں سے مدد مانگنے کے لئے بھیجا گیا۔ درخواست کا مضمون ظاہر کرتا ہے، "ملک مغرب میں مسلمان سب سے زیادہ طاقتور ہیں۔ ان کی سلطنت بحیرہ روم سے کاشغر تک پھیلی ہوئی ہے۔ دنیا کے اکثر حصے ان کے قبضے میں ہیں۔ ہمارے ملک میں بغاوت ہو رہی ہے جنہیں فرو کرنے کے لئے ہمارے پاس لشکر بہت کم ہے۔ ہم مسلمانوں سے مدد کی توقع رکھتے ہیں" (محوالہ شاہی تذکرہ چین)۔

ٹانگ بادشاہ کے عہد میں ایک مسلمان کو جن کا نام یانگ یونگ تھا چنشی (ڈاکٹر) کا خطاب دیا گیا تھا۔ ۶۲۳ء میں اور دو سال جو مسلمان تھے ملک چین میں بڑی شہرت کے ملک بنے۔ ایک کا نام تھا، لی شیانگ، اسے تی بینی بھی کہتے ہیں۔ یہ اپنے وقت کا مشہور اور جلیل القدر حکیم تھا دوسرا مسلمان دانشور "جو کونگ یون" تھا جو بڑا زبردست شاعر تھا۔ غرض بے شمار تاریخی حوالوں سے یہ بات ثابت ہے کہ یونگ اور سوگ بادشاہان چین کے زمانوں میں اسلامی سلطنتوں کے ساتھ اس ملک کے بڑے اچھے دوستانہ تعلقات قائم رہے۔ مسلمان اپنے ملک کے بڑے وفادار تھے اور اسلام کی تبلیغ کے ساتھ ساتھ خدمت وطن میں بھی دل و جان سے شریک رہتے تھے۔ مسلمانوں نے اس ملک میں اس قدر عزت حاصل کی اور اسلام کا پیغام ایسا عالمگیر ہوتا چلا گیا کہ ۱۹۲۴ء تک ان کی تعداد ایک کروڑ سے بھی متجاوز ہوئی۔ جس وقت ملک چین میں سوگ بادشاہوں کا زمانہ آیا تو مسلمانوں اور چینوں کے تعلقات اور بھی مضبوط ہو گئے، اور بادشاہ سوگ کے ساتویں سال جلوس (۱۱۳۶ء) میں ایک مالدار عرب تاجر ابوعلی، کینٹن میں آکر آباد ہوئے اور کینٹن کے ایک تحصیلدار، چن بلہ، نے اپنی حقیقی بہن کا رشتہ بھی ان سے کر دیا اور یہ کوئی اکیلی مثال نہ تھی بلکہ مسلمانوں کے ساتھ از دو اجی تعلقات برابر بڑھتے رہے۔

عہد یونگ میں کوہلے خاندان کو خاص شہرت ملی اور مسلمانوں کا اثر و رسوخ بڑھا۔ توئی خان، چنگیز خان کا پوتا اور ہلاکو خان کا بھائی تھا، اس توئی خان کا ایک لڑکا تھا جس کا نام

حضرت ابو وقاص کے ساتھ جو عرب مسلمان چین میں داخل ہوئے انہوں نے اسلام کا پیغام دود و دود پہنچایا اور ہزاروں کیلا لگوں انسان اس دین حق کی روشنی سے فیضیاب ہوئے۔ اس وقت مسلمانوں کی آمد کا حال مشہور چینی مؤرخ "چاو جو یوئی" اپنے ایک مکتوب میں لکھتا ہے: "کینٹن میں اجنبی لوگ بہت ہیں۔ ان کے کھانے بھی وہی ہیں جو ہم بھی کھاتے ہیں۔ لیکن سوار کا گوشت ان کے نزدیک سخت ممنوع ہے"۔ کتاب، THE STORIES OF HANG HAI میں مرقوم ہے کہ کینٹن میں عربوں نے ایک مینار تعمیر کیا تھا جس کا نام "دی سینک" (مینار یادگار بنی) رکھا گیا تھا۔ اس کی بلندی ۴۰ فٹ ہے ہر صبح وہاں سے اذان کی آواز بلند ہوتی ہے۔ اس میں نعرے لگائے جاتے ہیں اور اس مینارہ کے نیچے ان لوگوں کی عبادت گاہ ہے۔ ایک دوسری کتاب "تاریخ یوکان" کے مؤلف نے بھی چینی مسلمانوں کی بابت لکھا ہے کہ "خان یونگ میں درباری مسافروں نے آکر سکونت اختیار کی ہے۔ عبادت کے لئے مذہب تو دھرتے ہیں اور ایک دوسرے کے ساتھ صف بہ صف کھڑے ہو کر عبادت کرتے ہیں۔ ان کا اپنا الگ ہی عبادت خانہ ہے مگر یہ بات معلوم ہے کہ اس میں کوئی ترشا ہوا بت یا مورت وغیرہ نہیں ہوتی بلکہ وہ آیا آیا (اللہ! اللہ!) پکارتے ہیں۔ معلوم نہیں یہ کیا ہے۔ عبادت خانے میں لمبے لمبے کتے بھی ہیں جن کی زبان عجیب ہے۔ جب عبادت کرتے ہیں تو ایک ہی آواز طار کر نکالتے ہیں اور ایک طرف اپنا رخ رکھتے ہیں۔ اس سے ہمارے دلوں پر ان کی ہیبت طاری ہو جاتی ہے۔ ایک اور تاریخی حوالہ کتاب "ٹائی پیگ" میں ملتا ہے جو ۹۷۶ء میں لکھی گئی تھی۔ "جس وقت ٹیانگ زین کونگ کے لشکر نے یانگ چاو میں بغاوت کر دی۔ اس وقت جتنے آدمی ہلاک ہوئے ان میں سے کئی ہزار مسلمان تھے۔ اسی سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ جب اس چھوٹے شہر میں مسلمانوں کی اتنی کثیر تعداد تھی تو سارے چین میں ان کی آبادی کس قدر ہوگی۔

چین کے حکمران خاندان ٹانگ نے بیرونی مسلمان سلطنتوں سے بڑے اچھے تعلقات قائم کرنے تھے اس کی ایک بڑی وجہ یہ تھی کہ خود دربار چین میں مسلمان شیر بڑی کثرت سے تھے۔ ان کی وجہ سے ہی خارجہ پالیسی ایسی بنی تھی کہ مسلمان سلطنتوں کے ساتھ خوشگوار تعلقات برابر قائم رہنے اور یہ باہمی مراسم اخلاق اتنے

چاؤ۔ ہولی چاؤ۔ نیاگنگ ناگنگ چاؤ۔ مگر جب لفظی ترجمہ کی طرف خیال کریں تو یہ "اشلام"۔ "اشلا"۔ "اسلام"۔ "اسلم" ہو جاتا ہے۔ معنوی لحاظ سے "واشفا" اور "واشفی چاؤ" کہلاتا ہے۔ عہد ناگنگ میں حضور سرور کائنات صلعم کو "مرو" یا "مخامو" اور "ناؤ" کہتے تھے۔ مگر اس کا صحیح ترجمہ ۱۲۴۸ء میں ہوا۔ کینٹن کی سچائی میں یہ اسم مبارک "مخامو" کی صورت میں کندہ ہے۔

یہ دعویٰ کہ اسلام بزرگشیر نہیں پھیلا اب کسی حجت کا محتاج نہیں رہا ہے اور اس کے بے شمار دلائل موجود ہیں۔ دودھ کیوں جائیں خود چین کی مثال لیجئے جہاں اسلام کو احترام کی نظر سے دیکھا جاتا ہے اور مسلمان عزت و وقار کی جگہوں پر فائز رہے ہیں۔ اس وقت بھی چین میں کروڑوں مسلمان ایسے ہوئے ہیں۔ بیکن اور شنگھائی میں بے شمار مسلمان موجود ہیں اور عزت کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔ میں اس سلسلہ میں خود اپنے ایک بزرگ کا واقعہ لکھتا ہوں۔

میرے یہ بزرگ ۱۹۲۶ء میں سرور شینگھائی سے تشریف لائے جو وہاں عرصہ سے مقیم تھے انہوں نے فرمایا کہ اس شہر میں مسلمان بہت اچھی حالت میں ہیں اور اپنی ترقی کے لئے کوشاں رہتے ہیں۔ یہاں بڑی بڑی مسجدیں بھی بنی ہوئی ہیں جو بہت خوبصورت اور صاف ستھری ہیں۔ یہاں مسلمانوں کے اپنے ہوٹل بھی ہیں اور علامت کے طور پر اپنے سائن بورڈ پر ایک کوزہ کی شکل بنا دیتے ہیں جس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اس ہوٹل میں حلال اشیائے خورد و نوش پیش کی جاتی ہیں ۱۹۲۳ء میں "تان کینگ" کی مرکزی مجلس میں بھی مسلمانوں کی کافی بڑی تعداد شریک تھی اور اس سے مسلمانوں کی سماجی حیثیت کا علم ہو سکتا ہے تعلیمی میدان میں بھی مسلمان کسی سے پیچھے نہیں اور ۱۹۳۳ء میں وزیر تعلیم مسلمان تھے اور چینی ترکستان کا گورنر بھی حلقہ بخوش اسلام ہو چکا تھا۔ موجودہ چین میں جب سے ماؤزے ناگنگ اور چوایں لائی کی قیادت مستحکم ہوئی ہے مسلمانوں کی سیاسی، فوجی، معاشرتی اور اقتصادی ترقی کی رفتار بڑی نمایاں رہی ہے اور امید ہے کہ اس میں اضافہ ہوتا رہے گا۔

کوئٹہ خان تھا اور وہ چین پر ۳۵ سال تک بڑی شان و شوکت کے ساتھ حکمرانی رہا۔ (وفات ۱۹۶۳ء) اس کے عہد میں سید اجل بخاری کا خاندان وزارت کے عہدہ پر فائز تھا۔ ان بزرگ کے طفلاً ہی کوئٹہ خان کا پوتا "آئندہ سلطان" والی فتلت اپنی ڈیڑھ لاکھ فون کے مسلمان بزرگ اور تقریباً سارے چینی ترکستان میں اسلام پھیل گیا۔ کوئٹہ خان کے بعد اس کا پوتا التجائی تو خان تخت چین پر جلوہ آرا ہوا جس کے اکثر امراء مسلمان تھے۔ اسی کے عہد میں وزیر رشید الدین فضل اللہ نے فارسی زبان میں اپنی مشہور تاریخ "سوامع التواریخ" تم تب کی۔ ان تمام سرگرمیوں سے پتہ چلتا ہے کہ مسلمان سیاسی اور سماجی لحاظ سے ترقی کی بڑی منزلوں تک پہنچ گئے تھے جس کا ایک ثبوت یہ بھی ہے کہ تقریباً ایک سو سے زائد مسلمان چین کی مرکزی حکومت میں بڑے بڑے منصبوں پر فائز تھے اور انش و فرہنگ میں بھی ان کا ایک ممتاز مقام تھا۔ چنانچہ اس دور کے عظیم مسلمان شاعر، ننگ فونالگ، کا دیوان آج تک چینی زبان میں موجود ہے اور شوق سے پڑھا جاتا ہے۔ مسلمان سیاست و ادب کے ساتھ فن تعمیر کے بھی دلدادہ تھے اور انہوں نے کئی اہم یادگار عمارات بنوائیں۔ ان تعمیرات میں سب سے ممتاز بنیاد شہرہ یکن ہے جس کا بانی بزرگ تھا۔ ملاحظہ ہو "سوامع التواریخ" رشید الدین فضل اللہ اس سلسلہ میں یہ بھی مناسب معلوم ہوتا ہے کہ چینی زبان میں اسلام اور مسلمان کے الفاظ کی بھی تحقیق کی جائے۔ یہ دونوں نام چینی زبان کے ہر دو میں مختلف رہے ہیں مگر مطلب ایک ہی رہا ہے۔ ان الفاظ کی کتابت میں بھی فرق پایا جاتا ہے اور اس کا صحیح تعین کبھی نہیں ہوا۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ چینی زبان میں اسلام اور مسلمان کے تلفظ و اطلاق نظر آتے ہیں مگر ان کو جس طرح بھی ادا کریں مفہوم ادا ہو جاتا ہے۔ اس اختلاف کی وجہ یہ ہے کہ بعض نے لفظوں کی صرف دیکھ کر اور بعض نے معنوں کا لحاظ کیا ہے۔ لوگ قوم کے لحاظ سے اس کا تلفظ کرتے ہیں اور معنی مراد دیتے ہیں۔ یہاں لفظ اسلام کا لفظی ترجمہ اور معنوی مطلب پیش کرتا ہوں۔ نسلی اعتبار سے اسلام کے یہ نام مشہور ہیں، ہولی ہولی

سُورَةُ خَالِدٍ وَنَوِيْدٍ مَسِيْحًا

کی
حیاتِ طیبہ پر

”مَالِئُو“

کا
شمارہ خصوصی

یہ شمارہ جولائی اور اگست ۱۹۶۳ء کا مشترکہ شمارہ ہو گا جو عیدِ میلادِ النبی کی تقریبِ سعید کے موقع پر

شائع ہو رہا ہے

”ہم نے تمہارے لئے رسول اللہ میں بہترین اسوہ اور
قابلِ تقلید مثال قائم کی“ (احزاب)

ملک اور بیرون ملک کے نامور علما کرام اور ممتاز اہلِ قلم کے مضامین نظم و نثر
روضہ مبارک کی رنگین شیبہ
مقاماتِ مقدسہ کی باصرہ نواز تصاویر۔

حضورِ سرورِ کائنات کی زندگی ہمارے لئے، اور کلِ عالم کے لئے
ہر عہد و زمانہ میں، ایک ایسی شمسِ راہ ثابت ہوئی ہے اور ہوتی
رہے گی کہ جس کی روشنی میں ہم دین اور دنیا کی ساری نعمتیں، فلاح
اور فیوضِ حاصل کر سکتے ہیں۔

ہمیں اس عہد میں روحانی بلندی اور دنیاوی برکات کے حصول میں، اسوہ نبویؐ کے روشن و انقلاب آفرین پہلوؤں کو اور بھی
زیادہ جاننے اور ان پر عمل کرنے کی ضرورت ہے۔ اس موضوع پر ماہنامہ ”کاشمارہ“ خصوصی بصیرت افروز اور ایمان پرور مضامین
نظم و نثر کی ایک سلسلہ مرقعہ پیش کر رہا ہے۔

یہ شمارہ خصوصی جو جولائی اور اگست ۱۹۶۳ء کی مشترکہ اشاعت ہے، جولائی کے وسط میں شائع ہو گا۔ قارئین اور
ایجنٹ حضرات نوٹ فرمائیں اور مطلوبہ تعداد ”مسیرت رسولِ نبی“ سے فی الفور مطلع کریں۔

ضمانت تقریباً دو سو صفحات، قیمت ۲ روپیہ

ای ایم مطبوعات پاکستان پوسٹ بکس ۱۸۳ کراچی

ماوشا

ستیمقدت نقوی (ملتان)

تو نہیں البتہ تصور میں باطن پرودہ سمیوں کی طرح فلمی نمائش کا سافقت
جھک گیا۔ بیباختہ زبان سے نکل گیا۔ دیتے ہیں دھوکا یہ بازی گر کھلا
واہ لے اہام و اشاریت کا کمال! بقدر۔ بائست راز دلی پر سہکا
سب دفتر کھلا، مگر غیر پر کچھ بھی نہ سرتا سر کھلا۔
- اک بزرگ ہمیں ہمسفر لے "خوب! چچا غالب اور امریکہ کی
سیرا اچھی سوچی! لطف آگیا۔ جیل نقوی صاحب اور آفاق صاحب
کو کس لئے شریک نہیں؟ کیلئے نہیں چرلے؟

غالب نمبر کے سطح میں آپ سے داد پائی۔ ہم تو
اس کوشش میں تھے کہ اسے اور بھی وسیع بناتے
مگر جتنکے صفحات اور لکھنے والوں کی کوتاہی
عارض ہوئی اس لئے جو کچھ دل دیا میتسرایا
حاضرین کی خیانت طبع کے لئے پیش کر دیا۔ اچھے
خوش ذوق حضرات نے اسے المان نعمت کا
مصدق سمجھا یہ ادارہ کس لئے باعث صد شکریہ۔
(مدیر)

رشید امجد دراولپنڈی

ماہ نومبر ۱۹۶۲ء میں میری مبلوہ لوک کہانی "لہ سے
متعلق سلیم خاں لکھی صاحب نے بعض بحثات کے بعد فرمایا ہے کہ لہ
لوک کہانی نہیں بلکہ مضمون ہے۔
غالباً معترض نے لہ کے شروع میں دئے ہوئے نوٹ کو
بغور نہیں پڑھا۔

لوک کہانی کا رابطہ عوام سے ہے اور لوک کہانی کہنے
والے لغت وال، مؤرخ یا محقق نہیں ہوا کرتے بلکہ جو سننے والے

فرونی کا پرچہ ملتا تھا۔ پڑھا، دل خوش ہو گیا، بیباختہ داد
دینے کو چاہا۔ اس کے توپور غالب نمبر بنا دیا ہے۔ اللہ کے جوش
عمل اور زیادہ! عنوان نرالی، مضمون انوکھے، نظمیں لاجواب، شمارہ
دامی دل می کشد کہ جا اینجا است کا مصداق! مولانا تہر کا مضمون
مشعل راہ کا کام دے سکتا ہے۔ واقعی ہمیں یہ پہلو بھی نظر انداز نہیں
کرنا چاہیے کہ غالب نے اسلاف کے سرمایہ سے کیا فائدہ اٹھایا اور
اس پر کیا اضافہ کیلئے۔

مالک رام صاحب کو "مولانا آزاد بنام غالب" اچھا مضمون
سوچا.... مگر پہلو دار جملوں سے ذمہ کی پہلو کیوں بھالا جائے۔
"نظر اپنی اپنی خیال اپنا اپنا۔ ہم کیوں کسی کی نیت پر حملہ کریں۔ اگر یہی
بات ہے تو آجیات میں اس پہلو واری کا شکار کون نہیں ہے مولانا اللہ
کے خلوص میں شک کی گنجائش نہیں، غالب کی وفات پر قطعہ جاریج اس پر
دال ہے جو غالب اگر وہ یا دہلے کسی اخبار میں شائع ہوا تھا اور پھر اس
دور کے حالات، تہذیب، ذہنی افتاد اور تاریخی عوامل کو سامنے رکھ کر
دیکھا جائے تو مولانا آزاد نے حقیقت کے خلاف نہیں لکھا ہے۔

آزاد کا مرتبہ اس سلسلہ میں اس لئے بلند ہے کہ مولانا آزاد ہی
کے تذکرہ نے مولانا حالی کو یاد دہکا غالب لکھنے کی طرف متوجہ کیا۔
مولانا حالی نے تذکرہ آزاد سے کماحقہ فائدہ اٹھایا ہے۔ ہمیشہ بتائیں
آجیات ہوتے ہی گئی ہیں۔ رہا زبان کا معاملہ تو مرزا کی زبان پر
دلی والوں نے ہمیشہ ناک بھوں چڑھائی ہے۔ حالی یادگار میں زبان
کے مسئلہ کو بالکل ہی گول کر گئے ہیں۔ اگر زبان کے متعلق انہیں لکھنا پڑا
تو وہ بھی دلی کی حادراتی زبان سے غالب کی زبان میں دیکھاتے۔
... "مجموعہ باز خیال" کی گنجھ بازی نے نہ معلوم کتنی محفلیں
برسم کردیں، نہیں، بلکہ پیش کردیں۔ نیز گنگ یک تنہا نہ کی رون گردانی

انہیں آئندہ فسول کو سنا دیتے ہیں۔

میں نے بھی اسے جس طرح سنا، لکھ دیا۔ میں نے یہ لوگ کہانی تحریر کی ہے کوئی مضمون یا جواب "نمون" نہیں لکھا۔ اگر میں ایسا کرتا تو نہ صرف اللہ کے نام سے متعلق بلکہ اس کی تاریخ پیدائش و وفات کے بارے میں بھی بحث و تحقیق کرتا۔

دنیا کی بیشتر لوگ کہانیوں سے متعلق اختلاف رائے ہے۔ اللہ ہی کو لکھیے۔ "تذکرۃ العارفین"، "اسرار الابرار" تاریخ کشمیر، "تاریخ کشمیر"، تاریخ جدولی کشمیر میں اس کے متعلق حوالے ملتے ہیں۔ منشی محمد الدین فوقی (مروج) نے بھی اپنی کتاب "لذکارہ" میں تفصیلاً ذکر کیا ہے۔ لیکن تذکرہ نویس اس کی تاریخ پیدائش و وفات سے متعلق بالو خاموش ہیں یا اختلاف رکھتے ہیں۔ آج تک یہ نہیں چل سکا کہ اللہ مسلمان تھی یا ہندو کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ اللہ نے سید حسین سمٹائی کے ہاتھ پر اسلام قبول کر لیا تھا۔ ایک نظم میں مشہور اوہلئے کرام اور عارفان حق کے ساتھ اللہ کا ذکر بھی موجود ہے:

ازاں حمد لائے عارف
کہ اسرار حق را بود کاشف
ز سید حسین منفعت یافت
سوئے مرکز صدق بشاخت

لیکن اکثر تذکرہ نویسوں نے اسے ہندو ہی لکھا ہے۔ اسی طرح اللہ کے نام کا مسئلہ ہے۔ فوقی نے اس کے کئی نام لکھے ہیں مثلاً اللہ دو، اللہ شوری، اللہ ایشوری، اللہ عارفہ، وغیرہ۔ معلوم نہیں اس میں کونسا نام درست ہے۔

لہذا کہہ کر دراصل ہندوستان میں معاشرت کی نمائندگی کرتا ہے اور یہ کہانی علامتی ہے اور اس لئے سنائی جاتی ہے کہ عورتوں میں فرماں برداری اور فرض کا احساس پیدا ہو۔

لہذا اس کے ظلم صرف اسی لئے برداشت کرتی ہے کہ وہ اس کے شوہر کی ماں ہے۔ کیا کسی ایسی بیوی سے جو ساس کی اتنی عزت کرتی ہو یہ توقع نہیں کی جاسکتی کہ وہ اپنے خاوند سے بھی

بے پناہ محبت کرتی ہوگی۔ سمجھ میں نہیں آتا بیوی کا خاوند کے گھر میں بازو حائل کرنا کیوں قابل اعتراض ہو؟

اسی طرح چاولوں کی طشتری میں پاٹ کی موجودگی سے متعلق میں اتنا ہی عرض کر سکتا ہوں کہ کہانی اسی طرح سنی ہے۔ اگر پاٹ اللہ کے مسح کرنے ہی دیکھا تو اس سے کہانی کے پلاٹ پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔

شاہ ہمدانی کا نام محمد الدین فوقی نے سید علی ہمدانی لکھا ہے (لذکارہ، "تذکرۃ العارفین"۔ فوقی: صفحہ ۸۸)۔

مختصر یہ کہ اللہ صرف لوگ کہانی ہے اور اسے اسی طرح سنا دیا گیا ہے یہ کوئی تحقیقی چیز نہیں ہے۔ رہ گئی اس کی ترویہ لیکن پریوری اترتی ہے۔ اس میں تقدیر عروج و خیرہ موجود ہے۔ ہذا سے افسانہ ہی کہنا زیادہ موزوں ہے۔ مدیر ماہ تو نے بھی سے ترتیب دینے ہوئے افسانہ ہی لکھا ہے:

آپ کا خط کچھ عرصہ سے ہمارے پاس محفوظ تھا اور اب شائع کیا جا رہا ہے جس میں آپ نے کئی صاحب کے کچھ اعتراضوں کا جواب دیا ہے۔ یہ ظاہر بہ بحث طوالت طلب نہیں معلوم ہوتی اور آپ کا یہ موقف کہ اللہ محض ایک، لوگ کہانی ہے اور اسے ایسا ہی سمجھنا بھی چاہیے، درست معلوم ہوتا ہے۔ بہت سی لوگ کہانیاں تحقیق اور زندگی کی خوردبین کے نیچے اگر جزئیات میں پرآئندہ نظر آتی ہیں اور تاریخی شواہد کی آنکھ تو انہیں اور بھی زیادہ گھٹلا دیتی ہے اس لئے ان کا متن بس یہی ہے کہ انہیں اساطیر الاولین کے ذیل ہی میں رہنے دینا اور جو راوی اسے جس طرح بیان کر دے، سن لیا جائے تاکہ حکایت بے فرائد نہ ہو۔

(مدیر)

مرگِ شوکت: — ”حقیقی معنوں میں ایک قومی سانحہ۔“
 — ”مجھے ان کی وفات سے بھرپور درد پہنچا ہے۔“
 — ”ان کی خدمات ناقابلِ فراموش ہیں۔“
 (صدر پاکستان)

وہ عدم کے پہاڑ سے چلا گیا۔
 وہ اپنے چچے، کچھ یادیں اور اپنی کچھ باتیں چھوڑ گیا۔ مگر سقدہ تمام۔ شاید ناقابلِ تمام۔
 ایک مشاق صفائی، ایک بے ہوش، اور شکر منگل دوست ہم سے جدا ہو گیا۔ اور کیسے وقت!
 اس کی ادنیٰ شہرت ”سودیشی ریل“ سے شروع ہوئی اور پھر تو اس کے ہاں دھماکا کھلانے والے قلم نے مضامین قلم کے ایسے ٹوہ فوٹا نہلا گئے
 کہ اس کی سودیشی ریل بھی بہت پیچھے رہ گئی۔ وہ قاضی جی بنگر بھی آیا اور ہر شام کی کیا ادائیں دے دکھا گیا۔ اس کی باتیں یاد رہیں گی،
 اس کی ہنسانے والی باتیں ہمیں کی کیا دُر لائیں گی۔

اب میں ظرافت سب سے ڈیرھی کھیر ہوتی ہے اور اگر آدمی یہ حس قدر کا لیکر پیدا نہ ہوا ہو تو اسے نبھانا مشکل ہو جاتا ہے اور آدمی اگر
 نکھتا ہی رہے تو خود اک احمق کہ بن جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے ہاں اس صنف میں ممتاز مقام پیدا کرتے والے چند ہی نام نظر آتے ہیں۔
 افسوس کہ یہ کھینچ پکھینچ جس قدر جلد پیدا ہوتی تھی، اتنی ہی جلد ختم بھی ہو جاتی۔
 فرحت اللہ بیگ گئے، عظیم بیگ چغتائی پر وہ کر گئے۔ پطرس، حسرت، مجید، سائل، — غرض کس کس کی یاد اس وقت نہیں
 آ رہی ہے، اور آج ہم شوکت کا پڑ سادے رہے ہیں، اُس شوکت کا جو ساری عمر ہمارے سامنے نشاط و فکر، تبسم اور قہقہوں کی دولت لٹاتا
 رہا۔ آج ہم اس کا قرض چکا بھی رہے ہیں تو آنسوؤں کے خراج سے! زندگی کا یہ نہر خند بھی کیسا قاتل ہے!

شوکت تھانوی (— آہ — مرحوم!) کے پسندیدگان کے ساتھ ادارہ ان کے غم میں شریک ہے اور اپنے دلی تعلق
 اظہار کرتا ہے (ادامہ)

” نوائے دوش“ بقیہ منہ

یوں کہینا ہے

بہ کثرت ریا حین و گل ہلے رنگیں
بہ افراط شمشاد و سرو و صنوبر
درختوں پہ پھل اور پھلوں پر پرندے
زمین پر دھبے دیتی ہیں ٹہنیاں سر
ہوئے ہیں مگر چھپے سنتے سنتے
شب و روز و صبح و مساؤش گل کو
ہر اک قطعہ پھولوں کے تختے کے تختے
ہر اک حوض پانی کی چادر کی چادر
تعالی اللہ فواروں کی سر بلندی
کہ قطرے بنے انجم چرخ چنبر
فواکہ اگر کھائیے رزق طیب
شگوفے اگر سونگیئے مشک و عنبر
سنے ہوں گر اوصاف جنت کے قلم نے
اسی کا نمونہ تھا روئے زمین پر

نذیر احمد طنز و مزاح میں اپنا جواب نہیں رکھتے تھے۔ ان کی
یہ خصوصیت ان کی شاعری میں بھی موجود ہے۔ یوں تو ہر نظم میں ایک اور
”شوخی“ شعر موجود ہے، لیکن مندرجہ ذیل مختصر نظم سے نذیر احمد کے
کلام کا یہ پہلو بڑی خوبصورتی سے واضح ہوتا ہے، یہ نظم سینٹ آلفین
کالج دہلی کے کسی جلسے میں پڑھی گئی تھی :

آؤ دیکھو شش کے رنگوں نے جھولتے جھولتے بڑھائی پینگ
سب کو جلسے میں کھینچ بلوایا اس کو شیخی قرار دیا ڈینگ
یعنی پھروں میں کتنے بوسے ہیں آن شامل ہوئے کٹا کر سیگ
جو بیکپر ہے اپنے گھر جا کر اس کو چاٹا کرو لگا کر ہینگ
اس مختصر سے مضمون میں نذیر احمد کا ان کے ماحول
سے موازنہ کرنے کی کوشش نہیں کی گئی ہے۔ اس کی ضرورت
بھی نہیں، اس لئے کہ نذیر احمد کی شاعری موازنہ و مقابلہ کی متعل نہیں
ہو سکتی۔ یہ صحیح ہے کہ وہ بڑے شاعر نہ تھے، لیکن یہ صحیح نہیں کہ
ایک بڑے ادیب کے ذہنی رجحانات کو سمجھنے کے لئے اس کی شملہ
کو وہ اہمیت نہ دی جائے جس کی وہ مستحق ہے :

” اک طرف تماشا تھی“ بقیہ منہ

لطف کی ان سے التجا نہ کریں ہم نے ایسا بھی کیا، نہ کریں
دل نہ لگے گا جوان سے ملنا ہے لب کو شہر مندہ دعا نہ کریں
حسرت نے غزل کے میدان میں وزیر، صبا، امانت اور
فلق کی ہم قدمی سے اپنے ادبی سفر کا آغاز کیا۔ ادھر معاشرہ میں
دراخ اور امیر جیسے اساتذہ بھی موجود تھے جن کا کلام پیش نظر رہتا
تھا، مگر غزلوں میں ان کا سفر آگے بڑھتا گیا غزل میں ایک نئی راہ نکالی
اور مضامین تازہ کے ایسے نمونے پیش کئے کہ اردو غزل میں ان کا ایک
منفرد و ممتاز مقام پیدا ہو گیا جسے رنگ حسرت کہنا بالکل بجا ہے۔
ان کی غزل میں عشق، خلوص، معصومیت، درد مندگی اور سپردگی
خاص طور پر نمایاں ہے۔ فراق کا یہ کہنا کہ حسرت اپنے پیشروؤں کے
انداز بیانی و وجدان اور فنی شعری انتہا تکمیل ہے، کوئی مبالغہ نہیں
ان کی حبشیات کا یہ رخ بھی اک طرف تماشا ہی ہے کہ

جیل میں کافی طویل زمانہ گزارنے کے باوجود انہوں نے کلام پر
اس کا کوئی براہ راست اثر پیدا نہیں ہونے دیا۔ چند اشعار کو چھوڑ
کر ان کے کلام کے تیور اور انداز بیان ایسا ہے کہ اسے جس فنک
کی دین نہیں کہا جاسکتا۔ غزل سے ان کی شیفنگی مشہور تھی اور
وہ اسی رنگ میں کہتے رہے۔ سب سے بڑی بات انہوں نے
یہ کہ غزل کو درباریت کے رنگ سے آزاد کیا اور واردات
دل کی شرح و بیانی کو ہی اپنا شیوہ سخن بنایا جو ان کے عشق اور
خلوص و نیاز کا ایک آئینہ مصفا معلوم ہوتا ہے۔
غرض حسرت کی زندگی کے کسی پہلو کو بھی دیکھیں ایک
انفرادیت اور انوکھا پن اس میں ضرور نظر آئے گا، خواہ وہ
سیاست کا خازن رہا ہو یا شعر کا گلستاں :

عالم یکتہ جستجو: ————— بقیہ صفحہ ۱۳

دو رخ سے دو رخ (چھاپہ) بنا اسی سے انگریزی (DAUGHTER) ڈاٹر
ہے جس کی املا میں غ کی آواز (uH) موجود ہے مگر تلفظ سے ساقط
ہو چکی ہے۔ رخ کا تبادلہ رخ سے بھی ہوتا ہے دو رخ سے دو رخ بنا ہے
علامت تائید "ٹیک" لگا کر پہلے دو رخ تک بنا، اس کے بعد دو رخ تک
دو رخ کی شکل اختیار کی مگر اس کے معنی میں ذرا تغیر آیا ہے، یعنی
دو رخ صرف نوجوان لڑکی کے لئے مخصوص ہے۔

ہماری موسیقی

موتیہ: رفیق خاور

نئے موضوعات کا اضافہ

پاکستانی موسیقی کے موجودہ مسائل

ساز و آہنگ کی دنیا میں مسلمانوں کا عظیم حصہ

مسلمان فنکاروں کے اعزازات موسیقی، تمدن و تاریخ انسانی میں لغت و آہنگ لکھنے کی کارکردگی اور ادائیگی۔

چند موضوعات

مشاہیر موسیقی: امیر خسرو، سلطان حسین شرقی، میاں تان سین، شاہ عبداللطیف جٹائی، نرس خاں، سہیل خان، فیروز خان

تاریخ موسیقی: موسیقی اور تہذیب عالم موسیقی میں مسائل کا حصہ، پاکستانی موسیقی، ہماری موسیقی کے ساز

پاکستانی موسیقی: مشرقی پاکستان کے لوگ، گیت، رنگ و روپ (وارث شاہ)

مسائل موسیقی: تجدید موسیقی، فنی نوازے کی موسیقی اور سرگم، ہماری موسیقی کے مسائل، سرفروسی۔

چند ممتاز اہلکار

سید عابد علی، عابد، جناب شاہد احمد دہلوی، جناب خادم

محمد الدین تاجو، احمد میاں اختر، جونا گڑھی، ڈاکٹر نبی بخش خان

بلوچ، فیروز نظامی، سید شہلہ آغا، سجاد سرور، نیازی، احمدی

چاگلا۔ سید امجد علی، عاصم حسین، امین الرحمن، رفیق غریبی

اور ماہر آدم آذادی۔

کتاب میں مختلف سازوں کی آرٹ پر بھی ہوتی آٹھ صفحے

کو انھیں تصاویر بھی شامل ہیں۔ کتاب نفیس اردو ناسپ

میں نہایت دیدہ زیب اور خوبصورت سرورق کے ساتھ

شائع کی گئی ہے۔ قیمت صرف پانچ روپے

ادارہ مطبوعات پاکستان پوسٹ بکس ۳۵۳ کراچی



رحمت
یا رحمت؟

یہ صفائی کے استعمال پر منحصر ہے!

خون میں سرایت کئے ہوئے فاسد مادے برسات
میں پھوڑے پھنسی بن کر نمودار ہوتے ہیں۔ ان موکی
عوارضات سے محفوظ رہنے کیلئے صفائی استعمال کیجئے۔
یہ خون کی صفائی اور تقویت کا بہترین ذریعہ ہے۔

صافی

برسات میں صحت و عافیت کیلئے



خون صاف
کرنے کی
قدرتی دوا



بہررد دواخانہ (وقف) پاکستان
کراچی - ڈھاکہ - لاہور - چٹاگانگ

تین عہد

- آپ کو ہر شب اپنے ضمیر سے یہ سوال کرنا چاہئے کہ دن بھر میں آپ نے پاکستان کیلئے کیا کیا۔ پھر اس جواب کا موازنہ کر کے یہ دیکھنا چاہئے کہ آپ نے جو کچھ کیا وہ آپ کی شان کے شایان بھی تھا یا نہیں؛
- پاکستان کے نظریاتی بنیادیں اپنے تمام قلبی، ذہنی اور روحانی وسائل وقف کر دیجئے۔ تاکہ ہم اس موقع سے جو قدرت نے عطا کیا ہے۔ فائدہ اٹھانے میں پیچھے نہ رہیں۔
- پاکستان کے مالی بینکوں میں اپنی پس انداز کی ہوئی تمام رقمیں اور منافع جمع کیجئے تاکہ وہ عظیم ترقیاتی منصوبے جو اس وقت زیر تجویز ہیں آسانی سے پایہ تکمیل کو پہنچیں۔ اور آنے والی نسلیں زیادہ خوشحال، مسرور اور پرسکون زندگی محظا ر سکیں۔

یونٹ انقلاب کی دوسری سطر کے موقع پر

صدر پاکستان فیملڈ مارشل محمد ایوب خان کا قوم کے نام پیغام

ان مخلصانہ عہدوں میں جو منصب العین پیش کیا گیا ہے اسے رو بہ عمل لانے کیلئے نیشنل بینک آف پاکستان نے اپنی بہترین کوشش صرف کی ہے۔ اسے توقع ہے کہ سارے ملک میں ۲۹۷ دفاتر بچت کی جو سہولتیں فراہم کر رہے ہیں عوام ان سے پورا پورا فائدہ اٹھائیں گے۔

منظور شدہ، مادی کردہ

اور اقرا ری اصل سرمایہ

۱۰۰۰ روپے

اداشدہ سرمایہ

۱۰۸۰۰۰۰۰۰ روپے

محفوظ رقم

۳۰۰۰۰۰۰۰ روپے

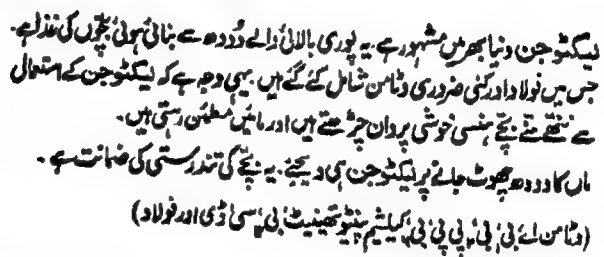
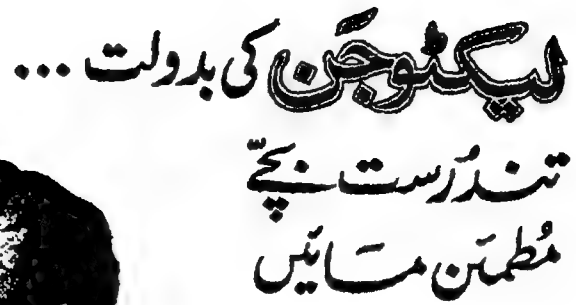
رقوم امانت تا ختم جون ۱۹۶۳ء

۵۰۰۰۰۰۰۰ روپے



نیشنل بینک آف پاکستان

ہیڈ آفس :- بندر روڈ - کراچی



جَبَ مَاں کا دودھ کا رگڑ نہ ہو تو لیکٹوجن پر سہروسہ کیجئے

نام _____
 پتہ _____
 کتاب مفت حاصل کرنے کے لئے اس کو پُر کیجئے اور ڈاک خرچ
 کے لئے چھپیس پیسے کے ٹکٹوں کے ہمراہ اس پتہ پر روانہ کیجئے۔
 نیسلر پروڈکٹس پوسٹ بکس ۲۹۶۲-۱۵ ویسٹ وارٹ روڈ۔ کراچی
 LAC.1 63

یہ خوشنما اور آرام دہ لباس



بنوں اور ہرنائی کے اُونی پارچہ جات سے بنے ہیں

ان کا ہریشہ اور ہر بافت گر مائی پہنچاتے ہیں اور ہر ڈیزائن جدید فیشن کے تقاضوں کو پورا کرتا ہے

مردوں، عورتوں اور بچوں کے اونی لباس
کے لئے عمدہ ڈیزائن اور دلکش رنگ انتخاب کیجئے۔

ادور کوٹنگ، ویلور، بلیزر کلاٹھ، کمبل

اب ہرنائی ورسیٹڈ اور سوئنگ بھی جدید ترین ڈیزائنوں میں دستیاب ہیں۔

مغربی پاکستان بھر میں مقررہ ڈیلروں سے خریدیے۔

مغربی پاکستان صنعتی ترقیاتی کارپوریشن

۶	سیلاب اکبر آبادی (مرحوم)	روکش منزل (نظم)	یہ یاد قائد اعظم:
۷	یوسف عبداللہ	"طرح بلند مشرب تالیف" (مقالہ)	
۱۰	عبدالغنی شمس	منزل آشنا (نظم)	
۹	منظر صدیقی	حسن فیضان (نظم)	
۱۱	انور سعید گیلانی	حسن کلام آئینہ (صدر پاکستان: تازہ فرمودات پر ایک نظر)	مسائل امروز:
۱۳	الطاف پرواز	مسافران شب (دور حاضر) (نظم)	
۱۵	احسان اللہ دانش	افق تاب (صاحبزادہ سر عبدالقیوم، مرحوم) احسان اللہ دانش	اکابر ملت:
۱۸	احمد فراز	افسانہ، ڈرامہ، پوختا تار: اے روشنیوں کے شہر! (ڈرامہ) احمد فراز	
۲۹	اللہ بخش راجپوت	جنگل جنگل، پریت پریت (مشرقی پاکستان: پہاڑی علاقے میں ایک اور یادگار سفر)	
۲۶	لفٹیننٹ کرنل خواجہ عبدالرشید	جہاں میں تھا، ایک تاثر	
۳۳	وجاہت حسین سوئی پتی	ایسا لگاں نہ تھا (انسان)	
۳۷	طاہر احمر	سوندھی مٹی	ثقافت:
۴۵	سیدنا ہد الرحیم	ستارہ مشرق (سید حافظ حسین، ایک تعارف)	فن:
۴۲	اقبال نبوی	کالی گرم (سابق صوبہ سرحد)	مقامات:
۴۰، ۴۱	حشم لکھنوی	جمیل نقوی • عبداللہ قادر • شیدائے اجماع • حشم لکھنوی	غزلیں:
۴۸	مصباح الحق	جام ادب جم اور حقوق انسانی	گرہ درمیش:
۵۲	ر-خ	اپنا نہیں وہ شیوہ	فیچر:
۵۷	صغریٰ ربانی	قائد اعظم (رنگین نقش)	نئی مطبوعات:
			سرورق:

روکش منزل

(قائد اعظم بارگاہِ باری تعالیٰ میں)

سیاح اکبر آبادی (محل)

باری تعالیٰ :

باری تعالیٰ :

ہم نے دنیا میں مٹانی جاؤ ملت دی تھے جو رفیع اہل شہرت تھی وہ شہرت دی تھے
اک نئی جوت مٹا کی اگر اچھوتا تھا اک بڑی قوت بغیر علم و حکمت دی تھے
مشرق و مغرب ترے انکسار سے عجب تھے خود معلم بن کے تعلیم سیاست دی تھے
صرف پاکستان ہی تھکوا نہیں بخشا گیا پاکیت پاک طینت پاک سیرت دی تھے
قائد اعظم تھے سارا جہاں کہنے لگا کاروانِ اہل ملت کی قیادت دی تھے

ملتِ مرحوم کا ہم توں بہا دیں گے تھے تیرے ایثارِ مسلسل کا صلا دیں گے تھے
خونِ ناسق سے رنگے جن و شہید نے لپٹا کیا آل ان کا ہوا یہی بتا دیں گے تھے
تھکوا تائیچ نہ جان نو تھکا سکتی نہیں اویں پاکستان کے فتنے بھی مٹا دیے تھے
اب چلیاں رگدڑ ہوں گے نقوشِ پاترے ہم منارِ کشنی منزل بنا دیں گے تھے
قوتِ عزم و عمل بخشیں گے تیری قوم کو دماغے دل بقدرِ اتحاد دیں گے تھے

اب جو ہو کر فائزِ منزل یہاں آیا ہے تو

حال بھی روشن ہے پاکستان کا، مستقبل بھی

پیشکش کو کیا ہمارے سامنے لایا ہے تو؟

اس کو استحکام بھی قسمت ہے استقلال بھی

قائد اعظم :

قائد اعظم :

ہر ہیئت بہ درگاہِ خدا لایا ہوں میں امتِ ختمِ میل کا شکر لایا ہوں میں
اپنے کا فوری کفن کے گوشہِ محد میں خون بھر کر ملتِ ظلم کا لایا ہوں میں
پیش کرنے کے لئے منجانبِ قوم ضعیف استغاثہِ مشعلِ برخوں بہا لایا ہوں میں
ذفرِ مستقبلِ ملت ہے شایانِ کرم دستخاک کو محضِ اہل و فالایا ہوں میں
دستِ لرزاں میں میرے نقشہ ہے پاکستان اور اس کے ساتھ ہی یہ التجایا ہوں میں

میں ہوں یا ملتِ تنگ دامن تیری محنت میں اپنے چلنے کا اب تھکوا دورا بھی غم نہیں
اب میری پی قوم پسند نہ کو دتا ہوں پیا ہے یہ وقتِ شادمانی موقعِ ماتم نہیں
کلِ نفیرِ تحفے والے کیوں ہیں بھر پور خوا میرا جانا خلافتِ فطرتِ عالم نہیں
زندگی نو دماغوں میں چلی چاہئے یہ قنوط و یاس شلیلین بنی آدم نہیں
میں کا مسلک اس کا نصب العین لاؤ جو ہے تم میں گویا تھی قائد اعظم نہیں

بسکہ ہے آغازِ تیرے ہاتھ اور انجام بھی

گر نہیں قائد نہ ہو، کوئین کا آقا تو ہے

سلطنتِ دی ہے تو اب دے اس کو استحکام بھی

نندہ دہاتی خدا ہے اعظم و اعلا تو ہے

طبع بلندے، مشربِ نلبے

(بیاد قائد اعظم)

یوسف عبد اللہ

ظاہر ہے کہ مسلم لیگ کی تنظیم اس وقت کس قدر ناقص تھی اور مسلمانوں کو ذرا بھی علم نہ تھا کہ اس کا پروگرام کیا ہے، بلکہ سچ پوچھا جائے تو اس کا سرے سے کوئی پروگرام تھا ہی نہیں اور تھا بھی تو بالکل بملے نام اور اسے کوئی بھی کار نمایاں دکھانے کا شرف حاصل نہ تھا۔

غرض وہ سیاسی جماعت جس سے یہ توقع کی جاتی تھی کہ مسلمان ہند کی قیادت کا حق ادا کرے گی، اس کی کیفیت یہ تھی اور جب سربراہ کی یہ حالت ہو تو تقویر کیا جاسکتا ہے کہ خود مسلمانوں کا حال کیا ہوگا۔ جن کا شیرازہ بری طرح درہم برہم تھا۔ جو صلیبست، حالت زبول، امید موہوم۔ یہ دل شکن حالات تھے جب قائد اعظم نے ان کی قیادت کا بار امانت اٹھانے کا فیصلہ کیا۔

اس قیادت کے نتائج بھی جلد مرتب ہونے شروع ہو گئے۔ نواب اسماعیل خان ان کے معادن کا رستہ۔ ان کی بہترین خوبی ان کا اعلیٰ اخلاقی کردار اور حسن نیت تھا۔ انہوں نے قائد اعظم کا ہاتھ بٹایا اور مسلم لیگ کی کاپالپٹ ہو گئی۔ یہاں تک کہ ۴۰ء میں اس کا ایک معین مقصد ایک واضح سمت متعین ہو گئی مسلمانوں کے دل میں ایک دلولہ تازہ پیدا ہوا اور ان کی از سر نو تنظیم معرضِ بل میں آئی۔ بیوردی نکلس کے الفاظ میں صورت حال یہاں تک پہنچ گئی تھی کہ قائد اعظم مسلم لیگ کو جیسے اور جس طرف بھی چاہتے لے جاسکتے تھے۔ ایک موقع پر قائد اعظم نے فرمایا:

"میرے دس گروڈم مذہب میرے اور صرف میرے کہنے پر دائیں بائیں، سامنے، پیچھے، غرض جودھر بھی حکم دیا جائے، جانے کو تیار ہیں" اور یہ بالکل سچی بات اور تسلیم شدہ حقیقت تھی۔ اس زبردست عوامی عقیدت سے بابائے ملت نے بڑا تعمیری کام لیا۔ سب سے پہلے انہوں نے پوری ملت کی شیرازہ بندی

بابائے ملت، محمد علی جناح کی شخصیت میں چند باتیں خصوصیت سے نمایاں ہیں۔ ان کی زبردست ذہنی توانائی، ان کی وسیع النظری اور بلندی کردار۔ یہی خصوصیات ہیں جن کی وجہ سے وہ تاریخ کی عظیم ترین ہستیوں میں شمار ہوتے ہیں۔ صرف اپنے کارہائے نمایاں ہی کی وجہ سے نہیں بلکہ اس لئے بھی کہ وہ خود کس قدر بزر عظمت تھے۔

یہ حقیقت ہے کہ ہمارے بابائے ملت بڑی ہی اعلیٰ درجے کی قیادت کی خوبریں سے بہرہ ور تھے۔ اور ان کی تنظیمی صلاحیت تو بے پناہ تھی۔ چنانچہ جب ۲۳-۱۹۱۹ء میں تحریکِ خلافت ناکام ثابت ہوئی اور مسلمانوں کا کوئی ایسا رہنما نہ رہا جسے حقیقی معنوں میں سربراہ ملت کہا جاسکے تو برطانوی استعمار پسندوں کو ملے دے کر یہی بے نصیبت قوم نظر آئی جسے وہ اپنے غیظ و غضب کا تختہ مشق بنائے۔ یہ وہ دن تھے جب قائد صحتی نے مولانا محمد علی کو بری طرح کا وادیا تھا۔ اور وہ یوں کہ فروری ۲۲ء میں چوری چوڑا کا مشہور واقعہ پیش آیا۔ قائد صحتی نے اسی کو بہانہ بنا کر تحریک کو واپس لے لیا، اور پھر لگے کانگریس کی قیادت کو مسلمانوں پر زبردستی مسلط کرنے۔

مسلمان، قدرتی طور پر اس تحریک کی ناکامی سے بہت ہی بد دل اور مایوس ہوئے۔ یہ بد دلی و مایوسی دوسری دہائی کے آخری دنوں اور تیسری کے شروع میں انتہا کو پہنچ گئی۔ اس لئے انہوں نے یہی مناسب خیال کیا کہ وہ زندگی کی اصلیتوں سے روگردان ہو کر ملکی مسائل و معاملات سے الگ تھلگ رہیں۔

وہ پُر خلوص مسلمان جنہوں نے مولانا محمد علی کا سیاسی انجام دیکھا تھا، کانگریس سے کنارہ کش ہونے لگے یہ بڑا نازک مرحلہ تھا بڑا آٹا وقت تھا، جب ۳۰ء میں قائد اعظم نے مسلم لیگ کی بنیاد قیادت اپنے ہاتھوں میں لی۔

کی اور ان کو اس طرح راہ عمل پر لگایا کہ وہ "راہ مختصر" کے وسیلے سے اپنی منزل تک پہنچ سکیں۔ چنانچہ ۲۳ مارچ ۱۹۰۷ء کو یہ منزل طے ہو گئی اور کاروان ملت اس طرف روانہ ہوا اور صرف سات سال کی قلیل مدت میں منزل کو چالیا۔

واضح رہے کہ قائد اعظم کے ہاتھ میں کمال آواز کی طرح کوئی بے اندازہ قوت نہ تھی جس کا وہ جیسے چاہیں استعمال کر سکیں۔ ان کے ساتھ بہارک یا ہنٹن برگ کی طرح کوئی لشکر چڑا بھی نہ تھا۔ پھر بھی وہ اپنا نصب العین حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے، جیسے لوگ ناممکن خیال کرتے تھے۔ بیشک انہوں نے تاریخ کا رخ بدل دیا۔ بلکہ ایک برجستہ بات تو یہی ہے کہ قائد اعظم نے تاریخ کو تخلیق کیا۔ بے شک وہ ایک بہت بڑے سیاست دان، صاحب تدبیر قائد اور بے اندازہ تنظیمی صلاحیت کے مالک سربراہ تھے۔

مگر ساتھ ہی یہ بھی حقیقت ہے کہ قائد اعظم ایک بہت بڑے حقیقت پرست بھی تھے اور وہ اسی وجہ سے بڑے ٹھنڈے دل کے ساتھ، منطقی و استدلال سے کام لیتے ہوئے بالکل درست نتائج تک پہنچتے تھے اور حالات کا صحیح ادراک کر کے نہایت صحیح نکات اخذ کرتے تھے۔ یہی عظیم صلاحیت تھی جس نے انہیں خواب و خیال کی دنیا میں گم ہو جانے سے باز رکھا اور ہمیشہ زندگی کی کڑی اصلیتوں پر نظر رکھے اور ان سے روبراہ ہونے کی تحریک دلائی۔

اس سے پہلے سید احمد شہید بریلوی تھے، جنہوں نے سابق پنجاب و صوبہ سرحد میں مسلمانوں کی آزادی کے لئے بلی و بھڑکی کے ساتھ جہاد کا علم بلند کیا تھا، اور ان میں اپنے نصب العین کی جدوجہد کے لئے بڑا عظیم جذبہ ابھرا تھا۔ لیکن ان کی تحریک نے قوم کے نوجوان افراد کو اپنی طرف اس قدر راغب نہ کیا تھا جیسا قائد اعظم کی دولہ انگیز قیادت نے کیا۔ یہ تاریخی حقیقت ہے۔ اور آپ جانتے ہیں کہ قوم کا نوجوان و فعال اور باشعور طبقہ ہی کسی ایسی عظیم تحریک کا اصل روح و رواں اور پشت بنا ہوتا ہے۔ پھر اس کے بعد سر سید احمد خان کی تحریک نے قوم کو جدید راہ عمل دکھائی، ایک تمام تر جدید تحریک۔ انہوں نے حالات کے تقاضے کا صحیح ادراک کیا اور بھلائی و لوکیت سے فوراً کوئی جنگ نہیں چھیڑی بلکہ حالات سے مفاہمت کو ہی تدبیر

منزل بنایا۔ مولانا محمد علی کی تحریک خلافتِ خلافتِ برطانیہ کے خلاف تھی اور حرکاتِ رندانہ کی آئندہ وار۔ مگر اس کی جڑیں بھی حقیقت کی نہیں ہیں۔ پیوست نہ تھیں۔ اس کا واحد مقصد ترکی میں خلافت کا استقرار تھا اور ان کا موقف یہ معلوم ہوتا ہے کہ ترکوں کی آزادی دلائے "خلافت کے طفیل ہندوستان بھی خود بخود آزاد ہو جائے گا۔ حالانکہ حالات ایک اور ہی طرف اشارہ کر رہے تھے اور وہ یہ کہ عرب، جو کلیتہً مسلمان ہی تھے، خلافت کی قبا کو چاک چاک کر دینے پر تلے ہو گئے۔ جب قائد اعظم نے مسلمانوں کی قیادت سنبھالی تو ان تمام عظیم تحریکوں کو بھی پیش نظر رکھا۔ انہوں نے سید احمد شہید رحمہ کی اسلامی ریاست کے تصور کو قبول کیا مگر سر سید رحمہ کی تلاشِ جدید کی روشنی میں اپنا نیا نقشہ عمل تیار کیا جس میں حامیانِ خلافت کے جذبہ "پان اسلام ازم" کو بھی اپنے نصب العین سے ہم آہنگ رکھا۔ اس طرح قائد اعظم نے مسلمانانِ ہند کے لئے جو طرح نظر قائم کیا اور جس طرح اس کے حصول کے لئے جدوجہد کی وہ ان کی ثابت رائے کی دلیل محکم ہے اور ہم نے خود کچھ یاد کر دس سال کے اندر اندر ان کا نصب العین حاصل ہو گیا اور دنیا کے نقشے پر پاکستان جیسی عظیم اسلامی مملکت ابھرائی۔

قائد اعظم کا سرچشمہ فیضانِ اسلام تھا اور اسی نے پاکستان کی بنیاد پھینکی۔ ان کا تصور ایک ایسی اسلامی مملکت تھی جس میں نظریہ اسلام ہی کو بالذاتی حاصل تھی۔ اب یہ ہمارا کام ہے کہ مسلمانوں کے لئے جو وطن بنا ہے اسے حصارِ اسلام بنالیں۔ قائد اعظم پہلے شخص تھے جنہوں نے مسلمانانِ ہند کو ایک ملت قرار دیا اور انہیں ایک "فرقہ" کی کمر حثیت سے اٹھا کر ایک عظیم اور جداگانہ ثقافت کی حامل ملت کے طور پر تسلیم کرایا۔ میری مراد ان کے دو قومی نظریے سے ہے۔ یہ صحیح ہے کہ دو قومی نظریہ کا تصور کسی نہ کسی عنوان پہلے بھی موجود تھا مگر بہم، جب منزل سامنے آگئی تو یہ ابہام دور ہو گیا اور یہ قائد اعظم کی سب سے بڑی قائدانہ کامیابی تھی۔

ان کا ایک مشہور اعلان ہے: "ہم ایک قوم ہیں، جس کا ایک اپنا مخصوص تہذیبی مزاج ہے، ایک جداگانہ ثقافتی نقطہٴ نظر، زبان، ادب، فن، طریقہٴ تعبیر، نام، اصطلاحیں، اقدار و مناسبات

حسن فیضان (قائد اعظم کے بعد)

منظر حداثی

یہ فطرت کی عنایت ہو رہی ہے کہ پھر بیدار قسمت ہو رہی ہے
فروزان شمعِ وحدت ہو رہی ہے جہاں سے دو ظلمت ہو رہی ہے
نئی تنظیم ملت ہو رہی ہے روایت پھر حقیقت ہو رہی ہے
نئے سورج ابھرتے جا رہے ہیں اندھیری راتِ رخصت ہو رہی ہے
ہمیں اپنی تباہی کا نہیں غم زلزلے کو تو عبرت ہو رہی ہے
ہمارا ہی چمن لوٹا گیا تھا ہمیں سے اب شکایت ہو رہی ہے
وہی دُنیا جو دوزخ بن چکی تھی حریفِ باغِ جنت ہو رہی ہے
دُعا اور میت کیوں نہ بڑھتا کہ قدرِ آدمیت ہو رہی ہے
نکھرتی جا رہی ہے زندگانی ہر اک شے اہِ طلعت ہو رہی ہے
یہ فیضِ قائدِ اعظم تو دیکھو جہاں میں اپنی شہرت ہو رہی ہے
زلزلے میں ہمارے پھر ہیں چرچے خدا کی پھر عنایت ہو رہی ہے
ذکیوں تقدیر پر ہوں اپنی نازاں شہ یک حال فطرت ہو رہی ہے

اندھیرے دور ہوتے جا رہے ہیں

نئی اک صبحِ عظمت ہو رہی ہے

فقہ، مناکحت، اخلاق، رسوم و رواج، تقویم، تاریخ، روایات
صلاحیتیں، ہماری امنگیں، کیا چیز ہے جو اپنا ایک طلوع و مغرب ہو
نہیں رکھتی۔ حقیقت یہ ہے کہ زندگی کے بارے میں ہمارا ایک تباہی
خیر اور زاویہ نظر ہے۔

بے حد اولوالعزم اور اپنے ارادوں میں راسخ جیسے کہ وہ
تھے، اپنا نصب العین حاصل کر کے رہے۔ ان کے متعلق ایک واقعہ
بھی مشہور ہے کہ جب انہوں نے جمٹر بیٹی کے عہدہ سے (جس کا
مشاہرہ ۵۰۰ روپے ماہانہ تھا) علیحدگی کا فیصلہ کیا تو ان سے اس کی وجہ
پوچھی گئی۔ انہوں نے کہا تھا کہ میں تو ڈیڑھ ہزار روپے یومیہ کمانا
چاہتا ہوں۔

یہ بھی مانا کہ اس وقت انہیں ایک سر پھر انو جان تصور
کیا گیا ہوگا۔ بے حد برخورد غلط اور دنیا کی اونچ نیچ سے بے خبر
مگر یہ حقیقت ہے کہ ایک ایسا زمانہ ضرور آ گیا جب قائد اعظم نے
واقعی ڈیڑھ ہزار روپیہ یومیہ کیا، اس سے کہیں زیادہ کیا۔

عجب ہے کہ ایک انسان جس کی زندگی اتنی بوقلموں
توانا اور کارہائے نمایاں سے بھر پور ہو، اس کی اب تک کوئی
مستند و جامع سوانح حیات مرتب نہ ہوئی ہو۔ ایک ایسی واحد
سوانح عمری جس میں قائد اعظم کے آخری دنوں تک کے حالات
منعبط کر دیئے گئے ہوں۔ ہیکٹر تولائی، تھو کی تصنیف یوں تو
بجائے خود بڑی اچھی ہے (اور کچھ نہیں تو اپنے دیکش سلیو
تھویر کے اعتبار سے ہی تھی) مگر قائد اعظم کے عقید مندوں
کے دل میں پھر بھی یہ تمنا باقی رہ جاتی ہے کہ وہ ان کے
بارے میں اور بہت کچھ معلوم کریں۔ اور پھر ایک اور اشد
ضرورت یہ بھی ہے کہ قائد اعظم کی سوانح عمری اپنے ملک کے
لوگوں کے لئے بہت کم قیمت پر فراہم ہو تاکہ ہر ایک کے پاس
اس کی کاپی پہنچ سکے۔ حق یہ ہے کہ اکثر لوگوں کی نظروں میں بابائے
مستراب بھی زیادہ سے زیادہ ایک ایسا ابرگہ رہا ہیں جس نے
برصغیر ہندو پاکستان کے مسلمانوں کو ایک جداگانہ ملت کی
نعمت ارزانی کی اور بس۔

منزل آشنا

عبد الغنی شمس

عظیم قائد!

سلام لے دس کروڑ ان بیٹے بیٹیوں کا
جنہیں عطا کی ہے تیرے عزم و یقین نے کچھ ایسی سرفرازی
کہ اب ہمارے کی بھی بلند قوتیں ان کے نہیں ساتی

عظیم قائد!

سلام لے دس کروڑ ان بیٹے بیٹیوں کا
جو تیرے نقش قدم کو مشعل بنائے باغ و ناز و تکلیں
منازل ارتقا کی پڑیچ شاہراہوں پہ گامزن ہیں

عظیم قائد!

سلام لے دس کروڑ ان بیٹے بیٹیوں کا
جو تیری اس کشورِ حسین پر نشا کر لے کو اپنی جانیں
قطارِ اندر قطار، خنجرِ بدست، آمادہ و عنا ہیں
نظر اٹھا کر ذرا تو دیکھ اُس اُبھرتے سورج کی ضوفشانی
کہ جس کی ہیبت سے، قلبِ ظلمت کی دھڑکنیں تیز ہو گئی ہیں۔
نہ جانے کتنے ہی ان میں ایسے جیسے ہوں گے، جو نام روشن کریں گے طاری کا شش بہت میں۔
نہ جانے کتنے ہی ان میں ہوں گی، غیور و جساں باز، مثلِ خولہ
کہ جن کی جہات کی داستانیں سنائیں گی مائیں بیٹیوں کو

میں سوچتا ہوں، جو تو نہ ہوتا، تو تیرے گردوں کے ماہ و انجم
بصورتِ ریگہائے صحرا، خراب و آوارہ و ریشاں
خلا کی انجانی دستوں میں، نہ جانے کب تک بھٹکتے رہتے
کہاں کی منزل، نشانِ منزل کی بھی انہیں کچھ خبر نہ ہوتی
شبِ سیمہ کی سحر نہ ہوتی

حسنِ کلامِ آئینہ

انور سعید گیلانی

کاتھاقضابی ہے کہ ہم ایسی آوازوں پر کان نہ دھریں جو ”کجہ“ کی بجائے ”ترکستانی“ کی طرف بلارہی ہوں۔ ہمارے لئے سب سے پہلی اور بنیادی شرط تو ملک کی سلامتی ہے۔ حتیٰ کہ کوئی بدیہی ظلم ہمارے لئے کارآمد ثابت نہیں ہو سکتا۔ ہمیں خود غرض لوگوں کو یہ موقع ہی نہیں دینا چاہیے کہ وہ اپنے فائدے کے لئے ہم عوام کو اپنا آلہ کار بناتے رہیں۔

صدر پاکستان کا یہ ارشاد سو فیصد صحیح ہے کہ صدارتی نظام قطعاً غیر جمہوری نہیں بلکہ اسلامی روایات سے بے حد قریب ہے۔ اس سے حکومت کو کئی سال تک اطمینان سے عوام کی سچی خدمت کی مہلت مل جاتی ہے اور کوئی دوزاری افراتفری برپا نہیں ہوتی۔ نہ حکومت کا نظام دھم دھم ہوتا ہے۔ یہ بالکل بجاس ہے کہ جو اس رائے سے اتفاق نہ کرے گا وہ آخر محض چند لوگوں کی تفریح کی خاطر یہ کیسے برداشت کیا جاسکتا ہے کہ آئے دن کوئٹہ بدلنے کا تماشا دیکھا جائے۔ خدا ہمیں ۵۸-۶۱ء کے دورے محفوظ ہی رکھے!

پارلیمانی نظام کے کیا کہنے۔ چند ہی دن بعد صدر پاکستان نے بڑی پتے کی بات کہی کہ دنیا کی قدیم ترین پارلیمنٹ ”جو پارلیمنٹوں کی ماں“ کہلاتی ہے، خود اس کی اولاد اب اس کو بوڑھا اور شہیاد ہوا سمجھنے لگی ہے۔ اس کا رنگ روپ بگڑ چکا ہے اور یہ ایک نئی اور اولوالعزم قوم کی ضرورتیں پوری کرنے سے معذور ہو چکی ہے۔ جناب صدر نے بہت اچھا کیا کہ اس ضمن میں لارڈ شکرٹن جیسے فاضل اور جہاں دیدہ سیاست کا خواہ دیتے ہوئے بتایا کہ بطلانِ نظامِ حکومت ایک ایسی بوسیدہ مشین ہے جو چرچر کرکے ٹوٹنے ہی والی ہے اور موجودہ دور کے لئے ہرگز موزوں نہیں۔

اب کے پہلی تاریخ کچھ دن پہلے ہی یادو باراتی! اس لئے کہ صدر پاکستان، فیلڈ مارشل محمد ایوب خان، نے حسبِ معمول یکم کو ملت سے خطاب فرمایا، مگر اس سے کچھ ہی روز پہلے ۲۷ اکتوبر کے یادگار دن کو بھی وہ ملت سے خطاب کرنا نہیں بھولے۔ ریڈیو کی لہروں ان کی ہر وعید، حیاتِ افروز آواز لئے گھر گھر پہنچیں۔ عین اس وقت جب اس کی اشد ضرورت تھی۔ جبکہ وطن دشمن، ملک کے اندر بھی اور باہر بھی۔ پھر پاکستان کے خلاف مسلح ساز ہے ہیں اور دن رات نئے نئے منصوبے کرنے میں مشغول ہیں۔

صدر پاکستان کی آوازاں جیسے کا ملا صدائے ملت بنتی جا رہی ہو، اس کے پیش نظر میں اور میری طرح ہزاروں افراد، خانہ بہ خانہ کو بگڑے برابر گوش برآواز رہتے ہیں۔ اس لئے اب کے میں اپنے دوسرے پاکستانی بھائیوں کی طرح دونوں تقریروں کو سننے کے لئے پہلے ہی سے تیار تھا۔

پہلے اکتوبر کا ذکر بہتر ہے۔ کیونکہ یہ انقلاب کی پانچویں سالگرہ کی بات ہے۔ جب ہم اور ہمارے ساتھ پاکستان نے ایک نئی زندگی پائی اور آزادی حقیقی معنوں میں آزادی بنی۔

بے شک جو لوگ اپنی تاریخ سے سبق حاصل نہیں کرتے انہیں تاریخ میں کوئی جگہ بھی نہیں ملتی۔ اس لئے ہمیں لازم ہے کہ ہم اپنی بے پیرمائی اور غفلت سے پرانی غلطیوں کو نہ دہرائیں اور ان میں سب سے بڑی غلطی مغربی طرز کے پارلیمانی نظام کو بحال کرنا ہے جس نے ہمیں تباہی کے کنارے لاکھ لاکھ کیا تھا۔ اور اب بھی اس سے یہی خطہ لاحق ہونا لازم ہے۔ مگر انقلاب بار بار تو نہیں برپا کئے جاسکتے اور نہ وہ ملک و قوم کی نجات کا آخری علاج بن سکتے ہیں کی جگہ عوام کی منشا کو نظامِ مملکت میں شریک کرنا چاہئے مگر دانش

اور جنوں و کشمیر کی سنگین صورت حال کے ساتھ یہ بھی ہمارے لئے مسلسل پریشانی کا باعث رہا ہے اور ہے۔

ان ایام میں جو کچھ درپہندہ تھا براہِ فکندہ نقاب سامنے آ گیا ہے۔ یہ کہ جس چیز کا قانوناً و اخلاقاً استحقاق نہیں وہ اس ترکیب سے ضم ہو جائے۔ اخلاقی قدر میں مسئلہ بین الاقوامی دھڑے، عالمی رائے عامہ اور دوست ملکوں کے مشورے سب اس لئے ہیں کہ انہیں گلدستہ طاق نسیاں بنایا جائے اور زبردستوں کے جذبات افواج کے پاؤں تلے کچل دیئے جائیں۔ ایسی جارحانہ کارروائیاں کس کے ماتھے پر کلنگ کا ٹیکہ نہ ہوں گی، خواہ وہ کوئی ہو۔ اس سے اس کو کوئی فائدہ نہیں پہنچ سکتا۔ دوسری طرف ایسے اقدامات سے ہمارے اس عزمِ جمیم میں ذرہ برابر فرق نہیں پڑے گا کہ ہم عوام کو ان کا حق دلایں تاکہ جو بھی فیصلہ ہو حق و انصاف کے مطابق ہو معلوم نہیں ہمارے پیارا ان عزیز ہمیں دنیا میں اپنا سب سے بڑا دشمن کیوں سمجھتے ہیں، حالانکہ ہم ہر تازہ کوئلہ من اور منصفانہ طور پر حل کرنے کی ہر ممکن کوشش کرتے رہے ہیں اور اب بھی اس پر کاربند ہیں۔

قدرتی بات ہے کہ جب کسی کو دھڑلہ دھڑلہ عسکری امداد حاصل ہوتی جائے تو وہ من مانی کرنے پر تیار ہوتا ہے اور بظاہر ہدف خواہ کچھ بھی ہو اگر اصل ہدف کوئی اور ہی ہوتا ہے۔ شاید وہ غلطی سے اسی کو حقیقی غنیمت سمجھ لیتا ہے۔ یقین جانیے۔ یہ مسلح پوشی اس غنیمت کے ساتھ کبھی جنگ پر متوجہ نہیں ہوگی اور پھر وہ دن آجائے گا جب "بھائی بھائی" کا راگ الاپا جائے گا۔ ایسے حالات میں جنگ مغلوبہ بی کی طرح ڈالی جاسکتی ہے اور وہ یوں کہ ہم اپنی صفوں ہی کو مستحکم کریں اور ہر جارحانہ اقدام کا ترکی بہ ترکی جواب دیں۔

سب سے بڑی ضرورت حقیقت پسندی ہے۔ ہمارے دانشوروں کو لازم ہے کہ وہ عوام کی فلاح و بہبود کی باتیں سوچیں اور خواہ مخواہ فضول نظریوں، نعروں اور جڈبانی لہیلوں سے کام نہ لیں۔ ضرورت یہ بھی ہے کہ زمین پر قدم جمائے جائیں نہ کہ خلاؤں میں خیالی پرواز سے کام لیا جائے۔ یہ دیکھ کر ہمیں قوم کے حقیقی مسئلوں کا جائزہ لینا اور ان کے حل سوچنا ہے۔

پچھلے دنوں ہمارے اخبار نویسوں نے اسی حقیقت پسند کا ثبوت دیا ہے جو ان کے موجودہ نسبت بہتر معیار میں منعکس ہے۔

(باقی صفحہ ۵۸ پر)

جناب صدر نے پھر بھی ہے اور بڑی ہی خدا انگیزی کہی ہے کہ پارلیمانی حکومت کو بحال کرنے کا نعرہ دراصل اپنی سیاست دانوں کا نعرہ ہے جو سیاست کی بازی ہار چکے ہیں اور پھر کسی جیلے بہانے وہی کھیل کھیلنا چاہتے ہیں جو انہوں نے پہلے کھیلنا تھا تاکہ قوم کا بیڑا پھر تباہ ہو جائے۔ سچ پوچھا جائے تو ان لوگوں کے تھکنڈوں کا جواب انقلاب ہی تھا اور اس انقلاب کے کام کو اس وقت تک جاری رکھنا چاہئے جب تک وہ اصلاحات جو اس کے تحت رائج ہوئیں ملک میں پوری طرح نشوونما پا کر بار آور نہ ہو جائیں۔ اور یہ سب کچھ اسی صورت میں ممکن ہے کہ ملک میں سیاسی و اقتصادی استحکام برقرار رہے۔ صدر پاکستان کی یہ آواز یقیناً بڑی توجہ اور سنجیدگی سے سنی جائے گی۔ ایسی سیاست بھی کیا جو کسی مسئلہ کا حل نہ پیش کر سکے اور عوام کے لئے کسی طرح بھی سودمند ثابت نہ ہو۔ آغواں سیاست دانوں نے پارلیمانی حکومت کی بجائی، بنیادی حقوق اور بائع حق رائے دہی کی رٹ لگانے کے سوا اور کیا بھی کیا ہے؟ ان سے قوم کے امراض کا کیا مداوا ہوا اور ہو بھی کیا سکتا ہے ان سے تو انشا اصلاحات اور عوامی رفاه و بہبود میں رکاوٹ ہی پیدا ہو سکتی ہے، اس کے سوا کچھ نہیں ہو سکتا۔ ساتھ ساتھ یہ بھی تو ہے کہ خود غرض سیاست دان محض حکومت کی مخالفت پر اندھا کھلے بیٹھے ہیں اور حزب اختلاف کے کردار کا بہت سی غلط تصور رکھتے ہیں جنہیں بغضِ لہی اور اندھا دھند مخالفت کو چھوڑ کر اصل تعمیری کام کرنے کی طرف متوجہ ہونا چاہئے، تاکہ حکومت کی تعمیری اور مفید سرگرمیوں کو ان کی بھی تائید حاصل ہو اور ان کے خلوص نیت کا لوگوں کو بھی علم ہو۔ صدر پاکستان کی اس رائے سے کون اتفاق نہ کرے گا کہ کیا ذاتی و سیاسی مقصد برآری کے لئے ملک میں انتشار اور بے چینی پھیلنا کوئی نیکی ہے، خصوصاً جبکہ باہر دشمن اپنے دندانِ آرتیزر کئے بیٹھا ہے؟ سیاست دانوں کو ہرگز زیم نہیں دینا اور نہ یہ محبتِ وطن ہی ہے کہ عوام کی سادگی اور ان کے مذہبی لگاؤ سے ناجائز فائدہ اٹھایا جائے کیا یہ کوئی دینی خدمت ہے کہ مذہب کی آڑ میں اپنا اٹو مسدھا کیا جائے؟

تو ہوسکے اپنے باور بیلگانے؟ اسی کے تھکنڈوں بھی کچھ کم نہیں۔ آسام اور تری پورہ کے بد نصیب مسلمانوں کا انخلا جاری ہے۔



معاشری خدمات کی حوصلہ افزائی
(جوبلی اسلامیہ کالج پشاور)



لیاقت میموریل : مجوزہ عمارت کا نقشہ (راولپنڈی)



اراکین بنیادی جمہوریت و عمائدین شہر سے خطاب (نواب شاہ)

اے آمدنت : قبائلی طلبہ کی طرف سے خیر ما



مشائخ کانفرنس کراچی : معمار حرم باز بہ تعمیر جہاں خیز



جبریلی

اسلامیہ کالج پشاور
اولین جدید درسگاہ،
سابق صوبہ سرحد۔
(تاسیس: ۱۹۱۰ء)



روحانی تعلیم کا سرچشمہ

کالج سے متعلق شفاخانہ



ب سر صاحبزادہ عبدالقیوم خان
نوم (سیاسی اصلاحات اور ترویج
تعلیم کے، حرک اعظم)

اسلامیہ کالج، جواب نرقی کر کے یونیورسٹی بن چکا ہے



مسافر ان شب

دقائد اعظم اور انقب کی روشنی میں

الطاف پروانہ

صبح رنگیں سے بدل جائے کہ تو قادر ہے -
رات اور دن بھی - ری طرح ہیں تیری مخلوق
وقت بھی تیرا ہی شہکار دوام
اب خموشی کا بھی جادو لوٹے
یہ خموشی، یہ مری تنہائی
کسی چٹکا نہ رنگیں سے بدل جائے کہ میں
اپنے امانوں کا خون دیکھ نہیں سکتا
میرے آقا! کوئی آواز،
کسی دوست کی آواز سنوں
لطف فرما کہ یہ کائنات نہ رہیں، پھولی جنوں

اللہ اکبر اللہ اکبر
تو راہ رو ہے نہ کئے نہ پائے
یہ رات دن تو میں تیرے سائے
حیرت ہے، ان سے تو عو قحکا؟
قدر پر تیری صبح منور
اللہ اکبر اللہ اکبر
بڑھتا چلا جائز ہر منزل
جے دم تیرا اگر وہاب و سائل
مدد کی کیوں آکھہ ڈوتا ہیکٹا
سودنیا میں دامت اللہ
اللہ اکبر اللہ اکبر

آئی تنہائی کی رات
تو مالک، تو داتا سب کا
تو والی، تو آقا سب کا
تو منزل تو راہ نجات
آئی تنہائی کی رات
آ، دل ڈرتا ہے
ہر بات پر، ہر آہٹ پر
گو یہاں کچھ بھی نہیں
بات، نہ آہٹ، نہ اجالانہ دھواں
پھر بھی دل ڈرتا ہے ان کوئی نہیں
ادو نہ کوئی آئے گا -
کہ یہ محول، یہ ٹھکانہ غم کا
زیست کے سایہ الطاف سے ہے دو بہت،
اس قدم و رکہ امید کی رو
پر رکھ کر بھی جو چاہے تو نہیں آسکتی
لیکن اسے رب مئی! خالق ہر انس و ملک!
تو رگ جال سے بھی رہتا ہے قریب
میں نہ گر دیکھ سکوں تو تو مجھے دیکھتا ہے
تو شتا سلسلے مرے درد نہال سے آقا!
تو جو جاسے تو یہ دیرانہ پیر ہول اگھا
شوش زلیست کا گہوارہ بنے
اور یہ رات کہ سبب کا ساں ہے گویا

یہ شب تیرہ و تیرہ ہول، یہ خاموش سماں
وقت تمنا تو نہیں ہے لیکن -
وقت پیچھے کہ تھا جا کسے
کوئی دریا نہ درخت،
کوئی بھرنہ نہ پہاڑ
ایک چپ، سکھ سے بہت دور
دکھوں سے بھر چور!
ایسی تنہائی کہ سایہ بھی جدا ہے مجھ سے!
(وقفہ)
آئی تنہائی کی رات
رات، بیباک رات
موا دل ڈرتا ہے
چھوٹے طوفان، گھپ اندھیا را
لوٹی نیت - دور گن را
ہاتھ کو دے نہ سبھا ئی بات
آئی تنہائی کی رات
پل پل بڑھتے غم کے سائے
کوئی نہیں جو دیر بندھاے
پیار میں دیکھ مات ہی مات
آئی تنہائی کی رات
ایک اکیلا نیر بہاؤں
آپ ہوا پتا دھندھاؤں
کوئی نہ گئے میری بات

باغ اور دین ہیں دھوکا نظر کا
یہ تیرگی پیش خیمہ سحر کا
ہے عشق سلطان بھرا اور بر کا
ہے عشق تیرا ہر آن رہبر
اللہ اکبر اللہ اکبر
خود شہد فوج شرق سے ابھرا
پھولوں سے ہے دامن صحرا
تو وقت کو دے بڑھ کر سہارا
تو جبر الفات کا ہے شناور
اللہ اکبر اللہ اکبر

پھول ہی پھول، اجالا ہی اجالا
وہ شب تیرہ دُپر پھول، وہ خاموش سماں
میری تقدیر نہ تھا!
کہا یہ سب وہم تھا
خود میری نظر کا دھوکا ہے
پر یہ آواز
الہی یہ صدا کس کی تھی؟
کیا میں تنہا بھی نہ تھا؟
تھا کوئی اور بھی اس دکھ بھرے دیر لے میں،
کون تھا؟ اب وہ کہاں ہے؟
اسے کس جا دیکھوں؟
اب تو شب بیت گئی
صبح تو ابھی گئی ہے کے اجالوں کا پیام
پھر وہ روپوش ہے کیوں؟
میں پکاروں نہ اسے؟ دو لہان
آواز دینے والے
آواز دے دو بار
تو کون ہے کہاں ہے
کس کچھ میں نہیں ہے
اک بے کمی ہے دل کو
پہرا رنڈو جاں ہے

کوئی نہیں سہارا
آواز دینے والے!
آواز دے دو بار
جلد و جھگ گیا ہے
حیراں بنا گیا ہے
میں بے نوا سا فر
تورہ دکھا گیا ہے
آ، سامنے خدا را
آواز دینے والے!
آواز دے دو بار

تجمہ سے ہوا اجالا
تو نے دیا سنبھالا
میں گھریب تھا غم میں
تو نے مجھے بٹکا لایا
تو صبح کا ستارا
آواز دینے والے!
آواز دے دو بار

اور پھر میں نے پکارا اسے یوں جیسے کوئی
رکاوٹ مصیبت کا اسیر
ہر آنے وقت پہ مایوس جہاں سے ہو کر
دل کی ہر شیں کو آواز بنالیا ہے
میری آواز، مرے دل کی غم آمیز پکار
صبح کے توڑ میں تحلیل ہوئی، پھیل گئی
دو ترک وشت و جبل کو بجائے
باز گشت آئی تو یوں جیسے وہ خود
نغمہ نشاں، رقص کن آن پہنچا
گھنٹیاں بجے گئیں،
سامعین دامن صحرا میں جو غمایدہ تھے میدان ہونے
ایک آواز بدلتی، عشق فر دایہ کا، عجاز بنی

صحن، سامان نظر، دعوتِ نخلہ بنا
بے کمی گئی گئی،
اس کی آواز
مرے دل کی صدا، ایک ہوتی
اور دوئی مٹ گئی، تنہائی کا غم دوہوا

جاگا پیارا کا جادو
بیت گئے اندھیا رے
کرک کرکے آنے لگی ہے
کلی کلی سسکا کے کھلی ہے
جھک اٹھے نفا رے
جاگا پیارا کا جادو
بیت گئے اندھیا رے

اجلی اجلی پیارا کی راہیں
پھیل ہوئی جیون کی باہیں
امرت رس کے دعا ہے
جاگا پیارا کا جادو
بیت گئے اندھیا رے

ہانٹ لے غم سا سہ اپنے
آسمان کے بندھن، سندھ پہنچے
گیت سلونے پیارے
جاگا پیارا کا جادو
بیت گئے اندھیا رے

منزل منزل ساتھ چلیں گے
غم سے سدا ہم دو دہریہ گے
اک درجہ کے سہارے
جاگا پیارا کا جادو
بیت گئے اندھیا رے

افق تاب

(صاحبزادہ سر عبد القیوم مرحوم)

احسان اللہ دانش

قارئین سے ظاہر ہوتا ہے کہ انہوں نے اپنے لڑکپن میں سرسید حرکات شہر ضرور سنا ہوگا اور ان حالات سے بھی آگاہی ہو گئی ہوگی جہاں عظیم ہستی کے ساتھ ہمارے ذہن میں آتے ہیں۔ سر صاحبزادہ عبد القیوم خان پٹانوں کے مشہور لودھی خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ ۱۵۲۶ء میں جب سلطان ابراہیم لودھی نے شہنشاہ بابر کے ہاتھوں پانی پت کے مقام پر شکست کھائی تو بعض لودھی شہزادے افغانستان میں پناہ لینے پر مجبور ہو گئے۔ بعد میں جب احمد شاہ ابدالی نے مرہٹوں کا قلع قمع کرنے کے لئے ہندوستان پر حملہ کیا تو انہی لودھی شہزادوں کے خاندان کا ایک فرد عبدالکریم غازیوں کے لشکر کے ساتھ جہاد کی غرض سے ادھر آیا۔ احمد شاہ توپانی پت فتح کرنے کے بعد لوٹ گیا۔ مگر عبدالکریم نے یوسف زئی علاقے کے ایک چھوٹے سے گاؤں ٹوپی میں سکونت اختیار کر لی۔ عبدالکریم ایک صوفی منش بزرگ تھے اور زیادہ تر عبادت و ریاضت ہی میں مصروف رہتے۔ یہی وجہ تھی کہ مقامی پٹانوں میں ان کی قدرومنزلت بہت بڑھ گئی۔ لوگ ان کی روحانی عظمت کے باعث ”بابا“ کہہ کر پکارتے تھے ان کی اولاد کو جو مین لڑکوں پر مشتمل تھی اسی نسبت سے صاحبزادہ کہتے تھے۔ بڑے لڑکے صاحبزادہ غس اللہ مین کی اولاد میں سے ایک صاحبزادہ قطب عالم (پ ۱۸۰۰ء) تھے جنہوں نے اپنے زمانے کے ایک مشہور صوفی و مبلغ حضرت سید امیر مرے، جو ٹوپی سے تھوڑی ہی دور ایک گاؤں کوٹہ کے رہنے والے تھے، بیعت کی تھی۔ بعد میں حضرت صاحب نے اپنی ہمشیر کا کلچ بھی صاحبزادہ قطب عالم سے کر دیا تھا۔ اس طرح علاقے کے دو بطلان القدر خاندان متحد ہو گئے۔ صاحبزادہ قطب عالم کے لڑکے صاحبزادہ عبدالرؤف بھی اپنے والد کے نقش قدم پر چلے اور اپنے ماموں حضرت سید امیر مرے ارادت اختیار کی۔ ۱۸۵۸ء میں صاحبزادہ عبدالرؤف کی شادی حضرت سید امیر

انیسویں صدی کے وسط میں جب درانیوں کی قوت کمزور پڑی اور ان کی سلطنت کا جوڑی اور کشمیر تک پھیلی ہوئی تھی، شیرازہ بکھر گیا تو اس کا سب سے زیادہ اثر ان لوگوں پر بالخصوص پٹانوں کو کہ سلیمان کے شرقی جانب رہتے تھے۔ بعد کو جب انگریزوں اور روسیوں کے مابین افغان دہلیز میں اٹھوڑا صحن برٹھانے کا مقابلہ شروع ہوا تو ان غیر ملکی حالت اور بھی خستہ ہو گئی۔ بحیثیت منگھ اور اس کے جانشینوں نے سرحد کے بعض علاقوں کو جی بھر کر لوٹا، بلکہ ہری سنگھ تلورہ کی بربریت تو آج بھی پشتوئیں ایک کثیر الاستعمال ضرب المثل کی طرح موجود ہے۔ عرض سابق صوبہ سرحد ایک عجیب انتظامی اذرائع کی کاشکار محتاج میں نہ کسی کی جان محفوظ رہی اور نہ مال۔ جا بجا لڑائیوں نے قحط کی صورت پیدا کر دی تھی۔ انگریزوں نے جب زمام اقتدار سکھوں سے اپنے ہاتھ میں لی تو حالات کچھ سنبھل گئے لیکن غیور پٹانوں نے تسلط فرنگ کو کبھی پوری طرح قبول نہ کیا اور برابر آزادی حاصل کرنے کی کوششوں میں مصروف رہے۔ نتیجتاً حاکم اور محکوم کے درمیان ایک خلیج بھی پیدا ہو گئی جو روز بروز بڑھتی رہی۔ برادران وطن نے حسب معمول اس صورت حال سے خوب فائدہ اٹھایا اور ایمان حکومت میں داخل ہو کر مسلمانوں کی اس شہلے قوم کو اپنی نبال و قلم کے تیروں اور انگریزوں کی سنگینیل کا نشانہ بناتے رہے۔ کچھ ہی صورت حال تھی جو سرسید کو اپنے زمانے میں دلی کے زوال کے بعد درپیش آئی تھی۔ سابق صوبہ سرحد میں بالخصوص اس صورت حال کے مقابلہ کی ضرورت تھی اور ادھر بھی ایک سرسید کے لئے آنکھیں تھلائی تھیں۔ ایسی ہی شخصیت عبد القیوم خان (نواب سر صاحبزادہ) کی تھی غور و فکر اس عظیم شخصیت سے ہماری قوم آشنا ہو، بالخصوص وہ ہونہار و جوان کی بابت بہت ہی کم یا کچھ ہی نہیں جانتے۔

نواب سر صاحبزادہ عبد القیوم خان ۱۸۶۴ء میں پیدا ہوئے

بے محفوظ ہو گئی۔ ۱۹۸۷ء میں انہیں خیبر ایجنسی کا اسسٹنٹ پولیٹیکل ایجنٹ مقرر کیا گیا۔ کچھ ہی عرصے کے بعد پولیٹیکل ایجنٹ مقرر ہوئے اور ۱۹۹۱ء تک اس عہدہ جلیلہ پر فائز رہ کر سبکدوش ہو گئے۔ یہ تو داستان تھی اُن کی شخصی ترقی اور عزت و توقیر کی اب کچھ ذکر ان کی ملی و تعلیمی خدمات کا پیش کیا جاتا ہے :

بیسویں صدی کے آغاز میں ہندوستان میں انگریزوں کی حکومت مستحکم ہو چکی تھی۔ اور صرف اغیار ملازمتوں پر فائز، نظم و ضبط پر قابض تھے۔ مسلمانوں بالخصوص پٹھانوں کو انگریزوں کا دشمن ثابت کر کے اپنی ترقی کے خواہشمند رہتے تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ سیاسی، معاشرتی، تعلیمی، ہر میدان میں پیچھے رہے جا رہے تھے۔ صاحبزادہ صاحب کی دور رس نظریں ان تمام ناگفتہ بہ حالات کو دیکھ رہی تھیں۔ مگر انہوں نے ہتھیہ کر لیا تھا کہ وہ اپنی قوم کو اس گڑھے میں گرنے سے منور نہ پائیں گے۔ چنانچہ اس مقصد کے حصول کے لئے وہ عرصے تک برابر سوچتے رہے۔ قومی لوہار کو دور کرنے کا واحد علاج تعلیم ہی تھا اور وہ چاہتے تھے کہ ہمارے پٹھان بھائی بھی تعلیم کی طاقت حاصل کریں۔ اس ضمن میں ان کے سامنے سرسیدؒ کے تعلیمی مشن کی مثال موجود تھی۔ چنانچہ انہوں نے ”دارالعلوم اسلامیہ سرحد“ جسے آج کل اسلامیہ کالج کے نام سے یاد کیا جاتا ہے کی تشکیل کا ارادہ کیا۔ سرچارج روس کپٹل نے اس سلسلے میں نواب صاحب کی بہت بہت افزائی کی حقیقت یہ ہے کہ اگر اس وقت روس کپٹل جیسا ہندو شخص مدد کرنا تو اس ادارے کے قیام میں بہت دیر لگتی اور بڑی مشکلات پیش آتیں۔

دارالعلوم کا قیام فوری ۱۹۰۹ء میں ہوا۔ سرچارج روس کپٹل اور سر صاحبزادہ دونوں ہی کسی کام سے کلکتہ جا رہے تھے۔ علی گڑھ راستہ میں پڑتا تھا۔ وہیں پٹھان طالب علموں سے بھی کچھ دیر گفتگو کرنے کا موقع ملا۔ انہوں نے سوز و پے کی ایک تھیلی سرچارج کی نذر کرنا تاکہ ان کے لئے علی گڑھ میں ایک پٹھان ہوسٹل کی تاسیس کی جاسکے لیکن سرچارج نے انہیں بتایا کہ نواب صاحب ان کے اپنے ہی وطن میں ایک ایسے ادارے کے قیام کا ارادہ رکھتے ہیں اور ان کی کوششوں میں سب کو مدد کرنی چاہئے۔ طلباء اس خبر سے بہت خوش ہوئے اور انہوں نے یہ رقم دارالعلوم فنڈ میں بطور خیریت دے دیا

کی صاحبزادی سے ہوئی، جن کے بطن سے ان کی تین لڑکیاں ایک لڑکا پیدا ہوا۔ دو لڑکیاں تو بچپن ہی میں وفات پا گئیں مگر ایک لڑکی خیرالنسا اور ایک لڑکا زندہ رہا۔ یہی لڑکا بعد میں شہرت و ناموری کے آسان پر مہر مالتاب بن کر چکا اور خان بہادر نواب سر صاحبزادہ عبدالغفور (کے بی۔ آئی۔ ای۔ سی۔ آئی) کے نام سے روشناس خلق ہوا۔

صاحبزادہ موصوف ابھی نو سال ہی کے تھے کہ والد کا انتقال ہو گیا۔ تھوڑے ہی عرصے بعد ان کے والد شہید ہو گئے۔ اب یہ دونوں بہن بھائی یتیم ہو چکے تھے۔ حضرت سید امیر نواسوں کو کوٹھلے کے اندر بہنیں صاحبزادہ صاحب نے اپنی ابتدائی تعلیم حاصل کی۔ ثانوی درجے کی تعلیم کے لئے موصوف کو پشاور کے مشن ہائی سکول میں داخل کر دیا گیا۔ قیمی اور گھر سے دوری نے انہیں بڑی مشکلوں میں پھنسا دیا۔ مگر انہوں نے بڑے محنت سے تمام سختیاں جھیلیں۔ میٹرک پاس کرنے کے بعد صاحبزادہ صاحب کشر کے دفتر میں مترجم کی اسامی پر متعین ہوئے اور تھوڑے ہی عرصے میں ضلع ہزارہ کے ڈپٹی کمشنر کے معتد خاص اور میرٹھی کے عہدے تک پہنچ گئے۔ ۱۸۹۱ء میں سیالکوٹ میں بندوبست کی تربیت حاصل کرنے کے بعد نواب صاحب نائب تحصیلدار مقرر کر گئے اور کوہ سمانہ پر میر آل زئی مہم کے ساتھ خدمات انجام دیں۔ اگلے سال تحصیلدار بنائے گئے۔ تیس سال کی عمر میں اسسٹنٹ پولیٹیکل آفیسر کے عہدے تک پہنچے اور کرم ایجنسی میں پولیٹیکل ایجنٹ مقرر ہوئے۔ روس کپٹل کے ساتھ متعین ہوئے۔ میجر روس کپٹل بہت سمجھدار اور علم دوست آدمی تھا۔ اس کی اور صاحبزادہ کی بہت دوستی تھی۔ اسلامیہ کالج پشاور کا قیام اسی زمانہ کے مراسم کا نتیجہ تھا۔

اسی زمانے میں برطانوی اور افغان حکومتوں کے درمیان سرحدی معاہدہ بھی ہوا تھا۔ حکومت نے سر صاحبزادہ کو ”اندو افغان باؤنڈری کمیشن“ کا رکن مقرر کیا جہاں انہوں نے بڑے تدبیر کا ثبوت دیا۔ جب ۱۸۹۶ء میں ہندوؤں اور انگریزوں میں اُن جن ہوئی تو صاحبزادہ صاحب کی ہی کوششوں سے ان کے درمیان باعزت سمجھوتہ ہوا۔ اگلے سال تیرہ کے آفریدی قبائلی اور انگریزوں کے درمیان جنگ چھڑی۔ انگریزی فوج نے تیراہ پر یلغار کی لیکن صاحبزادہ صاحب نے اس کو بھی روک دیا۔ اور آفریدیوں کی آزاری سلب ہونے

یہ پہلا خطبہ تھا جو دارالعلوم فتنہ کے لئے موصول ہوا اس لئے تاریخی اہمیت کا حامل ہے۔

اسلامیہ کالج پشاور کی خشتِ اول ۲۱ مارچ ۱۹۱۲ء کو منعقد ہونے لگا۔ ایشیا پر حضرت فضل احمد صاحب (حاجی نیرنگ زئی) نے اپنے میلہ رکھ کر ہاتھوں سے رکھی۔ پہلا طالب علم جس نے اس ادارے میں داخلہ لیا، حضرت سید امیر کافور سا اور نواب صاحب ہی کے خاندان کا ایک نامور فرد، صاحبزادہ محمد خورشید تھا۔ یہی وہ صاحبزادہ خورشید صاحب ہیں جو ۱۹۴۹ء میں سرحد کے اولین پاکستانی گورنر مقرر ہوئے۔

ملازمت سے سبکدوش ہونے کے بعد سر صاحبزادہ اپنے دوست سر چارچ روس کپٹل سے ملنے لندن گئے۔ واپسی میں سائبریا، چین، جاپان، ہنگ کانگ اور تھائی لینڈ بھی گئے۔ مگر جب واپس آئے تو وطن کی سیاسی فضا بدلتی ہوئی تھی۔ ہندوستان میں خلافت اور ہجرت کی تحریکوں کا زور تھا۔ نواب صاحب ہجرت کی اس تحریک کو مسلمانان ہند کے سیاسی مفاد کے لئے معززت رساں سمجھتے تھے اور اس کے اصولاً موافق نہ تھے۔ مگر جوش کے سامنے موجد بوجھ کی بات نہ چلی اور صاحبزادہ صاحب کو عملی سیاست سے کچھ عرصے کے لئے کنارہ کش ہونا پڑا۔

نواب صاحب اس دوران میں زیادہ تر اسلامیہ کالجوں کے کام میں منہمک رہے۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ اپنے ہم وطنوں کی سیاسی اور معاشرتی بہبود میں ان کے مد نظر رہی۔ ۱۹۰۹ء اور ۱۹۱۹ء کی نسلی اصلاحات میں کانگریس اور حکومت برطانیہ دونوں ہی صوبہ سرحد کو حقوق دینے کے مخالف رہے جس سے سرحد کے باشعور طبقوں میں شدید عجل پیدا ہوا۔ نواب صاحب سرحد کے لئے حقوق حاصل کرنے میں سب سے پیش پیش تھے۔ مگر جب ۱۹۲۱ء میں وہ شمالی افریقہ کے راستے دوبارہ لندن گئے یہ سرگرمیاں تعویق میں پڑ گئیں۔ واپسی کے سفر میں وہ امریکہ اسپین، شام و بیت المقدس ہی نہیں گئے بلکہ مدینہ منورہ پہنچ کر دوبارہ نبوتی میں بھی جا فری دی۔

۱۹۲۲-۲۳ء میں حکومت نے سر ڈینز برے کی صدارت میں ایک کمیٹی صوبہ سرحد کے مسئلہ حقوق کا جائزہ لینے کے لئے مقرر کی۔ اس کمیٹی کے اراکین کو سر صاحبزادہ اسلامیہ کالج بھی لے گئے برصغیر کے اس دور افتادہ علاقہ میں اتنا شاندار ادارہ اور اس قدر صحت مند

ماحول دیکھ کر سر ڈینز برے دنگ رہ گئے۔ انہوں نے حکومت ہند سے سفارش کی کہ اس مفید کام کو ترقی دینے کے لئے نواب صاحب کو مرکزی قانون ساز کونسل کا رکن نامزد کیا جائے۔ مجلس قانون ساز میں نواب صاحب نے ۱۹۲۳ء سے ۱۹۳۲ء تک کام کیا۔ اور اصلاحات کے لئے میدان ہموار کرتے رہے۔ مرکزی اسمبلی میں بھی کانگریس سرحد کو اصلاحات دینے کی مخالف رہی۔ قائد اعظم اور علامہ اقبال نے برابر سر صاحبزادہ کے موقف کا ساتھ دیا۔

اس زمانے میں پہلی جنگ عظیم ختم ہو چکی تھی اور ہندوستانی وطن پرست حکومت برطانیہ کو مجبور کر رہے تھے کہ وہ برصغیر میں مزید آئینی اصلاحات نافذ کریں۔ چنانچہ اس سلسلہ میں ایک گول میز کانفرنس منعقد ہوئی، جس میں صوبہ سرحد کی نمائندگی کے لئے نواب صاحب ہی کو منتخب کیا گیا۔ کانگریس کے لیڈروں میں بھی مسلمانوں خاص کر شیخوں کو نقصان پہنچانے کے ورپے رہے۔ لیکن نواب صاحب نے اپنی استقامت کروار اور سلاست گفتار دونوں سے کام لیا اور مخالفین کے منہ بند کر دیئے۔ چنانچہ حکومت کو مجبور ہو کر سرحدی اصلاحات کا مطالبہ تسلیم کرنا پڑا۔ اس موقع پر سر عبدالقیوم نے نواب کو کہا تھا: ”مجھے علم نہیں کہ آپ نے مجھے اپنی اس ہنگامی کی وجہ سے تقریر کرنے کی اجازت دی ہے۔ یا انصاف کے اس تقاضے کے تحت کہ جنوب کے رہنے والوں کی طرح شمال مغرب کے پسماندہ صوبوں کو بھی اپنے معروضات پیش کرنے کا حق ہے۔ بہر کیف، جناب والا! اس روشن دور میں فقط آپ ہی ہیں جو اچھوت پر چار کر رہے ہیں۔ مگر ہم پسماندہ صوبوں کے رہنے والوں کو زندگی کے عام حقوق بھی نہیں دیتے ہماری قوم سڑھے سے اصلاحات کے لئے جھج پکار کر رہی ہے لیکن کوئی نہیں سنتا۔ آخر یہ کمتری کا دستہ ہماری پیشانیوں پر کب تک رہے گا؟۔“ آخر میں انہوں نے فرمایا: ”میں اپنی تقریر کو اپنی زبان پشتو کے ایک محاورے پر ختم کرتا ہوں جس میں کہا گیا ہے کہ ایک پتو بھی اگر آپ کے جامہ میں گھس جائے تو آپ کو عذاب میں مبتلا کر دے گا۔“ برطانوی وزیر اعظم مشر ریمزے میکڈونلڈ پر نواب صاحب کی تقریر کا بڑا اثر ہوا، اور انہوں نے سر صاحبزادہ کو ایک نامکن انجمن مطالبہ تسلیم کر لینے پر دل سے مبارکباد بھی دی۔

۱۸ اپریل ۱۹۳۲ء کو اس مجاہد ملت کی کوششیں بار آور باقی صنف ہے

اے روشنیوں کے شہر!

احمد فراز

اے نمر رکتی مراغلی حیات! اے نمر رکتی مراغلی حیات
آمنہ: قدر سے دور سے اس رسیدہ آواز
کیا ہوا؟ کیوں بلاوجہ پریشان ہوتے جاتے ہو؟
اک ذرا صبر کرو
آگ روشن کئے دیتی ہوں ابھی
تم کو زیبا نہیں ہر وقت جواں بیٹی کو
ایسے مطعون کرو
خالدہ بیٹیوں سے ٹھیکھری پیاری بیٹی
کس قدر نیک ہے، معصوم ہے، سنجیدہ ہے
ہم کہ اب ٹوٹی گئی ہوئی دیواریں ہیں
اس کا معصوم سہلا بھی بہت ہے ہم کو
جوشب دروزہ جوائی کے تقاضوں کو بچھا کر کے
ہم پہ قربان ہوئی جاتی ہے
بوڑھے ماں باپ کی خدمت پہ کربتہ ہے
بوڑھا، آمنہ کہتی کم فہم ہے تو
تیری کوتاہ نظر
صرف امر و نکر کی محرم ہے مگر
تجھ کو فردا کی خبر کچھ بھی نہیں
آہ میں کیسے کہوں، کیسے تجھے سمجھاؤں
خاندان کس لئے ہر شام کئی پہروں تک
اپنے ماحول سے بیگانہ کسی دھیان میں گم
اس دیکھ میں کھڑی رہتی ہے۔
آمنہ: یوں اگر ہے بھی تو پھر
کون ظلم ہوا

دگر دیال سات بجالسم اور پھر کسی آباد بازار کی
مختلف آوازیں فیلڈان ہوتی ہیں۔ ان آوازوں میں بعض
ساروں کے ہارن لگھنیاں، قحط، اور بال روم کی
موسیقی ہے۔
بوڑھا: دکھلتے ہوئے، اپنے آپ سے
اف یہ جائزے کی خنک شام،
یہ ٹھنڈے جھونکے۔ جسم معلق ہوا جاتا ہے
جیسے شریاؤں میں قہم جائے ہوئی گردش
یہ بڑھاپا، یہ خدیاں کا موسم
دو لوں بے رنگ، حرارت سے تھی۔ دونوں محرم تپش
جل چکا کب سے بڑھاپے کے جہنم میں گنہگار بدن کا ایندھن
اب تو انک پیکر نکستروں
زندگی لاکھ کا ڈھیر
اب کوئی آگ اسے حدت جاں تاب نہیں دے سکتی
اف یہ جائزے کی خنک شام
یہ ٹھنڈے جھونکے
دلچسپ بدلی کر، خالدہ!
بند کر دے یہ دریکچے کے کوادر
کتفی بے رحم ہے بیٹی تو بھی،
میں چراغ سحری، اور تجھے
طلبِ بادشاہ
کیا اسی دن کے لئے تجھ کو جواں ہونا تھا؟
(اپنے آپ سے)
کاش اس دختر بے فیض کے بدلے قدرت

چھین لے جائیں گی اک روز ترے اور مرے گھر کا یہ ننھا سا
یہ معصوم چہرہ

آنکھ کا نور، بڑھاپے کا سکون۔ خالدہ

خالدہ کی آواز اور ہر عادی ہو کر ابھرتی ہے

خالدہ! اے روشنیوں کے شہر

اے روشنیوں کے شہر!

سورج ڈوب چلا تو کتنے دیپ جلے

شام کے ملے روشنیوں میں ڈوب چلے

یہ خوشبو کے بوجھل جھوکے

یہ کرنوں کی نہر

اے روشنیوں کے شہر

اے روشنیوں کے شہر

یہ لوگوں کے ہنستے اور مانوں کے رعب

لات ہوئی تو دمک اٹھی چہروں کی دھوپ

میرے دل میں کیوں ہے اک

انجانے درد کی لہر

اے روشنیوں کے شہر

اے روشنیوں کے شہر

تیرے ہنگاموں کی دنیا نور ہی نور

میرے دھیان میں تاریکی کو میں مجبور

میں کیا جانوں میں کیا سمجھوں

تو امرت یا زہر

اے روشنیوں کے شہر

اے روشنیوں کے شہر

دغہ فید آؤٹ ہو جاتا ہے اور ہوسکتی

سے منظر بدلنے کا تاثر پیدا ہوتا ہے۔

ہاں میں ایک مھوڑا کی تصویروں کی

خائش غم جہم کی ملی جلی آوازوں کے

اثرات۔

آواز مل: خوب تصویریں ہیں

یہ کتنی ترتیب سے آویزاں ہیں۔

دن بھر اسکول پڑھا، ابھی تو کچھ سہل نہیں

تو کبھی ایک اذیت ہے، کوئی کھیل نہیں

اور وہ بیچارہ کی ٹھکن کی ماری

خام کے وقت بھی اپنے درجے میں کھڑی

خود کو پہلائے اگر شہر کے نظاروں سے

تو یہ معصوم سی تفریح بھی ہے جہم عظیم

کتنے خود غرض ہیں احسان فراموش ہیں ہم

کتنے بے دردمست کوش ہیں ہم

دوھیے اور اداس لہجے میں)

خالدہ!

کتنی بد بخت ہے تو

کتنی بے رنگ ہے معصوم جوانی تیری

تیری قسمت میں نہیں ہے شاید

کہ تری ماگ میں انساں کے ستارے چمکیں

کہ ترے ہاتھوں میں گلزارِ حنا کے ہلکیں

تیری تقدیر میں محنت کے بیاہاں ہیں فقط

اور ماں باپ کی بوڑھی لاشیں

کتنی بد بخت ہے تو!

دسکیاں لینے لگتی ہے۔ دوسرے خالدہ کے گنگناہ کی آواز آتی ہے

بوڑھا: سن۔ سن یہ آواز کہ اس میں ہے نہاں

تیری بیٹی کا سسکتا فردا

غم فشاں فوجہ کسان!

خالدہ میری نظر میں بھی ہے معصوم مگر

مجھ کو اس ہنسنے ہوئے شہر سے خوف آتا ہے

اس کے ہنگاموں سے، رعنائیوں سے

جلد خفاقی ہوئی راہوں سے، چمکتے ہوئے بازاروں سے

توبوں اور ٹھیکتی ہوئی خوشبوؤں سے

اس کے غموں سے جیسے رنگوں سے

اس کی دیواروں سے نظاروں سے خوف آتا ہے...

تو نہیں جانتی

اس شہر کی یہ روشنیاں

۱۱ ہاں کسی فن کی نمائش بھی تو اک فن ہے

۱۲ ذرا دیکھو تو

۱۱ اس طرح دیکھو یہ تصویر

۱۲ "غزل صحرا" فن کی معراج ہے یہ۔ جس طرح قاف کی آواز

پری ہو کوئی۔

۱۱ اے مصوّر ترے ہاتھوں کی بلائیں لے لوں

۱۲ خوب تصویر بنائی مرے پہلائے کو

۱۱ "صحیح نو"

۱۲ قابل داد ہے ان رنگوں کی آمیزش بھی

۱۱ کتنے موزوں ہیں یہ باریک خطوط

۱۲ فور و ظلمت کی کٹ کش کہ عجب منظر ہے

۱۱ جس طرح شب کی تباہ پاک ہوئی جاتی ہو

۱۲ آہٹ! کلہ کوہ سے گرتا ہوا دریا، تو بہ!

۱۱ کتنی بھیری ہوئی ہر مودت نظر آتی ہے

۱۲ جیسے بر سنگ گراں ٹوٹ کے بہہ جائے گا

۱۱ جو بھی تصویر ہے شہکار ہے، فن پارہ ہے۔

۱۲ (یہ آوازیں رفتہ رفتہ دھندھوتی

جاتی ہیں اور دھندھوتی آوازیں

ابھرتی ہیں)

۱۱ سلمیٰ : اے زاہد، تم بھی موند نہ ہو

۱۲ زاہد : کون؟ سلمیٰ : ... کیونکہ میں چلی آئی تھی

اس مصوّر کے فن سے عقیدت ہے مجھ کو

۱۱ سلمیٰ : بڑی خوبصورت تصاویر ہیں

۱۲ زاہد : واقعی فن کے شاہکار ہیں

۱۱ سلمیٰ : جس کو دیکھو وہی نقش ہائے مصوّر میں گم بہت بنا ہے

اور یہ! خالدہ اور یہاں۔

۱۲ زاہد : کیوں، اسے دیکھ کر تم کو حیرت ہوئی ہے۔

۱۱ سلمیٰ : بھاری کی تقدیر میں صرت اس کی ہے اور گھوڑے۔

۱۲ زاہد : مگر آج تو وہ نمائش میں آئی ہوئی ہے

خدا جانے کیسے بھاری کا مفلوج باپ اور معذور ماں

دو لڑکا اس کے سہارے پہ زائیدہ ہیں.....

اور خالدہ خود بھی اس عمر میں فلسفی بن چکی ہے

۱۱ کہ جیسے کسی اور دنیا کی ہاںسی یہاں آگئی ہو

۱۲ اسے آرٹ سے ہے لگاؤ

۱۱ مگر زندگی کے کسی اور رخ سے محبت نہیں ہے

۱۲ زاہد : بھاری اکیلے کھڑی ہے.....

۱۱ چلو اس سے باتیں کر پ

۱۲ سلمیٰ : زاہد، تم نہیں جانتیں...

۱۱ اس کی دنیا انہیں سر دہنہا میوں ہی سے آباد ہے

۱۲ دیکھ لو ایک تصویر کے سامنے، کیسے مہیوت ہے

۱۱ زاہد : اور ہاں اس کے ہونٹوں کی جنبش کہ جیسے کوئی خود سے

محو سخن ہو۔

۱۱ سلمیٰ : چلو اب چلیں لوگ جانے لگے ہیں۔

۱۲ ہجوم کی ملی جلی آوازیں

۱۱ آہستہ آہستہ فید آؤں گے جہاں

۱۲ خالدہ : (اپنے آپ سے) : یہ تصویر کس شہر کی ہے؟ سن

کتنسا مانوس ہے

۱۱ جیسے میری نگاہیں اسے روز و شب دیکھتی ہوں

۱۲ یہ اونچی عمارات یہ جگمگاتے در و باہم۔ روشن دریا

۱۱ یہ شغاف رنگیں، بھڑکتے بادلوں میں خوش باش انسان

۱۲ حسین قص گاہوں میں یہ قلعے، قلعے، قلعے،

۱۱ زندگی۔ روشنی۔ زندگی۔ روشنی.....

۱۲ اور یہ ایک گوشے کے سائے میں ڈوبا مکان

۱۱ نیم ڈاک دریا

۱۲ یہ کیوں روشنی کے سمندر کی قربت میں بھی

۱۱ اک کرن سے بھی محروم ہے۔ کیوں؟

۱۲ نہیں، یہ چمکتا ہوا شہر...

۱۱ اور یہ اندھیروں میں ڈوبا مکان

۱۲ جیسے میرا ہی شہر اند۔ میرا مکان ہو

۱۱ مصوّر!

۱۲ مصوّر! یہ کس کا مکان ہے؟

۱۱ مصوّر: یہ کس کا مکان ہے، یہ کس کا مکان ہے،

مجھے خود نہیں علم یہ روشنی سے چمکتا ہوا جگہ کا ہوا شہر کس کا
اور یہ اندھیرے میں ڈوبا مکان خود مرے واسطے اجنبی ہے۔

خالدہ: (چمک کر) کوئی؟

منصور: خاتون! میں ہی وہ مجرم مصوروں جس کی پریشان تصویر نے

آپ کے ذہن کو اتنا الجھا دیا ہے۔

سبھی لوگ میری بتائی ہوئی ان تصاویر کو دیکھ کر ہلچلے ہیں
مگر ان کی آنکھیں

فقط شوخ رنگوں، چمکتی لکیروں، فسوں کا قوسوں میں
کھوئی رہی ہیں

سبھی نے فقط جگہ گاتے ہوئے شہر کا نور دیکھا

مگر بھول کر بھی کوئی اس اندھیرے مکاں تک نہ پہنچا

یہ سایوں کی دنیا، اندھیروں کا مسکن

مصوّر کا ایک نقشِ لوحہ کناں ہے

یہ ہاسم کاوش!

مری ناتمام آرزو اس مجرم فراواں میں بھی

اک بجھا و کرم کو ترستی رہی ہے

یہ توہین فنکار کی موت ہے

ہاں یہ توہین۔ فنکار کی موت ہے

مصوّر گمراہ کی..... قیمت؟

منصور: فقط قدرِ ذاتی۔

خالدہ: مراد عام ہے... اگر میں اسے لینا چاہوں

منصور: نہیں یہ ابھی نامکمل ہے

خالدہ: وہ کس طرح؟

منصور: اس اندھیرے مکاں کا دریچہ

ابھی منتظر ہے کسی ایسے پیکر کا

جس کے رنگ دہے میں یہ جگہ کا ہوا شہر طوفاں اٹھائے

مگر اس کے قدموں میں ساحل کی زنجیرِ ظلمت پڑی ہو

یہ نورِ ظلمت کی پیہم کش

مرے شاہ پارے کو تکمیل کا رنگ دے گی

مجھے اس خیالی ہیوے کی، اس پکیہ خواب کی جستجو ہے۔

نہ جانے یہ تصویر کب تک ادھوری رہے گی

نہ جانے یہ تصویر کب تک ادھوری رہے گی

(اپنے آپ سے کھوئے ہوئے لہجے میں)

یہ خاتون تصویر میں کس قدر کھو گئی ہے

یہ بکھری ہوئی زلف۔ جیسے زمانے کا دکھ اس پر سایہ لگن ہو

یہ غمگین آنکھیں۔ کہ جیسے کسی خواب گول جھیل میں

دو کنول شام ہستی کے ٹہرے میں لپٹے ہوئے ہوں۔

یہ گھٹنا رلب جیسے بارغِ جوانی کی کلیاں بہاروں کے انجام

سے باخبر ہوں

یہ معنوم چہرہ۔ کہ جیسے کسی جگہ گاتے ہوئے شہر پر دھند

چھب گئی ہو

مسلل اداسی میں ڈوبی ہوئی فوجوانی

خوشی میں بھی لوحہ گر ہے

یہ پیکر وہی ہے جسے میں نے

منعوم صبحوں میں، خاموش شاموں میں ویران راتوں میں

ڈھونڈا

مجھے مل گیا۔ میرے تاریک و تنہا مکاں کا کیس

(تقریباً آتے ہوئے) اجنبی نیک خاتون! میں آپ کی قدرِ ذاتی

کا مشکور ہوں

میرے فن کا اتفاق ابھی یہ ہے کہ میں آپ کی نذر کردوں یہ تصویر

لیکن اگر آپ کچھ روز اس نامکمل ہیسلے کی تکمیل تک ایک

زحمت اٹھائیں

خالدہ: وہ کیسے؟

منصور: مری آرزو ہے... کہ میں اس اندھیرے مکاں کے دیکھے میں

اس روشنی کی کرن کھینچ لاؤں

جو اس جگہ گاتے ہوئے شہر کی تابناکی سے تابندہ تر ہو

اگر آپ کچھ روز تک شام کو چند لمحے

مرے سامنے آکر بیٹھیں

تو میں آپ کو اپنی تصویر کے اس دریچے کی زینت بنا دوں

یہ شہر کا جس دن مکمل ہو۔ بس آپ کا ہے۔

خالدہ: مصوّر۔ مجھے تیرے فن سے عقیدت ہے

مگر میری موجودگی تیرے فن کے کسی کام آئے

تو میں... غواہ کچھ ہو۔ یہاں روز آتی رہوں گی...
اسے شام ڈھلنے کو ہے... لوگ سب جا چکے
مجھ کو لازم ہے... اب میں بھی جاؤں
معتور، تو کل شام؟
خالدہ: ہاں، میں ضرور آؤں گی
(موسیقی)

بوڑھا: آمنہ!
ہو چکی شام مگر نکلہ اسکول سے اب تک نہیں واپس آئی
دسویں بجے کو پریشان کئے دیتے ہیں
آمنہ: آج کچھ دیر سے آنے کے لئے اس نے کہا تھا مجھ سے
اس کے اسکول کے پاس
اک نمائش تھی۔ دہی آج اسے جاتا تھا
ابھی آتی ہوگی
بوڑھا: ہوں، تو اب۔

اس کو بھی شہر کی رنگینیاں بہکائے لگیں
آخرا اس پہ بھی یہ پرچھائیاں اب پھیلنے لگیں
آہ اس شہر کی یہ روشنیاں!
تکے معصوم چراغوں کو بجھا دیتی ہیں
کتنے تاریک مکوں کو ٹٹا دیتی ہیں
آہ اس شہر کی یہ روشنیاں!

آمنہ: جاتے کیوں واسے بظن کئے دیتے ہیں نہیں
خود سے، ماحول سے، مٹی سے، سمی دنیا سے!
واسے کتنے گناہوں کو جنم دیتے ہیں
آدمی اپنے تراشے ہوئے بت پوجتا ہے...
ہم کہ اب عمر کی اس منزل تاریک میں ہیں
جس میں اک شمع کی موہوم سی ضرور
ایک ہلکی سی کرن

خیر کہہ دیتی ہے آنکھوں کو۔ وہاں
تابِ نظر گئی مشعلِ خورشید کے
اپنی محرومی کا احساس ہے، اس تنگ جگہ کی سبب،
خود نہیں رکھتے تو اوروں کے بھاتے ہیں چراغ

بوڑھا: ٹھیک کہتی ہو مگر
یہ مرے واسے وہ تلخ حقائق ہیں جنہیں
میری بے نور نگاہیں ہی فقط دیکھتی ہیں
یہ نظر سوز نظارے یہ بھڑکتے منظر

یہ چکا چوندیہ جلووں کا ہجوم
رنگ داہنگ کا طوفان۔ یہ سیل انوار
اک ملمع ہے، نمائش ہے، دکھا واسے ہے
اک فسوں کا رتنے ہر سمت بجا رکھا ہے
ہائے اس سادہ و معصوم نظر کی قسمت
جو فقط ظاہری جلووں سے ہو مسور مگر
موت کے دام سے بیگانہ رہے
اپنے انجم سے بیگانہ رہے
(خالدہ کے قدموں کی چاپ سنائی دیتی ہے)

آمنہ: خالدہ آگئی۔ بہتر ہے کہ خاموش رہیں
بوڑھا: میں تو خاموش ہوں، خاموش ہی ہو جاؤں گا
میں تو خاموش ہوں، خاموش ہی ہو جاؤں گا
(موسیقی)

(معتور کا کمرہ)

(تصویر بناتے ہیں گم۔ اور اپنی آواز سے خود بے خبری کا)

معتور: تیری تصویر کہ خوابور کا جہاں ہو جیسے
میرا دل میری تمنا، مری جہاں ہو جیسے
چشمِ نرگس کو میں کچھ اور بھی حیراں کر دوں
ذلفِ آوارہ کو کچھ اور پریشاں کر دوں
جھیل میں پرتوِ تاب رواں ہو جیسے
تیری تصویر کہ خوابوں کا جہاں ہو جیسے
جلوہ افروز ہو پر دوں میں بھی افسوں شباب
جس طرح شیشہ مے سے نہ چھپے عکس شراب
آپ سے آپ کھل جاتے ہیں ہونٹوں کے گلاب
آمدِ صبح بہاواں کا سماں ہو جیسے
تیری تصویر کہ خوابوں کا جہاں ہو جیسے
کس قدر سادہ و سادہ ہے جوانی تیری

میرے ہر نقش میں پہاں ہے کہانی تیری
فن کی معراج ہے تصویر بنائی تیری

ہر مصوٰر تیری جانب نگراں ہو جیسے
تیری تصویر کہ خوابوں کا جہاں ہو جیسے
خالہ: کہے قدموں کی چاپ -

کمرے کا دروازہ کھلتا ہے اور
مصوٰر خاموش ہو جاتا ہے،

مصوٰر: تون؟ تم خالہ، آؤ بیٹھو

خالہ: مت ودا، بڑے خوش نظر آ رہے ہو

کہ جیسے جہاں بھر کی دولت تمہیں مل گئی ہو

مصوٰر: بہت خوش ہوں میں، واقعی جس طرح ایک دروازہ لڑکوں

کوئی بخش دے ہفت اقلیم کی بادشاہت

خالہ: ذرا ہم بھی جانیں کہ وہ تون حاتم ہے اور کونسی بادشاہت

ہے جس کے سبب تم ذرا مسرت سے نغمہ بہ لب لگتے۔

مصوٰر: سخاوت اگر ہو تو ایسی

کہ دس کرم اپنی بخشش سے خود بے خبر ہوں

میرے سامنے میں وہ بخشندہ و بادشاہت

خالہ: (مسرت سے) مصوٰر!

مصوٰر: مری ناتمام آرزو آج پوری ہوئی ہے

یہ تصویر میری تمت کی معراج

دیکھو - اندھیرے مکاں کے دریکچے میں

یہ روشنی کی کرن کے قدر و صداقت ہے

خالہ: تو کیا یہ اندھیروں میں ڈوبا مراہی مکاں تھا

جہاں آج تابانیاں موجزن ہیں؟

مصوٰر: نہیں تم تو خود روشنی ہو

ستاروں کے گھر کب اندھیرے ہوئے ہیں

یہ ظلمت میں ڈوبا مکاں

ایک فنکار کا غمگینہ، اک مصوٰر کا تصویر خانہ تھا جس پر

زمانے کی بے اعتنائی کے سائے پڑاؤں رہے ہیں

کسی نے تمہارے سوا یہ نہ دیکھا

کہ اس سبیل رنگ و طرب میں بھی آخر کوئی فوج گرے۔

تمہارا کرم تھا کہ تم حسب وعدہ
مرے فن کی نگین کو میرے ظلمت کندے میں کئی روز تک
روشنی کے آتی رہی ہو۔

خالہ: تو کیا اے مصوٰر، تمہارا مکاں بھی اندھیروں میں گم تھا؟

تو کیا ہر مکاں تیرہ دتا و سایوں میں ڈوبا ہوا ہے؟

یہ سب روشنی پھر کہاں کھو گئی ہے؟

کہاں ہے وہ نور شب - وہ منبع نور؟

وہ روشنی کا سمندر

کہ جس کے لئے تیرہ دتا و دنیا میں شام و سحر منتظر ہیں،

مصوٰر تمہیں روشنی کی ضرورت نہیں ہے،

تمہیں روشنی کی ضرورت نہیں

میرا تاریک گھر اک کرن کو تہہ بست ہے

اور یہ کرن ... یہ کرن؟

مصوٰر: مل تمہاری ہے، و حسب وعدہ یہ تصویر حاضر ہے۔

اب اس مکاں میں اندھیرا نہیں

یہ بھی اس جگہ گا - تہ ہوئے شہر کا آب حصد ہے

یہ تو وہ تیرگی سیل انوار میں کھل گیا مل گیا

روشنی تو ملی - ... روشنی تو ملی

خالہ: اچانک تمہاری نگاہوں میں کس سوچ کے دائرے تیرے

لگ گئے ہیں؟

یہ ایک مسرت کی لہروں میں کن حسرتوں کے بھنور پڑ گئے؟

جس طرح تم سے بل بھر میں ہی چن گئی ہفت اقلیم کی بادشاہت

کہو ... چپ ہو کیوں ... کچھ تو بولو، مصوٰر

مصوٰر: نہیں، کچھ نہیں، سوچتا ہوں کہ جب چاند تارے بھی محتاج

ہیں روشنی کے

تو پھر میں اندھیروں کا باسی

کہ جس کے مقدّر میں تاریکیاں ہیں اندھیرے ہیں

کیوں آرزوئے ضیا میں - اجالوں سے شکوہ کننا ہوں

مجھے میری تاریکیاں چاہئیں صرف تاریکیاں - صرف تاریکیاں

مجھے جگہ گاتے ہوئے شہر کے کتنا دھوکا دیا ہے

کہ میں اپنے فن کا گلا گھونٹ کر سیل انوار میں بہہ چلا تھا۔

مصور کی دنیا تو ظلمت کدو ہے

اسے جگمگاتے ہوئے شہر سے کیا؟

تو... خاتون... کل شام میں آپ کے شہر کو چھوڑ جاؤں گا

کل شام، اسی وقت

خالدہ! تو کیا واقعی تم مرے شہر کو چھوڑ کر جا رہے ہو؟

مصور نہ جاؤ... نہ جاؤ مصور،

مصور مجھے صرف فن سے محبت ہے۔

شہروں سے، لوگوں سے، بچیوں سے، شاموں سے نسبت

نہیں ہے،

مجھے آپ سے آپ کا عکس پیا رہتا ہے

جو میلے خونِ جگر سے سمایا ہے روشنی کیا ہے

اسی کے لئے میں یہاں چند دن رک گیا تھا

اور اب جب مکمل ہے یہ نقش۔ میں جا رہا ہوں

ابھی جلتے کتنے ہیولے مرے منتظر ہیں

ابھی جالتے کتنے ہیولے مرے منتظر ہیں

(موسیقی)

بوڑھا: آمنہ! جو چکی شام مگر خالدہ گھرا آئی نہیں

جالتے کیا بات ہے، کیوں آج پریشاں ہے طبیعت میری

آمنہ: ابھی آتی ہوگی

بوڑھا: ابھی آتی ہوگی

اب تو یہ روز کا معمول ہوا۔

خالدہ شام سے پہلے کبھی گھرا آتی نہیں

اور گھرا آئے تو اپنے ہی خیالوں میں گمن رہتی ہے

نہ اسے باپ کا غم ہے نہ اسے ماں کا خیال

طورے طور ہوئے جاتے ہیں۔

آمنہ: جالتے یہ واہے کب ختم تمہارے ہوں گے

تم کو معلوم تو ہے

خالدہ ان دنوں اسکول میں مصروف بہت رہتی ہے

صبح سے شام تک

اک اذیت میں گرفتار ہے نازک بچی

بوڑھا: چاہے تم کچھ بھی کہو (تلخ ہنس میں) کل سے اب خالدہ اسکول

نہیں جاتے گی

(خالدہ کے تھروں کی چاب)

آمنہ: خالدہ آگئی

بوڑھا: کل سے اب خالدہ اسکول نہیں جاتے گی

خالدہ: کیا ہوا؟

بوڑھا: خالدہ! کل سے تم اسکول نہیں جاؤ گی

سن یا! کل سے تم اسکول نہیں جاؤ گی

خالدہ: ماں... مگر

بوڑھا: بس نہیں جاؤ گی تم۔

آمنہ: لیکن اتنا سوچو

خالدہ نوکری چھوڑے گی تو ہم کیسے جیئیں گے آخر؟

تم بھی معذور ہو... میں بھی مجبور

دوسرا کوئی سہارا بھی نہیں۔

بوڑھا: وائے محرومی تقدیر کہ جس کے باعث

آج میں اپنی جوان بیٹی پر

بار ہوں۔ بارگراں

پھر بھی میں یہ کبھی برداشت نہیں کر سکتا

خالدہ: باپ کی محتاجی و معذوری کے پردے میں مرا

اتنی تذلیل کرے

اس سے پہلے کہ یہ افلاس مرا

میری غیرت مری ناموس کا نیلام کرے

میں بچا دوں گا ہر اک شمعِ حیات

زندگی، موت سے بدتر ہے اگر غیرت و ناموس نہیں...

کچھ بھی ہو

نہج کو منظور ہے ہر ایک عذاب

مجھ کو منظور ہے ہر ایک عذاب

(شدت سے کھانسی)

(موسیقی)

(شام کا منظر۔ گھر ڈیال سات بجائے کسی

آدا شہر کا بازار۔ باری، گھنٹیوں، تھمپوں

اور ہل روم کی موسیقی کے اثرات)

خالدہ: (وائے آپ سے): آہ یہ شام کس درجہ اندوہ میں ہے

مگر آج بھی شہر کس ہے عالم

آمنہ: (خیالی آواز): خالد، نوکری چھوڑے گی تو ہم کیسے نہیں گئے آخر
تم بھی معذور ہو میں بھی مجبور
دوسرا کوئی سہارا بھی نہیں
دوسرا کوئی سہارا بھی نہیں
خالدہ: نہیں میری دنیا بھی لاشوں کا گھر ہے

میرا کب تک یہ لاشیں اٹھائے اندھیروں میں بھٹکوں
میری زندگی سرد لاشوں کے بارگراؤں سے سسکتے لگی ہے
مصور، مجھے اب تمہاری ضرورت نہیں
کہ تم بھی اسی جگہ کاتے ہوئے شہر کی اک کرن تھے
تمہارا وجود ایک زرتاب ذرہ تھا جو

اپنے مرکز سے پھر باہر
تم بھی اس شہر کے ایک جگہ تھے
جوان اندھیروں میں اک پل کا جہان تھا اور بس
اک کرین، ایک جگہ سے ظلمت کی دیوار کب گر سکی ہے
یہ لاشیں

کہ جن کے لئے میں نے اپنی دھڑکتی جوانی کو مفلوج رکھا ہے
اب وہ بھی مجھ کو فقط باعث تنگ گردانتی ہیں
تو کیا وہ مقدس فریضہ مراجع تھا جس کی خاطر
میرا اک لاش بنکر اندھیروں میں ڈوب رہی ہوں
تو کیا یہ میری زندگی شہر کی طرٹ
تا ابد روشنی سے گریزاں رہے گی؟
مرے سامنے اک طرف یہ پھلکتا ہوا شہر ہے۔
روشنی کا سمندر ہے

جو سرد لاشوں سے بیگانہ مینہ سی ہوئی زندگی کا چال ہے
اور اک سمت ساحل کی زنجیر ظلمت۔ میری آرزوؤں کی قاتلی
ادھر روشنی۔ زندگی

اور ادھر۔ موت۔ اور موت کی تیرگی
اگر یہ اجالے میری دسترس میں نہیں ہیں
تو پھر۔ موت کی مستقل تیرگی کو دکھوں اپنا سکنا بنا لوں؟
میں اس نور و ظلمت کو اب تو نوروں کی۔
فقط موت ہی میری اس کشش کا حوالہ ہے

باقی دوسرے

کہ ہر سمت جیسے چراغاں ہوا ہو
وہی درد کے زخموں سے۔ قہقہے۔ قہقہے جیسے جن طرف ہو
وہی جگہ کاتے درد باہم روشن دریکے
وہی رقص کا ہوں کے منظر
یہ انہوں کا سیلاب گیتوں کی کرنیں
بھڑکتے باروں میں خوش باش رہ گیا خوش بخت پیکر
وہی زندگی روشنی۔ روشنی زندگی
اور میرا مکان۔ اے مصور، یہ تم میری نہیں ہے
نہیں۔۔ میری دنیا میں اب تک اندھیرے بے ہیں
یہاں ظلمتیں اب بھی نور کا کنا ہیں مصور
مصلوبی خیالی آواز، نہیں تم تو خود روشنی ہو

ستاروں کے گھر کب اندھیرے ہوئے ہیں
مجھے جگہ کاتے ہوئے شہر نے کتنا دھوکا دیا تھا
کہ میں اپنے فن کو سسکتا ہوا چھوڑ کر
سیل انوار میں بہہ چلا تھا
مصور کی دنیا تو ظلمت کدہ ہے
میں یہ جگہ کاتا ہوا شہر کل چھوڑ جاؤں گا
کتنے ہی بولے مرے منتظر ہیں

خالدہ: مجھے چھوڑ کر تم کہاں جا رہے ہو
گھر۔۔۔ ہاں۔۔۔ تمہیں اپنے فن سے غرض
اپنے بے جان رنگوں، ادنیٰ لکیروں سے۔
خاموش سیالوں سے ساکن ہموالوں سے الگ۔ ہے
تم نقش گر ہو، تمہارے لئے زندگی میں
دھڑکتے دلوں، گنگناتے لبوں، جھللاتے چراغوں پہکتی
شاعیوں میں

کچھ بھی نہیں ہے!
فقط کاغذی بت۔ خیال صدمہ سرد لاشیں
تمہاری جگہ ہوں کے مرکز۔ مگر بولتی زندگی سے گریزاں
پورھا (خیالی آواز):
خالدہ، کل سے تم اسکول نہیں جاؤ گی
خالدہ، کل سے تم اسکول نہیں جاؤ گی

”جہاں میں تھا“

لفٹیننٹ کرنل خواجہ عبدالرشید

کے الفاظ بھی دیئے۔ پہلوی تو مشہور ہے ہی جس کی یاد اعلیٰ حضرت
محمد رضا شاہ پہلوی مرحوم نے تازہ کی تھی۔ خیر حصہ بقدر حقہ۔ یہ دلوں پر
لازمًا خوش خوراک ہوں گے۔ کشتی کا اکھاڑہ نہ ہی کھانے کا اکھاڑہ
ہی ہے۔ یا آپ پہلوانوں کی رعایت سے ہفت خواں کہہ لیجئے۔ یہ
”میل سیستان“ رستم ہی تو تھا جس نے قوی ہیکل دہقان، اولاد کے
کلان اکینہ کرخونا خون اس کی ہتھیلی پر رکھ دیئے تھے۔ اس لئے
میرے جیسے غیر پہلوان پہلے ہی سے ڈر رہے تھے۔ بہر حال جب وقت
آیا تو ہم اپنے مجسم دشمن، شہ زور، ہم نوال، ہم پیالہ، دوستوں کا نہایت
بیچینی سے انتظار کرنے لگے۔

اس دعوت کا سہرا ہم سب کے مشترک دوست الحاج، میاں
منظور حسین کے مرتھا۔ آپ انہیں جانتے ہی ہوں گے۔ ”گجرات بس برس“
کراچی روڈ ٹرانسپورٹ کارپوریشن“ جیسے اداروں کے صدر ان کے والد
میاں کرم الہی بھی گجرات سے تشریف لائے ہوئے تھے، بڑے جہان نواز،
اہل گجرات کی زندہ دلی کا نمونہ عزت بیگ نے اسی سرزمین پر پہنچ کر جیل
عمر تیار رہا۔ ”کرم“ کے مصداق اپنا سارا دھن دولت سب کچھ
ٹا دیا تھا۔

موصوف کے رستم ہند امام بخش کے ساتھ بڑے گہرے دوستانہ
مراسم ہیں اس لئے جب وہ کراچی تشریف لائے تو یہ کیسے ممکن تھا
کہ وہ اپنے یار سبز کو حاضر تاول کرنے کی رحمت نہ دیتے؛ چلے بیٹھا کہ شاید
ہی، تقریب پر ملاقات ہی ہی مگر معلوم نہیں کیا کچھ کو نہیں بھی ان بولوں گروں کے

دعوتیں کھانے کا اتفاق، تو اکثر ہوا ہے، پاکستان میں بھی اور
پاکستان سے باہر بھی کبھی وزیروں کے ساتھ، کبھی بڑے بڑے رؤسا
کے ساتھ، مگر جو لطف پہلوانوں کے ساتھ کھانا کھانے میں ہے وہ
کسی بڑی سے بڑی محفل طعام میں بھی کہاں؟ یہ میری خوش قسمتی تھی کہ
مجھے ایک ایسا موقع میسر آیا اور محفل بھی وہ جو پاکستان کے مایہ ناز
پہلوان، رستم ہند امام بخش، اور ان کے فرزند ان رشید کے اعزاز میں
منعقد ہوئی تھی۔ دعوت شیراز تو طائر ہے یہ ہو ہی نہیں سکتی تھی، پھر
بھی اتنا ضرور ہے کہ اس میں نہ کوئی تکلف تھا، نہ نمود۔ سادگی بطور
خاموشی، انہماک اس دعوت کے نمایاں خواص تھے۔ نہ کوئی ہنگامہ نہ
اعلیٰ وادنیٰ کی تخصیص، نہ لباس کا امتیاز بلکہ دعوتی رقعوں کا جھنجھٹ
نہ تھا۔ نشست فرش اور بلا تکلف۔ عام لباس، سیدھا سا داکر
سیٹنے کی ضرورت ہی پیش نہ آئے جیسے کوئی چاہے آرام سے بیٹھے
جس طرے چاہے کھائے پیئے، بات چیت کرے۔ کوئی کیل کانٹوں سے
لیں ہو کر نہیں آیا تھا! مطلب یہ ہے کہ دعوت کے لئے زمین پوری
طرح ہموار کر دی گئی تھی، اور بس، تاکہ کھانا پورے ذوق و شوق سے
کھایا جاسکے۔

ہونے کو تو ہم بھی اس محفل میں شریک تھے، لیکن کہاں وہ
رستم واسفندیار کے جانشین اور کہاں ہم۔ آپ کو یہ تو معلوم ہی ہوگا
کہ لفظ ”پہلوان“ غالباً ”پارتھین“ سے ماخوذ ہے جس کے بہادروں
نے روما کے بڑے بڑے فاتحین، انڈینی وغیرہ کے دانت

بھی کھینچ کر دیئے تھے تب ہی سے انگریزی میں PARTHIAN SHOT
(قادرانہ زنی، تبریکگی) بطور ضرب المثل مشہور ہو گیا ہے۔ اپنی
”پارتھیوں“ نے ”فارسی“ کو پہلو (شہر) اور ”پہلوان“

لے کھائے پیئے ہیں! (ادارہ)

نے تصویر سے تو یہ گمان نہیں ہوتا! (ادارہ)

لے لٹکا میں سب بادل گز کے ہونے ہیں بک یوں بھی سنا ہے کہ ہر چیز کے درکار
ہم رفت نمک شد! شاید اس لئے آپ بھی اس میں دھرتے گئے ہوں! (ادارہ)

لمبا گلاس، سب کو دیا گیا۔ مجھے تولیوں لگا جیسے ناونوش کی یہی انتہا ہو۔ یعنی مزید کچھ کھانے پینے کی نوبت شاید ہی آئے۔ شربت مہانوں کی فرمائش پر ہی تیار کیا گیا تھا اور ”نسخہ“ کے مطابق تھا۔ میں ہم غیر پہلوان بھلا کیا جانیں کہ پہلوانوں کی غذا کیا ہے۔

کھانا تھا تو مختصر مگر چٹا گیا بڑے سلیقے سے۔ سبجان اللہ خوشبوؤں کی کیا کیا لپٹیں اٹھ رہی تھیں۔ مرغ پلاؤ، قورمہ، شیرینی پھل۔ قورمے میں گوشت کے ساتھ ابلے ہوئے اندے جس سے کھانا دو آتشہ ہو گیا۔ ساتھ ہی بڑے بڑے پرانے۔ کھانا بڑا مرغن کسی استاد کا پکایا ہوا جو کراچی میں ذرا کم ہی نصیب ہوتا ہے۔ یہ کھانا تو واقعی لکھنؤ کے روایتی کا پداروں کی یاد دلاتا تھا۔ خالص گھی میں پکنا ہوا اور اسی میں شرابور، بلکہ ترتراتا ہوا۔ مہک ایسی کہ خواہ مخواہ کھانے کو جی لچا۔ میں بڑے اشتیاق سے، کنکھیوں سے دیکھنے لگا کہ اب کھانے کا پہلوانی محاذ کیسے قائم ہوتا ہے اور کیا کیا استادانہ بات، کیسے کیسے داؤ بیچ دکھائے جاتے ہیں۔ بار بار تھ کی روانی کا وہ نقشہ سامنے آتا جو کبھی فکا ہی شاعر، خضر میمن نے کھینچا تھا۔ امام بخش تنہا معرکہ سر کرنے نہیں آئے تھے۔ ان کے ساتھ تقریباً بیس کا راز مودہ شاکر دوں کا پرانی تھا تاکہ جنگل میں مشکل کی طرح منزل میں داخل کا بھی کچھ سماں بندھ جائے۔

پہلوانوں کا یہ ٹولہ بڑی بے کلنی کے ساتھ وارد ہوا۔ سیدھا سادا لباس دیکھ کر حیرت ہوتی تھی۔ ہمارے ملک کا بہترین لباس ہے تو یہی۔ کرتہ اور تہمد۔ ہمان جو تے اتار کر قالین پر آتی پالتی مار کر تھو گئے۔ بھلا انہیں کالروں، کنکشیوں کی ٹوک پلک کے جھنجھٹ سے کیا واسطہ۔ پتلون میں شکن پڑ گئی، اس کا انہیں غم کہاں۔ بیٹھے ہی سلسلے دسترخوان کچھ گئے۔ یعنی صف طعام برپا ہو گئی۔ کھانا بھی چن دیا گیا۔ ادھر ادھر کی باتیں بھی ہو رہی تھیں۔ کہیں زیر لب بات چیت، کہیں تمغہ پر تمغہ۔ اور پھر تمغہ بھی پہلوانی۔ کہ صاعقہ کا گماں ہو۔ ادھر دھیمی آواز میں ریکارڈ بھی بج رہے تھے۔

ساتھ شامل کر لیا گیا۔ فخر و قہامت میں ہم ان کے حریف کیا ہوں گے۔ چونکہ پہلے کبھی ایسی صحبت میں شریک ہونے کا اتفاق نہیں ہوا تھا۔ اس لئے بڑی بے تابی کے ساتھ وقت کا منتظر رہا۔ طرح طرح کے خیالات ذہن میں گھومتے رہے۔ یہ میرے لئے پہلا موقع ہو گا کہ میں پاکستان کے مایہ ناز اور عالمی شہرت رکھنے والے ان سپورتوں کو یکجا دیکھ سکوں گا۔ ان کے ساتھ کھانا بھی کھاؤں گا، اور سب سے بڑھ کر یہ کہ وہ جو کھانے کے ساتھ ”انصاف کریں گے“ بلکہ یوں کہنے کو کھانے کی کشتیوں سے ”کشتی“ لڑیں گے، اس معرکہ کے دیکھنے کا بھی موقع ملے گا۔ یوں پہلوانوں کی خوش خوری کے متعلق میں بہت کچھ سن چکا تھا۔ مگر کج اس کی تصدیق ہونے والی تھی۔

میرے اشتیاق کا یہ عالم تھا کہ میں نے فون پر اپنے میزبان سے درخواست کی کہ اس موقع پر ایک فوٹو گرافر کا بھی انتظام کیا جائے تو بہتر ہے کیونکہ ایسے نادر مواقع کم ہی ہوتے ہیں۔ یہ فوٹو بطور یادگار محفوظ ہو جائیں گے۔ اس سے قبل یہ خواہش کبھی پیدا نہ ہوئی تھی۔ خیر، خدا خدا کر کے وہ وقت آ ہی پہنچا۔ اور ہم ”میدان عمل“ میں پہنچ ہی گئے۔ مگر ابھی صبح جہان، یعنی پہلوان صاحبان تشریف نہیں لائے تھے۔ ان کو لانے کے لئے ایک لابی بھیجی گئی تھی اور یہی سواری ان کے لئے موزوں بھی تھی۔ ارٹھائی بجے کے قریب سب لوگ تشریف لے آئے۔ معزز مہانوں کا بڑے ندر شور سے استقبال کیا گیا۔ امام بخش کو سرخ اور زینہ نوٹا کے ہار بطور اعزاز پہنائے گئے، جس نے اور بھی بہار پیدا کر دی۔ پھر سب لوگوں کو ”میدان کارزار“ یعنی ”گجرات ہاؤس“ کے ایوان طعنا میں پہنچایا گیا جو بالائی منزل پر تھا۔ ہمارا بھی یہی گمان تھا کہ اس جگہ صبح معرکہ دہشتاگرہ گرم ہو گا۔ امام بخش کے ساتھ ان کے تین صاحبزائے بھی تھے۔ سب یکساں نامور۔ بھدو، اسلم، گوٹا۔ اور دو کس پوتے بھی۔ ایک پوتا۔ جو سات برس کے قریب لگ رہا تھا، ماشاء اللہ پوت کے پاؤں پالنے میں نظر آتے ہیں ”کامنو تھا۔ اس کا ذیل ڈول اور پہلوانی دم ختم کی شروعات صاف اعلان کر رہی تھیں کہ یہ اس خاندان کی روایات کو خوب برقرار رکھے گا۔ ہر ہمارا بروا کے چمکے چمکے پات۔ سب سے پہلے شربت کا دو چلا۔ پہلی مرتبہ پہلوانی شربت بھی پیا۔ کتنا فرحت بخش! اس کا ایک ایک بڑا، قد آور، ہاتھ

۱۰ علامہ حسین کشمیری نے مدت ہوئی لکھا تھا۔

کتیں جو چند گز دین تو قوم کی ہر زندگی

لہو جو ہے خدوس کا وہ قوم کی زکوۃ ہے (ادارہ)

سے چلتے پھرتے، کھاتے پیتے اور خوب ڈنڈ پیلے ہیں۔ بالکل بند توانا، اور عادی بھی صرف مرغز غذاؤں کے۔ سلسلے وہ اب بھی بڑا پلدا ایک گھنٹہ ورزش کرتے ہیں۔ یہی ان کی صحت و توانائی کا راز ہے ہم لوگوں کو خدا رک کیسے ہمیں ہر وجہ ورزش کی عادت ہی نہیں رہی بلکہ اس سے کوسوں دور بھاگتے ہیں۔ "بیڈ ٹی" کے بغیر بات نہیں کرتے۔ ورزش تو پھر دور کی بات ہے۔ پیدل چلنا باعث عارضی ہے میں مشہور مقولہ ہے، قیصر کا حق قیصر کو ادا کرو اور خدا کا حق خدا کو مطلب یہی کہ تن کا حق تن کو دیتے رہو اور من کا من کو۔ اگر ہم تن کا حق ادا نہ کریں گے تو وہ بغاوت کیوں نہ کرے؟

نوجوانوں کے لئے کرلہجی میں کھیل کے میدان کتنے ہیں، اور ہوں بھی تو وہ کھیلے کب ہیں؟ اگر ہمارے نوجوان کام کریں اور کھیلے کھیلے پوری طرح تنگ جائیں تو ان کی خدا رک بھی بڑے اور فضول شرارتیں بھی کم سو جائیں۔ نوجوانوں کی ورزش تو بس رقص تک محدود ہو گئی ہے۔ اور آپ جائیں رقص کے ساتھ اور کیا کچھ نہیں۔ ورزش ضبط اور تاب تو ان کا تحفظ سکھاتی ہے اور یہی ہم میں ناپید ہے۔ ہم لوگ جسمانی محنت سے بھی جی چراتے ہیں کہ اس سے تکلیف ہوتی ہے جس طرف دیکھئے "صاحب پہلوان کرسیوں پر بچے بیٹھے ہیں۔ دفتر سے نکلے تو موٹر، یا رکشا، ٹیکسی، بس پر سوار جسم میں طاقت آئے تو کیونکر؟ جبھی تو وہ ہیں اور طرح طرح کے امراض، ڈاکٹر بچا رہے بھی ان کی بڑھتی ہوئی تعداد دیکھ کر گھبراتے ہیں اور ان کا علاج نہیں کر پاتے۔ معدے کا کارہ، ہوجھکے ہیں، صحتیں بگڑ گئیں۔

آپ بھی کہیں گے کہ یہ کیا رنگ میں بونگ ملا دی۔ کھانے اور گانے بجانے میں یہ کھراگ کیسا! وہ کھانے کی بات تو یقیناً ہی پڑ رہ گئی۔ خیر، کھانا ختم ہوا تو پھلوں پر حملہ ہوا۔ انہیں بھی بڑے ذوق شوق سے کھایا گیا۔ ایک پہلوان کو کہتے سنہ ۱۲۶ کل کیلے کھا گیا تھا۔ دوسرے نے مصرع طرح لگایا کہ "اب بھی اتنا کچھ کھانے پینے کے بعد بارہ درجن کیلے گھوٹ کر لاؤ تو نوش کر جاؤں!" میرے تو سن کر ہوش اڑ گئے۔ خدا ہمارے ان پہلوانوں کو سلامت لے آپ نے دوسری تفصیلات تو بیان ہی نہیں کیں۔ مگر اجناس کا انازہ

بھی اسی سے کیا جا سکتا ہے۔ (ادارہ)

باتی ۲۷

جو دلوں کے ساتھ کام و دہاں کو بھی تیار کر رہے تھے۔ ماہرین خوراک کا نظریہ تو یہی ہے۔ پہلوان گانوں کے لئے ہم تن گوش۔ اتنے ذوق! اس کا تو ہمیں وہم و گمان بھی نہ تھا۔ دھیان کھانے کی طرف، کان گلانے کی طرف۔ خصوصاً اسلم اور بھولو تو دھیرے دھیرے پاؤں کے ساتھ تال بھی دیتے جاتے تھے۔ امام بخش نے تو ایک دوسرے سم پر سر بھی جھٹکا! پہلوان اور موسیقی۔ مجھے یہ تال میل بڑا عجیب لگا۔ مگر ایسا ہی عجیب یہ بھی ہے کہ اکثر ریاستوں میں جہاں پہلوانوں کی بڑی قدر ہوا کرتی تھی، اچھی اچھی ڈیرہ دارنیاں بھی ان کے فن کا بچہ قدر دان ہوتیں۔ بہر حال مجھے یہ دیکھ کر بڑی خوشی ہوئی کہ ہمارے پہلوان صرف پہلوان ہی نہیں۔ خشک اور بے ذوق۔ بلکہ بڑے خوش مذاق اور زندہ دل بھی ہیں۔

لباس جتنا مختصر اور صاف ستھرا اتنا ہی چال میں وقار اور خود اعتمادی جسم گھٹے ہوئے، کسرتی، جیسے فولاد۔ مگر کیا مجال جو چرس پر غور کی ذرا بھی جھلک ہو۔ سب بڑی خاموشی اور خوش تیزی کے ساتھ بیٹھے کھاتے رہے، آہستہ آہستہ باتیں بھی کرتے جاتے۔ میں برابر کنکھروں سے ان کی شرعہ خوراک کا منظر دیکھتا رہا۔ کھانے کا سلسلہ فقو سوا گھنٹے جاری رہا۔ سب نے حسبِ توقع کھانے کے ساتھ خوب انصاف کیا۔ اور جتنا بقدر جتن کی صداقت پر پوری طرح مباد۔ اپنے پہلوان بھائیوں کو کھاتے دیکھ کر بے حد خوشی ہوئی۔ جیسے اس مظاہر میں ہم بھی شریک ہوں اور اپنے آپ پر ناز کر سکیں، زیادہ تر خوشی اس لئے ہوئی کہ آج بھی ہم میں ایسے لوگ موجود ہیں جو حقیقی معنوں میں "کھاسکتے ہیں" ورنہ آج کل تو جہاں دیکھیں "ڈائٹنگ" یعنی خوراک کم کرنے اور جسم کو گھلاتے جانے کا چرچا ہو رہا ہے۔ اور شرقی ہو یا مغرب، لوگ اسی پر فخر کرتے ہیں، بلکہ پھولے نہیں سماتے کہ ہم "ڈائٹنگ" پر کاربند ہیں۔ اِلا ماشاء اللہ۔ میرا خیال ہے ماہرین طب کو چاہئے پہلوانوں کی خوراک کا سائنسی جائزہ لیں اور اس پر تحقیق کریں۔ وہ تو آئے دن یہی پتی پڑھاتے رہتے ہیں کہ کئی کم کھاؤ ممکن، کم کر دے نہ کھاؤ، وہ نہ کھاؤ۔ مگر یہ نہیں دیکھتے کہ یہ لوگ جو اتنا کھی بکھن، میوے ہمیں کر لیتے ہیں تو کیسے، بلکہ اتنا کچھ کھاس طرح لیتے ہیں؟

امام بخش کی عمر اس وقت ۸۵ سال ہے۔ وہ خدا کے فضل

جنگل جنگل، پریت پریت

اللہ بخش راجپوت

گولے بھی اڑتے ہیں جن سے بستیاں کی بستیاں اڑ کر سمندر میں جا پڑتی ہیں
جائگہ کے پہاڑی علاقے کی سرسبزی، ہریادوں اور خوشبو
کا اندازہ دیکھنے سے ہی ہو سکتا ہے۔ یہ کوئی پانچ ہزار مربع میل کو محیط
گھنے جنگلوں سے ڈھکا ہوا، خوفناک وحشی جانوروں کا مسکن۔ تنگ،
سکڑی وا دیاں حد درجہ یک پھیل ہوئی۔ بے شمار ندیاں، تکیہ چٹانیں،
ہیب پہاڑ کہ انسان مارے رعب کے آنکھیں بھی کر لے۔

یہاں کی آبادی کا حال کیا پوچھتے ہیں۔ مجھے اتنا ہی معلوم
کہ یہاں ۲۹۳۱۱۳ نفوس جگہ جگہ بسے ہوئے ہیں۔ یہاں کے پہاڑی
لوگ شگولی نسلوں میں سے ہیں۔ زیادہ تر بودھ دھرم کے ماننے والے
ہیں جیسے موگھ اور چاگہ۔ ان میں سب سے زیادہ غیر تمدن نمونہ
لوگ ہیں۔ ان کی اپنی ہی ایک تہذیب ہے۔ بالخصوص ناتراشیدہ اور
ابتدائی حالت میں۔ دنیا کو ان کا حال سب سے کم معلوم ہے۔ چند
بستیاں ہیں، ہر ایک میں سو سو سوا آدمی، مرد، زن، بچہ، رہتے
ہیں۔ انہیں بن جوگی اور ٹیگور بھی کہتے ہیں۔ ان کے چہرے کو دیکھنے سے
ایک فرق معلوم ہوتا ہے۔ اقوام درود کے دیگر نمونوں کے مقابلہ پر
ان کے رخساروں کی ہڈیاں زیادہ ابھری ہوئی نہیں ہوتیں نہ آنکھیں
ہی اتنا اندر کو دھنسی ہوئی ہیں۔ موثرنگ قبیلہ کے لوگ ۲۰ تا ۲۵ ہزار
ہوں گے

مجھے پہلے ہی بتا دیا گیا تھا کہ راستہ پر خطر ہے، چنانچہ میں نے
سفر کا آغاز کیا ہی تھا کہ صرف ایک منزل تک پہنچنے میں مجھے کوئی تیس
ندیاں پار کرنی پڑیں حالانکہ فاصلہ صرف تین میل کا تھا! ستواں پہاڑ
کو عبور کرنا جنگلی زادیوں میں سے ہر گز گزرنا میرے لئے کوئی نئی بات
نہ تھی مگر اس سفر میں ایک عجیب طعن کی تھر تھری ضرور محسوس ہوئی۔

سب سے بڑا قصبہ بندرا بن ہے اور جنگلی علاقہ صرف
۱۶ میل دور تھا۔ اسے مقامی لوگوں میں دیوانی پائرہ کہا جاتا ہے۔

پچھلے اپریل میں میں نے پھر رخت سفر باندھا۔ ایسا معلوم
ہوتا ہے کہ ستیا جی میرے خون میں مٹی ہوئی ہے یا پاؤں میں سیر ہے،
کہ میں ایک طرے تک کسی جگہ ہی نہیں رہ سکتا اور دنیا کا کوئی نہ کوئی خط
ضرور مجھے دعوتِ نظارہ دیتا ہے اور میں پھر آمادہ سفر ہو جاتا ہوں
یہ سوال کہ شہر اچھے یا بے؟ بہت پرانا ہے۔ انسان کے مدینیت اختیار
کرنے کے وقت سے ہی یہ سوال بھی سامنے ہے اور حضرت و۔ و۔ دیت
کی بحث ہی ان اڑلی بحثوں میں سے ہے جن کا کوئی آخری فیصلہ نہیں
ہو سکتا۔ شہر کے کوچہ و بازار اور بام و سقف، دیوان و منار کا اپنا
ایک روپ اور بلا واسطہ جنہیں نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ اور سر جنگل،
بیاباں ہیں، باغ و فراخ ہیں صحرا اور مٹے ہیں، جن کا اپنا ہی ایک مادہ
ہے۔ جنس جنہیں تو خود دلنے ہی ملک میں ایسی ہیں کہ کم لوگوں نے دیکھی ہیں
اور میں ایسے ہی مقامات کی روتے سے قریب ہونے اور ان کی ملکسی دہائی
تصویریں حاصل کر لے کے لئے جایا کرتا ہوں۔ یہی گن مجھے مشرقی پاک
کے بندرا بن کی طرف لے گئی۔

جائگہ کے پہاڑی علاقوں کی سیر کئی بار کرچکا ہوں مگر
وہاں تمدنِ حاضرہ سے بہت دور رہے ہوئے اب بھی ایسے قبائل ہیں
جن کو خود اس پاس کے لوگ بھی نہیں جانتے اور میں تو ہزاروں کوس
سے یہاں پہنچا تھا۔ سفر قحطاشکل اور راہ کی صعوبتیں جس قدر زیادہ
ہوں اتنا ہی لطیف سیاحت بڑھتا ہے ورنہ آدمی اس وادی میں
تذہب کیوں رکھے شہر میں آیا ہوا کوئی بد جنگل نام دیکھ لے یا کسی سفر نامہ کا
مطالعہ کر لے۔ چنانچہ جب میں بندرا بن کے سفر اور ایک طلسمی جنگلی
قبیلہ تک پہنچنے کی تیاری کر رہا تھا تو معلوم ہوا کہ روانگی کا انتظام
فورا ہونا چاہیے ورنہ بارشیں شروع ہو جائیں گی اور وہ ایسی
قیامت کی بارشیں ہوتی ہیں کہ آسمان کا طبق پھٹ جاتا ہے اس لئے
سفر نامہ ممکن ہو گا۔ سننا ہے صرف بارشیں ہی نہیں ہوتیں زلزلے کے

بہنا تے ہیں۔ ہر گھر کا نقشہ ایک سا نظر آئے گا۔ یہ
ہل کر دے محن بھی کہہ لیجئے۔ ادھر ادھر کی جڑے اور رکھڑکے
بھلیاں لگی ہوئی۔ اس پنجرہ تک پہنچنے کے لئے عجیب طرح کا
لیتے ہیں۔ زبان عامہ میں کوئی نہیں جاسکتا۔ ”صحیٰ“ میں جہا
عرشے کا سلف آتا ہے، اٹھا ہوا دارا دودھ دودھ کا نفا
میلے یہاں جو لٹا بھی دیکھا۔ بس ویسا ہی جیسا چھا
ہوتا ہے۔ گھر کے کچھ بیٹھے کدو کا خول برتا جاتا ہے، یہی ان
اور انیس کبس بھی ہوتا ہے۔ بید کا بہنا ہوا ایک عجیب
نظر آیا۔ معلوم ہوا کہ اس میں دھان بھرا جاتا ہے۔ بلامہ
شن غلہ اس میں آجاتا ہوگا۔ اب ان کی زراعت کا حال
بونے سے پہلے کسی زمین کو چھانٹ لیا، صاف کیا اور جھاڑ
زمین پر جمع کر کے سوکھنے دیا۔ یہ کوڑا ساری گرمیوں غور
ہے۔ اس کے بعد اسے آگ لگا کر زمین کو کاشت کے لئے
ہیں اور سارے اناجوں ترکاریوں کے بچوں کی ”کاک ٹیل
پھیلاتے ہیں۔ دھان، روٹی، مکا، مرسولی، میٹھا کدو، خربوز
اور تبا کی سب ایک جگہ بونے جلتے ہیں۔ ان کی سب
کاشت چاول ہے اور آگ جلنے کے بعد چورا کھنی تھی وہ بہ
ثابت ہوتی ہے۔

ان لوگوں میں بھی تقسیم کار کا اصول جاری ہے۔ ہر
عورتوں کے جدا جدا کام ہیں۔ مرد جو مونگ کرتے ہیں اور
کرتے ہیں، ٹوکریاں بننا، چٹائیاں بنانا، روٹی اور شنّا گھرن
بڑھئی کے کام۔ گائے کا دودھ بھی مرد ہی کھلتے ہیں۔ عورتیں
پانی لاتی ہیں، دھوئی نمالگوٹ اور دریاں بناتی ہیں۔ منڈ
بھی اٹھا کر لے جاتی ہیں۔ جھاڑو بوا رو، بچوں کی دیکھ بھ
پکانا وغیرہ تو خیر عورتوں کے کام ہی ہیں۔

میں نے ان کے علاقے میں چل پھر کر شادی بیاہ کی
معلوم کیں۔ شادی کے وقت لڑکی کی عمر لڑکے کی عمر سے
جلد شادی ہو جاتی ہے کیونکہ ایسی لڑکی شوہر کی عمدہ
گھریلو ذمہ داریوں کو اٹھانے کے لئے زیادہ موزوں
لڑکا لڑکی آپس میں ملتے جلتے رہتے ہیں جس سے شادی کر
لڑکا اس کے گھر شام کو آتا اور کافی دیر تک گھر میں رہتا۔

یہاں کوئی سردار دیوانی نام کا تھا جس نے یہ پاڑہ بسایا تھا۔ جو مونگ
رکھوالا تھا۔ اس رقبے میں کوئی دس گیارہ مونگ بستییاں تھیں جہاں
اس مقام تک پہنچا تو حسب معمول زبان نہ جاننے والی دشاوی پیش
آئی مگر انسانوں کے پاس خلوص کی زبان ایسی ہے جس کا سکھ ہر جگہ
رواں ہے۔ اور وہ اولے مطالب میں بڑی مدد دیتی ہے۔ ویسے ایک
مقامی ترجمان کا بندوبست بھی کر لیا تھا تاکہ جہاں گاڑی بالکل ہی
اٹک جائے تو اس سے مدد لیں اور وہ رہنمائی کرتا رہے۔ میرا خیال تھا
کہ سب سے پہلے یہاں کے سردار سے ملا جائے۔ پھر ان لوگوں کے
گھر گزرتی کو جا کر دیکھوں اور جتنی باتیں مجھے معلوم ہوں ان کی کہانی
آپ کو سنائوں۔

ان کے پاڑہ میں پہنچ کر معلوم ہوا کہ یہ عجیب زبان بولتے ہیں،
ہر چیز عجیب، انوکھی اور جلد سے۔ میں ان عجائبات کو ہی دیکھنے آتا تھا
گاؤں کے مکھیات سے ملاقات ہوئی۔ سب سے پہلے اس نے کھیتی باڑی
دیکھائی۔ یہاں زراعت کا وہ طریقہ رائج ہے جسے ”جھونگ“ کہتے ہیں۔
اس کا حال آگے بیان کروں گا۔

مونگ لوگ اپنی ضرورت کی سب چیزیں بستی ہی میں پیدا
کر لیتے ہیں اور صرف دو ایک ہی چیزوں کا باہر سے انتظام کرتے
ہیں جیسے مٹی کا تیل، نمک وغیرہ۔ مجھے گاؤں میں نہ کوئی درزی دکھا
دیا، نہ موچی، نہ بڑھئی، نہ لوہار، کہار، جولاہا۔ اس کی وجہ یہ معلوم
ہوئی کہ یہ لوگ خود ہی اپنا کام کرتے ہیں۔ اب میں مونگ گھر میں بھی پہنچا۔
اس کا حال سناتا ہوں۔

گھر کا کافی کٹا رہا تھا۔ شادی شدہ جوڑے کے لئے رنجہ کی
الگ جگہ بنی ہوئی تھی، یوں مشترکہ خاندان کا رواج یہاں بھی ہے۔ مونگ
کی دنیا یا س کی دنیا ہے جیسے عربوں کی دنیا کبجور کے گھر دھو متی ہے۔
موندگوں کا گھر زمین سے دس بارہ فٹ بلند تلیوں پر بنتا ہے تاکہ
جنگلی جانوروں وغیرہ کے گزند سے محفوظ رہے۔ اتنی اونچائی پر مکان
بنانے کی وجہ مونگ کچھ ادھی بتاتا ہے۔ اس کا قصہ بھی سن لیجئے۔
کتناسے ہزاروں سال گذرے ایک دفعہ کسی مونگ کے گھر میں
بچہ پیدا ہوا جنگل میں چوہنیاں، کیڑے مکوڑے اور وہ بھی ایسے
جنگلوں میں بہت ہوتے ہیں، وہ اس ننھے سے بچے کو لپٹ گئے اور
انہوں نے اس بچے کو کھا لیا۔ تب سے یہ لوگ انہی کرسی کے مکان

قبول کر لی جاتی ہے۔ دلہن کے گھر صرف مرد جلتے ہیں۔ دلہن کوئی خاص جوڑا بھی شادی کے روز نہیں پہنتی بس ایک گھبراہٹا چادر ٹانگوں سے لپیٹ لیتی ہے۔ ہاں رخساروں اور پیشانی پر بندیاں اور نقش و نگار ضرور بنائے جاتے ہیں۔ لبوں اور دانوں کو سرخ گلابی رنگ میں رنگا جاتا ہے۔ منکوں کی مالا، چوڑیاں، بازو بند جھانجن اور کمر کا پٹکہ ضرور ہوتا ہے۔

پٹکے المونیم کا ہوتا ہے۔ یہ سب سامان گھر پہاڑی لوگ لاتے ہیں اور ان کے کاٹوں پاس جب ہاٹ لگتا ہے تو وہاں فروخت کرتے ہیں یا ان کے جھگی سامان وغیرہ سے تبادلاً کر لیتے ہیں۔

مورنگوں کے علاقے میں پہنچ کر مجھے یہ معلوم کرنے کی بھی جستجو ہوئی کہ ان کے مذہبی خیالات۔ معلوم کروں۔ معلوم ہوا کہ یہ لوگ کسی دیوی دیوتا کو نہیں مانتے، کچھ پرانی رسوم اور عقیدے کا نام ہوتا ہے اور انہی کو اپنا دھرم کہتے ہیں۔

مورنگ موسیقی کے بڑے دلدادہ ہوتے ہیں۔ قص بھی کرتے ہیں۔ ذرا ان کے سارینہ کا حال سنئے۔ ایک دوڑ خاڑھ، جسے وہ خوب پٹتے ہیں۔ عجیب عجیب شکلوں کے باجے، کوئی نفرخا، کوئی ۸ فٹ دیوار، قص کا نقشہ یہ ہوتا ہے کہ وہ بھرن بیاہی لڑکیاں ایک طرف کھڑی ہو جاتی ہیں اور اتنے ہی باجے والے ہوتے ہیں شادی شدہ لڑکیاں کسی موقع پر بھی قص میں حصہ نہیں لے سکتیں۔ بیچ میں ایک آدمی بیٹھ جاتا ہے اور قص شروع ہوتا ہے۔ مال دینے کے لئے المونیم کے جھانچہ عجیب طرح کا آہنگ پیدا کرتے ہیں۔ رقص کرنے والیاں پیروں سے اس کے ساتھ سنکت کرتی ہیں۔ میک آپ کیلئے پھول، کوڑیاں اور جسم کو رنگنے کے مختلف طریقے استعمال کئے جاتے ہیں۔ یہ محفل رقص و سرور صرف خاص خاص موقعوں پر منعقد ہوتا ہے جیسے جھوم کی فصل تیار ہونے کے وقت امیر آدمی کاٹے ضرور ذبح کرتا ہے۔

غرض مورنگوں کے شب و روز اس ہی طرح گزرتے ہیں ان لوگوں میں زندگی کی جو سچائی بہت ہے۔ یہ لوگ جمائی تو انائی، جیلے پن اور جاکشی میں بھی ممتاز ہیں مگر چاول زیادہ کھانے اور جو ہڑوں کا گند پانی پینے کی وجہ سے مرد عورت سب کی

کی موجودگی میں ہنسنا بولنا اور گیت گانا عام مشغلہ ہوتا ہے۔ لیجئے ان کے ایک گیت کے بلی نہیں تو مطلب آپ بھی سن لیں:

”اے لڑکی، تیرا دوسے زریا کنول کے مانند ہے۔

بہر چند کہ توجہ ہو رہی ہے مگر میں تجھے کنول میں

ڈھونڈ رہی ہوں گا اور تیری یاد میں اسے پیار کئے

جاؤں گا، اے خیریں، اے شیریں!“

انچہ حبیب کی یہ بات سن کر لڑکی یوں جواب دیتی ہے:

”اے دلنواز، تو کیسا بولتا ہے، اے میری سرخ گتھی،

تیرا بدن چمکدار طلا مثل محفل ہے، اے میرے جھگی

باسی، اے میرے دلنواز!“

ان کے مردوں میں بہترین صن یہ مانا جاتا ہے کہ جسم کٹھا ہوا ہو، رنگ گندمی ہو، سر کے بال لٹوں کی صورت میں بکھوے ہوئے نہ ہوں بلکہ چٹے کی طرح گدی پر باندھ رکھے ہوں۔ اس نے اپنے گالوں کو سرخ قرمزی رنگ لیا ہو، گالوں میں جو سوراخ ہیں ان میں رنگین پھول لٹے ہوئے ہوں۔ دانت ایسے کالے ہوں جیسے کوئلہ وہ ہانسی پر پریم گیت سنا گتا ہو شادی اس طرح ہوتی ہے کہ ایک دم وہ اپنے منگیتر کے ساتھ بھاگ جاتی ہے۔ لڑکے کی سسرال پہنچ کر جہیز کی رقم طے کی جاتی ہے۔

د تقریباً تین سو روپے پر شادی طے ہو جاتی ہے، ان تین سو روپے کا حساب بھی ذرا سن لیجئے۔ دس روپے دلہن کی ”بھی“ قیمت، دس روپے دودھ پلائی کا حق، مادیر دس کو، باقی رقم دیگر مصارف کے لئے۔ چادریں، چٹائیاں، کلباری، گنڈاسا، تیر، تلوار خریدنے کے لئے، الگ خرچ لڑکے والے کو دینا پڑتا ہے پہلے تو صرف کھینکتے ہوئے روپوں میں ہی یہ حق ادا کیا جاتا تھا مگر اب سنا ہے نوٹ بھی چلنے لگے ہیں کیونکہ جھگیوں تک یہ کھینکتے روپے اب کم پہنچتے ہیں۔

یہ نوٹ نصف قیمت پر بدلے جاتے ہیں! اگر اس رشتے پر کوئی اعتراض ہو تو لڑکی کی مجلس شورعی میں اعتراض سنا جاتا ہے اگر لڑکی کو پہلا پھسلا کر لڑکے لے گیا تھا تو ۷ روپے کا تاوان دینا پڑتا، اگر بعد گوں کا فیصلہ یہ ہو کہ نہیں لڑکی نے لڑکے کو روغلا یا تھا تو لڑکی والوں پر تیس روپے جرمانہ کیا جاتا ہے۔ اگر لڑکا قصود وار مانا جائے تو اسے ایک سو ڈکڑ کر لانا ہوگا۔ اسے وہی ذبح کرے گا اور ہر گھریہ پہنچ کر اس کا گوشت بانٹ کر معافی مانگے گا۔ عام طور پر یہ معافی

تو ندیں نکلی ہوئی نظر آتی ہیں، ان کی عمریں ۷۰-۸۰ برس تو معمولی بات ہے۔ کسی خاص بیماری میں بھی مبتلا نہیں ہوتے۔ جڑی بوٹیوں سے علاج کر لیتے ہیں ورنہ مرغ یا سور کی تروائی دے کر دبا یا بیماری بھگنے کا ٹوڑکا کرتے ہیں۔ دوسرے قبائلیوں کے ہاں تو مندر یا استھان جیسی کوئی چیز بن جائے گی مگر مورنگوں میں نہ دیوی ہے نہ دیوتا۔ اسپتال جیسی کوئی چیز ان کے ہاں نہیں۔ ہاں رنجھاتی کے صدر مقام پرسول اسپتال ضرور موجود ہے کچھ ڈسپنسریاں بندوبان اور رام گڑھ کے ذیلی صدر مقامات پر بھی بنی ہوئی ہیں جو تھانوں کے ساتھ ہی ہوتی ہیں۔ دبا وغیرہ کی اطلاع کرنے کے لئے رنجھاتی کا نمائندہ نزدیکی تھا نہ پڑتا ہے اسے یہاں کا باری کہتے ہیں۔ جھگڑے وغیرہ کی اطلاع بھی یہی کار باری جاکر دیتا ہے۔ ویسے کوشش یہ کی جاتی ہے کہ پنچایت ہی میں فیصلہ ہو جائے۔ کیونکہ مورنگ عام طور پر امن پسند ہوتے ہیں۔ وہ حکومت سے مدد اس وقت مانگتے ہیں جب فصلیں تباہ ہو جائیں یا دریاؤں میں طغیانی آنے کے باعث ان کے گھر گرہستی بہہ جائیں۔ حکومت انہیں "جھوم" اگانے کیلئے ۵۰ روپیہ فی کنبہ دیتی ہے۔ مورنگ کے پاس گھر گرہستی کے سامان، تھوڑی بہت نقد پونجی اور چند پالتو جانوروں کے علاوہ کوئی خاص املاک نہیں ہوتی۔ وہ درکاریاں اور تہا کو خود ہی بوتے اور گھر کے لوگ اسے استعمال کرنے میں مورنگوں میں بچے کی پیدائش پر کوئی خاص رسم ادا نہیں کی جاتی۔ زچگی کے دوران ماں نو دن تک گھر کے کمرے سے باہر نہیں نکلتی۔ مرنے پر مورنگوں میں چند رسوم ادا کی جاتی ہیں۔ میت ایک ماں میں سات دن تک رکھی رہتی ہے اور اگر کنبہ داروں میں استطاعت ہو تو چند سوڑا و مرغی کاٹ کر خزا داروں کو کھلا دئے جاتے ہیں۔ سات دن گزرنے کے بعد میت کو نزدیکی ندی پر لے جا کر جلاتے ہیں۔ اس شمشان یا مردہ گھاٹ کو ان کی بولی میں "چینگ رنگ" کہتے ہیں۔ میت کی لاکھ بانس کے ایک کس میں رکھ کر جلانے کی جگہ پر دفن کر دی جاتی ہے اور اوپر ایک سفید جھنڈا گاڑ دیا جاتا ہے۔ اگر کوئی دبا میں مرا ہو تو اس کی لاش دو دروازہ جھل

میں لے جا کر دفن کرتے ہیں ورنہ میت کو جلائے ہی کا رواج ہے۔ رسوم کی طرح مورنگوں کے لباس میں بھی انوکھا پن ہے۔ عورتیں اور چھوٹی بچیاں اپنی کمریں ۹ انچ لمبی کپڑے کی تاکڑی یا ٹیپی سی باندھتی ہیں۔ اس ڈھکی کوہ دھکی کہتے ہیں۔ عام طور پر یہ کپڑا کالا ہوتا ہے اور گھر پر بنایا جاتا ہے۔ مرد بھی ایک چھوٹی سی ننگوٹی ستر پوشی کے لئے استعمال کرتے ہیں۔ کار باری چونکہ گاؤں سے باہر بھی جلتے ہیں اس لئے ان کو زیادہ اچھا لباس پہننا بھی ضروری ہوتا ہے اور یہ مختلف ایک لنگی کے ذریعے پورا کیا جاتا ہے۔ اوپر برمی وضع کی ایک بنش شرٹ جیسی چیز پہنتے ہیں اور سر پر سفید پگڑی بھی باندھتے ہیں۔

کہتے ہیں کہ یہ لوگ برما کے علاقے ارکان سے یہاں آکر آباد ہوئے تھے۔ ان کی زندگیوں میں آج تک کوئی تبدیلی نہیں ہوئی ہے۔ ایک روایت یہ بھی کہتی ہے کہ مورنگ لوگ ہندو گنگائی علاقوں سے ہجرت کر کے یہاں پہنچے تھے۔ بہر حال مشرقی پاکستان آج جس تیز رفتاری کے ساتھ ترقی کی منزلوں کی طرف گامزن ہے اس کی وجہ سے یہاں کے پہاڑی علاقوں کے باشندوں میں بھی ترقی کی لہر دوڑے گی اور وہ بھی ان ترقیاتی منصوبوں سے بہرہ ور ہوں گے جو پورے مشرقی پاکستان میں اب عام ہو رہے ہیں پہاڑی علاقے کے عین وسط میں ترقی کی لہر دوڑ گئی ہے۔ کچی کا برقی منصوبہ اور کرنال کا خانہ کاغذ ساز نے چمک اور موٹو قبائل کے لئے ترقی و معاش کی بہت سی نئی راہیں کھول دی ہیں۔ اسی طرح غلط بندوبست میں سانگو ڈیم بنانے کی تجویز ہے۔ اس کے مکمل ہونے پر مورنگوں کے بھی دن پھر جائیں گے اور اب تک ان جنگل باسیوں کی طرف سے جو غفلت برتی گئی تھی وہ توجہ سے بدل جائے گی اور صدیوں پہلا ناجو دور دور ہو جائے گا۔ مشرقی پاکستان کے ان پہاڑی علاقوں میں جب نئی لہر مرد وڑے گی تو قدرتی بات ہے کہ مورنگ بھی اس سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہیں گے۔ اس وقت ان مورنگوں کی زندگی اور تمدنی نظام میں کیا کیا تبدیلیاں آگئی ہیں اس کی کہانی بھی بڑی دلچسپ ہوگی۔ امید ہے اس کا آنکھوں دیکھا حال جلد مشہور کر سکیں گے۔

”ایسا گماں نہ تھا“

(ایک نفسیاتی مطالعہ)

وجاہت حسین سونی پتی

کی داد دے بغیر نہ رہ سکتا۔ شاید یہ مردانہ پن تھا جس کے باعث وہ ایسے ایسے مشکل کام انجام دے لیا کرتی جن سے مرد بھی پہلو بچا لیتیں۔ لباس! اسے یہ کیا؟ مذاق تو نہیں کر رہی ہیں؟ ہٹلن کوٹ، مگر وہ ذرا بھی ٹس سے مس نہ ہوتی۔ رفتہ رفتہ میں بھی اور گھر کے سب لوگ ان باتوں کے عادی ہو گئے۔ لطف یہ کہ وہ پوری طرح مرد بننے کے لئے سر پر دوپٹے کو گڑی کی طرت بانہ لیتی۔ جیسے ہیر کسی نامک میں رانجھاں گئی ہو۔ اتنی چھوٹی سی عمر میں! جو دیکھتا حیران ہوتا۔ شاید کچھ عین جنس کا امتیاز اور جنسی شعور اتنا زیادہ نہیں ہوتا۔ ان کے ڈانڈے کچھ کچھ آپس میں ملے جوتے ہیں۔ اس لئے ایسی باتیں عجیب بھوتے ہوتے بھی عجیب نہیں ہوتیں۔ میں اس کی اس ٹیپ میو۔ دس پر کوئی مذاق کر بیٹھا تو وہ بھٹک کر اب دھجی، ”میرا نام نعمہ ہے۔“

اتنی جان نے شروع ہی سے نعمہ کے لئے اپنی بہن کا روپا دھار لیا تھا۔ بھر حواس، ہمدرد۔ ایک پردان چڑھتے بھنے پودے کی ہر حالت سے دلچسپی رکھتے ہوئے، وہ ان باتوں پر اسے نصیحت کرتیں، بڑے پیار سے سمجھاتیں۔ اما کی تو ایک سے دو بلکہ دو سے تین ہو جانے میں جیت تھی۔ اس لئے سب کبھی ”ابا جان“ کے سامنے اتنی ناصح مشفق کا کردار ادا کرتی تو وہ کھٹکھٹا کر نہیں پڑتے اور کہتے کہ یہ ہم مردوں کی تعداد میں ایک اور اضافہ ہے۔ ہماری اکثریت تمہاری اقلیت۔ ”ابا جان“ کی یہی ہنسی نعمہ کے اس جذبہ کی تسکین کا باعث بنتی جس کی زد میں وہ ہمہ جا رہی تھی۔ سمند احساس کو تازہ نہ۔

ہم دونوں کھینچے کھینچے رکھی پڑتے۔ نعمہ یہاں بھی باز رہتی۔ اور تاؤ میں آکر مجھے ایسا دھنک ڈالتی کہ میں چیخنا چلتا ناٹھی کے پاس شکایت لے کر جاتا۔ وہ الٹی مجھے ملامت کرتی، ”نوٹ! امر دھو ہوئے یہ چیخ پکار، یہ داؤ دیا آگے چل کر کیا ہو گا؟“

نعمہ؟

ہاں ناں اور کون؟

میں کیسے باور کر لوں؟ وہ اور

یعنی چہ؟ ناممکن! اُسے تو

نفرت تھی، وحشت تھی، سب کچھ تھا مگر اب وہ تنہا نہیں!

مجھے وہ دس سال یا دو ہیں۔ اپنی عمر کے ابتدائی سال بچوں نے

اس کے ساتھ گزاریے۔ وہ پانچ برس کی تھی جب اس کا باپ فوت ہو گیا، ایک کار کے حادثے میں اور اس حادثے سے ایک اور حادثہ بھی

پیدا ہو گیا جو عموماً ہوتا ہی ہے۔ اس کی ماں نے دوسری شادی کر لی اور سوتیلی باپ تو سوتیلے ہی ہوتے ہیں۔ تھا تو کافی پریشان تھا، ترقی یافتہ مگر بے حد

تنگ نظر۔ نعمہ پر وہ ان چٹھے، تعلیم پائے، اسے اس سے کیا۔ وہ بڑی پیاری ہی تھی، بڑی ذہین، مگر وہ اس کی کف میں تو نہ تھی، کوئی خون کا

رشتہ تو نہ تھا۔ نفی مٹی نعمہ، اس کا رشتہ تو کچھ دوست سے ہمارے ہی ساتھ جا ملتا تھا۔ نعمہ کی ماں میری والدہ کی بہن تھیں اس لئے میرا

اس کا بھی ایسا دور۔ اور قریب کا رشتہ بھی ملے ہو گیا میری ماں اس لئے اسے اپنے یہاں لے آئی۔ اس وقت میں یہی سات آٹھ سال

کا تھا۔ اکلوتا بچہ۔ اور جب اس گھر میں ایک اور اکلوتی آگئی تو وہ قدرتی طور پر میری بھولی بن گئی۔ پہلے پہل تو میں یسٹن کرچو کس پڑا کہ وہ اکلوتی نہیں۔

اکلوتے کی طرح بات کرتی ہے۔ بالکل میری طرح۔ جیسے دو لڑکی ہوتے ہوئے بھی لڑکی نہیں کہلاتا چاہتی۔ بالکل مردوں کا سلوک، خود بخود ہی

وہ بے دھڑکی کہتی تھا دید بھینا! میں یہ کام کر سکتا ہوں۔ میں اس کے منہ سے یہ سن کر مسکرا دیتا اور چھٹیلے کے لئے کہتا ہوں تو جاوید بھیتا میں وہ اس پر ذرا بھی نہ گھبراتی اور میں اس کی بہت عزت

ظاہر ہے اس میں ایک خاص اشارہ ہوتا جس سے اماں کے ارادوں کی جھلک صاف دکھائی دیتی اور جسے میں سمجھتے سمجھتے ہی سمجھ لیا بھی تغذی کا ساتھ دیتے، واہ بیٹا! پٹ گئے نا۔ ایں کارا تو آید مردا! چنیں کنند! اس سے ڈرتے ہو۔ باشت بھر گڑیلے سے، ماشاء اللہ ابھی سے ٹینگ! دراصل وہ ان الفاظ سے مجھے شہ دیتے اور واقعی میرے دل میں حوصلہ و ہمت پیدا ہو بھی جاتی۔ مگر جہی حریف سامنے آتا میری ساری اولوالعزمی اور جرات ہوا ہو جاتی اور میں یوں کانپ اٹھتا جیسے کوئی مجرم جاہر حاکم سے سنگین سزا پانے کے بعد۔

ہمارا گھریلو حامل ہم دونوں کی زندگیوں کو الگ الگ ڈگر پر ڈالتا جا رہا تھا۔ حریف — خندی، شوخ، تند مزاج اور میں اس کے برعکس احساس کمتری کا شکار۔ دونوں طبعا ایک دوسرے سے مختلف۔ پھر بھی ہمیں ایک دوسرے سے جلدانی گوارا نہ تھی۔ جتنی شدت سے لڑتے اتنی ہی شدت سے پیار بھی کرتے تھے۔ ہماری نوعمری کا یہ زمانہ بھی کتنا معصوم تھا۔ جب کبھی مجھے سکول سے ویر ہو جاتی یا میں کسی دوست سے ملنے کے لئے چلا جاتا تو واپسی پر گھبرا کر پتہ چلنا کہ نغمہ نے اور دم چپا رکھی ہے۔ اتنی، اتنا سے لڑتی، نوکرائیوں کے پیچھے پڑتی کہ جاؤ ابھی ڈھونڈ کر لاؤ، میں یہ دیکھ کر جی ہی جی میں بہت خوش ہوتا۔ نغمہ ان موقعوں پر ”نقش فریادی“ بھی تیار کرتی اور اپنی شوخی تحریر یا شوخی طبع کا ثبوت دیتی۔ وہ اپنے غم و غصہ کا نثر انہیں نقوش میں ظاہر کرتی۔ یعنی کہیں کپڑے لٹے سیدھے پھینکے ہوئے، کہیں اوندرھی کر سی توڑے پوڑے ہوئے قلم۔ کہیں الٹ پلٹ کتابیں اور کہیں چینی کے پیالوں کے ٹکڑے۔ گھر میں اسے ٹوکتا تو کون ٹوکتا؟ جو کسی اس کی لاابالی طبیعت میں آیا وہ کہ گزرتی اور جو کچھ چاہتی بے دھڑک کر ڈالتی۔ میرے ماضی کے اور ایسے ہی نقوش سے بھرے پڑے ہیں کسی گہرے سمندر میں غرق اور حافظہ کے نہاں خانے میں محفوظ۔ کتنا حسین تھا یہ سنہری زمانہ اور کتنی دلاؤ نہیں اس کی معصوم یادیں۔

وقت گزر رہا تھا جا رہا تھا۔ دختروں کے سائے ابھرتے رہے، پھیلتے رہے، سمٹتے رہے، گم ہوتے رہے۔ زندگی کے سینہ پر خوبصورت عمارتیں کھڑی ہو گئیں اور کہیں زمین کے دھن نے خستہ عمارتوں کو مغل لیا۔ روشنی بارش کی طرح ہستی رہی اور اندھیرے خاموشی سے رات کی کشتی میں بیٹھ کر کائنات کے دریاؤں میں تیرتے رہے۔ یہ کیفیتیں،

یہ صبح و شام کے ملاپ، یہ بہار و خزاں، آتی جاتی رُتیں۔ یہ تعمیر و تخریب کے مناظر، یہ ابھرتے ڈوبتے سائے ہماری زندگی میں طرح طرح کے اضافے کرتے چلے گئے۔ ہم جوانی کی حدود کو چھوئے گئے۔ ان حدود کی ابتدا ایک ایسی بارڈر سے ہوئی جسے اعتدال کی زری اور احتیاط کی قوت نے تعین کیا تھا۔ اب ہم بالکل اڑتے جھگڑتے نہ تھے۔ اب ہم میں کوئی بے تکلفی بھی نہیں رہی تھی۔ کمرے الگ الگ۔ میں آئس کا طالب علم، وہ علم نباتات کی طالبہ۔ اس کی وہ شوخیاں جو بچپن کا اقتدار ہی نشان تھیں، بالکل ختم ہو گئیں۔ اب اس کے چہرے پر غور و فکر کی روشنی نظر آتی تھی۔ بے حد سنجیدہ ایسا نظر آتا تھا جیسے شوخیوں شرارتوں کا وہ سرمایہ جو قدرت نے نغمہ کو دیا تھا، وہ بسے پوری طرح اپنے بچپن میں صرف کر چکی تھی اور اسے اب سنجیدگی کے خزانے مل چکے تھے۔ اکثر دیکھا گیا ہے کہ جو بچے بچپن میں بے حد شرارتی ہوں، وہ شباب میں داخل ہوتے ہی نہایت سنجیدہ ہو جاتے ہیں۔ نغمہ بھی میری نظر میں اس حقیقت کی واضح مثال تھی۔ اس کا کمرہ اچھا خاصا محل بن چکا تھا۔ وہ دن رات اپنے کام میں منہمک رہتی۔ طرح طرح کے تجربے کرنا۔ ان سے نتائج مرتب کرنا، اس کے علمی شور کا حصہ بن چکا تھا۔ وہ میری طرف بہت کم توجہ دیتی اور تعجب یہ کہ ہم ایک ہی گھر میں رہنے کے باوجود کئی کئی دن ایک دوسرے کی شکل تک نہ دیکھتے تعلیم کی راہ پر چلے۔ ہم بہت دور نکل چکے تھے۔ میں ایم۔ اے میں داخلہ لے چکا تھا اور وہ اسی تناسب سے علمی دوڑ میں تیز رفتاری کاٹ رہی تھی۔ اب اس کا عمل کمرے ہی تک محدود نہ تھا، بلکہ اس نے گھر سے باہر ایک پھلواڑی بھی بنا رکھی تھی، جس میں وہ دن بھر پھولوں پتوں پھلوں اور سبزلیوں کو کاٹتی، تراشتی اور ان کا کیمیاوی یا خوردبینی تجزیہ کرتی رہتی۔ ہوتے ہوتے اسے اتنی مہارت ہو گئی کہ وہ آنکھیں بند کر کے کسی چیز کو محض ہونکھنے سے اس کا نام بتا سکتی تھی۔ میں اس کی قوت شامہ پر اکثر حیران رہ جاتا۔ جیسے اس کے ذہن میں ایک ایسا صحیفہ کھل گیا تھا جس کے اوراق میں کل کائنات کی خوشبوئیں محفوظ تھیں۔ ایک دن ہم سب نے مل کر اسے سٹ پٹانے کے لئے پلاٹ بنایا۔ صبح کا وقت تھا۔ وہ بانچہ میں کچھ نئے پودوں کا تجربہ کر رہی تھی جو باہر سے منگوائے گئے تھے۔ اس نے ان کی پرورش کا خاص اہتمام کر رکھا تھا۔ یہ پودے زمین سے ڈیڑھ فٹ کے قریب ابھرائے تھے۔ مجھے یوں لگا جیسے ان کا تجربہ کرتے وقت نغمہ اس زمانے کی طرف

نغمہ کو اس لفظ سے شدید نفرت تھی۔ جب کسی اس کا سوال اٹھتا وہ خبر نہیں کس نفسیاتی رد عمل کے تحت بیمار ہو جاتی۔ ایسا کئی بار ہوا۔ یہاں تک کہ اس بات کو ہمیشہ کے لئے ختم کر دینا پڑا۔ اس کے معنی تھے اس کی زندگی کو معرض خطر میں ڈال دینا۔ اور اسی کو نغمہ کی زندگی میری سرت سے زیادہ عزیز تھی۔

نغمہ خوشبوؤں کی دنیا میں بڑھتی چلی گئی۔ پودوں، پھولوں، پتوں، شاخوں، سبزیوں غرض ہر نباتاتی شے کا تجربہ اس کی زندگی کا مقصود بن گیا۔ میں نے ایم۔ لے کا امتحان بھی پاس کر لیا اور میری زندگی.... خیر اب اس کا تذکرہ ہی کیا۔ میں نے محسوس کیا اس کی سب سے زیادہ خوشی نغمہ کو ہوگی حالانکہ میرا خیال تھا وہ اس کا بہت گہرا اثر لے گی۔

زندگی بار آور ہوئی اور ایک غنچہ کھلا۔ نغمہ بہت خوش تھی۔ وہ اس نوشگفتہ غنچے سے کھینچ رہی تھی۔ اس کی توجہ پھولاری کے مٹھوں سے اس نئے غنچے کی طرف منتقل ہو گئی۔ خبر نہیں اس کو واقعی غنچہ کہہ بھی سکتے ہیں یا نہیں۔ ہم کیا اور ہماری قوت شائدہ کیا۔ مگر نغمہ تو ہر پھول کی خوشبو سونگھ لیتی تھی۔ شاید اس کے تحت الشعور کو اس سے بھی کوئی خوشبو آتی ہو۔ ایک نامعلوم پیام۔ وہ اسی غنچہ نوشگفتہ کو ہنسلاتی، ذحلانی اور خوب پیار کرتی۔ میں نے یہ بھی دیکھا کہ وہ کیسے دیوانہ وار اس ہنستے کھیلنے غنچے کا منہ چومتی جاتی۔ میں نے غور کیا، بچے کے بال بھٹوں کے بالوں کی طرح ہنرے ہنرے، چمک دیتے ہوئے، تروتازہ تھے۔ جیسے ان کو چھونے سے کوئی تکلیف کسی ہری بھری سوندھی سو ندھی سینٹی گھاس کو چھو رہا ہو۔ آنکھیں رس بھری کی طرح اور پہوٹے جیسے رس بھری ہی کا نرم نرم چھلکا۔ گال گلاب کی طرح لپکتے ہوئے اور چونٹ پھولوں کی نرم و نازک پتیوں۔ بھلا اس سے بہتر غنچہ اور کیا ہو سکتا تھا جس کا روز خوب مطالعہ کیا جاسکے۔

چنانچہ وہی پرانا سوال ایک بار پھر ابھرا۔ اب کے بزرگ نیچے ہٹ گئے اور غور یعنی ہوا آگے بڑھی۔ اس نے باتوں باتوں میں کہا بچے بھی تو پھول ہی ہوتے ہیں۔ کیسے کوئل، کیسے پیارے، کیسے اچھے لگتے ہیں یہ۔ نغمہ نے کہا کیوں نہیں۔ کایاں بچہ بولی زندگی کی بہار بھی ہے کہ گود ہری بھری ہوا اس میں ایسا ہی کوئی غنچہ۔ رئیس ہنستا کھینٹا ہنستا نظر آئے۔ نغمہ کے چہرے پر سرخی کی لہر دوڑ گئی اور دیکھنے والی (باقی صفحہ دہر)

نوٹ گئی ہے جہاں اس کا بچپن خدا نہیں پودوں کی طرح معصوم اور دلی کی امداد کا محتاج تھا جب وہ پھولاری شے ہاں تک لیتی تو اس کے چہرے پر ایک خاص قسم کی چمک ہوتی۔ میں نے پودوں سے نظر ہٹا کر پھولاری میں لگے ہوئے، اچھے نیچے پودوں کو دیکھا اور مسکرائے بغیر نہ رہ سکا۔ نغمہ نے میرے چہرے پر اس مسکراہٹ کو نہیں دیکھا۔ میں سسٹنٹ کھڑے ہوئے درختوں کے تصور میں کھویا ہوا تھا اور اس کا ذہن ابھی پودوں کی نرم نرم کوئیلوں سے باہر نہیں نکلا تھا۔

میں پلاٹ کا ذکر کر رہا تھا۔ ہم نے نغمہ کی آنکھوں پر پٹی باندھ دی۔ اتفاق سے وہ دونوں ایک صاحب جنہیں ”سیاح چچا“ کہتے تھے اور جنہوں نے ہمالیہ کے ایک ایک پہاڑ کی سیر کی تھی، ایک بڑے ہی نایاب قسم کے پھول کا عطر تحفہ لائے تھے۔ ہم نے یہ عطر اس عطر گل نیلوفر کے ایک منہ بند غنچے پر چھڑک دیا اور کہا بتاؤ یہ کون سا پھول ہے؟ ہمارا خیال تھا وہ جھٹ کہہ دے گی یہ فلاں پھول ہے۔ لیکن وہ خاموش رہی۔ اس نے تین چار مرتبہ غنچہ کو سونگھا۔ مگر منہ سے کچھ نہ بولی۔ ہر بار اس کے لبوں پر ایک ”پر معنی مسکراہٹ“ ابھرتی۔ آبا کہتے بس بس، تم اسے بوجھ چلیں۔ آخر نغمہ کے لبوں کو جنبش ہوئی اور اس نے کہا ”پھول ایک نہیں دو ہیں۔ ایک تو نیلوفر لگتا ہے اور دوسرا....“ آبا جان جھٹ بولے ”ہو نہ ہو! دو کہاں ایک ہی تو ہے۔ بس جی بس معلوم شد“ نغمہ کا جواب بڑا دلچسپ تھا۔ وہ بولی ”ہے تو خیر وہ نیلوفر مگر ہے پہاڑی۔ اس میں کسی نایاب پھول کی باس بھی مل گئی ہے۔ ادھو! یہ کوئی عطر تو نہیں مل دیا آپ نے؟ دونوں خوشبوئیں ایک دوسرے کو دہا رہی ہیں۔ دیکھیں تو....“ ہم سب حیران رہ گئے اور آبا جان نے تو بہت ہی شاہاش دی۔

ایسے نغمہ ہمارے گھر کی مستقل رونق بن گئے تھے۔ زندگی کی کشتی اب شباب کے دریا میں پوری طرح تر چکی تھی۔ شباب کی لہریں جذبات کے ساحل سے مستانہ وار تکرار رہی تھیں۔ نغمہ جوان ہو چکی تھی۔ اتنی کو اس کی شادی کی فکر دامنگیر ہوئی۔ لیکن جوہنی اس کا تذکرہ کیا گیا، نغمہ پر جیسے سکتے طاری ہو گیا۔ اتنا شدید رد عمل! اس کا وہم و گمان بھی نہ ہو سکتا تھا۔ وہ کئی دن بخار میں ٹھنکتی رہی مجھے بے اختیار ”مذکا“ کا ہیرو یاد آ گیا۔ میرے ذہن میں نغمہ کا ایک تصور تھا اور وہ مجھے دھندلاہٹوں کی آغوش میں کھوتا ہوا محسوس ہوا۔

ہماری موسیقی

فنِ نغمہ کی تاریخ اور اس کے فن و فلسفہ پر سیر حاصل نظر

مرتبہ: رفیق خاں

- نئے موضوعات کا اضافہ
- پاکستانی موسیقی کے موجودہ مسائل
- ساز و آہنگ کی دنیا میں مسلمانوں کا عظیم حصہ
- مسلم فنکاروں کے اعجازاتِ موسیقی، تمدن و تاریخ انسانی میں نغمہ و آہنگ نے کیا کردار ادا کیا۔

چند موضوعات

مشاہیرِ موسیقی: امیر خسرو، سلطان حسین شرقی، میان تان سین۔ شاہ عبدالطیف بھٹائی، مان رس خاں، مسیت خاں، نیروز خاں
تاریخِ موسیقی: موبقی اور تمدنِ عالم، موسیقی میں مسلمانوں کا حصہ، پاکستانی موسیقی، ہماری موسیقی کے ساز
پاکستانی موسیقی: مشرقی پاکستان کے لوک گیت، مغربی پاکستان کے لوک گیت، راک و رول (دارالشاہ)
مسائلِ موسیقی: تجددِ موسیقی، قومی ترانے کی موسیقی اور سرگم ہماری موسیقی کے مسائل، نمبر نویسی

چند ممتاز ادیبانِ قلم

سیدنا بدلی عابد جناب شاہد احمد دہلوی۔ جناب خادم محی الدین، قاضی۔
احمد میاں اختر جو ناگزری، ڈاکٹری بخش خاں بلوچ، فیروز نظامی سید بٹے
سجاد و سرور نیازی، احمد جی چھاگلہ، سید امجد علی، عاصم حسین، امین الرحمن،
رفیق غزنوی اور مادام آذوری۔

کتاب میں مختلف سازوں کی آرٹ پیپر چھپی ہوئی آٹھ صفحے کی
نغیں تعداد بھی شامل ہیں۔

کتاب نغیں اردو ٹائپ میں نہایت دیدہ زیب اور خوبصورت سرورق
کے ساتھ شائع کی گئی ہے۔ قیمت صرف پانچ روپے۔

ادارہ مطبوعات پاکستان۔ پوسٹ بکس ۱۸۳۳ کراچی

سوندھی مٹی

طاہر احمر

اب اس دعوے کے لئے کسی دلیل کی بھی حاجت نہیں رہی ہے۔ ہر قوم اپنے ثقافتی آثار و ملامت کی زندہ مثالوں سے ہی ممتاز ہوتی ہے اور اقوام عالم میں پہچانی جاتی ہے۔ یہ ملامتیں رسم و رواج، زبان و ادب، قدیم کہانیوں، گیتوں، روایات میں ملتی ہیں یا قوم کی امنگوں اور دین و ملت کی گامی سوندھی مٹی سے تیار ہوتی ہیں۔ ان کی توانائی کی سب سے بڑی علامت یہ ہے کہ وہ نئے ماحول اور نئی رفتار کے ساتھ خود کو زندہ رکھ سکتی ہیں اور ان کا حسن ماند نہیں پڑتا نہ ان کی تاب دم بڑھتی ہے۔ ہمارا قومی کچھ اس روشنی میں یقیناً نیا نہیں، بہت پرانا ہے، بڑا مانوس اور گہرا۔ اس کی علامتیں گندھارا کی وادیوں سے لے کر سندھ کے ڈیٹا تک بکھری ہوئی ہیں اور آج کی مشینی زندگی بھی اس کی اصل توانائی، کشش اور روح کو نقصان نہیں پہنچا سکی ہے۔ یہی زندہ تہذیب کی علامت ہے۔ ہماری ثقافت، جس کے ڈانٹے گندھارا کے مجسموں، مومن جو درو کے گلی کوچوں، یہاں کے ظروف اور ٹیکسلا کے عظیم معبدوں اور دانشکدوں سے ملے ہوئے ہیں اور ہڑپا سے اس کا قدیم رشتہ ہے۔ اسے شالامار کے مرمیں دیو کوں سے بھی مناسبت ہے۔ اس نے قصبہ خوانی بازار کو صرف ایک بانڈا ہی نہیں رہنے دیا ہے اور رندھا کا کی طلسمی گلیاں صرف گلیاں ہی ہیں۔ ان میں جو زندگی، رنگارنگی اور ہمہ گیر کیفیت نظر آتی ہے وہ ایک طویل قومی داستان کا حصہ ہے۔ یہ تاریخ، تہذیب اور ثقافت کی ان مختلف طاقتور تحریکوں کا امتزاج ہے جو اس سرزمین میں پہلے ہی ہیں اور اپنا نقش چھوڑ گئی ہیں۔ ان مٹ نقش۔ یہ تہذیبی نقوش فن کارانہ بھی ہیں، نسلی و سماجی بھی اور تعمیراتی بھی۔ ان کے قدیم اور مقدس وجود سے ہم کو اپنی سرزمین کی زندگی، اس کی قدامت، عظمت اور شہرہ کا پتہ چلتا ہے۔ یہ تہذیب دنیا کی عظیم ترین تہذیبوں کی طرح انسانی عظمت و حسن کا ایک سرمدی نقش ہمارے دلوں پر چھوڑتی ہے، خواہ آپ محسوس کریں یا نہ کریں۔

شکر کا مقام ہے کہ اب کچھ عرصہ سے ملک کے دانشور اور ادیب بھی قلم کھلا قومی کچھ کی اصطلاح استعمال کر رہے ہیں اور انہوں نے بھی بالآخر اس کے اپنے علیحدہ وجود کو تسلیم کر لیا ہے۔ آج ان مفکروں کی طرح جن کی مٹھی انگلیوں نے ہماری دھرتی کے حسن اور اس کی بالیدگی کی پرورش کی ہے، ہمارے اہل علم و اہل قلم بھی اب سر بلندی کے ساتھ اپنے قومی کچھ کے الفاظ استعمال کر رہے ہیں۔ یہ ہمارے قومی نشوونما اور خود داری کی ایک واضح علامت ہے۔ اس سے پہلے اکثر یہ سنا جاتا تھا کہ ہمارا کوئی واضح کچھ نہیں ہے۔ ہمیں ایک قومی کچھ کی ضرورت ہے۔ وغیرہ۔ اب کچھ اداروں نے، بالخصوص رائٹرز گلڈ، آئس کوئٹل آف پاکستان اور نڈل ایکڈمی کی کوششوں سے یہ صورت حال روشن تر ہوتی جا رہی ہے کہ ہماری ندخیز زندگی جو خیر سے چاٹھام کی پہاڑیوں اور بیو عرب سے قراقرم کی وادیوں تک پھیلی ہوئی ہے، ایک زبردست تہذیب اور واضح کچھ کی امین ہے۔

یہ احساس اتنا ہی اٹھکا ہے جیسے بعض لوگ شہروں میں رہتے ہوئے اچانک سمجھ جائیں کہ وہ کیلئے نہیں رہتے۔ یہ حقیقت بڑی آہستہ کی طرح سے ظاہر ہوئی ہے۔ لیکن اس کی وضاحت بڑی ضروری اور مبارک ہے۔ کیا ہمارا قومی کچھ کوئی نئی علامت ہے؟ کیا یہ صرف چند سال کے اندر ہی ظہور میں آیا ہے؟ میرا خیال ہے کہ ایسا نہیں ہے۔ بلکہ صرف اس احساس کی جڑیں مضبوط ہوئی ہیں اور اگر اب بھی کہیں احساس کمتری یا بھنبھلا ہٹ پائی جاتی ہے تو وہ بھی یقیناً آہستہ آہستہ دور ہو جانیگی۔ کیونکہ واقعہ یہ ہے کہ ہماری قومی ثقافت اتنی ہی قدیم ہے جتنا اباسین، جتنا چناب اور ان کی ٹھنڈی زرخیز زمین اور شہر قیام پاکستان کے جنگلوں میں رقص کرنے والی خوشبودار ہوا۔ ہمارا یہ قومی ورثہ ایک وسیع، متنوع اور گہمیر دنیہ ہے جس کے کنارے دلوں سے دلوں تک پھیلے ہوئے ہیں اور جس کی علامتیں اب واضح تر ہوتی جا رہی ہیں شاید

دوسرے افلاطین میں یہ کہوں گا کہ ہماری قومی تہذیب دراصل مختلف علاقائی عناصر اور عوامی روایات سے مل جل کر گندھی ہے۔ یہ اتنی ہی قدیم ہے جتنی بن جلی، کسان کا ہل بھولا ہے، کارگھ چلانے والی انگلیاں اور قالین بننے والے کے ہاتھ۔ یہ اتنی ہی عظیم ہے جتنی سفال مگر کی تھیلیاں، ڈلیاں، اور ٹوکریاں بننے والی آنکھیں۔ یہ وہی قدیم تہذیب ہے جس کی تعمیر میں معمار کی محنت، کسان کا پسینہ، ٹبرجی کی کاوش، ڈھاکر لیل بچاؤ والوں کی روایات، نقاشوں کی عرق ریزی اور سنگ تراشوں کا خون مگر ملا ہوا ہے۔ ہماری تہذیب کی اساس ایک زرعی معاشرت پر قائم ہے جس کو صدیوں تک دھرتی نے پر دان چڑھایا ہے اور جو وقت کے ساتھ ساتھ زیادہ توانا اور دلکش ہوتی چلی گئی ہے۔ آج مٹی کا برتن، اونٹ کی کھال کا لمپ، اونٹنی قالین، رنگین تنکوں کی ٹوکری اور تھکر کی ہوتی سب ہماری تہذیب کی علامتیں بن گئی ہیں۔ ہم نے ان کو زندگی میں ایک نئے انداز سے شامل کیا ہے۔ آج ہمارے سجے ہوئے ڈرائنگ روم کی زینت بھی ہیں اور معمولی سے گھر کی آرائش بھی، ہمیں ان سے محبت ہے کیونکہ یہ سب چیزیں ہماری ہیں۔

اس گفت گو سے یہ تو معلوم ہو گیا کہ ہماری تہذیب قدیم ہے اور اتنی قدیم جتنی کہ زندگی، لیکن ہماری تہذیب صرف اپنی قدمت کے بل بوتے پر ہماری بقا و حفاظت کی حق دار نہیں بن جاتی بلکہ اس میں افادیت بھی ہے اور وجدانی تہذیب کا سامان بھی۔ اس میں قومی تنکوں اور آندوؤں کا اظہار بھی ہوتا ہے، نیز آگے بڑھتی ہوئی ارتقاء پذیر زندگی کی بیباکی اور اخذ و جذب کی صلاحیت بھی۔ کیا ہماری تہذیب ان مظاہر کو پیش نہیں کرتی؟ میرا جواب تو اثبات میں ہے۔ آپ کا کیا خیال ہے؟

ہماری تہذیب صرف قدیم ہی نہیں ہے بلکہ اس نے ہر دور میں نئی باتوں کی توانائی اور حسن کو بھی اپنے اندر سمویا ہے۔ مغلوں اور ترکوں کی تہذیب نے اسے بہت کچھ دیا ہے۔ غور سے دیکھئے اس تمام سراپا میں محکم کا حسن طبیعت بھی ہے اور عرب کا سوز و دروں بھی۔ ایک اور خوبی یہ کہ اس نے ادب اور فن کے میدانوں میں بھی مقامی اثرات کو قبول کیا ہے اور بڑی بلاغت و چابکدستی کے ساتھ ارتقائی عمل کا ساتھ دیا ہے۔ اسی قومی مزاج نے ہم سے شالامہ بنوایا، بادشاہی مسجد بنوائی، قصہ خوانی بانا آباد کر لیا۔ دیکھئے جہاں بہت خاں کی مسجد، مسجد مست گنبد اور جہاں گھر کے

مقبورہ کی نازک مرمرین نقاشی کیا دستان سنا رہی ہے۔ کیا ڈھاکر کی لیل، گجرات کے نازک ظروف، شمشک کی عظیم عمارتیں اس دھرتی کے حاد و خبیث۔ تہران اور پشما کے شاداب پانیوں سے زرخیز، علاقائی گیتوں میں ابھرنے والا جذبہ اور اس کی مٹھاس کون بھول سکتا ہے۔ ہمارا قومی کلچر عوام کے دلوں میں اتنا ہی قدیم ہے جتنی زمین کی چھایا اور آس کا حسن، ہم اس سے اپنا رشتہ کیسے توڑیں؟ کیا ماضی کی ہر شے ناکارہ ہی ہوتی ہے؟ ماضی سے ہی زندہ اور توانا کلچر کی روایت آگے بڑھتی ہے۔ ایسا کلچر جو ابھی تک انمٹ ہے، کیا وہ کبھی بھی نابود ہو سکے گا؟ حقیقت تو یہ بتا رہی ہے کہ وہ زندگی کے ساتھ جینے کی کوشش میں کامیاب رہا ہے۔ یہ کلچر بھٹیالی گیتوں، ٹوڑھی لگکا اور پدما کے ملاحوں، چناب و جہلم کے کسانوں، نذرل، وارث شاہ اور شاہ لطیف کی دھرتی کی پیداوار ہے اس لئے سدا بہا ہے۔ یہ دھان کے کھیتوں، پٹن کی فصلوں، چانگام کے چائے کے باغات میں پیدا ہوتا ہے اور ان کے باسیوں کے گیتوں سے رنگارنگ بنا ہے۔ اسے کافیوں اور ٹپوں نے سوز و ساز دیا ہے۔ سندربن اور کھلنا کے ساحلوں کے طائرانہ رقص و نغمہ نے اسے پروان چڑھایا ہے۔ اسے سرحد کی چٹانوں، سوات کی وادی اور راوی کی موجوں نے دلکش بنا دیا ہے، جوانی بخشی ہے۔ یہ صدف ڈھاکہ، جیسو اور کھکس بازار میں ہی نہیں پہچانا جاتا اس کی نمود ملتان، پاک پٹن، لاہور، بہاولپور اور لنڈی کوتل میں بھی اپنا روپ دکھاتی ہے۔ یہ اقبال، نذرل، وارث شاہ، فرید، لطیف اور خوشحال خاں کے فکر کی آغوش سے تباہی پاتا ہے۔

کیا ہمارا کلچر حال سے بے خبر یا بے نیاز ہے؟ کیا وہ مرگیا ہے؟ کیا وہ نئی علامتوں کو جذب کرنے سے قاصر ہے؟ مگر امتیاز سے دیکھئے تو وہ ہر طرح والا مال نظر آتا ہے۔ ان اہم سوالوں کے اقرار یا انکار پر ہمارے قدیم کلچر کے مستقبل کا فیصلہ ہے، مگر خوش قسمتی سے ان سوالوں کا جواب نفی میں ہے۔ ہمارا قومی کلچر تمام زندہ کلچروں کی طرح ماضی سے بے نیاز نہیں۔ نہ وہ مردہ ہے نہ وہ نئے دور کی نئی صحت مند علامتوں کے جذب سے بے خبر یا تہی مایہ۔ یہ صحیح ہے کہ ہمارا قومی کلچر بھی صنعتی دور کی زد میں ہے۔ مگر دنیا کے کون سے تہذیبی عناصر ہیں جو اس طرح مٹتی ہیں عہد کی زد میں نہیں۔ آج صدیوں پرانے عقائد، رسوم اور روایات پر نئی زندگی کی ضرب لگ رہی ہے۔ یقیناً نئی زندگی اور اس کے مطالبات

زبانوں، داستانوں، ناٹکوں سے ہم کیا کچھ کام نہیں کر سکتے، قومی تعمیر نو میں سب کو ششوں کو مبلغ اور موثر بنانے کے لئے انہیں عوام تک پہنچانا ہے، اسے عام پسند و عام فہم بھی بنانا ہے۔ مختصر یہ کہ ہماری دھڑکی ثقافتی اقدار کی نشوونما کے لئے بہت زرخیز ہے۔ بس اسے اپنے عمل اور جذبہ سے پروان چڑھانا ہے۔ اگر یہی اس طرح زراعت ہو جائے تو اس کی زرخیزی کو چار چاند لگ سکتے ہیں۔ اس دعوت فکر و عمل کے لئے ہمارے ذہین و دانشور طبقہ ہی پر زیادہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے اور کام کرنے کے لئے اس دور میں پہلے کی نسبت کچھ زیادہ ہی مروساں ملتیں ہیں، اس لئے ضرورت ہے کہ ہم اس ہی ضمن میں کچھ سوچنا اور کام کرنا شروع کریں۔

”اے روشنیوں کے شہر“ البقیہ ۲۵

میں تو رندوں کی یہ زنجیر ظلمت - شعاعوں بھرے شہر!
(دریچے سے جھلاٹک دکا تپہ)

بوڑھا، خالدہ! خالدہ!

(رنگین موسیقی)

آہ اے شہر... چمکتے ہوئے ہوتے ہوئے شہر
کٹنا ہے دم ہے سفاک ہے تیر
قرے بے خواب درجوں کے ا جالے - جلاو
تیرے شب تاب تنوؤں کی فضا - تیغ ستم
تیرے انہوں کی کٹکٹ - ساغر ستم
تیری خواب عمارات ہیں - نقش گاہیں
تیری رعائیاں - آنکھوں کا فریب
یہ ترا سن - متعجب ہے - نائش ہے فقط
ریگ رواں، موج سراپ! د

ریویو کے لئے

دو کتابیں روانہ فرمائیں۔

(ادارہ)

قدیم ٹھہری ہوئی زندگی اور اس کے مطالبات سے بے پروا یا لائق نہیں ہو سکتی اس لئے نئے دور میں قدیم معاشرہ کا رنگ روپ بدلنے کی بات نہ چڑھکا دینے والی ہے نہ ماپوس کن - روایات شکست و ریخت کی زد میں ضرور آئیں گی، مگر نیا چلا بدلی کر پھر سامنے بھی آجائیں گی۔ عام مشاہدہ ہے کہ کوئی شے کا ملا نہیں بنتی، ہاں روپ ضرور بدلتی ہے۔ کسی علامت اور نشان کو ہم کیسے مٹا سکتے ہیں۔ وہ نقش اگر دم پرچے ہو کوئی دوسرا نقش اس کے چھوڑے ہوئے نشان پر کھرا تپہ بنی ہوئی طاقتوں نے بھی قدیم نقش کے ساتھ ایسا ہی کچھ کہہ سکتا ہے۔ مگر کیا پرانی تہذیب کی نمود، تاریخی عمارت پرانی بستیوں کے گچی کوچے یکسر فنا ہو گئے؟ ریل، تار، برقی طاقت اور ریڈیو نے ہم سے کیا چین لیا؟ پلوں کی تعمیر، سڑکوں کا حال اور گاؤں گاؤں بجلی پہنچ جانے سے ہمیں فائدہ اور آرام پہنچا ہے یا نہیں؟ ان جدید آسائشوں نے ہمارے صنعت کاروں اور فنکاروں سے ہی ہاتھ ڈالا ہے اور ان کی تخلیق کو متاثر کیا ہے۔ بعض چیزوں کی قلب باہیت ہو گئی ہے مگر کسی چیز کی کوہ کلیتہ فنا نہیں ہوئی ہے۔ نئی روایات اور نئی زندگی میں تبدیلیاں آجانا ناگزیر تھا مگر یہی حقیقت ہے کہ جدید صنعتی دور نے پیداوار اور سماجی رشتوں کو نئی طاقت بھی دی ہے اور نئی زندگی ابھر رہی ہے۔ لیکن کیا اس نئی برق واپ کی قوت میں اتنا ہوتا ہے کہ وہ آپ کے کلاسیکی ادب کو بدل ڈالے، آپ کے گیتوں کا رس چیلن لے؟ کوئی سائنس، کوئی قوت آتش و آہن روایات کی دھڑکن اور ان کا حسن نہیں چھین سکتی، نہ انہیں ہمیشہ کے لئے مٹا سکتی ہے۔ وہ کبھی کبھی دلوں کی پہنائیوں میں چھپ ضرور جاتی ہیں مگر ایک وقت میں پھر دلوں سے ہی ان کے سوتے پھوٹتے ہیں، اور اپنی سر زمین کو لالہ زار بنا دیتے ہیں۔ اس کی بڑی گہری نفسیاتی وجہ ہے۔ مثلاً آپ اپنے خوابوں کا نقشہ بھی بدل سکتے ہیں۔ اس میں کنوئیں کی جگہ نل لگا سکتے ہیں۔ بیل گاڑیوں کی جگہ موٹر میں دوڑ سکتی ہیں۔ اور یہ سب کچھ ہو بھی رہا ہے مگر کیا دلوں سے ہمیں اپنی تہذیبی روایات کے چھن جانے کا خدشہ لاحق ہوا ہے؟ ہمارے گیت، ہمارے قصے، ہماری داستانیں، ماوی تہذیبوں کے دائرہ سے خارج بھی نہیں ہوتیں اور اپنا جادو پھر بھی جگاتی ہیں۔

آج ہم کو چاہئے کہ برق و باد اور آہن و آتش کے جابر عناصر سے اپنی قومی تہذیب کے دفاع کا کام لیں۔ ان سے نئی توانائی، طاقت اور اشاعت علم و فن کا کام لیں۔ پرانی کتابوں، ادب پاروں، تصویروں،

غزل

جمیل نقوی

عبد اللہ خاوند

ہو اے شوق کو اپنی روش پہ چلنے دو
جنوں کو راہ گزاروں کا رخ بدلنے دو
کسی کے وعدہ فردا کا انتظار رہی
اسی حسین سہارے پہ غم کو ٹلنے دو
نگاہ شوق سے پھوٹے گی صبح نو کی کرن
افق پہ تیر گئی شام غم مچلنے دو
کبھی تو آئے گا گم گشتہ کا روانِ سحر
روش روش پہ دلوں کے چراغ جلنے دو
جہاں میں اہل سیاست بہا رلا نہ سکے
سب کو کشانِ محبت کا دور چلنے دو
افق کی اوٹ میں سوا آفتاب میں خاوند
کچھ اور حوصلہ تیرگی نکھلنے دو

محبت میں سزا و ناسزا کی یاد کیوں آئے
شامِ عشق کو گل کی، صبا کی یاد کیوں آئے
منو و آگہی تو مین ہے دینِ محبت میں
لبِ اظہار کو دستِ دھلی یاد کیوں آئے
خرد بھی ہے شریکِ خندہ گلہائے بدنامی
تبسم ہائے تمکینِ آنما کی یاد کیوں آئے
حریمِ ناز میں حسنِ نظر کی آزمائش ہے
تو پھر ایسے میں ان دیکھے خدا کی یاد کیوں آئے
نظرِ گم ہے طلسمِ لذتِ محشرِ خرامی میں
جبینِ بندگی کو نقشِ پاکی یاد کیوں آئے
چمن میں سرو بھی آزاد ہے سبز بھی بیگانہ
جنوں کو آشنا، نا آشنا کی یاد کیوں آئے
نشاطِ ضبطِ غم جب عشق کا مقسم ہو ٹھہر
جمیل اس دشمنِ ہر و وفا کی یاد کیوں آئے

غزل

شیدائے گجراتی

انٹھی تو ہے اور میری وہ نگاہ مہرباں اکثر
مگر حائل ہوئی ہیں راہ میں محرومیاں کیا کیا
ازل سے نا ابد اک منزل بے نام کی دھن میں
ہیں سرگرداں سر دشتِ تمنا کا رواں کیا کیا
جواب جلوہ صد رنگ ہے داغِ جگر اپنا
چمکنے کو تو چمکے مہر و ماہ و کھشاں کیا کیا
ہم اپنی عظمتِ گفتار سے بیگانہ تھے اب تک
کھلے اس انجن میں جو ہر طبع رواں کیا کیا
بہر صورت ہم اپنی وضع پر قائم تو ہیں شیدا
بدلتا ہی رہا یاروں کا اندازِ بیاں کیا کیا

سنائی وقت نے یارِ غم کی داستاں کیا کیا
ہوئے ہیں دیدہ کوئین سے آنسو رواں کیا کیا
لئے ہیں زندگی نے اہل دل کے امتحاں کیا کیا
ہوئے ہیں ہم حریفِ انقلابِ آسماں کیا کیا
یہ کس نے بر بطلِ دل پر سرودِ آرزو چھیڑا
اٹھے ہیں روئے فطرت سے سجاوٹِ میاں کیا کیا
سراغِ منزلِ قلب و نظر ملتا گیا جوں جوں
فروں ہوتی گئی رعنائی فکر و بیاں کیا کیا

بمقامِ جانِ تمنا بہ ذرا دیکھ کر کن دہوں سے مجھ کو بے مری گزشتہ تمام حیات
آپنی زیست کے فناک و غم انگیزہ صند لکوں میں سمانے کے لئے کتنی ہے بے چینی مری شامِ حیات
اے مرے دوست مرے ہدم و ہزار مرے عہدِ گزشتہ کی بہادری کی المناک حکایات نہ چھیڑ
جوفہِ شوقِ رنگ ہی پھر بھی مرے دل کے لئے کتنی سم آلود ہے یہ دورِ و تہ جب اے حیات
دیکھ کر پلٹے عملِ جاوید تاریک کے فضاں سے اس طرح نکلتی ہے بہر کام امیدوں کی گلی
حلقہِ ظلمتِ شب توڑ کے جس طرح عمل آتا ہو غورِ شیدائے دنیا پاش جہاں تابِ سیرِ بامِ حیات
تیز چل تیز کہ اے راہِ و ملکِ عدم میں حادثےِ تعبیروں میں نہیں کوئی ٹھہرنے کا مقام
وقت کے دوش پہ ان ٹوٹے ہوئے سقف و دروہام کے آثارِ قدیمہ ہیں بے عبرت گزرا تمام حیات
آج جو ماہِ رخ و ماہِ کوشش و ماہِ جبین سونے میں جتنی سے بہت دور بہت دور تیرے خاکِ مزار
یہ وہی غنچہِ نو خیز ہیں گل جن کے شہسب سے گلستاں کی بہاروں کو لاکھ تھپتھپانیاں حیات
حوصلے دل میں اگر ہوں تو سرے فذوقِ فذوقِ طلب کے لئے یہ ادبِ تریا بھی کوئی چیز نہیں
غمِ ملامتِ جہاں سے لے فرصت تو دکھا دوں میں نہلنے کو پہچاتا ہے کہاں تک یہ راہِ گم حیات
اے چشم ہے چمنستانِ جہاں میں کہیں کوئی کہیں بیل کہیں تیشی کہیں جگنو کہیں بد بخت چکور
یعنی اس عالمِ فانی کے ہر اک گوشہ رنگیں میں برکِ سمت ہے پھیلا ہوا اک سلسلہِ دامِ حیات

غزل

حشمت لکھنوی

کافی گرم

اقبال بنوی

کافی گرم کا علاقہ سطح سمندر سے ۵۳۹ فٹ بلند ہے۔ ٹانگ سے ۸۳ میل دور اور یہاں کے مشہور صحت افزا مقام دانا سے ۳۵ میل کے فاصلے پر واقع ہے۔ وزنگ کا نام تو مشہور چھاؤنی ہونے کی وجہ سے دور دور مشہور ہے، یہ بھی بڑا نفیس علاقہ ہے اور کافی گرم اس سے بس کوئی ۲۰ میل دور ہی تو ہے۔ دانا اور وزنگ کے درمیان ۵۵ میل لمبی سڑک سانپ کی طرح بل کھاتی چلی جاتی ہے۔ اس کا کچھ حصہ اچھی حالت میں نہیں ہے مگر حکومت اسے اب درست کر رہی ہے اور امید ہے کہ جلد حکومت کی مساعی اور عوام کے تعاون سے یہ سڑک نچھٹ اور عمارت ہو جائے گی اور سفر مزے سے کئے گا۔ آزا دی سے پہلے اس سڑک پر صرف ٹرکیں چلا کرتی تھیں مگر اب سات آٹھ میل تک بسیں بھی چلنے لگی ہیں اور جوں جوں فلاحی کام بڑھتے جائیں گے اس علاقے کی ترقی بھی ہوتی جائیگی۔ اور بسیں بھی دور دور تک جانے لگیں گی۔ اگر آپ دانا سے بس یا ٹرک پر سوار ہو کر چلیں تو راستہ میں کوئی ۱۰ میل کے فاصلے پر آپ کو ایک بڑا مضبوط قلعہ نظر آئے گا۔ اسے تیار کردہ کا قلعہ کہتے ہیں۔ اس میں پہاڑی علاقے کا حفاظتی دستہ تعینات ہے جو خلعے دار کہلاتے ہیں۔ یہاں سے کوئی سات آٹھس دو چالیس تو بڑا سبز و شاداب علاقہ آجاتا ہے، بڑا دلنزیب پہاڑی منظر ہے۔ سڑک کے کنارے اور پہاڑوں پر چتر کے سدا بہار درختوں کا سلسلہ دور تک چلا گیا ہے۔ یہ جھوم جھوم کر آنے والے جھول کو خوش آمدید کہتے ہیں، اخروٹ، خربانی، چلوڑہ کے شاندار درختوں کی کثرت ایک الگ پربہار و جاں فرزا نظارہ ہے۔ کافی گرم کا قصبہ اب ذرا سے فاصلے پر رہ گیا ہے، لیجئے وہ قصبہ کے مکانات کا طنسی نظارہ سنئے آگیا۔ دو دو سے ایسا لگ رہا ہے جیسے ”الف لیلہ“ کا کوئی معجزہ ہو!

کافی کی وجہ تسمیہ کے سلسلے میں بھی بہت سی روایتیں مشہور ہیں۔ یہاں کے لوگ زیادہ تر آباد ہیں۔ یہاں کے لوگوں کا کہنا ہے کہ گرم ”گرام“ (گاؤں) کا بڑا ہوا تلفظ ہے جیسے بلگرام، مگرام وغیرہ مقامات میں

آپ کا فرمانا صحیح ہے کہ آپ نے یہ بولی اس سے قبل کبھی نہ سنی تھی مگر ہمارے ملک میں، خاص کر مغربی پاکستان میں، آپ ایسے بہت سے مقامات پر پہنچیں گے جہاں کی دنیا جی بدلی ہوئی نظر آئے گی اور بولی بھی پہلے کبھی نہ سنی ہوگی، مگر حقیقت میں وہ ہمارے ہی وطنی بھائی ہیں اور یہ جگہیں بھی ہماری ہی سرزمین کا حصہ ہیں۔ اپنی و حرتی کے مختلف علاقوں کا تعارف، ہم پہنچنا چاہا تو قومی و قریضہ ہی نہیں یوں بھی ایک بڑا دلچسپ ثقافتی مشغلہ ہے۔ آپ جگہ جگہ جائیں تو بہت سی باتیں سنیں گی بلکہ لباس، بول چال اور رہن سہن بھی کچھ جدا معلوم ہوگا مگر یہ بھی ان میں بہت سی مشترک قدریں آپ کو ملیں گی اور انہیں معلوم کر کے ہم میں یکجا نکت کا اور بھی قومی احساس پیدا ہو جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج آپ اتنے دور دراز سفر کے بعد یہاں تک پہنچے ہیں۔ یہ ہمارے علاقے اور اس کے باشندوں سے تعارف کی لگن ہی ہے جو آپ کو کھینچ کر یہاں لائی ہے۔ جیسا کہ میں نے عرض کیا، آپ نے یہ بولی پہلے نہ سنی ہوگی، پشتون کہ تو خیر آپ جانتے ہی ہیں مگر یہ برکی لوگوں کی بولی ہے۔ برکی حضرات اور ان کی بولی کا مزید تعارف میں ابھی کرتا ہوں۔ آپ نے راستہ میں جگہ جگہ ”برکی کروانہ سٹور“ برکی جنرل مینشن وغیرہ کے بورڈنگ ہوئے دیکھے ہیں، تو اس سے یہ تو معلوم ہو گیا ہو گا کہ یہاں برکی حضرات کثرت سے آباد ہیں۔ اب تو برکی حضرات کا تعارف برکی مشاہیر کی وجہ سے ویسے بھی ہر جگہ ہو چکا ہے، یوں مختصر میں بتانا چلوں کہ یہ لوگ یہاں کے خاص باشندے ہیں اور بڑی پرانی تاریخ و ثقافتی اہمیت کے مالک ہیں۔ ان لوگوں کی اپنی زبان ہے جس جگہ آپ پہنچے ہیں اسے کوہستان شور کا سلسلہ کہا جاتا ہے۔ یہیں وہ جگہ واقع ہے جسے دیکھنے کی کشش آپ کو لاتی ہے یعنی کافی گرم۔ یہ بھی ہمارے کوہستانی شمال کا ایک بڑا پُر فضا اور صحت افزا مقام ہے مگر ابھی اس کے نام کا چرچا کم ہوا ہے اس لئے ضرورت ہے کہ ہم لوگ ارضی بہشت کے اس گوشے سے بھی اچھی طرح واقف ہو جائیں۔

علاقہ ہند کو بھی خوب بولتے ہیں۔ جب ان کے علاقے میں زبردست برف پڑتی ہوتی ہے تو یہ لوگ پناہ لینے کے لئے ٹانگ کی طرف ہجرت کر جاتے ہیں۔ وہاں ہند کو کارواج بھی ہے اس لئے ہند کو بھی خوب بولنے لگتے ہیں ضرورت کے وقت پشتو ہی زیادہ بولتے ہیں۔ مگر ان کی اپنی بولی، آرمڑ، کئی زبانوں کا آمیزہ ہے۔ جو بھی بیرونی لفظ یا دخیل الفاظ ملیں گے وہ زیادہ تر بگڑی ہوئی شکل میں ملیں گے۔ اس زبان کا کوئی بڑا ادبی ذخیرہ میرے علم میں نہیں مگر یہاں کے ادب دوست حضرات کے پاس اس زبان کے جو چند کسلے بچے دیکھنے کا اتفاق ہوا ہے وہ کافی دلچسپ ہیں۔ ایک صاحب اس زبان میں غزلیں بھی خوب کہتے ہیں۔ پشتو بولنے والی درستی کے کتب خانہ میں اس زبان کی ایک امر کا بھی ایک رسالہ موجود ہے۔

کافی گرم میں کچھ زیادہ آبادی تو نہیں ہے، یہی کوئی چھ سات ہزار کے قریب ہے۔ مکانات کی روشنی ہی نظر آئے گی جیسی کھلاباغ میں ہے۔ درجہ حرارت بلند یوں پر بنے ہوئے۔ مکانات ہیں۔ کہیں کہیں موڑے بھی بنے ہوئے نظر آئیں گے۔ بجل بھی بنے ہوئے ہیں جو بہت اچھی پناہ گاہیں بھی بن چکی ہیں۔ ان بجلوں سے عام طور پر باب کی دلکش آواز سنائی دیتی ہے۔ ضروریات زندگی سب ہی مل جاتی ہیں، زیادہ تر لوگ کھانہ پیٹہ ہیں۔ یوں تو کاشتکاری اور مویشی بانی بھی کرتے ہیں۔ یہاں کی پیداوار میں جوار، آلو اور کھیرا بہت عمدہ ہوتا ہے۔

ہاں، ایک اور ضروری بات بھی بتاؤں، یہاں بھی دورہ آدم خلی کی طرح بڑا اچھا سلمہ بننا ہے بلکہ یہاں کے لوگ تو یہ بھی کہتے ہیں کہ ہماری سلمہ سازی استادانہ ہے، اور درہ والوں نے ہم ہی سے سیکھی ہے۔ آرمڑ بہت تنومند، دھیمہ اور قد آور ہیں۔ مردوں کا لباس قمیص، شلوار، واسٹ اور ٹیڈی ہے۔ کبھی کبھی سواتی ٹوپی بھی پہنتے ہیں جو اب دور دور مشہور ہو چکی ہے۔ چٹانوں کا زبرد بندوق ہے۔ یہاں کے لوگ انہیں بڑے چاؤ سے رکھتے اور صبح شام ملے کر کھتے ہیں۔ عورتوں کا لباس وہی شلوار قمیص یا سرخ پھولدار چینٹ کاٹھا گرا ہے، کالا دوشیہ بھی اوڑھتی ہیں جس پر ٹھیکہ ٹکا ہوتا ہے۔ ان کپڑوں پر ریشم کے تاروں اور رنگین دھاگوں سے بہت عمدہ کشیدہ کاری کی جاتی ہے۔ زیور کارواج یہاں کم ہے۔ یہاں کی عورتیں بڑی نوی، بڑی صحت مند اور مختار ہوتی ہیں۔ کھنڈے، حائیاں، چرخنا، کھیتوں میں مردوں کا ہاتھ بٹانا، نڈی سے پانی بھر کر نانا اور گھر کے سارے دھندلے اپنے ہاتھ سے کرتی ہیں۔

مگر گرم، کا لفظ بھی شامل ہے۔ یہاں پہاڑی علاقوں میں اسے کانٹری گرم (پتھروں کا قریہ) کہتے تھے وہ کثرت استعمال سے کافی گرم" بن گیا۔ ایک دفعہ کسی پرچے لکھے دوست نے مجھے بتایا تھا کہ اصل میں یہاں معدنیات کی کثرت ہے۔ اس لئے یہ "کین گرم" کہلاتا تھا، اب عوامی بولی میں اس کا عنوان "کافی گرم" ہو گیا ہے پشتو میں "کانٹری" کے معنی بیشک پتھر یا چٹان ہی کے ہیں۔ اس پاس لوہا ملتا ہے اور سونا موجود ہونے کے بھی آثار ہیں کیونکہ برسات میں اکثر ندیوں کے پانی میں سونے کے ننھے ننھے ذرات کا بہنا عام مشاہدہ ہے۔ بہر نوع یہ قصبہ پراپرانا آباد ہے۔ یہاں تک کہتے ہیں کہ راجہ اشوک و کنشک کے زمانہ میں بھی موجود تھا، چنانچہ یہاں ان راجاؤں کے زمانے کے سکے بھی برآمد ہوئے ہیں مسلمان یہاں ساتویں صدی سے ہی آباد ہیں۔ اکثر آرمڑوں کا دعویٰ یہ ہے کہ ان کے آباؤ اجداد دینی تھے اور محمود غزنوی کے زمانہ میں یہاں آکر آباد ہوئے تھے۔ محمود نے اپنی زوج میں پانچ سو کھیتی جنگجو بھی بھرتی کئے تھے۔ فخر سومات کے بعد یہ کھیتی سپاہ محمود کی اجازت کے کراسی جگہ مستقلاً آباد ہو گئی امدان کی نسل کے حضرات آرمڑ یا بگڑی کہلاتے ہیں۔ یہ حضرات پشتو بھی بولتے ہیں اور اپنی مخصوص برکی بولی بھی۔

مغلوں کے عہد میں یہ لوگ بڑے خوشحال تھے، آبادی بھی اتنی کثیر تھی امدان کے پاس زمینیں بھی بہت تھیں مگر جب معاشی حالات کا تقاضا ہوا تو وہ لوگ یہاں سے نکل کر دوسرے مقامات پر بھی جا بسے۔ چنانچہ آجکل یہ حضرات ملتان، پشاور، ورنہ، ٹانک، کابل میں بھی بسے ہوئے ہیں اور غیر منقسم ہند میں جالندھر تک جا کر آباد ہو گئے تھے۔ آزادی کے بعد بہت سے گھرنے پھر پاکستان میں آکر رہائش گئے ہیں۔ خود پشاور میں آرمڑ بایاں اور آرمڑ بالا ان کی مشہور بستیاں ہیں۔ اور آپ کو سن کر تعجب ہو گا کہ یہاں بھی ایک جگہ جالندھر کے نام سے مشہور چلی آتی ہے۔ یہ کافی پرانی جگہ ہے اور کافی گرم سے ذرا ہی فاصلہ پر چھوٹا سا گاؤں ہے جو حضرات امر جا کر بس گئے انہوں نے بہت ترقی کی اور اس علاقہ کی شہرت کا باعث بنے۔

اب آپ پوچھتے ہیں کہ ان کی زبان کا حال کیا ہے، تو عرض ہے کہ ان لوگوں کی اپنی بولی آرمڑ کہلاتی ہے مگر مسعود پنڈانوں کی طرح پشتو بھی اسی روائی و فصاحت کے ساتھ بولتے ہیں۔ یہ لوگ بھی افغانہ میں شمار ہوتے ہیں امدان کی مادری زبان آرمڑ ہی ہوتی ہے، پشتو کے

اور اسکی وجہ سے ان کی صحت قابل رشک رہتی ہے۔

دوسرے قبائل کی طرح ارغر (یا برکی) حضرات بھی بڑے دیندار ہوتے ہیں اور پاکستان کے انتہائی وفادار و توانا باشندے ہیں۔ جہاں تک میں ان کو جتنا غلو ہے وہ آپ نے ابھی دیکھ ہی لیا۔ ارغر نوجوانوں کو موسیقی سے بھی بڑا لگاؤ ہے اور الغوزہ تو بڑا اچھا بجاتے ہیں۔ شادی بیاہ کی صوات زیادہ تر دہی ہیں جو سابق صوبہ سرحد کے دیگر علاقوں میں پائی جاتی ہیں۔ ایسے موقعوں پر مرد پہاڑی رقص پیش کرتے اور بڑے سریلے سازوں کے ساتھ پشتو لوک گیت گاتے ہیں۔ موسم سرما کے دوران لوگ زیادہ تر جھروں میں وقت گزارتے ہیں۔ ساگ دکھتی رہتی ہے اور لوگ ارد گرد جمع ہو جاتے ہیں۔ کوئی خوش فکر نوجوان الغوزے پر ایک ایسی دھن بجانے لگتا ہے جس سے شہر میں سحر ہو جاتا ہے۔ آگ میں لکڑیاں ڈھنکی رہتی ہیں، بوڑھے عمر رفتہ کے قصور میں گم اور نوجوان ان دیکھے خواب میں محو ہوتے ہیں، غرض محب سماں ہوتا ہے۔ ارغرؤں کی زبان میں حلاوت بہت ہے اور جذبہ خیال میں رفعت و صداقت بھی۔ یہاں کے چند مقبول گانے کسی وقت سنو اڑیں گا، اس وقت مجھے دوبہی ایک گیت یاد آگیا۔ بطور نمونہ پیش کرتا ہوں۔ کہنے والا کہتا ہے۔

”میں آجاؤں گا، مگر تم نہ سو گے، تمہاری ٹوٹی ہوئی

دلہاؤں پر میں پھوٹ پھوٹ کر روؤں گا“

ایک اور شعر کا مفہوم یہ ہے،

”میرے حبیب اب تم نہ ہی پہ آنا چھوڑ دو، میری ماں

نے میرا گھر توڑ دیا ہے“

یا پھر کسی گیت کا یہ ٹکڑا:

”یہ روشن چہرہ، یہ چکوری آنکھیں، یہ مشکیں بال،

ہاں ان کا مالک وہی ہے جو جنگ میں کبھی نہیں دکھا۔

غرض اگر ایک بار روانہ ہو تو اس کو لوٹا یا جاسکتا ہے

مگر دیدار محبوب کا لمحہ گزند جانے تو وہ نہیں ٹوٹتا“

آپ نے مری بھی دیکھی ہے اور صوات بھی سنا ہے۔ اب آپ ہی

بتائیے کہ اس مقام کی قدرتی خوبصورتی ان جگہوں سے کچھ کم تو نہیں ہے؟

دیکھئے سامنے چتر کے جنگلات ہیں۔ صاف شفاف نیلے پانی کی مترقعی

گزر رہی ہیں۔ ذرا غور سے دیکھیں، جب سورج کی کرنیں ان پر پڑتی ہیں تو

پانی کیسا گلستا ہے، جیسے پارہ بہہ رہا ہو۔ چاندنی رات میں ان طلسمی

ندیوں کا نظارہ تو غضب کا جوت ہے۔ چتر، خرمائی، اخروٹ، نلستر

چنار اور پلغوزہ تو یہاں کثرت سے ہے، مگر کہیں کہیں زیتون بھی ملتے ہیں۔

مگر ابھی لوگ اس مفید درخت کی پرورش کرنے اور اس سے فائدہ

اٹھانے سے واقف نہیں ہوئے ہیں۔ مکانی گرم کے شمال میں پری غل، کا

بلند و بالا پہاڑ ہے جو جنگلات سے ڈھکا ہوا ہے۔ یہ پہاڑ ۱۵۷۹۱ فٹ اونچا

ہے اور محل بہت گہنا جس میں وحشی کبڑوں کے علاوہ خوفناک درندے

بھی پائے جاتے ہیں۔ اگر آپ اس کی کسی چوٹی پر چڑھ کر دھار دھر نظارہ

کریں تو رات کو بتوں، ٹانگ، اور میراں شاہ کی روشنیاں جھلکاتی

نظر آئیں گی۔ کافی گرم کے جنگلوں میں خرگوش عام ہے اور گھاٹیوں میں

چکورا کا راج بھی کیا جاسکتا ہے۔ چکوریہاں بہت کثرت سے ہے اور خوبصورت

شہابی آنکھوں کو یہاں کے لوگ چکور کی آنکھوں سے تشبیہ بھی دیتے ہیں۔

جیسا کہ میں نے آپ کو پہلے ہی بتا دیا تھا یہاں معدنیات کثیر ہیں۔ خام لوہا

بھی نکلتا ہے جس سے مقامی اسلو سا نہایت اچھے ہتھیار بناتے ہیں۔ موسم

سردیوں میں بڑا سخت ہوتا ہے مگر گرمیوں میں نہایت خوشگوار و گرمیوار

جنوری میں برف باری ہوتی ہے اور اس قدر زیادتی کے ساتھ کہ دیکھتے

ہی دیکھتے شجر و جھر سفید قابوؤں میں غرق ہو جاتے ہیں۔ اپریل سے ستمبر تک

ان پہاڑوں کا حسن رونق پر ہوتا ہے اور قدر نگاہ تک خوبصورت بریادوں

ہی بریادوں نظر آتا ہے۔ بھیتوں میں گلی کی شاداب فصلیں ابلہاتی نظر آتی

ہیں اور جنگلی پھولوں کی بھیجی بھیجی خوشبو مشام جاں کو تازہ کرتی ہے۔

پہاڑی لڑکیاں ندی کنارے بیٹھ کر میسی دھیمی آواز میں گلگلتی

ہیں اور ان کی بھڑپیں ہری ہری دھب چرتی پھرتی ہیں۔ نمایاں سارے سال

بہتی رہتی ہیں۔ کہیں کہیں پہاڑوں میں سرنگیں بنائی گئی ہیں اور ان کے

ذریعے بھی پانی لانے کا انتظام کیا گیا ہے۔ جس طرح زندگی میں نشیب و فراز

نہ ہوں تو وہ بے کیف ہو جاتی ہے اسی طرح کافی گرم بھی ہے۔ پہاڑی راستے

خطرناک ہیں مگر یہاں کے لوگ ایسے بے خطر چلتے ہیں جیسے لاجورد کی بالعد

پہلے جا رہے ہوں۔

کافی گرم میں ایک ہائی اسکو اور سرکاری ڈپنسری بھی ہے۔ محلو

دق کے مریضوں کے علاج کے لئے یہاں ایک صحت گاہ بھی بنانا چاہتی ہے۔

یہاں کے قابل دید مقامات میں پیردشن کا شہر بھی ہے جو ازمرغسل کے

ایک بزرگ تھے۔ دوسری مشہور زیارت گاہ میاں شکاران صاحب کی

کھی جاتی ہے۔ اب ذکر آگیا ہے تو ان کا واقعہ بھی سن لیجئے جو لطف سے

بانی ہے۔

ستارہ مشرق

(حفاظت حسین: ایک تعارف)

سید زاہد الرحیم

اور ان کی طوفانی موجیں، طلوع اور غروب ہوتے ہوئے سورج کی کرنوں اور آیت ہا دوسرے مناظر سے بے پناہ محبت ہے۔ چنانچہ اس لئے اپنے احساسات کا اظہار غنڈہ عنوان سے کیا ہے۔ مثلاً پورے گنگا میں غروب آفتاب: مجھروں کی روانگی۔ غضبناک نہایت یہ تینوں تصاویر کی رنگوں سے تیار کی گئی ہیں۔ پہلی تصویر میں سورج کے جلال و جمال کا منظر پیش کیا گیا ہے۔ پچھم شفق سے اس کی رنگین کرنیں پھوٹ پھوٹ کر پورے گنگا کی پچھل لہروں کو جلاتی ہے۔ بدھ گیت سنا رہی ہیں اور اس نسبت پر رقص کرتی ہوئی موبیہ: مانجھیوں کے قریب سے ہو کر گزرتی ہیں جن سے مانجھیوں کی اندکیر کی کشتیاں تن میں ہچکولے کھائے لگتی ہیں۔ وہ بھنبالی کے گیت گانے اس کا اظہار کرتے ہیں جن میں کوئی کویا کا رنگ بھی ہے اور مشہور شا عجمی لکھنے کے خیالات کا پرتو بھی۔ حفاظت حسین کی دوسری تصویر لکھنؤ کی رونا میں معاشرتی زندگی کی جھلک نظر آتی ہے۔ اس میں دو نوجوان مچھلیوں کے جوش و خروش کا نقشہ کھینچا گیا ہے جو پو پھٹتے ہی زندگی کی جدوجہد شروع کر دیتے ہیں اور کشتیوں میں بیٹھ کر دریائی تہ سے مچھلیاں تلاش کرنے میں مصروف ہو جاتے ہیں۔ مچھلیوں کی دستیابی پر ان کی زندگی کا انحصار ہے۔ دن بھر کی تھکن سے جب ان کی کمر ٹھٹھنے لگتی ہے تو کبھی وہ دریا کی کہلیوں کی طرف دیکھتے ہیں اور کبھی چاروں طرف پھیلے ہوئے آسان کی سمت۔ لیکر جب دریا میں دلچسپ طوفان اٹھتا تو مانجھیوں کی زندگی بھی ہچکولے کھائے لگتی ہے اور ان کی چھوٹی چھوٹی ہانسی کی کمزور کشتیاں سیلاب کی تیز موجوں میں۔ حفاظت حسین نے اسی ڈراما نے منظر کی جھلک اپنی تیسری تصویر غضبناک دریا میں دکھائی ہے۔ الغرض حفاظت حسین اپنی تصویروں میں مشرقی پاکستان کی زندگی کو وہاں کی مخصوص فضا میں حقیقت سے ہمکنار کر کے پیش کرتا ہے۔

یوں تو پاکستان میں کتنے ہی فنکار پیدا ہوئے جو اپنے فن کے ذریعہ زندگی کے ہر شعبہ پر روشنی ڈال چکے ہیں تاہم جرات سید حفاظت حسین کی تصویروں میں نظر آتی ہے وہ کسی اور کے یہاں شکل ہی سے ملے گی۔ زندگی کی کشمکش اور طوفان کے بعد عورت جیسی تصاویر اس کی فنکارانہ صلاحیتوں کا تین ثبوت ہیں۔ ان تصاویر میں تخیل اور مشاہدہ کا بڑا حسین امتزاج نظر آتا ہے۔ سب سے زیادہ قابل توجہ بات یہ ہے کہ اس کے فن میں نفاست کے ساتھ نزاکت بھی ملتی ہے اور یہ دونوں خصوصیات اس بات کی دلیل ہیں کہ وہ فن کی رفتوں تک پہنچنے کی کتنی صلاحیت رکھتا ہے۔ ہنگال کا یہ تیس سالہ نوجوان ۱۹۴۳ء میں مکمل کتاب پیدا ہوا اور وہی اکتاب فن کیا۔ اس کا ذوق و شوق اساتذہ کے زیر سایہ برابر پروان چڑھتا رہا۔ زندگی کی تنگ دوپٹوں پر اردوں کا گلاب بھرے جنوں نے فنکارانہ لہجہ پہنچایا اور حقیقت کے آئینہ میں زندگی کے نشیب و فراز کے منت نے روپ دکھائے۔ حفاظت حسین بھی نئی نئی خوابیں دیکھنا شروع کر رہے تھے ۱۹۴۴ء میں ڈھاکہ پہنچا۔ آزادی کی سحر طلوع ہوتے ہی اس کی زندگی بھی روشن ہو گئی اور وہ مشہور فنکارانہ درنگ کا گورنمنٹ ہسپتال ٹیوٹ آف آرٹس میں زمین العابدین کے زیر نگرانی اپنے خوابوں کو صفو قرطاس پر منتقل کرنے لگا۔ ماہی سال کے پہلے ہی ریاض سے اس کی زندگی میں ایک نیا چل سہ لگ گیا اور وہ ماضی کے دھندلکوں سے نکل کر حال کی روشن فضا میں پرواز کرنے لگا۔ آج ہی جوں سالی حفاظت حسین فن کی اس بلندی پر ہے جہاں فی الدینا قمر الحسن اور کبریا جیسے فنکاروں کے سلسلے آ کر ملتے ہیں۔

مشرقی پاکستان کے دوسرے مصوروں کی طرح حفاظت حسین کو کبھی فطرت سے گہرا لگاؤ نہیں۔ وہ فطرت کی بے نظیر رنگینوں کو اپنے مو قع سے صفحہ قرطاس پر زندہ جاوید بنا دینے کا بڑا لالچ رکھتا ہے۔ فطری مناظر کے علاوہ اس کو مجھروں کی زندگی اچھلنے سے تھمتے دیاؤں

میں آبی رنگ استعمال کئے گئے ہیں۔ طوفان کی ہلاکت آفرینیوں کا جو ہر بینناک
خطر اس تصویر میں پیش کیا گیا ہے اسے دیکھ کر دہائے گھڑے ہو جاتے ہیں۔
حفاظت حسین کے فن کی ایک نمائش دھاکہ میں منعقد ہوئی
اور دوسری پاکستان امریکن کالج سینٹر کراچی میں۔ مؤرخانہ ذکر نمائش میں
مغربی پاکستان سے متعلق تصاویر بھی تھیں۔ اس طرح وہ صرف مشرقی
پاکستان ہی کا نہیں بلکہ مغربی پاکستان کا بھی نمائندہ مصوٰف ہے اور
اس کے مو قلم سے وہی زندگی کنواں اس پہاڑی ہے جسے ہم چلتی پھرتی
دیکھتے ہیں۔

حفاظت حسین کی ایک بڑی خصوصیت روایت سے انحراف
ہے۔ مسلمان مصوٰفوں میں غالباً حفاظت حسین ہی پہلا فنکار ہیں جس نے
مذہبی موضوع کو مرکز توجہ بنایا اور چند ایسی تصویریں تخلیق کیں جو اس کے
ماہر فن ہونے کی تین دلیل ہیں۔ اس کی ایک تصویر خدائے حضرت مولیٰ کی
گفتگو، جرات کے علاوہ روایت سے بغاوت کی بھی نشاندہی کرتی ہے۔
اس تصویر میں روشن استعمال کیا گیا ہے، حضرت عیسیٰ کی والدہ ماجدہ
بھی اس کے فنی شعور کا بڑا اچھا نمونہ ہے۔ اس میں پنیل اور روشنائی
استعمال کی گئی ہے۔

یہ مصوٰف کے حسین تخیل، وسیع مطالعہ اور مشاہدہ کا نادر
شاہکار ہے۔ یہ کہنا بجا نہ ہوگا کہ مصوٰف نے نہایت چابکدستی سے
ان روایات کو از سر نو تازہ کیا جو ہمارے آئے دن کے واقعات سے
ہٹ کر صحائف آسمانی میں قلمبند کی گئی ہیں۔ مصوٰف کا خیال ہے جیسا کہ
اس تصویر سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ بحر تخیل میں غوطہ زن رہ کر
انواع و اقسام کے نعل و گہر تصویر کی صورت میں پیش کرتا رہے گا مگر
دنیا اس سے فائدہ اٹھانا چاہتا ہے تو اٹھائے دہرہ وہ خود تو اس سے
سکون قلب حاصل کرتا ہی رہے گا۔ حفاظت حسین حقیقت کی
روشنی میں مذہب کا روشن چہرہ دیکھنا چاہتا ہے اور یہ واضح
کرنا چاہتا ہے کہ آج کی "تیسرے ترک" کا مزہ کی دنیا میں قدیم رشتہ
ست اور بہت سست ہے۔ یہاں امت محمدی سکون کی غنیمت دیتی
ہے۔ اسی سلسلہ کی ایک اور کڑی ہے۔ یہ روشنی رنگوں کی آمیزش
تیار کی گئی ہے اور اس کا منظر بہت پروردہ ہے۔ فضا میں ہر طرف
خاموشی ہے، پتیاں زمین پر بکھری پڑی ہیں۔ درخت کی شاخیں
بالکل خشک اور قبروں کا ایک سلسلہ آستانہ ہی حد تک چلا گیا ہے۔

حفاظت حسین کو قدرتی مناظر سے بڑی محبت ہے۔ اس کی
تصاویر نشان مشرق، اور جب فطرت سکراتی ہے "فطرت سے والہانہ
شینگی کا مظہر ہیں" نشان مشرق میں روشنی رنگ استعمال کئے گئے ہیں
اور دوسرے تصویر میں آبی رنگ گہرے دوسری تصویر بنانا زیادہ مشکل
ہے۔ یہ دونوں تصویریں حفاظت حسین کی ژرف نگاہی کا زندہ جاوید
ثبوت ہیں۔ ہارٹس میں چند لمحے تو اس کا شاہکار ہے۔ برسات میں مشرقی
پاکستان ایسا نظر آتا ہے جیسے کائنات کی تمام رعنائیاں ایک ہی جگہ
سمٹ آئی ہوں۔ حدنگار تک ہریالی ہی ہریالی، رنگ برنگے پھول ہی
پھول۔ ہرے بھرے دھانوں کے کھیت، زردی نائل سرسوں کی
رعنائی، گہرائے رنگ رنگ سے بھرے ہوئے ٹرٹ ٹرٹ پتھر، آسمان سے
باتیں کرتے ہوئے نال اور تاریل قطار انداز قطار، دور دور تک
پھیلی ہوئی بھیلیں، پانی میں حسین کنول کے عکس، تالابوں میں نہانے کا
سماں۔ اور پھر ان سب کا مجموعی تاثر۔

اگر فردوس ہر دے زمین است

ہمیں است زمین است وہیلی است

حفاظت حسین نے ان تمام رعنائیوں کو اپنی ایک ہی تصویر

"ہارٹس کے چند لمحے" میں سمیٹ لیا ہے۔ اس تصویر سے مصوٰف کی
ژرف نگاہی کا اندازہ ہوتا ہے۔ اس میں رنگوں کی آمیزش بھی فنی
اعتبار سے بے عیب ہے۔

آبی اور روشنی رنگوں کے علاوہ حفاظت حسین کو پنیل اور
چار کول کے استعمال پر بھی قدرت حاصل ہے۔ اس سلسلے میں اس کی
تصاویر غسل کے بعد، آئینہ کے سامنے، سنگسار، گپ شب
کمال فکر و فن کا مظہر ہیں۔ ان تصویروں کو دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے
کہ حفاظت حسین نے گاؤں کی معصوم دوشیزاؤں اور ان کے
زہن سہن کا بڑی گہری نظروں سے مطالعہ کیا ہے۔ اس کی ایک تصویر
"عناصر کی بے توجہی کا خدواں ہی زندگی ہر ایک تازیادہ سے کم نہیں۔"

اس تصویر کا تعلق مشرقی پاکستان کے قیامت خیز طوفان سے ہے۔
اس بلائے بے وقار نے چانگام، نو اکھائی اور دوسرے ساحلی
علاقوں میں زندگی کی رت تک نہ چھوڑی۔ اس نے ہر جاندار کا ایک
ایک قطرہ ہونچ کر موت کی گرسنہ آنتوں کی بھینٹ چڑھا دیا۔
دم توڑتے ہوئے بے بس انسان گدھوں کا شکار بن رہے تھے۔ اس

اندازہ لگانا خود اس کے بس کی بات بھی نہیں۔ وہ اپنے کام میں مصروف ہے اور جیسے جیسے اس کی تصویریں سامنے آتی رہتی ہیں اس پر پائے زنی کی جاتی ہے۔ اس کے ریاض، کاوش اور فنی تحقیق و جستجو کا پہلا سلسلہ چندے اور رملتورہ دن دو نہیں جب وہ صف اول کے ماہرین فن میں شمار ہونے لگے گا۔

یہ تصویر حفاظت حسین کے شدید احساسِ کلبے ساختہ ردِ عمل معلوم ہوتی ہے۔

اب تک حفاظت حسین کے فن پر جو کچھ لکھا گیا ہے وہ حرفِ آخر نہیں کیونکہ وہ ہر لحظہ ترقی پذیر ہے۔ اس کا مشاہدہ نئی نئی چیزوں کو اپنے فنی گرفت میں لینے کے لئے سمجھتا ہے شاید اپنے تخیل کی رفعتوں کا

”جہاں میں تھا“

کشمیری چائے پہلو انوں کو بڑی مرغوب ہے۔ اہل ہمارے پہلو ان زلیوہ کشمیری ہی ہیں۔ کیونکہ یہ کھانے کو ہضم کرتی ہے مگر یہ لوگ تو اپنی جسمانی قوت سے ہی کھانا ہضم کرنے کے قابل ہیں۔ مشروبات اور چائے وغیرہ کی لاگ سے نہیں۔ کون ہے جو ان باتوں سے سبق لے۔ سب یہی کہیں گے، نئے زمانے میں آپ ہم کو یہاں باتیں سنارہے ہیں! یہاں تو دن رات چائے یا ایسی ہی اور چیزوں کا دور ہے اور اس +

رکھے۔ جن کی بدولت خوش خور کی نظر پر دیکھنا نصیب ہوا۔ یہ مایہ ناز طبقہ ہماری قومی محنت کا قابلِ قدر سرمایہ ہے۔ اگر ہم اس کے نقش قدم پر چل کر اس کی محنت و توانائی کو واقعی ساری قوم میں عام کر سکیں تو بڑا کام ہوگا۔

آخر میں جب میزبان نے ”چائے پیمانی“ پر تان توڑی تو سب پہلو انوں نے ایک زبان ہو کر معذرت چاہی، بلکہ صاف انکار کر دیا۔ چائے آج کل ہر کھانے کا متمم سمجھی جاتی ہے، بلکہ لازمہ۔ گو یہ سنا تھا انگلیں

”کافی گرم“

بہر کیف کافی گرم ایک قابلِ دید جگہ ہے اور سیاح کے لئے چڑکی یہاں بہت کچھ سنانے۔ دیکھئے اب سورج ڈوب رہا ہے اور اس کی قرمز کا کرنیں پہاڑوں کی برف پوش چوٹیوں پر پڑتی ہیں۔ ایسا دکھائی دے رہا ہے طلسمی شہزادیاں شہر سے تاج پہننے جمع ہو رہی ہیں۔ ہوا کے سارے پرندیں مدھرواگ کا رہی ہیں، ادھر دیکھئے ایک نوجوان الغونہ لبوں کو لٹکائے زیتون کے پیر سے ٹیک لئے بیٹھا ہے اور وہ اب اپنا دل پسند نغمہ چھیرے گا اور یہ وادی موسیقی کے رس سے بھر جائے گی۔ اب شام کا دُھند لگا رہا ہے، رنگین قبا پرندے بھی اپنے اپنے اشیانوں کی طرف جا رہے ہیں، پیر اور پہاڑ ایسے نظر آ رہے ہیں جیسے ان پر کسی نے جادو کر دیا ہے اور وہ دم بخود کھڑے ہیں۔ کئی ایسے ہی جگہوں پر جادو کی اس راجدھانی سے رخصت ہوں +

خالی نہیں۔ کہتے ہیں کہ یہ بزرگ شکار کے بہت شائق تھے اور اسی وجہ سے ان کا یہ نام پڑا۔ ایک دفعہ وہ شکار پر گئے تو اتفاق سے کوئی شکار ہاتھ نہ آیا اور وہ تہی دست لوٹے، ان کے فرزند بھی ہمراہ تھے، اور انہوں نے ایک جھگی بکرا شکار کر لیا تھا۔ اس واقعہ پر صاحبِ جزا دے بار بار کہتے رہے کہ: آپ تو کچھ بھی نہیں لائے۔ باہا کو اس پر جلال آگیا اور ایک نعرہ مستانہ بلند کیا جس سے ساری وادی گونج اٹھی اور لوگوں کا کہنا ہے کہ وادی میں جس قدر بکرے تھے ان کے سر تن سے کٹ کر گر گئے اور واقعہ کی محنت پر یقین کرنا نہ کرنا تو خیر اور بات ہے مگر میں خود ان کے مزار پر گیا ہوں اور وہاں یہ ضرور دیکھا ہے کہ مقبرہ کی دیواروں کے ساتھ جگہ جگہ جھگی بکروں کے ان گنت سرسبزگو سمیت پڑے ہوئے ہیں۔ کہتے ہیں کہ یہ وہی سر ہیں۔ سنائے بعض سرچھی حالت میں تھے اور اگر گریز لپٹنے ساتھ بطور یادگار لے گئے۔ اُنہ بہتر جانتا کہ اس بات میں کہاں تک صداقت ہے۔

جام اور ہے، جم اور

(حقوق انسانی)

طلب حقوق ہمیشہ اور ہر زمانہ میں رہی مگر اس سلسلے میں جب بھی تشدد یا انصافی سے کام لیا گیا یہ حقوق حاصل نہیں ہوئے۔ اس لئے صلح برود کی ہمیشہ ہی کوشش رہی کہ انسانوں کو ان کے بنیادی حقوق ملیں۔ ساری دنیا کے قابل ذکر چھوٹے بڑے ممالک مل جل کر ان حقوق کو اپنے یہاں عام کریں تاکہ لاکھوں انسان بددلی، بیزاری اور محرومی کا شکار نہ بن سکیں۔ لوگوں کو جیسے جیسے حقوق ملیں گے ان کی زندگی میں بہتر اور زیادہ خوش گوار بنیں گی۔ انہیں اپنے فرائض ادا کرنے اور مدد طلب پوری کرنے کا احساس بھی زیادہ ہوگا۔ وہ اپنے ملک کی حکومتوں اور اجتماعی نظاموں کے ساتھ زیادہ سے زیادہ تعاون بھی کریں گے۔ اسی طریقہ سے معاشری و سیاسی مقاصد کا کچھ مستجاب اور عالمگیر انصاف کا حصول ممکن ہے۔

نیک نیتی کے ساتھ مقصد بھی جلیلی ہو تو اس پر تہم قویوں کا کامل اتفاق نہ ہو تا حیرت انگیز امر ہے کیسی عجیب بات ہے کہ دنیا کے سارے ملک انسانوں کو ان کے بنیادی حقوق آسانی سے دینے کے لئے تیار نہیں۔ کیوں؟ اس سوال کے کئی پہلو ہیں جن پر تفصیلی بحث یہاں ممکن نہیں۔ اس سلسلے میں صرف اسی قدر کہا جا سکتا ہے کہ دنیا میں صرف ایسا بڑا عالمی ادارہ، اقوام متحدہ ہے جس کے منشور میں ابتدائی سے حقوق انسانی کے تحفظ و حمایت کا نکتہ شامل ہے اور وہ ہر مسئلہ دنیا کے ضمیر کو یاد دلاتا رہتا ہے کہ انسانوں کو ان کے بنیادی حقوق ملنے چاہئیں اور اس نیک مقصد کو حاصل کرنے کے لئے انفرادی و اجتماعی طور پر افراد و اقوام کو کیا کچھ کرنا ہے۔

اقوام متحدہ ہر سال تمام ممالک کے تعاون سے جن میں پاکستان بھی شامل ہے، ایک عالمی یوم حقوق انسانی مناتا ہے اس دن تمام باشندے انسانی طبقوں کو یہ یاد دلایا جاتا ہے کہ حقوق خدا کی ترقی نام، مسرت اور اطمینان کے لئے ہیں کیا کرنا چاہئے۔ جہاں یہ مقاصد حاصل

آج کل جیسے دیکھئے طرح طرح کے مطالبے کرنے اور حقوق مانگنے پر لگا ہوا ہے۔ اس حقوق طلبی میں مصلحت بینی، عقل سلیم کے تقاضے، انہی حیات کا پاس، شعور و شائستگی کا احساس کچھ بھی قابل اعتنا نہیں یہی وجہ ہے کہ اب بین حقوق تائین و انسانیت دونوں کے حدود سے گزر جاتے ہیں جس سے معاشرہ کو کوئی فائدہ پہنچتا ہے اور نہ فرد کو ضرورت اس امر کی ہے کہ ہند و شائستہ انسان سب سے پہلے حقوق و فرائض کے مسئلہ سے آگاہ ہی حاصل کرے۔ یوں تو حقوق طلبی کسی انسانی معاشرہ کے زندہ و فعال رہنے کی سب سے بڑی علامت ہے مگر حقوق ہی وقت طلب کئے جاسکتے ہیں جب کسی منظم و ہند معاشرہ کے افراد خود بھی کچھ پابندیاں، فرائض اور ذمہ داریاں اپنے اوپر عائد کر لیں۔ حقوق فرائض کے اس توازن کی بدولت نہ صرف معاشرہ کے بہت سے مسائل حل ہو سکتے ہیں بلکہ مختلف انسانی گروہوں کے باہمی تنازعات بھی پُر اس طریقہ پر طے کئے جاسکتے ہیں۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ ہم فرائض ادا کرنے یا کچھ نہ اپنا قبول کرنے کے لئے یا تو تیار ہی نہیں یا انہیں صرف زبانی طور پر قبول کر لیتے ہیں اور ان پر عمل نہیں کرتے۔ انفرادی نہیں اقوام کا بھی کچھ ایسا ہی حال ہے۔ اسی لئے انسانوں کو اپنے انفرادی و اجتماعی حقوق کے حصول میں دشواریاں پیش آتی ہیں یا وہ ان حقوق سے بالکل ہی محسوسم رہتے ہیں۔

حقوق و فرائض کے سلسلے میں ہمیں یہ بات بھی یاد رکھنی چاہئے کہ اجتماعی حقوق کے مطالبہ کے لئے ہم پہلے صرف چند بنیادی اصولوں پر متفق ہوں اور ان ہی کے حصول کے لئے کوشش کریں ورنہ یہ تو آپ جانتے ہی ہیں کہ انفرادی خواہشات کی طرح اجتماعی مطالبوں کی بھی کوئی حد نہیں ہوتی۔ ہم بعض نکات ایسے ضرور ہوتے ہیں جن کی ہر شخص تائید کرے تاہم سب سوال یہ ہے کہ دنیا کے ہر انسان کے لئے یہ حقوق کن کن طرح حاصل کرے۔ دنیا کی تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ



مہینہ سہر !

طوفان کی آغوش میں



بانی کی تہہ میں چشم کرداب سو گئی ہے !



طوفان بھی سکون بھی

دو انتہاؤں کی سر زمین

مشرقی پاکستان

اسی کے ایک مصور کی نظر میں

سید حفاظت حسین

(۱۹۳۳ء)

جام اور ہے، حجم اور

(حقوق انسانی)

طلب حقوق ہمیشہ اور ہر ناد میں رہی مگر اس سلسلے میں جیسا بھی فتنہ دو نا انصافی سے کام لیا گیا یہ حقوق حاصل نہیں ہوئے۔ اس لئے اصلاح بر لوگوں کی ہمیشہ ہی کوشش رہی کہ انسانوں کو ان کے بنیادی حقوق ملیں اور ساری دنیا کے قابل ذکر چھوٹے بڑے ممالک مل جل کر ان حقوق کو اپنے یہاں عام کریں تاکہ لاکھوں انسان بد ملی، بیزاری اور محرومی کا شکار نہ بن سکیں۔ لوگوں کو جیسے جیسے حقوق ملیں گے ان کی زندگی بھی بہتر اور زیادہ خوشگوار بنیں گی۔ انہیں اپنے فرائض ادا کرنے اور ذمہ داریاں پوری کرنے کا احساس بھی زیادہ ہوگا۔ وہ اپنے ملک کی حکومتوں اور اجتماعی نظاموں کے ساتھ زیادہ سے زیادہ تعاون بھی کریں گے۔ اسی طریقہ سے معاشی و سیاسی مقاصد کا کچھ سدباب اور عالمگیر فلاح کا حصول ممکن ہے۔

نیک نیتی کے ساتھ مقصد بھی جلیل ہو تو اس پر تمام قوموں کا کامل اتفاق نہ ہونا حیرت انگیز امر ہے کیسی عجیب بات ہے کہ دنیا کے سارے ملک انسانوں کو ان کے بنیادی حقوق آسانی سے دینے کے لئے تیار نہیں۔ کہوں؟ اس سوال کے کئی پہلو ہیں جن پر تفصیلی بحث یہاں ممکن نہیں۔ اس سلسلے میں صرف اسی قدر کہا جاسکتا ہے کہ دنیا میں صرف ایسا بڑا عالمی ادارہ، اقوام متحدہ ہے جس کے منشور میں انسانی سے حقوق انسانی کے تحفظ و حمایت کا نکتہ شامل ہے اور وہ ہر سال دنیا کے ضمیر کو یاد دلاتا رہتا ہے کہ انسانوں کو ان کے بنیادی حقوق ملنے چاہیں اور اس نیک مقصد کو حاصل کرنے کے لئے انفرادی و اجتماعی طور پر افراد و اقوام کو کیا کچھ کرنا ہے۔

اقوام متحدہ ہر سال تمام کن ملک کے تعلق سے جن میں پاکستان بھی شامل ہے، ایک عالمی یوم حقوق انسانی مناتا ہے اس دن تمام باشعور انسانی طاقتوں کو یہ یاد دلایا جاتا ہے کہ مخلوق خدا کی ترقی و تمام، مسرت اور اطمینان کے لئے ہمیں کیا کرنا چاہئے۔ جہاں یہ مقاصد حاصل

آجکل جسے دیکھنے طرح طرح کے مطالبے کرنے اور حقوق مانگنے پر تکا ہوا ہے۔ اس حقوق طلبی میں مصلحت بینی، عقل سلیم کے تقاضے، انہی حیات کا پاس، شعور و شائستگی کا احساس کچھ بھی قابل اعتنا نہیں یہی وجہ ہے کہ طالعین حقوق آئین و انسانیت دھڑوں کے حدود سے گزر جاتے ہیں جس سے نہ معاشرہ کو کوئی فائدہ پہنچتا ہے اور نہ فرد کو ضرورت اس امر کی ہے کہ مہذب و شائستہ انسانی سب سے پہلے حقوق و فرائض کے مسئلہ سے آگاہی حاصل کرے۔ یوں تو حقوق طلبی کسی انسانی معاشرہ کے زندہ و فعال ہونے کی سب سے بڑی علامت ہے مگر حقوق انسانی کو طلب کرنے جاسکتے ہیں جب کسی منظم و مہذب معاشرہ کے افراد خود بھی کچھ پابندیاں، فرائض اور ذمہ داریاں اپنے اوپر عائد کر لیں۔ حقوق فرائض کے اس توازن کی بدولت نہ صرف معاشرہ کے بہت سے مسائل حل ہو سکتے ہیں بلکہ مختلف انسانی گروہوں کے باہمی تنازعات بھی پراسن طریقہ پر حل کئے جاسکتے ہیں۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ ہم فرائض ادا کرنے یا کچھ نہ دیا قبول کرنے کے لئے یا تو تیار ہی نہیں یا انہیں صرف زبانی طور پر قبول کر لیتے ہیں اور ان پر عمل نہیں کرتے۔ افراد ہی نہیں اقوام کا بھی کچھ ایسا ہی حال ہے۔ اسی لئے انسانوں کو اپنے انفرادی و اجتماعی حقوق کے حصول میں دشواریاں پیش آتی ہیں اور ان حقوق سے بالکل ہی محروم رہتے ہیں۔

حقوق و فرائض کے سلسلے میں ہمیں یہ بات بھی یاد کرنی چاہئے کہ اجتماعی حقوق کے مطالبہ کے لئے ہم پہلے صرف چند بنیادی اصولوں پر متفق ہوں اور ان ہی کے حصول کے لئے کوشش کریں ورنہ یہ تو آپ جانتے ہی ہیں کہ انفرادی خواہشات کی طرح اجتماعی مطالبوں کی بھی کوئی حد نہیں ہوتی۔ تاہم بعض نکات ایسے ضرور ہوتے ہیں جن کی ہر شخص تائید کرے۔ ان کے بارے میں سوال یہ ہے کہ دنیا کے ہر انسان کے لئے یہ حقوق کون اور کس طرح حاصل کرے۔ دنیا کی تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ



سینہ سپر !

طوفان کی آغوش میں



پانی کی تہہ میں چشم کرداب سوکئی ہے !

طوفان بھی سکون بھی

دو انتہاؤں کی سر زمین

مشرقی پاکستان

اس بھی کے ایک مصور کی نظر میں

مید حناظت حسین

(۱۹۳۳ء)



کھانے سے پہلے؟ کھانے کے بعد؟



دبیز قمیص
بھولو

بارہی قمیص
اسلم

کالی قمیص
گوٹا

بھولو: لقمہ بقدر جنہ!

صف اول: لوکا، رستم خند امام بخش، میان کرم الہی (میزبان
بھولو - اسلم -
بجھلی صف میں: لفٹیننٹ کرنل خواجہ عبدالرشید
(میزبان کے عقب میں)

فصافہ نہیں یاد لوگ

پاکستان کے مابہ ناز بلند بالا پھلوان
جنہوں نے ہر معرکہ میں کامیاب رہ کر
پاکستان کا نام دولا کیا ہے
اور جن کے ساتھ کھانا کھانا باعث
فخر و مسرت ہے ایک یادگار واقعہ



کالو و الشربوا! اے کشمیری بھئی عوتے!

حقوق اور آزادیوں کا حصول و تحفظ اسی وقت ممکن ہے جب معاشرہ اپنے آئین و قانون کا معقول طریقہ پر احترام کرے۔

حقوق انسانی کے متعلق اقوام متحدہ کے اس اعلان کو اگر دنیا کا "منشور اعظم" کہا جائے تو بیجا نہ ہو گا کیونکہ اس میں صرف سیاسی و شخصی حقوق ہی نہیں بلکہ اقتصادی، سماجی اور ثقافتی حقوق بھی شامل ہیں کیونکہ افراد کے تین آزادیوں کے بغیر سیاسی و انفرادی آزادی کے کوئی معنی ہی نہیں پچھلے پندرہ سال میں ان حقوق کی حفاظت اور ترویج کے لئے بہت کچھ کام کیا گیا ہے اور اس ضمن میں اقوام متحدہ کی مساعی کی سب سے بڑی کامیابی تو یہی ہے کہ انسانوں کے ذہن و ضمیر اس سے متاثر ہوئے ہیں اور دنیا کے ہر ملک کے مرد و زن اب اس منشور کی روح کو سمجھتے جا رہے ہیں۔

کنہ معاشرہ انسانی کی بنیاد ہے۔ اس لئے خاندان کے مسائل و تعلقات اور حقوق و فرائض کو ہی ہمیں منب سے پہلے دیکھنا چاہئے۔ اقوام متحدہ نے یہ اصول ہی تسلیم کیا کہ اس کی حفاظت بہت ہی ضروری معاشری نکتہ ہے۔ اس حفاظت کا فرض معاشرہ اور حکومت دونوں پر عائد ہوتا ہے۔ چنانچہ طے کیا گیا کہ شادی، اس کے دوران اور طویل سب حالتوں میں جملہ متعلقہ افراد کو مساوی حقوق حاصل ہونے چاہئیں نیز یہ کہ میاں بیوی کی ذمہ داریاں بھی یکساں ہونی چاہئیں تاکہ کام، زندگی، قومیت اور انسانی معاشرہ میں ان کے بے شمار تعلقات و روابط کے پیش نظر ان مساوی حقوق و فرائض کا تحفظ ہو سکے۔

دنیا میں انسانوں کے دکھوں کی کہانی یوں تو بڑی طویل ہے مگر بعض چیزیں ایسی ہیں کہ ان کے تدارک و تحفظ کے لئے ضمیر انسانی بیدار ہوتا جا رہا ہے۔ حریت نفس، آزادی فرد اور قوام انسانی کو طبع طرح کے حملوں سے بچانا انسانی معاشرہ کی سب سے بڑی ضرورت بھی ہے اور خدمت بھی۔ مثلاً ابھی تک دنیا کے بعض حصوں میں غلامی کا مسئلہ بہ طور موجود ہے، عورتوں اور جوانوں اور بچوں سے ناجائز فائدے اٹھانے کی لعنت الگ ہے۔ مردوروں کے سیاسی و اقتصادی حقوق چرچ کرنے کی جگہ بھی موجود ہے۔ اس سے قطع نظر اہل نسل، تعلیمی اور دیگر بنیادوں پر امتیازی سلوک رفاہ کنسی طرح جائز نہیں سمجھا جاتا۔ اقوام متحدہ نے ان تمام مفاسد کی روک تھام کے لئے بہت اہم خدمات انجام دی ہیں۔ ہر ملک ان معاشری و سیاسی ضرورتوں کو ختم کرنے

نہیں سمجھتے ہیں یا جزوً حاصل ہوئے ہیں وہاں ہماری کاوش و مساعی کا کیا انداز رہنا چاہئے۔

اقوام متحدہ نے شروع ہی میں حقوق انسانی کو اپنے منشور کا ایک جزو بنالیا تھا اور اس ادارہ کی جنرل اسمبلی نے ۱۰ دسمبر ۴۴ء کو اسے ایک قرارداد کی شکل میں منظور بھی کر لیا تھا۔ عالمی تاریخ میں انسان کے لئے سب سے بڑا جینے ہی حقوق انسانی کا مسئلہ رہا ہے۔ اس کی اہمیت کا اندازہ یوں لگایا جاسکتا ہے کہ جنرل اسمبلی نے یہ قرارداد منظور تو کر لی مگر چند ہی ملک اس بات پر آمادہ ہوئے کہ قرارداد میں شامل انسانی حقوق دینے کے سلسلے میں کوئی آئینی پابندی قبول کریں۔ اس میں سب سے بڑی رکاوٹ سیاسی و اقتصادی حقوق کا معاملہ تھا جس کی وجہ سے لیکن مالک پس و پیش کر رہے تھے۔ ہر ملک کے مسائل و مشکلات کی نوعیت جدا گانہ تھی۔ ان دشواریوں کو مدد کرنے کے لئے جنرل اسمبلی نے حقوق انسانی کے دو حصے کر دیئے۔ ایک حصہ کا تعلق شہری و سیاسی حقوق سے تھا اور دوسرے میں اقتصادی، سماجی اور ثقافتی حقوق شامل تھے۔ پھر یہ طے کیا گیا کہ انہیں کس طرح بروئے کار لایا جائے۔ جنرل اسمبلی میں ان حقوق کو تسلیم کرنے کے لئے بین الاقوامی مواقع کی طرح ڈالی گئی تاکہ سب ملک ان مقاصد کے حصول کے لئے اپنے ہاں کام کریں۔ مگر جنرل اسمبلی میں جب اس سلسلے میں تقریریں ہوئیں تو یہ معلوم ہوا کہ مختلف ممالک کو انہیں تسلیم کرنے یا ان پر عمل پیرا ہونے میں کیوں تامل ہے۔ انہیں عملی جامہ پہنانے میں کیا دقیقیں لاحق ہیں۔

حقوق انسانی سے متعلق چار اہم نکات تھے، خوف سے آزادی، احتیاج سے نجات، عبادت اور مذہب پر خیال کی آزادی۔ جب اقوام متحدہ نے ان باتوں اور دیگر متعلقہ اجزاء کو اپنے منشور میں شامل کیا تو سب سے پہلے اس بنیادی اصول کو تسلیم کیا گیا کہ "ہر انسان آزاد پیدا ہوتا ہے۔ وقار و حقوق کے باب میں سب یکساں ہیں۔ وہ شعور و ضمیر کے اوصاف سے بھی متصف ہیں۔ اس لئے انہیں ایک دوسرے سے برادری و اتحاد کے ساتھ سلوک کرنا چاہئے"۔ اقوام متحدہ نے یہی اعلان کیا کہ ان آزادیوں اور حقوق کا اطلاق نسل، مذہب، جنس یا مذہب کے اختلاف کے باوجود ہر فرد پر ہو گا خواہ وہ کسی آزاد یا خود مختار علاقہ میں یا کسی ایسے حصہ میں رہتے ہوں جیسے حق خود اختیاری حاصل نہیں۔ ساتھ ہی یہ نہایت اہم شرط بھی لگا دی گئی کہ ان

کے درپے ہے، گو جس قدر کامیابی حاصل ہونی چاہئے تھی اتنی نہیں ہوئی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دنیا سے غلامی کا کلیتہً خاتمہ نہیں ہوا۔ احتیاج اور انفرادی آزادی سے محرومی کا مسئلہ بھی معقول طریقہ پر حل نہیں ہو سکا ہے۔ مگر ایسا سب جگہ نہیں ہے، حالات سدھرتے جا رہے ہیں اور ضمیر انسان بیدار ہو کر مطالبہ کر رہا ہے کہ ان دعووں کو انسانیت کی پیشانی سے دور کیا جائے۔ اب جہاں کہیں بھی یہ برائیاں زور پکڑتی ہیں، ساری دنیا میں پھیل چکی ہیں اور ہر جگہ نہایت شدید احتجاج و ردِ عمل ہوتا ہے۔ اتنا کام بھی انسانی حقوق کے لئے بڑا کام ہے اور اس سے امید بندھتی ہے کہ آخر کار انسانیت ان برائیوں کو یکسر ختم کرنے میں ضرور کامیاب ہو جائے گی۔

اب ہمیں یہ دیکھنا چاہئے کہ ہمارے ملک میں حقوق انسانی کا مسئلہ کس منزل پر ہے، اور اس کا ہماری قومی زندگی میں کیا مقام ہے؟ ایک اسلامی مملکت ہونے کی حیثیت سے حقوق انسانی کی طرفداری اور حمایت ہمارا انسانی فرض ہے۔ انسانوں کو یہ حقوق دینے کے لئے اسلام نے ہی سب سے پہلے آواز اٹھائی اور عملاً ان حقوق کو معاشرہ میں تسلیم کرنا چاہیہ۔ جنسور صلعم کے آخری خطبہ کے الفاظ و معانی پر غور کیجئے۔ ان کو اگر حقوق انسانی کا اولین منشور اعظم کہا جائے تو بالکل بجا ہے۔ ہمارا فلسفہ دین و حیات ان حقوق کو نہ صرف تسلیم کرتا ہے بلکہ اسے لوگوں کو تفویض بھی کرتا ہے۔ معاشری مفاسد پیدا ہو جانے کے باعث اگر ان پر کہیں کہیں پوری طرح عمل نہ ہو رہا ہو تو وہ دوسری بات ہے مگر جہاں تک ان حقوق کو بطور عقیدہ تسلیم کرنے کا تعلق ہے ایک اسلامی مملکت ہونے کی حیثیت سے ہمارا موقف بالکل واضح ہے۔ سب سے بڑی بات تو یہ ہے کہ ہمارے ہاں ذات پات کے بندھن نہیں ہیں جو انسانوں کے درمیان امتیاز پیدا کرنے والی سب سے بڑی لعنت ہے۔ ہمارے ہاں معاشری انصاف، عورتوں مردوں کے مساوی حقوق، تعلیم، ورثہ، عفو و رحم، خیرات و زکوٰۃ کے ادارے صدیوں سے موجود ہیں۔ ہم حقوق انسانی کے احترام کی روح سے بخوبی آشنا ہیں اور ان کا دائرہ عمل بھی بہت وسیع ہے، کیونکہ اسلام نے ہماری نسبت کے جو اصول عطا فرمائے ہیں ان میں ہر جگہ ان حقوق و فرائض پر ہی زور دیا گیا ہے۔ ان اسباب کی بنا پر ہماری حکومت، عوام اور اہل الرائے بلکہ حقوق انسانی کی وکالت و حفاظت کا دل سے خیر مقدم کرتا ہے۔

صحت، ترقی اور تعلیم و مساوات کے لئے ہمارے ہاں بڑا کام ہو رہا ہے اور ایک نوزائیدہ مملکت ہونے کے باوجود اس معاملہ میں ہمارا کامیابی کی رفتار تیز ہے۔ مثلاً تعلیم کا معیار ۵۳ یا ۴۲ فیصد سے بڑھ کر فیصد تک پہنچ چکا ہے۔ ہمارے ترقیاتی منصوبوں نے اس پر خاص توجہ دی ہے۔ اور دورِ انقلاب میں ایک تعلیمی کمیشن کا تعین بھی اسی نیت سے کیا گیا تھا اور اس کی سفارشات پر پوری تندی سے عمل ہو رہا ہے۔ صحت عامہ کا بیڑا بچلنے اور بیمار لوگوں کے سد باب کے لئے بھی کوشش کی جا رہی ہے۔ نئے اسپتالوں اور مراکز صحت کا قیام، گاؤں گاؤں خیراتی شفا خانوں، گشتی طبی امداد و دیگر طبی سہولتوں کا فروغ اس سہولت کا خاص کارنامہ ہے۔ طبی امداد کی مساعی جاری ہیں جس کی وجہ سے مشرقی پاکستان کے باشندوں کو اس موذی بیماری سے کلیتہً نہیں تو بڑی حد تک نجات مل چکی ہے۔ ملک کے کچھ حصوں میں وق اور جذام جیسے منحوس امراض کے استیصال اور علاج کے لئے کافی بڑی رقم بھی لگی ہے اور عوام کو اس سے جو فائدہ پہنچ رہا ہے وہ انکسب دلیل کا محتاج نہیں۔ یہ سب کام انسانی حقوق کی پذیرائی کے لئے ہی ہو رہے ہیں اور عوام و خواص کا باہمی تعاون جیسے جیسے بڑھتا جائے گا ہم اس ضمن میں کامیابی کے مزید مراحل بھی طے کرتے جائیں گے۔ اصل میں ضرورت اس امر کی ہے کہ ہم ہر معاملہ میں حکومت کی طرف نہ دیکھیں بلکہ خود بھی منظم ہو کچھ کام کریں۔ حکومت تو مدد و تعاون کر رہی ہے لیکن معاشرہ کے اہل عمل لوگوں کا بھی یہ فرض ہے کہ جگہ جگہ سماجی کارکنوں کی مدد کریں۔ یہ فرض سماجی کارکنوں کا ہے کہ وہ مقامی حالات کا جائزہ لے کر وسائل کا اذعان کر کے کام شروع کریں اور ہر جگہ محلہ میں، گاؤں میں، بستی میں تعلیم، صحت، امن و امان اور معاشری بہبود کے دوسرے کاموں کی داغ بیل ڈالیں۔ اس طرح جو فرائض اداروں، سرکاری امداد اور توجہ سے انجام پا رہے ہیں، اس میں ہاتھ بٹائیں۔ صرف اسی طریقہ سے ہم اسلام کے دئے ہوئے سبق پر عملاً کار بند ہو سکتے ہیں۔ ہمارے ہاں سماجی حقوق دینے پر کوئی نظریاتی قدغن نہیں ہے۔ لہذا انسانی حقوق کو کام کرنے میں ہمارے معاشرہ کو خاص طور پر زیادہ عمل کرنا چاہئے کیونکہ ہمارے ہاں جیسے سازگار حالات ہیں وہ کم جگہوں پر پائے جاتے ہیں۔ ہمیں کوشش کرنی چاہئے کہ اقوام متحدہ کے منشور کی حمایت میں ہمارا ملک بھی کسی سے پیچ نہ رہے کیونکہ یہ ہماری ملکی بہبود اور ہمارے عوام تک ان حقوق کے فوائد

خدمت کی بڑی ضرورت ہے اور اس خدمت ہی میں انسان کو کتنی
پورے کو حیثیت ہے ہماری عظمت ہے۔

★

دور دور تک پہنچانے کا سوال ہے، اس لئے ہم اپنے معاشرہ میں ان
صدق کو پامال نہ ہونے دیں اور جہاں ان کے حصول و تحفظ میں دقتیں
مائل ہوں ان کو مل جل کر دور کریں کیونکہ تعمیر انسانیت کے لئے اس

”افقی“ باب ”بقیہ صفحہ ۱۷

کرائے میں کامیاب ہو گئی۔ صاحبزادہ صاحب نے وزارت سے استعفی
دے دیا۔ اور دل شکستہ ہو کر گھر بیٹھ رہے۔ مگر اسلامیہ کالج کی وہ لب
بھی خدمت کرتے رہے۔ اور خدمت وقت ہی کے دوران ۴ دسمبر ۱۹۶۳ء
کو ان کا انتقال ہوا۔

صاحبزادہ عبدالقیوم خان کچ ہمارے درمیان نہیں لیکن
ان کی یاد اب بھی اسلامیہ کالج پشاور کی صورت میں تازہ متاثر ہے۔
جس نے حال ہی میں اپنی زندگی کے پچاس سال پورے کئے ہیں۔
ان کے تعلیمی مشن اور ملت کے وسیع تر مفاد کے لئے ان کی مساعی باآزاد
ہو رہی ہیں۔ اب کئی مقامات پر کالج کھل رہے ہیں مثلاً صوابی ہی
میں ایک کالج قائم کیا گیا ہے۔ ان کا یونیورسٹی بنانے کا خواب بھی
اب پورا ہو چکا ہے۔ اور امید ہے کہ ملک و ملت کے اس نامور
فرزند سرحد کی خدمات جلیلہ ہمیشہ یاد رہیں گی اور موجودہ نسل ان
کی مساعی کو اور آگے بڑھائے گی۔ جو ان کا مسلح نظر تھا۔

ہوئیں اور صوبہ سرحد کو ایک یونیٹ گورنر کی تحویل میں دے دیا گیا۔
۲۸ اپریل کو ہی صاحبزادہ عبدالقیوم خان وزیر برائے محکمات
منتقل مقرر کئے گئے اور سرحد میں ایک نئے دور کا آغاز ہوا۔ وزارت
منظومی کے پہلے پانچ سال میں نواب صاحب ہی نے پشاور میں ایک ریڈیو
اسٹیشن بھی قائم کیا۔ ملاکنڈ کی برقی قوت کا منصوبہ شروع کر دیا۔
اور قانون انتقال اراضی بھی منظور کر دیا۔ اس کی رو سے مسلمانوں کی
فیہ نقد جائداد غیر مسلموں کے ہاتھ میں جانے سے محفوظ ہو گئی۔ اسلامیہ
کالج پشاور کی رفتار ترقی بھی تیز ہو چکی تھی۔ کیونکہ تعلیم کا محکمہ خود
ان کے پاس تھا۔

انہوں نے زندگی میں اپنی کوئی سیاسی جماعت قائم نہیں کی۔
وہ سیاست میں غیر جانبداری کے قائل رہے۔ اس کے بعد کانگریس
کی ریشہ و اینوں کا جھڑپا اور اس علاقے میں طرح طرح کے سیاسی
گٹھ کھلے۔ کانگریس پارٹی ان کے خلاف عوام اعتماد کی تحریک منظور

مسلم شعرائے بنگال

پچھلے چھ سو سال میں مسلمانوں نے بنگلہ شعر و ادب میں بیش بہا اضافے کئے ہیں۔ یہ ان کا ایک مختصر، مگر سیر حاصل
انتخاب ہے جو عہد قدیم سے معاصر شعرائے بنگال پر مشتمل ہے۔

یہ ترجمے حسن احمد لکھ اور جناب یونس احمد نے

برائے رامت بنگالی سے اردو میں کئے ہیں۔

صفحات ۲۵۰۔ کتاب مجلد ہے۔

پارچہ کی نفیس جلد۔ طائفی لوح سے مزین۔

قیمت صرف چار روپے ۵۰ پیسہ۔

یہی کتاب سادہ جلد میں چار روپے۔

ادارہ مطبوعات پاکستان۔ پوسٹ بکس نمبر ۱۸۳۔ کراچی

چناب سے پدما تک (عوامی کہانیاں)

ہمارا ملک اس لحاظ سے کافی ممتاز و منفرد ہے کہ اس کا دامن طرح طرح کی اچھوتی، دلچسپ، عوامی کہانیوں کے گہلے رنگ لنگ سے لبریز ہے۔ مغربی پاکستان کی دنیا دل آویزیوں کا ایک بوقلموں مرتع ہے تو مشرقی پاکستان کی بھی ایک انہی ہی دنیا ہے انہی ہی فضلے، نفس پری بھری، سحرور کن۔ مگر فرزندِ ان کوہِ دامن اور دیگ و جلاہوں یا نرم کوئلہ و دب میں جھلکتی چھلکتی کہنہ نالی ندیوں اور اٹھتی گھاٹوں کے دیس والے ہوں، ان سب کے ذہنوں، تجزیوں اور احساس نے جن جن کہانیوں کو نسبتاً طور پر جنم دیا ہے وہ ایک ہی چیز کی غماز اور عکاس ہیں۔ عوام کے اپنے دل کی دھڑکنیں، ان کی حیات کی جھلکیاں اور سادہ و رنگین جذبات و احساسات کی بے لوث تصویریں۔ ہر کہانی پر تحلیل کی کار فرمائی ہے، یا بیان واقعہ کی تفسیر جمیل۔ مشرقی پاکستان میں مغربی پاکستان، ان کی رو میں ایک ہی ہیں۔ اس لئے ان عوامی کہانیوں کا مطالعہ ہمیں ایک دوسرے کے قریب کر لے اور باہمی تعارف و یکجہت کا احساس بیدار کرنے میں مدد دیتا ہے

چند جھلکیاں

تعارف، درفتی خادرا، ابتدا میں ایک بسیط مقدمہ جس میں عوامی کہانیوں کے مخصوص تیوروں پر مرتبے ایک بھر پور روشنی ڈالی ہے۔
ایک کے اس پار، موٹی خاں گل کٹی، آدم خاں درخانہ، محبوبہ جلات، یوسف کرٹھدار، شہی تور وٹی، زرساگ، بہرام دگل انعام۔
پنج ند، ہیر رانجھا، ہیر سیال، مرزا صاحبان، سوہنی جہنوال، یوسف زلیخا، میندھل مول۔ سسی
داوٹی جہان، سسی پنوں، سرستی مول راتو، عمراروی، سراروٹی، لیلا چنسر، نوری جام تاجی۔
دادئی بولان، لیلا موہر کشمیر، گلزار شہر حاج
مشرقی پاکستان: ہوا، گوتائی بی بی، دیوانی مدینہ، کاجل ریکھا، آئینہ بی بی، کنول کنڈ۔
اس مجموعہ کا ایک اہم دلچسپ پہلو یہ ہے کہ ہر کہانی کے ساتھ اس کی ایک مختصر منظوم جھلک بھی پیش کی گئی ہے۔
قیمت صرف دو روپے

ادارہ مطبوعات پاکستان۔ پوسٹ بکس ۸۳۳ کراچی



کارٹون : ریچان

اپنا نہیں وہ شیوہ...

مصباح الحق

کے متعلق سدا سے فیصلہ یہ ہے کہ :
بہشت آنجا کہ آزارے نیا شد
کسے را نہا کسے کارے نیا شد

اور یہاں کسے را با کسے 'کارے' پر زور نہیں بلکہ صرف "کارے" پر زور ہے کیونکہ مشہور ہے بلکہ یہاں تک سنا ہے کہ بہشت میں رہنے والے حاشا و کلا کوئی کام نہیں کریں گے۔ بیٹھے بیٹھے سب کام خود بخود ہو جائیں گے۔ سبحان اللہ ! لیٹے ہی لیٹے خوشہ انگور آپ ہی آپ منہ میں ! اور جنت کے تمام رسیلے رسیلے سیرے اور نعمتوں پر نعمتیں کام و ہان کی خاطر تواضع کے لئے آمادہ ۔ نہ ہاتھ ہلاؤ نہ پیر، بلکہ منہ بھی چلانے کی ضرورت نہیں، کیا بات ہے ! کتنا نکما شخص تھا، کیا کہتے ہیں اے ؟

— کارلائل - سخت گاؤدی - خوجی سے بھی کہیں بڑے چڑھ کر - رات دن "کام کام کام" کی رٹ - جیسے کام اس کی اماں جان نے گھٹی میں ڈال رکھا تھا - آخر تھا کہاں کا ؟ یورپ کا - جس کا باوا آدم ہی نرالا ہے - جو الھتا ہے اونڈھی کھوپڑی لئے - الٹی گنکا بھانے پر تلا ہوا - اور یہ کارلائل بھی تو اسی تھیلی کا چٹہ بٹہ تھا - کوئی شاعر ہوتا تو بٹہ کے ساتھ وہ قافیہ ملاتا کہ عمر بھر یاد رکھتا - وہ نہ سہی اس کے جانشین ابد الابد تک یاد رکھتے - کہاں مغرب کہاں مشرق - ٹھیک ہے مغرب والے کام کریں - مشرق والے عیش سنائیں - اور ہم دیسوں کے دیس، دیار پاک، کے رہنے والے - بھئی اللہ میاں ہمارا حاجت روا - ہمیں کام کرنے کی ایسی ہلکت ہی کیا پڑی ہے ؟ اپنی

کہ آرام سے بیٹھیں - واہ صاحب واہ ! آپ بھی خوب سمجھے - سخن فہمشی عالم بالا معلوم شد - مصباح صاحب ! واللہ ہم تو آپ کو بہت سنانے بیانے سمجھتے تھے - مگر آپ تو، معاف کیجئے، بڑے "وہ" نکلیے - ورنہ فوراً کہتے : اپنا ہے یہی شیوہ کہ آرام سے بیٹھیں - اور بیٹھے ہی رہیں، بیٹھے ہی رہیں - نہ ہلیں نہ جلیں - زمیں جنید نہ جنید گل محمد - کام کرنا، ہاتھ پاؤں ہلانا بھلا کہاں کی دانائی ہے - وہ جو تھے نالسان العصر، آہا ہا ہا ! سبحان اللہ ! کیا کہہ گئے ہیں - قربان جائیے : موت سے ڈرنا بشر کا اک خیال خام ہے

اصل فطرت میں فقط آرام ہی آرام ہے
ذرا غور کیجئے - کیا آج تک کسی نے کام کی خواہش ظاہر کی ہے ؟ جسے دیکھو آرام ہی آرام چاہتا ہے - کام ؟ واہ صاحب ہوش کے ناخن لیجئے - یہ کس حکیم نے مشورہ دیا ہے کہ کام کیجئے - وہ حکیم نہیں ہوگا کوئی اور ہوگا جس نے کوئی ایسی بات کہی ہو - "غالب" کو بھی تو بعض لوگوں نے "حکیم فرزانہ" کہا ہے - اور اس حکیم فرزانہ نے ساری عمر میں ایک ہی کام کی بات کہی : عشق نے غالب نکما کر دیا - ورنہ ہم بھی آدمی تھے کام کے ہائے ہائے ہائے ! کیا لفظ گھڑے گھڑنے والوں نے - سو جان سے قربان جائیے - حق یہ ہے کہ کام نہ اینجانب کے نکڑ دادا کے نکڑ دادا کے نکڑ دادا نے کیا اور نہ اس سے بھی آگے خانوادہ سلسلے کی آخری کڑی باوا آدم نے کیا - کیونکہ وہ ٹھہرے بہشت کے باسی - اور بہشت

میں آئے گی۔ فی الحال اتنا ہی کہہ دینا کافی ہے کہ جیسے پریزگار لوگ صبح سویرے نماز با جماعت ادا کرتے ہیں، اسی طرح ہم کام چور اکٹھے ہو کر سوئے آسمان دیکھتے رہتے ہیں۔

اب چاہے اس کے جو بھی معنی لے لیجئے۔ یہ کہ:

تھیں بنات النعش گردوں شب کو نظروں پر عیاں

دن کو ان کے جی میں کیا آئی کہ پنہاں ہو گئیں؟

یا پھر یہ کہ اللہ جل شان، کی شان کریمی کے طفیل آسمان

سے سن و ملوٹ اتر آئے۔ اور، اور کچھ نہیں تو Penguin

بنتے ہی کی مشق کی جائے۔ رات بھر سوئے کا مزا، اور دن

بھر پینے کا۔ لگے دم پر دم! مطلب یہ کہ ایک بڑا

سا سماوار، ویسا ہی جیسا ہمارے دوست، ابراہیم جلیس

کے گھر سے کوئی منچلا چور چرا کر لے گیا تھا اور انہیں

اس کا بڑا دلدوز مرئیہ لکھنا پڑا۔ اس سماوار میں من بھر

نہیں تو آدھا من پانی تو ضرور آیا ہوگا۔ اسے اہالا اور

پھر اس میں سلہٹ کی ہری پتی کو گھلا یا۔ یا

اصفہانی کو جوشایا۔ بن گیا سنہرا پانی۔ پھر کیا۔ یہ کہ

گو ہاتھ میں جنبش نہیں آنکھوں میں تو دم ہے

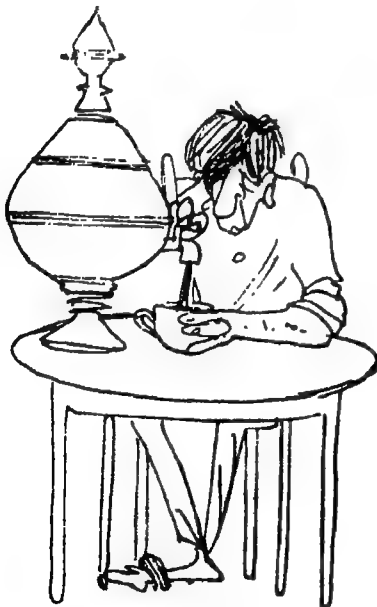
رہنے دو ابھی ساغر و مینا مرے آگے

یہ ہے تو ساری دنیا آگے۔ ساقی نہ ہو تو کیا۔ ٹوٹی کے

نیچے رکھی پیالی اور اسے دم بھر میں خالی کر کے وہی قصہ

بلا سے بیٹھ رہے گر فقیر ہو۔ ہمارا پس چلے تو کام کا لفظ ہی لغت سے نکال دیں۔ 'کام بہت ہے' 'کام بہت ہے'۔ وہ ہمارے "حکیم فرزانه" بولے خاک کام ہے۔ ہم لوگ تو جنم جنم کے شاعر ہیں۔ اور شاعر تو ویسے ہی کام کے دہنی ہیں جیسے آج کل کی ہیکمات۔ زبان پہ بار خدایا یہ کس کا نام آیا! اگر کوئی ہیکمات سنتی ہوں تو بخش دیں، غصہ تھوک ڈالیں!

کسی نے کہا نہا دن کام کے لئے، رات آرام کے لئے۔ مگر ہماری بات اور ہے۔ نہ دن کام کے لئے نہ رات بلکہ دونوں آرام ہی آرام کے لئے! مانا ہم عاشق نہیں۔ مگر عاشقوں سے کم کیا ہیں۔ رات بھر زیر بام آسمان، صحن میں بڑی شان سے لیٹے ہوئے، پاؤں کسی پستینی نواب کی طرح ہمارے "گن گن تارے" گنگنا بھی رہے ہیں اور تارے بھی گنتے جارہے ہیں کہ دل کے بجائے وقت کو خوں کرنے کی کوئی تو صورت ہو۔ اور دن؟ اس میں ہم کسی سے کب پیچھے رہنے والے ہیں۔ آپ ہی کہنے کوئی ڈیڑھ دو انچ موٹا لعاف تان کر سو جائیے تو سورج کی کبا مجال جو کبھی طلوع ہو۔ مارے شرم کے طلوع ہونے ہی ڈوب جائے گا۔ اور بھئی، جاگ بھی اٹھیں گے تو کیا تیر مار لیں گے۔ علی الصباح کہ مردم بہ کاروبار روند۔ اور ہلا کشان محبت بہ کوئے یار روند کی بات تو بعد



جب تک بس چل سکے.....!



سوئے آسمان دیکھا کئے.....!

یوں لگا جیسے وہ پنڈا گورا گورا چاند ہو اور اس سے ایک اجلی اجلی کرن برابر لڑھکتی چلی آرہی ہو۔ حضرت انشاء اللہ خاں آفشاؒ تصور عرش پر ہے اور سرے پائے ساقی پر،، کیا کہہ گئے ہیں۔ کہاں ہمارے ابن آفشاؒ جو چاند نگر ہی میں کھو کر رہ گئے۔

بہیں تفاوت رہ از کجاست تا بکجا !

ہم دل ہی دل میں جانتے تھے کہ بھنس گئے یعنی ان بیگم صاحبہ نے ہمیں بیگار میں دھر لیا۔ مگر مرتے کیا نہ کرتے۔ ان کی نوج کا ڈر سواں روح ! مگر وہ رہ کر اس جان رومان کو کنکھیوں سے دیکھتے جاتے اور میرا جی کی طرح کہتے چلو سراہ میرا سین کے ساتھ اتنا ہی راز و نیاز غنیمت۔ یعنی کہ ہوں تو کسی کی نگاہ میں۔

”جچا“ غالب نے یوں ہی تو نہیں کہا تھا کہ :

عشرت صحبت نوباہی ہی مناسب سمجھو

نہ ہوئی غالب اگر عمر طبعی نہ سہی

سبحان اللہ ! ”میرا سین“ کے سر پر وہ پیچاک کا پیچاک کہ اون کے پنڈے سے کسی طرح کم نہ تھا۔ اون کے پنڈے کے مقابلہ میں اون کا پنڈا ! مطلب یہ کہ جتنی دیر شاپنگ جاری رہی بڑا مرا رہا۔ لوگ یہی ”مجھتے“ ہوں گے کہ یہ ان کے تابع بیان ہیں۔ تابعدار اس لئے نہیں کہا کہ حضرت جوش ملیح آبادی اس پر معترض ہیں کہ تابع خود ہی تابع ہے، تابعدار کیا ہوا۔ ”دار“ بالکل تابع مہمل۔ خیریت گذری۔ اس دوران



ادھیڑ — بُن

اپنی تو جہاں آنکھ پڑی پھر وہیں دیکھو

آئینے کو لپکا ہے پریشان نظری کا

میاں مجنوں تم بھی لیلیٰ پر فریفتہ ہو۔ وفا نباہنا اسی کو کہتے ہیں۔ سمجھے ؟

ہاں صاحب، اب مجنوں کا ذکر آگیا تو ہمارے شاعروں کی طرح دشت کا ذکر کموں نہ آئے؟ وقت کشی کے لئے دشت نورددی سے بہتر تدبیر اور کیا ہوسکتی ہے؟ اور دشت بھی ”بوہری بازار“ کا، جہاں لیلیٰ سے لے کر ٹیڈی تک ہر جلوہ مفت نظر۔ صبح ہوئی، چائے پی کر گرم ہوئے اور چل پڑے سفر شوق پر۔ آنکھیں سری جلوہ ان کا۔ اور کبھی ان میں سے کوئی مہربان ہو جائے تو کیا کہنے !

میں جا نوں اس زمین پر آسمان سے ماہتاب آیا۔ چنانچہ ایک دن اس دشت نورددی کا صلہ مل گیا۔

ہم تھے کہ گھومتے خاں پھرتے خاں کا پورا پورا روپ۔ آنکھ جھپکی تو مجنوں کو لیلیٰ کے سوا اور کیا دکھائی دے سکتا تھا؟ — وہی مگر ذرا بزرگ۔ ترن بھرت چلتی ہوئی سلاٹیاں اور اون کا پنڈا وزنی دو سیر۔ اشارہ ہوا یہ اٹھالو۔ مدت سے سن رکھا تھا نہ :

رشتہ اندر گلو افگندہ دوست

می برد ہر جا کہ خاطر خواہ اوست

سو اس کا تجربہ بھی ہو گیا۔ یا ہم نے خود ہی خود کو اس تجربہ کے لئے یار مہربان کے حضور پیش کر دیا۔ یہ بھی سن رکھا تھا کہ — کچے دھاگے سے بندھی آئیں گی سرکار مری۔ اون کا دھاگہ کچا ہوتا ہے یا پکا، یہ تو نہیں کہہ سکتے مگر ہم اس سے بندھ ضرور گئے۔ ہمارا کیا ہم تو بغیر دھاگے کے بھی بندھے چلے آتے ہیں۔ کچھ یہ بھی ڈر کہ بے چون و چرا ساتھ نہ ہولئے تو بیگم صاحبہ کہیں تاؤ میں آکر سلاٹیاں ہی نہ آنکھوں میں بھونک دیں۔ ان کا کیا جائے گا۔ اندھے کانے ہوں گے تو ہم۔ کسی کی جان گئی آپ کی ادا ٹھہری ! اس لئے ”بس میڈم“، کہہ کر پنڈا اٹھا لیا اور بڑے طمطراق سے ساتھ ساتھ چلتے لگے۔ جیسے ہم ان ہی کے ساتھ ہوں۔ اور چلتے گئے، چلتے ہی گئے۔ جیسے کسی فرنگی شاعر کا وہ ہیرو جو اپنی محبوبہ کے ساتھ برابر گھوڑا سواری کئے جاتا رہا تھا۔ بیگم صاحبہ کی بھی تو یہی ”ہابی“ ٹھہری۔ دکان دکان پر شاپنگ، چاہے خریدیں کچھ بھی نہیں۔ یہ رہی لیلیٰ کی دشت نورددی۔ کوئی کسی سے کم نہیں۔ ہاں تو صاحب لیلیٰ کے حسن سیاہ کی آب و تاب سے

کوئی بہت ہی ہمارے جیسا با ذوق ہے جس نے کہا ہے کہ :

دیکھ ہاتھ ہیں جو ٹانگے پر حسیں
گھر پہ پہنچانا ہمارا کام ہے

واہ واہ کیا کام ہے ! کام سا کام ! یہ بھی ایک مشغلہ
دلچسپ ہے بیکاروں کا - اور یقین جانتے، یہ محض غیب
نہیں، ٹانگا تو کیا وہ تو آلو رکشاؤں کے پیچھے بھی رہیں
لگانے سے کبھی نہ چوکیں اور جوں توں کر کے کام شوق
حاصل کر کے ہی رہیں -

کیا عورتیں کیا مرد، وقت کا کیا پانچا کرنے میں سب
ایک جیسے - لو صاحب، گھر والیاں تو کچھ کرنے سے
رہیں - وہ تو گریباں چاک کرنا جانتی ہیں، سینا کیا
جائیں - اس لئے مرمت ہو یا رفوگری، یا پھر ہمارے کا
سارا کوٹ پتلون سینا، سب آپ ہی کرنا پڑتا ہے -
یعنی مردوں کو - اور سچ ہو چھٹے تو ویسے بھی عورتیں
کب سینی پڑتی ہیں - یہ دھندا بھی تو مرد ہی کرتے
ہیں - اور ہم بیگمات کے ہتھکنڈوں سے ایسے لاچار
ہو گئے ہیں کہ سربازار بیٹھ کر مرمت، پیوند، سب کچھ
آپ ہی کرتے ہیں - خود بقیہ و خود بقیہ گر و خود....



لاچار ہم ہوئے !

ارے صاحب ٹھہرنے تو.... سٹنے تو.... ؟.... خدا کے
لئے صرف ایک بات اور.... چس بول گئے نا؟ ہا ہا ہا....
ہمارے رے رے گا گا ما ما دھا دھا دھانی....
ہپ ہپ ہرا !!

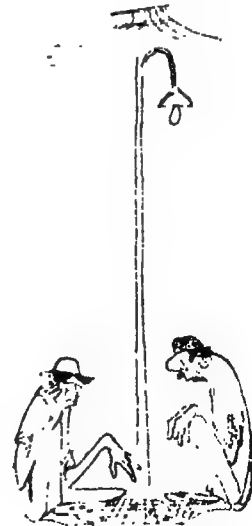
ہیں کہیں اپنی بیگم صاحبہ ہی نہیں مل گئیں - ورنہ جان
نے لالے بڑ جاتے - یقین جانتے رات کو جب ہم کسی کی
د میں ”کن کن تارے“ کا ورد کرتے ہیں تو خواب
میں بھی رہ رہ کر کسی کافر ادا کے سینے ہی دیکھتے
ہیں - ہائے ہائے !

کیا چاند سی صورتیں بنائیں

قربان اے نیلی چھتری والے !

شعر ! اے کاش ! عبدالعزیز خالد ہمارا سارا دیوان
لیں اور اپنا یہ شعر دیدیں - بہر حال، یہ سفر خوب
مٹا - اور جب تک یہ مشغلہ شوق جاری رہا، بڑا لطف
ہا - ادھر ادھڑ ادھر بن - اور ہم برابر ادھڑ بن ہی
ہیں رہے - بے کام و باکلام کے مصداق -

ہمیں تو وقت کی گردن مارنے سے غرض ہے، چاہے
جیسے بھی ہو - خدا کارپوریشن کا بھلا کرے - ہر سڑک
کیا تیز روشنی دینے والے سو سو، دو دو سو کینڈل ہاور
نے قمقمے لگا رکھے ہیں جن کے سائے میں بیٹھ کر بار لوگ
ت رات بھر پچسی کھیلنے رہیں - ہم بھی بڑے بڑے
ماستدانوں اور ریاست والوں سے کیا کم ہیں - وہ بھی تو
ہے ہی ہیں - یہ گوٹ مار، وہ گوٹ مار، یہ چال چل،
چال چل کا کھیل ہی کھیلنے رہتے ہیں - کبھی چین،
بھی پاکستان، کبھی یہ، کبھی وہ - کسی پر بھی
’دندان آڑ تیز‘ غرض یہ کہ قمقمہ ان کا، کھیل ہمارا !



قمر آن لائیکل ہزار !

نئی مطبوعات

مصنف : ضامن نقوی
اصل حیات : ناشر : ادارہ معارف ادب

۱۲۰- ڈی۔ ڈی۔ کوٹلی گراچی

قیمت : ایک روپیہ

ضخامت : ۷۷ صفحات

یہ کتاب جتنی مختصر ہے، موضوع و مضمون کے اعتبار سے اتنی ہی بسیط بھی ہے۔ مقصد تخلیق جس کا سیاق انسانی سے بڑا گہرا و قریبی تعلق ہے، صرف مذاہب ہی نہیں فلسفہ اور سائنس کے مطالعات میں بھی بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ اگر بعض کا یہ نقطہ نظر تسلیم کر لیا جائے کہ زندگی کا کوئی مقصد تخلیق نہیں اور وہ صرف عناصر میں ظہور ترتیب کا نام ہے اور موت ان کے پریشاں ہو جانے سے عبادت تو بھرتی دہی آل کار اور حیات مابعد کا تصور ہی خاک میں مل جاتا ہے۔ خود حیات مابعد کے تصور کو بھی اب اس دور میں رد کر دینا کچھ ایسا آسان نہیں رہا ہے اور ہم لاجاً لہ آگے چلیں گے دم لے کر کے عقیدہ ایسی ہی نہیں عقلاً بھی قابل ہوتے جا رہے ہیں۔

”اصل حیات“ میں بہ دلائل یہ ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ حیات انسانی ایک دائمی سوچ اور تقابلیہ جس کے بے شمار نظام، سلسلے اور مظاہر ہیں اور یہ کہ حیات مابعد بھی دراصل ایک نظام و سلسلہ حیات ہی ہے، نہ کہ کسی غیر مرتب دیوانہ بے شیرازہ کا جزو۔ اس کتاب کے مطالعہ سے ارباب تشکیک کو کافی مایہ فکرمیتا ہوتا ہے۔ جو لوگ اب بھی ریب و شک کے شکار ہیں اور ان کے ذہنوں پر کڑی کا سا جلا اتنا ہوا ہے وہ پھر ایک بار تلاش حق کی جستجو کریں تو فکر و نظر کے لئے بہت کچھ سامان اس چھوٹی سی کتاب میں مل سکتا ہے۔

یہ کتاب ۱۹۳۲ء میں شائع ہوئی تھی اور اب یہ اس کا دوسرا

ایڈیشن ہمارے سامنے آیا ہے : (۱-۲)

★

ابو کی کہانی :

ایک عرصہ بعد پھر ایک کھپ کی کھپ -

قیام پاکستان کے ساتھ دیگر علاقائی زبانوں

(انجمن کے افسانے پنجابی) کی طرح پنجابی میں بھی ایک نئے دور کا آغاز ہوا

ہے جس میں نظم و نثر کو یکساں دخل ہے مکلاسیکی دور تو شاعری ہی کا

دور رہا۔ جدید دور میں شاعری نے بھی نیاز رنگ اختیار کیا جس کا نمونہ

شرف، سر شہاب الدین (مجموع) عبد المجید بھٹائی، اور احمد راہی کے

کلام میں دکھائی دیتا ہے۔ اب ان میں اور سلسلے بھی شامل ہو گئے ہیں

جن میں غزل کو بھی نمایاں حیثیت حاصل ہے۔ اس باب میں بعض استاد

اب بھی پیش پیش ہیں۔ ان میں سیر فیض گجراتی کا نام سرفہرست ہے۔ انہوں

نے اپنے مقبول عام مجموعے ”ڈونچیک، پیڈلے“ (لمبی مسافرتیں) میں

غزل کا حق بہت خوش اسلوبی سے ادا کیا ہے۔ اور اس صنف میں وہ

تمام تیور پیدا کر دئے ہیں جو اس سے مخصوص ہیں۔ ان کے زیر اثر دیگر شعرا

نے بھی اس صنف کو اپنا لیا ہے اور توقع ہے کہ بہت جلد پنجابی شاعری

اس صنف میں بھی مالا مال ہو جائے گی۔

ایک اور استاد جناب عبد الکریم شرمہیں۔ ان کی نظموں، غزلوں

اور گیتوں کا مجموعہ ”نگراں“ کے نام سے موسوم ہے۔ ”نگراں“ اصل میں وہ

کوئٹہ میں ہوتی ہیں جو درخت کو کاٹ دینے کے بعد زرخیز پھوٹ آتی ہیں

اور ان میں مجدد توانگی پائی جاتی ہے۔ اسی لئے پہلی و شیشم کی طرح

سہی قد تیاروں کو بھی ”نگراں“ کہا جاتا ہے۔ ”نگراں“ جتنی مینا ظاہر

ہے کہ اس ہلکتے ہوئے نام کے ساتھ نظموں، غزلوں، گیتوں کی کیسا

کیفیت ہوگی۔

یاد رہے کہ ایک استاد کی تصنیف ہے جسے پنجابی ادبی بورڈ لاہور

نے حال ہی میں شائع کیا ہے اور یہ بھی کتابوں کے ایک جدید عمدہ سلسلے

کی تمہید ہے۔

ولکناس (چینیٹ) تنویر بخاری کی پنجابی غزلوں کا مجموعہ ہے۔

گو مجموعہ مختصر ہے مگر اس نو عمر شاعر نے تھوڑے ہی عرصہ میں پنجابی نظم

وہ خاصی حیرت افزا ہے۔ یہ اس کی کہانی، داجل کے افسانے پنجابی افسانوں کا نہایت عمدہ اور دلچسپ مجموعہ ہے۔ مرتبین پنجابی ادب کے چوٹی کے ادیب ہیں۔ محمد آصف خان، خالد لاہوری اور شہباز ملک۔ لکھنے والوں میں بزمیر کے کم و بیش پچیس بلند پایہ افسانہ نگار اس مجموعہ میں نظر آتے ہیں۔ ان میں خود مرتبین کے علاوہ صوفی غلام مصطفیٰ اقبتم، راجندر سنگھ بیدی، افضل احسن، نواز، غلام علی چودھری، کرتار سنگھ دگل، امریتا پرتم، رشیدہ سلیمین، شفقت تنویر مرزا، صنیف چودھری وغیرہا خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ افسانوں کا معیار خاصا بلند ہے اور یہ امر بھی تعجب انگیز ہے کہ تھوڑے ہی عرصہ میں اس نئی صنف نے بھی اس قدر اعلیٰ مدارج ترقی طے کر لئے۔ ان گوناگوں امور سے اس زبان میں آئندہ ترقی کے بڑے وسیع امکانات نظر آتے ہیں: (ر۔خ)

میں غزل کی صنف میں جو اضافہ کیا ہے اس کا ذکر نہ کرنا کالیفانی ہوگی۔ تنویر بخاری گو یہ فیصل گجراتی اور استاد عبدالکریم شمس سے متاثر نہیں، پھر بھی انہوں نے اپنے پیش رو اساتذہ کے رنگ کو بڑی حد تک اپنایا بھی ہے اور نبھا یا بھی۔ اس نوجوان شاعر سے بہت سی توقعات وابستہ کی جاسکتی ہیں۔

بہر کیف، پنجابی نظموں سے زیادہ دلچسپی کا باعث اس کی نثری کتابیں ہیں جن کی طرف اہل قلم حال ہی میں زور شور کے ساتھ متوجہ ہوئے ہیں۔ اور یہ واقعہ ہے کہ تھوڑے ہی عرصہ میں تقریباً ہر صنف میں انہوں نے کئی نثر لیس طے کر لی ہیں۔ چائن کا ذکر قبل ازیں ان صفحات میں کیا جا چکا ہے۔ عبدالعجید کھٹی کا ناول "ٹھیکڈا" (ٹھوک) ادبی انعام بھی حاصل کر چکا ہے۔ اس کا طرہ امتیاز ناول کی نہایت چٹیل زبان ہے۔

پنجابی افسانے نے چند ہی سالوں میں جو گریز پاتری کی ہے

ایسا گمان نہ تھا: ————— بقیہ صفحہ ۳۵

چاؤ سے، ایک کی طرف جاتی ہیں دوسرے کی طرف بھی، مگر اب اس سوال کا عمل ہی کیا تھا؟ مجھے اپنے بچے سے بے حد پیار ہے۔ اس لئے نہیں کہ وہ میرا ہے، بلکہ اس لئے کہ اس کی خوشبو نے ایک زندگی کی کایا پلٹ دی۔ وہ اسے تصور کی دنیا سے نکال کر حقیقت کی دنیا میں لے آئی ہے، ایک باغ و بہار دنیا:

نظروں نے اسے بھانپ لیا۔ کوئی مدھل؟ وہ اب پرانی بات بڑھکی تھی، شاید۔

اور آخر — وہ بات جس کا کسی کو گمان نہ تھا! نہ تابا جان نہ آئی، نہ بچے۔ میں حیران تھا۔ اور میرے دل میں سوال اٹھا: کیا قدرتی اور انسانی پھول دونوں ایک ہی ہیں؟ دونوں کا رنگ بوپ، بو باس، کیف اور ان کے ساتھ بیا رہی وہی؟ — ہا نہیں جو اس تپاک سے،

حسن کلام آئینہ: ————— بقیہ صفحہ ۱۲

لگے ہوئے تھے۔ صدر کی روز افزوں عوامی مقبولیت، ان کی صدا آواز گفتار اور صاحب الرائے ہونے کی بڑی علامت۔

یقین ہے کہ اب کے پھر میری طرح دوسرے بھی اپنے ساتھ گوناگوں تاثرات لے کر گئے ہوں گے۔ اور یہ سوچ رہے ہوں گے کہ ہمارے محترم سربراہ نے جو کچھ کہا ہے ٹھیک کہا ہے اور ان باتوں پر عمل کیا جائے تو ہم اپنے قومی مقاصد میں جلد از جلد فائز المرام ہو سکتے ہیں۔

اگر سیاست داں اور عوام بھی انہی کی پیروی کریں تو کیا اچھا ہو۔ مذہاتہ بالآخر ہم سب کا یہی ہے نا، کہ پاکستان کو مضبوط و مستحکم اور ترقی پذیر بنایا جائے۔ پس اس سلسلے میں جو بھی حقیقت پسندانہ قدم اٹھایا جائے مستحسن ہوگا۔

پہلے کی طرح اب بھی جس توجہ اور پیش از پیش اپنا شک سے صدر پاکستان کے ان دلنہی خطابات کو سنا گیا اس کا ثبوت اس امر سے بھی ملتا ہے کہ کوچہ و بازار میں کتنے لوگوں کے ٹھٹھٹ ٹھٹ

نوائے پاک

ملک میں ایسے مجموعہ منظومات کی بڑی ضرورت محسوس کی جا رہی تھی، جو ہمارے وطنی احساسات کو بیدار کر سکے۔ اور ہمیں اپنے وطن کی پاک سرزمین کی عظمت اور محبت سے روشناس کر سکے۔

نوائے پاک میں ملک کے نامور شعراء کی لکھی ہوئی وطنی جذبات سے لبریز نظمیں گیت اور ترانے درج ہیں۔

کتاب مہلہ ہے اور خوبصورت
گردپوش سے آراستہ، گیت آپ
بہت نفیس اور دیدہ زیب،
قیمت صرف ایک روپیہ

ملنے کا پتہ :- ادارہ مطبوعات پاکستان - پوسٹ بکس ۱۸۳ - کراچی

ہندوستان کے خریداروں کی سہولت کے لئے

ہندوستان میں جن حضرات کو "ماہ نو" اور "مطبوعات پاکستان" کراچی کی کتابیں و رسائل اور دیگر مطبوعات مطلوب ہوں تو وہ براہ راست حسب ذیل پتہ سے مزکا سکتے ہیں۔ استفسارات بھی اسی پتہ پر کئے جاسکتے ہیں۔ یہ انتظام ہندوستان کے خریداروں کی سہولت کے لئے کیا گیا ہے۔

پتہ :-

ادارہ مطبوعات پاکستان

معرفت پاکستان ہائی کمیشن - شیر شاہ میس - نئی دہلی (ہندوستان)

منجانب :- ادارہ مطبوعات پاکستان پوسٹ بکس ۱۸۳ کراچی

ہماری دونی مطبوعات

(زیر طبع)

انتخاب "ماہ نو"

"ماہ نو" کے سلسلہ انتخابات کی تیسری ترتیب جو پچھلے پانچ سالوں کے بہترین مضامین، نظم و نثر کی چیدہ اور نمائندہ تحریروں پر مشتمل ہے۔ ملک کے بہترین اہل قلم کے مضامین نظم و نثر جو ہمارے ملی ادب، تاریخ و فن، اور ثقافت و انتقاد کے موضوعات پر سیر حاصل پیشکش ہیں اور دائمی قدر و قیمت کے حامل۔

کتاب مصور اور کافی ضخیم ہوگی اپنی کاپی کے لئے فرمائش جلد درج کرا لیجئے

★

(زیر طبع)

سنہرا دیس

(دفاعا شدری)
مدھر دریاؤں، گنگنا تے ما بھیلوں، سنہرے پٹ سن، اور روپہلی دھان کی سرزمین کا ایسا مرقع جو ہمیں اس دیس سے اور قریب کر دے گا۔ جو ہمیں اس کی عظیم تاریخ، اس کے شاندار ادب، فنون اور زندگی کی جھلکیوں سے پہلی بار بطریق احسن روشناس کرائے گا۔

اپنے موضوعات کے تنوع اور اسی دھرتی کے رہنے والے کے قلم سے پُر خلوص تاثرات، مستند حقائق اور معلومات پر مشتمل ایسی وسیع پیشکش جو عرصہ تک مشرقی پاکستان پر ایک نفیس دستاویزی حوالہ سمجھی جائے گی۔

— ضخیم — مصور — مجلد
فرمائش جلد درج رجسٹر کرائیں۔

اداری مطبوعات پاکستان، پوسٹ بکس ۱۸۳ کراچی



زمانہ کسی کا انتظار نہیں کرتا!

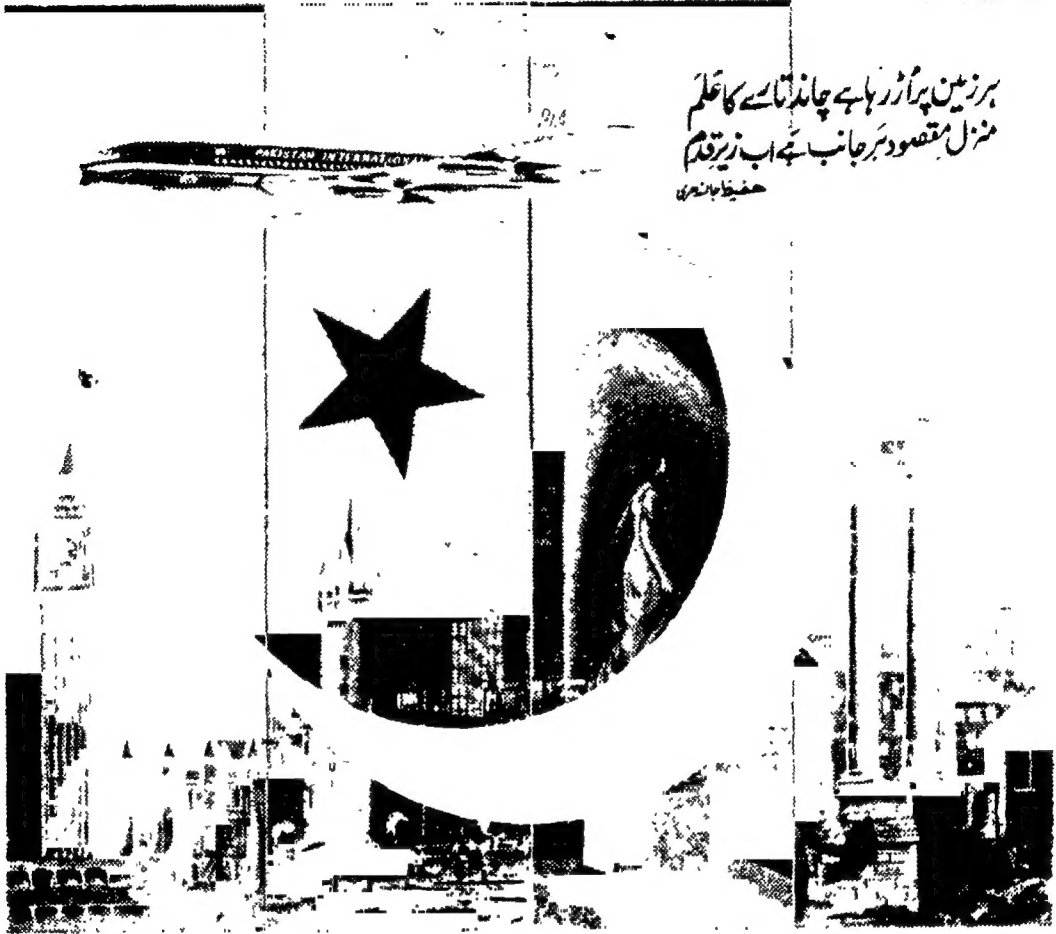
وقت گزرنے پر اور بڑوں کی طرح تیل بھی خراب ہو جاتا ہے اور انہیں تبدیل کرنا پڑتا ہے۔ یہی تبدیلی کتنے وقفے سے کی جاتی ہے! ریسرچ کرتی ہے اس کا مدار مخصوص حالات اور کارکردگی پر ہے۔ اس لئے بیج جو اب مون چورنگ سے مل سکتا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ برما شیل نے اپنے خریداروں کی آسائش کے لئے جدید قسم کی پھر گاہ قائم کر رکھی ہے۔ مگر خریدارہا جان پازنی کے ساتھ اپنے تیل کی پھر گاہوں کو اس کی ۱۰۰ ورنل کو پوری مل استعمال کر کے کفایت کر سکیں۔

یہ پھر گاہ کی خدمت برما شیل کی اعلیٰ خدمات کا ایک پہلو ہے۔ آپ جو برما شیل کی پھر گاہ سے استعمال کرتے ہیں برما شیل آپ کی ہر خدمت کیلئے حاضر ہے۔ وہ آپ تیل کی دشیا جو اس کی پھر گاہ سے فراہم ہوتی ہیں سب ہی اعلیٰ قسم کی ہوتی ہیں۔

خدمت اپنا افتخار: برما شیل پر اعتبار

برما شیل آئل اسٹورنگ انڈسٹریز پرائیویٹ لمیٹڈ (ایمپتھان میں قائم شدہ) کمپنی کے مسبران کی ذمہ داری محسوس



ہر زمین پر اُڑ رہا ہے چاند تارے کا علم
منزل مقصود ہر جانب ہے اب زیر قدم
حفیظ جالبندی

ہمارا چاند تار ترقی اور طہیستان کا نشان ہے۔
اس تصویر میں ہمارا چاند تار دنیا کی سب سے زیادہ ترقی یافتہ قوموں کے نشان بردار میناروں پر روشنی برسا رہا ہے۔
ریاست جو یا سیاست۔ امارت جو یا تجارت۔ صنعت جو یا حرفت۔ اب ماری دنیا سے تعلق رکھتی ہے۔
پاکستان کے مشرق مغرب اور باہر کی دنیا پر عزت اور طہیستان کی آواز سے ہمارے طیارے ہماری اپنی خوش نصیبی کا عملی اعان ہیں۔

PIA

پاکستان انٹرنیشنل ایئر لائنز - ہا کمال لوگ لاجواب پرواز

چین سے دو خط



دل روز تمام علاج جلدی امراض

چشم کے پوٹے سنسی یا پوری پوٹے
منفلائی پوٹے یا سورج بگستہ۔ بال توڑ دا دھنیل غاراش
گج خست زیر کچالی گجلی۔ دھلی۔ یا سوخو چندی رست پہلہ
درو۔ ملن رجون چوٹ سنے اور پالنے زخم اور زہریلے بالوں
کے کاٹے اور ڈسے کا بیضر اور تیر بہیف علاج ہے۔

چیرہ پاڑا اور مریم ٹپی سے نجات دلاتی ہے

قیمت فی شیشی

دو روپیہ۔ ایک روپیہ۔

آئین گنجی ہنزل
چنگ کنگ چین

۱۹۶۳ء

..... کے پوٹے گرن پرکھنے کی قیمت ہے
فلانے سے ملن کی وجہ سے غاراش بیت ہوتی ہے
غشاشات اور گنم سے ملنے جیتے ہیں مگر باوجود
انگریزی علاج کے آقا قندیں ہوا یا نسل میں آپ
کی دانی دل فذ کا شہدہ ایک خیال ہوا کہ اسے بھی
استعمال کرو کیوں کہ گنم کا لاندہ عالی شانہ کی آپ
مہرانی فرما کر ایک شیشی میں دلوں کو منہ بلا پتہ
پیش کر دیا کرتے ہیں.....

صداغ
میر

صداغ
میر

سندھ سے استعمال میں ہے

حکیم طاہر الدین اینڈ سنز دروازہ لاہور روڈ لاہور۔ خوب

شہود و افروغ طلب کریں

ماہ نو، میں مضامین کی اشاعت کے متعلق شرائط

- ۱۔ دو ماہ نو، میں شائع شدہ مضامین کا معقول معاوضہ دیا جائے گا جس کے بعد وہ ادارہ کی ملکیت ہوں گے اور وہ حسب منشا ہر طور سے استعمال کرنے کا مجاز ہوگا۔
- ۲۔ مضامین بھیجنے وقت مضمون نگار حضرات دو ماہ نو، کے معیار کا خیال رکھیں اور یہ بھی تحریر فرمائیں کہ مضمون غیر مطبوعہ ہے اور اشاعت کے لئے کسی اور رسالہ یا اخبار کو نہیں بھیجا گیا ہے۔
- ۳۔ ترجمہ یا تلخیص کی صورت میں اصل مصنف کا نام اور دیگر حوالہ جات دینا ضروری ہیں۔
- ۴۔ ضروری نہیں کہ مضمون موصول ہوتے ہی شائع ہو جائے۔
- ۵۔ مضمون کے ناقابل اشاعت ہونے کے بارے میں ایڈیٹر کا فیصلہ قطعی ہوگا۔
- ۶۔ ایڈیٹر کو مسودات میں ترمیم و تنسیخ کرنے کا مجاز ہوگا مگر اصل خیال میں کوئی تبدیلی نہ ہوگی۔
- ۷۔ مضامین صاف اور خوشخط کاغذ کے ایک طرف تحریر کئے جائیں۔
- ۸۔ ہتھ بہت صاف اور مکمل درج کیجئے۔
- ۹۔ اپنے مضامین نظم و نثر کی نقول اپنے پاس بھی رکھئے۔ غیر طلبیدہ ناقابل اشاعت مضامین کی واپسی کے لئے ڈاک کے مناسب ٹکٹ روانہ کیجئے۔

(ادارہ)

مسلم بنگالی ادب

(بنگلہ سے ترجمہ)

ڈاکٹر انعام الحق ایم۔ اے۔ پی۔ ایچ۔ ڈی

اس کتاب میں بنگالی زبان و ادب کی مکمل تاریخ اور اس کے ثقافتی، ملی و تہذیبی پس منظر کا جائزہ لینے کے بعد بتایا گیا ہے کہ اس زبان کی نشو و نما اور ترقی و تہذیب میں مسلمان حکمرانوں، صوفیاء، اہل قلم، شعرا اور ادباء نے کس قدر حصہ لیا ہے۔ یہ جائزہ بہت مکمل اور تحقیق و تفصیل کا شاہکار ہے۔

پوری کتاب نفیس اردو ٹائپ میں چھاپی گئی ہے اور مجلد ہے۔

سرورق دیدہ زیب اور رنگین - ضخامت . . . صفحات

قیمت چار روپے (علاوہ محصول ڈاک)

”ماہ نو“

کے لئے غیر طلبیدہ مضامین

۱۔ غیر طلبیدہ مضامین نظم و نثر صرف اس حالت میں واپس کئے جائیں گے جب کہ ان کے ساتھ ڈاک کے مناسب ٹکٹ روانہ کئے گئے ہوں۔

۲۔ مسنرد مضامین کے سلسلے میں غیر ضروری خط و کتابت کرنے سے ادارہ کو معذور سمجھا جائے۔

۳۔ ایک ہفتہ تک اطلاع موصول نہ ہونے پر مرسلہ مضمون کو نالابل اشاعت چھوڑ کیا جائے۔

۴۔ ادارہ ڈاک میں کمی مسودہ کے کم ہوجانے کا ذمہ دار نہیں۔ (ادارہ)